



ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before taking
it out. You will be responsible for
damages to the book discovered while
returning it.

—

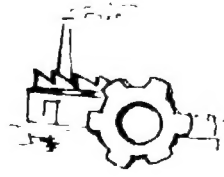
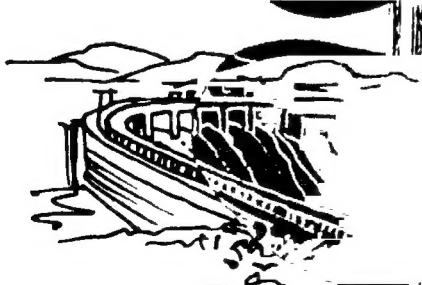
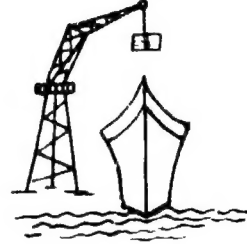
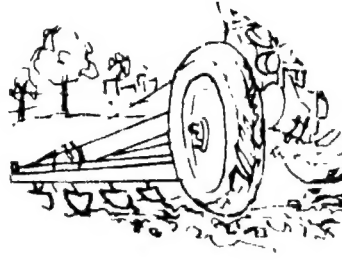
Acc. No. _____

Rs. 1/- per day. Over Night book Rs. 1/- per day.

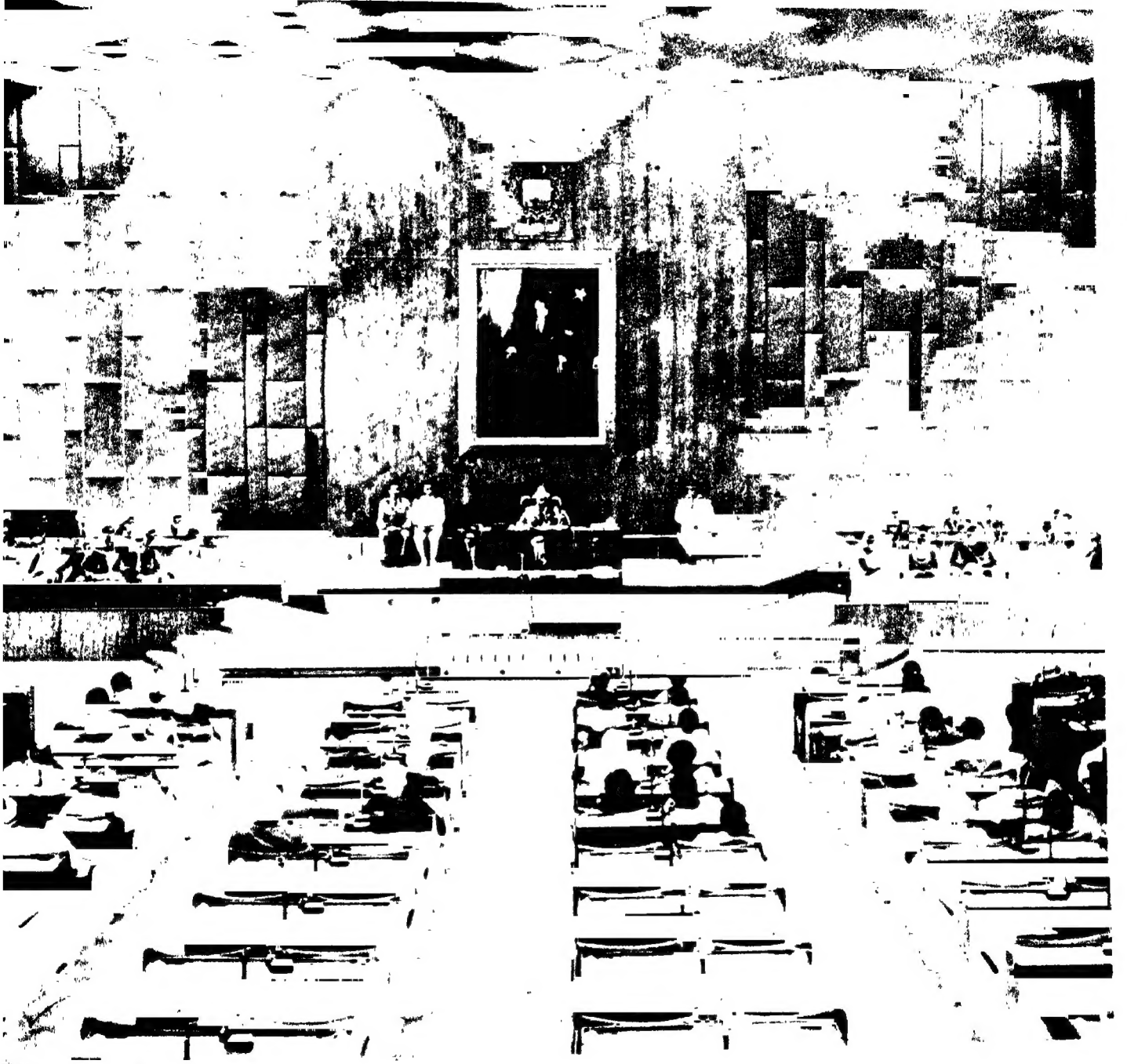
[illegible]

ماہ نو

(1088)



کے چار سال



جناب ذوالفقار علی بھٹو ۱۰ اپریل ۱۹۷۷ء کو آئین کی منظوری سے پہلے قومی اسمبلی
سے خطاب کر رہے ہیں

مدیر اعلیٰ : بیگم مسرت برکی
مدیر : فضل قدیر
نائب مدیر : سید علی محمد حسینی

ماہِ نو

نومبر - دسمبر ۱۹۷۵ء
اشاعتِ غالب

جلد : ۲۸ چند سالانہ فورویپے
شمارہ : ۴ قیمت فی پرچہ : ڈیڑھ روپیہ

اسے شمار سے سیو

ت - ق

قاضی محمد عیسیٰ

ایم حنیف شاہد

سید عبدالقدوس ہاشمی

آغا سلمان باقر

مسرت رفیق

الطاف پروانہ

کنور محمد اعظم علی خان خسروی

مولانا کوثر نیازی

اختر عادل رضوی

جناب محمد حنیف

بتدائیہ

مذہب اعظم میری زندگی میں - چند جھلکیاں

اکثر سر محمد اقبال کا ایک نایاب خطبہ

حضرت امیر خسرو دہلوی

میر خسرو - آہ حیات کے قلمی مسودے میں

میر خسرو بحیثیت عظیم فنکار

میر - اک خورشید (نظم)

صدر شیریں بیاں - خسرو (نظم)

عوامی حکومت کے چار سال

نہیں اور خدمتِ اسلام

کستان کا آئین - کچھ خیالات

کستان اور افرو ایشیا

کستان میں ترقیاتی منصوبہ بندی

_____	عوامی حکومت کے سہارے سال - انتظامی اصلاحات پر ایک نظر
جناب عبدالستار گبول	محنت کشوں کی فلاح و بہبود
_____	پاکستان میں تعلیم
_____	پاکستان میں زراعت کی ترقی
_____	زرعی بستیوں کا ترقیاتی پروگرام
_____	مربوطہ دیہی ترقیاتی پروگرام
سعید خاں قمر	صحت کے نئے پروگرام
_____	سیاحت
_____	پاکستان میں شہری پرواز
_____	پاکستان کی اقلیتیں
_____	وفاقی حکومت کے زیر انتظام قبائلی علاقوں کی ترقی
ایم۔ اے صدیقی	اردو ادب
تاج سعید	گیت

ادارۃ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۲۵۵، راولپنڈی

غور شنید پر نثر - اسلام آباد

ابتدائیہ

کاروانِ ملت جو ان عزمِ قیادت کی رہنمائی میں اپنے تابناک مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ عزمِ دایمان کا فیضان ہے کہ آج عوامی حکومتِ نظم و ملکت کے بابرِ عظیم کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے اپنی حیاتِ فروزاں کے چار سال مکمل کر چکی ہے۔ اگر قوموں کی حیاتِ سیاسی پر نظر کیجئے تو یہ چار سال چند ثنائے قرار پائیں گے، مگر اس انتہائی قلیل مدت میں وہ کام انجام پا چکے ہیں جن کے لئے صدیوں کا عمل درکار ہوا کرتا ہے۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۹ء کی ٹھٹھری سردرات میں جس آواز نے مایوسیوں کی سیاہ بدلیوں کو چیر کر یہ اعلان کیا تھا کہ ہم چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو چن کر ایک نیا پاکستان بنائیں گے وہ آواز آج ایک لازوال صداقت بن کر نہ صرف نئے پاکستان کی مستند آواز ہے بلکہ تیسری دنیا کے مضطرب انسانوں کی بھی مستند آواز بن چکی ہے جو متمول دنیا سے اپنے حقوق طلب کر رہی ہے۔

اس مختصر ترین مدت میں قوم نے جو فاصلہ طے کیا ہے اس پر اقوامِ عالم شہد ہیں۔ شکست خوردگی اور مایوسی بھاپ بن کر تحلیل ہو گئی۔ ۱۳ دسمبر سے زائد جنگی قیدی ہجرتِ طور پر وطن لوٹ آئے۔ قوم نے انتظام و انصرام ملکی کے لئے آئین بنالیا۔ جمہوریت کی بنیادیں مستحکم ہو گئیں۔ محنت کشوں کی زندگیوں میں خوشیاں ڈولی آئیں۔ مفلوک الحال کسانوں کے دن پھر سہ، تعلیم عام اور مفت ہوئی، قومی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوا اور ملکی دولت کے ابشار استحصال پسندوں کی مٹھیوں سے نکل کر عوام کی خدمت کے لئے رواں ہو گئے۔ یہ صفحات ابھی لکھے ہی جا رہے تھے کہ ایک اور مزیدہ جانفزا ملک بھر میں گونجنے لگا۔ تقریباً ۸۰ لاکھ چھوٹے مالکانِ اراضی کو مالیائے معان کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسا اعلان تھا جس نے زرعی دنیا میں مسرت کی نئی لہر دوڑا دی۔ ان صفحات میں سیدھے سادے انداز میں ہم نے قوم کے سامنے ان چار سالوں کی میزان رکھ دی ہے۔ توقع ہے کہ ہمارے قارئین بصیرت سے اس کا مطالعہ کریں گے۔ اور ایک مرتبہ پھر قوم کے لئے خود کو وقف کر دیں گے اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کی تعمیر میں منہمک ہو جائیں گے۔

بلاشبہ یہ موقع ایک مجموعہٴ عیدین ہے۔ اس عیدین قوم نے نئے عزم کے ساتھ نئے سفر کا آغاز کیا۔ اسی عیدین میں ہم معمارِ پاکستان حضرت بابائے قوم کا جشنِ ولادت مناتے ہیں اس شمارے میں محرمِ قاضی محمد عیسیٰ کا مضمون قائدِ اعظم کی سوانح میں ایک خوبصورت نگین بن کر دمک رہا ہے اس کے لئے ہم قاضی صاحب موصوف کے ممنون ہیں۔ علامہ اقبال کا ایک نایاب خطبہ اور طوطی شکر مقال خسرو پر مضامین بھی یقیناً قارئین کی دلچسپی کا موجب ہوں گے۔ خدا کرے یہ شمارہ قبولِ عام حاصل کر سکے۔

قائد اعظم میری زندگی میں چند جھلکیاں

قاضی محمد عیسیٰ

کروں۔ لیکن یورپ کو دیکھنے کے بعد دل میں یہ خواہش تھی کہ پورے ہندوستان کو بھی دیکھ لوں اور اس کے بعد جم کر اپنا کام شروع کروں۔ چنانچہ آخر جنوری ۱۹۳۹ء میں بمبئی پہنچا۔ چند دنوں کے قیام کے بعد اپنے ایک دوست ہز ہائی ٹینس نواب طالع محمد خان دہلوی ریاست پالن پور کے ہمراہ بمبئی کے مشہور گھوڑ دوڑ کے میدان پہنچا۔ ایکسپس کپ (ECLIPSE CUP) کا دن تھا ریس کورس میں تماشائیوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ میں ہاکس میں بیٹھا دوڑیں سے دوڑ کے میدان اور تماشائیوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک میں نے پڈاک (PADDOCK) یعنی اس چکر کے قریب جہاں گھوڑے ریس پہلے گھمائے جاتے ہیں اور جہاں لوگ ان کا قریب سے جائزہ لیتے ہیں۔ ”مسٹر جناح“ کو دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں گھونڈو کی کتہ تھی اور ایک آنکھ پر مونیکل عینک لگی ہوئی تھی۔ بے ساختہ میں نے نواب صاحب سے پوچھا کہ ”کیا وہ مسٹر جناح ہیں؟“ مجھ سے انہوں نے دور بین لی اور اس میں دیکھا اور دیکھنے کے بعد فرمایا: ”ہاں مسٹر جناح ہی ہیں۔“ میں نے پوچھا کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟ جواب ملا ”ہاں“ ”مجھے ان سے ملائیے۔“ میں نے بے چینی سے ان سے کہا۔ وہ میرے ہمراہ گئے اور جہاں مسٹر جناح کھڑے تھے ان سے ملے اور میرا تعارف ان

سال ۱۹۳۴ء تھا اور غالباً ستمبر یا اکتوبر کا مہینہ تھا۔ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ لندن کے پارک لین ہوٹل واقع پیکڈلی (PICCADILLY) کے پیش کمرہ میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ہوٹل کے گول چکر والے دروازے (REVOLVING DOOR) سے میں نے ایک خوش پوش شخص کو ہوٹل میں وارد ہوتے دیکھا۔ کئی لوگوں کو میں نے اپنی نشست کے دوران ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا لیکن کسی پر بھی میری نظر یہی ایسی نہ جمیں جیسے اس شخص پر۔ بہترین سوٹ میں ملبوس یہ شخص ہوٹل کے دفتر استقبالیہ کی طرف بڑھا اور وہاں سے اپنی چابی حاصل کر لی۔ پھر وہ لفٹ میں اوپر کو چلا گیا۔ میں تمام وقت اس شخصیت کو معلوم کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ آخر رہا نہ گیا اور میں استقبالیہ کے دفتر پہنچا اور پوچھا کہ وہ کون صاحب تھے؟ برجستہ جواب ملا ”مسٹر جناح“ میں بیرسٹری کی غرض سے انگلستان میں مقیم تھا اس دن میں نے دل میں عہد کیا کہ میں بھی اپنے وطن کی اس مایہ ناز ہستی کے جو ایک نامور قانون دان بھی ہے نقش قدم پر چلوں گا۔

۱۹۳۸ء میں بیرسٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد میں اپنے وطن واپس آیا۔ اور ارادہ کیا کہ کراچی میں اپنی پریکٹس شروع



قائد اعظم بلوچستان مسلم لیگ کے سابق صدر تاج محمد عیسیٰ کے ساتھ

آں انڈیا مسلم لیگ کا چھبیسواں سالانہ





مسلم لیگ کے ایک سالانہ اجلاس کا منظر



مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس لاہور میں
قائد اعظم، لیاقت علی خان اور تواب محمدی کے ساتھ



سائنس اعظم پہلی مجلس قانون سازی میں
رجسٹر پر دستخط کر رہے ہیں



اعظم مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ساتھ

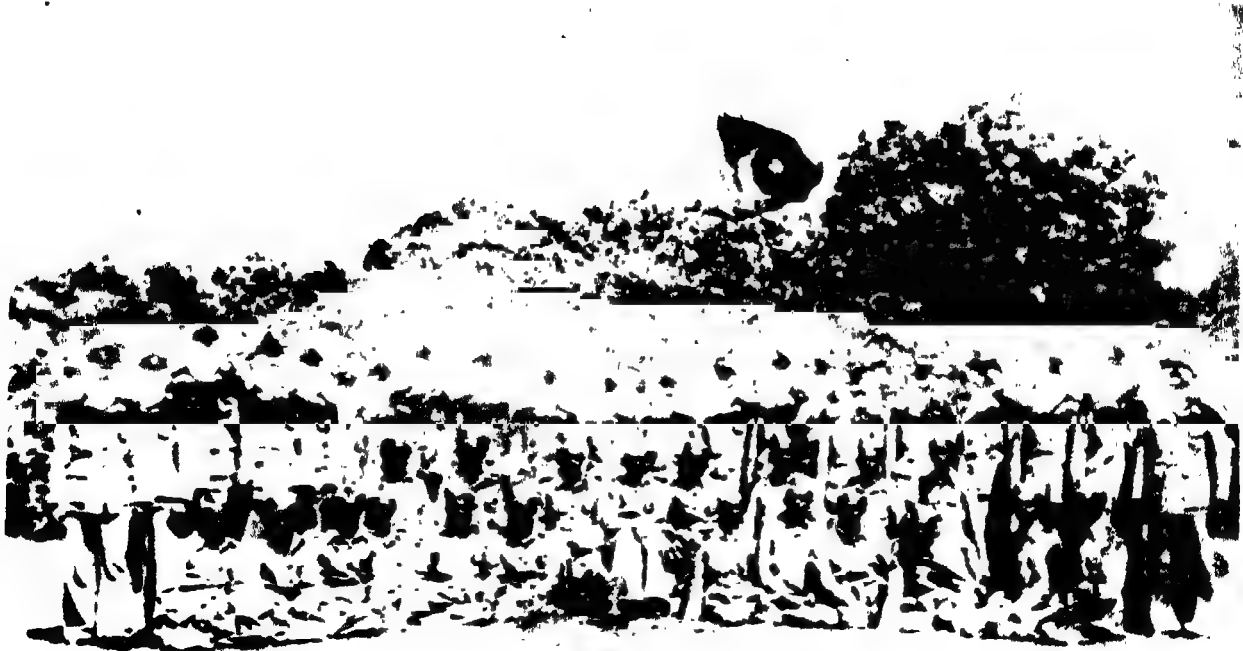


سائنس اعظم کارکنان مسلم لیگ سے
خطاب کر رہے ہیں



قائد اعظم کے دورہ سرحد کی ایک تصویر

مسلم یگ نیشن گارڈز



سے کرایا۔ پہلا جملہ جو نہایت گرجوٹھی سے ان کی لبوں سے نکلا وہ تھا: اچھا تو آپ بلوچستان سے آئے ہیں۔۔۔۔۔ وہاں میری کوئی مسلم لیگ نہیں۔ وہاں میں نے ہر چند کوشش کی کہ کوئی ایسا شخص ملے جو کام کر سکے لیکن اب تک مجھے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اچھا تو پھر تم یہ کام کیوں نہیں شروع کر دیتے؟“ جواباً عرض کیا۔ ”محسوس میں ابھی ابھی انگلستان سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد آیا ہوں۔ میں خود بھی نہیں جانتا کہ مسلم لیگ کیا ہے اور ایک سیاسی جماعت کی بنیاد کیسے رکھی جاتی ہے۔“ جواب ملا ”تو اچھا تم اور نواب صاحب کل میرے ہاں پلنگ پر آنا“ ان دنوں قائد اعظم کا قیام مالا بارہل کے اس مکان میں تھا جو ٹل گیبرز روڈ پر تھا۔ دہلی میں اسی مالا بارہل پر انہوں نے ایک دوسرا گھر بنایا۔ جس میں تقیم کے وقت تک مقیم رہے۔ پلنگ کے بعد نواب صاحب رخصت ہو گئے اور قائد اعظم نے شام تک مجھے اپنے پاس بٹھایا اور تحریک مسلم لیگ سے آشنا کیا۔ شام کو اپنی موٹر میں ہوٹل تاج محل جیواں کی محبت، اخلاص اور جذبے نے اس حد تک مجھے گرویدہ کر دیا کہ پریکٹس کا خیال دل سے نکل گیا اور میں واپس کوئٹہ پہنچ کر تن من و جان سے خدمت مسلم لیگ میں مشغول ہو گیا۔ صوبے کے ہر ضلع اور تحصیل میں لیگ کی شاخیں قائم کیں۔ اس وقت تک کانگریس کی ہوا توہ “انجمن وطن” کے لئے صوبے کا سیاسی میدان صاف تھا۔ لیکن اب مسلم لیگ کے ساتھ اس کی زور آزمائیاں شروع ہوئیں۔ حق کے سامنے کہاں کوئی ٹھہر سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ سیاست بلوچستان پر مسلم لیگ غالب آئی۔ غالباً ستمبر ۱۹۷۹ء میں صوبہ بلوچستان کی مسلم لیگ کا الحاق آل انڈیا مسلم لیگ سے پہلی بار ہوا۔ دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس تھا۔ قائد اعظم صدارت فرما رہے تھے۔ میں بھی خاص دعوت نامہ کے تحت مال کے آخر میں دیک کر بیٹھا تھا۔ چونکہ بلوچستان صوبائی مسلم لیگ کا الحاق اس وقت تک نہیں ہوا تھا۔ اس لئے صوبہ بلوچستان کا کوئی رکن کونسل کا ممبر نہ تھا۔ کونسل کی کارروائی کے اختتام پر قائد اعظم کرسی سے اٹھے اور کونسل سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ”آپ حضرات کو معلوم ہے کہ اب تک

صرف صوبہ بلوچستان ہی ایک ایسا صوبہ تھا جس میں ہماری کوئی تنظیم نہ تھی۔ لیکن میں نہایت خوشی سے آج یہ اعلان کرتا ہوں کہ گزشتہ چند مہینوں سے وہاں بھی ایک زبردست انقلاب آ گیا ہے۔ اب وہاں بھی ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہمارے ممبر بنے ہیں اور برابر بن رہے ہیں۔ پرائمری لیگوں، تحصیل لیگوں اور ضلع لیگوں کا جال بچھ گیا ہے۔ یہ کام گزشتہ سردیوں میں میں نے قاضی محمد عیسیٰ کے سپرد کیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔ انہوں نے نہایت تندہی سے یہ کام سرانجام دیا ہے۔“ ہال میں ہر طرف سے آوازیں اٹھیں۔ ”ہم قاضی عیسیٰ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایسیج پر بلایا جائے۔“ جب آوازیں کم ہوئیں قائد اعظم نے مائیک پر کہا۔ ”قاضی عیسیٰ ایسیج پر آؤ۔“

لندن کے سٹے ہوئے سوٹ میں ملبوس شرماتے ہوئے ہال کے آخر صف میں سے اٹھ کر میں آگے بڑھا۔ ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ ایسیج کی سیڑھیوں کے پاس جب پہنچا تو وہاں بیٹھے ہوئے اکابرین لیگ نے مجھے ایسیج پر گھسیٹ لیا۔ اور ہر ایک بغل گیر ہوا۔ نواب صاحب چھتا ری نے بغل گیری کے بعد کہا۔ ”ارے میاں جب ہم نے سنا کہ بلوچستان کے قاضی صاحب نے چند مہینوں میں یہ معجزہ کر کے دکھایا ہے تو خیال تھا کہ بلوچستان کا قاضی کوئی بھاری عمامہ پہننے والے اور ڈھیلے ڈھالے شلوار پوش کوئی سفید ریش ہوں گے۔“ یہی الفاظ پھر انہوں نے مانگ پر بھی دہرائے۔

چند ہی مہینوں کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں سالانہ اجلاس کالاہور میں ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء کو انعقاد ہوا۔ بلوچستان مسلم لیگ کے مندوبین نے کثرت سے اجلاس میں شرکت کی۔ اس کے علاوہ بلوچستان مسلم لیگ نیشنل کارڈز کا ایک دستہ بھی خدمت قوم کرنے کے لئے ہمراہ تھا۔ قائد اعظم کے ارشاد پر میں نے صوبہ بلوچستان کی طرف سے پاکستان ریڈ کوشن (یعنی وہ قرار داد جو ۲۳ مارچ ۱۹۷۰ء کے اجلاس میں پیش ہوئی) کی تائید میں تقریر کی (برکوک پاک و ہند میں میں تنہا وہ شخص رہ گیا ہوں جس نے اس قرار داد کی تائید کی) اس تاریخی اجلاس

کے امیدوار کامیاب ہوئے۔ اور انہیں کامیابیوں کے بعد صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی وزارت بنی۔ جس کے وزیر اعظم مرحوم سردار اورنگ زیب تھے۔ اور ان کے دیگر ساتھیوں میں سے مرحوم سردار اختر صاحب وزیر خزانہ مقرر ہوئے اور انہی دنوں میں سردار اختر صاحب پہلی بار مسلم لیگ کے ممبر بنے۔ ہندوستان بحر سے مجھے پیغامات تہنیت موصول ہونے لگی کہ کسی کو یہ امید ان دنوں میں نہیں ہو سکتی تھی کہ صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کو سو فیصد کامیابی ہوگی۔ قائد اعظم نے بھی مجھے پیغام خوشنودی سے سراہا جو اس مضمون کا تھا:

“WELL DONE MY BOY THE
VICTORY IN THE RECENT
BYELECTIONS IN THE FRONTIER
IS YET ANOTHER FEATHER IN
YOUR CAP”

جب میں پشاور سے دہلی آیا اور ان کی رہائش گاہ واقع ۱۰ اوکٹوبہ روڈ پر پہنچا تو نہایت خوشی اور محبت کا اظہار کیا اور کچھ دیر کے بعد جب میں نے رخصت مانگی تو فرمایا: ”اچھا اب حساب دو کیا خرچ کیا ان ایکشنوں پر“ میں نے عرض کیا ”جائے دیں“ انہوں نے کہا نہیں ایسا نہیں ہو سکتا بالآخر میں نے کہا ۲۵۰۰ روپیہ۔ چیک نکال کر دس ہزار روپیہ کا چیک دیا۔ اور فرمایا ”یہ ناقابل یقین ہے کہ صرف اتنا خرچ ہوا“ چیک کو دیکھ کر میں نے عرض کیا آپ نے تو دس ہزار کا چیک دیا ہے میں نے تو ڈھائی ہزار کہے تھے“ فرمایا ”ڈھائی ہزار فی سیٹ (SEAT) ۳ سیٹ کے دس ہزار ہوتے ہیں“ میں نے عرض کی ”حضور چاروں سیٹوں پر صرف ڈھائی ہزار روپیہ خرچ ہوئے“ یقین نہیں کر رہے تھے۔ بادل نخواستہ پہلا چیک لے کر دوسرا ڈھائی ہزار کا چیک دیا۔

پہلی مرتبہ جون ۱۹۴۳ء میں قائد اعظم بلوچستان تشریف لائے اور صوبہ بلوچستان مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کا افتتاح فرمایا بلوچستان کی تاریخ میں اتنا جھوم کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اور نہ ہی

کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کی نئی ورکنگ کمیٹی قائد اعظم نے مقرر کی اور مجھے ممبر بنایا گیا۔ اس طرح مجھے یہ خیر حاصل ہوا کہ سب سے کم عمر ممبر تھا جو مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی میں بنایا گیا۔ صوبہ سرحد میں چونکہ سرخ پوشوں میں عدالت خدمت گارڈوں یعنی کانگریس کے ہوا خواہوں کا زور تھا۔ قائد اعظم چاہتے تھے کہ صوبہ سرحد کے لوگوں کے سامنے لاہور ریڈولوشن کی تشریح کی جائے اور وہاں کے لوگوں کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جائے اس عرض کے لئے قائد اعظم نے میری قیادت میں ایک وفد صوبہ سرحد بھیجا۔ وفد کے دیگر اراکین میں نواب بہادر یار جنگ مرحوم مولانا عبدالحامد یلونی مرحوم مولانا اکرم علی ملیح آبادی تھے ہم نے صوبہ سرحد کے طول و عرض کا دورہ کیا جو نہایت کامیاب رہا۔ کانگریس کے بڑے سے بڑے گروہ کی بنیادیں ہل گئیں۔ غالباً اس دورے کی کامیابی ہی کی وجہ سے جب قائد اعظم نے یہ فیصلہ کیا کہ صوبہ سرحد کی مسلم لیگ جو باہمی اختلافات کی وجہ سے بہت کمزور اور تقریباً ناکارہ ہو چکی تھی کی از سر نو تنظیم کی جائے تو صوبہ سرحد مسلم لیگ کو توڑ دیا گیا اور مجھے صوبہ سرحد کا آرگنائزر مقرر کیا گیا۔ تقریباً سال بھر پشاور میرا صدر مقام رہا۔ مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم شروع ہوئی انہیں ایام میں صوبہ سرحد میں چار ضمنی انتخابات صوبائی اسمبلی کے لئے ہونے لگے۔ مسلم لیگ کی طرف سے میں نے چار نمائندوں کو مقرر کیا۔ اس سے پہلے قائد اعظم نے مجھے دہلی بلایا اور فرمایا ”کو شش کرنا ایک آدھ سیٹ مسلم لیگ کو مل جائے“ جو اب عرض کیا۔ ”لیگ کے نمائندوں کو میں نہایت ایمانداری سے چن لوں گا۔ لیکن آپ یہ وعدہ کریں کہ میرے چنے ہوئے نمائندوں میں کوئی ردوبدل نہ ہوگا۔“ قائد اعظم نے فرمایا۔ ”یہ وعدہ میں نہیں کر سکتا کیونکہ کلٹ نہ لٹنے پر ہر ایک ممبر کو حق ہے کہ میرے پاس اپیل پیش کرے۔ یہ میں کیسے کر سکتا ہوں کہ یہ حق اپیل ممبران سے چھین لوں“

ایک آدھ حلقے سے اپیلیں دائر ہوئیں لیکن میرے تمام فیصلے برقرار رہے۔ قائد اعظم نے مجھے اختیار دیا تھا کہ خرچ جو بھی ہو اس کی میں فکر نہ کروں۔ اللہ کے فضل و کرم سے چاروں حلقوں میں مسلم لیگ

ہو رہا ہے ؟

تقریباً دو مہینے میرے ہاں ان کا قیام رہا۔ شوخ رنگ کے لباس شب پہنتے تھے۔ اور صبح خود شیوہ کرتے تھے۔ سیٹھی ریزر سے نہیں بلکہ جسے نائیوں والا استرا کہتے ہیں یعنی کٹ تھروٹ (CUT THROAT) استرے سے۔ لڑائی کے ایام تھے ہزار میں بیڈز کی ہر وقت قلت رہتی تھی۔ میں نے ایک روز شکوہ کی صحت میں اس امر کا اظہار کیا۔ منہس کر فرمایا، ”میری طرح کٹ تھروٹ سے شیوہ کرنا شروع کر دو“

صبح سویرے ناشتہ سے پہلے میرا مطالعہ انور کمال اپنے ہنگ سے اتر کر سیدھا ”داد جناح“ کے پاس ڈرینگ روم میں پہنچ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ قائد نے چہرہ پر خیسو کے لئے صابن لگایا تھا کہ انور میاں پہنچے۔ پوچھا ”داد جناح یہ کیا لگایا ہے“ فرمایا صابن ”پھر سوال کیا۔“ آپ نے صابن کہاں لگایا ؟ جواب ملا ”مذہب“ پھر بچے نے سوال کیا۔ ”آپ بات کہاں سے کرتے ہیں۔“ ”منہ سے“ اس پر بچے نے کہا منہ کونسا جہاں آپ نے صابن لگایا ہے یا جہاں سے آپ بات کرنے ہیں۔“ قائد اعظم بڑے خوش ہوئے اور خوشی خوشی ناشتہ پر یہ سب ہمیں سنایا۔ اور کہا کہ عیسیٰ تمہارا یہ بچہ ماشاء اللہ بڑا زیرک ہے۔

ناشتہ کے بعد قائد اعظم مجھے گھر پر چھوڑ کر موٹر میں شہر تشریف لے گئے۔ خود کھلونوں کی دکان پر گئے اور بچے کے لئے کھلونے لے آئے۔ انہی دنوں ایک شب کے لئے پشین ہمارے دیہاتی گاؤں تشریف لے گئے۔ تخیلے میں آرام کا دن اور رات گزارنے کے بعد روانہ ہونے سے پہلے کہا، ”کاش میں ایک مہینہ یہاں رہ سکتا۔ آرام بھی مل جاتا اور کم از کم ایک لاکھ ڈالر بھی کما سکتا۔“ میں نے ایک لاکھ ڈالر کے بارے میں پوچھا۔ جواب دیا ”ایک امریکن میگزین نے انہیں یہاں پر لکھا ہے کہ وہ اپنی سیاسی تحریک پر اگر لکھیں تو انہیں یہ معاوضے ملے گا۔ اس میں آدھا تمہارا ہوتا۔ عیسیٰ“ میں نے کہا عزیز خانہ ہر وقت حاضر ہے مزدور آرام کریں۔ جواب ملا ”میرے لئے آرام کہاں۔ میں

آج کے دن تک شہر کو ٹیٹ کبھی اتنا سمجھایا گیا۔ حالانکہ سرکاری خوش آمدید پر آج کل ہزاروں بلکہ لاکھوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ لیکن فور مجست سے پہلے نے جو اس وقت کر کے دکھایا اس کی مثال نہیں ملتی۔ کوئٹہ فروٹ مارکیٹ کے قریب دکانداروں نے میوے کا ایک گیٹ بنایا بلوں ریلیس اسٹیشن سے مسلم لیگ کے دفتر تک جہاں سے گزرا قائد اعظم کے روز اول سے لے کر اس وقت تک کے جو سیاسی اقوال تھے، اردو اور انگریزی عبارت میں سلسلہ وار آویزاں تھے۔ قائد کی دور بین نگاہوں نے اس کا جائزہ لیا۔ اور جب میرے مکان یعنی اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو اپنی ہمیشہ سے فاطمہ جناح سے مخاطب ہو کر پوچھا ”بتلاؤ اس جلوس کی خاص خوبی تم نے کیا دیکھی“ کئی دروازے تھے جو جھنڈیاں تھیں وغیرہ وغیرہ جواب میں کہا گیا، قائد اعظم نے فرمایا۔ ”نہیں خاص خوبی یہ تھی کہ اسٹیشن سے مسلم لیگ کے دفتر تک جو بھی اس راہ سے گزرا اس نے کتوں کے پڑھنے کے بعد مسلم لیگ کی تمام تاریخ کا مطالعہ کیا“

قائد اعظم جذبات کی رو میں بہنے والے انسان نہ تھے۔ اور نہ ہی انہوں نے جذبات کا کبھی اظہار کیا۔ لیکن صوبہ بلوچستان کے مسلم لیگ کے اجلاس میں خطبہ افتتاحیہ میں پہلی بار اپنی زندگی میں جذبات کا اظہار ہوا۔ فرمایا ”ان کا خطبہ انگریزی میں تھا۔ یہ بھی میرے اصرار پر کیونکہ اسٹیج پر کئی انگریز فوجی افسر اور ان کی بیویاں جو قائد اعظم کو سننے کو ترس رہے تھے آئے تھے۔“

حضرات امیر کا یہ عادت نہیں کہ کسی کی بے جا تعریف کروں۔

جب میں پہلی بار بمبئی کے ریس کورس میں آپ کے صدر قاضی عیسیٰ سے ملا تھا تو میں نے ان کا جائزہ لیا اور مکرر جائزہ لیا۔ کیونکہ آپ ہانٹے ہیں میرا پیشہ وکالت ہے۔ اس وقت میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔ یہ ہے کام کا آدمی۔ ان سالوں میں انہوں نے آپ کی خدمت کی آپ میں زندگی کی نئی ہر دھڑائی اور ایک مثالی لیگ قائم کی اس کامیابی کا نتیجہ آج میرے سامنے ظاہر

ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔

کوئٹہ ہی کے قیام میں مجھے بہ کارِ لیگ لاہور بھیجا اور چلتے وقت کہا کہ لاہور چھاؤنی میں ایک جنگلہ ہے جو غالباً نظیر احمد کا ہے۔ حال ہی میں بنایا ہے لیکن بیچنا چاہتا ہے یہ چیک لو۔ اس میں جو رقم وہ کہے بشرطیکہ تمہیں مکان پسند آئے۔ اندراج کر لو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو بڑی ذمہ داری ہے۔ فرض کریں کہ مجھے مکان پسند تو کیا۔ مگر آپ کو پسند آیا تو پھر کیا ہوگا؟ مسکرا کر فرمایا ”مجھے تمہاری پسند، ضرور پسند ہوگی“ اس طرح وہ مکان جو بعد میں اور غالباً اب بھی لاہور کے فوجی۔ جی۔ او۔ سی کی رہائش گاہ ہے قائدِ اعظم نے خرید فرمایا قائدِ اعظم کے سیاسی ارشادات کے علاوہ ان کی باتیں بڑی پیاری ہوتی تھیں۔ پہلی مرتبہ جب مجھے حکم ملا کہ علی گڑھ جاؤں اور وہاں پر طلبہ سے خطاب کروں۔ میں نے عرض کیا۔ ”جہاں بھی آپ جانے کا حکم دیں گے جاؤں گا۔ لیکن علی گڑھ ہرگز نہ جاؤں گا۔ پوچھا اس کی کیا وجہ۔ جو ابا عرض کیا۔ ”سنئے ہیں وہاں پر طلبہ ہر کسی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میری اردو کیسی ہے۔ میرا بھی وہ حرور مذاق اڑائیں گے۔“ خوب ہنسے۔ اور فرمایا۔ ”میری اردو اور تمہاری اردو ایسی ہے جو ہندوستان کے ہر گوشہ کے لوگ سمجھ سکتے ہیں اس کی فکر نہ کرو۔“ بالاسن میں علی گڑھ گیا۔ بہت پسند آیا۔ اس کے بعد علی گڑھ کو مجھ سے اور مجھ کو علی گڑھ سے عشق ہو گیا۔ اور اتنی مرتبہ وہاں گیا کہ بعض لوگ اب تک یہ خیال کرتے ہیں کہ میری تعظیم علی گڑھ میں ہوئی ہے۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ ۴۴ء میں صدر دفتر دیا گنج دہلی میں شعبہ اطلاعات وہ بلسٹی کھولا قائدِ اعظم نے یہ شعبہ میرے حوالے کیا۔ قائد جب کسی پر ذمہ داری عائد فرماتے تو تفصیل کے بارے میں کچھ نہیں کہتے تھے۔ صرف یہ حکم ملتا تھا کہ یہ کام اب تمہیں کو سہرا انجام دینا ہے۔ میں نے شعبے کو تین اداروں میں تقسیم کیا۔ انگریزی

سیکشن جس کے انچارج نور العارفین تھے۔ جو سندھ ہائی کورٹ کے بعد میں جج بنے اور جنہوں نے حال ہی میں کراچی کے ایک حلقہ انتخاب سے مرکزی اسمبلی کی ایک نشست ہائی پٹی کے ٹکٹ پر جیت لی ہے۔ اردو سیکشن کے انچارج سمر کرمانی تھے، جنہوں نے قیام پاکستان کے بعد سندھ گورنمنٹ کے پبلسٹی کے محکمہ میں اعلیٰ عہدہ حاصل کیا۔ اور چند دنوں بعد فوت ہو گئے۔ مولانا ظفر احمد انصاری حال ایم۔ این اے محکمہ اسلامیات کے انچارج تھے۔ لیگ کا یہ شعبہ اتنا موثر ثابت ہوا کہ آل انڈیا کانگریس نے بھی نئی دہلی ہوٹل امپریل میں شعبہ اطلاعات قائم کر دیا۔ اور نامور کانگریسی خواتین کا دن بھر وہاں بجوم رہتا تھا۔ ایک شام قائدِ اعظم کی رہائش گاہ پر پہنچا میں تقریباً ہر شام کو جب بھی قائدِ اعظم وہاں تشریف فرما ہوتے تھے پہنچ جاتا تھا۔ عرض کیا۔ ”حضور میرے پاس دفتر میں ہمارے بڑے میاں یعنی مستقل آفس سکرٹری سید شمس الحسن ہیں اور دوسری طرف کانگریس کا دفتر دیولوں سے بھرا رہتا ہے۔ میں کیا کروں؟“ خوب ہنسے اور فرمایا۔ ”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری پبلسٹی ضرور موثر ثابت ہو رہی ہے جب ہی تو ایسے ہتھیار تمہارے خلاف استعمال کرنے شروع کر دیئے گئے ہیں“ میں نے بھی مزاحاً عرض کیا کہ ”اگر اجازت ہو۔ میں بھی کبھی ان کے دفتر جاؤں اور ان کے طریقہ کار سے واقفیت حاصل کروں۔“ ہنس کر فرمایا ”ضرور ضرور۔ ہو سکتا ہے تم انہیں اپنا ہم خیال بنا سکو“ ادارہ ماونو سے عرض ہے کہ میں کہاں تک کھتا رہوں۔ زندگی کے باقی ایام اگر میں اپنے محبوب قائدِ اعظم کے بارے میں کھتا ہی رہوں تب بھی یہ کام سہرا انجام نہ پاسکے گا۔ کاش میرے پاس وقت اور وسائل ہوتے کہ گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر یہ کام کر سکتا۔ چلنے فی الحال اتنے ہی پر پیر کہنہ اور ماونو کو اکتفا کرتے ہیں یہ

ڈاکٹر محمد اقبال کا ایک نایاب خطبہ

ایم حنیف شاہد

انجمن جمہلیت اسلام لاہور کے بیالیسویں سالانہ جلسے کا ۱۶ اپریل ۱۹۷۷ء بروز شنبہ کا چوتھا اجلاس جناب صلاح الدین خدا بخش صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ سی۔ ایل بیرسٹریٹ لاء کلکتہ کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں علامہ سر شیخ محمد اقبالؒ نے بھی شرکت فرمائی۔ آپ نے دو دی اسپرٹ آف مسلم کلچر (THE SPIRIT OF MUSLIM CULTURE) یعنی ”روح تہذیب اسلامی“ کے موضوع پر انگریزی زبان میں بے نظیر فاضلانہ و فلسفیانہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ ڈیڑھ گھنٹہ تک اس خطبہ کا صرف ابتدائی حصہ ختم ہو سکا۔ علامہ مملوح نے حیرت انگیز نکات پریدہ کئے اور انتہائی کوشش کی کہ ہر انگریزی دان انہیں سمجھ سکے۔ آخر میں حاضرین کے بے حد اصرار پر آپ نے اردو زبان میں خطبہ کا خلاصہ ارشاد فرمایا جو ہدیہ قارئین ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

لوہر انسان کے دل میں مشاہدہ حقیقت کی ہوس ہے
وہ چاہتا ہے کہ اسے نظام عالم سے آگاہی حاصل ہو
زمان و مکان کی لہ سمجھ میں آجائے جو حقیقت کائنات
کے اندر پوشیدہ ہے۔ اس کے مشاہدہ اور نظام
کا موقع مل جائے ساری قومیں اس مشاہدہ کے لئے
ہمیشہ بے تابی کا اظہار کرتی رہی ہیں۔ یہودیوں نے



حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ”لن نقاب من
لا حق فیہ الا اللہ جہنم“ (تہ اس وقت تک
ایمان نہیں لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو ظاہر
اور کھلے طور پر نہ دیکھ لیں) خود حضرت موسیٰ ”رب
ارنی“ فرماتے رہے۔

میں نے لکھا ہے کہ
خرد گفت او بچشم اندر گنج
نکاح شوق و امید و بیم است

نیکرود کہن انسانہ طور
کہ در بدل تمنائے کیم است
مشاہدہ حقیقت کے حصول کے دو طریق ہیں :

(۱) سمع و بصر اور (۲) قلوب یا اصطلاح ”قرآن حکیم“ اقتداء
یہ ضروری ہے کہ ان دو طریقوں سے بقدر ضرورت کام لیا جائے
یورپ نے اپنی ساری کوششیں صرف ”سمع و بصر“ تک محدود
کر دیں اور ”افتدہ“ کو ترک کر دیا۔ مسلمانوں نے اپنی توجہات
”افتدہ“ پر مرکوز کر دیں اور ”سمع و بصر“ سے پورا کام نہ لیا بلکہ ساری
ایشیائی تہذیب کا خاصہ یہی ہے کہ اس میں ”افتدہ“ پر بہت زور دیا گیا
ہے اور ”سمع و بصر“ کا بالکل پرواہ نہیں کی گئی حالانکہ ضرورت دونوں
طریقوں سے کام لینے کی ہے۔

نظام عالم کی آفرینش کو یوں سمجھو کہ حقیقت نے اپنی نمود یا اپنے
آپ کو واضح کرنے کے لئے ایک نقطہ خاص سے سفر کیا یا اصطلاح
صوفیانہ ”حس“ نے نظارے کے شوق میں اپنے آپ کو آشکارا
کر دیا۔ اس خط سفر کا آخری نقطہ عالم ظاہر ہے۔ اب حقیقت تک
پہنچنے کا راستہ یہ ہے کہ اس آخری نقطہ سے الٹ سفر کیا جائے۔

سے قرآن مجید چلا پارہ سورہ البقرہ آیت ۵۵ درمذہب
نہ علامہ رشید محمد اقبال پیام سترق و لالہ طور ۱ صفحہ ۳۰ (۱۰ تب)

مشاہدے کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ انسان اس میں
اپنے آپ کو فنا کر دے۔ اسلام جس مشاہدے کا مکتب ہے وہ اپنے
آپ کو قائم رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ یعنی اسلام کا مشاہدہ مردانگی پر مبنی
ہے۔ ایک شاعر نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی
نعت میں یہ نکتہ بڑے اچھے طریق پر واضح کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ
نعت میں اس سے بہتر شعر نہیں لکھا گیا ہے

موسیٰ زبوش رننت بہ یک جلوہ صفات
تو عین ذات فی نگر می در تبستے

یہ اسلامی آئیڈیل ہے۔ اسلامی نقطہ خیال سے معراج یہی
ہے کہ مشاہدہ ذات کے بعد بھی عبودیت قائم رہے لیکن سرکشی اور
مرد کے لئے نہیں بلکہ خدمت و عبودیت کے لئے۔ مسلم کو کسی چیز
میں فنا نہ ہونا چاہیئے۔ گو یہ فنا فی اللہ ہی کیوں نہ ہو۔ علامہ محمد رفیع
نے اپنے خطبہ میں جو نکات بیان فرمائے ان میں سے چند حسب
ذیل ہیں :

(۱) آنحضرت ختم الرسل ہیں

نبی اس لئے بھیجے گئے کہ وہ لوگوں کو جن کی سمجھ ابتدائی حالت
میں تھی سمجھائیں۔ عین اس وقت جب دنیا میں غور و فکر کا زور شور
شروع ہوا اور لوگ تقلید سے نہیں بلکہ اپنے فہم و ادراک کی مدد
سے نتائج اخذ کرنے لگے تو یا تقلید جامد کی جگہ افق عالم پر علم و
ادراک کا آفتاب طلوع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے
آخری جتہ کو ارسال کر دیا اور کہہ دیا کہ اب کوئی ایسا شخص نہیں
آ سکتا جس کی باتوں کو تم تقلید کے بغیر تسلیم کر لو۔ شہنشاہیت اور
نبوت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور دماغی غلامی پر موت چٹائی۔ عقل کے
عروج کی ابتداء روزِ سعید ہے جب ختم رسل مبعوث ہوئے
اب اگر کوئی شخص نبوت کا مدعی ہو تو ہم اس کی دماغی حالت کا
اسی طرح مطالعہ کریں گے جس طرح علم الحیات کا ماہر کسی مینڈک

کے اجزاء کا مطالعہ کرنا ہے اور کیڑے کے وجود پر غور و فکر کی نگاہ ڈالتا ہے۔

(۷) یورپ کی ترقی اس سے شروع ہوئی کہ اہل مغرب نے فلاسفہ یونان کے فلسفے کے خلاف جو تقویم پارینہ ہو چکا تھا علم جہاد بلند کیا۔ بیکن نے اسنقراطی منطق پر زور دیا۔ مونٹگانی کے بجائے مشاہدات و تجربات حصول علم کا ذریعہ قرار دیئے گئے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اسنقراطی منطق کا مسجد اور مدون اولیٰ یعقوب کنہی "ہے بیکن نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ بیکن نے جو عربی پڑھا ہوا تھا اندلس کے عرب منطقوں کی تصنیفات سے حظ وافر حاصل کیا اور ان کے خیالات کا ترجمہ کیا۔

(۸) ہندی حکماء اور یونانی طلبہ کے نزدیک یہ دنیا ایک مکمل نظام کی شان رکھتی ہے مگر امام غزالی اور امام ابن تیمیہ جیسے اکابر اسلام نے اس واہمہ کی دھجیاں بکھر کر رکھ دیں۔ انہوں نے قرآن کریم

کی آیات بینات سے منہ تر ہو کر دنیا کی عدم تکمیل کا دعوے کیا اور ثابت کیا کہ دنیا ابھی منازل ارتقا طے کر رہی ہے۔

(۹) فلسفہ یونان کے خلاف جہاد کرنے کا ڈھنگ۔ یورپ کے ارباب فکر نے مسلمان حکماء سے سیکھا۔ امام غزالی نے فلسفہ یونان کے پرچے اڑا دیئے۔ ابن رشد نے فلسفے کی تباہی دریدہ کو رفو کرنا چاہا مگر وہ اس مقصد میں ناکام رہا۔

(۱۰) ذوالنون مصری بہت بڑے صوفی ہی نہیں تھے بلکہ اعلیٰ درجہ کے کیمیا دان بھی تھے۔ چنانچہ وہ حکیم جس نے سب سے پہلے یہ دریافت کیا کہ پانی جو ہر بیض نہیں بلکہ ایک مرکب شے ہے آپ ہی ہیں۔ (۱۱) اٹنی کے مشہور شاعر دو دانے نے اپنی شہرہ آفاق نظم میں مہشت بریں کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ تمام و کمال محی الدین ابن عربی کی "فتوحات مکیہ" سے ماخوذ ہے۔ اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے یورپ کے فلسفہ ہی پر نہیں بلکہ ادب پر بھی زبردست اثر ڈالا۔



حضرت امیر خسرو دہلوی

سید عبد القدوس ہاشمی

- (۱) دیباچہ دیوان غزوة الکمال، مختصر سادہ بیباچہ ہے فارسی نثر میں جو خود اپنے دیوان غزوة الکمال پر لکھا تھا۔
- (۲) آمینہ سکندری۔ فارسی نظم (مثنوی)
- (۳) تاج الفتوح
- (۴) تغلق نامہ
- (۵) خزانہ الفتوح
- (۶) دیوانی و خضر خان
- (۷) شیرین خسرو
- (۸) قرآن السعدین
- (۹) مجنون و بیلی
- (۱۰) نہ سپہر
- (۱۱) مطلع الانوار

ایک برگزیدہ اور باکمال شاعر، ایک ماہر موسیقی، ایک عظیم المہبت صوفی اور ایک بہترین نثر نگار ولادت بمقام پٹیالی ضلع ایٹھ سو، یوپی (ہندوستان) ۱۳۳۷ھ ہجری مطابق ۱۲۷۳ء عیسوی وفات بمقام دہلی (دارالسلطنت ہندوستان) ۱۷ ذی قعدہ ۷۷۳ھ ہجری مطابق ۱۲۷۵ء اکتوبر ۱۲۷۵ء مزار پر انوار، درگاہ نظام الدین اولیا، بستی نظام الدین ملحق بہ دہلی۔

امیر خسرو دہلوی نے ہندوستان کے پانچ مسلمان بادشاہوں کے دور دیکھے، اور ان میں سے بعض کی ملازمت میں بھی رہے۔ تقریباً ایک لاکھ اشعار کہے، اگر ان کی ہر مثنوی کو ایک تصنیف قرار دیا جائے تو ۹۹ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان سب ذیل کتابیں اب بھی موجود ہیں۔

(۱) اعجاز خسروی، فارسی نثر، دو ضخیم جلدوں میں ہے اور اس زمانہ کے انداز فارسی نویسی کا بہترین نمونہ ہے۔

ماہر بلکہ مجتہد تھے۔ اس حد تک کہ بعض راگ ورانگان انہوں نے جدید پیدا کیں۔ طنزہ میں کچھ تاروں اور پردوں کو بدل کر ایک نیا ساز بنا دیا۔ دوسرے یہ کہ وہ باوجود درباری ہونے اور شہر و موسیقی کے دلدادہ ہونے کے ایک صاحب عرفان بزرگ اور ایک دانشمند صوفی بھی تھے۔ اپنے پیرومرشد حضرت نظام الدین اویان دہلوی المتوفی سنہ ۷۸۵ (شیخ محمد نظام الدین بدایونی) کے مخلص مرید اور جان نثار پیروکار تھے۔ ان کے شیخ کی وفات امیر خسرو کی وفات سے چھ مہینے پہلے ہوئی ہے۔

فارسی شاعری میں امیر خسرو کا یہ درجہ ہے کہ انہیں بجا طور پر طوطی جند کہا جاتا ہے۔ شمس الدین حافظ شیرازی نے امیر خسرو کی وفات کے تقریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد غیاث الدین اعظم شاہ (سارگادون۔ بنگال) کو ایک غزل لکھ کر بھیجی تھی، اس میں یہ شعر ہے

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

اس میں حافظ نے امیر خسرو کے کلام کی بے پناہ مقبولیت دیکھ کر شاعرانہ تعریف کی ہے۔ بات یہ ہوتی کہ جب خواجہ حافظ شیرازی نے دیکھا تو یہ دیکھا کہ فارسی جاننے والوں کی ساری دنیا امیر خسرو کے اشعار سے گونج رہی ہے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر حافظ کے دل میں جو جذبات پیدا ہوئے ہوں گے ان کا شاعرانہ اظہار اسی صورت میں ہو سکتا تھا۔ لیکن حق یہ ہے کہ خسرو کی غزلیات اس درجہ کی اور اس قدر اعلیٰ معیار نغزل کی حامل ہیں کہ خواجہ حافظ ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر غزل گو شاعر کو ان پر رشک آ سکتا ہے۔ بھلا ان اشعار کے کہنے والے پر کس صاحب ذوق کو رشک نہیں آئے گا۔

من عاشق شوره سرا کہ فرو ایمان بے خبر
دیم شدہ مہر کسے ایمان من روئے کے

آمد سجود ز اہوان اندر حریم کعبہ
شد سجدہ گاہ عاشقان محراب اہرے کے

(۱۳) ہشت بہشت فارسی نظم (مثنوی)

(۱۴) اشک و آہ ” ”

(۱۵) مثنوی عشقیہ ” ”

(۱۶) مثنوی در تعریف دہلی ” ”

(۱۷) کلیات عناصر غزلیات کے چار دیوانوں (تحفۃ الصغر)۔
وسط الحلیۃ، غزۃ الکمال، اور بقیۃ نقیۃ کا مجموعہ امیر خسرو نے اپنی فارسی غزلیات کو شاعری کی عمر کے بموجب چار حصوں میں منقسم کر دیا تھا۔ پہلے کلام تحفۃ الصغر کے نام سے ایک جلد کر دیا۔ وسطی دور کا کلام وسط الحلیۃ کے نام سے۔ پختہ دور کی غزلیات کا نام غزۃ الکمال رکھا، اور اس کے بعد جو کچھ کہا اسے بقیۃ نقیۃ کا نام دیا۔

کہا جاتا ہے کہ خود امیر خسرو ہی نے اپنے ان چاروں دیوان کا انتخاب بھی نیا کر دیا تھا، اور مطبوعہ نو لکھنؤ پریس کا جو انتخاب ہمیں آج ملتا ہے وہ خود امیر خسرو ہی کا تیار کیا ہوا ہے۔

امیر خسرو کے زمانہ میں دہلی اور اس کے گرد و نواح میں جو بولی رائج تھی وہ اردو زبان کی ایک قدیم شکل ہی تھی لیکن اسے کھڑی بولی کہا جاتا تھا۔ امیر خسرو نے اس بولی میں بھی بطور تفنن طبع کچھ پیدیاں کچھ لکھ کر نیاں اور کچھ اشعار کہے ہیں جو بہت دلچسپ اور بہت مقبول ہیں۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس قسم کی وہ تمام چیزیں جو امیر خسرو کی طرف منسوب ہیں وہ سب کی سب امیر خسرو دہلوی کی ہیں بلکہ ان میں سے بہت ماحفہ دوسروں کا کلام ہے جو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ بنتا اور بدلتا رہا ہے اور خالق باری (مصنف ضیاء الدین خسرو) کی طرح امیر خسرو کے نام سے منسوب ہو گیا ہے، لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ حقیقت ان کا حضرت امیر خسرو کا کہا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

فارسی ادب اور شاعری میں مرتبہ کمال پر فائز ہونے اور طوطی جند کہلانے کے ساتھ ساتھ امیر خسرو دو اور خصوصیات کے بھی حامل ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ہندوستانی موسیقی کے بہت ہی باکمال

پری پیکر نگار سے سرو بالا لالہ خدادے

مرا پاگنت دل بود شب جائیکہ من بودم

منم خود بین۔ رقیبان گوش بر آواز من جبران

معنی گفتن چہ مشکل بود شب جائیکہ من بودم

امیر خسرو کی پُرگوئی اور: در الکلامی کا کمال اگرچہ ان کی شہابیوں

میں پوری طرح جلوہ گر ہے لیکن ان کے تخیل کی بلندی اور زبان و بیان پر

قدرت کے جس قدر عمدہ نمونے ان کی غزلیات میں دکھائی دیتے ہیں کسی

اور جگہ نہیں دکھائی دیتے۔ شاعرانہ صنایع مثلاً ترصیع، براعتہ، لطف و

نثر بھی بہ کثرت ان کی غزلیات میں موجود ہیں۔

امیر خسرو کی نثر نویسی میں اُس زمانہ کے مذاق کے بموجب بیانیہ

لفظی اور معنوی باریع سے بہت ماہیا گیا ہے اور عام پڑھنے والے کو

اس سے پوری طرح استفادہ مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن اس میں اخلاق

کا جیب نہیں ہے۔ یہ اُس زمانہ کی صفت نثر نویسی کے بموجب بہت اعلیٰ درجہ

کی نثریں ہیں، اگرچہ آج ہمارے لئے بہت نامانوس ہیں۔

امیر خسرو کا نام ابوالحسن محمد بن امیر سیف الدین محمود لاچین ہے۔

لاچین ترک تباری قبائل میں سے ایک چھوٹا سا قبیلہ ہے جس کا اصلی اور

قدیم وطن روسی ترکستان میں تھا۔ لیکن ان کے بزرگ بلخ سے ہندوستان

میں آئے تھے اور فوجی خدمات کے صلہ میں بڑی بڑی جائیدادیں ملے ملک

بن گئے تھے۔ ان کے والد کو پیشانی ضلع ایٹہ (موجودہ یوپی۔ ہندوستان)

میں ایک بڑی جائیداد حاصل تھی اور یہ وہیں رہتے تھے۔ امیر کا لفظ ان کے

خاندان میں اصلی وطن سے بمعنی سرواڑ چلا آ رہا تھا۔ امیر خسرو کی والدہ ماجدہ

نواب عباد الدولہ محمد الملک دہلی دربار کے مشہور و معروف درباری

اور فوجی عہدہ دار کی صاحبزادی تھیں۔

امیر خسرو کی ولادت پیشانی میں ہوئی۔ یہاں سے قریب ہی وہ

مقام واقع ہے جہاں ہندوستان کی مشہور رزمیہ منظوم داستان مہابھارت

کی ہیروئن اور علت العلل رانی دروپدی پیدا ہوئی تھیں اور آج تک

ان کی یاد میں وہاں سالانہ میلہ لگتا ہے اور تیرتھ ہوا کرتا ہے تاریخ ولادت

کے سلسلہ میں صرف سال معلوم ہے اور اس میں بھی تذکرہ نویسوں کا اختلاف

ہے کہیں ۱۲۵۳ھ لکھا ہے اور کہیں ۱۲۶۶ھ۔ میرے خیال میں ۱۲۶۶ھ صحیح ہے۔

بہر حال تاریخ ولادت میں اختلافات قابل اعتناء نہیں ہوتا۔ آدمی

اپنے کارناموں اور اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے قابل یاد اپنی وفات کے

وقت ہو جاتا ہے۔ پیدائش کے وقت انسان کی عظمت کہاں نمایاں ہوتی ہے

اور کون جانتا ہے کہ یہ بچہ کیا بنے والا ہے۔

امیر خسرو نے ابتدائی تعلیم مقامی اساتذہ سے حاصل کی۔ آٹھ سال کے

ہوئے تو والد بزرگوار کا سایہ مرے اٹھ گیا۔ یتیم ہونے کے بعد امیر خسرو

دہلی میں رہنے لگے اور اپنے نانا محمد الملک کے زیر سایہ تعلیم و تربیت حاصل

کرتے رہے۔ فارسی ادبیات میں تو کمال حاصل ہی کیا کہ اس وقت کمال کا

یہی معیار دہلی میں تھا۔ عام زبان دہلی کی کھڑی بولی یا قدیم اردو تھی۔ اس

میں بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کرتے رہے۔ آدمی بڑے ذہین۔ دین دار اور

بدرست فہم بات میں بات پیدا کرتے اور اردو فارسی کے مرکب مصرعے

بھی کہا کرتے تھے۔

جوان ہو کر دہلی کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ مشہور حشّی بزرگ

نظام الدین اولیاء خلیفہ محضرت فرید شکر گنج کے مرید ہوئے اور ان

سے بڑی محبت کرنے لگے۔ بزرگ مرشد بھی اپنے اس مرید سے بہت

محبت کرتے تھے۔ ان میں موسیقی کا ذوق اور پھر اس فن میں ان کا

کمال حضرت نظام الدین کی محفل ہائے سماع کا رہیں محنت ہے۔

امیر خسرو جب کسی بادشاہ کے ساتھ سفر میں نہ ہوتے بلکہ دہلی میں

قیام پذیر ہوتے تو اپنے مرشد کو کبھی ستار و ساز پر اور کبھی بغیر ساز و ستار

کے صوفیانہ و عاشقانہ غزلیں سنایا کرتے تھے۔ شاعر اور موسیقار کی حیثیت

سے ان کی شہرت ان کی زندگی ہی میں دور دور پہنچ چکی تھی۔

۱۷۰۵ء فروری ۱۷۰۵ء کو اپنے مرشد نظام الدین اولیاء کی وفات

کے چھ ماہ کے بعد سلطان محمد تغلق کے دور میں مقام دہلی وفات پائی اور

مرشد کی قبر کے قریب ہی دفن کئے گئے۔ دہلی والے ہر سال ان کا عرس

کیا کرتے ہیں۔

امیر خسرو۔ آب حیات کے قلمی مسودے میں

آغا سلمان باقر

لگائی ہیں۔ وہ طلباء کے امتحانی پرچوں کے صفحات ہیں، وہ ایک طرف سے خالی تھے اس لئے مولانا نے انہیں بلا تکلف استعمال فرمایا۔

مسودے پر صفحات کے اندراج جامعی روشنائی سے کئے گئے ہیں اور اُس کا پہلا صفحہ مسودے میں نمبر ۲ اور آخری صفحہ مسودے پر نمبر ۵ ہے ان کے علاوہ پانچ صفحات بعد میں شامل کئے گئے ہیں، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

”قلم مسودے میں بعض الفاظ کو نمایاں لکھنے کے لئے بھی جامعی روشنائی کا استعمال کیا گیا۔ ہے جس سے مسودے کا حسن بڑھ جاتا ہے۔

ایک بات اور قابل بیان اس مسودے میں نظر آئی کہ مولانا نے بعض واقعات کے حاشیے پر یا اُن کے بیان کے اختتام پر ”صحیح البیاض“ کے الفاظ یا ”ص“ تحریر کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آب حیات کی تصنیف کے وقت مولانا آزاد کے پاس کوئی بیاض تھی۔ اور آب حیات مکمل ہونے کے بعد مولانا نے بہ نظر احتیاط مسودے کا دوبارہ جائزہ لیا اور واقعات و حالات کو بیاض کے مطابق کرنے کے بعد ”صحیح البیاض“ کی عبارت لکھی۔ لیکن میں نے آزاد کے کاغذات میں ایسی کوئی بیاض نہیں دیکھی اور کسی اہل علم سے بھی ایسا کوئی تذکرہ نہیں سنا۔

امیر خسرو دہلوی کا ذکر مولانا آزاد نے اپنی ایک تصنیف ”نگارستانِ فارس“

۱۱۱ امیر خسرو کے حالات ہیں جو شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد

لے ”آب حیات“ کے مسودے میں اپنے ہاتھ سے تحریر فرمائے ہیں مسودے کا یہ حصہ چار صفحات پر مشتمل ہے مولانا نے اس کی نگارش میں واسطی قلم استعمال کیا ہے سہ خیاں جامعی روشنائی سے تحریر فرمائی ہیں۔ شروع سے آخر تک تحریر کا انداز ایک سا نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آزاد نے مختصر ذکر کیا، بعد میں مواد مل جانے کے بعد دوسرے بار ایک قلم سے اضافہ کیا اور بہت سے اضافے نظر ثانی کے دھوا ہوئے۔ اس دوران میں جن صفحات کا اضافہ ہوا، اُن کو ”م“ اور ”م“ میں متن میں شامل کیا۔ جس میں آئینہ کی پھیلی سے لے کر عورتوں کے گیت تک شامل ہیں اس کے بعد ایک اور صفحہ بھی ہے، جو ایک الگ کاغذ پر ہے اس کا سائز ۸×۶ ہے یہ تحریر متواتر ایک ہی قلم سے لکھی گئی ہے۔ جا بجا نظر ثانی کے بعد املنے بھی موجود ہیں۔ یہ باریک قلم سے بین السطور میں کئے گئے ہیں بعض جگہ مولانا نے پہلی تحریر پر ایک الگ کاغذ چپکا کر اُس پر دوبارہ وہی مضمون کچھ الفاظ دل بدل کر تحریر فرمایا ہے۔ جن نے بہت کوشش کے بعد اُس جپے کے نیچے کی تحریریں پڑھی ہیں۔

جس کاغذ پر مولانا آزاد نے آب حیات کا مسودہ تحریر کیا ہے اس کی لمبائی چوڑائی ۸×۶ ہے اور کاغذ کے جن پرندوں پر مولانا نے لکھ کر جپے

جسے موزونیت کہتے ہیں (اور) دوسرے مضمون میں کچھ ایسا لطف پیدا ہو جاتا ہے کہ سب پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ تیسرے کلام میں زور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ چوتھے تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خوش یا غم یا کسی قسم کا، کے ذوق شوق کا خیال انسان کے دل میں جوش مازنا ہے اور وہ قوت (تقریر) بیان سے نکھر کھاتا ہے تو زبان سے خود بخود موزوں کلام نکلتا ہے اور یہ اسطر ہے جیسے پتھر اور لوہے سے آگ نکلتی ہے۔

جس طرح کوئی زمین اپنی قابلیت کے بموجب، موافق کچھ نیک چھروید کے بکھر، تبیں رہ سکتی۔ اس طرح کوئی زبان اپنے اہل زبان کی حیثیت بموجب نظم سے ڈالی نہیں رہ سکتی۔ ہر روئیدگی کی رنگینی اور شادابی اپنی سرزمین کی خاصیت (دکھائی)

۱۔ مولانا نے مذکور کے نم البدل کے طور پر دوسرے "تقریر فرمایا ہے۔

۲۔ مسودے میں مولانا نے کچھ کے نقاط رہ گئے ہیں

۳۔ مسودے میں مولانا نے "میں" کے نقاط رہ گئے ہیں۔

۴۔ مولانا نے "م" کا نشان دے کر متن میں اضافہ کیا ہے، جو مسودے کے صفحہ پر دائیں جانب لیا گیا ہے، جو نظر ثانی کے بعد مولانا نے قلم زد کر لیا عبارت ہے "اور مضمون میں ایسی تیزی پیدا ہو جاتی ہے کہ اثر کا نقشہ دل پر جا کر کہکتا ہے۔"

۵۔ "کا" قلم زد کر دیا اور اس کی بجائے "کے" تحریر کیا ہے۔

۶۔ مولانا نے باریک قلم سے یہ اضافہ کیا ہے "جو کا خیال" ہے۔

۷۔ نظر ثانی کے دوران مولانا نے باریک قلم سے اضافہ کیا۔

۸۔ مولانا نے "تقریر" قلم زد کر کے "بیان" اصلاح کی۔

۹۔ مولانا نے نظر ثانی میں باریک قلم سے اضافہ کیا۔

۱۰۔ مولانا نے نظر ثانی کے دوران "اور یہ اس طرح ہے" اضافہ کیا۔

۱۱۔ یہ نام پیرا گراف مولانا نے قلم زد کر دیا ہے جس میں یہ حرف اسلئے ہو رہا نقل کر دیا ہے تاکہ طالب علم ان کے انداز تحریر کو باسانی سمجھ سکیں۔ نیز یہ عبارت "اب حیات"

(مطبوعہ) میں شامل نہیں ہوئی۔

۱۲۔ مولانا نے قلم زد کر کے "موافق" اصلاح کی۔

۱۳۔ نظر ثانی کے دوران مولانا نے قلم سے کیا گیا اضافہ ہے۔

۱۴۔ مولانا نے "دکھائی" کی بجائے "ظاہر کرتی" اصلاح کی۔

میں بھی کہ ہے، اور اب حیات کے واقعات، وحالات کا اثر اس میں نمایاں ہے۔ میں نے اب حیات کے مسودے "امیر خسرو" بحال اسی "رسم الخط" میں نقل کیا ہے، جس میں مولانا آزاد نے تحریر کیا ہے اس سے بہت سلیم سانیات شکلات حل ہو گئیں مثلاً مولانا نے اپنے قلم سے عاری کھا جلا کر فقط اب حیات مطبوعہ میں "دس" کھانے کا تلفظ تردیقاً ایک سا ہے لیکن "جاریسی" یعنی "شرم س" اصل مفہوم ہے، جس سے پہلے کو چار چاند لگ جاتے ہیں اس طرح ایک اور لفظ "جمولی" ہے اس سے دو مفہوم اخذ کئے گئے ہیں یعنی "نبولی" اور دوسرے نیم کا پھل "نبولی" ایسے ہی کئی پہلے کے مفہوم کو دلچسپ اور معنی خیز بناتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک اور وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں نے مولانا کی حذف شدہ یا قلم زد کردہ تمام عبارتیں اور الفاظ جو ہوتل کر دینے ہیں اور ماہرین سانیات اور دو کو دعوت دی ہے کہ وہ مولانا کے انداز تحریر کا بغور مشاہدہ کریں اس مضمون میں بہت سی ایسی عبارتیں بھی ہیں جو آج تک اب حیات میں قلم زد ہونے کے باعث شائع نہ ہو سکیں۔

میں نے اب حیات کے قلمی مسودے کو پیش نظر رکھ کر اس مضمون کو مرتب کیا ہے اور اول ایڈیشن اب حیات مطبوعہ ۱۸۸۰ء کو تولد کے طور پر استعمال کیا ہے اور مولانا کے قلم سے کئی ہر اصلاح، ترمیم اور کاٹ چھانٹ کو واضح کیا ہے۔ تاکہ مولانا کے خاص انداز، اسلوب اور انشاء پر داری کے کے نشیب و فراز قاری اور نقار تک پہنچ سکیں۔

نظم اردو کی تاریخ

"صنعت گاہ عالم میں نظم ایک عجیب صنعت صنایع آہنی سے ہے (۱) ایسے، دیکھ کر غل حیران ہوتی ہے کہ اول ایک مضمون کو ہم ایک سطر میں لکھتے ہیں اور پھر میں پڑھتے ہیں پھر اسی مضمون کو فقط لفظوں کے پس و پیش کے ساتھ لکھ کر دیکھتے ہیں تو اس میں اول وہ کیفیت خاص پیدا ہو جاتی ہے۔

۲۔ جامنہ دشتانی سے لکھا ہے اور مولانا نے قلم زد کیا ہے۔

۳۔ مولانا نے مسودے میں قلم زد کر دیا ہے۔

ظاہر کرتی ہے اسی طرح ایک نظم اپنی زبان کی شائستگی اور تہذیبِ علمی کے ساتھ
ژباؤں کے سلسلہ میں لطافتِ طبع کے درجہ ظاہر کرتی ہیں۔

زبانِ اردو کے ظہور پر خیال کریں اور اُس کی تعینات پر نگاہ کریں تو
اس میں نثر سے پہلے نظم نظر آئے گی۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچہ پہلے شعر کہے اور پھر تقریر کی وقت
حاصل کرے (مگر) ہاں نظم حوصلہ تھا اس نے پہلے نکل پڑا۔ نثر شائستگی
کے (بواسطے) بچہ ہیے گراں بار تھی اپنی ضرورت کے وقت ظہور کیا۔ بہر حال
نثر اردو کی تصنیف ۱۱۴۵ھ ہجری سے پہلے کوئی نظر نہیں آتی البتہ نظم کی حقیقت
زبانِ حکایتوں اور کتابی روایتوں کا خاک چھان کر یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب
برج بھاشائے اپنی وسعت و اخلاق سے عربی فارسی الفاظ کے جہاں لوگوں
جگہ دی تو طبیعتوں میں اس قدر نفوذ و زندگی نے بھی ڈال دیا۔ لیکن وہ
صد ہا سال تک دُور ہونے کے رنگ میں ظہور کرتی تھی یعنی فارسی کی بحریں اور
اور فارسی کے خیالات نہ آئے تھے سلاطین، امیر خسرو نے کہ جنگی طبیعت

۱۔ باریک قلم سے نئی سطر شروع کرنے کی ہدایت۔

۲۔ ”نظم اردو کی تاریخ“ کا پہلا صفحہ مسودے میں ختم ہو گیا۔

۳۔ مولانا نے ”مگر کو قلم زد کر کے“ ہاں ”اصلاح دی۔

۴۔ مولانا نے ”باس“ کو قلم زد کر کے ”بوجہ“ اصلاح دی۔

۵۔ نئی سطر شروع کرنے کی ہدایت۔

۶۔ قلمی مسودے میں مولانا نے ”کو“ رہ گیا ہے، البتہ اب حیات ایڈیشن اول
۱۸۸۰ء میں ”کو“ لکھا ہوا ہے۔

۷۔ قلمی مسودے ”اس“ دوسرے مولانا سے شائد سہواً لکھا گیا ہے۔

اب حیات مطبوعہ ۱۸۸۰ء میں ایک مرتبہ لکھا ہے۔

۸۔ میں نے یہاں تک مولانا کی عبارت اسلئے نقل کی تاکہ تسلسل اور مضمون کا متعلق
برقرار رہے۔ امیر خسرو کا ذکر اب حیات میں یہاں سے شروع ہوتا ہے۔

جو قلمی مسودے میں ”نظم اردو کی تاریخ“ کا دوسرا صفحہ ہے۔

۹۔ ”البتہ“ قلمی مسودے میں لکھا ہے اور مطبوعہ میں نہیں۔

۱۰۔ ”امیر خسرو“ مولانا نے جامی وراثت سے مسودے میں نمایاں لکھا ہے

(ایجاد) اختراع میں اعلیٰ درجہ (صنعت گری) صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی
ملک سخن میں برج بھاشا کی ترکیب سے ایک طلسم خانہ انشا پر دانی کا کہولا
خالق باری جسکا اختصار آج تک بچوں کا وظیفہ ہے کئی بڑی بڑی جلد و نہیں تھیں۔
اس میں فارسی کی بحر و نغموں نے اول اثر کیا ہے۔ اور اُس سے ہم بھی معلوم ہوتا ہے
کہ اس وقت کون کون سے الفاظ مستقل تھے جو اب متروک ہیں۔ اس کے علاوہ
بہت سی پھیلاں۔ عجیب و غریب لطافتوں سے ادائی ہیں جن سے معلوم
ہوتا ہے کہ فارسی کے ملک نے ہندی کے ذائقے میں کیا لطف پیدا کیا ہے۔
”مکمل“۔ اعلیٰ دو سخن و غیرہ خاص ان کے اُئینہ کا جوہر چنانچہ ہر ایک کی مثال یہاں
لکھی جاتی ہے۔ کیونکہ ان سے اس وقت کی زبان کا کچھ کچھ پتا لگتا ہے۔

نہلی کیلئے تردد سے ایک قریا اتوی اسے بہت بچایا۔

باپ کا اسکے نام چلو چہا اُدا نام بتایا

پیشی ادا نام پتا پر پیارا بوجہ پیہی موری

امیر خسرو یوں کہیں اپنے نام نہولی لکھا

۱۱۔ مولانا نے مسودے میں ”ایجاد و اختراع“ سے پہلے مکمل لکھا، نظر ثانی کے دوران ایجاد و قلم لکھا

۱۲۔ مولانا نے مسودے میں ”صنعت گری“ لکھ کر قلم زد کر دیا اور دوبارہ

”صنعت و ایجاد“ باریک قلم سے لکھا۔

۱۳۔ مسودے میں ”بہ“ کے جگہ کا فقط مولانا سے رہ گیا۔

۱۴۔ ”انشاء پر دانی“ میں ”۶“ مولانا نے استعمال نہیں کیا۔

۱۵۔ امیر خسرو کی تصنیف سنہ۔ تعینات تا معلوم: خالق باری کے لفظ مسودے
میں جامی وراثت سے لکھے ہیں۔

۱۶۔ مسودے میں جامی وراثت سے لکھا ہے۔ نیز پنسل سے یہ بھی لکھا ہے کہ

”در میان میں چاہیے“

۱۷۔ قلمی مسودے میں ”ادا“ کے نیچے باریک قلم سے نظر ثانی کے دوران

مولانا نے ”نیم“ لکھا ہے لیکن اب حیات پہلے ایڈیشن ۱۸۸۰ء میں اس
قسم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

۱۸۔ ”نہلی“ یہاں پر دوہرے معنی دیتا ہے۔ یعنی ”نہ بولی“ اور نیم کا

پہل ”نہلی“۔ قدیم رسم الخط میں یہیں خوبی نظر آتی ہے۔

فارسی بولی اکی نہ تھے ترکی سوچی پائی نہ
ہندی بولتے عارسی کیے منہ دیکھو حراسے بتایے
ناخ کی پیہ سیل

بیسوں کا سر کاٹ یا ناما دا نا خون کی
لال کی پھیل

اندھا گونگا بہرا بویے گونگا آپ کہا ہے
 دیکھ سفیدی ہوت انگڑا گونگے سے بھر جائے
 باتن کا مندر واہ کا باشا۔ ماشے کا وہ کچا
 سنگ لے تو سر پر رکھیں واہ کو را وراجا
 سی سی کر کے نام تجا۔ تاہ میں بیٹھا ایک
 اٹا سد باہر پھر دیکھو وہی ایک کا ایک

۱۷ یہاں پر قلمی مسودے میں نیل پینسل سے "م" کا نشان ہے جس سے معلوم ہوتا ہے آئندہ صفحہ نظر ثانی کے دور کا اضافہ ہے کیونکہ اس پر بھی حوالے کا نشان "م" موجود ہے اور دوسرے یوں بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ نظر ثانی کے دوران کیا گیا اضافہ ہے کیونکہ صفحہ یاد یک نب سے لکھا گیا ہے یاد ہے کہ حوالہ نہ گذرے محض کن کا نشان چھانٹا یاد یک نب اور اس قسم کی سیاہی سے کی ہے۔

۱۸ قلمی مسودے کے اس صفحے پر بھی گذشتہ صفحے سے پیوستہ کا نشان ہے جو نیل پینسل سے دیا گیا ہے۔

۳۷۰ "فلمی موسومہ میں آئی" لکھا ہے جبکہ اول ایڈیشن اب حیات میں
 "ایڈیشن" لکھا ہے۔

میں نے "ہندی" کا نقطہ مولانا سے رہ گیا ہے۔

۵ "عاریسی" قلمی مسودے میں لکھا ہے جبکہ مطبوعہ آبِ حیات میں "اُدسی" لکھا ہے جس سے مفہوم کا حسنِ غایت ہو جاتا ہے۔ یعنی "عاریسی" معنی "شرم" سی۔ اس انجینئر کی بے نیل میں یہی قوتی ہے۔

”ضرر ہی“ اس نینہ کی پسیل میں ہی خوی ہے۔

۳۴ نیل پنسل سے نمایاں کیا ہے۔

۱۹۷۱ء "چتر" کے بعد "سو" فلمیں مسودے میں پینسل سے کی گئی۔ اضافہ ہے، جو شاہد مولانا نے نظر ثانی کے دوران کیا۔

زمین کی ریت مکے نکال لاتے تھے۔ ان الفاظ و خیالات پر نظر کرو کیے نیچرل
میں ڈوبے ہوئے ہیں اور عورتوں اور لڑکیوں کے فطری خیالات اور دلوں
کے ارمانوں کو کیا اصلی اصلی طور سے ظاہر کرتے ہیں۔

مگر نیوں کا انہیں موجد کہنا چاہیئے۔ نمونہ اسکا یہ ہے۔

لکھ مکرئی۔ سگری رین موہے سنگ جاگا

بہور بھی تب پچھڑن لاگا

اس کے پچھڑے پہاٹ ہیا

ایسے سکھی ساجن؟ ناسکھی دیا

۱۔ سرب سلونا سب گن تیکا

وا بن سب جگر لایگے پھیکا

وا کے سر بر ہو دیے کون

ایسے سکھی ساجن؟ ناسکھی نوں

۲۔ وہ اویے تب شادی ہوئیے

اُس پن دوجا اور نہ کوئیے

میٹے لاگن و اسیکے بول

لے سکھی ساجن؟ ناسکھی ڈھول

۳۔ "مک" کے دو نقطے مولانا سے رہ گئے ہیں

۴۔ "نیچر" کو نیل پنسل کے نشان سے نمایاں کیا گیا ہے۔

۵۔ یہاں پرسوئے میں اضافی ورق کا دوسرا صفو ختم ہوتا ہے۔

۶۔ قلمی مسوئے میں، صفحے کے دائیں جانب اوپر "ص" کا نشان ہے جس کا مطلب

ہے یہ صفو بھی پہلے صفحے سے منسلک سمجھا جائے۔

۷۔ تنی سطر شروع کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

۸۔ جامن روشنائی سے نمایاں لکھا ہے قلمی مسوئے میں ایک مرتبہ "مکرئی" لکھا ہے

جبکہ اب حیات کے اول ایڈیشن میں تین مرتبہ "مکرئی" لکھا ہے۔

۹۔ مولانا نے "ہوئیے" کی "یے" کے جو دو نقطے دیئے ہیں، انہیں نظر ثانی

کے دوران پنسل سے مسوئے پر قلم زد کر دیا ہے۔

بڑی بڑی عورتوں کے گانے کے لئے دیئے گیت تھے۔ چوٹی چوٹی لڑکیوں
کو پیا۔ اور سوائی کی یاد میں اس طرح کا نامناسب تھا۔ لیکن دلیں اسنگ تو
وہ بھی رکھتی تھیں اور فصل کی بہار انہیں بھی منانی تھی۔ اُن کے لئے اور گیت
رکھے تھے۔ چنانچہ ایک لڑکی کو یا اپنی سسرال میں ہے۔ برسات کی فصل اُن
وہ جھوس ہے اور مان کی یاد میں گاتی ہے۔

امان میرے یاد کو بھوجی۔ کہ ساون آیا

لینے جھے اگر تبتائے

بیٹی تیرا باوا تو بڈھاری۔ کہ ساون آیا

لینے وہ کیونکر اُسکتا ہے

امان مرے بھائی کو بھوجی۔ کہ ساون آیا

بیٹی تیرا بھائی تو بالائی۔ کہ ساون آیا

لینے پھیکا لائتہ دو کیونکر لائے

اماں میرے ماموں کو بھوجی۔ کہ ساون آیا

لینے اسکے لئے تو وہ دونوں غدر نہیں

بیٹی تیرا ماموں تو بانکاری۔ کہ ساون آیا

بھلا وہ میری کب سنتا ہے

ذرا غور کر کے دیکھو۔ باوجود علم و فضل اور اعلیٰ درجہ خیالات

شاعرانہ کے۔ جب یہ لوگ پستی کی طرف جھکتے تھے تو ایسے تھے کہ کوئی سمجھتے تھے کہ

۱۔ مولانا نے "زخا" کو قدیم رسم الخط کے مطابق لکھا ہے۔

۲۔ "ایک" باریک قلم سے کیا گیا اضافہ ہے

۳۔ مولانا سے تحریر کے دوران "لیجائے" کے دو نقطے اور "وہ گئی ہے"

۴۔ "میرے" کے دو نقطے اور "بھائی" کی "و" قلمی مسوئے میں نہیں ہے۔

۵۔ نظر ثانی کے دوران کا اضافہ ہے

۶۔ قدیم رسم الخط کی مناسبت سے مولانا نے "دونوں" کا "ن" رد کر دیا ہے

۷۔ قلمی مسوئے میں "سنتا ہے" جبکہ اب حیات کے اول ایڈیشن میں

"سے" لکھا ہے۔

۸۔ مولانا نے "اعلیٰ" کو قدیم رسم الخط میں "اعلا" لکھا ہے۔

ایک کوئین پر چار عورتیں پانی بہہ رہی تھیں۔ امیر خسرو کو رستہ چلتے چلتے پیاس لگی۔ کوئین پر جا کر ایک سیے پانی مانگا۔ انیس سے ایک نہیں پہنچتی تھیں۔ اسنے اوروں سے کہا کہ دیکھو۔ کبوتر گئے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کیا توہ ہی کبوتر جس کے سب گیت گاتے ہیں۔ اور پہیلیاں۔ مکھنیاں۔ اٹلی سنتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ ہاں۔ اس پر ایک انیس سے بول کہ مجھے کبوتر (اٹلی) بات کہہ دیے۔ دوسری نے چرخہ کا نام لیا۔ تیسری نے ڈھول کا چرتی نے کہتے کا۔ انہوں نے کہا مجھے بہت پیاس لگی ہے۔ پہلے پانی تو پلا دو۔ وہ بولیں جب تک ہمارے (اٹلی) بات نہ کہہ لگا ہم نہ پلانیں گے۔ انہوں نے (دوراً) جھٹ کہا۔

اٹلی۔ کبیر پانی جتن سیے۔ چرخہ دیا جلا
ایسا کتا کہا گیا تو بیٹھی دھول بجسا۔ لا پانی پلائے

اسی طرح کہیں کہیں ڈھول سلا کہا کرتے تھے کہ وہ بھی انہی کا ایجاد ہے۔

قدیم رسم الخط کے مطابق مولانا "نویں" کو "کوئین" لکھا ہے۔

قلمی نسخے میں "عورتیں" لکھا ہے، جبکہ اب حیات کے پہلے ایڈیشن ۱۸۸۰ء میں بھی "عورتیں" ہی لکھا ہے، لیکن بعد میں تمام ایڈیشنوں میں "پنہاریاں" چھاپا ہوا ہے یہ تبدیلی نہ جانے کیسے واقع ہوئی۔ اسے نیل پنس سے نمایاں لکھا ہے۔

مولانا نے "کبوتر" لکھ کر گویا اس علاقے کا تلفظ واضح کیا ہے۔

سودے میں مولانا نے "اٹلی" لکھ کر قلم زد کر دیا ہے اور دونوں جگہ "بات" استعمال کیا ہے۔

قدیم رسم الخط میں "ہمارے" کو "ہامی" پڑھا جاتا تھا، لیکن کچھ کاغذات مختلف تھا۔

مولانا نے "فورا" لکھ کر قلم زد کر دیا اور اس کے متبادل "جھٹ" استعمال کیا تاکہ تحریر میں زور پیدا ہو سکے۔ جہاں جاتی روشتائی سے نمایاں لکھا ہے مولانا سے "ڈھول" کی "د" پر "ط" شاید رہ گئی ہے۔

م۔ کا آخری اضافی مصرعہ ختم ہو گیا اسلئے سودے میں جاتی سیاہی سے متوازن مصرعہ نرم مولانا نے لکھا ہے اسلئے نئی سطر شروع کرنے کی ہدایت لکھی ہے

بہادوں کی پیلی چو چو پڑی کپاسی ڈھول سلا۔

بی مہتران دال پکا ڈنگی؟ یا نگاہی سودہوں

دو سینے۔ گوشت کیوں نہ کھایا۔ ڈوم کیوں نہ گایا گلا نہ تھا

جوتا کیوں نہ پہنا۔ سنہوسہ کیوں نہ کھایا تالا نہ تھا

انار کیوں نہ چکھتا۔ وزیر کیوں نہ رکھا دانا نہ تھا

دو سینے فاریں سوداگر راجہ جی باید۔ پوسے کو کیا چاہئے دکان

اردو تشہ راجہ جی باید۔ ملاپ کو کیا چاہیے چاہ

شکار بچہ باید کرد۔ قوت مغز کو کیا چاہئے باوام

چونکہ موسیقی میں ان کی طبیعت ایک بین تھی کہ بن بجائے پڑی بجتی تھی اسلئے

دہریت کی جگہ قول و قلباً نہ قائم کر کے بہت سیے راگ ایجاد کیے کہ ان میں

سے اکثر گیت ان کے آج تک ہندوستان کے زن مرد کی زبانوں پر ہیں۔

بہار راگ اور بسنت کے میلنے انہی کی طبیعت سے رنگ پڑا ہے۔ بین

کو مختصر کر کے ستارہ جی انہی نے نکالا ہے اسلئے "ص م"

اسلئے جاتی روشتائی سے نمایاں لکھا ہے۔

"چکھتا" قدیم رسم الخط میں لکھا گیا ہے لیکن اس پر دیئے گئے دو نقشے

فاضل معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے "دار" لکھا، پھر اسے ہی درست کیا اور

"دانا" لکھا جہاں سودے میں کچھ یوں نظر آتا ہے۔ "دانا"

جاتی روشتائی سے نمایاں لکھا ہے۔ اسلئے نئی سطر شروع کرنے کی ہدایت لکھی

نمبر ۱۳ء سے یہاں تک تمام عبارت واسطی قلم اور گہری سیاہ روشتائی سے متواتر تحریر ہے۔

اسلئے ستارہ جی پوری عبارت باریک نب سے لکھی گئی جس سے اندازہ ہوتا ہے

کریر اخلاص مولانا آزاد سے نظر ثانی کے دوران کیا۔

یہاں پر "م" کا متن میں اضافہ کا نشان ہے جو ایک الگ کاغذ پر ہے مرنونا کا قند

لکیر وار کا قند x-۱ کی لمبائی چوڑائی کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متن میں یہ اضافہ، اب حیات

کی طاعت کے دوران کا ہے۔ کیونکہ اب حیات کے پہلے ایڈیشن ۱۸۸۰ء میں ایک صفحہ کتاب کے

صفحہ نمبر ۸۷ کے ساتھ "متعلقہ مصرعہ نمبر ۸۲" کے حوالے سے الگ، لکھائی چھپائی سے پیوست

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ متن کا اضافہ مولانا آزاد سے کتاب کی طاعت کے دوران کیا

اور اسے الگ چھپو کر کتاب میں شامل کیا۔

اول اول شہرت پاتی ہیں۔ بہرگم تلم ہو جاتی ہیں۔ یہ گویا بچے ہی تھے کہ مر گئے۔ بہتری تعینت ہوتی ہیں اور چہیتی ہیں مگر کوئی نہیں پوچھتا۔ یہہر بچے گویا مرے ہی ہوئے پیدا ہوئے۔ (ہیں) بعض کتابوں کی عمریں میعاد معلوم ہوتی ہیں۔ وہ مدارس سرکاری کی تعینتیں ہیں۔ کیونکہ جب تک تعلیم میں داخل ہیں۔ تب تک چہیتی ہیں اور خواہ مخواہ بکتی ہیں۔ لوگ پڑھتے ہیں۔ جب تعلیم سے خارج ہو گئیں مر گئیں۔ کوئی اُنکھ اُنکھ کر بھی نہیں دیکھتا، مدرسوں کی کتابیں جب تک درس میں داخل ہیں۔ زندہ ہیں۔ خارج ہوئیں تو مردوں سے بدرجہ

(قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است
خدا یہ نعمت نصیب کرے)

غرض اس جوش طبع اور ہنگامہ ایجاد میں ایک تازہ ایجاد اور ہوا جس میں ہمارے لئے تین تا بل لحاظ ہیں۔

اول مضامین عاشقانہ۔ یہ وہ سلسلہ اشعار کا ہمارے ہاتھ آچکے غزل کہتے ہیں۔ وہی قافیہ۔ یا ریب اور قافیہ دونوں کی پابندی۔ اس طرح اول مطلع یا کئی مطلع۔ پھر چہند شعر۔ اخیر میں مقطع اور اس میں مولانا نے "اول کو فاضل سمجھ کر قلم زد کر دیا۔

لے قوسین کی پوری عبارت قلمی مسودے میں نہیں ہے البتہ اب حیات ایڈیشن اول ۱۸۸۰ء، صفحہ اضافی ۱۱ پر موجود ہے۔ تم جانے یہ عبارت کسی طرف اب حیات کے مطبعہ ایڈیشن میں آگئی۔ آغاز قد یا قریبیرہ ازا دم جو کا خیال تھا کہ مولانا نے اب حیات اور دربار اکبری کے مسودے جب کتابت ہو رہے تھے تو وہ اس میں کچھ حصہ خود بھی کتابت کیا کرتے تھے تاکہ کام جلدوں مکمل ہو جائے۔ لیکن ہے مولانا نے یہ اضافے بذات خود کتابت کے دوران فرمائے ہوں گے۔

۱۱۔ قلمی مسودے میں عبارت یہاں تک ہے اس کے بعد اضافی صفحہ ۱۱م "تم ہو جاتا ہے۔

۱۲۔ یہ شعر نہ ہی قلمی مسودے میں ہے اور نہ ہی اب حیات کے اول ایڈیشن میں ہے البتہ بعد کے ہر ایڈیشن میں یہ شعر موجود ہے۔ یہاں تک کہ مقدمہ اب حیات مرتبہ آغاز قد یا قریبیرہ ۱۹۱۵ء میں بھی ہے۔ نہ جانے یہ شعر کہاں سے وارد ہو گیا۔ ۱۳۔ یہ سلسلے سے نمایاں کیا گیا ہے۔

آپ نے سدا یہ لونڈی کا نام بھی رہ جائے گا۔ ایسے کنی دفعہ کہا تو ایک دن چلا آگیا کہ لونڈی چوسنویں اور دن کی چوہیری باجے چوں کی اُٹھ پھری بیٹے یہر بادشاہوں سے بھی بڑی ہیں باہر کوئی آئے ناہیں اُمین سادے شہری (جنگل گئے، جنگل گنوا دوں) کا کچھ کام نہیں۔ سفید پوش اُنہیں ہیں۔

سان صوف کر کے آگے راہ گئے جس میں ناہین تو سل پیار ہنگ صاف مصطفیٰ حاضر کرتے چہر تہنگ ہو اور دن کے جہاں سینگ سمانے چوکی وہاں موسل ملے ہنگ فزنیہ کہا کرتے ہیں کہ وہ ایسی ہنگ

پیتا ہے جس سینگ کھڑی رہے۔ آپ مبالغہ کرتے ہیں کہ یہہر ایسی گہری ہنگ بناتی ہے جس میں موسل کھڑا رہے۔

غیر اُن کی بدولت جو کا بہن نام رگیا۔ حق پوچھو تو جس طرح ہر جاندار کی عمر ہے۔ اس طرح کتاب کی بھی عمر ہے مثلاً شاہنامہ کو نو سو برس ہوئے۔ سکندر نامہ کو ۷ سو برس سمجھو گلستان بوستان ساڑھے ۵ سو کو۔ زلیخا کی عمر قریب سو کے ہونی مگر اب تک جوان ہیں۔ اُردو میں باغ و بہار۔ بدرمیر وغیرہ جوان ہیں فساد عجباب جان بلب ہو گیا۔ بہت کثرت ملے مولانا نے قلم زد کر دیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے پہلے یہ عبارت کچھ لیے رکھی۔

"جنگل کے گنوا دوں کا کچھ کام نہیں۔ سفید پوش آتے ہیں۔"

لیکن بدل کر یہ عبارت یوں لکھی ہے۔

"جنگل گنوا دوں کا کام نہیں۔ سفید پوش آتے ہیں۔"

۱۴۔ یہاں پر قلمی مسودے میں مولانا نے نزلے کا نشان "۱" دیا ہے اور یہی نشان مسودے کے حاشیے پر بھی موجود ہے لیکن کوئی حوالہ یا حاشیہ نہیں ہے۔ شاید مولانا

حاشیہ لکھنا بھول گئے یا مناسب نہیں سمجھا۔

۱۵۔ یہ عبارت مولانا نے انتہائی باوریک قلم سے تحریر کی ہے۔ قیاس کہتا یہ نظر ثانی کے دوران کا اضافہ ہے۔

۱۶۔ مولانا نے پہر تہنگ سے مراد گئے تھے مولانا نے مثلاً "مسودے میں اس طرح لکھا ہے۔

تخلص (کا آئین) ۱۷

دوسرے عروص فارسی نے پہلا قدم ہندوستان میں رکھا۔ تیسرے۔
فارس اور بہاشا کو نون مرچ کی طرح اس انداز سے ملا یا ہے کہ خواہ مخواہ
زبان پر چٹخا دیتا ہے (اور) اس میں بہر بات سب سے زیادہ قابل ملاحظہ
ہے کہ انہوں نے بنیاد عشق کی عورت ہی کی طرف سے قائم (کئی) کی تھی جو کہ خاصہ
نظم ہندی کا ہے، (اور) مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس عشق کا انقلاب کس وقت
ہوا۔ غزل مذکور یہ ہے۔

(۱۷) زحل مسکین مکن تغافل ۲۰ ورلیے بنیاں بنایے بنیاں دراز
کہ ثابت ہجران مدام لے جان۔ نہ لہو کا بے لگنے چیتاں

۱۷ "کا آئین" مولانا نے قلم زد کر دیا ہے۔

۱۷ یہ پوری عبارت (حوالہ نمبر ۱۲ اور ۱۳) ایک انگ چھپی ہوئی ہے۔ مولانا نے
چپکانی ہے چھپی پر یہ سطور دو کی تعداد میں ہیں۔ اور انتہائی باریک تپ
سیاہ روشنائی سے تحریر ہیں۔ اس چھپی کے نیچے جو تحریر مشکل میں ہے
ہے وہ قلم زد ہے اور کچھ یوں ہے۔

"اول فانی کے ہاتھ مضمون عاشقانہ، اور سلسلہ اشعار کا کیا جسے غزل
کہتے ہیں دوسرے عروص"
مولانا نے اس مختصر اور غیر جامع عبارت کو دوبارہ تحریر کیا تو وہ مفضل
بن کی تحریروں ہے۔

"اول مضامین عاشقانہ ۲۰ وہ سلسلہ اشعار کا ہمارے ہاتھ آیا جسے غزل

کہتے ہیں۔ وہی تلفظ، یار دلیف اور تلافی و دروز کی پابندی۔ اس طرح اول
مطلع یا کئی مطلع۔ پہر چند شعر۔ اخیرین مقطع اور اس میں تخلص کا آئین"

۱۷ مولانا نے "دوسرے عروص" انتہائی باریک قلم سے دائیں کانسے پر کاغذ کے
لکھا ہے جس کو نیل پنسل سے نمایاں کیا ہے لکھ مولانا "تیسرے" کو نیل پنسل سے
نمایاں کیا ہے وہ مولانا نے پہلے "چٹخا" کو "۱۷" سے لکھا لیکن بعد میں اسی
"۱۷" کو "۱۷" میں تبدیل کر دیا ۱۷ مولانا نے "اور" قلم زد کر دیا اور باریک

قلم سے اصلاح "اس میں" کی ۱۷ مولانا نے پہلے "کئی" لکھا اور پھر قلم زد کر کے
"۱۷" اصلاح کی ۱۷ مولانا نے "اور" قلم زد کر دیا اور ایک باریک قلم سے "مگر" اصلاح دی۔

۱۷ مولانا نے نشان جامنی روشنائی سے لکھا اور بعد میں اس روشنائی سے قلم زد کر دیا۔

۱۷ یہاں پر مسودے کا باقاعدہ صفحہ نمبر ۱۷ ختم ہوتا ہے۔

شبان ہجران دراز چون زلف و روت وصلت چو عمر کوتاہ ۱۷

سکے پایہ کو جو زمین نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیرے زیتاں
یکایک از دل دو چشم جلاو یصد فریم بہر و سکین

کسے چڑی ہے جو جانا دے پیاری ہے کون ہمارے بنیاں
جو شمع سوزان چو ذرہ حیران نہ جہان مرگشتم آخر

نہ نیند نینا نہ انگ چینا۔ نہ آب اوس۔ نہ بھیں پتیاں
بخت روز وصال دہر کہ داد مارا فریب خسرو

سبیت سکے درائے را کہوں جو جائے پاؤں پیکے کہیں

ابتداء ایسا ہوتا ہے۔ پر زمانہ جو کہ تمام مبتدیانوں کا اصلا

دینی والا ہے۔ ہر شے کو تراشیں دے کر اعلیٰ درجہ خوبی و خوش اسلوبی پر
پرستیجا لیتا ہے۔ مگر اس وقت اس طرف کے اوردے ایسے توجہ نہ کے کہ جس
سے اس طرز کا رواج جاری ہوتا۔

کمزور کا آئین موجود کہنا چاہیے۔ نمونہ نمونہ ہے۔

۱۷ "سکے پایہ کو جو زمین نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیرے زیتاں"

۱۷ "یکایک از دل دو چشم جلاو یصد فریم بہر و سکین"

۱۷ "کسے چڑی ہے جو جانا دے پیاری ہے کون ہمارے بنیاں"

۱۷ "جو شمع سوزان چو ذرہ حیران نہ جہان مرگشتم آخر"

۱۷ "نہ نیند نینا نہ انگ چینا۔ نہ آب اوس۔ نہ بھیں پتیاں"

۱۷ "بخت روز وصال دہر کہ داد مارا فریب خسرو"

۱۷ "سبیت سکے درائے را کہوں جو جائے پاؤں پیکے کہیں"

۱۷ "ابتداء ایسا ہوتا ہے۔ پر زمانہ جو کہ تمام مبتدیانوں کا اصلا"

۱۷ "دینی والا ہے۔ ہر شے کو تراشیں دے کر اعلیٰ درجہ خوبی و خوش اسلوبی پر"

۱۷ "پرستیجا لیتا ہے۔ مگر اس وقت اس طرف کے اوردے ایسے توجہ نہ کے کہ جس"

۱۷ "سے اس طرز کا رواج جاری ہوتا۔"

۱۷ "کمزور کا آئین موجود کہنا چاہیے۔ نمونہ نمونہ ہے۔"

۱۷ "۱۷ "سکے پایہ کو جو زمین نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیرے زیتاں"

۱۷ "یکایک از دل دو چشم جلاو یصد فریم بہر و سکین"

۱۷ "کسے چڑی ہے جو جانا دے پیاری ہے کون ہمارے بنیاں"

۱۷ "جو شمع سوزان چو ذرہ حیران نہ جہان مرگشتم آخر"

۱۷ "نہ نیند نینا نہ انگ چینا۔ نہ آب اوس۔ نہ بھیں پتیاں"

۱۷ "بخت روز وصال دہر کہ داد مارا فریب خسرو"

۱۷ "سبیت سکے درائے را کہوں جو جائے پاؤں پیکے کہیں"

۱۷ "ابتداء ایسا ہوتا ہے۔ پر زمانہ جو کہ تمام مبتدیانوں کا اصلا"

۱۷ "دینی والا ہے۔ ہر شے کو تراشیں دے کر اعلیٰ درجہ خوبی و خوش اسلوبی پر"

امیر خسرو و بحیثیت عظیم فنکار

مسرت رفیق

فرزند عالم فاضل بنے اور تجسس علمی سے ہر سو روشنی پھیلانے لکین ان کا یہ خواب شہ مندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ ان کے والد کی اچانک موت نے ہونہار خسرو کے سلسلہ تعلیم کو یکدم موقوف کر دیا۔ اس وقت خسرو کی عمر تقریباً آٹھ سال تھی۔ والد کی وفات حسرت آیات کے بعد ان کی نگہداشت و تربیت کی کئی ذمہ داری ان کے نانا امیر عماد الملک کے ذمہ ٹھہری جو سلطان نصیر الدین محمود کے دربار میں وزارت کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔ وہ خود بھی شعر و نغمہ و رقص و سرود کے انتہائی شائق تھے اور اپنے شوق کی تکمیل و تسکین کے لئے انہوں نے اپنے ارد گرد معروف شعراء و موسیقار اکٹھا کر رکھے تھے۔

ایسے فنکارانہ اور جملہ بخش ماحول میں پروان پالنے والے خسرو کے دل و ذہن نے بڑے گہرے اثرات قبول کئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں بچپن سے ہی موسیقی اور شاعری کا ایک خاص ذوق و شوق پیدا ہوا۔ سوائے اس ماحولی تربیت کے انہوں نے نہ شاعری میں اور نہ ہی موسیقی میں کسی کے آگے زانوئے ادب نہ کیا۔ جس زمانے میں حضرت خسرو اپنے نانا کی زیر نگہداشت تھے، عماد الملک سلطان المانشی حضرت نظام الدین اولیا کے انتہائی عقیدت مند مرید تھے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ وہ بھی سلطان المانشی کے مرید ہوئے اور ان کے حلقہ خاص میں داخل ہوئے حضرت سلطان المانشی

بزمغیر پاک و ہند کی سات سو سال تاریخ نے کسی بھی ایسے شخص کو جنم نہیں دیا جو حضرت امیر خسرو جیسی غیر معمولی ذہین اور ہمہ گیر شخصیت کا مقابلہ کر سکے۔ گو اس دوران شاعر، موسیقار، صوفیائے کرام، مصور، ماہر سانیات اور فوجی سیاست دان بھی پیدا ہوئے اور انہوں نے مختلف ادوار میں اس خطہ ارض کی تاریخ پر انتہائی گہرے اور لافانی اثرات بھی چھوڑے لیکن ان تمام حقیقتوں کے باوجود کسی ایک شخصیت کی مثال پیش کرنا قطعی ناممکن ہے جس میں وہ تمام خصوصیات یکجا ہو گئی ہوں جیسی کہ ابوالحسن بیہن الدین معروف بہ امیر خسرو میں مجتمع ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت امیر خسرو کی بے نظیر ہمدردی اور مختلف تخلیقی فنون میں حیرت انگیز مہارت اور استدلال نے ان کی شخصیت کو بال حقیقت بے مثال بنا دیا۔

ایبٹ کے نزدیک واقع چٹالی گاؤں میں ۱۲۵۳ء میں ترک باپ اور ہندوستانی ماں سے تولد ہونے والے اس فقید المثال فنکار نے انتہائی معمولی تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد امیر بیہن الدین محمود جو ایک پیشہ ور سپاہی اور ترک لاجپتی قبیلہ کے سردار تھے مغل حملہ آوروں کی تباہ کاریوں سے پناہ دینے کی خاطر ایشیا نے کوچک سے ہجرت کر کے ہندوستان میں پناہ گزین ہوئے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کا

کی توجہ خاص نے امیر خسرو کو ان کے ایام زندگی کے بعد کے دور میں روحانی ترقی کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

اپنی بہتر سالہ زندگی میں حضرت خسروؒ نے گیارہ سلطنتوں کو مرجع و زوال پذیر ہوتے دیکھا۔ یہ وہ دور تھا جب درباری ریشہ وانیوں کی وجہ سے ہر شخص سماجی اضطراب اور سیاسی ابتلا کا شکار تھا۔ لوگوں کی اس کمپرسی اور قتل عام نے امیر خسروؒ پر جنہوں نے اس دور کا بہ نظر غائر مشاہدہ کیا تھا گہرا اثر چھوڑا اور وہ مذہب و تصوف کی جانب بھٹکتے چلے گئے۔ نتیجتاً اس دور کی مادہ پرستی کے رجحانات سے وہ بقدر دل برداشتہ ہوئے کہ انہوں نے سازشوں، خوشامدیوں اور خود غرضیوں سے بھری اس دنیا سے بتدریج کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ان کے ذہن میں ان باتوں نے انتہائی مضبوط پکڑیں پکڑ لیں کہ یہ دنیا فریفتگی ہے اور زندگی کے مقاصد کو اسی صورت حاصل کیا جاسکتا ہے کہ کھانوں کے مثلاًشی پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ روحانیت کی گہرائیوں میں صرف مادی سطح سے گزر کر ہی جھانکا جاسکتا ہے۔

حضرت خسروؒ کی زندگی میں بظاہر تضاد کے متعلق سوال بھڑتا ہے۔ کیونکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک جانب صرف دنیاوی مفاد کی خاطر انہوں نے متعدد بادشاہوں اور امیروں کے درباروں میں ملازمت اختیار کی اور ان کی مدح میں صفحات کے صفحات بھر ڈالے اور دوسری جانب جب ان میں تبدیلی آئی تو پلک بھپکتے میں انہوں نے اپنی تمام املاک اور دھن دولت کو خیر باد کہہ دیا۔ مؤخر جواب کے لئے اس ضمن میں صرف اس دور کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی صورت حال پر ایک نظر ڈال لینا ہی کافی ہوگا۔ مختلف علوم و فنون نے ترقی کے جو مدارج اس زمانے میں طے کئے وہ صرف امراء اور درباری سرپرستی کے ہی مرحون منت تھے۔ بایں حالات شعراء اور فنکاران درباروں سے منسلک رہنے پر مجبور تھے تاکہ وہ انعامات و اکرامات کے ذریعے اپنی دنیاوی ضروریات پوری کر سکیں۔ البتہ اس سرپرستی سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ اپنی دوزمرہ ضروریات کی فکر سے بالا ہو کر پورے

انہماک اور لگن سے تخلیقی اور دوسرے فنی کاموں میں پوری طرح مصروف رہے اور انہیں ترقی کے عروج تک پہنچایا۔

ایک بلند پایہ شاعر اور موسیقار ہونے کے علاوہ حضرت خسروؒ کو متعدد زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ترکی، فارسی، برج بھاشا (ہندی یا ہندوی) سنسکرت اور دوسری بہت سی زبانوں میں وہ مکمل استعداد اور مہارت سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے تھے۔ گو ان کی مادری زبان برج بھاشا تھی لیکن فارسی زبان انہیں ورثہ میں ملی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے سو سے زیادہ کتابیں مختلف علوم و فنون پر تحریر کیں جن میں سے بیشتر تاریخ کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ البتہ ان میں سے قریباً بیس کتب ایسی ہیں جو دنیا کے مختلف علاقوں میں اب بھی موجود ہیں۔ لیکن یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ان کی وہ بے شمار تحریروں جو اب تاریخ کے ملبے میں دفن ہو چکی ہیں ان کی تلاش و جستجو کے لئے مافنی قریب میں کوئی بنیاد اور پیہم کوشش نہیں کی گئی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے اصل فلمی مسودات برطانوی عجائب گھر، لندن کی انڈیا آفس لائبریری اور متعدد امریکی عجائب گھر اور کتب خانوں میں موجود ہیں۔

یہ بھی یقین کیا جاتا ہے کہ حضرت امیر خسروؒ نے پانچ لاکھ سے زیادہ فارسی میں اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں ہندی میں شعر کہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو مطلوبہ حالات میں یا یادداشتوں کے ذریعے جمع کئے جاسکتے ہیں۔ ان کے متعلق صرف اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے اور بس۔

ان کی شعوری کوششوں سے جو انہوں نے ترکی، فارسی اور برج بھاشا کی آمیزش سے اپنی شاعری میں کیں حضرت امیر خسروؒ کو بجا طور پر زبان اردو کا خالق تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے اسی تجربہ نے اردو کی نشوونما کی داغ بیل ڈالی۔

ان کی جو تخلیقی کاوش دریائے تاریخ کے دھارے میں بہہ گئیں ان میں ایک درجن کے قریب وہ تخلیقات بھی مقفیل جو انہوں نے

کے بعد ان سازوں کو ایجاد کیا۔ ان سازوں کے لئے انہوں نے مختلف تالیں بھی ایجاد کیں۔ ایک ایسے موسیقار کی طرح جس میں موسیقی کے محرکات اور دوسری چیزیں قبول کرنے اور ان میں اصلاح پیدا کرنے کی صلاحیت ہو امیر خسروؒ نے بھی تمام عالم کی موسیقی سے اثرات قبول کئے اور انہیں اپنی تخلیق ذہن کی جھٹی میں ڈال کر ایک نئی جلا بخشتہ اس ضمن میں فوالی اور ترازہ دو ایسی مخصوص اصناف ہیں جو اس نظریہ کی تصدیق کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔

مغرب میں جائزے کے موسیقار خصوصاً امریکی موسیقار جو سٹار اور بلبلہ کی تھاپ سے پیدا ہونے والی موسیقی سے بے حد مسحور ہو جاتے ہیں شاید اس بات سے قطعی نا آشنا ہیں کہ یہ دونوں ساز امیر خسروؒ کی ایجاد ہیں جن کی سات سو سالہ برسی دنیا بھر کے بیشتر ممالک میں اس سال منائی جا رہی ہے۔

موسیقی کے میدان میں امیر خسروؒ کی مسلمہ قابلیت و ذہانت کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ سلطان علاء الدین خلجی کے دور حکومت میں جنوبی ہندوستان کا ایک عظیم گانگ نائک گوپال موسیقی کے آسمان پر بڑی آب و تاب سے جگمگا رہا تھا۔ اسے شہنشاہ ہندوستان نے دہلی بلایا کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرے۔ گوپال جسے عظمت اور فن دانی کے باعث اس کے بارہ سو شاگرد پاکھی میں بٹھا کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جایا کرتے تھے حضرت خسروؒ کی فن موسیقی میں مہارت کے متعلق پہلے ہی سن چکا تھا۔ دربار میں گائیگی میں اپنی فنی مہارت کا اندازہ لگانے کی خاطر اس نے امیر سے درخواست کی کہ وہ پہل کریں۔ لیکن امیر نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہ ہندوستان میں بدلیسی ہیں اور ان میں مکمل خود اعتمادی نہیں کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ اس سے پہلے کریں۔ بالآخر گوپال نے متعدد راگ و راگنیاں پیش کیں جن پر امیر خسروؒ نے اعتراف کیا کہ وہ تمام چیزیں ان کی ترتیب شدہ ہیں۔ امیر کی اس بات نے شہنشاہ اور گوپال کو مکمل طور پر شدد و حیلان

موسیقی کے سلسلے میں تحریر کیں۔ لیکن ان کتب کے تلف ہو جانے کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت خسروؒ نے برصغیر کی موسیقی کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں ایک عظیم کردار ادا کیا۔ ہندوستان کی وہ موسیقی جسے دنیا کی قدیم ترین موسیقی تصور کیا جاتا تھا اب بالکل ناپید ہو چکی ہے۔ موجودہ خد و خال میں جو موسیقی اب مروج ہے وہ حضرت خسروؒ کی تخلیق کردہ ہے۔ جنہوں نے اس کی ترمیم و تازہ کاری کر کے اس میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔ موسیقی میں ان کی ہمتوں اور اصلاحات کی وجہ سے اور بعد میں آنے والے مسلم موسیقاروں مثلاً حسین شرقی، مہاں تانین اور سدا رنگ کی کوششوں سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے ہندوستانی موسیقی اب اپنی اصل شکل و صورت میں کہیں بھی موجود نہیں۔ حضرت خسروؒ اور دوسرے موسیقاروں کی شعوری کوششوں سے ایرانی اور عربی موسیقی کے جو اثرات ہندوستانی موسیقی پر پڑے اس کی بنا پر قدیم ہندوستانی ویدک موسیقی کی طرح برصغیر کی اس نئی موسیقی نے بھی بالکل جدا گانہ حیثیت حاصل کر لی۔ فی زمانہ ہم جو موسیقی ہندوستان و پاکستان میں سنتے ہیں وہ وہی موسیقی ہے جو امیر خسروؒ اور دوسرے مسلمان موسیقاروں کی کوشش سے پچھلے سات سو برسوں میں ترقی کے مختلف مراحل سے گزر کر ہم تک پہنچی ہے۔

امیر خسروؒ نے ذہن سے راگ اور راگنیاں ترتیب دیں بلکہ متعدد نئے ساز بھی ایجاد کئے۔ ان کے بے شمار راگوں میں سے "ساز گرمی"، "ایمن"، "زلف"، "مر پردا"، "زنگولا" اور "غار" چند ایسے راگ اور راگنیاں ہیں جنہیں آج بھی موسیقار اور گانگ بڑی آسانی اور خوبصورتی سے گاتے ہیں۔ برصغیر کا مقبول ترین ساز "ستار" انہی کی ایجاد ہے جو درحقیقت دینا کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ انگلیوں سے بجانے والے سازوں میں ڈھولک اور طبلہ وہ ساز ہیں جو اپنے وجود کے لئے امیر خسروؒ کی تخلیق استعداد کے مرہون منت ہیں جنہوں نے مردنگ اور پکھاوج کی اصلاح

قاصد شیریں بیاں۔ خسرو

کنور محمد اعظم علی خاں خسروی

- (۷) نظم میں جس کی بلاغت، نثر بھی جس کی فصیح
قال بھی جس کے ملاحات، حال بھی جس کا صیغ
اور امیری میں بھی جس کی فکر کا اک بانگین
خلعت زر کار میں بھی جو گائے کوئے دوست
طرہ دستار خم جس کا سونے ابروئے دوست
صحبت شاہی میں بھی جس کا فقیرانہ چلن
ساز بھی جس کا نیا، نئے نئے مئے بھی نئی
جس کے خم کو رے، اچھوتے جا سب بے بھی نئی
شمع بھی جس کی نئی ہے اور نیا اُس کا لگن
شمع جاں دل کے لگن میں جو جلاتا ہی رہا
گیات ساری عمر چاہت کے جو گاتا ہی رہا
قلب انسانی کی ٹھنڈک، جس کے سینے کی جلن
خسروی کی فکر روشن نسبت خسرو سے ہے
اس کی گتیا کا اُجالا، اُس کے ہی پر تو سے ہے
فکر بھی بچی تھی جس کی اور سچا جس کا فن
خسروی کیا اور اس کے فکر و فن کیا، کچھ نہیں
جو کچھ ہذیان ہے سارا، جو لکھا، کچھ نہیں
فکر خسرو گرنہ اس کے ذہن پر ہو صوفی گن

- (۱) خسرو اقلیم فکر و شہر یار ملک فن
ہر زمانے کو پیا، تازہ تر جس کا سخن
ہر سخن جس کا چمن اندر چمن اندر چمن
ہر چمن کی اک نئی خوشبو، نو پئی ہے بہار
(۲) ہر روش پر رنگ، نو، ہر رنگ پر تازہ نکھار
نکھت گل بھی انوکھی ہے، نئی بوئے سمن
(۳) لالہ و رنگس کی آنکھوں میں سرورِ نو بنو
سنبل و شمشاد پر ہر دم نرالی اک صنو
موتیا جو ہی، چنیلی پر بھی تازہ اک پھبن
(۴) ہر چمن اس کے سخن کا ہے بہاروں کا امیں
فصل ہو کوئی، خزاں جس میں کبھی آتی نہیں
اُس کی جوئے فکر سے سیراب ہیں کوہ و دمن
(۵) کوہ سے مطلب ہے کیا، ذہن رسا، طبع بلند
اور دمن کیا ہے، بحرِ قلب و وسیع و دردمند
جوئے فکر اس کی رواں ہے، کوئی واوی ہو کہ بن
(۶) شمع خلوت کا وہ ناز و مطرب بزم نیاز
کاشفِ سر حقیقت، شارحِ رمزِ مجاز
قاصد شیریں بیاں ملک جاں، در شہر ترن

عوامی حکومت کے چار سال

آئین اور خدمتِ اسلام

مولانا کوثر نیازی

(وزیر امور مذہبی)

اسلام اور اس کے نظریات نے ہمیں جمہوریت سکھائی ہے۔ ہمیں مساوات انسانی اور ہر ایک کے ساتھ انصاف اور صاف معاملہ کرنا سکھایا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حصول آزادی کے وقت سے آئین سازوں نے، جب کبھی انہیں موقع ملا مسلسل کوششیں کیں کہ اسلامی نظریات کے حصول سے متعلق دفعات متعارف کریں۔

۲۔ اسلامی نظریہ

جب پاکستان وجود میں آیا تو سب سے پہلا کام جس نے بانی پاکستان اور پہلی آئین ساز اسمبلی کی توجہ اپنی طرف مبذول کی وہ یہ تھا کہ نئی مملکت کے آئین کے لئے رہنما اصول اور مقاصد مرتب کئے جائیں۔ ۱۹۴۹ء میں پہلی آئین ساز اسمبلی نے قراردادِ مقاصد منظور کی جس میں وہ لازمی اور بنیادی اصول رکھے گئے جن پر آئین مرتب کرنا تھا۔ اس قرارداد میں مندرجہ ذیل اہم نکات رکھے گئے تھے :-

- (الف) حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے جسے پاکستانی عوام اس کی معتد بہ امانت کے طور پر استعمال کریں گے۔
- (ب) پاکستان ایک وفاقی مملکت ہوگی۔

۱۔ ابتدائیہ

پاکستان نے پیلز پارٹی کے چیئرمین نے ۳۱ مارچ ۱۹۷۲ء کو اپنے ہم وطنوں سے یہ کہا تھا کہ وہ اس حسین ملک کو اسلامی مملکت، سب سے بڑی اسلامی مملکت، ولیر ترین اسلامی مملکت اور سب سے ٹھوس اسلامی مملکت بنائیں، تو انہوں نے باشندگانِ پاکستان کے پُر خلوص جذبات اور امنگوں کا اعادہ کیا تھا کیونکہ پاکستان اسلام کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ یہ ملک اس لئے وجود میں آیا کہ برصغیر ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے لئے ایک ایسا وطن حاصل کرنے کی انتھک جدوجہد کی جہاں وہ اسلام کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں، جہاں وہ خوف اور شبہ سے آزاد ہو کر اپنے مذہبی فرائض ادا کر سکیں اور ان کا اظہار کر سکیں، جہاں وہ اسلام کی سربلندی کے لئے کام کر سکیں۔ چونکہ یہ عوام کی خواہش اور مرضی تھی اس لئے قائدِ اعظمؒ نے فروری ۱۹۴۹ء میں اپنی ایک نشری تقریر میں کہا تھا کہ ”مجھے نہیں معلوم کہ اس آئین کی قطعی شکل کیا ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ ایک جمہوری طرز کا آئین ہوگا جو اسلام کے لازمی اصولوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوگا۔ وہ اصول آج حقیقی زندگی میں اسی طرح قابلِ عمل ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے تھے۔

شوکت و عظمت کے لئے کام کر سکتے ہیں۔

۳۔ آئین اور اس کی اسلامی خصوصیات

(الف) تمہید (پیش نامہ آئین) اس میں شک نہیں کہ تمہید قانون سازوں کا دماغ کھینچنے کی کوشش ہے۔ تمہید پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں نہ صرف قرارداد مقاصد کی اہم دفعات شامل ہیں بلکہ یہ اسلامی تصور بھی ہے کہ مملکت کے کارندے

خدا تعالیٰ اور انسان کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اس میں باشندگان پاکستان کا یہ عزم اور عہد بھی نظر آتا ہے کہ وہ انصاف پر مبنی ایک معاشرہ قائم کر کے جمہوریت اور پاکستان کی سالمیت اور استحکام حاصل کریں گے۔ اس میں اسلام کا یہ بنیادی اصول بھی ملتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے قوانین وضع کرنے کا اختیار کلی مرت اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مجالس قانون ساز اس معنی میں حاکم مطلق اور خود مختار نہیں ہیں کیونکہ انہیں اپنی پسند کے قوانین وضع کرنے کا مکمل اختیار نہیں ہے۔ ان کے اختیارات ان پابندیوں سے محدود ہیں جو اسلام نے قانون سازی پر عائد کر رکھی ہیں اور یہ پابندیاں مستقل ہیں اور انہیں کسی قسم کی قانون سازی کے ذریعہ ہٹایا نہیں جاسکتا۔ چونکہ حقیقی حاکم اللہ ہے اس لئے عوام کے منتخب نمائندوں کو امینوں کی حیثیت سے اور شریعت کے حدود کے اندر رہتے

ہوئے قوانین وضع کرنے کے حق کو استعمال کرنا ہے۔ یہاں یہ سمجھ لینا مناسب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان کو اختیار تفویض کرنے سے متعلق ایک بنیادی غلطی فہمی جو ماضی میں رہی ہے، اس کی تصحیح کر دی گئی ہے اور آئین نے اب بجا طور پر ان اختیارات کو جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو دیئے ہیں ان حدود تک محدود کر دیا ہے جو اس نے متعین کر دیئے ہیں۔ تمہید کی دوسری اہم دفعہ، باشندگان پاکستان کی اس خواہش کا اظہار کرتی ہے کہ وہ جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں پر، جیسا کہ اسلام نے بتایا ہے، ایک اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں باشندگان پاکستان، اسلام کی

(ج) اسلام کے بتائے ہوئے طریقے پر جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں پر عمل کیا جائے گا۔

(د) مملکت اپنے اختیارات کا استعمال عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ کرے گی۔

(و) اقلیتوں کے حقوق کو مناسب تحفظ دیا جائے گا۔

(و) عدلیہ آزاد ہوگی۔

مختصر طور پر یہ اسلامی نظریاتی اصولوں کے نکات تھے جن پر پاکستان کے لئے ایک آئین کی بنیاد رکھنی تھی۔ تاہم ان اصولوں کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پاکستان ایک مذہبی مملکت ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ قائد اعظم صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ”آپ کوئی غلطی نہ کریں۔ پاکستان کوئی مذہبی یا اس قسم کی کوئی مملکت نہیں ہے۔ اسلام ہم سے دو سرے باب کے ساتھ رواداری برتنے کا مطالبہ کرتا ہے۔“ بہر حال ایک واضح تھی کہ پاکستان کو کسی حال میں بھی ایک لادینی مملکت نہیں بننا۔ قرارداد مقاصد میں مندرجہ اصول حقیقت میں اسلامی بنیادی اصول کے مطابق ہیں کیونکہ اسلام واضح طور پر یہ اعلان کرتا ہے کہ حقیقی حاکم صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ سارے انسان معاشرتی پر برابر ہیں، لہذا انہیں ترقی اور اظہار ذات کے یکساں مواقع ملنے چاہئے۔ اسلام میں رواداری، معاشرتی انصاف اور قانون کی نظر میں سب برابر ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ عوام کو یہ حق دیتا ہے کہ ان پر قانون کے مطابق رانی کی جائے۔ یہ کل بنی نوع انسان کی آزادی، انسانی اخوت، مشورے سب کے لئے حق رائے دہی کے ذریعہ جمہوری حکومت کے نظریات وضاحت کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ اسلامی معاشرے کے بنیادی اصول ہیں اور ایک اسلامی مملکت کے سارے قوانین و ضوابط میں مقاصد کے حصول کے لئے ہونے چاہئیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پاکستان کا آئین کتنے حسن طریقے پر ان مقاصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس میں وہ کون سے ذرائع اور وسائل رکھے گئے ہیں جن کی مدد سے اہل پاکستان، اسلام کی خدمت کر سکتے ہیں اور اس کی

تعلیمات اور مقتضیات کے مطابق زندگی بسر کریں۔

(ب) دوسری اسلامی دفعات

آئین میں تہیہ کے علاوہ دوسری دفعات ہیں جیسا کہ مقدمہ اسلام کے مقاصد کو فروغ دینا ہے۔ ان میں سے چند اہم دفعات کا مختصر تذکرہ کرنا سبباز ہو گا جو یہ ہیں۔

(۱) ہر قسم کے ابہام کو دور کرنے کی غرض سے یہ التزام کیا گیا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ ہو گا جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک جمہوری مملکت ہو گی جہاں اسلام کے منافی کوئی قانون وضع نہیں کیا جائے گا۔

(۲) پہلی مرتبہ اس آئین میں یہ خصوصی دفعہ رکھی گئی ہے کہ اسلام مملکت کا مذہب ہو گا۔

(۳) آئین کے تیسرے تہدوں میں عہدوں کے جو حلف رکھے گئے ہیں ان سے ہر قسم کا شبہ دور ہو گیا ہے۔ اور یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ صبر اور وفا کی انتظامی سربراہ سوائے سچے مسلمان کے اور کوئی نہیں ہو سکتا جس کا خدا کی وحدانیت بڑا الہامی کتابوں پر قرآن پاک پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری نبی ہونے پر روز قیامت پر اور قرآن و سنت کی تعین کی ہوئی ساری باتوں پر پختہ ایمان ہو گا۔

(۴) آئین میں ایک حالیہ ترمیم کے ذریعہ دفعہ رکھی گئی ہے کہ جو شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قطعی اور غیر مشروط آخری نبی ہونے پر ایمان نہیں رکھتا یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا ایسا دعویٰ کرنے والے کو نبی یا مہدی مصلح مانتا ہے وہ ”غیر مسلم“ ہے۔

(ج) مملکت کی پالیسی کے اصول

آئین نے باب دوم میں مملکت کی پالیسی کے چند اصول رکھے ہیں جن کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے مسلمان اسلام کے بنیادی

اصول اور تصورات کے مطابق انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگی بسر کر سکیں۔

اس میں یہ کہا گیا ہے کہ مندرجہ ذیل اقدامات کئے جائیں گے اور مملکت ان کے لئے کوشش کرے گی۔

(۱) قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم لازمی کی جائے گی۔
(۲) عربی زبان سیکھنے کی سہولتیں ہم پہنچائی جائیں گی۔
(۳) قرآن پاک کی صحیح اور ٹھیک ٹھیک طباعت کا انتظام کیا جائے گا۔

(۴) اتحاد اور اسلامی اخلاقی معیاروں پر عمل درآمد کو فروغ دیا جائے گا۔

(۵) زکوٰۃ، اوقاف اور مساجد کی مناسب تنظیم کی جائے گی۔

(۶) اقلیتوں کے جائز حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔

(۷) شراب نوشی، قمار بازی وغیرہ جیسی معاشرتی برائیوں کو روکا جائے گا۔

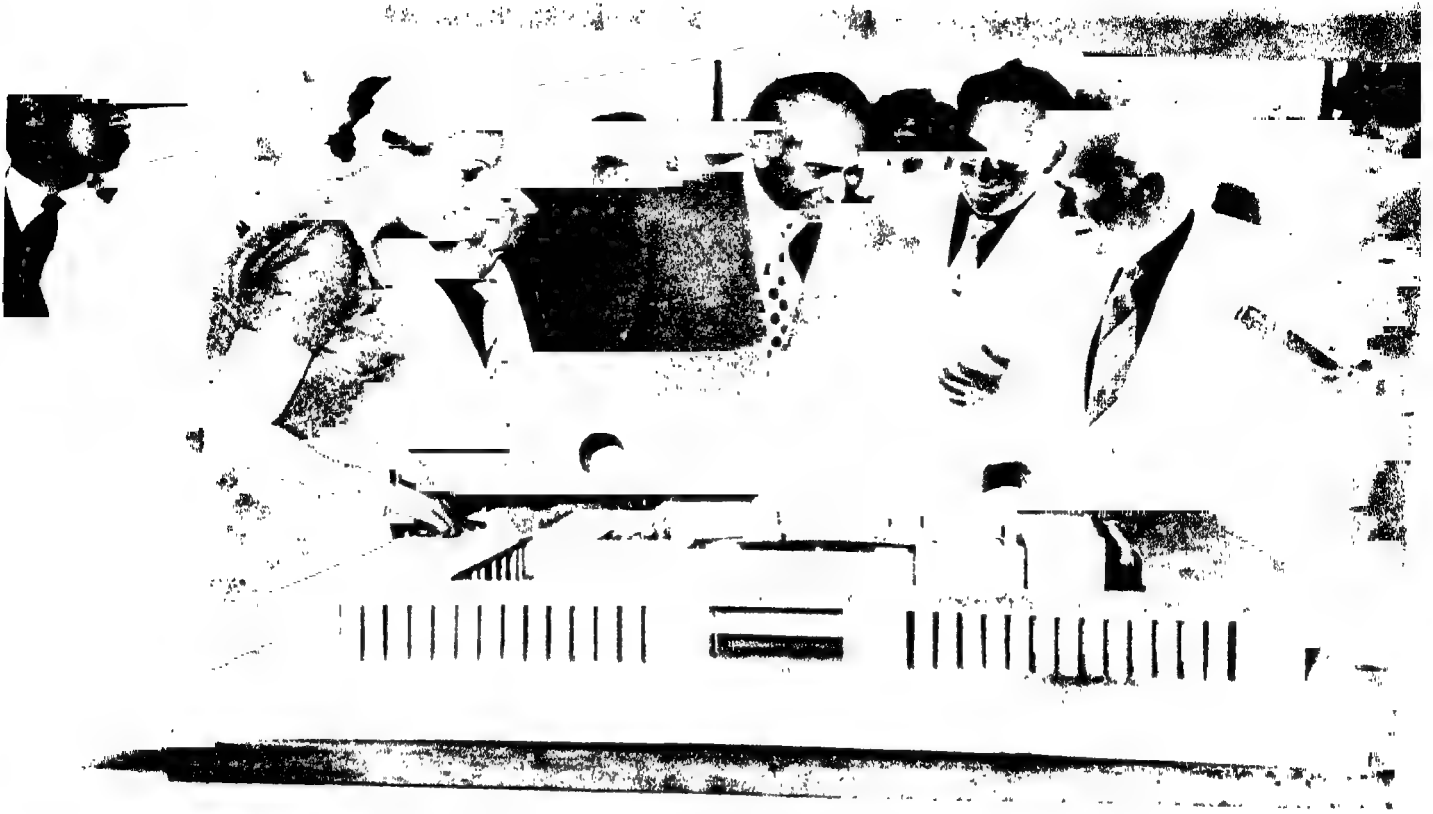
(۸) چند ہاتھوں میں دولت کے ارتکاز کی حوصلہ شکنی کی جائے گی اور ریل کو ختم کیا جائے گا۔

(۹) خارجہ پالیسی کا بنیادی نکتہ، مسلم مملکتوں سے دوستی کے برادرانہ رشتے اور بین الاقوامی امن کا تحفظ ہو گا۔

اگرچہ مملکت کی پالیسی کے ان اصولوں کے سلسلہ میں قانونی چارہ جوئی کا حق نہیں دیا گیا ہے تاہم ان سے بلاشبہ آئین کے اس منشا کا اظہار ہوتا ہے کہ مملکت کے انتظامی اعضاء و جوارح کی پالیسی کا رخ ان ہی مقاصد کے حصول کی جانب ہو گا۔ یہ ایسی دفعہ ہے جسے اسلام کے مقصد کو فروغ دینے کی غرض سے مملکت کے کارندوں کا ایک اکر سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ آئین کے نفاذ سے دو سال کے اندر ان سارے مقاصد کے حصول کے لئے بنائی جانے والی پالیسیوں پر عمل کرنے کی غرض سے اقدامات پہلے ہی کئے جا چکے ہیں۔ مہر حال ان پالیسیوں کے ذریعہ مسلمانانِ پاکستان

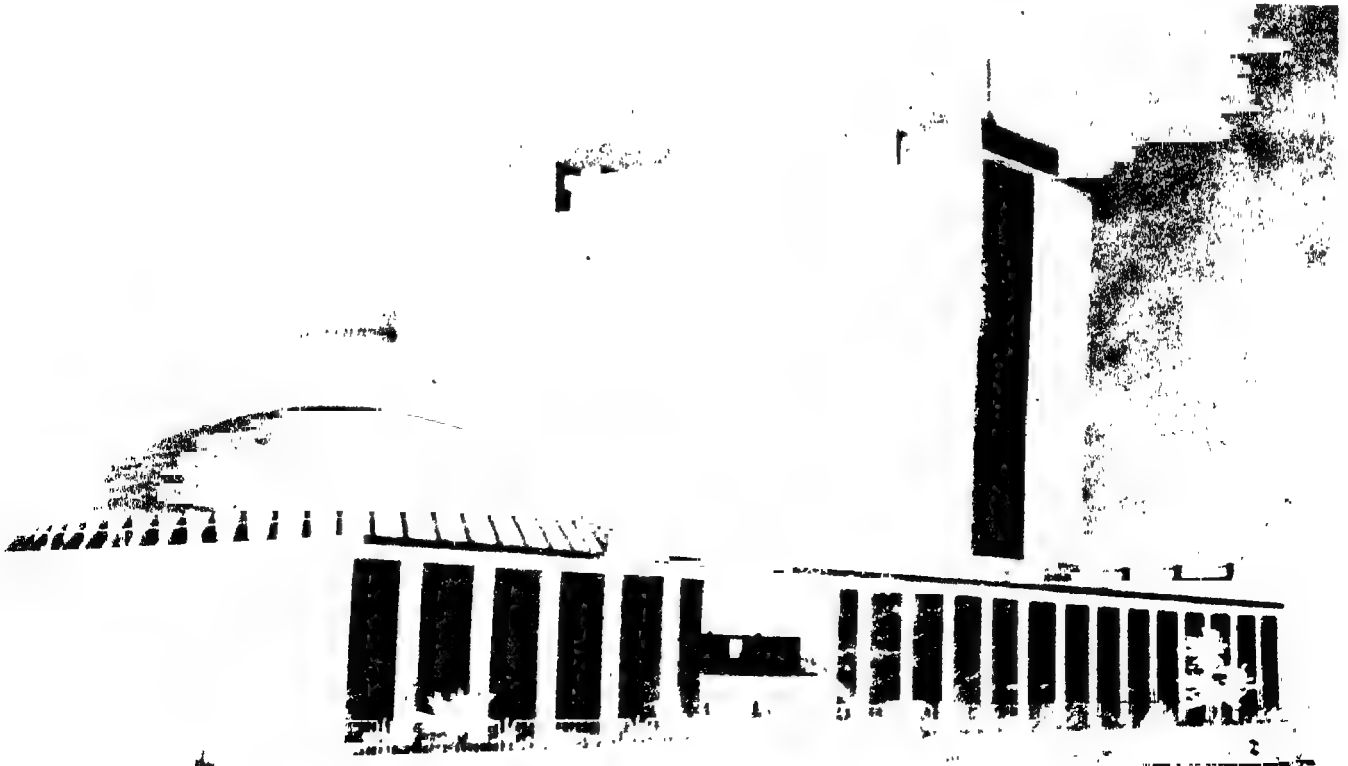


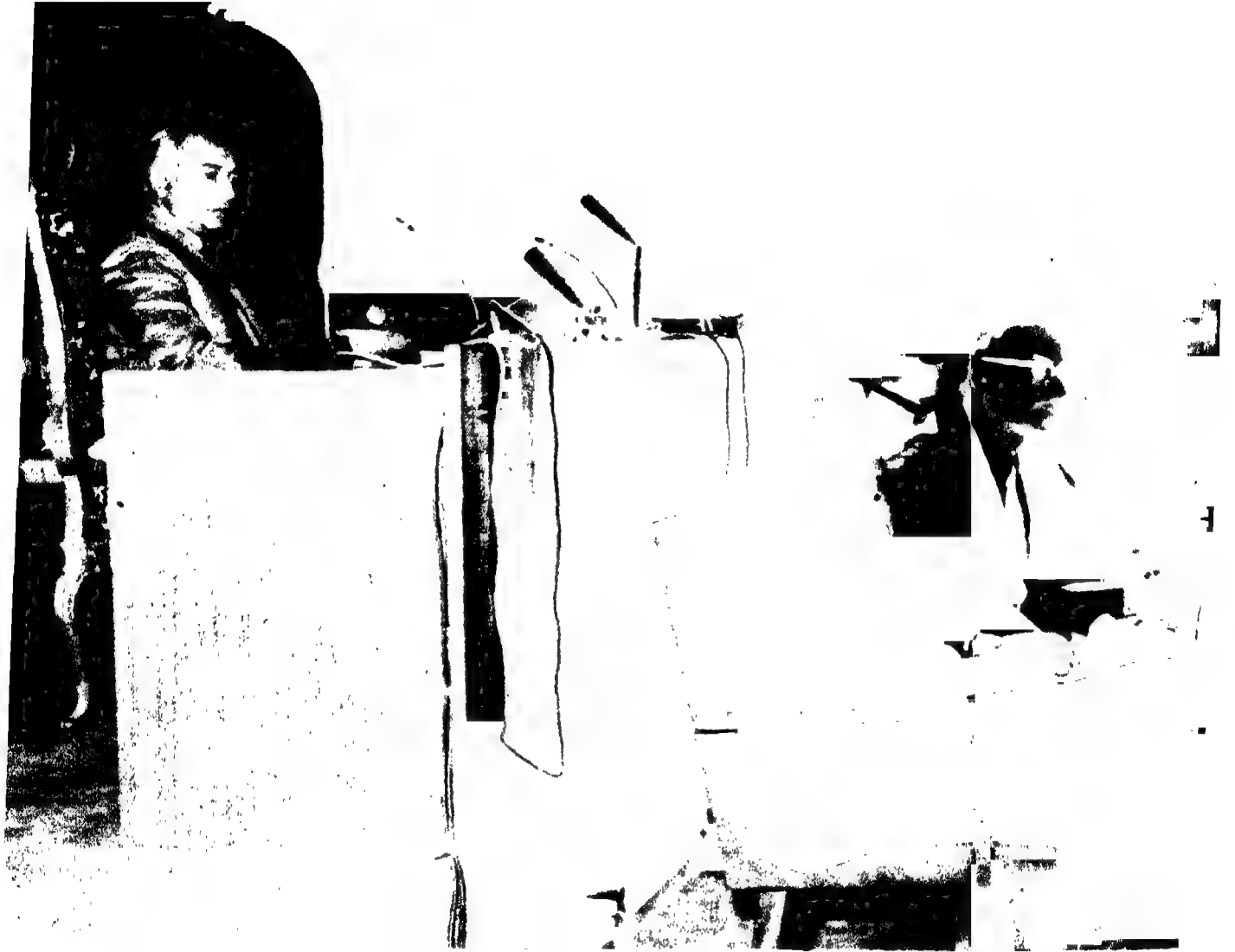
دربر اعظم ذوالفقار علی بھٹو (اس وقت کے صدر مملکت)۔ سلامی جہوریہ پاکستان کے آئین کی توثیق کر رہے ہیں
جسے صدر مملکت، فضل الہی چوہدری (اس وقت کے اسپیکر) نے ۱۲ اپریل کو پریذیڈنسی میں پیش کیا تھا۔



وہ براعظم ذوالعمار علی بھٹو اور یکیم نصرت بھٹو پارلیمنٹ ہاؤس کے ماڈل کا معائنہ کر رہے ہیں

فرم اسمبلی اسلام آباد کا بیرونی منظر





وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو (اس وقت کے صدر مملکت)
 آئین کی توثیق سے قبل ۱۰ اپریل ۱۹۷۳ء کو میران ماسمیل سے
 مخاطب ہیں۔



جناب عبدالغنیٹ پرزادہ کی زیر صدارت قون اسبلی میں "آئین لکھی" کا اجلاس (۱۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

جشن اہم لے موقع پر مرڈوں کا جلوس مری روڈ سے گزر رہا ہے۔



اس کونسل کا قیام، اسلام کے مقصد کی سب سے بڑی خدمت ہے اور حقیقی طور پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ نوسال کے اندر پاکستان کی قانون سازی کا پورے ڈھانچے پر اسلامی رنگ چڑھ جائے گا۔

۳۔ آئینی دفعات پر عملدرآمد

آئین کے پیش نظر مقاصد کے حصول کے لئے جو دفعات رکھی گئی ہیں ان پر اب تک جتنا عملدرآمد ہوا ہے۔ اس کی تفصیل بتانا مشکل ہے۔ تاہم بعض اہم کام جو اب تک ہوئے ہیں ان کا مختصر بیان یہاں نامناسب نہیں ہوگا :-

- (۱) اسلام سے متعلق معاملات اور آئین کی اسلامی دفعات پر عملدرآمد کی نگرانی کرنے کے لئے ایک وزارت مذہبی امور قائم کی گئی ہے۔
- (۲) اسلامی نصب العین کی کونسل قائم کی گئی ہے۔
- (۳) قرآن پاک کی ٹھیک ٹھیک اور اخلاط سے پاک طباعت کو یقینی بنانے کے لئے ایک وفاقی قانون نافذ کیا گیا ہے۔
- (۴) فریضہ حج کی ادائیگی پر سے ساری پابندیاں ہٹائی گئی ہیں اور حج سے متعلق سارے کام کمپیوٹر کے ذریعہ کے سہانے ہیں۔
- (۵) صوبائی حکومتوں کے محکمہ ہائے اوقاف، ٹھوس بنیادوں پر اوقاف کی تنظیم کرنے کے لئے کام دوای کر رہے ہیں۔
- (۶) ابتدائی درجہ سے میٹرک کلاس تک اسلامیات کو لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔
- (۷) سارے پاکستان میں عربی زبان کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

- (۸) عالم اسلام سے پاکستان کی یکجہتی قائم کرنے کی غرض سے فروری ۱۹۷۹ء میں لاہور میں پاکستان نے ایک اسلامی سربراہی کانفرنس کی میزبانی کی۔
- (۹) عید کی تقریبات کے موقع پر وجہ اختلاف دور کرنے کے

کو اسلام کے بنیادی اصولوں اور تصورات کے مطابق زندگی بسر کرنے اور قرآن پاک اور سنت کے مطابق زندگی کا مفہوم سمجھنے کے قابل بنانے کا قطعی مقصد حاصل کرنے کے لئے مسلسل کوششوں کی ضرورت ہوگی۔

(د) اسلامی کونسل

پاکستان میں صحیح معنوں میں اسلامی طرز زندگی رائج کرنے کی غرض سے آئین نے اسلامی نصب العین کی ایک کونسل قائم کرنے کا انتظام کیا ہے اس کونسل میں ہر مکتب فکر کے جید علماء اور جج اور جیورسٹ ہوں گے۔ اس کونسل کو دو قسم کے فرائض انجام دینے ہیں، سفارشی اور مشاوری جو یہ ہیں :

سفارشی فرائض

(الف) اس کونسل کا یہ فرض ہے کہ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے سامنے ان ذرائع و وسائل کی سفارشات کرے جن سے مسلمانانِ پاکستان قرآن و سنت میں بتائے ہوئے اسلام کے اصولوں اور تصورات کے مطابق انفرادی اور اجتماعی طور پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوں۔ یہ اس کونسل کا ابتدائی کام ہے جیسا کہ آئین میں گنجائش رکھی گئی ہے۔ اور اس معاملے میں یہ

(ب) موجودہ قوانین کو اسلام کے احکامات کے مطابق بنانے کے اقدامات اور ان مراحل کی سفارشات کرے گی جن میں ایسے اقدامات پر عملدرآمد ہونا چاہیئے اور

(ج) اسلام کے ایسے احکامات کو جن کا قانونی نفاذ کیا جاسکتا ہے مناسب شکل میں مرتب کرتا۔

مشاورتی فرائض

صدر، کسی صوبہ کا گورنر یا کوئی ایوان یا صوبائی اسمبلی، بشرلیک اس کے کل ارکان کا ہر حصہ ایسا چاہے اس سوال پر مشورہ طلب کر سکتا ہے کہ کوئی مجوزہ قانون اسلام کے احکامات کے منافی نہیں ہے۔

ایک رویت ہلال کبھی قائم کی گئی ہے۔

۵۔ خلاصہ

مختصر یہ کہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ پاکستان کے آئین کا مقصد، صحیح معنوں میں ایک اسلامی معاشرے کا قیام ہے۔ اس نے حاکمیت کے بنیادی تصورات، اسلامی جمہوریہ، اسلامی مفاد، مملکت کی پالیسی کے اصول کی واضح نشاندہی کر دی ہے اور اسلامی

نصب العین کی کونسل جیسے داخلی ادارے کے قیام کا انتظام کر دیا ہے جو باشندگان پاکستان کو بلاشبہ اس قابل بنائیں گے کہ وہ پاکستان میں اجائے اسلام اور نشاۃ ثانیہ کا دیرینہ مقصد حاصل کر سکیں۔ ہم خدا سے عزوجل سے دعا کریں کہ وہ ہمیں اسلام کے مقصد اور اس کی شوکت بڑھانے کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنے کا حوصلہ، قوت اور جذبہ عطا کرے کیونکہ حقیقت میں عوام اور ان کی کوششیں ہی آئین کو کامیاب بنا سکتی ہیں پتہ

لاہور میں منعقدہ

اسلامی دنیا کے عظیم اٹھان اجلاس پر ایک بلند پایہ دستاویز (انگریزی)

REPORT ON ISLAMIC SUMMIT - 1974 -

عالم اسلام کے محبوب رہنماؤں کے بے شمار نایاب اور نہایت ہی دیدہ زیب رنگین تصاویر سحر مزین عمدہ سفید کاغذ، جلد مضبوط، آرٹ کارڈ، ۳۲ صفحات، ۹x۶"۔ قیمت صرف چالیس روپے

مطالعہ کا ذوق رکھنے والے اصحاب کے لئے ایک نہایت ہی بیش قیمت تحفہ

کالجوں، اسکولوں اور درسوی لائبریریوں کیلئے ایک ناگزیر کتاب!

اپنے قریبی بک سٹال سے طلبہ کیجئے یا ہم سے براہ راست منگوائیے

ادراجہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۵۵۔ راولپنڈی

پاکستان کا آئین - کچھ خیالات

پاکستان پیپلز پارٹی کی موجودہ حکومت جس کے سربراہ جناب ذوالفقار علی بھٹو ہیں۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۵ء کو اس وقت مسند حکومت پر بیٹھی جبکہ اس وقت کے صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل اسے۔ ایم یحییٰ خان نے اقتدار منتقل کیا۔

صدر کا عہدہ قبول کرنے کے بعد جناب بھٹو نے ۲۹ دسمبر ۱۹۷۵ء کو اعلان کیا کہ حکومت ملک میں جمہوریت بحال کرنے اور ملک کے لئے آئین وضع کرنے کی جانب تیزی سے قدم بڑھائے گی۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے سخت جدوجہد کی گئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے نیشنل عوامی پارٹی اور جمیعت العلماء اسلام کے ساتھ طویل مذاکرات کئے جن کے نتیجے میں ۶ مارچ ۱۹۷۶ء کو ایک معاہدہ سواحس میں حسب ذیل اہم امور شامل تھے۔

(۱) مارشل لا ۴۴ اگست ۱۹۷۲ء کو اٹھا لیا جائے گا۔

(۲) قومی اسمبلی کا ایک تین روزہ اجلاس ۴۴ اپریل کو منعقد کیا جائے گا اور پھر ۴۴ اگست کو دوبارہ قومی اسمبلی کا اجلاس ہوگا۔

(۳) صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس ۲۱ اپریل کو منعقد کئے جائیں گے۔

(۴) عبوری آئین گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء بشمول انڈین انڈیپنڈنٹس ایکٹ ۱۹۴۷ء اور اسس کی ضروری ترمیم کی بنیادوں پر بنایا جائے گا۔

(۵) نیشنل اسمبلی کی ایک کمیٹی قومی آئین کا مسودہ تیار کرے گی اور یکم اگست تک اپنی رپورٹ کو آخری شکل دے دے گی۔

۲۔ قومی اسمبلی کا اجلاس ۴۴ اپریل ۱۹۷۶ء کو اسلام آباد میں طلب کیا گیا۔ اپنے تین روزہ اجلاس کے دوران قومی اسمبلی نے حسب ذیل کام کئے۔

(الف) صدر پر اعتماد کا ووٹ پاس کیا گیا۔

(ب) مارشل لا کا ۴۴ اگست ۱۹۷۲ء تک جاری رہنا طے پایا۔

(ج) عبوری آئین منظور کیا گیا، نیز

(د) قومی اسمبلی کی ایک کمیٹی پاکستان کے لئے آئین کا مسودہ تیار کرنے کے لئے مقرر کی گئی جسے اپنا ۴۴ یکم اگست ۱۹۷۲ء تک مکمل کر لینا تھا۔

مستقل آئین کا نفاذ

۳۔ قومی اسمبلی کی مقرر کردہ آئین کمیٹی کی پہلی میٹنگ ۲۲ اپریل ۱۹۷۶ء کو منعقد ہوئی اور اس کے بعد کمیٹی کے اجلاس ۱۰ مئی ۱۹۷۶ء تا ۱۸ مئی ۱۹۷۶ء اور ۲۹ مئی ۱۹۷۶ء تا ۳ جون ۱۹۷۶ء تک منعقد ہوئے۔ آئینی امور پر پارلیمانی جماعتوں اور گروپوں کے لیڈروں

کے ساتھ صدر کی بات چیت کے پیش نظر کمیٹی کو اپنے اجلاس گفت و شنید کا نتیجہ نکلنے تک روکنے پڑے۔

قومی اسمبلی نے ۱۶ اگست ۱۹۷۲ء کو منعقد ہونے والے اپنے اجلاس میں مسودہ آئین پیش کرنے کی تاریخ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء تک بڑھا دی۔ پارلیمانی پارٹیوں کے لیڈروں اور مختلف گروپوں سے ۱۷ تا ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۲ء تک گفت و شنید ہوتی رہی اور آخر میں بنیادی نوعیت کے تمام آئینی مسائل متفقہ طور پر حل کرنے کے لئے مختلف جماعتوں کے ساتھ آئین پر سمجھوتے پر ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو دستخط ہوئے اور اس بات نے آئینی کمیٹی کے کام میں بڑی سہولت پیدا کر دی اور اس نے اس سمجھوتے کی شقوق کو مسودہ آئین میں ہم نشین کرنے کا فیصلہ کیا۔ کمیٹی نے آئین کا مسودہ آئینی سمجھوتے کی روشنی میں تیار کرنے کا کام وزارت قانون اور پارلیمانی امور اور قومی اسمبلی کے سیکریٹریٹ کو تفویض کر دیا۔ اس اقدام کے بعد آئینی کمیٹی نے اپنے اجلاس ۲ دسمبر سے شروع کر دیئے اور یہ اجلاس ۲۱ دسمبر ۱۹۷۲ء تک آئینی مسودے اور اس میں مجوزہ ترامیم پر غور و خوض کے لئے منعقد ہوتے رہے۔

۴۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو آئینی کمیٹی کے چیئرمین نے آئینی کمیٹی کی رپورٹ مع مسودہ آئین ایک بل کی صورت میں پیش کیا۔ ۲ فروری ۱۹۷۳ء کو آئینی بل باقاعدہ طور پر قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا۔ آئینی بل پر بات چیت ۱۶ فروری ۱۹۷۳ء سے شروع ہوئی اور ۱۱ اپریل ۱۹۷۳ء تک جس دن بل بنیاد کسی اختلافی ووٹ کے پاس کیا جا رہی رہی۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئین ۳۱ اپریل ۱۹۷۳ء کو منظور کر لیا گیا تھا لیکن اس کی بنیادی دفعات ۱۱ اگست ۱۹۷۳ء سے نافذ عمل ہوئیں۔

۵۔ آئین میں کہا گیا ہے کہ وفاقی جمہوریہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نام سے موسوم ہوگی۔ آئین نے پہلی بار اسلام کو مملکت کا مذہب

قرار دیا لیکن ساتھ ہی اس نے تمام مذہبی اقلیتوں کے حقوق کو تحفظ فراہم کیا۔ آئین میں ایک قاتی پارلیمانی طرز کی حکومت جس میں ایک وائیوانی پارلیمنٹ ایک قومی اسمبلی اور دوسری سینیٹ ہوں قائم کرنے کو کہا گیا ہے۔ آئین بنیادی حقوق کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور ان کا قانونی حواز عطا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ آئین صوبوں کو قومی اتحاد اور سالمیت برقرار رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ حد تک خود مختاری کا فراہم کرتا ہے۔

معادہ شملہ کی توثیق

۶۔ ۱۰ جولائی ۱۹۷۲ء کو قومی اسمبلی کا خاص اجلاس صدر نے طلب کیا تاکہ پاکستان کے صدر اور ہندوستان کی وزیر اعظم کے مابین طے پانے والے معاہدے پر غور و خوض کیا جائے۔ قومی اسمبلی نے ۱۰ جولائی ۱۹۷۲ء تا ۱۵ جولائی ۱۹۷۲ء تک طویل بحث و مباحثہ کے بعد معاہدہ شملہ کی متفقہ طور پر منظوری دے دی۔

وزیر اعظم کا انتخاب

۷۔ آئین کی دفعہ (۳) ۱۱ کے تحت قومی اسمبلی کا ۱۲ اگست ۱۹۷۳ء کو اجلاس ہوا اور اس نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کو پاکستان کا وزیر اعظم منتخب کر لیا۔

احمدی غیر مسلم قرار دیئے گئے

۸۔ احمدی فرقہ جس کے بانی آنجنابی مرزا غلام محمد تھے خود کو مسلمان کہتے تھے جبکہ مسلمانوں کے تمام طبقے اس فرقے کو غیر مسلم سمجھتے تھے اور یہ جھگڑا گذشتہ ۹۸ برس سے چل رہا تھا اس دوران میں بہت سے خونی فسادات بھی ہوئے یہ مسئلہ پاکستان کے لوگوں کو مدت سے پریشان کئے ہوئے تھا اس لئے حکومت نے اسے قومی اسمبلی کے سامنے پیش کیا۔ پورے ایوان کی کمیٹی نے حسب ذیل

ریزولوشن پاس کیا اور اسے ۷ ستمبر ۱۹۷۷ء کو قومی اسمبلی کے سامنے رکھا۔

ریزولوشن

پوری قومی اسمبلی کی اسپیشل کمیٹی متفقہ طور پر اس فیصلے پر پہنچی ہے کہ درج ذیل سفارشات قومی اسمبلی کو غور و خوض اور منظوری کیلئے بھیجی جائیں۔

پوری قومی اسمبلی کی اسپیشل کمیٹی جس کی مدد اسٹیٹنگ کمیٹی اور سب کمیٹی کر رہی ہے، نے ان قراردادوں کو جو اس کے سامنے ہیں نیز ان دستاویزوں اور گواہوں کو جن میں صدر انجمن احمدیہ بڑو اور انجمن احمدیہ اشاعت اسلام لاہور شامل ہیں، کو دیکھنے اور سننے کے بعد متفقہ طور پر قومی اسمبلی کو حسب ذیل سفارشات کرتی ہے۔

(الف) یہ کہ پاکستان کے آئین میں حسب ذیل ترمیم کی جائے۔

۱۔ یہ کہ آئین کی دفعہ (۳) میں ایک حوالہ قادیانی گروپ اور لاہوری (جو خود کو احمدی کہتے ہیں) کے متعلق شامل کیا جائے۔

(۲) ایک غیر مسلم کی تعریف دفعہ ۲۴۰ کی ایک نئی شق سے کی جائے

(ب) اور یہ کہ پاکستان پینل کو ڈکے سیکشن ۲۹۵۔ الف میں حسب ذیل وضاحت شامل کی جائے۔

”وضاحت“ ایک مسلمان جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے نظریے کے منافی عقائد رکھتا ہو، ان کی اشاعت اور ان پر عمل کرنا ہو جیسا کہ آئین کی دفعہ ۲۴۰ کی شق (۳) کے تحت قابل سزا ہے۔

(ج) نیز یہ کہ پاکستان کے تمام شہریوں کی جان و مال، آزادی، جائیداد، عزت اور بنیادی حقوق کا بلا امتیاز اس کے کہ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں تحفظ کیا جائے گا۔

۹۔ اس ریزولوشن کو قومی اسمبلی نے اسی دن اپنے اجلاس میں

منظور کیا۔ اس کے بموجب آئین میں ترمیم کا بل قومی اسمبلی اور سینیٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس بل کو دونوں ایوانوں نے متفقہ طور پر پاس کیا اور اس کی توثیق ۷ ستمبر ۱۹۷۷ء کو صدر پاکستان نے کی اور اب اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین میں ترمیم ہو چکی ہے۔ متعلقہ قواعد و ضوابط میں ضروری ترمیمیں کی جا رہی ہیں۔

۱۰۔ ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۵ء کے دوران (جولائی ۱۹۷۵ء تک) قومی اسمبلی کے ۴ اجلاس ہو چکے ہیں اور قومی اسمبلی نے ۸۱ بل علاوہ جرنل بحث اور ریلوے بحث کے پاس کئے ہیں۔

پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس

۱۱۔ ۱۰ اگست ۱۹۷۳ء کو پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں جناب فضل الہی چوہدری کو آئین کی دفعہ (۳) ام کے تحت پاکستان کا صدر منتخب کر لیا گیا۔

پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس پھر ۲۶ اگست ۱۹۷۳ء کو بمبائی صورت حال کا وقفہ ۶ ماہ تک اور بڑھ جانے کے لئے ہوا۔ اور ۵ ستمبر ۱۹۷۳ء کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے سرکارِ لنگائی وزیر اعظم محترمہ شری ماہندرانائیک نے خطاب کیا استقبالیہ خطبے قومی اسمبلی کے اسپیکر جناب فاروق علی اور قائد ایوان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے پڑھے۔ محترمہ سر ماہندرانائیک کو خوش آمدید کہتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا کہ پاکستان اور سری لنکا دونوں نے جمہوریت کو اپنے طرز زندگی کے طور پر منتخب کر لیا ہے۔ اور وہ قانون کی حکمرانی اور بین الاقوامی امن اور چھوٹے ملکوں کے ہر خوت سے آزاد زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔ سری لنکا کی وزیر اعظم نے اپنی حکومت کی پالیسیوں اور دوست ایشیائی ملکوں سے اچھے پڑوسیوں کے سے تعلقات قائم کرنے کی روشنی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کا پاکستان میں جس گنجوش

سے استقبال کیا گیا وہ یاد رہے گا۔

پارلیمنٹ کا مشترک اجلاس پھر ۱۸ جنوری تا ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء
ہوا اور اس میں تین بل پاس کئے گئے۔

پاکستان کی سینیٹ

۱۳۔ پاکستان کے مستقل ممبروں میں ایک دو ایوانی مقننہ کی ہدایت ہے

اس لئے پارلیمنٹ دو ایوانوں پر مشتمل ہے ایک ایوان قومی
اسمبلی کہلاتا ہے اور دوسرا سینیٹ۔ آئین کی دفعہ ۲۷ کی
رو سے پہلی سینیٹ کے ۴۵ ممبر ہوں گے جن میں سے ۱۱ اہل
صوبہ کی اسمبلی منتخب کرے گی۔ ۲۱ تین ممبر وفاقی حکومت کے
زیر انتظام قبائلی علاقوں کے ممبران قومی اسمبلی منتخب کریں
گے۔ (۳) ۲ ممبر وفاقی دارالحکومت کے ہوں گے جنہیں ممبران
قومی اسمبلی منتخب کریں گے۔

ان ممبروں نے ۶ اگست ۱۹۷۳ء کو سینیٹ کے پہلے اجلاس
میں اپنے عہدے سنبھالے۔ اٹھایا۔ آئین کی دفعہ ۵۹ کی
رو سے سینیٹ توڑی نہیں جاسکتی لیکن اس کے ممبران کی
مدت ممبری چار برس ہے۔ جن میں سے آدھی تعداد ہر دو
سال بعد ریٹائر ہو جائے گی۔

آئین کی دفعہ ۷۷ کی رو سے پہلی سینیٹ کے ممبران

قرعہ اندازی کے تحت دو گروپوں میں منقسم کر دیئے جائیں

گئے۔ پہلی سینیٹ کا پہلا گروپ جو ہر صوبے سے پانچ ممبروں
اور وفاقی حکومت کے زیر انتظام قبائلی علاقوں کے ۲ ممبر
اور ایک ممبر وفاقی دارالحکومت کا ۶ اگست ۱۹۷۵ء کو

اپنی دو سالہ مدت پوری ہونے پر ریٹائر ہوں گے۔ پہلے
گروپ کے ممبروں کے ریٹائر ہونے کے بعد ان کی
نشتوں کا انتخاب جولائی ۱۹۷۵ء میں ہوا اور نئے
منتخب ہونے والے ممبروں نے ۶ اگست ۱۹۷۵ء کو

اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا۔ جناب حبیب اللہ خان
اور طاہر محمد خان کو ملی الترتیب سینیٹ کا چیئرمین اور
نائب چیئرمین منتخب کر لیا گیا۔

۱۴۔ اب تک سینیٹ کے ۱۱ اجلاس ہو چکے ہیں اور ان اجلاس
میں سینیٹ نے ۱۲ بل پاس کئے یہ بل یا تو قومی اسمبلی نے
بھیجے تھے یا سینیٹ نے خود وضع کئے تھے۔

پاکستان اور افرایشیا

اختر عادل رضوی

نے جو اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے اسے ایک سفاکانہ تجویز قرار دیا جس کا مقصد عربوں کو خود ان کے وطن سے محروم کرنا تھا۔ مسلم لیگ نے جس کے سربراہ قائد اعظم تھے عرب لیگ، فلسطینی عربوں کی اعلیٰ کمیٹی اور اس کے سربراہ مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحمینی کو یقین دلایا کہ مسلمان پوری طرح ان کے ساتھ ہیں اور ارض مقدس کو آزاد کرانے میں ان کی پوری حمایت کریں گے۔

اقوام متحدہ میں پاکستان کا موقف

۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ میں فلسطین کے بارے میں بحث کے دوران پاکستانی وفد نے اعلان کیا کہ پاکستان فلسطین کی تقسیم کا شدت سے مخالفت ہے اور وہ اس معاملہ میں اپنے موقف میں ذرا سی بھی تبدیلی کرنے کو تیار نہیں ہے۔ پاکستان نے اسرائیل کے قیام کے خلاف ووٹ دیا۔ پاکستانی مندوب نے صیہونی مملکت کے قیام کو ایک ایسا خنجر قرار دیا جو دنیائے عرب کے سینہ میں گھونپ دیا گیا ہے۔ پاکستان نے آج تک اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا۔ اس بارے میں وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے کئی بار وضاحت کی ہے کہ اسرائیل کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمیں انسانوں کی حیثیت سے یہودیوں سے دشمنی ہے بلکہ اس کی وجہ

سیاسی آزادی، معاشرتی برتری اور انسانی وقار و عزت کیلئے تیر کی دنیا کی جدوجہد سے پاکستان ج طرح کامل طور پر ہم آہنگی رکھتا ہے اور اسے اپنی جدوجہد سمجھتا ہے، وہی اصول اسکی بنیادی خواہش پالیسیوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے سے پہلے بھی برصغیر کی مسلم قیادت اپنی سیاسی آزادی کی جدوجہد کو ایک وسیع نقطہ نظر سے دیکھتی تھی۔ اس جدوجہد کو شہنشاہیت اور نوآبادیاتی راج کے خلاف وسیع تر تحریک کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ مسلمانان ہند نے اس وقت بھی جبکہ وہ اپنے سنگین سیاسی مسائل میں الجھے ہوئے تھے، وسیع النظری اور دوسری ترقی پذیر قوموں سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے۔ پاکستان کے قیام کو بھی ایک عظیم تر عالمی مقصد کی طرف پہلا قدم قرار دیا گیا تھا۔

جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے ہمیشہ غلامی اور استحصال سے آزادی کے لئے عربوں کی جدوجہد کی حمایت کی ہے جب انگریزوں نے زیادہ سے زیادہ یہودیوں کو باہر سے بلا کر فلسطین میں آباد کرنے کی سازش کی تو عربوں کی طرف سے اس کی مخالفت کی گئی۔ اس معاملہ میں آل انڈیا مسلم لیگ نے جس کے رہنما قائد اعظم تھے عربوں کی بھرپور حمایت کی۔ ۲۶ جولائی ۱۹۴۱ء کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ایک باقاعدہ قرارداد میں فلسطین کی تقسیم کی صیہونیت پسند تحریک پر گہری تشویش ظاہر کی۔ قائد اعظم محمد علی جناح

دوسرے مقتدر ہٹاؤں کی طرح جناب ذوالفقار علی بھٹو نے واضح طور پر یہ بات محسوس کی ہے کہ عالمی معیشت اور عالمی سیاست افریقی کا شکار ہیں۔ ایسی صورت میں ترقی پذیر اور نئے آزاد ملکوں کو چاہیے کہ وہ بین الاقوامی تعلقات کی غیر یقینی صورت حال سے ہمہ برآ ہونے کی کوشش کریں۔ دنیا کے غریب ملکوں کو اتحاد اور تعاون کے ذریعہ حوصلہ کے ساتھ سیاسی اور معاشی استحکام اور ایسے عالمی معاشی نظام کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے جس میں ہر ایک کو ترقی کے فوائد حاصل ہوں اور ایک دوسرے کے انفرادی مفاد پرورے ہو سکیں۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۷۵ء میں جب وہ وزیر خارجہ تھے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "جب تک افریقہ کے باقی ملکوں (انگولا، موزمبیق، جنوب مغربی افریقہ (نامیبیا) رھوڈیشیا اور جنوبی افریقہ سے نوآبادیاتی نظام ختم نہیں ہوتا اور ان علاقے کے لوگوں کو اپنا مستقبل آپ طے کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا افریقہ میں امن قائم نہیں ہوگا۔ موجودہ حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے بھی جناب ذوالفقار علی بھٹو نے نوآبادیاتی نظام، نسل پرستی اور نسلی امتیاز کے خلاف افریقی عوام کی جدوجہد کی سرگرمی کے ساتھ حمایت کی ہے۔ یہ حمایت ایکٹن اقوام متحدہ اور اس کے اداروں اور دوسرے بین الاقوامی اداروں میں سفارتی سطح پر اور دوسری طرف مادی امداد دے کر کی گئی ہے۔

پاکستان افریقہ کے دوسرے علاقوں میں آزادی کی زوردار تحریکوں کو قوت پہنچانے کے علاوہ افریقہ میں پرتنگال کی نوآبادیاتی شہنشاہیت کے خاتمہ کو گہری دلچسپی سے دیکھتا رہا ہے۔ اس شہنشاہیت کے خاتمہ سے افریقہ کے وسیع علاقے مزید خون خرابے اور اخلاقی انحطاط سے بچ گئے۔ پاکستان نے رھوڈیشیا اور جنوبی افریقہ میں سفید فام آبادکاروں کی اقلیتی حکومتوں کی ہمیشہ مدت کی ہے۔ اقوام متحدہ نے آزادی کی حمایت میں جو بھی قدم اٹھایا ہے پاکستان نے اس کی ہمیشہ حمایت کی ہے پاکستان نے رھوڈیشیا کے لوگوں کو حق خود ارادیت دلانے کے لئے اقوام متحدہ کے منشور کے تحت ہر اقدام کی حمایت کی ہے اس میں طاقت کا استعمال بھی شامل ہے۔

یہ ہے کہ اسرائیل ایک نوآبادیاتی ملک ہے جو بین الاقوامی سازش کے تحت عربوں پر مسلط کر دی گئی ہے۔ اس کے قیام کی وجہ سے عربوں کی بڑی تعداد کو بے گھر ہونا پڑا ہے اور انہیں ان کے بنیادی انسانی اور سیاسی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے، یہ ایک بہت بڑا انسانی المیہ ہے۔

عربوں کے ساتھ کامل ہم آہنگی

عربوں کے ساتھ پاکستان کا اتحاد غیر شرط اور بھرپور ہے۔ ۱۹۷۰ء تک جبکہ اقوام متحدہ میں لیبیا، صومالیہ، تیونس، مراکش اور الجزائر کی آزادی کے مسئلے زیر بحث تھے، اقوام متحدہ میں بحث کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان نے اس بات کی پروا کئے بغیر کون سی بڑی طاقت اس سے ناراض ہو جانے کی ان تمام ملکوں کی آزادی کی کھل کر حمایت کی۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں پاکستان نے سوئٹزرلینڈ کے علاقے برطانوی فوجوں کے انخلا کے سوال پر اور پھر ۱۹۵۶ء میں نہر سوئٹزرلینڈ کی ملکیت میں لینے کے سوال پر صبر کی حمایت کی۔ ۱۹۶۱ء میں پاکستان نے الجزائر کی قومی تحریک آزادی کی قائم کی ہوئی عبوری حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اس موقع پر پاکستان نے اس بات کی مطلق پروا نہیں کی کہ فرانس جو سلامتی کونسل کا ممبر ہے اس سے ناراض ہو جائے گا اور جموں و کشمیر کے معاملے میں اقوام متحدہ میں اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔

جب سے ۱۹۷۱ء میں عوامی حکومت نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں اقتدار سنبھالا ہے تیسری دنیا کے ساتھ پاکستان کی دوستی اور یگانگت اور بڑھ گئی ہے ان ملکوں کے ساتھ پاکستان کے دوایتی رشتے شروع ہی سے قائم ہیں کیونکہ وہ تاریخ کے ایک ہی دور سے گزر رہے ہیں اور ان کے مفادات میں بھی یکسانیت ہے۔

تیسری دنیا کی حمایت

محکوم اور استحصال کے طویل دور کے بعد اب تیسری دنیا اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو رہی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد انسانی معاشروں میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں ہوئی ہیں تیسری دنیا کے



وزیراعظم پاکستان سعودی عرب کے
اعلیٰ حضرت شاہ خالد سے گفتگو فرما رہے ہیں



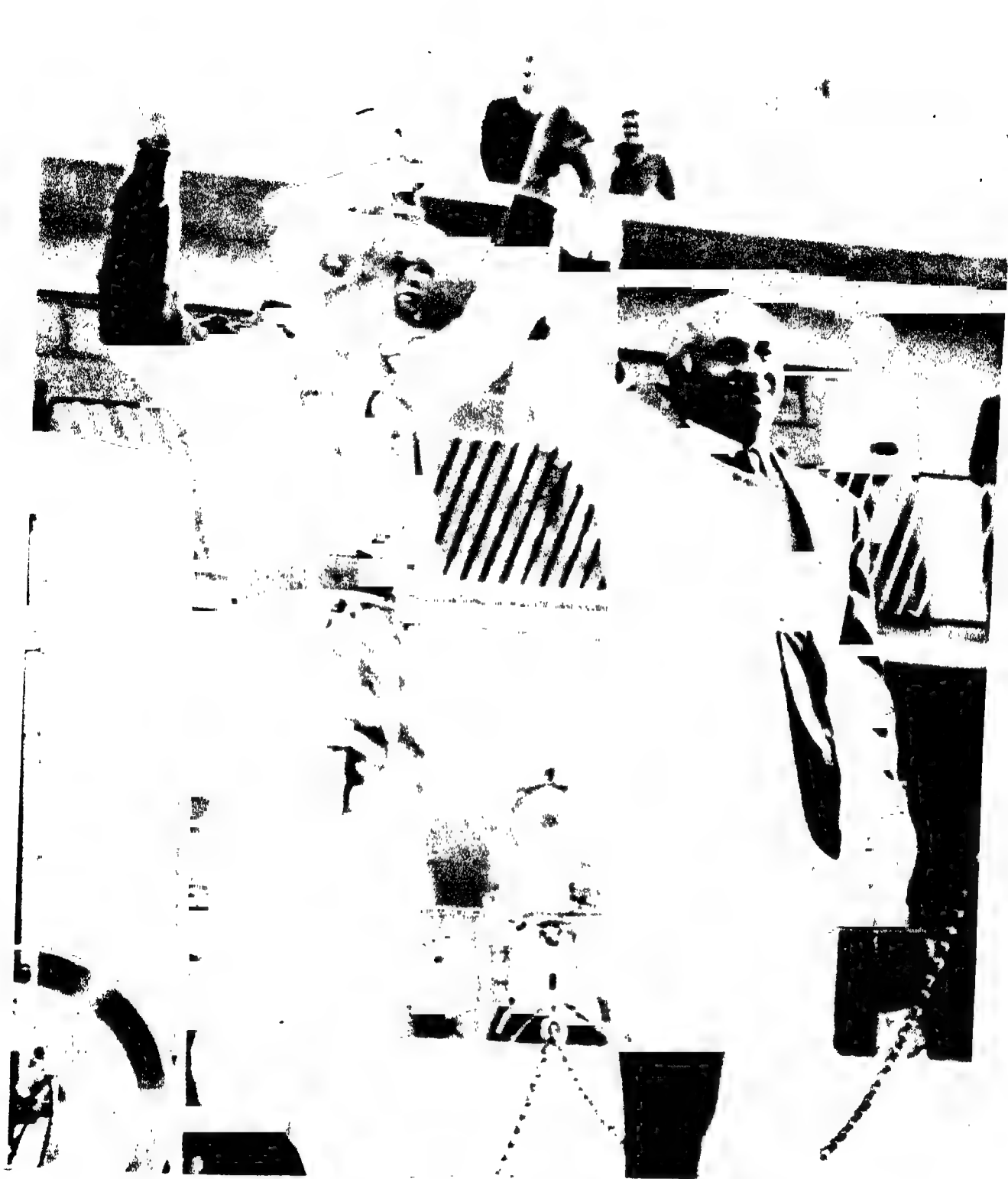
مصر کے صدر سادات صدر پاکستان سے بنگلہ گیر ہو رہے ہیں

وزیراعظم شام کے صدر حافظ الاسد کے ساتھ

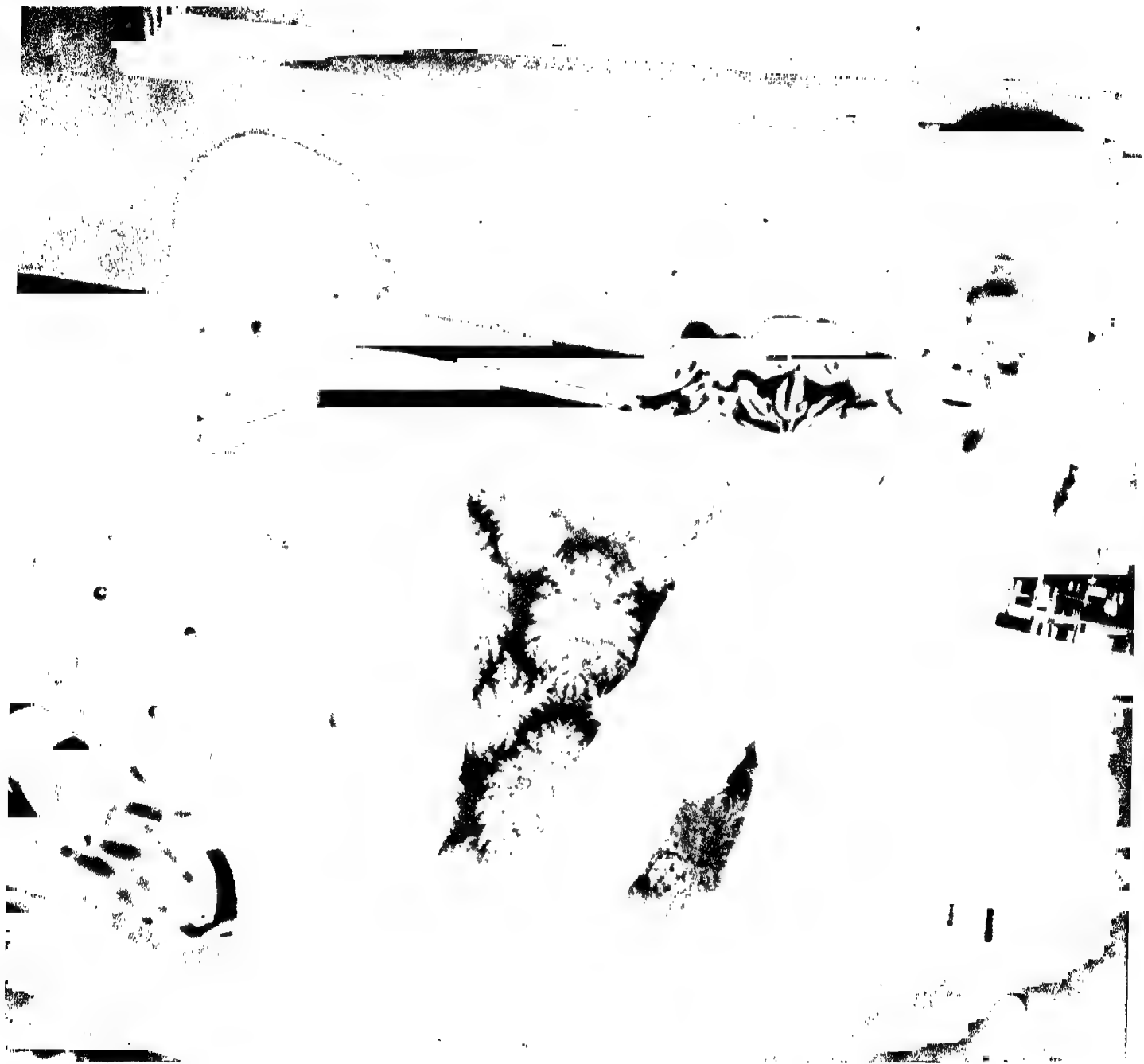


ایلیفمزت شهنشاه ایران وزیر اعظم پاکستان کے ساتھ

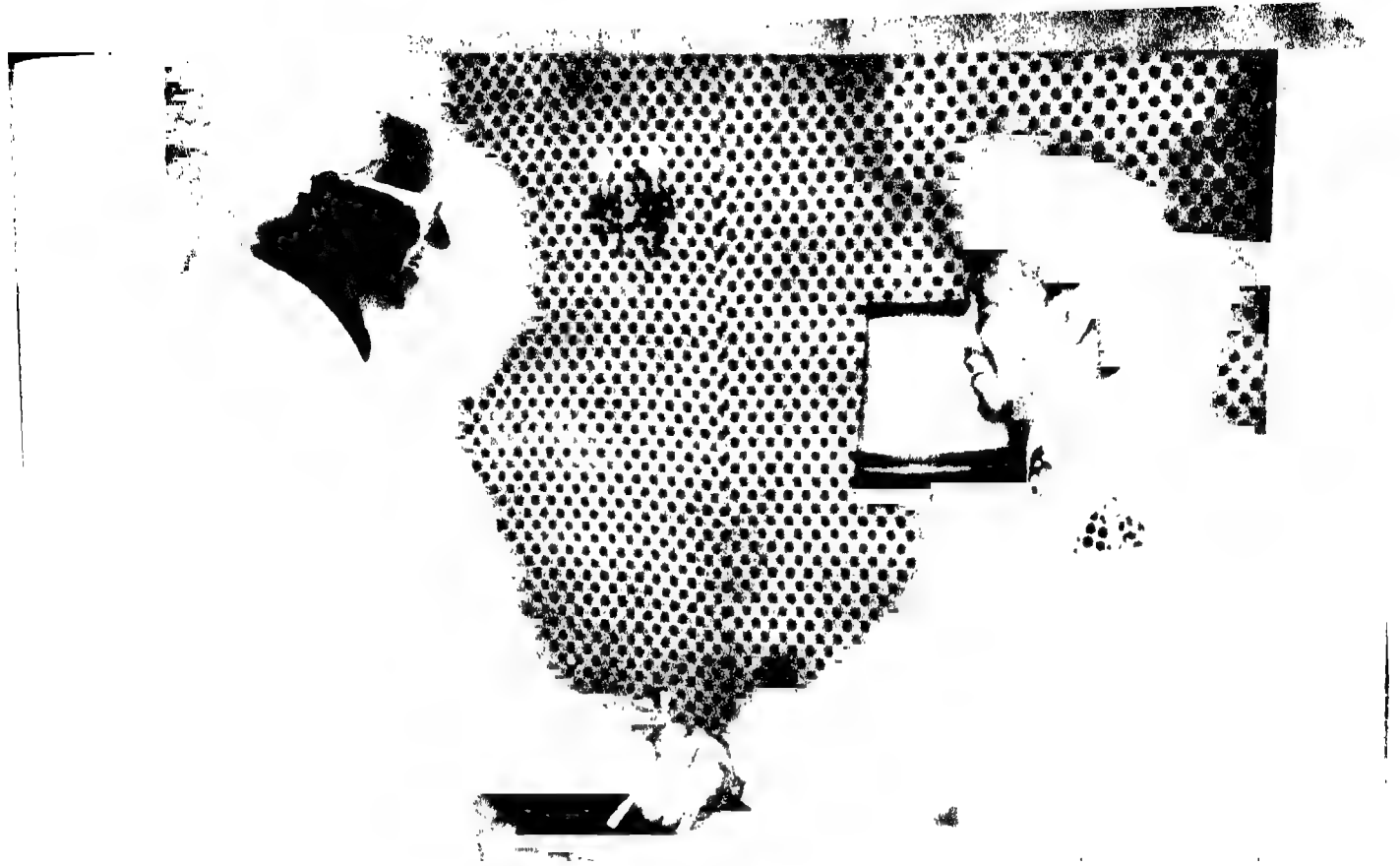




یہا کے صدر جناب قدان وزیراعظم پاکستان کے ساتھ



سوڈان کے صدر وزیر اعظم پاکستان کے ساتھ



صدر مملکت ملائیشیا کے بادشاہ سے مصافحہ کر رہے ہیں

مقدمہ عرب امارات کے صدر الشیخ زید بن سلطان الہنیان وزیر اعظم پاکستان سے مصافحہ کر رہے ہیں





وزیر اعظم امیر کویت کے ہمراہ



سزى لىكاى وزير اعظم محترمہ شرياد و بندرانالى
وزير اعظم پاكستان اور يقيم نصرت بيمو كى ساهه

برادری کے لئے بڑی نعمت ثابت ہوگا؟

۱۹۷۱ء میں ایک نیا پاکستان جو اپنی ہئیت اور اپنی انگلوں کے معاملہ میں بالکل نیا تھا منظر عام پر آیا اور صبح معنی میں عوام کی نامندہ حکومت نے اقتدار سنبھال لیا، ۱۹۷۲ء کے اوائل میں پاکستان نے شمالی ویت نام، شمالی کوریا اور مشرقی جرمنی کو سفارتی طور پر تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد کمبوڈیا کی شاہی حکومت، کوجس کے سربراہ شہزادہ سہانوک تھے اور جو ہینگنگ میں کام کر رہے تھے تسلیم کر لیا گیا۔

بائٹن برطانوی دولت مشترکہ سے الگ ہو گیا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ پاکستان قریب سوہ نظام کی بجائے عالمی مسائل میں بدستے ہوئے حالات پر نظر رکھنے کا حامی ہے۔

تیسری دنیا کے ملکوں نے بھی مختلف طریقوں سے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ پاکستان کے اصولی موقف کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں جب پاکستان کو بیرونی جارحیت کا نشانہ بنایا گیا تو ان ملکوں نے پاکستان کی اخلاقی حمایت کا بھرپور اظہار کیا۔ تیسری دنیا کے دوست ملکوں نے ان پاکستانی فوجیوں اور شہریوں کو جو تمام بین الاقوامی قوانین اور اخلاقی اصولوں کے برخلاف ایک سال سے زیادہ عرصہ ہندوستان میں نذر بند تھے رہائی دلانے کے لئے بڑا مفید کردار ادا کیا۔

۱۹۷۴ء میں اقوام متحدہ میں تیسری دنیا کی طرف سے پاکستان کی بھرپور حمایت کا واضح اظہار اس وقت ہوا جب جنرل اسمبلی نے پاکستان کی پیش کی ہوئی وہ قرارداد بھاری اکثریت سے منظور کر لی جس میں کہا گیا تھا کہ جنوبی ایشیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک علاقہ قرار دیا جائے تاکہ اس علاقے کے مالک ایٹمی حملے یا ایٹمی بلیک میل سے بے خوف ہو کر اپنے مسائل کوئی تعمیر کے لئے کام میں لانے پر توجہ دے سکیں۔ پاکستان پچھلے دنوں ایشیائی نشست پر سلامتی کونسل کا ممبر منتخب ہوا ہے۔ یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ اقوام متحدہ میں جہاں افریقی ایشیائی ملکوں کی بھاری اکثریت ہے پاکستان کی بڑی عزت ہے جیسا کہ پاکستان کے وزارت خارجہ کے سیکریٹری مسٹر آغا شاہی نے کہا تھا۔ پاکستان کی کامیابی اس بات کا ایک اور ثبوت ہے

پاکستان افریقی عوام کی سیاسی انگلوں کا بھرپور حامی ہے اس لئے اس نے جنوبی افریقہ سے کسی نوعیت کے سیاسی یا تجارتی تعلقات قائم نہیں کئے جنوبی افریقہ کے ہوائی جہازوں کو پاکستان میں اترنے یا پاکستانی علاقے پر پرواز کرنے اور جنوبی افریقہ کے بحری جہازوں کو پاکستانی بندرگاہوں میں داخلے کی اجازت نہیں ہے یہ تدابیر افریقی عوام کی تحریک آزادی کی حمایت کے لئے اختیار کی گئی ہیں۔

اسی طرح پاکستان جنوبی افریقہ کے چنگل سے نجات پانے کے لئے نیبیا کے عوام کی تحریک آزادی کی بھرپور حمایت کر رہا ہے پاکستان نیبیا کے لئے اقوام متحدہ کی کونسل کا ممبر ہے جس کے کل ۱۸ ممبر ہیں۔ نیبیا کے لئے اقوام متحدہ کا پہلا ہائی کمشنر ایک پاکستانی تھا۔ پاکستان نیبیا کے لئے اقوام متحدہ کے فنڈ میں بھی باقاعدگی کے ساتھ چندہ دیتا ہے تاکہ وہاں کے باشندوں کی تحریک کو تقویت پہنچے اور وہاں کے باشندوں کے لئے وطن سے باہر تعلیم کا بندوبست ہو سکے۔ مگن بساؤ کی آزادی کا اعلان ہونے کے بعد ایک ماہ کے اندر پاکستان نے اسے تسلیم کر لیا اور موزمبیق کو آزادی دینے کے بعد چند گھنٹوں کے اندر اسے تسلیم کر لیا گیا۔

تیسری دنیا کے ساتھ تعاون

تیسری دنیا کے ملکوں کے ساتھ دوستی اور باہمی تعاون پاکستان کی مملکت کی پالیسی کے ان اصولوں میں شامل ہے جو انہیں میں درج ہیں۔ انہیں کی دفتر ۳۳ کے تحت مملکت پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام کے مفادات کی حمایت کرے اور بین الاقوامی امن اور تحفظ کی حوصلہ افزائی کرے۔ اس پالیسی کے تحت پاکستان نے تیسری دنیا کے تمام ملکوں کے ساتھ یا مقصد تعاون بڑھایا اور ان کے ساتھ خاص تعلقات پیدا کئے کیونکہ پاکستان میں تیسری دنیا کا ایک حصہ ہے۔

وزیر اعظم نے یوم پاکستان کے موقع پر اپنے پیغام میں کہا تھا ”ہم پاکستان کو استحصال سے پاک کرنے اور جو ہمسایہ ملک اس کے خیر خواہ ہیں ان کے ساتھ امن و امان سے رہنے کی طویل جدوجہد جاری رکھیں گے طاقتور پاکستان دنیا نے اسلام کے لئے استحکام کا ذریعہ اور افریقی ایشیائی

کر وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کی عزت اور احترام کو بڑی بلندی تک پہنچایا ہے۔

وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ جہاں ایک طرف انہوں نے عوامی حکومت کی ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے عوام کی امنگوں کے مطابق قومی زندگی کی مضبوط بنیادوں پر تعمیر فرمائی ہے اور جہاں حکومت کی بنیادیں مستحکم کی ہیں، وہاں دوسری طرف انہوں نے نہ صرف بین الاقوامی معاملات میں ملک کی کھوئی ہوئی عزت بحال کی ہے بلکہ ایک ایسے مستقبل کے حصول کے لئے جو استحصال، نسل پرستی اور فوجی استعمار سے پاک ہو، پوری دنیا کی مشترکہ جدوجہد میں بھرپور شرکت کی ہے اور اس شرکت میں جان و مال دی ہے۔

ستمبر ۱۹۷۵ء میں موزمبیق کے شہر لاکو مادوکو میں افریقی ایشیائی عوام کے اتحاد کی تنظیم کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس کے نام پیغام میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے کہا تھا:-

"افریقی ایشیائی عوام ماضی کے اس نظام کو مسترد کر چکے ہیں جو انصاف پر مبنی نہیں تھا۔ وہ اب تسلط کے نئے طریقوں اور انداز کو تسلیم نہیں کر سکتے اب ان کے تحفظ اور آزادی کو بڑی طاقتوں کی برہمستی ہوئی رقابت جھوٹان کے غیر

تصنیف شدہ یا بھی جھگڑوں، اسلحہ سازی کی دوڑ اور ایٹمی ہتھیاروں سے خطرہ لاحق ہے۔

بحر ہند میں امن کا علاقہ قائم ہو جانے سے بیشتر افریقی ایشیائی ملکوں کو علاقہ کے اندر اور باہر سے ایٹمی خطرے سے بڑی حد تک نجات مل جائے گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ کانفرنس ایسے حازک وقت میں ہو رہی ہے۔ جبکہ ہمارے عوام ترقی خوشحالی اور اپنی تقدیر کے مالک بننے کی جدوجہد میں فیصلہ کن مرحلہ پر پہنچ گئے ہیں۔ اس بڑی عالمی برادری کے جبر کی حیثیت سے جو برسوں تک استحصال کا شکار ہونے کے بعد اب اپنے حقوق حاصل کر رہی ہے، پاکستان اپنا کردار سرگرمی سے ادا کر رہا ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے چھٹے اور ساتویں خاص اجلاسوں میں جن میں ترقی کے مسائل اور ایک نیا بین الاقوامی معاشی نظام کی بحث کیا گیا تھا پاکستان نے ایک مضبوط موقف اختیار کیا جو اصولوں پر مبنی تھا، پاکستان نے ایک طرف تو یہ بات واضح کی کہ تمام ملکوں کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ خود مختار ہوں اور انہیں اپنے قدرتی وسائل پر اختیار حاصل ہو۔ دوسری طرف اس بات کی حمایت کی کہ باہمی تقاضا کی بجائے گفت و شنید کے ذریعہ اس معاشی بحران کو دور کیا جائے جو مختلف براعظموں کو اپنی پلیٹ میں لئے ہوئے ہے۔

پاکستان میں ترقیاتی منصوبہ بندی

جناب رانا محمد حنیف

وزیر خزانہ منصوبہ بندی و ترقیات

۱۹۷۰ء تک ترقیاتی سرگرمیوں کے لئے جو لائحہ عمل اختیار کیا گیا اس کا بنیادی مقصد مجموعی قومی پیداوار، برآمدات، بچت اور سرمایہ کاری بڑھانا تھا۔ منصوبہ بندی کی یہ شکل عوام کی ضرورتوں اور امنگوں کے مطابق نہیں تھی۔ خاص طور پر اس سے ترقی کے فوائد کی منصفانہ تقسیم کا نقصان پورا نہیں ہوتا تھا۔ معاشرتی شعبوں میں سرمایہ کاری کے دور رس اثرات اور عوام کے حالات زندگی بہتر بنانے پر پوری توجہ نہیں دی گئی تھی۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں جب عوامی حکومت نے اقتدار سنبھالا اس وقت ملک کو بہت بڑے معاشی بحران کا سامنا تھا۔ اس بحران کی بنیاد یہ تھی کہ عوام اس معاشی نظام سے مطمئن نہیں تھے جس کے نتیجے میں ایک طرف ان کے حالات خراب ہو رہے تھے اور دوسری طرف دولت مندوں کا ایک چھوٹا سا طبقہ ابھر رہا تھا۔ ترقی کے میدان میں علاقائی اور معاشرتی توازن برقرار رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی جس سے مزید کشیدگی کا ماحول پیدا ہو گیا۔ اس کشیدگی نے ایسی شدت اختیار کر لی کہ روایتی ترقی بھی ممکن نہیں رہی۔ سرمایہ کاری اتنی کم ہو گئی کہ پرانی مشینوں کی جگہ نئی مشینیں لگانے کے بعد برائے نام ہی رقم باقی بچی۔ بجلی اور ٹرانسپورٹ جیسے اہم شعبوں میں رکاوٹوں اور کارخانہ داروں اور مزدوروں کے تعلقات میں کشیدگی کی وجہ سے

پاکستان میں معاشی ترقی کی منصوبہ بندی پچھلے بیس سال سے ہوتی رہی ہے۔ اس شعبہ میں کامیابی کی رفتار بھی تیز کبھی سست رہی ہے۔ پہلے ترقیاتی منصوبے کو (۱۹۵۵-۶۰) کافی سیاسی حمایت حاصل نہیں ہو سکی۔ پھر بھی اس سے ملک میں ترقیاتی سرگرمیوں کے مرحلہ کی ابتدا کرنے میں مدد ملی۔ دوسرا ترقیاتی منصوبہ (۱۹۶۰-۶۵) ترقی کے روایتی اعداد و شمار کی روشنی میں بظاہر بڑا کامیاب رہا۔ لیکن اس سے بہت سے مسائل بھی پیدا ہو گئے جن کا قوم کو ابھی تک سامنا ہے۔ تیسرا منصوبہ (۱۹۶۵-۷۰) غیر ملکی امداد رک جانے اور ۱۹۶۵ء کی جنگ کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوا۔ چوتھا منصوبہ (۱۹۷۰-۷۵) ایک ایسی حکومت نے تیار کیا تھا جس نے برملا اعتراف کیا تھا کہ اس نے محض اس وقت تک کے لئے عارضی طور پر اقتدار سنبھالا ہے جب تک عوام کے منتخب کئے ہوئے نمائندوں کو اختیار منتقل نہیں کیا جاتا۔ ۱۹۷۵ء کے بعد پاکستان کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑا ان کی وجہ سے چوتھا منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ یہ منصوبہ بالکل جھگڑا تاریخی اور جغرافیائی حالات میں تیار کیا گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی۔

مجموعی طور پر معاشی منصوبہ بندی کا نمایاں اثر ہوا ہے۔ لیکن

کئے ہوئے مستقل آئین میں معاشی پالیسی اور منصوبہ بندی کے ذریعہ معاشرتی انصاف حاصل کرنے کے بنیادی اصول شامل کئے گئے۔ وہ اصول مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ پسماندہ طبقوں اور علاقوں کے تعلیمی اور معاشرتی مفادات کو خاص توجہ سے تقویت پہنچائی جائے۔

ب۔ ناخواندگی کا خاتمہ اور کم سے کم مدت میں مفت اور لازمی طور پر ثانوی تعلیم کی سہولتوں کی فراہمی۔

ج۔ ملک کے وسائل کے اندر تمام شہریوں کو مناسب آرام اور تفریح کے ساتھ کام اور روزگار کی سہولتیں مہیا کرنا۔

د۔ ایسے تمام شہریوں کو جو معیشت، بیماری یا بے روزگاری کی وجہ سے مستقل یا عارضی طور پر روزی کمانے کے قابل نہ رہے ہوں بلا تفریق مرد و زن و ذات، نسل یا مذہب زندگی کی بنیادی ضرورتیں روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور علاج معالجہ کی سہولتیں فراہم کرنا۔

ہ۔ ملک کے تمام افراد جن میں مختلف درجوں کے سرکاری ملازم بھی شامل ہیں کی آمدنیوں اور اجرتوں میں عدم مساوات ختم کرنا۔

و۔ مختلف علاقوں کے لوگوں کو تعلیم، تربیت، زرعی اور صنعتی ترقی اور دوسرے ذریعوں سے تمام قومی سرگرمیوں میں جن میں سرکاری ملازمتیں بھی شامل ہیں پوری طرح شریک ہونے کے مواقع فراہم کرنا۔

ترقیاتی منصوبہ بندی کے شعبے میں موجودہ حکومت نے بہت سی پالیسیاں اور پروگرام اختیار کئے ہیں جنہیں گولانچ سالہ ترقیاتی منصوبوں کے دائرے میں واضح نہیں کیا گیا ہے لیکن ان کا نئے معاشی اور معاشرتی نظام سے گہرا تعلق ہے۔ سالانہ ترقیاتی منصوبے مرتب کرنے اور ان پر عمل درآمد کے سلسلے میں ان باتوں کا خیال رکھا گیا ہے

ا۔ معیار زندگی بلند کرنا۔

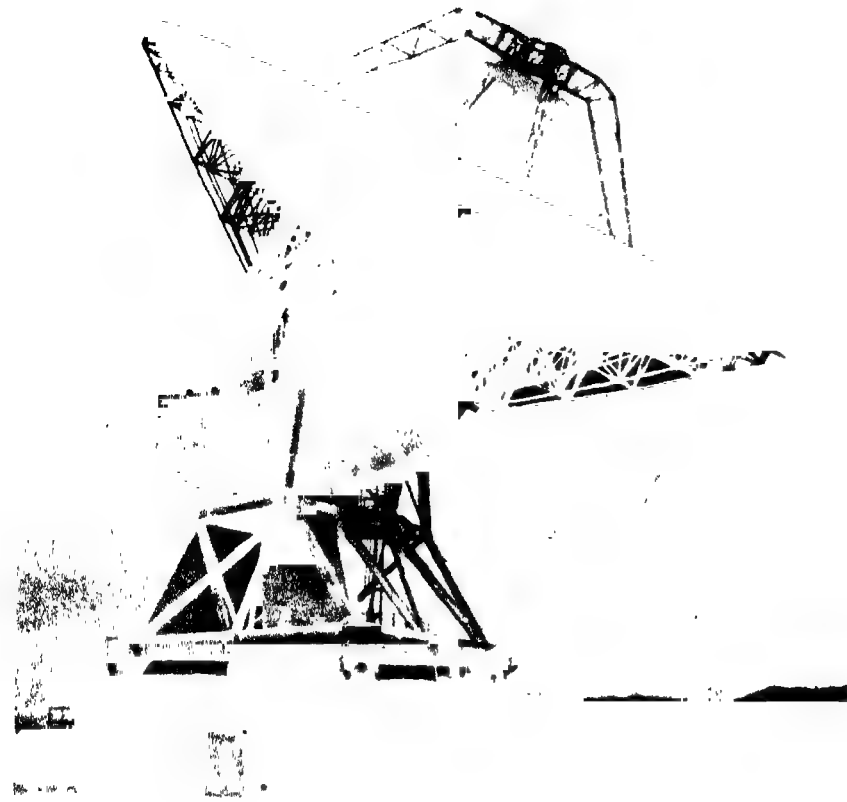
ب۔ عوامی اداروں کی خدمات کو بہتر بنانا

ج۔ آمدنی اور روزگار کی زیادہ سے زیادہ لوگوں میں بہتر

نہ صرف پہلے حاصل کی ہوئی کامیابیوں کا اثر زخمی ہو گیا بلکہ ان خطا طما خطرناک رجحان شروع ہو گیا۔ اس کا انسداد نہ کیا جاتا تو لمبی مدت کی معیشت بری طرح متاثر ہوتی۔ اس زمین اور شدید بحران پر قابو پانے کے لئے حکومت نے سالانہ ترقیاتی پروگراموں کا سلسلہ شروع کیا تاکہ ایسی پالیسیاں اختیار کی جائیں جن سے فوری نتائج حاصل کئے جاسکیں۔ پانچ پانچ سال کے لئے ترقیاتی منصوبہ بندی مفید ثابت نہ ہوتی لیکن اس سے پہلے کہ سالانہ ترقیاتی پروگراموں کا سلسلہ شروع کیا جاتا معیشت کی بنیادی حیثیت برلنے کے لئے بہت سی معاشی اصلاحات کی گئیں۔ معاشی بحالی سے پہلے معاشی اصلاحات ضروری تھیں، اعتدال کا پہلا دور جنوری سے مئی ۱۹۷۲ء تک چھ مہینے سے بھی کم مدت میں مکمل کر لیا گیا۔

معیشت کے ڈھانچہ میں بنیادیں تبدیلیاں کرنے کے لئے زراعت، صنعتی تعلقات، صنعت، صحت اور تعلیم کے شعبوں میں اصلاحات کی گئیں۔ حکومت نے بہت سی معاشی سرگرمیوں کا انتظام براہ راست خود سنبھال لیا۔ صنعتی شعبے میں اصلاحات کا مقصد یہ تھا کہ ملک کی معاشی ترقی میں سرکاری شعبہ زیادہ حصہ لے سکے اور صنعتوں کی ملکیت کی بنیاد وسیع کی جائے۔ لیبر اصلاحات کا مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کو ان کے بنیادی حقوق، ملازمت کا تحفظ میمنٹ میں مناسب حصہ اور مالی فوائد حاصل ہوں۔ زرعی اصلاحات کا مقصد یہ تھا کہ کسانوں کے مفادات کا تحفظ ہو اور زراعت کو سہید بنا یا جائے۔ ملک کے وسائل کو اس طرح کام میں لانے کے لئے کہ پہلے سے زیادہ معاشی ترقی ہو سکے اور معاشرتی انصاف بھی حاصل ہو سکے، مالیات، بنکارتی اور بیمہ کے شعبوں میں اصلاحات کی گئیں۔ صحت اور تعلیم جیسے معاشرتی شعبوں میں اصلاحات کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تعلیم اور علاج معالجہ کی سہولتیں حاصل ہوں۔

عارضی آئین اور اگست ۱۹۷۳ء میں اتفاق رائے سے منظور



ارتھ سیٹلائٹ اسٹیشن
دیہر مندرو (سندھ)
کا اسٹیشن

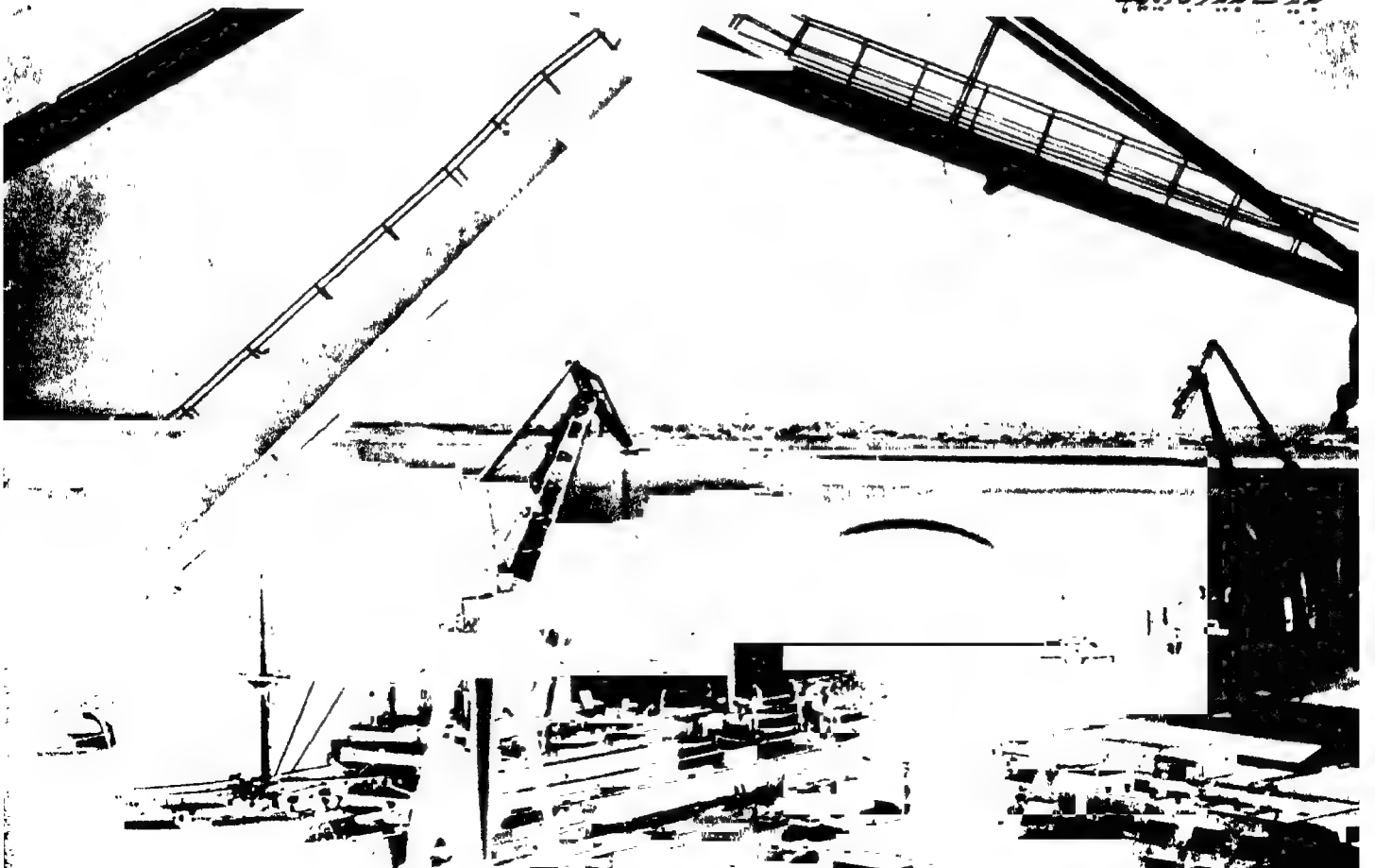


کیمیکل کمپنی کالہ شاه کا کو (پنجاب)

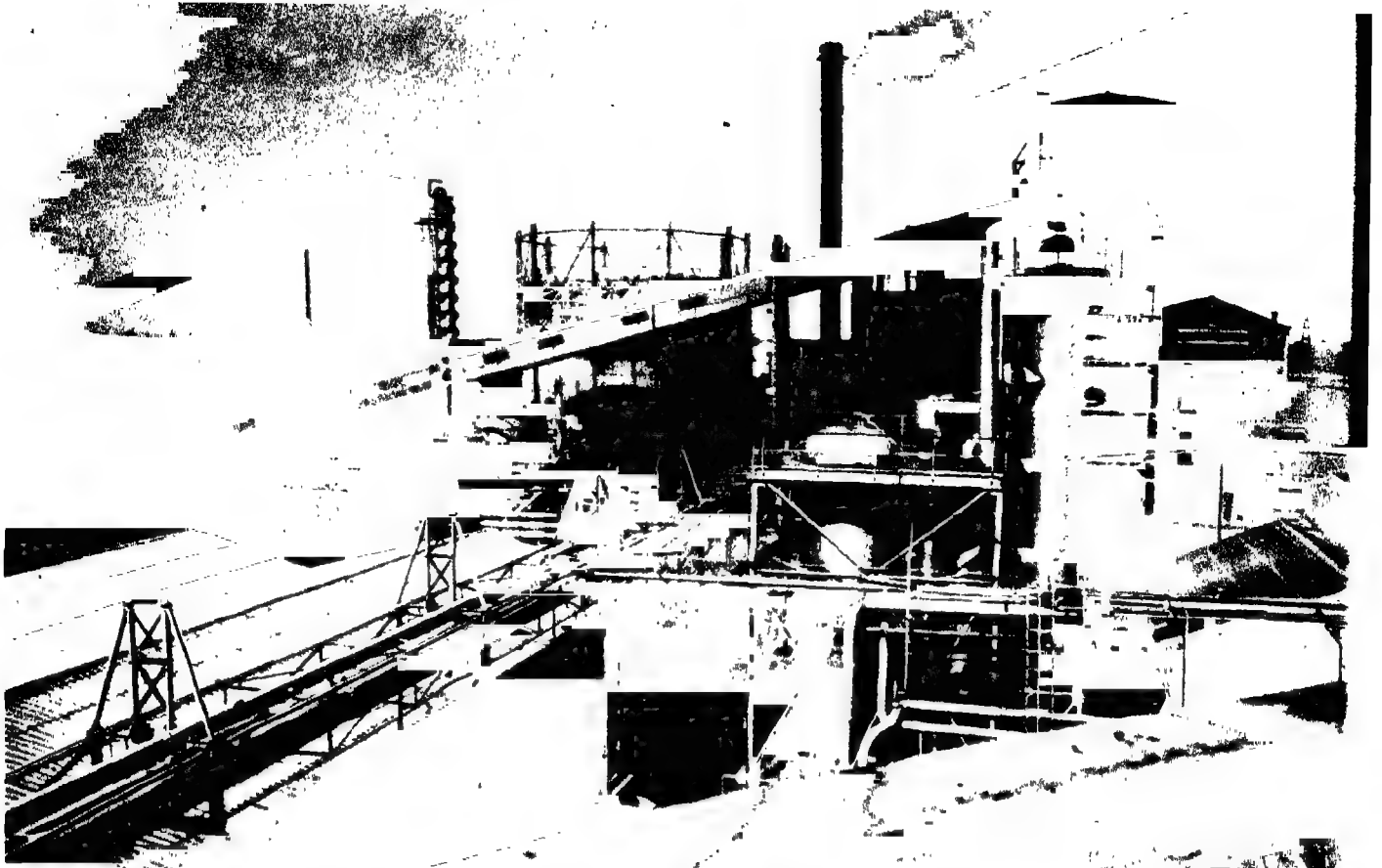




پنجاب کی ایک ٹیکسٹائل مل کا اندرونی منظر



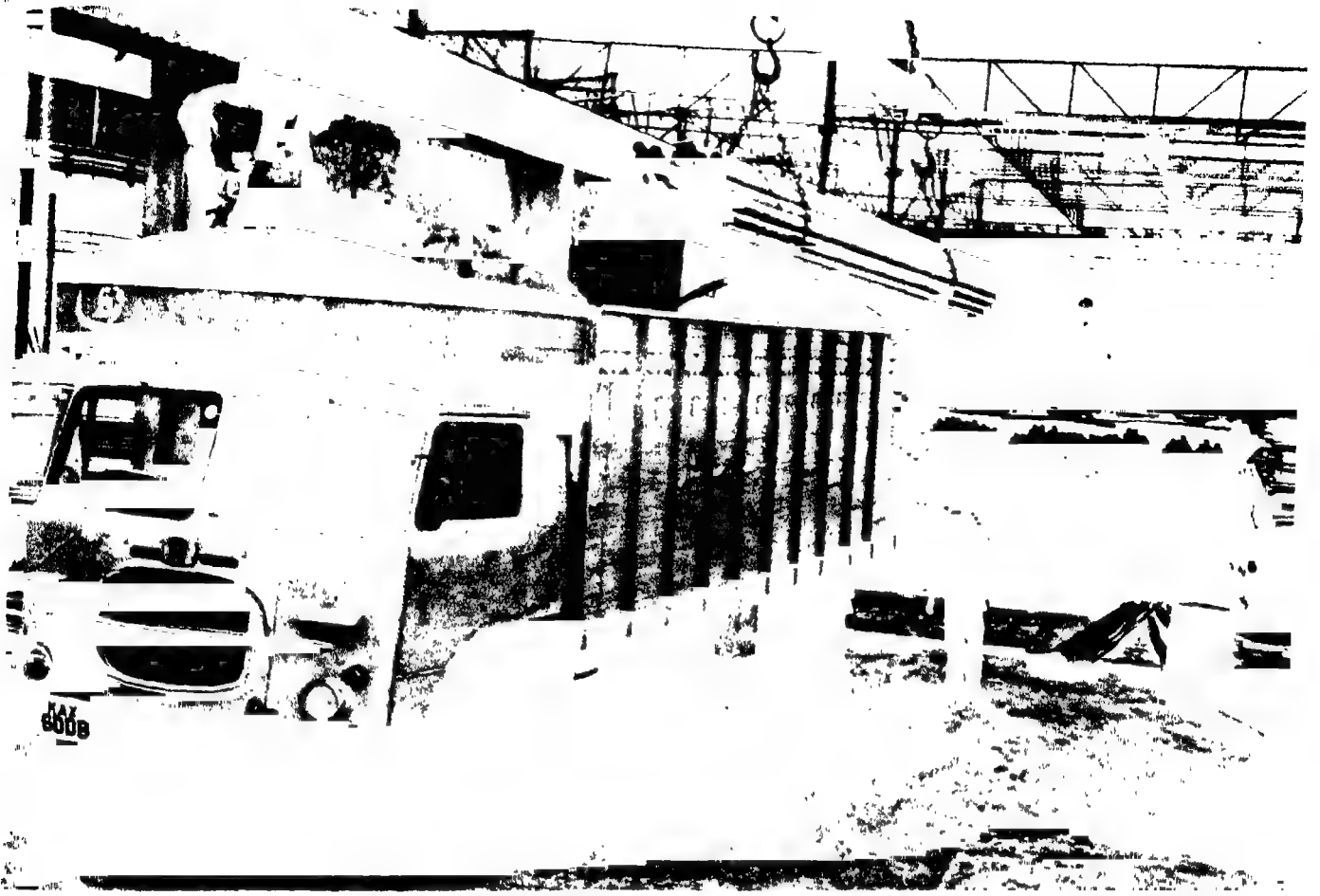
کراچی کی ہسٹورک گاہ کو
جدید سے جدید بنادیا گیا ہے



داؤد خیل میں کھاد کا کارخانہ

مٹان میں قدرتی گیس سے چلنے والا کھاد کا کارخانہ





ایک جدید پائپ فیکٹری



نیشنل موٹر ویکل میں ایک ٹرک کے
پرنسپل جو شے جا رہے ہیں

طریقے سے تقسیم۔

د۔ ملک کے پسماندہ علاقوں کی تیز و ترقی اور ملک کے معاشی نظام سے ان کو مربوط کرنا۔

پیداواری شعبوں کو مضبوط بنا کر اور درآمدات کے مقابلے میں

۴۔ برآمدات بڑھا کر خود کفالت کا حصول۔

یہ دور عالمی معیشت میں ایسی اہم تبدیلیوں کے لئے متفرد ہے جنکی وجہ سے ان ترقی پذیر ملکوں میں جہاں تیل پیدا نہیں ہوتا عظیم

اقتصادی پھل پیدا ہو گئی۔ دنیا میں افراط زر میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے بعد تیل پیدا کرنے والے ممالک تیل کی بہتر قیمت

حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کے صنعتی ملکوں میں بڑے پیمانہ پر مندرے کا دور شروع ہو گیا۔ ان حالات

کی وجہ سے ترقی پذیر ملکوں کو بہت بڑا ابوجہ برداشت کرنا پڑا۔ پاکستان پر اس عالمی معاشی بحران کا اثر ۱۹۷۳ء میں سیلاب اور

۱۹۷۴ء میں خشک سالی کی وجہ سے اور بھی بڑھ گیا۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ پاکستان کی معیشت کا بیشتر انحصار

غیر ملکی تجارت پر ہے اس لئے بین الاقوامی حالات کا قومی معیشت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ پاکستان نے ۱۹۷۴ء میں اندازاً ایک ارب ڈالر

کی درآمدات کیں جو مجموعی ملکی پیداوار کے دس فیصد کے برابر ہے۔ جرمین باہر سے درآمد کیا گیا وہ ملک میں پیدا ہونے والے

خدمات اور مال کے بیس فیصد کے برابر تھا۔ اس طرح ایک تنہائی مال پر براہ راست اثر پڑتا ہے جبکہ اس سے کہیں زیادہ چیزیں

بالواسطہ متاثر ہوتی ہیں۔ ان حالات میں پاکستان کی برآمدات اور ان سے حاصل ہونے والی آمدنی میں بڑی کمی آگئی۔ دوسری طرف گندم

کی پیداوی کھا دکھانے کے تیل اور پٹرول جیسی ضروری اشیاء کی مانگ کم نہیں کی جاسکتی تھی۔ پاکستان کو ان اشیاء کی کمی گت زیادہ

قیمت ادا کرنی پڑی۔ درآمدات کی قیمتوں میں اضافہ اور برآمدات کی قیمتوں میں کمی سے ایک سال کے اندر نقصان کا اندازہ اسی لئے

کر ڈال رہے ہیں۔ اس طرح وسائل کم ہو گئے اور دوسری طرف

سرمایہ کاری میں اضافہ کی ضرورت اور شدید ہو گئی۔ پوری معیشت میں قیمتوں کا اضافہ شدت سے محسوس ہونے لگا۔ حکومت کو ایک طرف تجارت

کے غیر مفید حالات کی روک تھام اور دوسری طرف ملکی معیشت میں جمود توڑنے کے لئے مناسب اقدامات کرنے پڑے۔ ان اقدامات کی کامیابی

کلیا ہر ہونے لگی ہے اور معیشت میں جان آنے لگی ہے۔ ظاہر ہے کہ بھی ملک عام آدمی کی زندگی پر اس کا کوئی واضح اثر نہیں پڑا۔ ابھی صرف ابتدا

ہوتی ہے اور سمت کا تعین ہوا ہے۔ حکومت نے اس ارادہ سے کہ قیمتوں میں اضافے کے چکرے عالم آدمی کے اخراجات زندگی پر کم سے کم اثر پڑے ایک طرف تو بڑی مقدار میں اشیاء

درآمد کیں اور دوسری طرف گندم، بناسپتی گھی شکر اور موٹے کپڑے کی قیمتوں کو مناسب سطح پر رکھنے کے لئے رعایتی قیمتیں مقرر کیں جو مالی

اقدامات کئے گئے ان میں خسارے کی سرمایہ کاری کی مکمل روک تھام بھی شامل ہے۔ افراط زر کی روک تھام کے لئے بھی زور دار مالی پالیسی

اختیار کی گئی۔ اس پالیسی کے تحت بینک اور بچت کی اسکیموں کی شرح میں اضافہ کیا گیا اور پرائیویٹ بچت کے لئے ترغیبات مہیا کی گئیں۔

نجاتی پالیسی کے تحت بھی افراط زر کی روک تھام کے لئے غذائی اشیاء مثلاً گوشت مرغی، سبزیوں والوں وغیرہ کی برآمدات کو بند کر دی گئی۔

برآمدی محصول بڑھا دیا گیا۔ زیادہ سے زیادہ غیر ملکی زرمبادلہ خرچ کر کے گندم اور بناسپتی درآمد کیا گیا تاکہ یہ اشیاء براہ دستیاب ہوتی

رہیں اس کے نتیجے میں حکومت کو بھاری رقم رعایتی قیمتوں کی مدد میں صرف کرنی پڑی اور تدریجی انداز میں قیمتوں میں کچھ اضافے بھی کرتے پڑے

تاکہ توازن قائم ہو۔

ملک کو بڑے پیچیدہ بیرونی اور اندرونی مسائل کا سامنا کر رہا ہے۔ پھر بھی پچھلے سال میں سالانہ ترقیاتی منصوبوں کے واضح مقاصد

متعین کئے گئے وہ مقاصد یہ ہیں۔

(۱) موجودہ گنجائش کے بھرپور استعمال اور برآمدات میں اضافہ

کے ذریعہ سرمایہ کاری کی سطح بڑھا کر ترقیاتی سرگرمیوں میں

اضافہ۔

ب۔ بجلی پیداوار اور بہم رسانی، اور پانی کی فراہمی جیسے اہم شعبوں میں ترقی کی رفتار میں اضافہ اور زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے سیم اور تھور پر قابو پانے کے پروگرام پر عملدرآمد۔

ج۔ ذرائع آمدورفت اور مواصلات کے نظام کو بہتر بنانا خاص طور پر ہمسامندہ علاقوں میں ان شعبوں کو دپیش رکاوٹوں کو دور کرنا۔

د۔ تعمیرات عامہ اور مربوط دیہی ترقی کے پروگراموں اور بنیادی اور زرعی صنعتیں قائم کر کے مفید روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کرنا۔

ه۔ اجرتوں، قیمتوں اور آمدنی میں مناسب توازن برقرار رکھنا اور مناسب قیمتوں پر ضروری اشیاء کی فراہمی۔

و۔ تعلیم اور علاج معالجہ کی سہولتوں کو بہتر بنانا، آبادی کی منصوبہ بندی کو اور زیادہ موثر بنانا اور شہروں اور دیہات میں مکان بنانے کی بہتر سہولتیں فراہم کرنا۔

۳۔ ۱۹۷۲ء سے اب تک معاشی ترقی

پاکستان کی معاشی تاریخ میں پچھلے چار سال بڑے مشکل لیکن اہم رہے ہیں۔ اس عرصے میں اندرونی اور بین الاقوامی حالات قومی معیشت پر برے اثرات ڈالتے رہے۔ نجی شعبہ میں سرمایہ کاری کی ترغیب ختم ہو گئی تھی۔ زرعی اور صنعتی پیداوار گھٹ گئی تھی۔ جن سے معاشی ترقی کی رفتار کم ہو گئی تھی دوسری طرف بیرونی ملکوں میں افراط زر اور مندرے کا زور تھا۔ ان تمام حالات نے پالیسی مرتب کرنے والوں کو بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ لیکن اس صورت حال کے بھی بعض مثبت پہلو قابل ذکر ہیں۔ سرمایہ کاری خاص طور پر سرکاری شعبہ میں سرمایہ کاری میں نمایاں اضافہ ہوا ہے

غلہ اور کپڑے کے فی کس استعمال اور دوسری اشیاء صرف کی دستیابی میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ صحت اور تعلیم جیسی سماجی خدمات بھی پہلے سے بہتر ہو گئی ہیں۔ جب سے عوامی حکومت نے اقتدار سنبھالا ہے ہمسامندہ علاقوں کی ترقی پر خاصی توجہ دی جا رہی ہے۔ توقع ہے کہ زرعی اور صنعتی پیداوار بڑھانے کے معاملہ میں

۷۶۔ ۱۹۷۵ء کا سالانہ ترقیاتی پروگرام ایک اہم موثر ثابت ہو گا توقع ہے کہ موجودہ مالی سال میں صنعتی پیداوار میں ۱۳ فیصد اضافہ ہو گا جبکہ ۷۵۔ ۱۹۷۴ء میں صرف ۳ فیصد اضافہ ہوا تھا۔ زرعی پیداوار میں بھی پچھلے سال کے مقابلہ میں نمایاں اضافہ ہو گا۔ مجموعی طور پر موجودہ مالی سال میں پیداوار میں ۷ سے ۹ فیصد تک اضافہ کی توقع ہے جبکہ ۷۵۔ ۱۹۷۴ء میں صرف ۳ فیصد اضافہ ہوا تھا۔

اور اس سے پہلے تین سالوں میں اوسطاً ۵ فیصد اضافہ ہوا تھا۔ ۷۲۔ ۱۹۷۱ء کے بعد سرکاری شعبہ میں ترقیاتی اخراجات چار گنے

بڑھ گئے ہیں۔ ۷۶۔ ۱۹۷۵ء میں ترقیاتی اخراجات کے لئے ۱۳ ارب ۷۰ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے جبکہ ۷۲۔ ۱۹۷۱ء میں ۱۲ ارب ۹۰ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی تھی مگر ان شعبہ میں سرمایہ کاری کی شرح ۷۲۔ ۱۹۷۱ء میں

۴ فی صد تھی ۷۵۔ ۱۹۷۴ء میں ۱۷ فیصد تک پہنچ گئی۔ مجموعی سرمایہ کاری کی شرح جو ۷۳۔ ۱۹۷۲ء میں ۱۳ فیصد تھی ۷۵۔ ۱۹۷۴ء میں ۱۷ فیصد تک پہنچ گئی۔ توقع ہے کہ ۷۶۔ ۱۹۷۵ء میں سرمایہ کاری کی یہ شرح ۱۹ فیصد تک پہنچ جائے گی۔

اب عام طور پر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ ملک میں اراعت کی بنیاد مضبوط ہے، معدنی دولت سے پوری طرح کام نہیں لیا گیا۔ اور مربوط صنعتی ڈھانچہ تیار ہو چکا ہے۔ ان تمام وسائل سے کام لے کر ملک نہ صرف موجودہ معاشی دشواریوں پر قابو پا سکتا ہے بلکہ مستقبل میں اس کی معاشی ترقی کی رفتار میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

پانچواں بیس سالہ منصوبہ

اب جبکہ اندرونی اور بیرونی معاشی حالات میں نسبتاً استحکام آ گیا ہے

برقرار رکھنے کیلئے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ یہ صورت حال بجائے خود تشویشناک ہے اس کے علاوہ اس سے افزائی طاقت کو پوری طرح کام میں لانے، کارکردگی میں اضافے صحت کی بہتری اور بچوں کے لئے تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کی راہ میں رکاوٹ پڑتی ہے۔

حکومت کا ایک اولین مقصد یہ ہے کہ غذائے لیمائی حراروں کی کمی سے کم مدت میں دور کی جائے۔ اس کے لئے محض خوراک کی پیداواریں اضافہ ہی کافی نہیں بلکہ خوراک کی تقسیم روزگار قیمتوں اور آمدنی کے بارے میں تمام پالیسیاں اس سے متاثر ہوتی ہیں۔ حکومت غذائی پیداوار میں خود کفالت کو پہلے ہی اولین قرار دے چکی ہے۔ اجرتوں کے بارے میں ایسی پالیسی پر عملدرآمد کیا جا رہا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ کم آمدنی والے طبقوں کے مفادات محفوظ رہیں۔

پاکستان جیسے ملک میں جہاں سرمایہ کم اور افزائی طاقت بہت زیادہ ہے تمام لوگوں کے لئے روزگار فراہم کرنا بہت اہم ہے۔ پیداوار کے ایسے طریقے اختیار کرنے سے جن میں زیادہ سے زیادہ مزدوروں کی ضرورت ہو افزائی طاقت کے بہتر استعمال میں مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک میں غربت کی اصل وجہ بے روزگاری یا روزگار کی غیر مناسب اجرت ہے۔ روزگار میں اضافہ سے انتہائی غربت دور کرنے میں مدد ملے گی۔ حکومت نے روزگار میں اضافہ کے لئے متعدد اقدامات کئے ہیں۔ منصوبے تحت سرمایہ کاری اور پیداوار میں اضافہ سے روزگار میں اضافہ ہوگا۔ زرعی پیداوار کو اہم ترار دینے سے دیہات کے لوگوں کی شہروں میں منتقلی کی رفتار کم ہو جائے گی اور کھیت مزدوروں کو دیہات ہی میں اچھا روزگار مل سکے گا۔

زرمبادلہ کی غیر منصفانہ شرح کی وجہ سے ایسی ٹیکنالوجی کو غیر ضروری اہمیت حاصل ہو گئی تھی جس میں سرمایہ اور درآمد شدہ مشینوں کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی ان عناصر کی وجہ سے قیمتوں کے نظام میں کئی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ حکومت نے ان خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ حکومت نے حال ہی میں ایسے اقدامات کئے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ غیر ملکی ٹیکنالوجی کی بجائے ایسی ٹیکنالوجی استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی کی جائے جس میں

یہ دیکھنا ضروری ہو گیا کہ مختلف اصلاحات اور مختلف شعبوں میں بہت مقرر کر کے جو ذمہ داریاں قبول کی گئی ہیں انہیں دستیاب وسائل سے کس طرح پورا کیا جاسکتا ہے اور اگر مجموعی وسائل سستہ راہوں تو کن منصوبوں کو ادیت دی جاسکتی ہے۔

مختلف شعبوں میں سرمایہ کاری میں بھی توازن ضروری ہے تاکہ معاشی ترقی میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔ ان حالات میں یہ ضروری ہو گیا کہ پانچ سال کے لئے معاشی سرگرمیوں کا ایک ڈھانچہ تیار کیا جائے جس کے ذریعہ طویل مدت کے لئے ترقی کا لائحہ عمل تیار کیا جاسکے۔

۸۰-۱۹۷۵ء کے لئے ترقیاتی سرگرمیوں کا ایک ہمہ گیر خاکہ ۱۹۷۵ء کے اوائل میں تیار کر لیا گیا تھا لیکن غیر یقینی بین الاقوامی حالات کے پیش نظر پانچ سالہ منصوبہ پر باقاعدہ عملدرآمد ملوثی کر دیا گیا تھا۔ اب جبکہ بہتری کے آثار واضح طور پر نظر آنے لگے ہیں منصوبہ بندی ڈویژن کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ۸۱-۱۹۷۶ء کے لئے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ تیار کرے۔ اس منصوبہ میں ان باتوں کا خیال رکھا جائے کہ دستیاب وسائل کے اندر پہلے سے زیادہ سرمایہ کاری، پہلے سے زیادہ اشیاء کا استعمال ہو سکے۔ اس سلسلے میں مختلف مطالعے مکمل ہو چکے ہیں اور مرکزی اور صوبائی وزارتوں سے تفصیلی مشورے ہو رہے ہیں۔ توقع ہے کہ منصوبے کا پہلا مسودہ دسمبر ۱۹۷۶ء تک تیار ہو جائے گا۔ اس منصوبہ میں ترقی کے لئے جو لائحہ عمل اختیار کیا جائے گا وہ مختصر طور پر درج ذیل ہے۔

ترقیاتی حکمت عملی کے عناصر

ترقیاتی حکمت عملی کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ مجموعی آمدنی میں اضافہ کا کس قدر حصہ عام آدمی کی فلاح و بہبود کے کام آتا ہے عام آدمی کی پہلی اور بنیادی ضرورت خوراک ہے۔ پاکستان میں پچھلے تین سال میں فی کس خوراک کی دستیابی میں اضافہ ہوا ہے تاہم آبادی کے ایک معتد بہ حصہ کو مناسب غذا میسر نہیں اور جتنی غذا کھائی جاتی ہے وہ حراروں کے اعتبار سے اس کم از کم مقدار سے کم ہوتی ہے جو جسمانی صحت

اس نے اختیار کیا گیا ہے کہ "ایسا معاشرتی نظام قائم کیا جائے جو استحصال سے پاک ہو لیکن جس میں اہلیتِ محنت اور حوصلہ کا مناسب صلہ دیا جاسکے انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ تیزی کے ساتھ متصفانہ معاشرہ قائم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ قومی تحویل میں لئے ہونے والے شعبہ کے ساتھ ساتھ نجی شعبہ بھی موجود ہو۔ وزیر اعظم نے ۱۹۷۲ء میں کہا تھا: "ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان کی معاشی ترقی میں نجی کاروبار کو بھی ایک کردار ادا کرنا ہے لیکن ہم کبھی ایسی صورت حال برقرار نہیں ہونے دیں گے جس میں تمام معاشی طاقت چند لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جائے اور انہیں بے شمار لوگوں کے استحصال کا موقع مل جائے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ نجی کاروبار میں قومی اور معاشرتی مفادات کے لئے یا قاعدگی پیدا کی جائے۔"

نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کے لئے حکومت نے حال ہی میں متعدد اقدامات کئے ہیں۔ نجی شعبہ پر یہ ذمہ داری ڈال دی گئی ہے کہ وہ ملک کے معاشرتی اور معاشی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے سرمایہ کاری کرے۔ پسماندہ علاقوں کی ضرورتوں کو نظر انداز نہ کرے۔ صنعتوں اور کاروبار کے انتظام میں معاشیات اور ٹیکسوں کے قوانین کا پورا احترام کرے اور مزدوروں اور صارفین کے مفادات کا پورا خیال رکھے۔

کسی بھی معاشی لائحہ عمل میں مختصر اور طویل مدت کے مقاصد سامنے رکھنے ضروری ہوتے ہیں۔ بعض حالات میں یہ مقاصد باہم متصادم ہوتے ہیں ایسے حالات میں حکومت کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ لمبی مدت کے منصوبوں میں سرمایہ کاری پر زور دیا جائے یا ان منصوبوں پر توجہ دی جائے جن سے فوری طور پر فوائد حاصل ہو سکتے ہیں فوری طور پر منفعت دینے والے منصوبوں کی کشش کے باوجود کوئی ذمہ دار حکومت ان مسائل کو نظر انداز نہیں کر سکتی جو لمبی مدت میں حل ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر تعلیم، آبادی کی منصوبہ بندی اور بنیادی صنعتوں میں سرمایہ کاری ہے آہستہ آہستہ فوائد حاصل ہوتے ہیں لیکن مستقبل کے استحکام اور ملک کی خوشحالی کی ضمانت کے لئے ضروری ہے کہ ان شعبوں میں بھی سرمایہ کاری کی جائے:

ملکی مہارت اور وسائل سے کام لیا جاسکے۔ حکومت نے نظامِ تعلیم میں تبدیلیاں کی ہیں۔ اب پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل تعلیم پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ ہنر مند نیکے لوگ آسانی کے ساتھ ملکی معیشت میں کھپانے جاسکیں دیہات میں روزگار فراہم کرنے کے لئے خاص طور پر پیپلز ورکس پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری ختم کرنے کے لئے حکومت نے این ڈی ڈی پی اور ایسی ہی دوسری اسکیمیں بنائی ہیں۔ ہم تمام شہریوں کو روزگار فراہم کرنے کا مقصد بھی پورا نہیں ہوا۔ مستقبل کے لئے ایسا لائحہ عمل تیار کرنا ضروری ہے کہ پیداوار اور روزگار دونوں میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو۔

ترقی کی رفتار برقرار رکھنے اور غیر ملکی امداد پر اعتماد ختم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ ملکی وسائل کو کام میں لایا جائے۔ وسائل کی فراہمی حکومت کی اس پالیسی کے مطابق ہونی چاہئے کہ مختلف طبقوں کی آمدنی کے درمیان فرق گھٹایا جائے۔ بدقسمتی سے وسائل حاصل کرنے کے وہ ذرائع جو مساوات کے نقطہ نظر سے موزوں ہیں مثلاً براہ راست ٹیکسوں کا اخذ وہ ٹیکس ادا نہ کرنے کے رجحان کی وجہ سے بے اثر ہو جاتے ہیں ٹیکس جمع کرنے کے نظام کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ وسائل حاصل کرنے کے لئے ایسا لائحہ عمل اختیار کرنا ضروری ہے کہ اس سے نہ صرف سرمایہ کاری کے لئے زیادہ سے زیادہ وسائل دستیاب ہوں بلکہ حکومت کا زیادہ سے زیادہ معاشرتی انصاف مہیا کرنے کا مقصد بھی پورا ہو سکے۔ حکومت نے جو مالی پالیسیاں بنائی ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ملکی وسائل کی بنیاد کو وسیع کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ٹیکسوں کے نظام کی بنیاد وسیع کی گئی ہے۔ ٹیکس جمع کرنے کے نظام کو بہتر بنایا گیا ہے اور زیادہ سے زیادہ بچت اور سرمایہ کاری کے لئے مناسب ترتیبات فراہم کی گئی ہیں۔

حکومت بار بار اعلان کر چکی ہے کہ وہی حل معیشت پر یقین رکھتی ہے۔ وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کے الفاظ میں معیشت کا یہ نظام

عوامی حکومت کے چار سال

انتظامی اصلاحات پر ایک نظر

کسی جمہوری ملک کو ایسی انتظامیہ کی ضرورت ہوتی ہے جو عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعہ عوام کے سامنے جواب دہ ہو۔ غیر ملکی حاکموں سے اکتان کو جو کوکر شاہیں مل وہ اس کی ضروریات کے لئے مناسب نہ تھیں۔ اصل میں یہ ایک استعماری نظام تھا جس کا مقصد ایک غیر ملکی حکومت کے مفادات کی خدمت کرنا تھا۔ پرانے نظام کی اصلاح کرنے کی ضرورت عام طور پر محسوس اور تسلیم کی گئی۔ اس معاملہ پر اعلیٰ سطح کے کمیشنوں اور ماہرین نے جن میں بعض مشہور غیر ملکی ماہرین بھی شامل تھے، غور کیا اور پاکستان کی مختلف سابقہ حکومتوں اور متعدد کمیٹیاں قائم کیں اور ان کی رپورٹوں نے جدید رجحانات کے مطابق بردست انتظامی تبدیلیوں اور اصلاحات کا آغاز کرنے کی ضرورت کا یکساں طور پر اظہار کیا تھا تاہم رائج نظام اتنی مضبوطی سے بیوست تھا اور مفاد پرست بہت اتنا طاقتور تھا کہ اس نے تبدیلی کے برتھور کی مزاحمت کی اور یوں غیر سی تبدیلی کے کئی سال گزر گئے یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۷۱ء میں موجودہ حکومت نے اقتدار سنبھالا۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو قوم سے اپنے پہلے ہی خطاب میں زیر اعظم نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا: ہم ایسی نوکر شاہی میں چاہتے ہیں جس کی پرورش استعماری روایات اور تصورات پر کی گئی ہو۔ ہم یں آشفامیہ چاہتے ہیں جو وسیع انظر ہو اپنی کارکردگی میں متحرک اور انقلابی ہرے کے حاصل ہو اور جو قوم کی خدمت کے جذبہ سے سرشار ہو۔

وزیر اعظم نے اس تبدیلی لانے کے لئے عزم مصمم کا اظہار کیا۔ اسی عزم کو پورا کرنے کی غرض سے حکومت نے اپریل ۱۹۷۲ء میں ایک اعلیٰ اختیار والی کمیٹی قائم کی جس کے سامنے سرکاری ملازمین کی تنظیم نو تھی۔ انتظامی اصلاحات کی کمیٹی نے مختلف مسائل کا گہرا جائزہ لیا جن میں ملازمت کے ڈھانچے پر نظر ثانی، رشوت شکنی کا انسداد، غلے کے انتظام کے لئے مزید سائنسی اور موثر مشینری کا قیام جس میں خالصتا پیشہ ورانہ اہلیت اور ملازمت کی ضروریات پر تقریباً ایک نموس اور معقول ترمیمی پروگرام کا آغاز اور دوسرے متعلقہ امور شامل تھے۔ وزیر اعظم نے ۲۰ دسمبر ۱۹۷۳ء کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے وسیع انتظامی اصلاحات کے ایک پروگرام کا اعلان کیا۔ اس کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں۔ ساری سروسوں اور کیڈروں کا ایک متحدہ درجہ وار ڈھانچے میں انضمام جس میں ان تمام لوگوں کے لئے مساوی مواقع جیا کئے گئے خواہلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر کسی بھی مرحلے میں ملازمت میں داخل ہوں۔ سرکاری ملازموں کے درمیان ساری کلاسیں ختم کر دی گئیں اور ان تمام لوگوں کے لئے مساوی مواقع جیا کئے گئے خواہلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر کسی مرحلے میں ملازمت میں داخل ہوں۔ ان اصلاحات نے بھی شعبہ کے ایسے باصلاحیت اشخاص کے لئے یکاوی، بیمہ، صنعت اور تجارت جیسے شعبوں میں مرکزی ملازمت میں داخل ہونے کی گنجائش پیدا کی۔

جنہیں ایسے عہدے آتے ہیں جو صوبوں اور مرکز میں مشترک ہیں۔ انہیں نے تو ہی یک جہتی اور وابستگی کے عظیم مفاد میں مرکز اور صوبوں کے درمیان مشترکہ سروس کا تصور برقرار رکھا ہے۔ مطلوبہ خصوصی جہات جیتا کرتے اور انتظامی کنٹرول کی آسانی کے لئے حکومت کے تحت مختلف عہدوں کی تنظیم نو اس طرح کی گئی ہے کہ دو گروپ بنا دیئے گئے ہیں ایک عملیاتی (FUNCTIONAL) اور دوسرا پیشہ ورانہ (OCCUPATIONAL) یہ کسی حد تک حکومتی سرگرمی کے اہم محکموں سے ملتے جلتے ہیں یعنی سیکریٹریٹ، پولیس، امور خارجہ، ریلویو، اکاؤنٹس، اقتصاد کی منصوبہ بندی وغیرہ۔ یہ گروپ کسی طرح بھی علیحدہ خانوں کی نمائندگی نہیں کرتے جس کی سابقہ سروسیں ہوا کرتی تھیں۔ ہر گروپ میں بغلی داخلے کی گنجائش رکھی گئی ہے اور ایک گروپ سے دوسرے گروپ میں جانے کے لئے افقی پیش قدمی کی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ حکومت میسر ہوتے والے باصلاحیت اور تجربہ کار لوگوں کا بہترین مصرف لے سکے۔

انتظامی طریقوں کو بھی بہتر اور آسان بنایا گیا ہے تاکہ حکومت، بد اطوار کی رتبہ ستانی اور نااہلی کے معاملات کے خلاف تیزی سے موثر کارروائی کر سکے۔ ریٹائرمنٹ کے قوانین میں بھی ترمیم کی گئی ہے تاکہ حکومت سول ملازمت میں ایسے غامض کو چھٹا کر سکے جن کی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ بھرتی اور ترقی کے طریقے کی مرکزیت ختم کر دی گئی ہے سرکاری ملازمین کی شرائط ملازمت کے معاملات میں ان کے محکموں کے حکام کے فیصلوں کے خلاف شکایات کے ازالہ کے لئے سروس ٹریبونل کی صوت میں ایک مشینری قائم کی گئی ہے۔

فیڈرل پبلک سروس کمیشن اب گریڈ ۱۴ اور اس سے اوپر کے سارے عہدوں کے لئے، جو براہ راست بھرتی کے ذریعے پرکئے جاتے ہیں بھرتی کرتے والی ایک ایجنسی ہے۔ خود مختار اداروں اور کارپوریشنوں میں گریڈ ۱۹ اور اس کے اوپر کے سینئر عہدوں کو بھی، اگر وہ براہ راست بھرتی کے ذریعے پرکئے جاتے ہیں، کمیشن کے دائرہ اختیار میں دے دیا گیا ہے۔ حکومت نے انتظامی اصلاحات کے جزو کے طور پر جو دوسرے اہم اقدامات کئے ہیں

انتظامی اصلاحات کے مترجمہ بالا مقاصد کے حصول کے لئے مطلوبہ قانونی ڈسپانچر، نے انہیں نے جیتا کیا اور ملازمت کے امور سے متعلق قوانین پاکستان میں پہلے مرتبہ اگست ۱۹۷۳ء میں وضع کئے گئے۔ ملازمت کی شرائط سے متعلق تحفظات بشمول انضباطی کارروائی، جو سابقہ دساتیر میں شامل کئے گئے تھے، انہیں لے لئے گئے۔ انہیں ضمانتوں نے سرکاری ملازمین میں بوجہ اس کے احساس کو ختم کر دیا تھا اور یہ ایک غیر نسلی بخش کارروائی اور تحفظ کے لئے ایک ڈھال بن گیا تھا۔ سرکاری ملازمین کا عظیم طبقہ پہلی مرتبہ پارلیمنٹ کے عدوی قانونی کنٹرول میں آیا جیسا کہ ایک جہوری نظام میں ہونا چاہیئے۔ اسی کے مطابق ملازمت کے امور سے متعلق قوانین نافذ کئے گئے۔ سول سروس ٹریبونل تجربہ ۱۹۷۳ء نے سول ملازمین کی شرائط متعین کیں۔ سروس ٹریبونل ایکٹ تجربہ ۱۹۷۳ء نے سروس ٹریبونل کے قیام کی گنجائش رکھی تاکہ سول ملازمین کی شرائط ملازمت سے متعلق امور پر خالص اختیارات استعمال کرے اور فیڈرل سروس کمیشن ایکٹ تجربہ ۱۹۷۳ء نے پبلک سروس کمیشن کا نظریاتی شدہ کردار مقرر کیا۔ نئی آئینی دفعات اور اس کے ساتھ ان تین ایکٹوں نے حکومت کو اس قابل بنایا کہ وہ قوانین کے ضوابط کے نئے سلسلے وضع کرے ملازمتوں کی تنظیم کرے اور سرکاری ملازمین کی بھرتی اور ترقی کے طریقوں اور تنخواہوں کے ڈھانچوں میں دوسری تبدیلیاں کرے۔ ان اصلاحات کا مقصد اور ان کے پیچھے فلسفہ یہ ہے کہ سرکاری ملازمین کے درمیان مساوات پیدا کی جائے۔ ان میں پیشہ ورانہ جذبہ پیدا کیا جائے اور ان کے اندر جواب دہی کا احساس پیدا کیا جائے۔ ان کا یہ بھی مقصد ہے کہ ملازمتوں میں بد عنوانی اور رشوت ستانی کا قلع قمع کیا جائے سارے عہدے، خواہ وہ پہلے باضابطہ قائم کی ہوئی سروسوں کے کیڈر میں تھے یا نہ تھے، اب ایک متحدہ درجہ دار ڈھانچے میں ضم ہو گئے ہیں۔ وہ پرانا نظام ختم کر دیا گیا ہے جس میں ایک یا دو سروسیں، دوسری سروسوں پر حکومت کرتی تھیں۔ اب تقریباً سروسوں میں نہیں بلکہ گریڈوں میں کی جاتی ہیں۔ جو عہدے، صوبے کے امور سے منسلک ہیں، ان کا تعلق صوبائی متحدہ گریڈوں سے ہے اور جو وفاقی حکومت سے منسلک ہیں۔ ان کا تعلق وفاقی متحدہ گریڈوں سے ہے۔ مزید برآں، جیسا کہ انہیں میں کہا گیا ہے ہمارے پاس کل پاکستان متحدہ گریڈ بھی ہیں

بعد فیڈرل پبلک سروس کمیشن کی طرف ایک آخری پاسنگ آؤٹ امتحان تھا ہے۔ مجموعی سول سروس کے نظام کے اندر مختلف پیشہ ورانہ گروپوں میں ان کی تخصیص صلاحیت کی بنیاد پر کی جاتی ہے جس کا تعین فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے مذکورہ بالا دو امتحانات کے نتائج پر کیا جاتا ہے۔

جن اقدامات کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وہ محض آغاز عمل ہیں۔ ان کی نوعیت اولین لازمی اقدامات کی ہے جن کا نشاء قلیل المیعاد و باسدا کی تکمیل اور ان اصلاحات کا شعوس اور موثر آغاز کرنا ہے۔ نظام اسلحا بہر حال ایک طویل المیعاد عمل ہے اور ہمارے بعض طویل المیعاد مقاصد یہ ہیں :-

(۱) انتظامیہ میں عمومیت کے اعتقاد کے برعکس پیشہ واریت کا آغاز کرنا کیونکہ اول الذکر نے اتنے طویل عرصہ تک خرابیاں پیدا کیں۔

(۲) پیشہ وارانہ زندگی کے انتظام اور منصوبہ بندی کا ایک سائنسی نظام شروع کرنا اس کے لئے ضرورت ہے کہ سرکاری ملازمین کی تعلیم صلاحیتوں اور تجربے کے اعتبار سے سادے موجودہ عہدوں کی درجہ بندی تقسیم کی جائے اور ملازمتوں کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے۔ مختلف ہئیت مندیوں اور پیشوں میں ہونے والی کمی کا پہلے سے اندازہ لگایا جائے اور انہیں مناسب سطحوں پر بھرتی کے ذریعہ اور دوران ملازمت ترقی پر مکرمل کا انعقاد کر کے پورا کیا جائے۔

(۳) موجودہ دوران ملازمت کی ترقیاتی ہولتوں کو اتنا وسیع اور مستحکم کیا جائے کہ اس میں سادے گریڈس کے سادے سول ملازمین آجائیں تاکہ انتظامیہ مشینری اچھی حالت میں رہے اور نیز معاشرتی اقتصاد کی ترقی اور عظیم قومی استحکام اور سلامتی کے ترقی تھانے پورے کرنے کے لئے پوری طرح تیار رہے۔

وہ تنخواہوں کے سیکنڈوں اسکیلوں کا ۲۲ قومی اسکیلوں میں انتظام ہے۔ معمول کے مطابق ترقی کے علاوہ، اس بات کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ نچلے گریڈوں میں کام کرنے والے سرکاری ملازمین جب نچلے اسکیل کی حد پر پہنچ جائیں تو خود بخود اس سے اوپر کے گریڈ چلے جائیں۔ مزید برآں، تنخواہوں کے اسکیلوں کو اوپر لے جانے کے لئے نظر ثانی کرتے وقت کم تنخواہ پانے والے ملازمین کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا گیا اور سینئر افسروں مثلاً جوائنٹ سیکریٹری اور اس سے اوپر کے عہدیداروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا گیا۔ ان اقدامات کے نتیجے میں سول سروس میں سب سے کم اور سب سے زیادہ تنخواہ پانے والوں کے درمیان آمدنی کی عدم مساوات بڑی حد تک کم ہو گئی ہے۔

اگست ۱۹۷۳ء میں انتظامی اصلاحات کے نفاذ کے وقت سے وفاقی سیکریٹریٹ میں سینئر عہدوں پر تقرریاں، بھرتی کے نظر ثانی شدہ طریقے کے ذریعہ بھی کی جاتی ہیں جسے بغلی داخلہ (LATERAL ENTRY) کہتے ہیں یہ طریقہ دوسرے مقصد کے لئے جاری کیا گیا یعنی یہ کہ سیکریٹریٹ نظام کی ہر سطح پر باصلاحیت اور تجربہ کار اشخاص کو داخل کیا جائے، باصلاحیت افراد یونیورسٹیوں، صنعت، کاروبار، کارپوریشنوں، پیشوں اور زندگی کے ہر شعبے سے لئے جاتے ہیں تاکہ سرکاری محکموں کے افراد کار کی روز افزوں ضروریات پوری ہوں اور سول سروس طبقہ کے ان لوگوں کو ترقی کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں جو اصلاحات سے پہلے ترقیوں کے ظالم اور امتیازی نظام کا شکار تھے اور جنہیں اہلیت اور صلاحیت کے باوجود ترقی کے سارے مواقع سے محروم کر دیا گیا تھا۔

فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ اہتمام ہونے والے مقابلہ کے امتحانات کے نتائج پر گریڈ ۱۷ میں بھرتی کئے جانے والے سادے پرومیشن کو اب منسلق تربیت اور ایک مشترکہ بنیادی نصاب دیا جاتا ہے اور اس کے

محنت کشوں کی فلاح و بہبود

جناب عبدالستار گبول
وزیر مملکت برائے محنت

محقر طور پر درج ذیل ہیں۔

صنعتی تعلقات اور صنعتی امن

ملک میں صنعتی تعلقات کے قوانین میں بنیادی اصلاحات کی گئی ہیں۔ ٹریڈ یونینوں کو کام کرنے کی پوری آزادی دے دی گئی ہے۔ ان کے رجسٹریشن پر تمام پابندیاں ختم کر دی گئی ہیں۔

ان کارخانوں میں جہاں مزدوروں کی تعداد ۵۰ یا اس سے زائد ہے فیکٹری کی سطح پر مزدوروں کو منجمنٹ میں ۲۰ فیصد حصہ دینے کا بندوبست کیا گیا ہے جب تک منجمنٹ کی سطح میں مزدوروں کے نمائندے تحریری طور پر مشورہ نہیں منجمنٹ کو نظم و ضبط، ترقی، فیکٹری میں کام کے حالات میں تبدیلی، فیکٹری میں کام کرنے والے مزدوروں کی تربیت، اور تفریح اور بہبود کے سہولتوں کے بارے میں ملازمت کے قواعد بنانے یا پالیسی مرتب کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

ان فیکٹریوں میں اجتماعی سودے کاروں کی یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ فیکٹری کا حسابی سال ختم ہونے پر ایک بار فیکٹری کا حساب کتاب سب سے پہلے طلب کریں۔

ٹریڈ یونینوں کو تحفظ دیا گیا ہے۔ جن دنوں رجسٹریشن کے

پاکستان میں آزادی کے بعد صنعت کے میدان میں بڑی تیزی سے ترقی ہوئی ہے۔ صنعتی ترقی اور محنت کشوں کی فلاح و بہبود کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے اور ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ موجودہ حکومت کا مطمح نظر یہ ہے کہ جن لوگوں کے پسینے سے صنعتی ترقی کی نئی راہیں کھلتی ہیں انہیں ملک کی خوشحالی میں پورا حصہ ملنا چاہیے۔ اس لئے قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کی فعال قیادت میں عوامی حکومت کی لیبر پالیسی کا سنگ بنیاد محنت کشوں کی فلاح و بہبود ہے۔

پاکستان اب تک عالمی ادارہ محنت کے تیس اعلانات کی توثیق کر چکا ہے۔ ان میں انجمن سازی کی آزادی کی ضمانت، اجتماعی سودے کاری کا حق اور کام کے صحت مند ماحول کے بارے میں اعلانات بھی شامل ہیں۔ عوامی حکومت دسمبر ۱۹۶۵ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد اب تک بڑی دؤر رس لیبر اصلاحات کر چکی ہے تاکہ عالمی ادارہ محنت کے اعلانات پر عملدرآمد ہو سکے اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو تمام ممکن سہولتیں، اضافی فوائد اور روزگار کے تحفظات حاصل ہو سکیں۔ لیبر اصلاحات پر عملدرآمد کے لئے بہت سے لیبر قوانین میں ترمیمیں کی گئی ہیں اور نئے لیبر قوانین وضع کئے گئے ہیں۔

لیبر پالیسی سے محنت کشوں کو جو فوائد حاصل ہوئے ہیں وہ



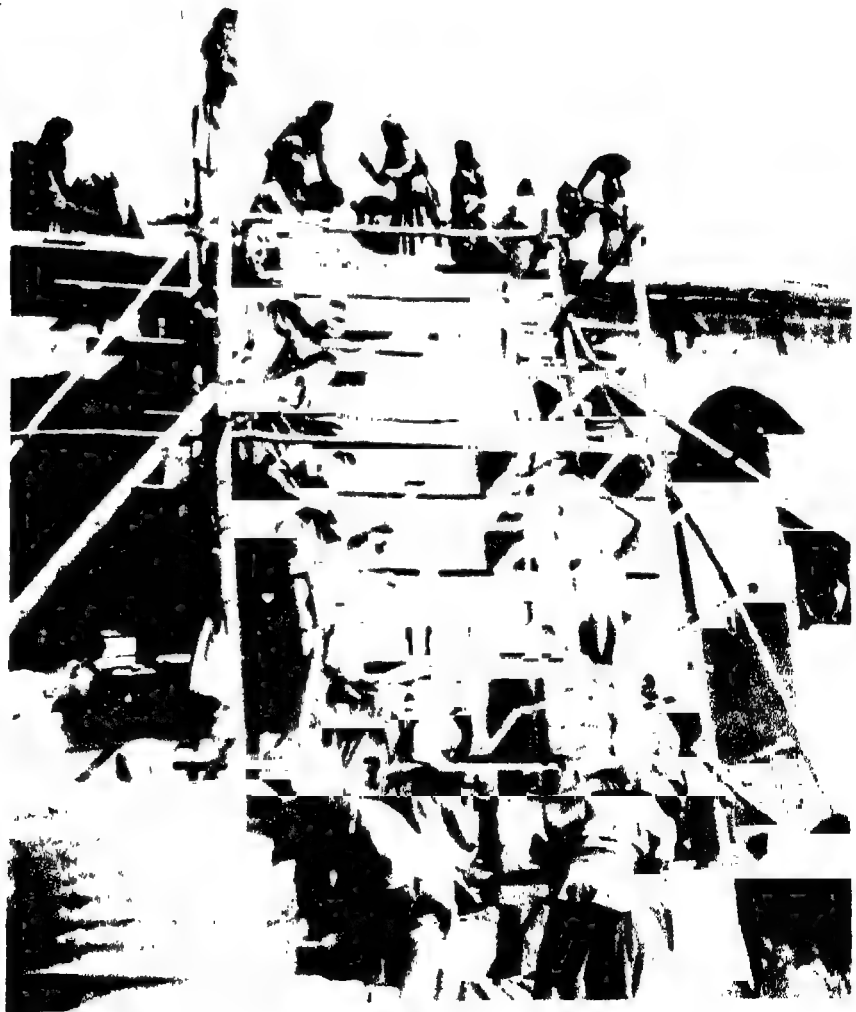
مزدوروں کی صحت مندر ہائش کا اہتمام لیبر کالونی راولپنڈی

ایک کارخانے میں مزدوروں کی کینٹین





کراچی کے کارخانہ جہاز سازی میں
مرد و ایک جہاز کی تعمیر میں مہمک ہیں



عمارت کی تعمیر میں مرد و عورتیں
شاذ بشارت محنت میں مصروف ہیں



کشتی سازی

ویلڈنگ کا کام ہنر اور حوصلے کا کام ہے





لاہور کی ایک سائیکل فیکٹری میں سائیکل کے ریم بنائے جا رہے ہیں

مزدوروں کی اجرتوں کی تقسیم



کو بونس، تنخواہ کے ساتھ چھٹی اور ملازمت کے تحفظ کے خاص خالص فوائد دیئے گئے ہیں۔

منافع کی صورت میں مزدوروں کو ایک ماہ کی اجرت یا منافع کا ۳۰ فیصد ان دونوں میں سے جو بھی کم ہو بونس دیا جائے گا۔ یہ بونس اُس بونس کے علاوہ ہوگا جس کے بارے میں کوئی بھڑکے تصفیہ یا فیصلہ ہو چکا ہوگا۔

مزدوروں کا ان آفات کے خلاف بیمہ کیا جاتا ہے جن پر مزدوروں کے معاوضہ کے قانون مجریہ ۱۹۶۳ء اور سوشل سیکورٹی آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۵ء کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ان آفات میں موت (بشمول قدرتی موت)، اور ڈیوٹی کے علاوہ دیگر اوقات میں زخمی ہونا بھی شامل ہے۔ بیمہ کی قسطیں آجر کو ادا کرنی پڑتی ہیں۔ کم سے کم اتنی رقم کا بیمہ ضروری ہے جتنی رقم مزدوروں کے معاوضہ کے قانون مجریہ ۱۹۶۳ء کے تحت واجب الادا ہوتی ہے۔

اس سے پہلے آجروں کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ کارخانہ میں آگ لگنے یا قدرتی آفت مثلاً سیلاب کی صورت میں اپنے مزدوروں کو مہم ادن تک گھر بٹھادیں۔ ایسی صورت میں مزدوروں کو کچھ رقم دی جاتی تھی۔ اب یہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ مزدوروں کو خواہ کسی وجہ سے گھر بٹھایا جائے انہیں معاوضہ ضرور دیا جائے گا۔ یہ معاوضہ پوری مدت کی بچاس فیصد اجرت کے برابر ہوگا۔ پہلے یہ قاعدہ تھا کہ پہلے ہفتہ میں نصف اجرت کے برابر اور دوسرے ہفتہ میں تنہائی اجرت کے برابر معاوضہ دیا جاتا تھا۔

مستقل کارکنوں کو ہر ایک سال کی ملازمت پر ۱۵ دن کی اجرت کے برابر گرہ بچائی دی جاتی تھی۔ اب ہر ایک سال کی ملازمت پر ۲۰ دن کی اجرت کے برابر گرہ بچائی دی جاتی ہے۔ غیر مستقل کارکنوں کی صورت میں گرہ بچائی ایک سال میں سب سے زیادہ ادا کی ہوئی اجرت کی بنیاد پر متعین کی جاتی ہے۔ دوسرے کارکنوں کے لئے گرہ بچائی متعین کرتے وقت پچھلے تین ماہ کی اجرت سامنے رکھی جاتی ہے۔

لئے یونین کی درخواست زیر غور ہو ان دنوں میں یونین کے کسی عہدیدار کا تبادلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ٹریڈ یونین کے کسی عہدیدار کو ہٹا کر نئے کے لئے اس کا تبادلہ بھی ناجائز اقدام قرار دے دیا گیا ہے۔

لیبر اور مینجمنٹ کے تعلقات میں صنعتی جمہوریت کو فروغ دینے کے لئے کئی ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ شاپ اسٹیوڈنٹس کا ادارہ دوبارہ قائم کر دیا گیا ہے۔ ورک کونسلیں جو ورک کمیٹیوں کی شکل میں پہلے ہی قائم تھیں اب انہیں اور زیادہ فعال بنا دیا گیا ہے۔ قومی صنعتی تعلقات کا کمیشن قائم کیا گیا ہے جو قومی سطح پر ٹریڈ یونینیں قائم کرنے اور ایک ہی صنعت کی تمام ٹریڈ یونینوں کی قومی فیڈریشن بنانے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ایک صنعت کی مختلف ٹریڈ یونینوں کے باہمی جھگڑوں کا تصفیہ کرتا ہے۔ یہ کمیشن ہر صنعت کی ٹریڈ یونین کی جبرٹیشن کرتا ہے اور مزدوروں کے بارے میں ناجائز اقدامات سے نپٹتا ہے۔ کمیشن کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ حکومت یا ٹریڈ یونینوں کی درخواست پر ان بڑے صنعتی اداروں کے بارے میں جو ایک سے زیادہ صوبوں میں پھیلے ہوئے ہوں اجتماعی صوبے کا یونٹ کا تعین کرے۔

کارروائی میں تاخیر کو روکنے کے لئے بھی مناسب اقدامات کئے گئے ہیں۔ صنعتی تعلقات کے بارے میں معاملات نپٹانے کی مدتیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ٹریڈ یونین کی طرف سے رجسٹریشن کی درخواست کا تصفیہ ۱۵ دن میں ہو جانا چاہیے۔ اسی طرح جوئیئر لیبر کورٹ میں پیش کی ہوئی شکایت کا تصفیہ سات روز میں اور لیبر کورٹ میں دائر کردہ مقدمہ کا فیصلہ ۳۰ دن کے اندر ہو جانا ضروری ہے۔

صنعتی اور تجارتی اداروں کے ملازمین کے بارے میں

میں احکام کا مغربی پاکستان آرڈیننس مجریہ ۱۹۷۸ء

اس قانون کا دائرہ کار بڑھا دیا گیا ہے۔ اب اس قانون کا اطلاق ٹھیکہ داروں اور ان صنعتی اور تجارتی اداروں پر بھی ہوتا ہے جن کے ملازمین کی تعداد ۲۰ یا اس سے زائد ہے۔ ان ملازموں

بارے میں کانوں کے انسپکٹ کو اطلاع دیں اور مقررہ معیار کے مطابق حفاظتی آلات اور ابتدائی طبی امداد کے کمروں کا بندوبست کریں۔ بعض حالات میں ان کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ طبی عملے، ادویات اور دیگر ضروری سہولتوں کا بھی انتظام کریں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کان مزدوروں کے لئے قانون کام کی اجرت عام اجرت سے دوگنی مقرر کی گئی ہے۔

اب ہر سال تنخواہ کے ساتھ چھٹی دی جاتی ہے۔ چھٹی کی مدت اس طرح متعین کی جاتی ہے کہ کان کے اندر ۱۷ دن تک اور کان سے باہر ۲۰ دن تک کام کرتے ہر ایک دن کی چھٹی۔ اس کے علاوہ اب کان مزدوروں کو پوری تنخواہ کے ساتھ دس دن کی اتفاقیہ رخصت، بیماری کی صورت میں آدھی اجرت پر ۱۴ دن کی رخصت اور تہواروں کے موقع پر پوری تنخواہ کے ساتھ چھٹی دی جاتی ہے۔

فیکٹریز ایکٹ مجریہ ۱۹۳۴ء

فیکٹریز ایکٹ مجریہ ۱۹۳۴ء کا ان فیکٹریوں پر بھی اطلاق کر دیا گیا ہے۔ جن میں دس یا دس سے زائد کارکن کام کرتے ہیں۔ صحت اور تحفظ کے بارے میں اس ایکٹ کی دفعات کو اور زیادہ ٹوٹر بنا دیا گیا ہے جس سے کارکنوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ اب آجر کے خرچ پر ہر چھ مہینے کے بعد کارکن کا طبی معائنہ اور اسے بیماریوں سے بچاؤ کے لئے ٹیکے لگانا لازم قرار دے دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے اس سلسلہ میں آجر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں تھی۔

- پہلے فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور، بیماری کی صورت میں رخصت کے مستحق نہیں تھے۔ سالانہ رخصت بھی زیادہ سے زیادہ دس دن کی ملتی تھی اب فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور مندرجہ ذیل چھٹیوں کے مستحق ہیں:
- ۱۔ تنخواہ کے ساتھ ۱۷ دن کی سالانہ رخصت۔
 - ۲۔ تنخواہ کے ساتھ دس دن کی اتفاقیہ رخصت۔
 - ۳۔ بیماری کی صورت میں نصف تنخواہ پر ۱۴ دن کی رخصت۔
 - ۴۔ سرکاری ملازموں کی طرح تنخواہ کے ساتھ تہواروں کی تعطیل

مزدوروں کی ملازمت کے تحفظ کے بارے میں اہم اصلاحات کی گئی ہیں۔ پہلے کوئی آجر ایک ماہ کا نوٹس یا ایک ماہ کی تنخواہ دے کر کسی مزدور کو ملازمت سے الگ کر سکتا تھا۔ یہ اختیار مزدوروں کو بڑے پیمانے پر ہراساں کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اب آجروں کے لئے لازم ہے کہ وہ تحریری طور پر تقرر تبادلوں اور ترقی کے احکام مزدور کے حوالے کریں۔ اب کسی مزدور کو برطرف کرنے یا اس کی چھانٹی کرنے کے لئے تحریری حکم جاری کرنا ضروری ہے اس حکم میں برطرفی یا چھانٹی کی وجہ بتانا بھی ضروری ہے۔ یہ بھی قانون ہے کہ کوئی آجر لیبر کورٹ سے پیشگی اجازت کے بغیر کارخانہ بند نہیں کر سکتا۔

پہلے آجر مستقل ملازموں کی جگہ بدلی کے کارکن رکھ لیتے تھے۔ ایسے کارکن مہینوں کام کرتے رہتے تھے لیکن انہیں وہ سہولتیں نہیں دی جاتی تھیں جو مستقل ملازموں کو حاصل تھیں۔ اب یہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ بدلی کے کارکن تین ماہ تک مسلسل ملازمت یا ایک سال میں ۱۸۳ دن کی حاضری کی صورت میں مستقل ملازم کے برابر حقوق اور حیثیت کے مستحق ہوں گے۔ اسی طرح تعمیرات میں کام کرنے والے مزدوروں کو بھی تحفظ دیا گیا ہے۔ اب چھانٹی کے بعد ایک سال کے اندر دوبارہ ملازمت کی صورت میں ان مزدوروں کو ترجیح دی جائے گی۔ جو مزدور چھانٹی کے بعد ایک ماہ کے اندر دوبارہ ملازم رکھ لئے جائیں گے ان کے بارے میں یہ سمجھا جائے گا کہ ان کی ملازمت میں کوئی وقفہ نہیں آیا۔

کانوں کا قانون مجریہ ۱۹۲۳ء

کانوں کا قانون مجریہ ۱۹۲۳ء جو وقت کے تقاضے پورے نہیں کر رہا تھا اس میں ترمیم کر دی گئی ہے۔ اس طرح ایک ہفتہ میں کام کے گھنٹے ۴۵ سے گھٹا کر ۴۸ کر دیئے گئے ہیں۔ کان مزدوروں کی صحت کیلئے بہتر سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ اب کانوں کے مالکوں کیلئے یہ لازم قرار دے دیا کہ وہ ہر ایسی بیماری جو ان کے پیشے کے باعث لاحق ہوتی ہو اس کے

مزدوروں کے معاوضہ کا قانون مجریہ ۱۹۷۳ء

اس قانون کے تحت مزدوروں کی موت یا کام کے دوران زخمی ہو جانے کی صورت میں معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اب اس کا اطلاق ایک ہزار روپیہ ماہانہ اجرت پانے والے تمام کارکنوں پر ہوتا ہے۔ کلرک بھی اس قانون کے دائرے میں آتے ہیں۔ معاوضہ کی شرحیں بھی خاصی بڑھا دی گئی ہیں۔

مغربی پاکستان سوشل سیکورٹی آرڈیننس مجریہ ۱۹۷۵ء

اس آرڈیننس کے تحت تاریخ ۱۹۷۴ء میں معاشرتی تحفظ کی ایک اسکیم نافذ کی گئی۔ اس کا مقصد مزدوروں کو بیماری، زچگی اور کام کے دوران زخمی ہونے کی صورت میں امداد دینا تھا۔ شروع میں یہ اسکیم کراچی، حیدرآباد اور لاکھپور میں کپڑے کے کارخانوں میں کام کرنے والے قریباً ایک لاکھ مزدوروں کے لئے تھی۔ بعد میں اسے سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد کے دوسرے علاقوں میں بھی نافذ کر دیا گیا اور اس کا اطلاق ان صنعتی اور تجارتی اداروں کے ملازموں پر بھی ہونے لگا جن میں دست یا دست سے زائد مزدور کام کرتے ہوں۔

پاکستان میں معاشرتی تحفظ کے پروگرام کی ابتدا ۱۹۷۴ء میں ہوئی تھی۔ سات سال کے قلیل عرصہ میں اس اسکیم نے خاصی ترقی کی ہے۔ اب اس سے پنجاب میں ۳۹۵ اداروں کے ۲۳۲۰۰۰ کارکن سندھ میں ۱۷۰ اداروں کے ۱۹۱ کارکن اور صوبہ سرحد میں ۱۱۹ اداروں کے ۲۷۰ کارکن فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

پنجاب میں معاشرتی تحفظ کے ۱۰۲ یونٹ، سندھ میں ۷۰ یونٹ اور صوبہ سرحد میں ۱۵ یونٹ کام کر رہے ہیں۔ سندھ کے معاشرتی تحفظ کے ادارے نے لائڈھی میں ۲۰۰ بستروں کا اور کوٹری میں ۵۰ بستروں کا ہسپتال بنوایا ہے۔ ادارے نے کئی دوسرے ہسپتالوں میں مریضوں کے علاج کا بھی انتظام کیا ہے۔ پنجاب اور صوبہ سرحد میں معاشرتی تحفظ کے اداروں کا اپنا کوئی ہسپتال نہیں ہے لیکن وہاں سرکاری اور پرائیویٹ ہسپتالوں اور شفاخانوں میں مزدوروں کے علاج کا انتظام کیا گیا ہے۔ موجودہ مالی

سال میں لاہور میں سینہ کے امراض کا ایک کلینک کھولا گیا ہے۔ معاشرتی تحفظ کی اسکیم کے تحت مزدوروں کو ملنے والے فوائد کی شرح بڑھا دی گئی ہے۔ موت کی صورت میں کفن و دفن کے اخراجات کے لئے گرانٹ ۵۰ روپے سے بڑھا کر ۵۰۰ روپے مقرر کی گئی ہے۔ بیماری کی صورت میں اب تحفظ یافتہ مزدوروں کو ۱۲ دن تک مالی امداد دی جاتی ہے۔ پہلے یہ امداد ۹۱ دن تک دی جاتی تھی۔ تب دق کی صورت میں یہ مدت ۱۹۱ دن تک بڑھا دی گئی ہے۔

کمپنیوں کے منافع میں مزدوروں کی شرکت کا قانون مجریہ ۱۹۷۵ء

اس قانون کا اطلاق ان صنعتی اداروں پر ہوتا تھا جن میں ایک شفیٹ میں ایک سو یا اس سے زائد مزدور کام کرتے ہوں۔ اب اس کا اطلاق ان تمام صنعتی اداروں پر ہوتا ہے جن میں پچاس یا پچاس سے زائد مزدور کام کرتے ہوں۔ منافع میں مزدوروں کا حصہ بڑھا کر خالص منافع کا پانچ فیصد مقرر کیا گیا ہے۔

مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کا آرڈیننس مجریہ ۱۹۷۲ء

اس آرڈیننس کے تحت جس کارخانے میں بیس یا بیس سے زائد مزدور کام کرتے ہوں اس کے اہل بیت پر یہ لازم ہے کہ وہ اس قانون کی روشنی میں ہر مزدور کے ایک بچے کی میٹرک تک تعلیم کا خرچ اٹھائے۔ اسے ان تمام بچوں کے لئے نصاب کی کتابیں مہیا کرنی ہوں گی اور داخلہ کی فیس، میڈیوشن فیس، امتحان کی فیس اور سکول کے فنڈ ادا کرنے ہوں گے۔

بڑھاپے میں ملازموں کی پنشن کی اسکیم

۱۹۷۲ء میں بڑھاپے کے لئے مزدوروں کی پنشن کا آرڈیننس نافذ کیا گیا ہے۔ وفاقی حکومت عالمی ادارہ محنت کے تعاون سے اس آرڈیننس کے تحت پنشن کی اسکیم کو

قطعی شکل دے رہی ہے۔

مزدوروں کے لئے مکان

۱۹۷۱ء میں مزدوروں کی بہبود کے فنڈ کا جو آرڈیننس

نافذ کیا گیا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کو مکان اور دوسری سہولتیں مہیا کرنے کے لئے ایک فنڈ قائم کیا جائے۔ آرڈیننس میں یہ دفعہ رکھی گئی تھی کہ ایسا ہر صنعتی ادارہ جس کی سالانہ آمدنی کم سے کم ایک لاکھ روپیہ ہو اپنی آمدنی کا دو فیصد حقہ ٹیکس کے طور پر فنڈ میں دے گا۔ حکومت کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ صنعتی اداروں کی مالی حالت اور دیگر حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے مزید رقم بھی وصول کر سکتی ہے۔ یہ ٹیکس جولائی ۱۹۷۲ء میں نافذ ہوا تھا۔ مرکزی حکومت نے اس فنڈ کے لئے ابتدائی طور پر دس کروڑ روپیہ اپنی طرف سے دیا۔ فنڈ کا انتظام ایک گورننگ باڈی کے حوالے کیا گیا اور مرکزی لیبر سیکریٹری کو گورننگ باڈی کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔

صوبائی حکومتوں کے لئے ہر صوبے میں مزدوروں کی تعداد کے مطابق ہر سال اس فنڈ میں سے رقم مختص کی جاتی ہے، یہ رقم اسی صورت میں ادا کی جاتی ہے جو پہلے ادا کی ہوئی رقم ان اسکیموں پر خرچ کر دی گئی ہو جو صوبائی حکومت کی طرف سے پیش کی گئی ہوں اور جنہیں مزدوروں کے بہبود فنڈ کی گورننگ باڈی منظور کر چکی ہو۔ اب تک سندھ کو ۲۶۸,۷۰,۰۰۰ روپے پنجاب کو ۲۵۹,۰۰,۰۰۰ روپے، صوبہ سرحد کو ۲۵,۹۸,۰۰۰ روپے اور بلوچستان کو ۱۰,۰۰,۰۰۰ روپے دیئے جا چکے ہیں۔ موجودہ مالی سال میں مختلف صوبوں کے لئے جو رقمیں مختص کی گئی ہیں وہ ابھی تک ادا نہیں کی گئیں۔ ۱۹۷۵-۷۶ء کے لئے مندرجہ ذیل رقمیں مختص کی

گئی ہیں۔

پنجاب : ۴۲,۹۰,۰۰۰

سندھ : ۵۹,۳۰,۰۰۰

صوبہ سرحد : ۳,۸۲,۰۰۰

بلوچستان : ۱۸,۲۰,۰۰۰

حکومت سندھ نے مزدوروں کے لئے ۷۰۰ فلیٹ بنوائے

ہیں اور ۲۵۰ فلیٹ بنوا رہی ہے۔ حکومت پنجاب نے لائلپور میں ۵۱۲ فلیٹ بنوائے ہیں۔

صوبہ سرحد میں مزدوروں کی ایک کالونی کی تعمیر شروع ہو گئی ہے جس میں دو د کمروں کے ۱۰۱ مکان ہوں گے۔

مہنگائی الاؤنس

قیمتوں میں بین الاقوامی سطح پر اضافہ کی وجہ سے پاکستان میں بھی اخراجات زندگی کا اشاریہ بڑھ گیا ہے۔ حکومت نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ افراط زر سے مزدوروں اور گری بندھی تنخواہ پانے والوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۱۹۷۳ء میں مہنگائی یلیف ایکٹ منظور کر لیا۔ اس کے تحت ۷۰۰ روپیہ ماہانہ تک اجرت اور تنخواہ پانے والوں کو ۳۵ روپیہ فالتو دیا گیا۔ ۷۳۵ روپیہ ماہانہ تک تنخواہ پانے والوں کی شرح تنخواہ میں مناسب رد و بدل کیا گیا۔ قیمتوں میں اضافہ کا اثر زائل کرنے کے لئے ۸ جون ۱۹۷۴ء کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ تک اجرت یا تنخواہ پانے والوں کو ان کی اجرت یا تنخواہ کے دس فیصد کے برابر مہنگائی الاؤنس دیا گیا۔ ۱۱۰۰ روپیہ ماہانہ تک تنخواہ پانے والوں کی تنخواہ میں مناسب رد و بدل کیا گیا۔ یہ ۲۵ روپیہ ماہانہ کے اس اضافہ کے علاوہ ہے جس کا حکومت نے حال ہی میں اعلان کیا ہے پے

پاکستان میں تعلیم

دوسرے ادارے جن کا خراج وفاقی حکومت اور وفاقی ادارے اٹھاتے ہیں اور تحقیق پیشہ ورانہ یا ٹیکنیکل ٹریننگ اور خاص خاص موضوعات کے مطالعہ کے ادارے شامل ہیں۔

تعلیمی پالیسی پر عملدرآمد

تعلیمی پالیسی پر عملدرآمد کے لئے منصوبہ بندی اور ترقی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ایک قومی کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ اس میں وفاقی وزارت تعلیم اور خزانہ کے صوبائی محکموں کے نامزد نمائندے شامل کیئے گئے ہیں۔ یہ کمیٹی تعلیم کے میدان میں پورے ملک میں ترقی سرگرمیوں میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔

بجٹ میں رقوم کی منظوری

تعلیم و تربیت کے میدان میں ترقیاتی اخراجات پورے کرنے کے لئے ۱۹۷۵-۷۶ء کے سالانہ ترقیاتی پروگرام میں ۴۳۹۷۳۹۱ ملین کی رقم رکھی گئی ہے۔ یہ رقم ۱۹۷۵ء میں نظر ثانی شدہ اخراجات کے تخمینے سے جو ۵۱۱۶۹۱۵ ملین تھا ۲۴۶۹ فیصد زیادہ ہے۔

پاکستان میں عوامی حکومت کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے تعلیم صوبوں کی ذمہ داری تھی۔ ہر صوبہ اپنے وسائل کے مطابق تعلیمی سہولتیں فراہم کرتا تھا۔ لیکن یہ وسائل طلباء کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کافی نہیں تھے۔ عوامی حکومت نے اس دشواری کو محسوس کیا اور ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا کہ تعلیمی سہولتیں حاصل کرنا تمام صوبوں کا حق ہے لہذا تعلیمی سہولتیں فراہم کرنا اور تعلیم کا معیار برقرار رکھنا وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی مشترکہ ذمہ داری قرار دے دیا گیا۔ اس سلسلہ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ۱۹۷۱ء کے آئین میں مناسب دفعات شامل کی گئیں۔ اب وفاقی حکومت نہ صرف تعلیم کے میدان میں صوبائی حاکمات کی ذمہ داریوں میں شریک ہو سکتی ہے بلکہ اس نے صوبوں کا کچھ بار خود سنبھال لیا ہے۔

تعلیم سے متعلق بہت سے اہم امور مشترکہ فہرست میں شامل کر دیئے گئے ہیں جن کے بارے میں پارلیمنٹ ضرورت پڑنے پر قانون بنا سکتی ہے۔ ان امور میں تعلیمی پالیسی، منصوبہ بندی، نصاب، کتابیں، تعلیم کے میدان میں نمایاں کارکردگی کے ادارے، تعلیمی معیار اور اسلامی تعلیمات شامل ہیں۔ وفاقی امور کی فہرست میں جن کے بارے میں صرف پارلیمنٹ ہی قانون بنا سکتی ہے لائبریریاں، عجائب گھر اور ایسے ہی

ثانوی، اعلیٰ ثانوی (جنرل ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم)

اس سطح پر عام تعلیم کا برسوں پرانا رجحان تبدیل کیا جا رہا ہے اور عام تعلیم کے ساتھ ذریعہ تکنیکی اور تجارتی تعلیم کو رواج دیا جا رہا ہے۔ عام تعلیم اور فن تربیت میں ہم آہنگی کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے تاکہ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اسکولوں کے طلباء اور طالبات کو مفید روزگار کیلئے تیار کیا جاسکے۔

ٹیکنیکل، کمرشل اور پیشہ ورانہ نصاب کی افادیت کا جائزہ لینے اس پر نظر ثانی کرنے اور اسے بہتر سے بہتر بنانے کے لئے خاص کمیٹیاں بنائی گئی ہیں۔ نصابوں کی افادیت کی جانچ پڑتال اور نظر ثانی متواتر ہوتی رہے گی تاکہ پبلک اور پرائیویٹ سیکڑوں میں صنعتی اور تجارتی اداروں کی ضرورتیں پوری کی جاسکیں۔

وفاقی وزارت تعلیم نے ثانوی درجوں میں تعلیم کے بارے میں اسکیم کا مسودہ شائع کیا تھا اس کے بارے میں پورے ملک سے ماہرین تعلیم، دانشور، استادوں، طلباء اور عام لوگوں کی طرف سے جو رائیں موصول ہوئیں ان کی روشنی میں ان کلاسوں میں تعلیم کی ایک نئی اسکیم تیار کی گئی ہے اس اسکیم کے تحت رات اور ٹیکنالوجی کی با مقصد تعلیم پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ وفاقی وزارت تعلیم نے کمرشل اداروں کے لئے نصاب کی افادیت کا جائزہ لینے اور اس پر نظر ثانی کے لئے ماہروں کی جو کمیٹی مقرر کی تھی اس نے انٹرمیڈیٹ سطح پر کمرشل تعلیم کی نئی اسکیم کی منظوری دے دی ہے۔ ماہروں کی ایک اور کمیٹی نے ملک کے نئے تقاضے اور ضرورتیں پوری کرنے کے لئے لڑکوں کے پیشہ ورانہ تربیت کے اداروں کے لئے بھی نئے کورس تیار کئے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم

موجودہ عام یونیورسٹیوں اور کالجوں میں براہ توسیع کی جا رہی ہے ان کے تعلیمی پروگراموں میں بھی توسیع کی جا رہی ہے ملک کے تمام حصوں کو اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنے کے پروگرام کے تحت ملتان اور ڈیرہ اسماعیل خان میں نئی یونیورسٹیاں کھول دی گئی ہیں۔ جامعہ اسلامیہ ہواپور کو مکمل یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا ہے۔

تعلیمی پالیسی کے بارے میں تمام سفارشات پر عمل درآمد کے لئے ۱۹۷۵-۷۶ میں ایک ارب بیس کروڑ روپے کی رقم درکار ہوتی۔ لیکن چونکہ وسائل محدود تھے اور اقراط زر کی روک تھام میں ضروری تھی۔ اس لئے ۱۹۷۵-۷۶ کا سالانہ ترقیاتی پروگرام کم دیا گیا۔ بہت سے ضروری پروگراموں میں تخفیف ناگزیر ہوئی۔ تعلیم کے لئے مطلوب رقم فراہم کرنا ممکن نہیں تھا اس لئے تعلیمی میدان میں ۷۶-۷۵ء میں صرف ۶۳ کروڑ ۹۰ لاکھ روپیہ کی رقم رکھی گئی ہے اس سے تعلیمی پروگراموں کو محدود کر دینا پڑا۔ ان پروگراموں میں بیشتر وہ اسکیمیں شامل تھیں جن پر پہلے سے کام ہو رہا تھا، مجموعی طور پر ۳۴ کروڑ ۳۱ لاکھ ۸۰ ہزار روپیہ یا سالانہ ترقیاتی پروگرام کا ۶۹ فیصد حصہ ان سکیموں کے لئے مختص کر دیا گیا ہے جن پر پہلے ہی کام ہو رہا ہے۔ نئے پروگراموں کے لئے جو چار صوبوں اور سات وفاقی ڈویژنوں کی طرف سے شروع ہونے ہیں صرف ۲ کروڑ روپیہ کی رقم باقی بچی ہے۔

پرائمری تعلیم

حکومت نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ ۱۹۸۳ء تک تمام بچوں کیلئے مفت ابتدائی تعلیم کا بندوبست کر دیا جائے۔ لیکن بین الاقوامی افراط زر اور دوسرے عوامل کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہے۔ اب یہ طے کیا گیا ہے کہ سب بچوں کے لئے مفت ابتدائی تعلیم کا بندوبست ۱۹۸۶ء تک کیا جائے۔ وفاقی وزیر تعلیم نے حال ہی میں کہا ہے کہ حکومت برصغیر پانچ سے دس سال تک کی عمر کے بچوں کو فیصد بچوں کے لئے اسکولوں کا بندوبست کرنے سے قاصر ہے۔ اس وقت اس عمر کے ۶۷ فیصد لڑکے اور ۳۰ فیصد لڑکیاں اسکولوں میں تعلیم پا رہی ہیں۔ سب کے لئے ابتدائی تعلیم کا بندوبست کرنے کے لئے موجودہ ۵۸ ہزار اسکولوں کے علاوہ قریباً ۱۱ ہزار نئے اسکول کھولنے ہوں گے ۱۹۷۵ء میں ۹ ہزار نئے اسکول کھولے گئے جن سے اسکول جانے والے بچوں کے فیصد تناسب میں برائے نام ہی اضافہ ہو سکا۔ تمام لڑکوں کے لئے ۱۹۸۳ء تک اور تمام لڑکیوں کے لئے ۱۹۸۶ء تک خواندگی کا بندوبست ہو سکے گا۔

میں لانا پاکستان کے لئے معاشی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ وفاقی حکومت نے اس مقصد کے لئے مختلف یونیورسٹیوں میں خاص خاص شعبوں میں اعلیٰ کارکردگی کے مرکوز قائم کر دیئے ہیں۔ امید ہے کہ ان مرکوزوں میں سائنسی مضامین میں بہترین ماہر تیار ہوں گے۔

ایریا اسٹیڈی سنٹرز

کئی یونیورسٹیوں میں ہم عصر معاشروں، خاص طور پر ان معاشروں کے بارے میں جن سے پاکستان کو خاص دلچسپی ہے اعلیٰ پیمانے پر مطالعہ اور تحقیق کے لئے ایریا اسٹیڈی سنٹرز قائم کئے گئے ہیں،

اساتذہ کی تربیت

ملک میں ۱۵ ٹیچرز ٹریننگ کالج، ۵۵ پرائمری ٹیچرز ٹریننگ انسٹیٹیوشن اور ۸۵ ٹیچرز ٹریننگ یونٹ ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں ان سب اداروں میں توسیع کی گئی تاکہ تربیت یافتہ اساتذہ کی بڑھتی ہوئی ضرورت پوری کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ اساتذہ کو تربیت دی جاسکے۔ اس کے لئے کئی تدریجی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ ان کے تحت نارمل اسکولوں کو سائنس ٹیچروں کی تربیت کے لئے کالج کا درجہ دیا جا رہا ہے، ٹریننگ کالجوں میں سائنس کی تعلیم اور تعلیمی تحقیق کی سہولتیں بڑھائی جا رہی ہیں۔ ملازمت کے دوران اساتذہ کی تربیت کا انتظام کیا جا رہا ہے اور یونیورسٹیوں کو ترقیاتی امداد دی جا رہی ہے۔

تیزی سے پھیلتے ہوئے نظام تعلیم کے لئے اساتذہ کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ثانوی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کو مضمون کی حیثیت سے شامل کیا جا رہا ہے جو طلباء اس مضمون کے ساتھ میٹرک انٹرمیڈیٹ یا ڈگری امتحان پاس کریں گے انہیں بالترتیب پرائمری مڈل اور ہائی اسکولوں کے لئے مستند پھر قرار دیا جائے گا۔

ان یونیورسٹیوں میں زراعت انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کی سہولتوں کو بھی بہتر بنایا گیا ہے اور ان میں توسیع کی گئی ہے۔ فنڈوجام کے زراعتی کالج اور جام شورو کے انجینئرنگ کالج کا درجہ بڑھا کر ہر ایک کو یونیورسٹی بنا دیا گیا ہے۔ کراچی کے این ای ڈی انجینئرنگ کالج کو بھی یونیورسٹی بنا دیا جا رہا ہے۔

ڈگری کی سطح پر بھی عام تعلیم کے رجحان کے متعلق سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم پر زور دیا جا رہا ہے۔ ۱۹۷۲ء کی ابتدا میں ڈگری کالجوں میں ۶۰ فیصد طلبائے آرٹس کے مضامین میں داخلہ لیا تھا۔ ڈگری کی سطح پر بھی عام تعلیم اور سائنسی اور ٹیکنیکل تعلیم میں بتدریج رابطہ پیدا کیا جائے گا۔ پروگرام یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء تک ڈگری کالجوں میں تقریباً ۴۰ فیصد واسطی ٹیکنیکل مضامین میں ۶۰ فیصد سائنس میں اور باقی ۳۰ فیصد آرٹس میں ہوں۔ جن ڈگری کالجوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کا انتظام نہیں تھا وہاں اب یہ انتظام کیا جا رہا ہے۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن

حکومت نے جون ۱۹۷۳ء میں پارلیمنٹ کے ایک قانون کے تحت یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قائم کیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یونیورسٹیوں کے پروگرام میں ہم آہنگی پیدا کی جائے، ان کی سہولتوں میں اضافہ کیا جائے، یونیورسٹیوں کی ترقی کے لئے فنڈ مہیا کئے جائیں اور اعلیٰ تعلیم سے متعلق معاملات میں وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو مشورے دیئے جائیں۔ کمیشن نے اعلیٰ تعلیم کے بارے میں ایک مربوط قومی پالیسی مرتب کرنے کی غرض سے اساتذہ اور طلباء کے مسائل، امتحانات اور یونیورسٹی کی سطح پر تعلیم کو بہتر بنانے کیلئے ایسے گروپ تشکیل دیئے جو اعلیٰ تعلیم کیلئے ایک مربوط قومی حکمت عملی تیار کریں۔ وفاقی حکومت ان گروپوں کی سفارشات پر پوری توجہ دے رہی ہے۔

اعلیٰ کارکردگی کے مرکز

قدرتی اور صنعتی وسائل دریافت کرنا اور انہیں پوری طرح کام

کیا ہے: ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کے میدان میں انٹرمیڈیٹ اور سیکنڈری ایجوکیشن کے بورڈوں نے اعلیٰ ثانوی درجوں کی تعلیم کے لئے ایک عارضی اسکیم تیار کی ہے ان میں سے کچھ بورڈوں نے حیاتیات، ریاضی، اردو، جغرافیہ اور معاشیات میں تفریقی شدہ کورسز رائج کئے ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کی سطح پر مذہبی تعلیم کے انحصار میں تبدیلیاں تجویز کرنے کے لئے اعلیٰ سطح کی

ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک کے لئے اسلامیات کا نصاب علما کے ایک گروپ نے سارکيا ہے۔ اس سلسلہ میں تیسری جماعت سے دسویں جماعت تک نصاب کی کتابیں مصنفون اور نظر ثانی کرتے والے ماہروں کے ایک گروپ نے تیار کی ہیں۔ جو علماء کے گروپ کے تجویز کے ہوئے نصاب کے مطابق لکھی گئی ہیں۔ ثانوی درجہ کے طلبہ کو تعلیم دینے کے سلسلہ میں سائڈ کو رہنما کتابیں دی گئی ہیں۔ نصابی کتابوں کے مختلف پروڈیوسر نے جو نصابی کتابیں تیار کی ہیں قومی جائزہ کمیٹی ان میں سے پہلی سے پانچویں جماعت تک کے لئے تیار کی ہوئی کتابوں کا جائزہ لے چکی ہے اس سال جو نصابی کتابیں پانچویں چھٹی اور نویں جماعتوں کے لئے تیار کی جائیں گی انہیں ۷۷-۱۹۷۶ء کے تعلیمی سال میں کورس میں لگنے سے پہلے ان کا جائزہ مکمل کر لیا جائے گا۔

کتابوں۔۔۔ مسودوں کا جائزہ لیتے ہو۔ مجھے کبھی اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ ان میں تقریباً پاکستان کے بارے میں کافی مواد شامل کیا گیا ہے اور پورے ملک کیلئے نفع مند کتابوں میں جو مواد پیش کیا جا رہا ہے اس میں یکساںیت پائی جاتی ہے۔

طلباء کی بہبود اور وظائف

طلباء کی بھہر اور ان میں وظائف دینے کے لئے کئی اسکیموں پر عملدرآمد
گیا۔ جن میں متعدد جہ ذیل اسکیمیں بھی شامل ہیں۔

مکہ میں اساتذہ کی تربیت کی موجودہ سہولتوں کا جائزہ لینے کے لئے یکدم عرصہ پہلے ماہروں کی جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی، اس نے سفارش کی ہے کہ اساتذہ کی تربیت کے لئے اس وقت ایک سال کا جو کورس رائج ہے اس کی جگہ تین سال کا اہمہ گیر کورس رائج کیا جائے۔

پیپلز اوپن یونیورسٹی

پمپلز اور پین یونیورسٹی ان لوگوں کو تعلیم دینے کے لئے قائم کی گئی ہے جو باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گھر دفتر یا دکان نہیں چھوڑ سکتے۔۔۔ یونیورسٹی کا صدر مقام اسلام آباد میں اور علاقائی دفاتر ملک کے مختلف حوالوں میں ہیں۔

سب سے پہلے یونیورسٹی نے فوری نوعیت کا پروگرام شروع کیا ہے اس کے تحت ابتدائی اسکول ٹیچروں کو تربیت دی جا رہی ہے ملازمت کرنے والے اساتذہ، تعلیمی کارکنوں اور سماجی کارکنوں کیلئے ریفرنٹر کورسز کا اہتمام کیا جا رہا ہے تاکہ وہ بدلے ہوئے معاشرے کے تقاضے پورے کر سکیں یونیورسٹی عملی برقیات، ریاضی، غذا اور عربی، اردو اور انگریزی زبانوں کی تعلیم کے ختمب پروگرام بھی شروع کرنے والی ہے۔

نصاب اور نصابی کتابیں

نصاب اور نصابی کتابوں کا قومی بیورو ایک مرکزی تنظیم ہے جو ملک میں تعلیمی نصاب اور نصابی کتابوں کی اصلاح کرتی ہے۔ اس ادارے کی از سر نو تنظیم کی گئی ہے اور اسے مستحکم کر دیا گیا ہے تاکہ نصابوں کا برابر جائزہ لیا جاتا رہے اور تمام نصابوں کو جن میں میکسیکس اور پیشہ ورانہ تعلیم کے نصاب بھی شامل ہیں بسہار سہار جاسانے تاکہ وہ تبدیلی کے تمام مراحل پر جن میں تینوں اور پیشہ ورانہ تعلیم میں شامل ہیں پورے اترسکیں اور وقفہ وقفہ سے ان پر نظر ثانی بھی ہوتی رہے گی۔ یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ بنیادی تصورات کے مطالعہ اور جہازوں کے حصول ذرا اہمیت دی جائے اور مشاہدے، دریافت، تجربے، عمل کام

اُجائے کا سفر



دارالحکومت اسلام آباد میں جدید طرز کا پرائمری اسکول



قبائلی بچے سبق یاد کر رہے ہیں

بلوچستان کے دور افتادہ علاقے میں ایک ہائی اسکول



گورنمنٹ ہائی



پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ایک گوشہ

فاطمہ جناح میڈیکل کالج لاہور میں رتنگ کلاس کی طالبات





کراچی یونیورسٹی کی طالبات لائبریری سے نکل رہی ہیں

گورنمنٹ کالج داؤپنڈی کی طالبات لیب و ڈری میں

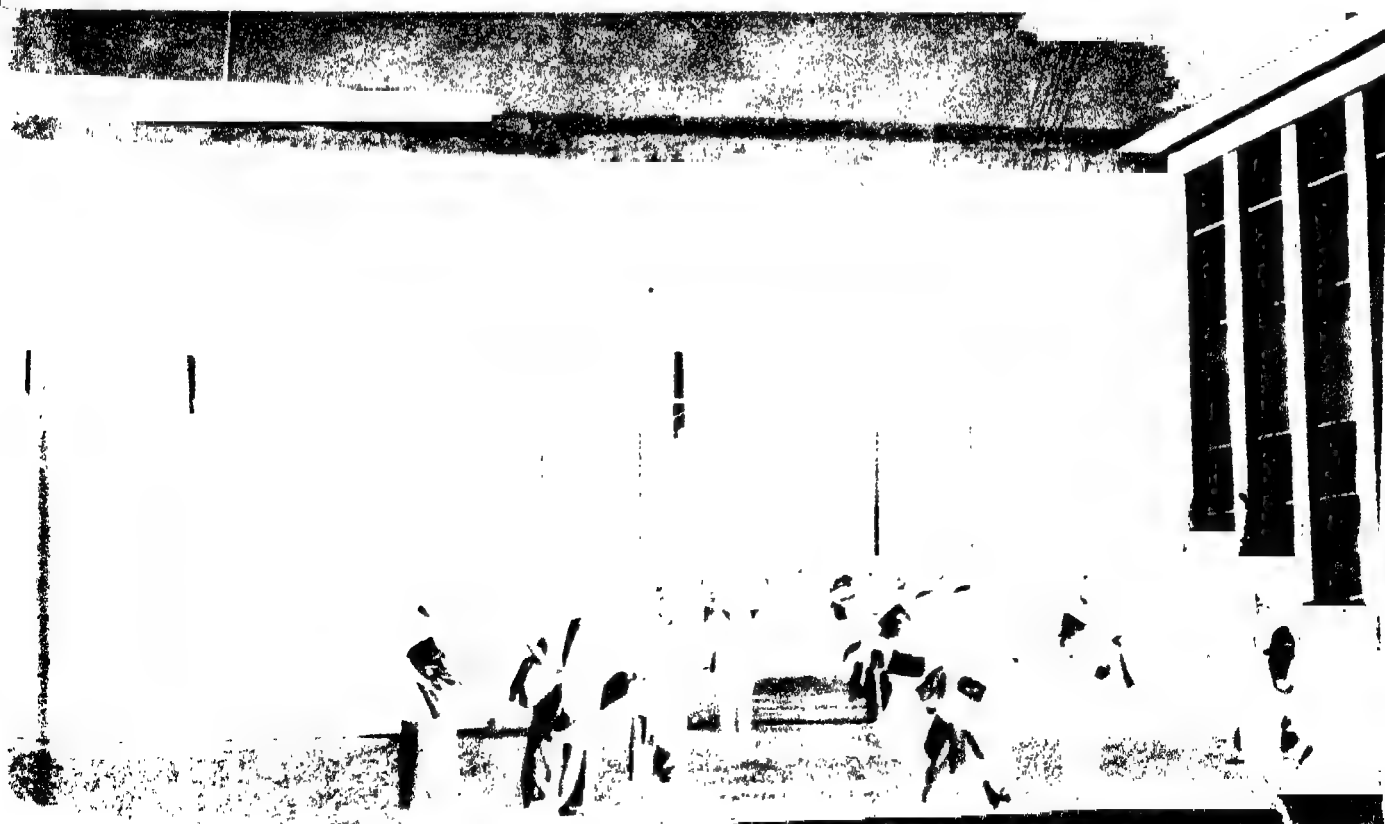


INSTITUTE OF CHEMICAL TECHNOLOGY



پنجاب یونیورسٹی کاشمیر کیمیکل ٹیکنالوجی

خمیر میڈیکل کالج (پشاور)



کھیل

پاکستان اسپورٹس بورڈ وزارت تعلیم کا ایک ادارہ ہے جو پاکستان میں مختلف کھیلوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ان کے اختلاط پر کنٹرول کرتا ہے۔ یہ ادارہ مختلف کھیلوں کی قومی تنظیموں کو مجموعی طور پر ۳۴,۵۴,۳۰۰ روپے دیتا ہے تاکہ یہ تنظیمیں اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔

حکومت نے کھیلوں کا شوق پھیلانے کے لئے کھیلوں کا قومی جرست بھی قائم کیا ہے۔ ٹرسٹ کا پروگرام یہ ہے کہ صوبائی صدر مقامات پر اسپورٹس کپلیکس تعمیر کئے جائیں۔ اس کے بعد اہم شہروں میں چھوٹے اسپورٹس کپلیکس بنائے جائیں۔ اس مقصد کے لئے ٹرسٹ کو ابتدائی طور پر ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ دیا گیا ہے۔ یہ رقم وفاقی اور صوبائی حکومتوں سرکاری اور خود مختار اداروں کی طرف سے چندے کی شکل میں حاصل ہوئی ہے۔

آرٹ اور کلچر

وزارت تعلیم نے بیرونی ملکوں کے ساتھ ثقافتی تعلقات بڑھانے کے لئے بہت سے اقدامات کئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے پچھلے چند سالوں میں پاکستان اور دوسرے ملکوں کے درمیان متعدد ثقافتی سمجھوتے ہوئے ہیں۔ ان سمجھوتوں پر عملدرآمد میں سہولت پیدا کرنے کے لئے نیشنل کونسل آف دی آرٹس قائم کی گئی ہے۔ کونسل نے پاکستانی طریق زندگی اور روایات کو دوسروں کے سامنے پیش کر کے پاکستان کے بارے میں بہتر تاثر قائم کرنے کے سلسلہ میں کئی پروگرام شروع کئے ہیں۔ پاکستان کی نیشنل کونسل آف دی آرٹس نمائشیں کراتی ہے اور ثقافتی معاہدوں کے تحت جو غیر ملکی ثقافتی طائفے آتے ہیں ملک میں ان کے دوروں کا بندوبست کرتی ہے، نیز ثقافتی طائفے باہر بھیجنے میں وزارت تعلیم کی مدد کرتی ہے۔

دوا طلباء کے لئے قرضے

وزارت تعلیم نے تین سال کے عرصے میں طلباء کو چھ کروڑ روپے بلا سود قرضے دینے کی اسکیم تیار کی اور منصوبہ بندی ڈویژن کو پیش کی۔ اس امید پر کہ یہ اسکیم منظور کر لی جائے گی پاکستانی یونیورسٹیوں کو ۲۵ لاکھ روپیہ دیا گیا تاکہ طلباء کو قرضے دینے کے لئے ہر یونیورسٹی میں فنڈ قائم کیا جائے۔

(ب) طلباء کے مطالعاتی دورے

طلباء کے مطالعاتی دوروں کے لئے ماضی میں بھی بجٹ میں رقمیں مخصوص کی جاتی رہی ہیں۔ ایسے دوروں کی قومی اہمیت کے پیش نظر وزارت تعلیم نے تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں کو جن میں قبائلی علاقوں، شمالی علاقوں، آزاد جموں و کشمیر اور کچھ دوسرے علاقوں کے کالج بھی شامل ہیں گرانٹ دی ہے تاکہ ان اداروں کے طلباء پاکستان کے اندر مطالعاتی دوروں پر جاسکیں۔

(ج) ایک ہزار صدارتی وظائف

وزارت تعلیم میں ایک ہزار صدارتی وظائف کی اسکیم تیار کی گئی اس کے تحت ۱۹۷۵ء تک ۵۸ لاکھ ۵۰ ہزار روپیہ خرچ کیا جائے گا اور ہر سال نادار لیکن ہونہار طلباء کو ایک ہزار مزید وظائف دیئے جائیں گے۔

(د) نشان جیڈر وظائف

حکومت ہر سال نشان جیڈر کے نام سے ان طلباء کو وظائف دیتی ہے جو سر بورڈ کے امتحان میں پہلی دو پوزیشنیں حاصل کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا وظائف کے علاوہ نیشنل بینک آف پاکستان نے برطانیہ میں تعلیم پانے والے طلباء کے لئے غیر ملکی زرمبادلہ کی شکل میں ۴۴ لاکھ روپے کے ۵۰ بلا سود قرضے منظور کئے ہیں۔

ہے۔ کونسل معوصی اور گرافک آرٹ کی نمائشوں کا بھی انتظام کرتی ہے اور ملک میں مختلف یادگاری دنوں پر تقریبات کا بھی اہتمام کرتی ہے۔

مردم شماری اور اسکولوں کے اعداد و شمار

پاکستان میں پہلی مردم شماری ۱۹۷۱ء میں ہوئی تھی۔ اس کے سوالنامے میں دوسری باتوں کے علاوہ لوگوں کی خواندگی کی بارے میں بھی معلومات مانگی گئی تھیں۔ ابھی تک ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مکمل اعداد و شمار شائع نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے ۱۹۶۱ء کی مردم

شماری کے مطابق پانچ سال اور اس سے زیادہ عمر کی ۳۰-۱۶ فیصد آبادی خواندہ تھی۔ اس وقت خواندگی کا مجموعی تناسب ۵۵ لاکھ تھا۔ حکومت نے ملک سے ناخواندگی ختم کرنے کے لئے ۱۹۷۲ء میں تعلیمی پالیسی بنائی۔ اس پالیسی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ۱۹۷۹ء تک تمام لڑکوں کے لئے پرائمری تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ تعلیمی پالیسی کے تحت تعلیم بالغاں اور بالغوں کی خواندگی کے وسیع پروگرام مرتب کئے گئے ہیں۔ ان پروگراموں کی ابتدا سوچلی ہے۔

حَفَّت رَوَزِجَہ

پاک جمہوریت لاہور

بالتصویر، دیدہ زیب آفسٹ چھپائی
علمی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی مضامین کا مرقع
افسائے اور نظمیں ————— صفحہ طلبا اور طالبات

عربی اسباق

سالانہ چندہ دس روپے قیمت فی پرچہ پچاس پیسے

پتنے: ————— پاکستان جمہوریت ۶۔ فین روڈ لاہور ————— ٹیلی فون: ۷۷۳۲۳

پاکستان میں زراعت کی ترقی

پاکستان کی معیشت میں زراعت کی ترقی کو بڑا اہم مقام حاصل ہے حقیقت یہ ہے کہ دیہات میں رہنے والی ۸۰ فیصد آبادی کی بہبود اور بحیثیت مجموعی پوری معیشت کی ترقی بڑی حد تک زراعت کی ترقی پر منحصر ہے۔ پیپلز پارٹی نے اس تہیہ کے ساتھ اقتدار سنبھالا کہ وہ اس ظالمانہ اور غیر منصفانہ زرعی نظام کو بدل دے گی جس کے تحت کسان صدیوں سے خاموشی کے ساتھ ظلم اور زیادتی برداشت کرتا آیا ہے۔ وزیراعظم بھٹو کے الفاظ کے مطابق "پارٹی جاگیرداری کی لعنت اور زمین پر انسان کی ظالمانہ بالادستی کو ختم کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے"۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد تین حصے کے اندر وزیراعظم نے وسیع زرعی اصلاحات کا اعلان کیا تاکہ کسان نئی زندگی شروع کر سکیں۔ وزیراعظم نے اس اعتماد کا اظہار کیا کہ کسانوں کو جو انقلابی مراعات دی گئی ہیں ان سے ان پر معاشی بہتری کے دروازے کھل جائیں گے۔

ان زرعی اصلاحات کی بدولت ۱۹۷۲ء تک ایکڑ زرعی زمین حاصل کی گئی ہے اس میں سے ۳۲ لاکھ ۶۳۲ ہیکڑ زمین ۵۳۴ لاکھ ۵۳۴ ہیکڑ زمین میں تقسیم کر دی گئی ہے، ۷۰۰۰ سہولتیں زمین کاشتکاروں کو زمین دے کر انہیں اس کا مالک بنادیا گیا ہے۔

لیکن چھوٹے چھوٹے کاشت کار زرعی اصلاحات کے بعد بھی مالہ

اور دوسرے ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے اس بوجھ کو کم کرنے کے لئے وزیراعظم نے ۱۰ نومبر ۱۹۷۴ء کو بڑے پیمانے پر مالیر کی معافی کا اعلان کیا اس سے چاروں صوبوں میں ۷۵ لاکھ سے زیادہ چھوٹے چھوٹے زمین کے مالکوں کو فائدہ پہنچے گا۔

ان میں سے ۵۰ لاکھ پنجاب میں، ۱۷ لاکھ صوبہ سرحد میں، ۷ لاکھ سے زیادہ سندھ میں اور ۳ لاکھ سے زیادہ بلوچستان میں ہیں۔

مالیر میں معافی کی خاص خاص باتیں یہ ہیں۔

۱۔ ۱۲ ایکڑ تک نہری یا ۲۵ ایکڑ تک بارانی زمین کا مالیر لوکل ریٹ، ترقیاتی ٹیکس اور مالیر سے متعلق تمام ٹیکس ریٹ ۷۴-۱۹۷۵ء سے بالکل معاف کر دیئے گئے ہیں۔

۲۔ اس رعایت سے ملک کے ۸۵ فیصد سے زیادہ کاشت کاروں کو فائدہ پہنچے گا۔

۳۔ ۲۵ ایکڑ سے زائد نہری اور ۵۰ ایکڑ سے زائد بارانی زمین کے مالکوں کے مالے لوکل ریٹ اور دوسرے ٹیکسوں میں ۵۰ فیصد اضافہ کر دیا گیا ہے۔

۴۔ ۵۰ ایکڑ سے زائد نہری زمین یا ۱۰۰ ایکڑ سے زائد بارانی زمین کے مالکوں کے مالے وغیرہ میں سو فیصد اضافہ کر دیا گیا ہے۔

- ۵۔ جن زمینداروں سے انکم ٹیکس وصول کیا جاتا ہے ان کا انکم ٹیکس بڑھے ہوئے مالیہ کے حساب سے تشخیص کیا جائے گا۔
- ۶۔ زمینداروں کی ملکیت اور ان کی زمین کے مالیک کی تشخیص کی تاریخ ۱ نومبر ۱۹۷۵ء مقرر کی گئی ہے۔

وزیر اعظم نے واضح ہدایت جاری کی ہے کہ تمام صوبے اس اسکیم پر عمل درآمد اور بڑھتے ہوئے مالیک کی ادائیگی سے گریز کی روئے تمام کے لئے ایسا نظام قائم کریں جو خامیوں سے پاک ہو۔ حکومت نے ویسی معیشت کی بحالی کے لئے جس پر صدیوں سے کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی ایک جامع پروگرام تیار کیا ہے۔ حکومت نے پیپلز ورکس اور سرنو دیہی ترقی کے جو پروگرام شروع کئے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ زرعی پیداوار میں اضافہ کیا جائے اور دیہات کے باشندوں کی زندگی بہتر بنائی جائے۔

سالانہ پروگرام کیلئے رقموں کی تخصیص

۷۶۔ ۱۹۷۵ء کا سالانہ منصوبہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے کہ نفع خاص طور پر گندم کی پیداوار بڑھائی جائے تاکہ ملک غلہ کے معاد میں جلد از جلد خود کفیل ہو سکے۔ ساتھ ہی ساتھ غذائی سطح بڑھانے کے لئے تلبین گوشت والے مویشیوں اور مرغیوں کی افزائش کی حوصلہ افزائی کے لئے بھی مناسب رقمیں رکھی گئی ہیں۔ کپاس باسمنی اور آری چاول وغیرہ کی پیداوار بڑھانے پر بھی زور دیا گیا ہے تاکہ ایک طرف تو ملکی ضروریات پوری کی جاسکیں اور دوسری طرف برآمدات سے حاصل ہونے والے اداں میں اضافہ کیا جاسکے۔ ایسی پالیسی اختیار کی گئی ہے کہ کٹاؤں کو کمیادوں کھاد، اچھی قسم کا بیج، کیڑے مار دوائیں وغیرہ وافر مقدار میں مہیا کی جا رہی ہیں۔ دوسری طرف زرعی پیداوار کی ایسی قیمتیں رکھی گئی ہیں جن سے ماست کا مدن کو تائدہ پہنچ رہا ہے۔

سیم اور خور پر قابو پانے، تزیلا بند کو مکمل کرنے (توقع ہے کہ اس بند سے ۱۹۷۵ء کی فصل ربیع کے لئے پچاس لاکھ ایکڑ فٹ اضافہ پڑے گا۔)

دستیاب ہوگا، تیر زمین پانی کے وسیلوں کو کام میں لانے اور بجلی اور ٹرانسپورٹ کی ترقی کے منصوبوں کے لئے جس بڑی بڑی رقمیں رکھی گئی ہیں۔ ان شعبوں میں ترقی کا دراحت کی ترقی پر براہ راست اثر پڑے گا۔ بارانی علاقے کے لئے خاص ٹیکنالوجی سے جو اس علاقے کے لئے موزوں ہے کام لینے کے پروگرام پر ۷۴۔ ۱۹۷۳ء سے عملدرآمد ہو رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بارانی علاقے کی زرعی پیداوار میں نمایاں اضافہ کیا جاسکتا ہے اس علاقے کے لئے خاص قسم کا بیج تیار کیا گیا ہے۔ اسے کاشت کاروں میں مقبول بنانے کے لئے بڑے پیمانے پر نمائشی پلاٹ تیار کئے جائیں گے۔ امداد باہمی کی بنیاد پر کاشت کار پروگرام تیار کیا گیا ہے جس پر موجودہ سال کے دوران عملدرآمد ہوگا۔ توقع ہے کہ اس کی بدولت نیوٹ پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ اور اس طرح دیہات کے باشندوں خاص طور پر چھوٹے زمینداروں کی معاشی اور معاش حالت بہتر ہو جائے گی۔

۷۶۔ ۱۹۷۵ء کے سالانہ حرقاتی پروگرام میں زراعت کی مد میں جو رقم رکھی گئی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ مذکورہ بالا نفع حاصل اختیار کیا جاسکے۔ توقع ہے کہ اس سے زرعی ترقی کی رفتار میں ۷۵۔ ۱۹۷۴ء کے مقابل میں ۲۳ فیصد اضافہ ہوگا۔ کمیادوں کھاد، کیڑے مار دواؤں اچھے بیج اور زمین کو فیکٹل کرنے والی مشینوں کے لئے جو رقم رکھی گئی ہے وہ موجودہ سال کے مقابلہ میں ۳۳ فیصد زائد ہے۔ جمیلیوں اور مویشیوں کی افزائش کے لئے موجودہ سال کے مقابلہ میں ۱۲ فیصد زائد رقم رکھی گئی ہے۔ اس طرح زرعی اداروں اور اندرونی انتظام کے لئے بھی پہلے سے زائد رقم رکھی گئی ہے۔

۷۶۔ ۱۹۷۵ء کے لئے کمیادوں کھاد کے استعمال کا ہدف پانچ سو ۵۰ ہزار ٹن مقرر کیا گیا ہے جبکہ ۷۵۔ ۱۹۷۴ء میں یہ ہدف چار سو ۲۵ ہزار ٹن تھا۔ ۷۶۔ ۱۹۷۵ء میں ۹۵ لاکھ ایکڑ ریت پر کیڑے مار دوائیں چھڑکی جائیں گی اس سے ۳۹۹،۰۰۰ ایکڑ ریت پر زمین سے اور باقی ریت پر سواری جہان سے دوائیں چھڑکی جائیں گی ۷۵۔ ۱۹۷۴ء میں ۵۵ لاکھ ۳۰ ہزار ایکڑ ریت پر کیڑے مار دوائیں چھڑکی گئیں اس سے ۳۶ لاکھ ۱۰ ہزار ایکڑ ریت پر زمین سے اور ۲۹ لاکھ ۲۰ ہزار ایکڑ پر ہوائی جہان سے دوائیں چھڑکی گئیں۔ اس طرح کیڑوں وغیرہ سے محفوظ کئے جانے والے ریت میں ۲۶ فیصد اضافہ ہوا۔



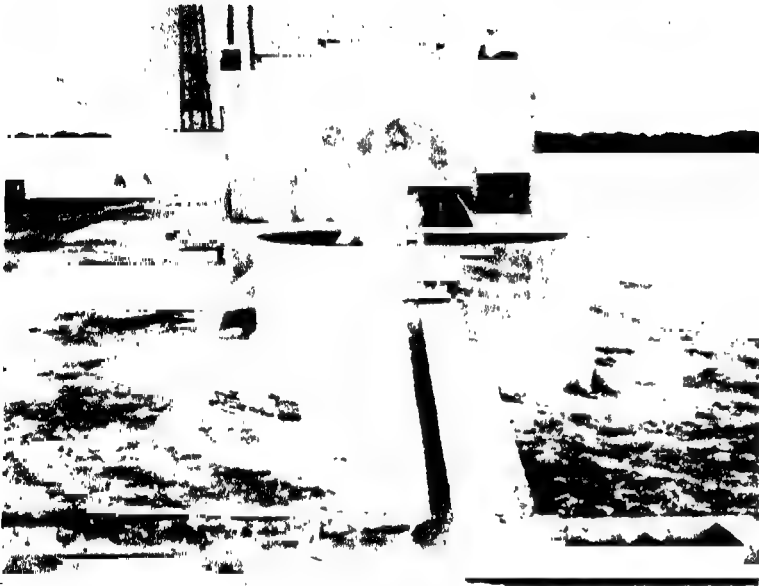
کاشت کاروں کو موقع برہی فرمے دیئے جا رہے ہیں

ایگریکلچرل یونیورسٹی دہلی





مشیق آلات سے گندم اُٹا جا رہا ہے

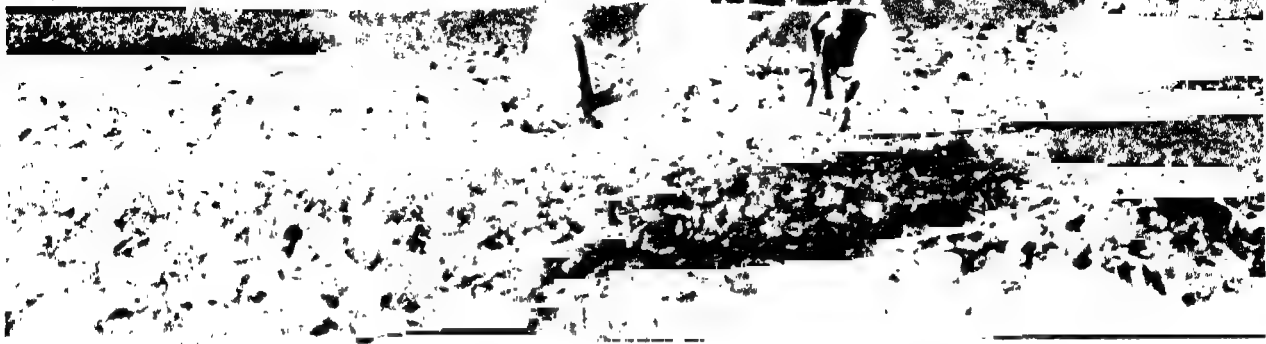


زراعت کے لئے ایک نیا ٹوب ویل



مشیقوں کے قدیمے جو سے سے اگ کیا ہوا
گندم ٹال پر لاوا جا رہا ہے



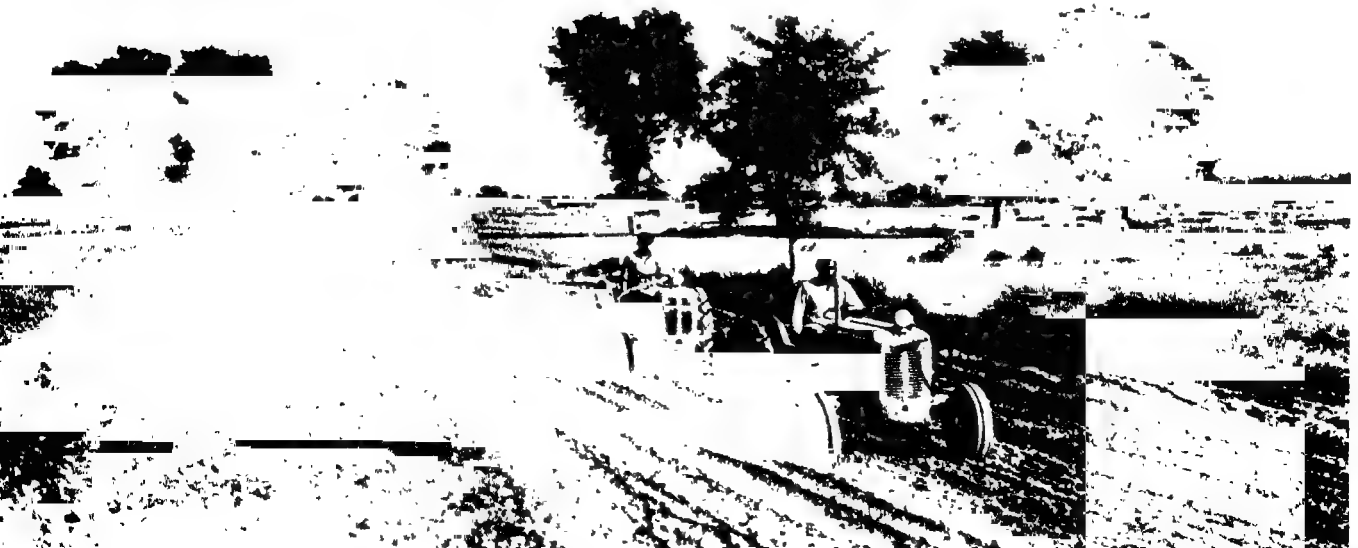


گلگت کا ایک جمائش کسان ہل پیلارہا ہے



ایک خوش دل کسان اپنی فصل بیل گاؤں پر لے جا رہا ہے

پنجاب میں ٹریکٹروں کا استعمال عام ہو رہا ہے۔





دھان پکڑے جا رہے ہیں

پنجاب کے جڑاں ہمت کسان فصل کاٹ رہے ہیں



جون ۱۹۷۳ء میں ۱۰ کروڑ روپیہ کے سرمایہ سے پاکستان اگریکلچرل اسٹوریج اینڈ سروسز کارپوریشن قائم کی گئی تھی۔

مالی تخصیص

۷۶-۱۹۷۵ء میں زراعت کے لئے ۱۲۲۵۰۰۰۰ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے، ۷۵-۱۹۷۴ء کے دوران اس مدینہ ۹۹۰۰۰۰ روپے کی رقم دیکھی گئی تھی۔ موجودہ سال کی رقم پچھلے سال کی رقم سے ۲۳ فیصد زائد ہے۔ اندازہ ہے کہ ۷۵-۱۹۷۴ء کے سالانہ ترقیاتی پروگرام میں زراعت کے لئے ۹۹۰۰۰۰ روپے کی جو رقم مخصوص کی گئی تھی وہ سب کی سب استعمال کر لی گئی ہے۔

گیہوں کی خریداری کی سرکاری قیمت خرید جو ۷۴-۱۹۷۳ء کی فصل کے لئے ۲۵ روپیہ ۵۰ پیسے فی من تھی۔ ۷۵-۱۹۷۴ء کی فصل کے لئے ۳۰ پیسے فی من مقرر کی گئی، ۷۵-۱۹۷۴ء میں چاول دینے کی مختلف قسموں کی سرکاری قیمت خرید میں وقتاً فوقتاً اضافہ کیا جاتا رہا ہے۔

حکومت نے غلہ کی قیمتوں میں استحکام پیدا کرنے کی جو پالیسی اختیار کی ہے اس پر غلہ درآمد اور ملک سے باہر بھیجے جانے والے غلہ کا ذخیرہ رکھنے کے لئے سرکاری گوداموں کی ضرورت ہے، جون ۱۹۷۵ء کے آخر تک سرکاری گوداموں کی مجموعی گنجائش قریباً ۱۶ لاکھ ۴۵ ہزار ٹن تھی ۷۵-۱۹۷۴ء کے دوران اس گنجائش میں ۳ لاکھ ۳۵ ہزار ٹن کا اضافہ کیا جائے گا کچھ فالتو گودام بن چکے ہیں، کچھ اور گودام بنائے جا رہے ہیں۔



زرعی بستیوں کا ترقیاتی پروگرام

پاکستان پیپلز پارٹی نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ”چھوٹے چھوٹے قصبے بسائیں جائیں گے جن کا آس پاس کے دیہات سے قریبی رابطہ ہوگا۔ شروع میں ایسے ۲۰ قصبوں کی ضرورت ہوگی جو زرعی بستیاں کہلائیں گی۔“

پس منظر

پاکستان کی تقریباً پچھتر فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے اور وہ ان سہولتوں سے محروم ہے جو شہریوں کو حاصل ہیں۔ دیہات کے باشندوں کی امنگوں میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ وہ اپنے لئے پہلے سے بہتر مواقع کے خواہش مند ہیں۔ دوسری طرف دیہات بہت پسماندہ ہیں ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دیہات کے لوگ شہروں میں منتقل ہو رہے ہیں۔ اس منتقلی سے اس افرادی طاقت میں برابر کمی ہو رہی ہے جو زراعت کے لئے درکار ہے۔ دیہات کی افرادی طاقت کو منفعت بخش طریقے سے کام پر لگانے کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے اور اپنا یہ وعدہ پورا کرنے کے لئے کہ ملک میں مساوات کی بنیاد پر معاشرہ قائم کیا جائے گا عوامی حکومت نے زرعی بستیوں کی ترقی کا پروگرام شروع کیا۔

متحدہ کیلئے کئے گئے تخمینہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ صدی کے آخر تک آبادی میں اضافہ کی موجودہ رفتار سے پاکستان کی آبادی ۳۰ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ ان میں سے کوئی ۸ کروڑ ۶۰ لاکھ نفوس یعنی ۶۶ فیصد آبادی شہروں میں آباد ہوگی۔ موجودہ شہروں کو سامنے رکھتے ہوئے بھی اس وقت کراچی کے برابر ۲۰ شہروں کی لاہور کے برابر ۳۰

شہروں کی اور کوٹہ کے برابر ۶۰ شہروں کی ضرورت ہوگی، تاکہ شہری آبادی میں اس اضافہ کو کھپایا جاسکے۔ ملک کے محدود معاشی اور فنی ذرائع کے پیش نظر یہ بہت بڑا چیلنج ہے۔

اس وقت ملک کے بڑے بڑے شہروں میں ایسے ہزاروں لوگ دیہات سے آگئے ہیں جو بے روزگار ہیں اور جنہوں نے کسی کام کی تربیت بھی حاصل نہیں کی۔ جو شہری ادارے چھوٹے شہروں کی محدود ضرورتیں پوری کرنے کے لئے قائم کئے گئے تھے، وہ دیہات سے آبادی کی منتقلی سے پیدا ہونے والی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شہروں میں جگہ جگہ گندمی بستیاں قائم ہو گئی ہیں۔ شہروں میں ہر جگہ بھیڑ بھاڑ ہو گئی ہے۔ میونسپلٹی کی سہولتیں کافی ہو کر رہ گئی ہیں اور بہت سے دوسرے مسئلے پیدا ہو گئے ہیں۔ بڑے شہروں کو آبادی میں ضرورت سے زیادہ اضافہ سے بچانے اور آبادی کو مربوط طریقے پر اس طرح بسائے کہ کسی کو دشواری پیش نہ آئے مناسب اقدامات کی ضرورت ہے۔ زرعی بستیاں بسانے کا منصوبہ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔

وسیع معنی میں زرعی بستیاں شہروں اور دیہات کے درمیان رابطہ کی بستیاں ہیں جو ترجیحی طور پر دیہی علاقوں میں بسائی جا رہی ہیں۔ ان بستیوں کا منصوبہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہاں کے رہنے والوں کو متوازن حد تک ضروری پبلک خدمات اور معاشرتی اور ثقافتی سہولتیں میسر آسکیں۔ زرعی بستیوں میں ترقیاتی سرگرمیوں کا مقصد یہ رکھا گیا ہے کہ ان سے آس پاس کے دیہات کو فائدہ پہنچے، ان کے لئے روزگار کے مواقع فراہم ہوں، زرعی پیداوار منڈیوں میں لانے، اشیائے صرف کی فراہمی،

کتنا کام ہو چکا ہے

زرعی بستیوں کی ترقی کا پروگرام ۱۹۶۲ء میں شروع کیا گیا تھا چونکہ یہ بالکل نیا پروگرام تھا۔ اس لئے پہلے چھ مہینے اس کے تصور کو واضح کرنے، اس کے لئے سرمایہ فراہم کرنے اور وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان تعاون کے طریقے طے کرنے میں مرت ہو گئے۔ پھر صوبائی حکومتوں سے کہا گیا کہ وہ ایسی جگہیں تجویز کریں۔ جہاں زرعی بستیاں بسائی جاسکیں۔

صوبائی حکومتوں نے درج ذیل مقامات تجویز کئے :

پنجاب

- (۱) ست راہ ضلع سیالکوٹ
- (۲) جگتاں والا ضلع سرگودھا
- (۳) دوٹار ضلع راولپنڈی
- (۴) دھراں والا ضلع بہاولنگر
- (۵) لار ضلع ملتان

صوبہ سرحد

- (۱) پی پشاور
- (۲) ٹوپی ضلع مردان
- (۳) ٹل ضلع بنوں
- (۴) تاجوڑی ضلع بنوں
- (۵) درہ بند ضلع ڈیرہ اسماعیل خان
- (۶) بھ ضلع مزارہ

سندھ

- (۱) بدین ضلع حیدر آباد
- (۲) میروخان ضلع لاڑکانہ
- (۳) گڑھی خرو ضلع جیکب آباد

زراعت پر انحصار کرنے والی صنعتیں قائم کرنے، تعلیم، صحت، پانی کی فراہمی اور مواصلات کی سہولتیں حاصل ہوں۔ زرعی بستیوں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ شہروں کی آبادی میں بے تحاشا اضافے کو روکا جائے اور دیہات کی ایسی آبادی کو جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ مفید کاموں میں کھپایا جاسکے۔ مختصر زرعی بستیاں بنانے سے حسب ذیل مفاد حاصل ہو سکیں گے۔

- (۱) ملک میں شہروں کے پھیلاؤ میں باقاعدگی پیدا کرنا۔
- (۲) دیہات کے باشندوں کی شہروں میں منتقلی کے رجحان کو رفتہ رفتہ ختم کرنا۔

(ج) فالٹو کھیت مزدوروں کے لئے روزگار فراہم کرنا اور

- (د) دیہات کی آبادی کو ان کے علاقے میں شہری سہولتیں فراہم کرنا۔

زرعی بستیاں ایسے مقامات پر بسائی جائیں گی جن میں ترقی کی صلاحیت ہو اور جو معاشی طور پر نئی بستی کا بوجھ برداشت کر سکیں۔ ان بستیوں کے لئے تین قسم کے مقامات پر غور کیا گیا (۱) بالکل نئے مقامات (۲) چھوٹے چھوٹے گاؤں اور (۳) مربوط دیہی ترقی کے مرکز۔ اس مسئلے پر بڑی تفصیل سے غور کیا گیا۔ یہ سوال زیر بحث آیا کہ زرعی بستیاں بالکل نئے مقامات پر بسائی گئیں یا چھوٹے گاؤں کو پوری بستی کا درجہ دے دیا گیا تو کیا آبادی کی تعداد اور بھاری اخراجات کے پیش نظر ایسی بستیاں معاشی طور پر چھوٹے چھوٹے سکیمیں گی۔ اور اپنی ضرورتیں پوری کر سکیں گی۔ کافی غور و خوض کے بعد اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ صرف موجودہ چھوٹے چھوٹے قصبے اور مربوط دیہی ترقی کے مرکز جو ترقی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تھوڑی بہت اعداد کے ذریعہ معاشی طور پر ترقی پذیر زرعی بستیاں بن سکتے ہیں۔ زرعی بستی کے لئے جگہ صوبائی حکومت تجویز کرتی ہے اور علاقائی حالات کا تفصیلی جائزہ لینے اور اسکیم کے قابل عمل ہونے کا اطمینان کرنے کے بعد ماحول اور شہری معاملات کی ڈویژن کے مشورہ سے جگہ کا قطعی انتخاب کیا جاتا ہے۔

بلوچستان

- (۱) ٹپل ڈیرہ ضلع کچی
- (ب) کوٹلو، مری، گجٹی ایجنسی
- (ج) ڈیرہ گجٹی، مری، گجٹی ایجنسی
- (د) کاہان، مری، گجٹی ایجنسی
- (۵) میوند، مری، گجٹی ایجنسی
- (و) ڈوکی
- (ز) گدرا، سوراب ویلی

آزاد کشمیر

- (۱) اٹھ مقام ضلع مظفر آباد
- (ب) راولا کوٹ ضلع پوچھ
- (ج) کوٹلی اور چیمب ضلع میر پور

پھر ان جگہوں کے کارآمد ہونے کا جائزہ شروع کیا گیا تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ وہاں زرعی بستیاں بسانا مفید ہوگا یا نہیں۔ اس مقصد کے لئے ماحول اور شہری معاملات کے ڈویژن کے ماہروں کی جماعتوں نے مختلف صوبوں میں جا کر بہت سی جگہوں کے کارآمد ہونے کا جائزہ لیا۔ اس جائزے کی بنیاد پر آٹھ جگہیں زرعی بستیوں کیلئے قطعی طور پر منتخب کر لی گئیں۔

حکومت پنجاب کی درخواست پر ماحول اور شہری معاملات کی ڈویژن کی ٹیکنیکل ٹیم ضلع سرگودھا گئی جہاں اس نے جگتاں والا میں زرعی بستی بسانے کی اسکیم کے کارآمد ہونے کا جائزہ لینے میں صوبائی محلے کی مدد کی۔ باقی اسکیموں کے جائزے حکومت پنجاب کا ہاؤسنگ اینڈ فزیکل پلاننگ کا محکمہ خود مکمل کرے گا۔

مزید مطالعہ اور زرعی بستیوں کے ماسٹر پلان تیار کرنے کے لئے ماحول اور شہری معاملات کی ڈویژن نے مشیروں کی خدمات حاصل کی ہیں۔ اس کے بعد صوبائی حکومتیں تفصیلی اسکیمیں تیار کریں

گی اور متعلقہ حکام سے ان کی منظوری ملیں گی۔ اس مقصد کے لئے ماحول اور شہری معاملات کی ڈویژن نے دس لاکھ روپیہ ان مشیروں کے حوالے کیا ہے۔

۷۶-۱۹۷۵ء کا پروگرام

۷۶-۱۹۷۵ء میں منتخب جگہوں کے لئے زرعی بستیوں کے ماسٹر پلان تیار کئے میں گئے۔ ۷۶-۱۹۷۵ء کے سالانہ ترقیاتی پروگرام کے بجٹ میں زرعی بستیوں کے پروگرام کے لئے ۷۵ء و ۱۲ لاکھ کی رقم رکھی گئی ہے۔ اس رقم میں سے زرعی بستیوں کے ماسٹر پلان تیار کرنے کے سلسلہ میں مشیروں کے بقایا جات ادا کئے جائیں گے اور صوبائی حکومتوں نے جو مزید جگہیں تجویز کی ہیں ان کے قابل عمل ہونے کا جائزہ لیا جائے گا۔

وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی طرف سے مالی امداد

زرعی بستیوں کے منصوبے کی کامیابی کا اظہار اس بات پر ہے کہ اس میں وفاقی اور صوبائی حکومتیں اور پرائیویٹ سیکٹر سرگرمی سے حصہ لیں۔ پروگرام کے ابتدائی مرحلے میں ضروری امداد کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ وفاقی حکومت ہر زرعی بستی کی بنیادی ضروریات اور ٹاؤن ہال کے مجموعی اخراجات کا پچاس فیصد حصہ برداشت کرے گی۔ باقی خرچ صوبائی حکومتیں اٹھائیں گی۔ اس سلسلے میں وفاقی حکومت نے سندھ میں بدین کی زرعی بستی کے لئے اپنے حصہ کا ۲۵ لاکھ روپیہ ادا کر دیا ہے۔

اس پروگرام پر عملدرآمد کے لئے ماحول اور شہری معاملات کی ڈویژن صوبوں کو بھرپور فنی امداد دے رہی ہے۔ اس سلسلے میں ڈویژن کے ماہروں نے صوبوں کی تجویز کی ہوئی جگہوں کے کارآمد ہونے کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ زرعی بستیوں کے ماسٹر پلان تیار کرنے کا پورا خرچ بھی وفاقی حکومت ہی اٹھا رہی ہے۔

مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام

میں زندگی کو عام طور پر بہتر بنانے روزگار کے مواقع فراہم کرنے اور دیہات اور شہروں کا فرق کم کرنے کی آخری امید ہے۔ اس طرح دیہات کے باشندے بھی ملک کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی میں اپنے شہری بھائیوں کے شانہ بہ شانہ فخر کے ساتھ بھرپور حصہ لے سکیں گے۔

پروگرام کا تصور

پروگرام کا تصور لاہور کے قریب شاداب پائلٹ پراجیکٹ میں حاصل ہونے والے تجربے کی روشنی میں معروضی وجود میں آیا۔ وہ تصور یہ ہے کہ پچاس ساٹھ ایسے دیہات کا پیداواری رقبہ منتخب کر لیا جائے جہاں چھوٹے اور درمیانے درجے کے زمیندار رہتے ہوں۔ ان زمینداروں کی معاشرتی اور معاشی حیثیت بہتر بنانے کے لئے سب سے پہلے پیداوار بڑھانے پر زور دیا جائے اس مقصد کے لئے فنی طور پر ان کی رہنمائی کی جائے، قرضے دے کر ان کے استعمال کی نگرانی کی جائے۔ بیج، کھاد وغیرہ فراہم کئے جائیں، مشینیں کرایہ پر دی جائیں اور زرعی پیداوار کا ذخیرہ رکھنے اور اسے منڈی میں لانے

دیہات کے باشندوں کے معاشرتی اور معاشی حالات سدھانے کے مسئلے پر یکے بعد دیگرے پاکستان کی ہر حکومت نے توجہ دی ہے اس مقصد کے لئے دیہی ترقی کے کئی پروگرام شروع کئے گئے۔ اس سلسلے میں ویلج، ہائیڈرو پاور، جمہوریتیں اور دیہی تعمیر کے پروگرام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان پروگراموں کی کامیابی محدود تھی اس لئے کہ ان میں ایک ہی پہلو پر توجہ دی گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ تمام پروگرام ترک کر دیئے گئے۔ عوامی حکومت دیہات کے باشندوں کا معیار زندگی بلند کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے اس لئے اس نے اقتدار سنبھالتے ہی مربوط دیہی ترقی کا پروگرام شروع کیا۔ پروگرام کا مقصد یہ رکھا گیا کہ دیہات کے باشندوں کی معاشرتی اور معاشی ترقی کے مسائل بہ حیثیت مجموعی حل کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ ان کی زندگی پہلے سے بہتر اور با مقصد بن جائے۔

جب جولائی ۱۹۷۴ء میں یہ پروگرام شروع کیا گیا تھا تو اس وقت کے صدر مملکت (موجودہ وزیر اعظم) نے اس کی اہمیت ان الفاظ میں واضح کی تھی۔

”غالباً مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام چھوٹے چھوٹے کسانوں کی اکثریت کی معاشی حالت سدھانے میں

صحت کے نئے پروگرام

سعید خاں قمر

پوری آبادی کے لئے علاج معالجہ کا مکمل انتظام بڑا مشکل کام ہے اور دنیا کے بہت سے ترقی یافتہ ممالک بھی ابھی تک اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکے۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی مشترکہ کوششوں سے اس منزل کی طرف پیش قدمی کی جا رہی ہے۔

وفاقی حکومت نے ۷۶-۷۵ء کے سالانہ منصوبے میں صحت کے لئے ۴۴ کروڑ ۲۶ لاکھ ۳۲ ہزار اور آبادی کی منصوبہ بندی کے لئے ۸ کروڑ ۴۹ لاکھ ۹۰ ہزار روپیہ کی رقم رکھی ہے۔ یہ رقم ۷۵-۷۴ء کے نظر ثانی شدہ تخمینے سے ۸۰ فیصد زائد ہے۔

۷۵-۷۴ء کے سالانہ پروگرام کے تحت صحت کے ۴۳ دیہی مرکز، ۱۱۴ بنیادی یونٹ اور ۲۳۵ شفا خانے کھولے جائیں گے۔ اس طرح دیہاتوں میں مجموعی طور پر صحت کے ۱۲۴ نئے یونٹ قائم کئے جائیں گے۔ توقع ہے ۷۵-۷۴ء سے ۷۶-۷۵ء تک پانچ سال کی مدت میں ہر سال صحت کے ۷۰ نئے یونٹ اور مرکز مکمل ہوں گے۔ حکومت دیہی ہیلتھ ورکروں اور ہیلتھ گارڈوں کی خدمات پر خاص توجہ دے رہی ہے۔ ان تمام کوششوں کی بدولت پندرہ فیصد سے بڑھ کر ہچاس فیصد آبادی کے علاج معالجے کا بندوبست ہو جائے گا۔ ہیلتھ ورکروں یا ہیلتھ گارڈوں کی اسکیم اپنی نوعیت کی انوکھی

حکومت نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ملک کی ترقی کے لئے اچھے ذہن بڑے ضروری ہیں اور اچھے ذہنوں کے لئے ضروری ہے کہ عام صحت اچھی ہو صحت کا ایک ہمہ گیر پروگرام شروع کیا ہے جس کے تحت آئندہ پانچ سال کے عرصہ میں نہ صرف شہروں بلکہ دور دراز دیہات تک میں لوگوں کو علاج معالجے کی مناسب سہولتیں حاصل ہو جائیں گی۔

صحت کے پروگرام کی خاص خاص باتیں یہ ہیں۔ موجودہ ہسپتالوں سے پوری طرح کام لینے کے علاوہ صحت کے نئے یونٹوں اور نئے مرکزوں کی تعمیر ہر سطح پر صحت کے اداروں میں کام کرنے والوں کے لئے تعلیم و تربیت کی سہولتوں میں اضافہ، متعدی امراض کی روک تھام اور شہروں اور دیہات میں صحت عامہ کی بہتری۔

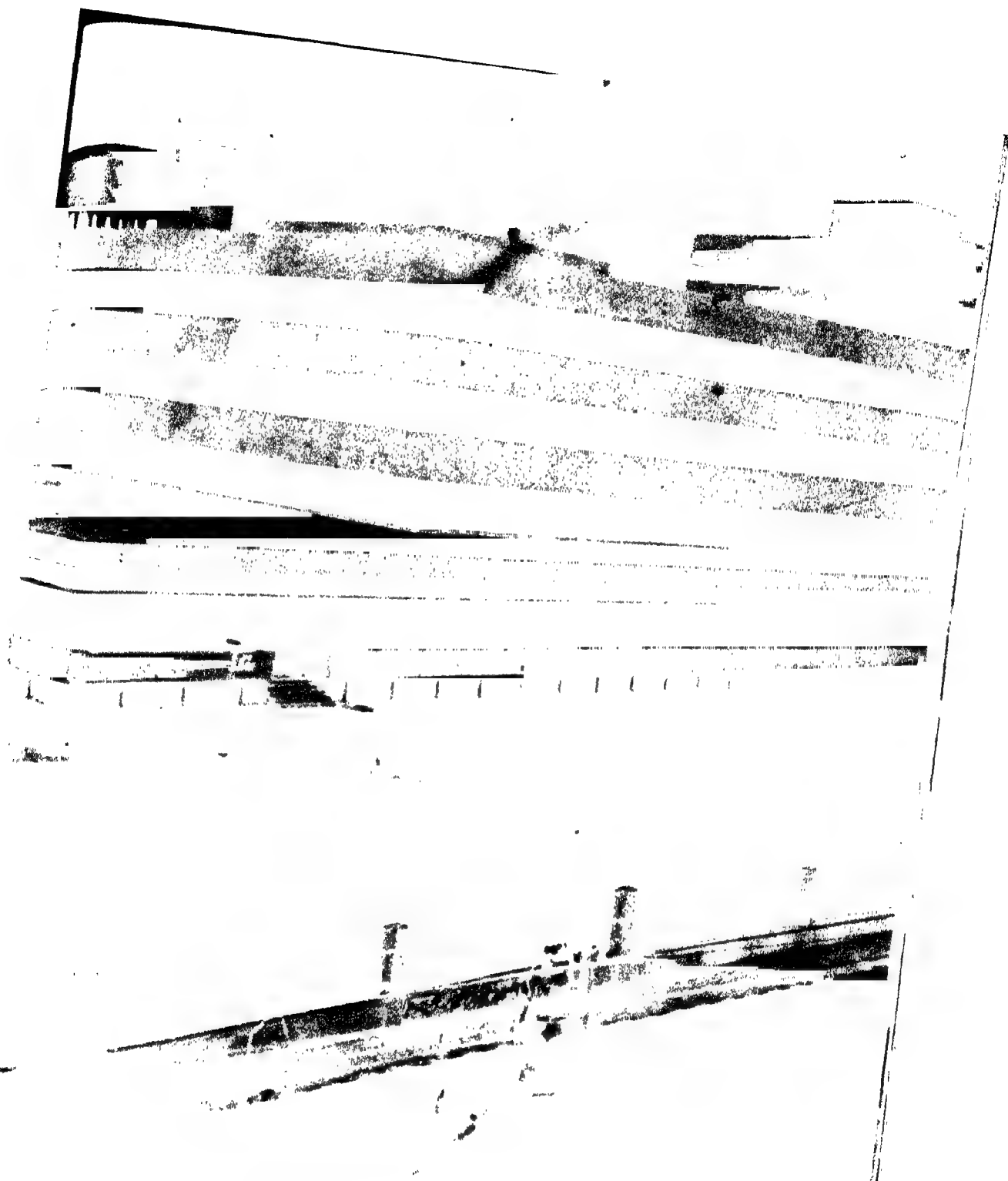
یہ مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں کہ ملک کے عامل کی حدود میں رہ کر لمبی مدت کے لئے ہمہ گیر منصوبہ بندی کی جائے حکومت نے اس سلسلے میں ۳ طریقے سامنے رکھے ہیں۔ اول پیشہ ورانہ اور عائلی تربیت یافتہ عملے کے ذریعے علاج معالجہ کا روایتی طریقہ، دوم ڈاکٹروں کی رہنمائی میں دستی حیثیت کے عمل کے ذریعے علاج معالجہ اور تیسرے دیہاتی ہیلتھ ورکروں یا ہیلتھ گارڈوں کے ذریعے صحت کے پروگرام پر عمل درآمد۔



بلوچستان کے قبائلی علاقے کے ایک ہسپتال میں ٹیکے لگائے جا رہے ہیں

بلوچستان کے قبائلی علاقے "کوہلو" میں ایک نو تعمیر ہسپتال





زخمیه "یبرعاس شهید ہسپتال" (کراچی)

”ڈاکٹر حضرات چاہے سرکاری ہسپتالوں میں ہوں یا
 نجی شعبہ میں، انہیں چاہیے کہ وہ ان منصوبوں کے فوائد کو
 ان کے وسیع خدو خال میں سمجھیں اور ان میں متعین کئے گئے
 مقاصد کے حصول کے لئے بل جل کر کام کریں۔“
 وزیر اعظم - ۲۶ مارچ ۱۹۷۲ء

ایک سرکاری میڈیکل اسٹور میں مریضوں کو
 مفت دوائیں تقسیم کی جاتا ہے۔





ایک ہسپتال میں خواتین کے وارڈ کا اندرون منظر

ایک نرسنگ کلاس



کی تربیت پر خطیر رقم خرچ کر رہا ہو، اس بات کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ ڈاکٹر ملک سے باہر چلے جائیں۔

صحت کے پروگرام کی کامیابی بڑی حد تک ملک کے اندر تیار ہونے والی دواؤں کی عمدگی پر بھی منحصر ہے۔ دواؤں کے جبرائیل کے رواج کا اب مفید نتیجہ برآمد ہونے لگا ہے۔ اب ملک میں نہ صرف سستی دوائیں تیار ہو رہی ہیں بلکہ ۹۵ فیصد دوائیں ملک کے اندر ہی بن رہی ہیں۔

حکومت اس بات کی کڑی نگرانی کر رہی ہے کہ غیر معیاری اور گھٹیا دواؤں نہ بنائی جائیں۔ ایسی دواؤں بنانے اور بیچنے والے افراد اور فرموں کو سزا دینے کے لئے سخت قوانین بنائے گئے ہیں۔

صحت کا کوئی پروگرام کتنا ہی عمدہ گہر کیوں نہ ہو وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک آبادی میں اضافہ کی شرح کو قابو میں نہ رکھا جائے۔ ۱۹۷۵ء کے وسط تک ملک کی آبادی ۷۷ کروڑ ۳۰ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ دوسری طرف شرح پیدائش ۴۵ فی ہزار اور شرح اموات ۱۵ فی ہزار تھی۔ ملک کی آبادی میں ۳ فیصد سالانہ کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر آبادی میں اسی شرح سے اضافہ ہوتا رہا تو سنہ ۱۹۸۰ء تک ملک کی آبادی اندازاً ۸ کروڑ ۴۰ لاکھ تک پہنچ جائے گی۔

شرح پیدائش پر قابو پانے کے لئے حکومت نے آبادی کی منصوبہ بندی کی اسکیم شروع کی ہے اور اس کیلئے ۷۷-۱۹۷۵ء کے بجٹ میں ۱۸ کروڑ ۹۴ لاکھ ۹۰ ہزار کی رقم مخصوص کی ہے جبکہ ۷۵-۱۹۷۴ء میں یہ رقم ۴ کروڑ پچاس لاکھ تھی گویا پچھلے سال کے مقابلے میں ۳۱ فی صد اضافہ کیا گیا ہے۔

اسکیم ہے۔ پاکستان کے شمالی علاقوں میں اس اسکیم کے بڑے حوصلہ افزا نتائج نکلتے ہیں، اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتہ ڈاکٹروں وغیرہ سے کام نہیں لیا گیا۔ گزشتہ سالوں کے نتائج کو دیکھتے ہوئے حکومت نے اس سال ۶۰ لاکھ روپیہ کی رقم پیش میں مخصوص کی ہے۔ اس میں سے چالیس لاکھ روپے صحت کے عام نظام پر اور ۲۰ لاکھ روپے صحت کے دیہی پروگرام پر خرچ کئے جائیں گے۔

ہیلتھ گارڈ چین کے ”برہنہ ڈاکٹروں“ کی طرح ہیں۔ یہ گارڈ ضرورت کے وقت علاج معالجے کے لئے ان دور دراز علاقوں میں پہنچتے ہیں جہاں صحت کی عام سہولتیں فراہم نہیں کی جاسکتیں۔

حکومت ڈاکٹروں کی تربیت پر پوری توجہ دے رہی ہے لیکن میزوں کے بعد ایک طالب علم کو مستند ڈاکٹر بننے میں کم از کم سات سال لگتے ہیں اور ہر ڈاکٹر کی تربیت پر ۸۰ ہزار روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ میزوں کے بعد زس کی تربیت تین سال میں مکمل ہوتی ہے اور ہر زس کی تربیت پر اوسطاً بیس ہزار روپے لاگت آتی ہے۔

ڈاکٹروں کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر وفاقی اور صوبائی حکومتیں زیادہ سے زیادہ میڈیکل کالج کھول رہی ہیں۔ ان کالجوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔

نئے کالجوں کے قیام کے بعد اب ہر سال اندازاً ۱۲۰۰ ڈاکٹر، ۵۰۰ نرس، ۱۰۰ ڈاکٹر، ۵۰۰ نرسیں اور ۲۰۰ ہیلتھ وزیٹرز فارغ التحصیل ہو رہی ہیں۔

ملک میں ڈاکٹروں کی کمی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بہت سے ڈاکٹر ملک چلے گئے ہیں یہی وجہ ہے۔ اب حکومت نے ڈاکٹروں کے ملک سے باہر جانے پر پابندی لگا دی ہے۔ اب صرف حکومت پاکستان کے ساتھ کسی غیر ملکی حکومت کے معاہدے کی شکل میں پاکستانی ڈاکٹر ملک سے باہر جاسکتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی ملک جو ڈاکٹروں



سیاحت

کی سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن اور دشمنوں کی اہلاک کے کسٹوڈین کے درمیان پڑے گا ایک طویل المیعاد معاہدہ ہوا ہے تاکہ چار اے ایچ پی ہوٹلوں یعنی فلیش مین، فلیٹنر، ڈین اور سیسل کا انتظام سنبھالا جائے۔ وزیر اعظم کی ہدایات کے مطابق ان ہوٹلوں کی تجدید و تزئین اور انہیں اول درجے کی رہائش گاہیں بنانے کے لئے ایک اعلیٰ اسکیم پہلے ہی تیار کر لی گئی ہے۔ اس پروگرام کو بڑی فوقیت دی جا رہی ہے اور اس پر مرحلہ وار عملدرآمد کیا جائے گا۔

۵۔ پاکستان کی سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن کے موجودہ ریٹ ہاؤسوں اور جملہ تعمیرات کو بہتر شکل و صورت دی جا رہی ہے۔

۶۔ پاکستان کی سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن کا ایک معاون اور ذیلی ادارہ پاکستان ٹورڈ لیٹڈ قائم کیا گیا ہے تاکہ طیاروں اور ریلوں کے ذریعہ آنے اور جانے والے سیاحوں کے لئے انتظامات کرے، ان کی تلاش کا سامان کرے اور انہیں معلومات فراہم کرے۔ کراچی، لاہور، راولپنڈی، پشاور اور کوئٹہ میں دس ایرکنڈیشنڈ ٹویٹا کوسٹرز تقسیم کئے گئے ہیں جنہیں خصوصی مقاصد، نیر شہروں میں گھمانے پھرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

۷۔ پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن، پی۔ اے۔ اے کے محکمہ شہری پرواز اور دوسری متعلقہ ایجنسیوں کے درمیان بہتر اشتراک و تعاون کے بھی انتظام کئے گئے ہیں تاکہ میسر وسائل کو زیادہ سے زیادہ مصرف میں لایا جائے اور ترقیاتی پروگراموں پر موثر عملدرآمد کا آغاز کیا جائے۔ وزیر اعظم نے وزیر سیاحت کی صدارت میں ایک اعلیٰ اختیاراتی بورڈ قائم کیا ہے تاکہ وہ عملدرآمد کی نگرانی کرے اور ان ششٹیوں میں ہونے والی ترقی کی رپورٹ انہیں باقاعدگی سے دیتا رہے۔ اس بورڈ کے

پاکستان میں بھی، سیاحت کی اہمیت کو نہ صرف درمبادلہ کمانے کے ایک بڑے ذریعہ کے طور پر بلکہ ملک میں اتحاد و اتفاق اور بین الاقوامی مفاہمت کے اہلکار کی جھنڈت سے پوری طرح تسلیم کیا گیا ہے۔ سیاحت کو اب محض روپے کمانے کا کاروبار نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہ پاکستان کے اندر اور باہر کہیں زیادہ مفید کردار ادا کرتی ہے جس کی پیمائش قوری طور پر نہیں کی جاسکتی لیکن بہر حال یہ شاندار سرمایہ کاری ہے۔ اس انداز فکر کے مطابق حکومت اور سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن کو صورت حال کا احساس ہے اور ایسے منصوبوں میں جان ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے جو غیر مالک کے ساحوں اور ملکی سیاحت کو فروغ دینے کی ضرورت پوری کریں۔

۲۔ اس مقصد کے پیش نظر، حکومت نے مارچ ۱۹۷۵ء میں پاکستان کی سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن قائم کی جس کے مقاصد یہ ہیں،

- (۱) ملک کے اندر اور باہر سیاحت کی نشر و اشاعت میں حکومت کے ایجنٹ کے طور پر کام کرنا۔
- (۲) ایسے منصوبے قائم کرنا جن میں ہوٹل، موٹل، نقل و حمل اور تفریحی سہولتیں شامل ہوں، اور
- (۳) نجی اور سرکاری شعبوں میں سیاحت کو فروغ دینے میں ایک سرگرم رابطہ ایجنٹ کے طور پر کام کرنا۔

۳۔ حکومت اور پاکستان کی سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن نے سہولتوں میں اضافہ کرنے اور سیاحت کو فروغ دینے کے لئے سائنلڈ فضا قائم کرنے کی غرض سے پہلے ہی ایک شاندار پروگرام کا آغاز کیا ہے۔

۴۔ موجودہ سہولتوں کو مزید بہتر بنانے اور انہیں مزید ترقی دینے کی غرض سے جو زبردست کوششیں کی گئی ہیں ان کے نتیجے میں آخر کار پاکستان

مہربوں میں خزانہ، سیاحت اور دفاع کے سیکریٹری اور پی۔ آئی۔ اے۔ س کے کے چیئرمین شامل ہیں۔ پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن کے مینجنگ ڈائریکٹر کے سیکریٹری ہیں۔

۸۔ سیاحوں کے لئے موجودہ اطلاعی مراکز کی تنظیم تو کی گئی ہے تاکہ ان کی کارکردگی بہتر ہو اور وہ سیاحوں کے لئے واقعتاً موثر اطلاعی مراکز کی حیثیت سے کام کریں۔ سیاحوں کے لئے نئے اطلاعی مراکز اہم جگہوں بشمول داخلہ اور اخراج کے مقامات اور ہوائی اڈوں پر قائم کئے گئے ہیں اور برابر قائم کئے جاتے رہیں گے۔

۹۔ نارن میں حال ہی میں چارہٹس (جھوٹے) تعمیر کئے گئے ہیں تاکہ رہائش سہولتیں بہتر ہوں۔ اس علاقہ کی ترقی کے لئے اور میں جامع منصوبہ پر اس وقت غور ہو رہا ہے۔

۱۰۔ سیاحوں کیلئے چرکنڈی کے مقبروں پر بنیادی آسائشیں جیسا کہ گئی ہیں تاکہ انہیں بارشوں، دھوپ، تیز ہوا اور دہشت سے محفوظ رکھا جائے اور ان کے لئے پینے کے پانی اور غسلانے کی سہولتیں جیسا کہ جانیں۔

۱۱۔ آئندہ پانچ چھ سال کے لئے پاکستان میں سیاحت کی ترقی کے لئے نمبرل ماسٹر پلان کی تشکیل کی گئی ہے جسے اب قومی پیمائش منصوبہ میں ضم کر دیا جائے گا اور وہ اب سے سیاحت کی ترقی کے لئے تصوراتی ڈھانچے کا کام دے گا۔

۱۲۔ سفر کرنے کے لئے اوسط درجے کے پاکستانی سیاح کی حوصلہ افزائی کرنے کی غرض سے ایک اور دوستارے والے "عوامی ہوٹل" قائم کرنے کے لئے عملی امکانات کی رپورٹ تیار کر لی گئی ہے جس پر اس وقت غور ہو رہا ہے۔

۱۳۔ مزید برآں کراچی کے قریب کینگرھیل پر سیاحوں اور کھیلوں کی جگہ کراچی میں سینڈز پیٹ پر ایک ساحل ہوٹل، بڑی بڑی مشینوں کے کنارے کیمپ لگانے کی جگہیں بنانے، تفریح، کھیل اور ثقافت کی سہولتیں اور سر دسین بہترین بنانے کے منصوبوں پر کام ہو رہا ہے۔

۱۴۔ سیاحت کو اب ساری دنیا میں قومی یکتہ جہتی کو فروغ دینے اور کسی قوم کے طرز زندگی کی غیر ملکی میں عکاسی کرنے کا ایک اہم ذریعہ تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ یہ ترمبادلہ لگانے کا اہم ذریعہ ہے۔

ان کاموں کا آغاز کرنے اور بہترین نتائج حاصل کرنے کی غرض سے پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن بہت سے منصوبوں پر کام کر رہی ہے شمالی علاقوں یعنی وادی کالاں، سوات، گلگت۔ ہزارہ اور کاغان کو کھولنے اور انہیں ترقی دینے پر خصوصی زور دیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ سے ان علاقوں کے بہت سے لوگوں کو روزگار ملے گا اور عام طور پر معیشت کو ترقی دے دے میں مدد ملے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں عوام کی زندگی اور شخصیت اور یہاں کے قدرتی مناظر کی نوعیت کی بنیاد پر سیاحت کو ترقی دینے کی بڑی ضرورت صلاحیت ہے۔ پاکستان کا عظیم ثقافتی ورثہ تین بڑی تہذیبوں پر مشتمل ہے یعنی وادی سندھ، گندھارا اور اسلامی تہذیبیں اور اگر اس کے شمالی علاقوں کے مثال حسن کو عمدہ طریقے سے پیش کیا جائے تو اس سے سیاحت، ملک کی ایک بڑی صنعت بن سکتی ہے۔

۱۵۔ تاریخی یادگاروں کو مناسب طریقے سے پیش کرنے اور انہیں شہرت دینے کی غرض سے پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن، ٹیکسیلا جیسے منتخب مقامات کو بجلی سے روشن کر دینے کے منصوبوں پر غور کر رہی ہے۔ گلگت، ہنزہ اور پتھال میں پچاس کمروں کے ہوٹل اور نالٹار۔ گرم چٹھہ اور بریت میں پانچ تا دس کمروں کے چھوٹے ہوٹل (CHALET) قائم کرنے کے بھی منصوبے ہیں۔ ملام جبہ منصوبہ کو بھی زندہ کیا گیا ہے تاکہ اسے حکومت آسٹریا کی مدد سے سیاحوں اور کھیلوں کے لئے اول درجہ کے کام بنایا جائے ہو۔

۱۶۔ موجودہ ریسٹ ہاؤسوں کو بہتر بنایا جا رہا ہے اور بالائی وادی سوات میں ایک جامع اور ہر موسم کے لئے موزوں سیاحتی مرکز قائم کرنے کے منصوبے بھی زیر غور ہیں۔

۱۷۔ موجودہ حکومت کی پالیسی کا اظہار اعداد کی زبان میں یوں ہوتا ہے کہ ۷۵-۱۹۷۴ء کے بجٹ میں سیاحت کے لئے ۱۲۰ کروڑ روپے مختص کئے گئے تھے جبکہ ۷۶-۱۹۷۵ء کے سالانہ ترقیاتی پروگرام میں ۳۰ کروڑ روپے زیادہ مختص کئے گئے ہیں جس میں نشر و اشاعت اور کھیلوں اور ثقافت کی ترقی، سیاحتی مقامات کی ترقی، ہوٹل، ریسٹ ہاؤس، سیاحتی مرکز اور دوسرے متعلقہ شعبے شامل ہیں۔

۱۸۔ پچھلے ایک دو سال کے دوران، پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن نے پاکستان میں دلچسپی کے بہت سے مقامات پر مختلف زبانوں میں انتہائی مفید اور مستند حقائق پر مبنی لٹریچر اور فولڈر شائع کئے ہیں جس میں واقعات

۲۰۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن میں اور انڈین ملک اور برصغیر میں اپنے عملے کو باقاعدہ تربیت دینے اور اپنے ٹورسٹ افئرس کو سیاحوں کیلئے گائڈ رہنمائے کی تربیت دینے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

۲۱۔ پاکستان کے آئین میں سیاحت کو موثر بنانے کیلئے سیاحت کو وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان ایک مشترکہ مدنیایا گیا ہے اس پر عملدرآمد کی خاطر سیاحوں کے لئے صوبائی مشاورتی کمیٹیوں کو سرگرم بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے تاکہ وہ صوبوں میں اپنا بنیادی ڈھانچہ اور دوسری سہولتیں اور سروسزیں بہتر بنائیں۔ اسی طرح (۱) سیاحوں کی ایجنسیوں (۲) ہوٹلوں اور ریسٹورانوں اور (۳) سیاحوں کے گائڈز کو باقاعدہ بناتے کیلئے ایک قانون حکومت کے زیر غور ہے۔

۲۲۔ ہوٹل والوں، سفری ایجنٹوں اور دوسروں سے باقاعدہ ملاقاتیں، تبادلہ خیالات اور مشورے ہمیشہ کئے گئے تاکہ ان کے مسائل پر غور کیا جائے، ان کی ضرورتوں کا اندازہ لگایا جائے اور انہیں متعلقہ درانے یا نجی اور سرکاری شعبوں کے ذریعہ جلد حل کرنے میں مدد دی جائے۔

۲۳۔ اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ دنیا کے بڑھتے پھیلنے والے سیاحتی کاروبار میں پاکستان کو مناسب حصہ حاصل ہو سکے اس مقصد کے ضمن میں پاکستان میں سیاحوں کے لئے کوششیں پیدا کرنے اور انہیں پاکستانی تہذیب و ثقافت سے روشناس کرانے کے اقدامات کئے گئے ہیں اور ان کوششوں کے نتیجے میں سیاحوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافے کے آثار پیدا ہوئے اور ۱۹۷۳ میں انکی تعداد میں ۸۶۸ فیصد کا اضافہ ہوا اور (۱) کی تعداد (۱۹۷۳) میں ۵۳،۱۳۲ تھی جبکہ ۱۹۷۴ میں انکی ۸۶،۸۶۸ تھی، ۱۹۷۴ میں سیاحت کی تجارت میں اضافہ کی وجہ سے ۲،۰۰،۴۹،۰۰۰ امریکی ڈالر کا زرمبادلہ حاصل ہوا اس طرح ۱۹۷۳ کی آمدنی کے مقابلہ میں ۱۰۰ فیصد اضافہ ہوا، جو ۱۹۷۵ء میں ۳،۰۰،۱۳،۴۹،۰۰۰ امریکی ڈالر کی آمدنی ہوئی جبکہ ۱۹۷۴ میں ۱۱،۳۴،۹۰،۰۰۰ امریکی ڈالر کی آمدنی ہوئی تھی جس سے ۱۹۷۳ فیصد کا اضافہ ظاہر ہوتا ہے۔ سیاحتی عملے کو اعلیٰ درجے کی فنی تربیت فراہم کرنے کے لئے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن اور دیگر ملکی مراکز میں تربیت دلانے کے اقدام کئے جا رہے ہیں۔

اطلاعات کے علاوہ ملک کے طرز زندگی اور ثقافت کی رنگارنگ تصویریں دی گئی ہیں۔ ان میں ٹیکسیا، ٹھٹھہ، کانغان، ہوٹل گائڈ راولپنڈی/اسلام آباد گلگت/ہنزہ۔ اسکردو۔ ہزارہ۔ سوات۔ حیدرآباد۔ چترال اور پاکستان کا گائڈ بک۔ گراچی۔ جواتات۔ ہالیوڈ جھیل۔ پاکستان ٹورزم ایڈیٹورز ہمنائی میں شہروں کے دورے شامل ہیں۔ دوسرے بہت سے فولڈروں پر کام ہو رہا ہے اور مستقبل قریب میں منظر عام پر آجائیں گے انتہائی چیرہ بامقصد نشر و اشاعت اور پاکستان کی جانب زیادہ سے زیادہ سیاحوں کو متوجہ کرنے کے لئے سرگرمیاں تیز کرنے کی غرض سے دوسرے ذرائع استعمال کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، جن میں ٹیلی ویژن۔ فلمیں۔ اخبارات۔ رسائل و جرائد شامل ہیں۔ ہم کھیلوں۔ ثقافتی تقریبات، عوامی جشنوں، میلوں اور گاہوں پر خصوصی تقریبات اور ایسی دوسری بڑی سرگرمیوں میں نیز سیاح بھیجنے والے بڑے غیر مالک میں ہونے والی اہم کانفرنسوں اور تماشوں میں موثر طریقے پر حصہ بھی لیتے رہے ہیں۔ ہم بہت اہم شخصیتوں نمایاں مصنفوں، صحافیوں اور فوٹو گرافروں کی بھی میزبانی کرتے رہے ہیں جو وقتاً فوقتاً پاکستان آتے رہتے ہیں۔

۱۸۔ پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن، نشر و اشاعت کے ان مشترکہ منصوبوں میں جان ڈال رہا ہے جن کا آغاز اس لئے کرنا اور اس لئے ڈائی (جزبی ایشیا) کا سال سیاحت کے زیر اہتمام کیا جا رہا ہے۔ پاکستان سیاحتی ترقیاتی کارپوریشن نے اس لئے آر ٹی سی کے زیر نگرانی، جزبی ایشیا کا سال سیاحت بنانے کے لئے ڈیفنٹ اور ٹورکیو میں شام کو منعقد ہونے والی سیاحتی فروغ کی مشترکہ محفلوں میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

۱۹۔ دنیا کے سیاح بھیجنے والے بڑے مالک سے سیاحوں کی آمد بڑھانے کی غرض سے ہم نے ایک فرانسیسی فرم (ایس اے سی اے) سے معاہدہ کیا ہے تاکہ فرانس اور یورپ میں مشترکہ منڈی کے دیگر مالک سے پاکستان میں سیاحوں کی آمد تیز تر ہو جائے۔ دنیا کے سیاح بھیجنے والے بڑے مالک یعنی لندن، نیویارک، فرینکفرٹ اور ٹورکیو میں سیاحوں کے دفاتر قائم کرنے کے منصوبے بھی حکومت نے بنائے ہیں۔

خیاباں خیاباں — ارم

ساہیوال کے قریب ہڑپا کے آثار قدیمہ



سندھ میں یھودیہ کے مقام پر حالیہ
کھدائی میں برآمد ہونے والے آثار



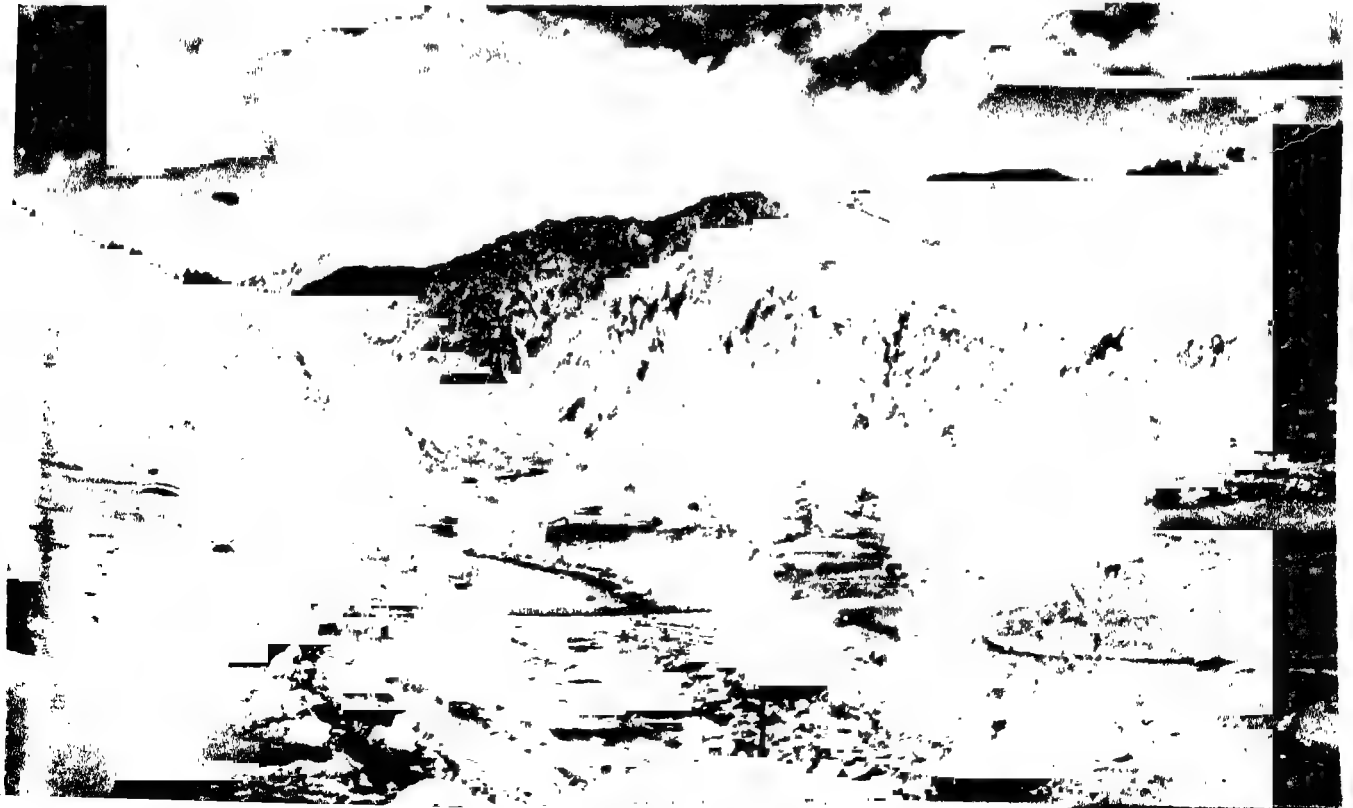
موجودہ دارو کے مالگیر شہر کے حامل آثار



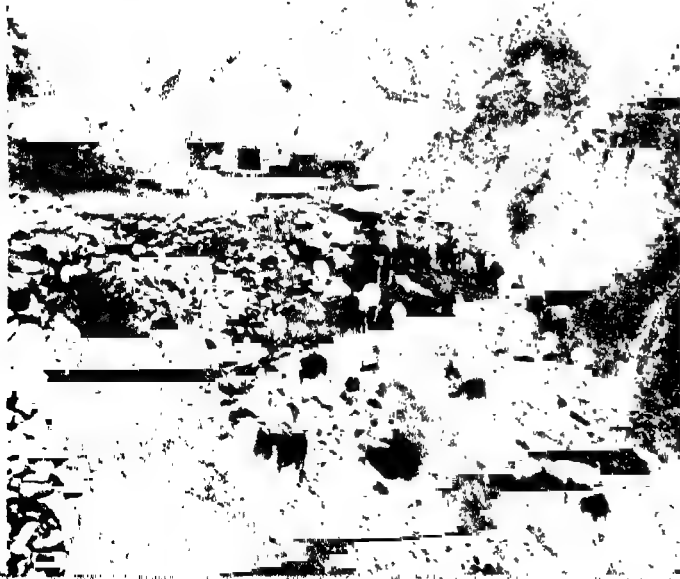


سوات کا خوبصورت مقام کالام جرسیا حوں کے لئے بڑی دلکشی رکھتا ہے

داوی سوات میں یل کھاتی ہوئی جوئے اب

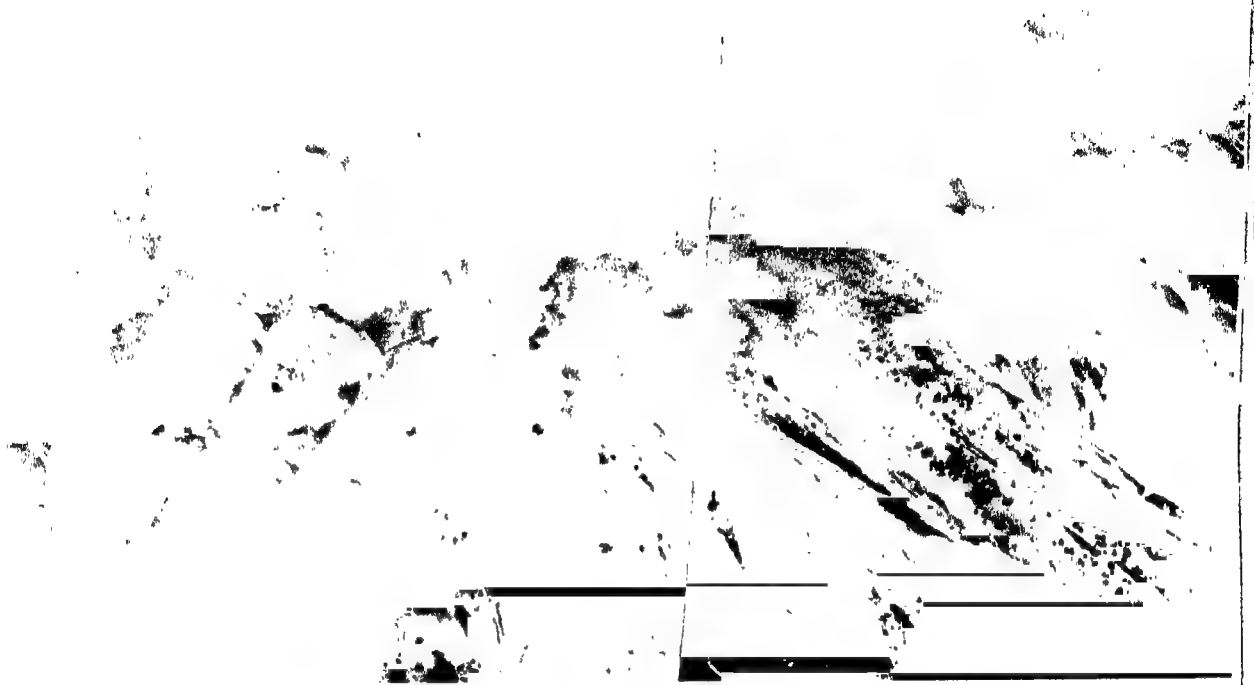


گلگت کا ایک منظر



کاغان میں حسین سیٹ الملوک مجید

راہد کاغان میں بیڑوں کا ایک گھر



ناگاپربت کا ایک حسین منظر

چترال کے کلاش قبیلے کی عورتیں رقص کے لئے تیار ہیں



پاکستان میں شہری پرواز

دسمبر ۱۹۷۵ء کے واقعہ کے بعد پاکستان میں شہری پرواز کی تنظیم اس نئی کسوٹی پر کرنی پڑی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اپنی سروس نہ رکھی جائے بلکہ نئے پاکستان کے اندر ملکی اور بین الاقوامی راہوں کی تعمیر کی جائے۔ عوامی حکومت نے قومی مسافر بردار طیاروں کے لئے بین الاقوامی راہیں تلاش کرنے کے امکانات فراہم کئے اور ملک کے اندر پرواز کی سرگرمیوں کو بہتر بنایا۔ ملک کے بہتر معاشرتی و اقتصادی حالات اور فی کس آمدنی بڑھانے کی فکر و کوشش کے ساتھ ہی صرفہ کی منصوبہ بندی پر حکومت کے زور دینے نے تریفک بڑھانے میں ایک بڑا اور فیصلہ کن کردار ادا کیا جس کا مقصد فضائی نقل و حمل کا نسبتاً چھوٹا لیکن بھرپور نظام قائم کرنا تھا۔

حکومت نے پسماندہ علاقوں کے سدھار اور بہتری پر جیسے سابقہ حکومتوں نے نظر انداز کیا تھا، خصوصی توجہ دی۔ اس سلسلہ میں بعض نمایاں کام یہ ہیں۔ صوبہ بلوچستان میں گوادر، پسنی اور پنج گور کے مقامات پر اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں چترال کے مقام پر موجودہ ہوائی اڈوں اور ہوائی میدانوں کی ترقی۔ غیر سمتی ہیکلنوں کی تنصیب۔ بہت اونچی فریکوئنسی کی ریڈیو ٹیلیفونی کا قیام۔ سندھ میں موناخو ڈرو کے مقام پر ہوائی اڈے کے ٹرمینل

کی عمارت کی تعمیر اور رن وے کی دوبارہ پختگی۔ سیدو شریف (چک دہ) میں ایک ہوائی میدان بنانے کا منصوبہ پر بھی کام ہو رہا ہے۔ کونٹہ، پشاور اور لائلپور کے ہوائی اڈوں کی جو بہتری کی جا رہی ہے اس سے عوامی حکومت کے اس دلی خواہش کا مزید اظہار ہوتا ہے کہ وہ ان علاقوں کے باشندوں کو نقل و حمل کا تیز تر وسیلہ مہیا کرنا چاہتی ہے۔ لاہور، اسلام آباد اور کراچی کے ہوائی اڈوں کے حسن میں اضافہ کرنے اور ان کی توسیع کرنے کے لئے جو کام ہو رہا ہے وہ نہ صرف بہتر جمالیاتی احساس اور دور اندیشی کی شہادت مہیا کرتا ہے بلکہ اس کی وجہ سے ٹریفک کی کشش اور گنجائش میں اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۷۵ء سے پرواز کی سہولتوں میں جو بہتری ہوئی ہے اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔ انسٹرومنٹ لینڈنگ سسٹم کی تنصیب اور کام کا آغاز۔ اسلام آباد میں ٹرمینل کی سہولتوں میں توسیع۔ وطن میں دور کے پیغامات موصول کرنے والے اسٹیشن کی تعمیر تاکہ لاہور کے بین الاقوامی اڈے کو مداخلت سے آزاد ریڈیائی پیغامات موصول ہوں اور کراچی سے پکنگ تک ریڈیو ٹیلیفونی رابطے کا قیام۔

اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر ایک سیکنڈے بھی کم کے اوقات اور بہت ہی کم وقت میں بڑی ہی اہم شخصیتوں کے لئے

اصل مطلوبہ آمدنی حاصل کر لی ہے جو ۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۰ء کے مجوزہ منصوبے کے ۵۰ کروڑ روپے کے ہدف کے برابر ہے۔ ۱۹۸۰ء کے لئے مسافروں کی مجموعی ٹریفک کا جو منصوبہ تیار کیا گیا تھا وہ ابتدائی تخمینوں سے پانچ سال پہلے ہی حاصل کر لیا گیا ہے جس کا اصل سبب یہ ہے کہ پاکستان میں آنے والے اور پاکستان سے باہر جانے والے مسافروں کی مارکیٹ میں پی۔ آئی۔ اے کا حقد ۱۹۷۳ء میں ۲۲ فیصد سے بڑھ کر ۱۹۷۵ء میں ۵۱ فیصد ہو گیا۔

انتظامی اصلاحات کا اثر

انتظامی اصلاحات نے فنی اور غیر فنی دونوں قسم کے عملے کی تربیت کو اولین ترجیح دی اور یہ بات تسلیم کی کہ افراد کے لئے اپنے متعلقہ شعبوں میں کارکردگی کا مسلسل اعلیٰ معیار یقینی بنانے کے لئے تربیت سب سے اہم اور بڑا ذریعہ ہے۔ جدید پرواز کی خواہشوں کا یہ تقاضا ہے کہ متعلقہ شعبوں میں اعلیٰ ترین پیشہ ورانہ اور خصوصی مہارت کی تربیت دی جائے جس میں ہم اب تک بہت پیچھے ہیں۔ اس صورتحال کو محسوس کرتے ہوئے ہماری حکومت نے ۸۲ء میں روپے کے کل تخمینہ شدہ خرچ پر حیدرآباد سول ایوی ایشن انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی مستعدی کے ساتھ منظوری دے دی۔ اس خرچ میں ۵۶ء ۹۰ ملین روپے کا زرمبادلہ شامل ہے۔ توقع ہے کہ یہ انسٹی ٹیوٹ، فضائی ٹرنیکل کی سروسوں، مواصلاتی کارروائیوں، مواصلاتی انجینئرنگ، ہوائی اڈوں کے انتظام، ہجاؤ اور آگ بجھانے اور نظم و نسق کے شعبوں میں بہن الاوقا معیار کے تربیت یافتہ افراد کا مہیا کرے گا۔ پاکستانی شہریوں کو تربیت دینے کے علاوہ، تربیتی سہولتیں ہماری حکومت کی پالیسی کے مطابق، دوست ممالک کو بھی فراہم کی جائیں گی۔ عوامی حکومت نے پرواز کی سرگرمیوں کو فروغ دینے اور ملک کے مختلف فلائنگ کلبوں میں پائلٹوں کو تربیت دینے کے لئے امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ امداد و اعانت فراہم کی۔ تربیت یافتہ پائلٹوں کے مسلسل فقدان پر قابو پانے کے لئے روان فلائنگ اسکیموں میں مزید توسیع کی گئی۔

متعدد پردازوں کا ٹھیک ٹھیک اور عمدہ انتظام، شاندار کارنامہ تھا جس کا مقابلہ پرداز کی دنیا میں ایسے کسی موقع سے باآسانی کیا جاسکتا ہے۔

فضائی نقل و حمل پر بہترین الاقوامی تعلقات کے اثرات

صنعتی پیداوار بڑھا کر ہرآمدات میں انتہائی حد تک اضافہ کرنے کی غرض سے حکومت کی پالیسی اور توازن ادائیگی کی بہتر پوزیشن نے ہمارے مال بردار قومی جہازوں کے لئے بحالی کی راہ ہموار کی جنہوں نے وقت ضائع کئے بغیر بال برداری کی برصغی ہوئی ذمہ داریوں کو حسن و خوبی سے سرانجام دیا اور اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی فاضل گنجائش کو کام صرف پیدا کیا۔ پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کے لئے بین الاقوامی راہوں کی تلاش میں اس بات کی تمام تر کوششیں کی گئیں کہ شہری پرواز کے بین الاقوامی ادارہ کے کونفشنز کی روشنی میں معاہدہ کرنے والی دوسری مملکتوں سے فضائی سروس کے دوطرفہ معاہدے کئے جائیں۔ پاکستان اب تک کل ۵۷ ملکوں سے ایسے معاہدے کرنے میں کامیاب ہوا ہے جن میں سے ۲۲ معاہدے موجودہ حکومت کے چار سال کی مختصر مدت میں کئے گئے جن کے مفید نتائج برآمد ہونے اور ہمارے قومی مال بردار جہازوں کو بڑا فائدہ ہوا۔ یہاں تک کہ پی آئی اے کا پہلا فضائی ادارہ بن گیا ہے جس کے طیارے مغرب کی مملکتوں تک جاتے ہیں اور لیبیا (نیز مستقبل قریب میں اطریشیا) وہ زینیہ ہے جہاں سے اس کی پروازیں شمالی افریقہ سے بحر اوقیانوس کے پار ریاست ہائے متحدہ امریکہ تک جائیں گی۔ پی۔ آئی۔ اے کی بین الاقوامی کارروائیوں کا تناسب جو مشرقی پاکستان کی سروسوں کے معطل ہونے سے پہلے ۳۰.۴ فیصد اور ۱۹۷۱ء میں ۶۲ فیصد تھا، ۱۹۷۳ء میں بڑھ کر ۸۶ فیصد ہو گیا۔ اب پی۔ آئی۔ اے کے طیاروں میں ہڈی سیٹیں لگی ہیں اور وہ بڑھتی ہوئی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے اپنے طیاروں میں بوننگ ۷۷ء شامل کر کے اپنی شاندار کامیابیوں میں ایک اور اضافہ کرنے کے امکانات پر غور کر رہی ہے۔ پی۔ آئی۔ اے نے ۱۹۷۳ء میں ۴۹ کروڑ روپیے کی

آئندہ رجحان

حکومت پاکستان، اسلام آباد ایر پورٹ کو مکمل بین الاقوامی درجہ دینے اور اسے غیر ملکی فضائی کمپنیوں کے لئے کھولنے پر سختی سے غور کر رہی ہے۔ یہ ہوائی اڈہ شمالی راہ کے ذریعہ چین جانے کے لئے چھانک کا کام دے گا کیونکہ یہ شمالی راہ، ٹرانس سائبیرین روٹ کے بعد جو چند منتخب فضائی اداروں کو میسر ہے، فاصلہ کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر ہے۔ دنیا کی بہت سی فضائی کمپنیوں نے عوامی جمہوریہ چین تک اپنی سروسیں چلانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ امکان ہے کہ یہ راہ مستقبل قریب میں بہت مقبول ہو جائے گی اور اسلام آباد ایر پورٹ اپنے اہم جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے یقیناً وسعت پائے گا۔ پھر اس کی وجہ سے پاکستان میں پرواز کی مرگرمیوں میں مزید اضافہ ہوگا۔ مزید برآں، حکومت کی بڑی خواہش ہے کہ دیہی آبادی، جو اس کی معیشت اور ثقافت کا مغز ہے، فضائی دور کے فوائد سے مستفیض ہو۔ اس خواہش کی تکمیل کی غرض سے فضائی نقل و حمل کی ایک نئی پالیسی تیار ہو رہی ہے۔ تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں اور افراط زر کے باوجود، حکومت اس امکان کا جائزہ لے رہی ہے کہ ملک کے دور افتادہ گوشوں کے باشندوں کو فضائی ٹیکسی چارٹر سروس مہیا کرے۔ ایسی پبلک فضائی نقل و حمل کا اہتمام بہت سستا اور عوام کے ایک بڑے طبقہ کی رسائی کے اندر ہوگا۔ اس طرح انہیں ملک کے ترقی یافتہ علاقوں سے قریب تر تعلق پیدا کرنے اور اقتصادی سرگرمیاں بڑھانے میں مدد دینے کا بھی موقع ملے گا۔ دور دراز علاقوں تک آسانی سے پہنچنے کی وجہ سے نہ صرف ان کا معیار زندگی بڑھانے میں مدد ملے گی بلکہ معیشت کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔

آج پرواز کی دنیا کو جو سب سے بڑا چیلنج درپیش ہے وہ طیاروں کی کارروائیوں میں غیر قانونی مداخلت کی حرکت یا خطرے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اسے بین الاقوامی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے شہری

پرواز کی بین الاقوامی تنظیم نے اس موضوع کا پہلے ہی گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کی روک تھام کے لئے ایک قرارداد منظور کی ہے۔ معیارات اور سفارش کئے گئے طریقوں کو مذکورہ تنظیم کے کنونشن کے منسلک، اس میں شائع کیا گیا ہے جسے حکومت پاکستان نے پوری طرح قبول کیا ہے۔ منسلک، اس میں مندرجہ دفعات پر مناسب عملدرآمد کو یقینی بنانے کی غرض سے ایر پورٹ سیکوریٹی فورس کی تشکیل اور قیام کے لئے ایک آرڈیننس حال ہی میں جاری کیا گیا ہے۔ محکمہ شہری پرواز اس نئے آرڈیننس کو جہاں تک بلد ممکن ہو لفظی و معنوی طور پر نافذ کرنے کی زبردست کوششیں کر رہا ہے۔ ایر پورٹ سیکوریٹی فورس ملک میں شہری فضائی نقل و حمل کو محفوظ اور مداخلت سے آزاد بنانے میں بڑا معاون ثابت ہوگا۔

تیل کے بحران، افراط زر کے رجحانات اور کرایہ میں ناگزیر اضافوں نے بلاشبہ دنیا میں فضائی ٹریفک کی معمول کے مطابق ترقی میں رکاوٹ ڈالی ہے۔ پچھلے دو سال کے اعداد و شمار اس بات کا ثبوت ہیں کہ بہت سی فضائی کمپنیوں کی آمدنی میں کمی ہو رہی ہے، اور وہ اپنی پروازوں میں کمی کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کا اثر پی آئی اے پر بھی پڑا ہے کیونکہ اس کی کارگزاریوں پر اخراجات میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے اس کے منافع کا فیصد متاثر ہوا ہے۔ ایسی صورت حال کے باوجود پی۔ آئی۔ اے اپنے مستقبل سے پُر امید ہے۔ پاکستان میں تیل کی قیمت میں اضافہ کا اثر ان غیر ملکی کمپنیوں کی کارگزاری پر پڑا ہے جن کے طیارے پاکستان آنے ہیں یا یہاں سے گزرتے ہیں جس کا اصل سبب یہ ہے کہ فضائی کمپنیوں نے منصوبہ بنایا ہے کہ ان کے طیارے ایسے ہوائی اڈوں سے گزریں گے جہاں تیل نسبتاً سستا ہے۔ حکومت اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے اور پروازوں کی صنعت مستقبل کی جانب پُر امید نظروں سے دیکھ رہی ہے کیونکہ ہمارا مقولہ ہے کہ ”کامیابی حاصل کرنا ناممکن ہے لیکن یہ کہنے کا موقع زور بجانے کہ ہم نے کوشش نہیں کی۔“

پاکستان کی اقلیتیں

قیام پاکستان کے وقت قائد اعظم نے ان الفاظ میں اقلیتوں کو یقین دہائی کر لی تھی :-

”آپ آزاد ہیں۔ آپ کو اپنی عبادت گاہوں میں جانے کی پوری آزادی ہے۔۔۔۔۔ ہم اس بنیادی اصول پر نئی مملکت کا آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب شہری ہیں اور ایک ہی مملکت کے شہری ہیں۔“

قائد اعظم کی یہ یقین دہانی اقلیتوں کے بارے میں حکومت کی پالیسی کا سنگ بنیاد ہے۔ اس بات کی ضمانت دینا کہ اقلیتوں کو اپنے حقوق کا تحفظ حاصل ہے اور انہیں اپنی ترقی کے تمام مواقع میسر ہیں حکومت کا اخلاقی، مذہبی، سیاسی اور آئینی فریضہ ہے۔

پاکستان میں غیر مسلموں کی مجموعی تعداد پوری آبادی کی ۱۲ فیصد ہے۔ لفظ اقلیت کی حقیقت نام کے سوا کچھ نہیں ہے، اس لئے کہ اقلیتوں کو ٹیکنیکل اعتبار سے کوئی جدا گانہ حیثیت نہیں دی گئی۔ درحقیقت ان کے ساتھ معاشی، معاشرتی، مذہبی یا سیاسی معاملے میں کبھی کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا۔ البتہ ان کے جداگانہ وجود سے حکومت کو اس مختصر گروپ کے مخصوص مسائل پر خاص طور سے توجہ دینے میں مدد ملی ہے۔

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے زیر قیادت عوامی حکومت نے اقلیتوں کے تحفظ اور بہبود کے لئے باقاعدہ ادارے قائم کئے ہیں۔ ان اداروں میں نظم و نسق، نمائندگی، مالی امداد اور فلاح و بہبود کے انتظامات شامل ہیں تاکہ اس گروپ کو آئین میں دی ہوئی ضمانتوں کو عملی شکل دی جا سکے اور اس کی فلاح و بہبود کا بندوبست کیا جا سکے۔ عام طور پر ایک بڑے معاشرے میں چھوٹا سا گروپ بے حوصلگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کمزوری کا بھی ازالہ کیا جا رہا ہے تاکہ اقلیتیں پوری قوم کی معاشرتی اور معاشی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے سکیں۔

عوامی حکومت نے اقلیتوں کی شکایتوں کے زالے اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے سب سے پہلے جو اقدامات کئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ دسمبر ۱۹۷۷ء میں اقلیتی امور کی ایک وزارت قائم کی۔ اس انتظام کو مستحکم کرنے کے لئے نچلی سطح پر بھی مناسب ادارے قائم کئے گئے۔

ہر ضلع میں ایڈیشنل ڈپٹی کمشنروں کو اقلیتی امور کے افسر کی حیثیت دے دی گئی ہے اور ان پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ ان کے سامنے اقلیتی فریقے کے کسی فرد یا گروپ کی طرف سے جو شکایت

پیش کیا جائے اس کے انزال کی طرف فوری توجہ دی جائے۔ ڈپٹی کمشنروں اور ان سے نیچے درج کے افسروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اقلیتی فرقوں کے سربراہان اور وہ لوگوں سے وقتاً فوقتاً ملتے رہیں۔ تاکہ ان کی مشکلات معلوم ہوتی رہیں۔ پھر ان مشکلات کو دور کرنے کے لئے مقامی اور صوبائی سطح پر کوشش کی جائے۔

اس طریق کار کی بدولت اقلیتی فرقوں کے لوگوں اور مقامی انتظامیہ میں براہ راست رابطہ پیدا ہو گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کچھ مسائل اقلیتوں کی وزارت کو بھیجنے کی بجائے مقامی طور پر حل کر دیئے جانے میں جس سے دقت بھی بچتا ہے اور اخراجات بھی۔ مقامی سطح پر ملاقاتوں کا مسئلہ شروع کرنے سے پہلے اپریل ۱۹۷۷ء میں راولپنڈی میں قومی سطح پر اقلیتوں کی کانفرنس بلائی گئی۔ کانفرنس کا اہتمام اقلیتی امور کی وزارت نے کیا تھا اور وزیر اعظم پاکستان نے اس کا افتتاح کیا تھا۔

وزیر اعظم نے اپنی افتتاحی تقریر میں اقلیتوں کو یقین دلایا تھا کہ حکومت ان کے جائز حقوق اور مفادات کے تحفظ کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ وزیر اعظم نے یہ بھی بتایا تھا کہ پاکستان کے آئین میں اقلیتوں کو کون کون سے تحفظات دیئے گئے ہیں۔

اس کانفرنس سے جس میں مختلف اقلیتی فرقوں کے تقریباً ۲۰۰ نمائندے شریک ہوئے ان شعبوں کی نمائندگی میں بڑی مدد ملی جن میں اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے حکومت کی طرف سے اقدامات درکار ہوں گے۔

آئین میں اقلیتوں کو خاص ضمانتیں دی گئی ہیں، آئین کی متعلقہ دفعات یہ ہیں :-

دفعہ ۲۰

قانون امن و امان اور اخلاقی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے :-

(۱) ہر شہری کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے مذہب کی پابندی کرے، اس مذہب کے بتائے ہوئے طور طریقے اختیار کرے

اور اس مذہب کی تبلیغ کرے، اور

(ب) ہر مذہب اور اس کے ہر فرقہ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے مذہبی ادارے قائم کرے، ان کی دیکھ بھال کرے اور ان کا بندوبست کرے۔

دفعہ ۲۱

کسی شخص کو ایسا خاص ٹیکس ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جس کی رقم اس شخص کے اپنے مذہب کے سوا کسی اور مذہب کو برقرار رکھنے یا اس کی تبلیغ پر خرچ کی جاتی ہو۔

دفعہ ۲۲

(۱) کسی تعلیم گاہ میں تعلیم پانے والے کے لئے یہ ضروری نہیں سمجھا جائے گا کہ وہ اپنے مذہب کے سوا کسی اور مذہب کی تعلیم حاصل کرے یا کسی اور مذہب کی عبادت یا رسوم میں شریک ہو۔

(۲) مذہبی اداروں کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دینے یا انہیں رعایت دینے کے معاملے میں کسی فرقے سے امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔

(۳) قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے،

(۱) کسی فرقے کو مکمل طور پر اپنے ہی قائم کئے ہوئے تعلیمی اداروں میں اس فرقے کے افراد کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے سے نہیں روکا جائے گا۔

(ب) کسی ایسے تعلیمی ادارے میں جسے سرکاری خزانے سے مالی امداد ملتی ہو کسی شہری کو تسلیم، مذہب، ذات یا سبائے پیدائش کی بنیاد پر داخلے سے نہیں روکا جائے گا۔

(۴) اس دفعہ کے نفس مضمون کی بنیاد پر کسی پبلک انتھارٹی کیلئے یہ ممانعت نہیں ہوگی کہ وہ معاشرتی یا تعلیمی لحاظ سے پس ماند کسی

گروپ کی ترقی کے لئے ضروری کارروائی کرے۔

دفعہ ۱۰۶

(۳) اس دفعہ کی شق ۱ میں بلوچستان، پنجاب، صوبہ سرحد اور سندھ کی صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں کی جو تعداد بتائی گئی ہے اس کے علاوہ ان اسمبلیوں میں کچھ فالتو نشستیں ہوں گی جن کی تعداد درج ذیل ہے۔ یہ فالتو نشستیں عیسائیوں، ہندوؤں، یہودیوں، پارسیوں، شڈول کاسٹ قادیانی اور لاہوری فرقے کے لئے جو احمدی کہلاتے ہیں مخصوص ہوں گے۔

۱	بلوچستان
۱	صوبہ سرحد
۳	پنجاب
۲	سندھ

حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ قومی اسمبلی کی ۶ نشستیں اقلیتوں کے لئے مخصوص کر دی جائیں اور پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں ان کے لئے مخصوص نشستوں کی تعداد ۳ سے بڑھا کر ۵ کر دی جائے۔ اس کے لئے قومی اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں بل پیش ہونے والا ہے۔ آئین میں ایک اور ترمیم کی جارہی ہے جس سے بہانیوں اور کچھ دوسرے فرقوں کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتوں کے لئے مخصوص کی ہوئی نشستوں پر نمائندگی کا حق مل جائے گا۔

قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتوں کے لئے نشستیں مخصوص کرنے کے علاوہ حکومت نے عوامی لوکل کونسلوں میں بھی ان کی نمائندگی کیلئے مناسب اقدامات کئے ہیں۔ کسی بھی لوکل کونسل میں اقلیتی فرقے کے لوگوں کی تعداد دیکھتے ہوئے ان کے لئے فالتو نشستیں مخصوص کی جائیں گی یہ نشستیں اقلیتی فرقے کے ایسے امیدواروں سے پُر کی جائیں گی جو لوکل کونسلوں کے عام انتخابات میں کامیاب نہ ہو سکیں گے لیکن اپنے فرقے کے امیدواروں میں سے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کریں گے انتخابی حلقہ بندی میں یہ خیال رکھا جائے گا کہ کسی ایک حلقہ میں اقلیتی

دفعہ ۲۵

قانون کی نظر میں تمام شہری مساوی ہیں اور تمام شہری ملوی قانونی تحفظ کے حق دار ہیں۔

دفعہ ۲۶

ایسے مقامات کے سوا جنہیں مذہبی حیثیت حاصل ہے باقی تمام پبلک مقامات اور تفریح گاہوں میں داخلے کے معاملے میں نسل، مذہب، ذات، جنس، سکونت یا جائے پیدائش کی بنیاد پر امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔

دفعہ ۲۷

کوئی شہری جو دیگر اعتبار سے سرکاری ملازمت میں لئے جانے کا مستحق ہوگا محض نسل، مذہب، ذات، جنس، سکونت یا جائے پیدائش کی بنیاد پر اسے ملازمت میں لئے جانے سے نہیں رکا جائے گا۔

دفعہ ۲۸

دفعہ نمبر ۲۵ کے دائرے میں رہتے ہوئے شہریوں کے کسی گروپ کی جداگانہ زبان، رسم الخط یا ثقافت ہونے کو اس گروپ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اس زبان رسم الخط اور ثقافت کے تحفظ اور ترقی کی کوشش کرے اور اس مقصد کے لئے ادارے قائم کرے۔

دفعہ ۳۶

حکومت اقلیتوں کے تمام جائز حقوق اور مفادات کا تحفظ کرے گی۔ ان حقوق میں وفاقی اور صوبائی ملازمتوں میں اقلیتوں کی مناسب نمائندگی بھی شامل ہے۔

روپیہ کی گرانٹ دی ہے۔

حکومت نے کراچی میں بودھوں کی عبادت گاہ اور ثقافتی مرکز کی تعمیر کے لئے ایک گیمٹی مقرر کی ہے جس کے پیڑمین اقلیتی امور و سیاست کے وزیر مملکت ہیں۔ پاکستان میں بودھوں کا عظیم ثقافتی ورثہ ہے۔ لیکن بودھوں کی اپنی کوئی عبادت گاہ نہیں ہے۔ بودھوں کی مجوزہ عبادت گاہ ان کی روایتی عبادت گاہوں کے نمونے کی ہوگی اس لئے جاپان کی حکومت سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ اس عبادت گاہ کا عمارتی ڈیزائن تیار کرنے کے لئے کسی معروف جاپانی ماہر تعمیرات کی خدمات کو مہیا منصوبے کے تحت پاکستان کو فراہم کرے۔ عمارتی ڈیزائن ملتے ہی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا۔ پوری عمارت پر ۲۵ لاکھ روپیہ لاگت آئے گی۔

اس بات کا احساس کرتے ہوئے کہ کچھ ایسے اقلیتی فرقے جو تعلیم کے میدان میں پسماندہ ہیں ان کے افراد محض قابلیت کی بنیاد پر تعلیمی وظائف حاصل نہیں کر سکتے ان کے لئے وظیفوں کا ایک بندوبست کیا گیا ہے۔ ایک ہزار صدارتی وظائف کی اسکیم کے تحت پچھلے تعلیمی سال میں اقلیتی فرقوں کے طلباء کو ۶۸ وظائف دیئے گئے۔ صوبائی حکومتوں نے بھی اقلیتی فرقوں کے طلباء کو وظائف دینے کا علیحدہ بندوبست کیا ہے۔

مختلف پیشہ ورانہ کالجوں میں اقلیتوں کے لئے مستند نشستیں رکھی گئی ہیں۔ ان اداروں میں جہاں اقلیتوں کے لئے اب نشستیں مخصوص ہیں اقلیتی فرقوں کے طلباء قابلیت کی بنیاد پر عام نشستوں کے لئے بھی داخلہ لے سکتے ہیں۔

اقلیتی فرقوں کے اہم تہواروں اور برسیوں کے موقعوں پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اقلیتوں کے لئے خاص پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ ہندوؤں کے اہم تہواروں پر ریڈیو پاکستان سے جھگوت گیتا کے پاٹھ کا انتظام کیا گیا ہے اور پشاور اسٹیشن سے نشر ہوئے والے جیسیائیوں کے پروگرام کا وقت بڑھا دیا گیا ہے۔ بالیک سوامی جی کے جنم دن کے موقع پر ریڈیو پاکستان کے پشاور ملتان اور حیدرآباد اسٹیشنوں سے خاص پروگرام نشر کیا جاتا ہے یہ

فرقے کے بہت سے لوگ ایک ہی جگہ آباد ہوں تو انہیں مختلف حلقوں میں تقسیم نہ کیا جائے نشستیں فراخ دلی کے ساتھ مخصوص کی جائیں گی اور اس معاملہ میں آبادی کے اصول کی سختی کے ساتھ پابندی نہیں کی جائے گی۔ ان انتظامات پر عملدرآمد کے لئے صوبائی حکومتیں لوکل گورنمنٹ یٹس اور آرڈیننس میں مناسب ترمیمیں کر رہی ہیں۔

اقلیتوں کو متروکہ وقف املاک کے بورڈ میں بھی نمائندگی حاصل ہے۔ یہ بورڈ پاکستان میں متروکہ املاک کی دیکھ بھال کرتا ہے اور ان پر کنٹرول کرتا ہے۔ انہیں پنجاب سوشل سروسز بورڈ میں بھی نمائندگی دی گئی ہے۔ اقلیتی فرقوں کے لوگوں کو اہم سیاسی ذمہ داریاں تفویض کی گئی ہیں اور جو وفود اور ثقافتی طائفے ملک سے باہر بھیجے جاتے ہیں ان میں اقلیتی فرقوں کے لوگوں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔

اقلیتی فرقوں کے ضرورت مند اور نادار افراد کی فلاح و بہبود کے لئے اقلیتی امور کی وزارت میں وفاقی حکومت کی طرف سے ۲۰ لاکھ روپے کا ایک فنڈ قائم کیا گیا ہے۔ اس فنڈ کو خرچ کرنے کی کوئی مدت مقرر نہیں کی گئی۔ اسکیم میں یہ بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ نادار افراد کے علاوہ ان اداروں کو بھی مالی امداد دی جائے جو اقلیتی فرقوں کے لوگوں کو تربیت دیتے ہیں اور روزگار حاصل کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ اب تک بحیثیت مجموعی ۲۳۴ مستحق افراد کو ۲۳۰۲۳ روپے کی مالی امداد دی جا چکی ہے۔ اس وقت مختلف اضلاع میں اقلیتی فرقوں کے افراد در انجمنوں کی بہت سی درخواستوں پر غور کیا جا رہا ہے۔ اقلیتی امور کی وزارت میں اس مقصد کے لئے ایک خاص کمیٹی بنائی گئی ہے جو صرف ان درخواستوں پر غور کرتی ہے جو افسران ضلع کی سفارش کے ساتھ وصول ہوتی ہیں۔

ذریعہ اعظم نے ضلع چترال کے کافرستان کی وادیوں میں رہنے والے کلاش قبیلوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی ہے۔ اقلیتوں کے لئے خیر سگالی کے اظہار کے طور پر وفاقی حکومت نے کراچی میں بودھوں کے لئے عبادت گاہ اور ثقافتی مرکز کی تعمیر کے لئے تین لاکھ

وفاقی حکومت کے زیر انتظام

قبائلی علاقوں کی ترقی

بارہ کروڑ روپیہ تقریباً قریب دو گنی ہے۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۴ء تک ان علاقوں کی ترقی پر ۲۴ کروڑ ۸۳ لاکھ ۵۰ ہزار روپے خرچ کئے جا چکے ہیں۔ اس خرچ کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے۔

تعلیم

تعلیم کے شعبے پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ جولائی ۱۹۷۴ء سے جون ۱۹۷۵ء تک تعلیمی پروگرام کے لئے جو ایک طرح سے ہنگامہ پر درگرم تھا ۵ کروڑ ۱۱ لاکھ روپے کی نظیر رقم مختص کی گئی تھی۔ ۱۹۷۴ء کے بجٹ میں تعلیم کے لئے دو کروڑ ۲۷ لاکھ ۶۰ ہزار روپے رکھے گئے تھے۔ اب ان علاقوں میں دو ماہری کالج ۶ انٹر میڈیٹ کالج، دو اساتذہ کے تربیتی ادارے، ۵۶ ہائی اسکول، ۸۹ مڈل اسکول اور ۷۴ پرائمری اسکول ہیں۔ اس کے علاوہ ۱۱۱ اسکول تک ان علاقوں میں صرف دو انٹر میڈیٹ کالج، ۱۱ ہائی اسکول، ۳۷ مڈل اسکول اور ۳۲ پرائمری اسکول تھے۔

۱۹۷۵-۷۶ء کا پر درگرم یہ ہے کہ ۱۱۰ پرائمری سکولوں

وفاقی حکومت کے زیر انتظام قبائلی علاقوں کا رقبہ ۱۰۵۱۰ مربع میل اور آبادی ۲۵ لاکھ ہے۔ ان علاقوں کا شمار پاکستان کے انتہائی پس ماندہ علاقوں میں ہوتا ہے اس لئے عوامی حکومت ان کی تیز رفتار معاشرتی اور معاشی ترقی پر خاص توجہ دے رہی ہے تاکہ یہاں کے لوگوں کو بھی وہی بنیادی معاشرتی سہولتیں حاصل ہوں جو پاکستان کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کو حاصل ہیں۔ اس علاقے کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے یہاں کے لوگوں کے ساتھ جرگوں کے ذریعہ رابطہ پیدا کرنے کی بجائے براہ راست عوام کے ساتھ بات چیت کی۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت کی کہ اب قبائلی علاقوں کے عوام پر پوری توجہ دی جائے گی اور ترقی کے فوائد گھر گھر پہنچانے میں کسی کوشش اور بڑے سے بڑے خرچ سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔ پچھلے چار سال میں اس پالیسی پر ثابت قدمی کے ساتھ عمل ہوتا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ۱۹۷۵-۷۶ کے بجٹ میں ان علاقوں کے لئے ۲۱ کروڑ ۹۶ لاکھ ۸۰ ہزار روپیہ کی رقم مختص کی گئی ہے۔ جب کہ ۱۹۷۱-۷۲ کے بجٹ میں صرف ۷۰ لاکھ ۶۰ ہزار روپیہ رقم مختص کی گئی تھی۔ موجودہ مالی سال کی رقم ۱۹۷۵-۷۶ کے پانچ سالہ منصوبے میں اس علاقے کے لئے مختص کی ہوئی رقم

موادلات

حکومت کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ عوام کے لئے موادلات کا وسیع سلسلہ مہیا کرنا انتہائی ضروری ہے۔ پچھلے چار سال میں مٹر کوں کی مختلف سکیموں پر دنش کروڑ ۷۰ لاکھ روپے خرچ کیے گئے۔ ان کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مختلف مٹر کوں کی مجموعی لمبائی جو سالہ ۱۹۷۲-۱۹۷۳ میں ۲۷۱۳ میل تک جا پہنچی ہے۔ بحری کی مٹر کوں کی مجموعی لمبائی جو سالہ ۱۹۷۲-۱۹۷۳ میں ۶۸۱ میل تھی اب ۸۲۱ میل تک اور پٹی، بطوریکہ لمبائی ۱۶۷ میل سے ۶۱۵ میل ہو گئی ہے۔ سالہ ۱۹۹۹ میں ہر طرح کی مٹر کوں کی مجموعی لمبائی ۱۲۶۹ میل تھی جو سالہ ۱۹۷۲-۱۹۷۳ میں ۸۹۹ میل تھی۔ مٹر کوں اور پلوں کی تعمیر کے لئے سالہ ۱۹۷۲-۱۹۷۳ میں سالانہ اخراجات تقریباً ۷۰ لاکھ روپے کی رقم دیکھی گئی ہے۔ ان کے علاوہ سب سے پہلی سکیموں پر پیپلز ورکس پروگرام کے تحت عملدرآمد ہو رہا ہے۔ ان سکیموں کے تحت جو سالہ ۱۹۷۲-۱۹۷۳ کے آخر تک پچاس میل لمبی کچی مٹر کی بنائی جا چکی تھیں۔

زراعت

قبائلی علاقوں میں پچھتر فی صد مزدور زراعت کے ذریعہ روزی کاتے ہیں۔ پچھلے چار سال میں ایک کروڑ ۳ لاکھ ۹۰ ہزار روپے کے خرچ سے تقریباً ایک ہزار ایکڑ رقبہ کو قابل کاشت بنایا گیا۔ زمین کیلئے ۵۰-۶۰ لاکھ روپے خرچ کیے گئے۔ اس کے علاوہ قبائلی علاقوں کی ترقیاتی کارپوریشن دریائے باڑہ کی نہروں سے سیرا ہونے والے علاقے میں ۲ کروڑ ۲۹ لاکھ روپے کے خرچ سے ۳۸ ہزار ایکڑ رقبہ کو قابل کاشت بنائے گئے۔

زراعتی زمین سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لئے کھاد کو عمدہ قسم کا بیج اور رعایتی نرخوں پر کھاد کی فراہمی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور فصلوں کی بیماریوں پر قابو پانے اور آب پاشی

کو ترجیح دیا اور ۲۰۰۰ مٹر اسکولوں، آبائی اسکولوں کا درجہ دے دیا گیا۔ ۳۰۰۰ سے زائد پرائمری و دہل اسکول اور ۱۰۰۰ اسکول کھولے گئے۔ اور پانچ ٹیکنیکل ورکشاپ قائم کی گئیں۔ اس کے علاوہ ملک کے اندر اور ملک سے باہر تعلیم حاصل کرنے کے لئے قبائلی طلباء کو فراخ دلانہ گرانٹ دی گئی ہے۔ وزیر اعظم کی ذاتی ہدایت پر ملک کے پیشہ ورانہ کالجوں میں قبائلی طلباء کے لئے اور زیادہ نشستیں مخصوص کی گئی ہیں۔ ۱۹۷۲-۷۳ میں قبائلی طلباء کے لئے میڈیکل کالجوں میں ۲۹ اور ٹیکنیکل کالجوں میں ۳۳ نشستیں یعنی کل ۶۲ نشستیں مخصوص کی گئیں۔ اب قبائلی طلباء کے لئے کل ۱۲۹ نشستیں مخصوص ہیں۔ ان میں سے ۵۹ میڈیکل کالجوں میں اور ۷۰ ٹیکنیکل کالجوں میں ہیں۔

صحت

۱۹۷۱ تک قبائلی علاقوں میں علاج معالجے کی سہولتیں برائے نام تھیں۔ فریئر کور کے کچھ ہسپتال اور ڈسپنسریاں تھیں۔ لیکن وہاں عام طور پر کور کے آدمیوں ہی کا علاج ہوتا تھا۔ اب فریئر کور کے ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کے علاوہ ۳۳ ڈسپنسریاں اور ۴۴ ہسپتال ہیں جو پورے سامان سے لیس ہیں اور وہاں پورا علاج کام کر رہا ہے۔ ۱۹۷۲-۷۳ میں ہسپتال اور ڈسپنسریاں کھولنے اور ان کی عمارتیں بنانے پر ۳۳۳۳ روپے خرچ ہوئے ہیں۔ جن سکیموں پر یہ رقم خرچ ہوئی ہے ان میں آٹھ آٹھ بستروں کے نئے ہسپتال، ۱۸ نئی ڈسپنسریاں، لنڈی کوتل میں ایک نیا ایجنسی ہیڈ کوارٹر ہسپتال اور صحت کے دس بنیادی دیہی مرکز شامل ہیں۔ ان کے علاوہ چار سول ہسپتالوں کا درجہ بڑھا کر انہیں ایجنسی ہیڈ کوارٹر ہسپتال بنا دیا گیا ہے۔ ان ہسپتالوں میں علاج معالجے اور سرجری کا مخصوص انتظام ہے۔

صنعت

۱۹۷۱ء تک صنعتی شعبے پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس کی تلافی کے لئے قبائلی علاقوں کی ترقیاتی کارپوریشن قائم کی گئی۔ ان دنوں یہ کارپوریشن قبائلی علاقوں میں ماحس، سگریٹ، چلوں اور سہریوں، چڑا رنگینے، جوتے اور جپڑے کا دوسرے سلطان بنانے، قالین کے دھاگے، شیشے اور بنا سستی گھی کے کاغذ بنانے کا کام کر رہی ہے۔ ان اسکیموں پر مجموعی طور پر ۵ کروڑ ۲۱ لاکھ ۴۴ ہزار روپے لاگت آئے گی۔ ماحس اور سگریٹ کے کارخانوں پر کافی کام ہو چکا ہے اور توقع ہے کہ ان میں اسی سال مال تیار ہونے لگے گا۔ دوسرے کارخانوں میں ۱۹۷۵-۷۶ء کے آخر تک مال تیار ہونے لگے گا۔

ٹیکیکل ٹریننگ سنٹر

تربیت یافتہ اور نیم تربیت یافتہ کارکنوں کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو دیکھ کر کے لئے صنعتی تربیت اور پیداوار کے پانچ مرکز قائم کئے گئے ہیں۔ صحت کی صنعتوں کا ایک ایک مرکز دہ آدم خیل اور میران شاہ میں اور ان کی صنعت کا ایک ایک مرکز میران شاہ اور وانا میں مزدی کی صنعت کا مرکز علی زئی میں قائم کیا گیا ہے۔

ان دنوں ان مرکزوں کی از سر نو تنظیم کی جا رہی ہے تاکہ یہ پہلے سے زیادہ مفید طریقہ پر کام کر سکیں۔ پچھلے چار سال میں ان مرکزوں میں ۴۳ افراد نے تربیت پائی۔ ۱۹۷۵-۷۶ء میں ان مرکزوں کے لئے ۲۸ لاکھ ۷۰ ہزار روپیہ کی رقم رکھی گئی ہے۔

پبلک ہیلتھ انجینئرنگ

وزیر اعظم بناب ذوالفقار علی بھٹو نے جب قبائلی علاقوں کا دورہ کیا تھا تو انہوں نے ہدایت کی تھی کہ ان علاقوں میں پانی کی فراہمی کی

لئے پانی باقاعدگی کے ساتھ فراہم کرنے کی اسکیمیں بھی تیار کی گئی ہیں۔ دریا نے بلاد کی نہروں کی اسکیم کے تحت خیبر پختونخوا میں ۸۳ ہزار ایکڑ اور ضلع پشاور میں ۱۱ ہزار ایکڑ رقبے کو ہر موسم میں پانی ملنا رہے گا۔ اس اسکیم کے تحت دریا کے دائیں اور بائیں کناروں سے نکلنے والی نہروں میں پانی آنے لگا ہے۔ شمالی وزیرستان میں ٹیوب ویلوں کی اسکیم کے تحت عیدک اور ٹھہری کے میدان میں ۴ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا۔ اس اسکیم کے تحت ۶ ٹیوب ویل کام کرنے لگے ہیں۔ اس وقت دران، شلوزان (کرم پختونخوا) اور اسپن میدان (جنوبی وزیرستان) انجینیئرنگ کی آب پاشی کی اسکیموں پر کام ہو رہا ہے۔ ان کے مکمل ہونے پر ۱۸،۷۰۰ ایکڑ رقبہ سیراب ہوگا۔ قبائلی علاقوں میں زیر زمین پانی کے ذخیروں کو کام میں لانے کے لئے قبائلی علاقوں کی ترقیاتی کارپوریشن نے امریکہ سے دو *INGERSOL RAND* رک منگوائے ہیں۔ آسٹریلیا سے *CABLE TOOL DRILLING RIGS* منگوائے جا رہے ہیں۔ ان میں سے تین رگ پاکستان پہنچ چکے ہیں۔

مولیشیوں کی افزائش اور علاج

۱۹۷۱ء میں قبائلی علاقوں میں مولیشیوں کے علاج کے لئے ۳۶ ہسپتال اور ڈسپنسریاں تھیں۔ اب وہاں ۵۶ ہسپتال اور ڈسپنسریاں ہیں جہاں مولیشیوں کا علاج مفت ہوتا ہے۔ وزیر بریجیروں کی نسل بڑھانے اور مولیشیوں کی افزائش کے لئے براہ کوشش کی جا رہی ہے۔ قبائلی طلباء کو اس بات کی ترغیب دی جا رہی ہے کہ وہ مولیشیوں کے بارے میں مختلف علوم کا مطالعہ کریں۔ بی۔ ایس۔ سی (انٹیمیل ہرینڈی) کے طلباء کو وظیفے دیئے جا رہے ہیں۔ جو لوگ وٹری کیمیا ڈیڑوں اور اسٹاک اسٹنٹ کی حیثیت سے تربیت پاتے ہیں انہیں بھی وظیفے دیئے جاتے ہیں۔

پیپلز ورکس پروگرام

دودھ دار علاقوں کی معاشی ترقی کے لئے پیپلز ورکس پروگرام بڑا مؤثر ثابت ہوا ہے۔ اس پروگرام پر عملدرآمد میں قبائلی باغوں کو شریک کرنے کے لئے حکومت نے انجینیئر ترقیاتی کمیٹیاں، حلقہ ترقیاتی کمیٹیاں اور دیہی ترقیاتی کمیٹیاں (جرگے) قائم کرنے کی منظوری دی ہے۔ تمام کمیٹیاں وفاقی حکومت کے زیر انتظام قبائلی علاقوں کی دیہی ترقیاتی کونسل کی نگرانی میں کام کریں گی۔ حکومت نے اس پروگرام کے لئے فراخ دلانہ گرانٹ منظور کی ہے۔ اس کے تحت سڑکیں بنانے، آب پاشی، سیلاب پر قابو پانے، اجتماعات، اسکولوں کی عمارتوں کی تعمیر اور پینے کے پانی کی فراہمی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی اسکیموں پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔ پچھلے چار سال سے اس پروگرام پر دو کروڑ ۶۲ لاکھ ۲۰ ہزار روپیہ خرچ ہو چکا ہے۔ ۱۹۷۰-۷۱ء کے بجٹ میں اس کے لئے ۵۰ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ یہ پروگرام قبائلی علاقوں کی معاشی ترقی کے لئے بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔

مربوط دیہی ترقی کا پروگرام

مربوط دیہی ترقی کے پروگرام کے تحت خوار (باجوڈ انجینیئر) پارا پنار (کرم انجینیئر) اور محمد خیل (شمالی وزیرستان) میں ایک ایک مرکز کھولا جا رہا ہے۔ ۱۹۷۰-۷۱ء کے قبائلی علاقوں کی ترقی کے سالانہ پروگرام کے لئے اس مد میں ۱۵ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔

متعدد اسکیمیں فوری طور پر تیار کی جائیں تاکہ قبائلی باشندوں کو پینے کے لئے صاف ستھرا پانی مل سکے؟ پچھلے چار سال میں ان اسکیموں پر دو کروڑ ۳۴ لاکھ روپے سے زیادہ رقم خرچ کی جا چکی ہے۔ دہہ خیبر، جمروڈ میران شاہ اور دتھیل کے لئے پانی کی اسکیمیں مکمل ہو چکی ہیں۔ ددوئی اسکیموں پر کام ہو رہا ہے اور یہ اسکیمیں بھی مکمل ہونے والی ہیں۔

۱۹۷۰-۷۱ء کے سالانہ ترقیاتی پروگرام میں پینے کے پانی کی کمیوں کے لئے ایک کروڑ ۷ لاکھ ۳۰ ہزار روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ یہ اسکیمیں مختلف قبائلی علاقوں کے لئے ہیں

بجلی کی فراہمی

عوامی حکومت ترقی کے ہنگامی پروگرام کے تحت تمام قبائلی علاقوں میں بجلی کی فراہمی پر عمل درآمد کر رہی ہے۔ پچھلے چار سال میں اس پروگرام پر دو کروڑ ایک لاکھ ۹۰ ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں اور ۱۱۶ دیہات میں بجلی پہنچائی گئی ہے۔ باجوڈ کے علاقے میں بجلی کی فراہمی کی اسکیم مکمل ہو گئی ہے۔ وہاں ۲۰ دیہات میں بجلی پہنچی ہے جس سے عربیہ چالیس ہزار سارنہیں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی طرح مہمند انجینیئر میں یوسف خیل اور دوسرے ۲۲ دیہات میں بجلی پہنچ گئی ہے۔ ۱۹۷۰-۷۱ء کے بجٹ میں قبائلی علاقوں میں بجلی پہنچانے کے لئے ایک کروڑ ۱۶ لاکھ ۳۰ ہزار روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ ۱۹۷۱-۷۲ء کے دیہات میں بجلی پہنچی تھی۔ اب ۱۵۱ دیہات میں بجلی پہنچ چکی ہے۔

اردو ادب

ایم اے صدیقی

برصغیر میں تمام زبانوں کے ترقی پسند ادیب ادب میں رجعت و قدامت پسندی کے مخالف تھے۔ روایتی ادب کے بارے میں بجا طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ انسان کے دکھوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ بہت سے جدید ادب کے حامی بھی جو انیسویں صدی کے ساتویں عشرے کے دور انحطاط کے فرانسیسی ادیبوں کی طرح ادب کی موضوعاتی تقدیس کے قائل تھے، درحقیقت قدامت پسند تھے جو ادب میں اپنے وقت کی معاشرتی اور معاشی حقیقتوں کو روشناس کرانے کو بدعت سمجھتے تھے۔ یہ بڑی مضحکہ خیز صورت حال تھی اور ادب نامی موضوعاتی تقدیس کی تحریک کا مقصد یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو معتبر ہائے فکر کسی بھی قسم کی معاشرتی تبدیلی کے مخالف ہیں ان کے لئے ذہنی ڈھال مہیا کی جائے یہ لوگ ادب برائے ادب کا نعرہ لگاتے تھے۔

راجر فرانی (ROGER FRY) نے بالکل صحیح کہا تھا کہ ۱۸۷۰ء سے آج تک جدت پرستی کی تمام تحریکیں اپنے مزاج کے اعتبار سے رجعت پسند تھیں۔ آج بھی صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہم جس سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بودلیئر (BAUDELAIRE) کی طرح گھر بیٹھ کر اپنی تحریروں کے ذریعہ معاشرتی برائیوں اور معاشی ناہمواریوں کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ

پاکستان میں ادب بڑی حد تک مشہوروں کی پیداوار ہے اسی لئے یہ معاشرتی اور معاشی تقاضوں اور عوامل سے کبہ اٹھتا ہے۔ جب جناب ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے اقتدار سنبھالا تو صحیح طور پر یہ توقع کی جاتی تھی کہ اب ملک کے ادبی میدان میں رونق آجائے گی اور ادیب اور ادب کو زندگی کا آئینہ دار بنانے کی ذمہ داری قبول کریں گے۔ آزادی فکر نہ صرف جمہوری اور ادب کی ترقی بکفن اور ادب کی ترقی کے لئے بھی ضروری ہے اس لئے ملک میں جمہوریت کی بحالی سے تعمیری ادب کی تخلیق لی۔ لی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔

قیام پاکستان کے وقت اردو ادب پنجاب، صوبہ سرحد اور ملک کے کچھ دوسرے حصوں میں خاصا ترقی پا رہا تھا۔ اس وقت نئے دور کے ادیب جن موضوعات پر خاص طور سے توجہ دے رہے تھے ان میں آزادی، مساوات، قومی پیداوار اور بین الاقوامیت شامل تھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادب کے روایتی موضوعات جن میں انشعاب اور علامات، بکثرت استعمال ہوتے ہیں ناپید ہو گئے تھے۔ البتہ ادب کا یہ رجحان زوال پذیر تھا۔ گل و بلبل کی شاعری کو نئے قالب میں ڈھالنا ضروری تھا اور کچھ جدت پسندوں نے کام بھی کر دکھایا اور ثابت کر دیا کہ وہ اس کے اہل ہیں۔

جو ادیب مقصدیت کے قائل نہیں ہوتے وہ بڑا اچھا ادیب نہیں کرتے ہیں کیونکہ ان پر مقصدیت اور معاشی اخلاق کے تقاضے پورے کرنے کا جنون سوار نہیں ہوتا۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو جدت پسند ادب کا مطالعہ روایتی انشائی ادب کے مقابلہ میں زیادہ اہم اور ضروری ہو جاتا ہے۔ اب بہت سے ادیبوں کی تخلیقات خالص انسانی مسائل کا احاطہ کرتی نظر آنے لگیں کیونکہ بہر حال ان مسائل سے کسی نہ کسی طرح بچنا ضروری تھا۔ ایسے وقت میں جبکہ چاروں طرف بے چینی پھیل ہوئی ہو خیالوں کی دنیا میں پناہ لینے سے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم سرسید کی اصلاحی تحریک کی روشنی میں جس میں ادب کے ساتھ خیالات کی اصلاح بھی شامل تھی کچھ اہم ترقی پسند ادیبوں کے اشعار قلم پر نظر ڈالیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ ترقی پسندی کے اثرات قبول کرنے کی صلاحیت شروع ہی سے رکھتا تھا۔ یہ معاشرہ کب تک حقائق کی طرف سے آنکھیں بند رکھ سکتا تھا جو قوم حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتی ہے وہ صورتِ سال سے ہمہ برا نہیں ہو سکتی اور ان مسائل کے حل کے لئے ضروری قدم نہیں اٹھا سکتی۔

آزادی کے بعد چار سال تک ہمارے ادبی میدان میں دو طائفتیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں۔ ایک طرف ترقی کے جو یا ادیب تھے اور دوسری طرف ادب برائے ادب کے حامی۔ موخر الذکر ادیب ایسی زبان استعمال کرنے کے عادی تھے جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ دوسرا گروپ ماضی کے مقابلے میں صرف حال سے سروکار رکھنا چاہتا تھا۔ پاکستان حق خود ارادیت کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے لاکھوں آدمیوں کو گھر بار چھوڑنا پڑا تھا۔ کچھ ادیبوں نے اس دوسرے واقعات کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت انسان دوستی کا جذبہ کارفرما تھا۔ ان دنوں بڑے بڑے قافلے ہر سو پارے پاکستان آ رہے تھے اور اپنے آپ پر وحشیانہ مظالم کی داستانیں سن رہے تھے۔ اس صورتِ حال کو کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

بنیادی طور پر اس دور میں انسانیت پرستی کا جذبہ ادیبوں پر حاوی تھا۔ معاشرتی تاریخ کے طالب علم کے لئے اس پس منظر میں محمد نیک قاسمی، مرزا ادیب، ظہیر کشمیری، ہاجرہ مسرور، بخارہ بکر مستور، قدرت اللہ شہاب، ابراہیم جلیس، رئیس امر و ہوی اور بہت سے دوسرے ادیبوں کے اشعار اور افسانوں کا مطالعہ بڑا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۹۵۷ء کے بعد ترقی پسندی کچھ مضبوطی ہو گئی اور اچانک غزل گوئی کا رواج بڑھ گیا البتہ غزل میں ترقی پسند اور وجودی خیالات کا اظہار ہونے لگا۔ میر تقی میر سے فراق نگ غزل کی جو روایت چلی آرہی تھی اُسے ناصر کاظمی اور منیر نیازی جیسے ترجمان مل گئے جن کے کلام سے قطعیت کی تلاش کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ محض غنائیت کا احیا نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برہنہ شکر کے تار خود بخود جڑ گئے ہوں اور اس کے نغمے روح کی گہرائی کو چھونے لگے ہوں۔ ناصر کاظمی، مجید احمد، منیر نیازی، ابن انشا، شکیب جلالی، باقی صدیقی، سلیم احمد، الطہر نفیس، جون اہلیا، احمد شتاق، شہزاد احمد اور کچھ دوسرے شاعروں کی شاعری اسی دور کی پیداوار ہے۔

ترقی پسندی کی تحریک ختم ہونے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس کے ساتھ ترقی پسندانہ اندازِ فکر بھی ختم ہو گیا۔ فیض، قاسمی، ممتاز حسین، عبادت بریلوی، مجتبیٰ حسین، عزیز حامد مدنی، شوکت صدیقی، عارف عبدالمعتین، فارغ بخاری، ظہیر کشمیری، ابراہیم جلیس، ہاجرہ مسرور، قمر ہاشمی، مسلم منیائی اور حمایت علی شاعر اپنے فارمین کو حال کی طرف متوجہ کرتے رہے۔

جمالیائی گروپ میں قیوم نظر، ضیاء جالندھری، حمید نسیم، مختار صدیقی، ن۔م، راشد، حفیظ ہوشیارپوری، مجید امجد، اعجاز بٹالوی، محمد حسن عسکری، شاہد احمد دہلوی، یوسف ظفر، غلام عباس، ممتاز شیریں جیسے انفرادیت پسند ادیب شامل ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس گروپ میں بڑے اچھے اچھے ادیب شامل ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں سے کچھ

ادیبوں کے خیالات نئی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہو گئے۔ ان کا تعاضا یہ تھا کہ زندگی سے فن کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔

لگ بھگ ۱۹۶۰ء میں وجودیت ہمارے ادب کے میدان میں خیمہ زن ہوئی۔ اس وقت تک سارتر اور کیوس کا فی مشہور ہو چکے تھے ہمارے کچھ ادیبوں کی تحریروں میں ان کے خیالات کی گونج سنائی دینے لگی۔ لیکن وجودیت اور جدید بحث کی باقاعدہ تحریک بعد میں ہمارے ادب میں آئی۔

غالباً جدید خیالات کی اسی بیخار کی وجہ سے ڈاکٹر وزیر لقا کے گرد پلنے جو سرگودھا مکتبہ ادب کے نام سے مشہور ہے زمین کے ساتھ رشتوں پر زور دیا۔ ڈاکٹر وزیر لقا نے ایک نیا جمالیاتی نظام پیش کیا یا اسے از سر نو مرتب کیا جس میں آسمان کے ساتھ زمین کے رشتے واضح کئے گئے تھے۔ بہت سے ادیبوں نے ان کی تقلید کی کوشش کی۔ ان میں غلام الثقلین نقوی، انور سدید، غلام جیلانی، اصغر، سجاد نقوی اور غلام اظہر شامل ہیں۔

شروع میں اس مکتبہ فکر کے ادیب یورپ کے ان جمالیاتی ادیبوں کے خیالات پیش کرتے رہے جو اس بارے کے خلاف تھے کہ ادب سے معاشرتی برائیوں کے علاج کا کام لیا جائے۔ ان ادیبوں کا بھی یہی خیال تھا کہ معاشی اور معاشرتی مسائل ادب میں داخل نہ ہونے دئیے جائیں۔ لیکن بعد میں اس گرد پلنے نے اپنے آپ پر تنقید کے زیر اثر اپنے خیالات میں تبدیلی کر لی۔ اب اس گرد پل کا سب سے بڑا اثر جہاں یہ اعتراف کرنے لگا ہے کہ ادب کا معاشرتی اور سیاسی پہلو بھی ہوتا ہے لیکن ادب کو پروپیگنڈے کا ذریعہ نہیں بنایا جاسکتا۔

لگ بھگ ۱۹۶۰ء میں لاہور میں شاعری کا ایک نیا اسکول منظر عام پر آیا جو نئی شاعری کا اسکول کہلاتا ہے۔ یہ گرد پل ہر قسم کی پابندی

یہاں تک کہ زبان کی پابندی کو بھی زبان بندی کے مترادف سمجھتا ہے۔ اس گرد پل نے ایسی زبان استعمال کرنے کی کوشش کی ہے جسے سب سمجھ سکیں۔ ان ادیبوں نے کبھی اس کا اعتراف نہیں کیا لیکن اس اسکول پر وینٹجینس کے گہرے اثر کا کوئی اور مطلب نہیں ہو سکتا۔ یہ اسکول اعلیٰ اور جذباتی زبان استعمال کرنے کا مخالف ہے۔ اس کے نزدیک پرائیویٹ زبان بے معنی فقرہ ہے۔ شاعری کی زبان صدیوں تک استعمال میں رہنے کی وجہ سے اپنی صداقت اور صمیم مفہوم کھو چکی ہے۔ یہ زبان گھسے ہوئے سکے کی طرح ہے اختصار جالب اور انیس ناکی اس مکتبہ کے رہنما تھے اور انہوں نے بڑا اچھا آغاز کیا تھا۔ منیر نادی، عباس اطہر، تبسم کشمیری، شاہد ڈار، یوسف گار، محمد سلیم الرحمن اسی مکتبہ کے ادیب ہیں۔ نوجوان ادیبوں کے اس گرد پل میں سعادت سعید، فہیم جوی، سرد صہبائی اور نسرتین انجم بھی بھی شامل ہو گئے ہیں۔

اردو ادب کے لئے پچھلے چار سال بڑے اہم تھے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ عوامی حکومت کا برسر اقتدار آنا بجائے خود ایک داستان ہے۔ جو پارٹی اب برسر اقتدار ہے، ادب کے بارے میں اس کا نظریہ شروع ہونے سے صاف اور واضح رہا ہے۔ وہ یہ کہ ادیبوں کو اپنی معاشرتی ذمہ داری پوری کرنی ہے۔ ترقی پسند ادیب بھی یہی کہتے آئے ہیں۔ جب تک ملک کے معاشرتی اور معاشی ڈھانچے کی بنیاد مساوات کی سیاست پر نہ رکھی جائے تو قوم زندگی کے کسی شعبہ میں ترقی ممکن نہیں ہے۔ ادیب اور دانشور برسر اقتدار پارٹی کے پُر زور حامی تھے اور وہ بجا طور پر یہ سوچتے تھے کہ معاشرتی مسائل کو عوام کی سب سے نچلی سطح پر حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کے یالوس کن ایام میں جب موجودہ حکومت نے اقتدار سنبھالا تو بہت سی علمی اور ادبی بحیثیت منظر عام پر آگئیں گویا اس کے لئے اسی وقت کا انتظار ہو رہا تھا۔ جو معاشرتی دانشوروں کی بنیادی نوعیت کے معاشرتی اور عقلی مسائل پر کھل کر بحث کرنے کی اجازت نہیں دیتا وہ کسی بھی سمت سے غیر متوجہ طور پر طوفان اٹھنے سے غافل رہتا ہے۔ ذہنی طور پر چوکس رہتا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا دفاعی طور پر چوکس رہتا۔ جس طرح

شامل ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے جن بے تکلفی اور شگفتہ انداز میں سفرنامہ لکھا ہے وہ اپنی دنیا آپ ہے۔

شاعری :-

زیر تبصرہ مدت میں بھی پہلے کی طرح شاعری کا بڑا چرچا رہا۔ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ شاعری کے نمونے پیش کئے بغیر محض اچھے شاعروں کے نام شمار کرنا ایک طویل اور اکتا جینے والا کام ہے۔ شاعروں کی صف میں جدید شعرا بھی ہیں، ترقی پسند بھی، جدید ترقی پسند بھی۔ اور روایت پرست بھی۔ اب روایت پرستی کا دور ختم ہو رہا ہے۔ اب جدید شاعر جو کبھی ترقی پسند اور کبھی جدید ترقی پسند کہلاتا ہے۔ اہمیت کا حامل ہے۔ عزیز حامد مدنی، انجم اعظمی، جون ایلیا مبارک احمد، افتخار جالب، انیس ناگی، زاہد ڈار، کشتورنا ہید، صلاح الدین محمود، یوسف کامران، امجد اسلام امجد اور سہیل احمد بہت کچھ لکھ رہے ہیں۔ صابر ظفر، خالد احمد، مسعود منور، نسرتین انجم بھٹی، شائستہ حبیب، فاطمہ حسن، رشید مفتی، اور خورشید الحسنین بھی اظہار کے نئے اسلوب آزما رہے ہیں۔

اچھی تحریروں کے سلسلے میں شکیب ہالائی کی روشنی لے روشنی مصطفیٰ زیدی کی کوہ ندا ادا جعفری کی غزالاں تم تو واقع ہو وزیر کا کی غزلیں اور نظمیں انیس ناگی کی غیر ممنوعہ نظمیں حفیظ ہوشیار پوری کی مقامات غزل، حمایت علی شاعر کی مٹی کا قرض، منیر نیازی کی ماہ منیر عبید اللہ عظیم کی چاند چہرہ ستارہ آنکھیں، رشید قیصرانی کی فصیل لب سرور یا رہ جکوی کی سنگ آفتاب اور اطہر نفیس کا کلام احمہ اضافے ہر فیض احمد فیض کی سرورادی سینا اور منیر نیازی کی گاہ منیر خاتم طور پر قابل ذکر ہیں۔ منیر کی غزلوں میں بہت ہی صاف ستھرا انداز بیان اور نازکی پائی جاتی ہے ان اشعار سے حسن و رعنائی اور توازن کے لئے روح کی تشنگی جھلکتی ہے۔

تنقید اور نثر

علی عباس جلال پوری کی مقامات وارث شاہ ڈاکٹر فرمان

دفاع کے معاملے میں چوکس رہنے سے ملک کے جغرافیائی وجود کی خوب حفاظت ہو سکتی ہے اسی طرح ذہنی طور پر چوکس رہنا قومی ذہن کو تباہی سے بچا لیتا ہے ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف سے عقلمندی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جب ملک کے مقتدر اعلیٰ کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ رجعت پسندی اور جمہوریت جو قرون وسطیٰ میں مسلط ہوئی عدم مساوات کی یادگار ہے بالکل ختم کر دی جائے گی تو دانشوروں کو اس سے زیادہ اور کیا چاہئے تھا۔ ادب کو نیست و نابود ہونے سے بچانے کے لئے ضروری تھا کہ قومی تعمیر نو اور ترقی کے لئے قومی سطح پر جو کوششیں ہو رہی ہیں ادب کو ان سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اب میں مختصر طور پر بتاؤں گا کہ پچھلے چار سال میں ادب کی مختلف اصناف میں کیا کچھ لکھا گیا ہے۔

ناول اور افسانے

زیر تبصرہ مدت میں افسانے برکثرت لکھے گئے۔ اس عرصہ میں مختلف ہونے والی کتابوں کی تعداد سے افسانے کی ترقی کا ٹھیک اندازہ جہیں ہوتا لیکن عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ افسانے ترقی کی ہے۔ افسانے کی تکنیک میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اختر جال کی انگلیاں ڈگا رہی ہیں، اکرام اللہ کا جنگل، جمید ہاشمی کا اپنا اپنا جہنم، رشید امجد کا بے زار آدم کے بیٹے تاسمی کا کپاس کے پھول، محمد منشا یاد کا بند مٹھی میں جگنو اور قمر عباس ندیم کی شیشے کی آبرو قابل ذکر ہیں۔ شیشے کی آبرو ایک نوجوان کی تعینیت ہے اس میں روایتی اور جدید افسانہ نگاری کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ قاری تک ابلاغ کو قربان نہیں کیا گیا۔ ناصر عزیز بٹ کا ناول نے چرائے گئے خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی بعض بہت اچھے افسانے لکھے ہیں۔ پچھلے چار سال میں سفرناموں نے بڑا رواج پایا۔ بیگم اختر ریاض پٹیل، ابن انشاء، جمیل الدین عالی اور پیر علی محمد راشدی ۱۹۷۱ء سے پہلے ہی اس میدان میں اپنا لوہا منوا چکے تھے لیکن عبدالحق مستنصر حسین ناز نے اس عرصے میں بڑے اچھے سفرنامے لکھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مستنصر حسین ناز کی ”نفلے تیرا تلاش میں“ دور جدید کے ادب العالیہ میں

گیت

تاج سعید

دھرتی میں جو بیج تھا بویا وہ اب پھل لے آیا ہے
دیکھ رب کی شان کہ جس نے قسمت کو چکایا ہے

اپنی دھرتی کے ہم ہیں مالک، دانہ دانہ اپنا ہے
پیار کا موسم اپنا موسم، دکھ کا موسم سپنا ہے
دھرتی کے چہرے پر ہم نے خون جگر ٹپکایا ہے
دھرتی میں جو بیج تھا بویا، وہ اب پھل لے آیا ہے

پریت کی چوٹی کا جھومر تاج بنا ہے دھرتی کا!
دڑہ دڑہ، سونا چاندی، اپنی بستی بستی کا
اپنی سوہنی دھرتی نے محنت کا پھول کھلایا ہے
دھرتی نے جو بیج تھا بویا وہ اب پھل لے آیا ہے

گھاٹی گھاٹی، ڈیرے ڈیرے دکھ سکھ سائے اپنے ہیں
خوشیوں بھری اس سیج پر ساتھی پھیلے سدر پہنے ہیں
پنوں کی بارات میں کوئی چھم چھم کرتا کیا ہے
دیکھو رب کی شان کہ جس نے قسمت کو چکایا ہے

اردو کی منظوم داستانیں، پروفیسر حمید احمد خان مرحوم کی ارمغان حالی،
ایس ایم اکرام مرحوم کی آثار شبلی، سلیم اختر کی اردو کی مختصر ترین تاریخ،
وزیر آغا کی تخلیقی عمل، شان الحق حقی کی نمکثر راز، مختار مسعود کی آواز
دوست، فتح محمد ملک کی تفصیلات، انور سدید کی فکر و خیال اور اختلافات،
صہبہ لکھنوی کی اقبال اور بھوپال، قاسمی کی تہذیب و فن، مجنوں گوڈکھیو
کی غالب شخص اور نثار شمسون مائیک کے نام سے ملنے کی سیمیں ایک مشتر
کا ترجمہ، سید محمد تقی کی تاریخ و کائنات میرا نظریہ، افسر صدیقی کی مصطفیٰ اور
جیل جالبی کی ارسطو سے ایلٹ تک کچھ اہم کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی مثنوی کرم راؤ پدم راؤ پچھلے چار سال میرا ایک
ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔

مجھے یہ احساس ہے کہ پچھلے چار سال میں اردو اور انگریزی میں
مذہب اور تاریخ کی اتنی کتابیں شائع اور دوبارہ شائع ہوئی
ہیں کہ ان سب کا شمار شکل ہے اس لئے میں نے صرف ان
کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جن پر ادبی حلقوں میں بحثیں ہوئی ہیں۔
اور بھی ایسی کتابیں ضرور ہوں گی جو اس فہرست میں شامل ہوتے
کے قابل تھیں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔

اردو ادب کے حالات بڑے امید افزا ہیں۔ امریکی
پروفیسر میر یو پی نے پاکستان کی قومی زبان کو دور جدید کا معجزہ
قرار دیا ہے۔ اردو اتنی تیزی سے مقبول ہو رہی ہے کہ ہم یقینی
سامنے کہہ سکتے ہیں کہ تھوڑے ہی دنوں میں پاکستان کے اردو ادب
میں علاقائی زبانوں جیسا زور پیدا ہو جائے گا۔ اردو ادب اور
بھی ترقی کرے گا۔ لیکن پچھلے چار سال میں اس نے جو ترقی کی ہے
وہ قابل ستائش ہے۔ یہ ادبی بحث کی آزادی اور ادب کو
محاشرے کے سامنے جواب دہ بنانے کا نتیجہ ہے کہ حال ہی
میں جو بیج بکھڑے گئے تھے ان سے نئے نئے شکوفے پھوٹے ہیں
اور ان کی مہک ہر طرف پھیل گئی ہے۔

مدیر اعلیٰ: بیگم مسرت برکی
مدیر: فضل قدیر
نائب مدیر: سید علی محمد حبیبی

ماہِ نو

جنوری - فروری - ۱۹۷۶ء
جلد: ۲۹ — شماره: ۱

اس شمارے میں

- ۲ ف - ق
۳ پروین اختر
۴ فیضان اکبر آبادی
۵ ڈاکٹر اسد اریب
۸ جلیل عالی
۹ ڈاکٹر محمد ریاض
۱۵ اعجاز الحق قدوسی
۱۹ سید مظفر حسین دزمی
۲۰ ادارہ
۲۲ عبدالحلیم اثر
۳۲ حسین احمد مدنی
۳۸ محمد احمد شمس
۴۵ محسن احسان
۴۶ ڈاکٹر وزیر آغا
۴۸ زینون ہالو
۵۰ ماجد خلیل
۵۱ فضل قدیر
۵۶ فوزیہ رشید
۶۲ ف - رشید

ابتدائیہ

نخستین گیت

سلام بحضور شہید کربلا

زمزم شاعری کی نئی آواز

غزل

غالب اور تغلیب عرفی

حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی

غزل

سبیم و قنور کے خلاف جنگ

نیسا - پاکستان کا چھ ہزار سال قدیم تاریخی شہر

پشتو کہانیاں

داستان اپنے پروفیسر بننے کی (انشائیہ)

غزل

نقد و نظر - داستان صحافت

لوک گیت ہمارا ثقافتی ورثہ

غزل

بزدل (افسانہ)

عظیم عورت (افسانہ)

ایک ماہر گٹ یا ساز - بابا احمد یار

ابتداء

ماہ نو کی قدیم روایت یہ رہی ہے کہ اس کا فردری کا شمار دیا وغالب کے لئے وقف ہوتا آیا۔ گزشتہ تقریباً ۲۸ برس کے طویل عرصہ میں ہم نے غالب کے متنازع ہنر کو دلچسپی سے دیکھنے کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف علمائے ادب اور غالب شناسوں نے بار بار کیا ہے۔ غالب کی صد سالہ برسی کا خیال بھی سب سے پہلے ماہ نو ہی نے ادب نوازوں کے کان میں بھونکا تھا۔ اور فروری ۱۹۶۹ء میں صد سالہ برسی کے موقع پر ایک شاندار غالب نمبر پیش کر کے ادبی انجمنوں اور اداروں کے لئے اس راہ کو کھولا تھا۔ خدا کا شکر کہ ہماری سعی مشکور ہوئی اور غالب کی صد سالہ برسی جس تڑک وا خشم سے تمام دنیا میں منائی گئی اس سے ہمارے ادب کو اور تاریخ و ثقافت کو بڑی نقویں پہنچی۔ غالب نمبر نکالنے کے بعد ہم نے اس چراغ کو بجھنے نہیں دیا اور آئے والے سالوں میں بھی ہمارے فردری کے شماروں میں ایسے گزراں بہا مقالات و مضامین غالب کے فکر و فن پر شائع ہوتے رہے جن سے ادب نوازوں اور غالب پر تحقیق کرنے والوں نے بہت کچھ استفادہ کیا اس سلسلے میں ہم اپنی قارئین کی توجہ ان طویل بحثوں کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جو غالب کی صحیح تاریخ پیداؤں کے متعلق ماہ نو کے صفحات میں اہل علم و ہمت و نجوم کے ماہرین کے ماہین ہوتی رہی تھیں اور بالآخر فروری ۱۹۷۰ء کے شمارے میں نامور ادیب و ہمت داں جناب سید صدیق حسین رضوی نے اپنے گرانقدر مضمون میں اس بحث کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور غالب کی صحیح تاریخ پیداؤں ۸ جنوری ۱۹۷۰ء بروز یکشنبہ سیاروں اور قمر کے مواضع سے دقیق رائجوں اور حساب سے ثابت کر دی یہ ایک ایسا فاضلانہ فیصلہ تھا جسے بڑے بڑے ہمت داؤں نے تسلیم کر لیا۔ یہ سب یکٹیں ماہ نو کے صفحات میں بکھری پڑی ہیں۔ ہمیں داد کی طلب نہیں البتہ اتنا ضرور ہے کہ ہمارے کرم فرماؤں کو ہمیشہ کی طرح فردری کے ماہ میں غالب پر اپنے گرانقدر مضامین بھیجنا یا درکھنا چاہیے۔ ہم اپنے گزشتہ شماروں میں بار بار اہل قلم کی توجہ قائد اعظم صدی کے لئے ماہ نو کے خاص نمبر کی طرف دلا چکے ہیں۔ کچھ لوگوں نے بڑی مہربانی سے دست تعاون بڑھایا ہے مگر بہت سے اجاب نے ابھی توجہ نہیں دی۔ ہماری درخواست اپنے قلمی معاونین سے مکرر یہ ہے کہ وہ بابائے قوم کے شایان شان نمبر نکالنے کے لئے جلد تعاون پر کمر بستہ ہو جائیں۔

اس شمارے کی ابتداء ایک نعتیہ گیت سے کی گئی ہے۔ نعتیہ گیت ہمارے ادب کا بڑا متبرک سرمایہ ہیں اور ان سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک سے دلیانہ محبت کے جذبات پیدا ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ مختلف بولیوں اور علاقائی زبانوں کے نعتیہ گیتوں کو جمع کر لیا جائے اور ہمارے ملک میں عنقریب جو بین الاقوامی سیرت کا نفرین منعقد ہو رہا ہے اس موقع پر اسے شائع کیا جائے۔ ان نعتیہ گیتوں میں بعض بڑے اہم اور نامور شعراء حسرت موہانی، مصطفیٰ خیر آبادی اور بقیدم دارنی وغیرہ کا وہ کلام بھی آجائے گا جس سے نئی نسل کے کان نا آشنا ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ماہ نو کا دبیر نمبر سابقہ روایات کے مطابق رہا اور بعض اہل علم نے اس کی بڑی تعریف کی ہے ہم ان سب حضرات کے بہت ممنون ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کی طرح ہماری اعانت جاری رکھیں گے۔

خدا کیسے یہ شمارہ بھی مرغوب قارئین ہو پ

جذباتِ عقیدت

(نعتیہ گیت)

پروین اختر

بیلی والیبل زلفاں کا ری
جنہن کی چھایا تلے جفتا ساری
کیسی سہانی رے بدریا کا ری
گیسوؤں والے میں تو رے بلہاری
شمس والضحیٰ ہے مکھ کی لالی
سورج صدقے چندرما واری
واری گلن نالے واری کہکشاں ساری
روپ والے میں تو رے بلہاری
خلق حیلے ترا بن کے پھلواری
فقر کی کلیں کرم پھولوں کی ڈاری
صورت مونی بات شہد کی پچکاری
پیاری مٹیوں والے میں تو رے بلہاری
نین کی لاج امرت رس دھاری
انگ انگ پور پوروں جل جہاری
صلی علی صلی علی توہے گئی رین اندھیاری
پریم برکھا والے میں تو رے بلہاری
اختر کاٹوں کیسے جیون کی دوہریا بھاری
درسا کو تڑپت میں اوگن ہاری
پھیر و سنجریا ہماری اور محبوب ہاری
لاج بھرے نین والے میں تو رے بلہاری

نیساں اکبر آبادی

اسیے بھی ہیں راہ حق میں جبری رُخ جانب طوفاں کرتے ہیں
 جب وقت پڑے تو ساماں کیا وہ نذر دل و جاں کرتے ہیں
 شبیر کا لشکر دیکھو تو بچے بھی ہیں ان میں بوڑھے بھی
 کیا جنگ کی یہ ہی صورت ہے یوں جنگ کا ساماں کرتے ہیں
 اسلام کا تھا اک نقش مگر کچھ مدھم سا کچھ سا وہ سا
 شبیر خود اپنے خوں سے اُسے رنگین و نمایاں کرتے ہیں
 باطل کی بھیس تک آندھ بھی ٹکل کر نہ سکی شمع دین کو
 ہے نور زمانے میں پھیل اِس طرح فروزاں کرتے ہیں
 ایک ایک ستارہ ڈوب گیا گردِ اون امامت کا پھر بھی
 اسلام کی دنیا روشن ہے اِس طرح چراغاں کرتے ہیں
 اِس گھر کے تو چھوٹے بچے بھی کچھ کم نہیں بہت میں نیسیاں
 ساحل کے سکوں کو ٹھکرا کر رخ جانب طوفاں کرتے ہیں



زمزمہ شاعری کی نئی آواز

ڈاکٹر اسد الریب

تجدد پسند طبیعت کا بھی۔

غالب اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے اردو غزل میں خیالات کی وحدت اور شعور کی رو کو برقرار رکھنے کی سعی کی۔ یہ تجربہ اس دور کے مصحفی اور آتش کے ہاں بھی ہے۔ مگر محدود ہے، مستقل اور مسلسل نہیں۔ غالب کو اپنے معاصر فنکاروں پر سو عقلی برتری حاصل تھی، اس کا منطقی لازمہ بھی یہی تھا کہ وہ حسرتِ تعمیر سے ہاتھ نہ کھینچیں۔ غالب سے پہلے اردو غزل نے کئی مرحلے طے کر لئے تھے۔ مسلسل سفر اور سفر کی یکساں کیفیتوں نے اس کے چہرے پر شکن کے آثار پیدا کر دیئے تھے۔ جیسے کسی در ماندہ رہرو کے چہرے پر زندگی کی توانائی اور بھرپور لذت نہیں آتی۔ اردو غزل کے چہرے پر بھی انمحلا ل کے یہی آثار نمایاں تھے۔ غالب نے اپنی آسمانی فراست اور حکمت سے شاعری کے اس انفعال کو دور کیا۔ اردو غزل میں انہوں نے جو تجربے کئے وہ تجربے اسی احساس کا حاصل ہیں۔ غزل تو پھر غزل ہے: اس عہد کے زمزمہ شعر کی سب سے زیادہ دلنشین آواز، غالب نے تو اردو قصیدے کو بھی سنبھالا دیا۔ موعظا اور ذوق نے قصیدے کے چہرے کو غیر منطقی اور مصنوعی خیالات کی جس ضرب سے بگاڑ رکھا تھا، غالب نے اس کا بھرپور علاج کیا۔ تمثیل کے طور پر ایک ایسا قصیدہ لکھا، جس کی تشبیہ (چہرہ) کو

شاعری کی بنیاد اگلے زمانے کے عالموں نے اُس جذبے پر رکھی تھی، جسے وہ جان کہتے ہیں۔ مگر اعلیٰ درجے کی شاعری کے لئے علم اور علم کے لئے تدبیر انہماک کی بھی ضرورت ہے۔ شاعری لڑکوں کا کھیل نہیں۔ اور نہ ہی اُس کم ظرف بڑھیا کا تھن ہے جو کاتا اور لے دوڑی۔ یہ مراحل صرف وہی لوگ طے کر سکتے ہیں جو موضوع شاعری کے بنیادی خیالات اور اس کے فکری پس منظر سے بخوبی آگاہ ہوں۔ اور اس فلسفہ علم کے کامل منتہی بھی ہوں۔ ایک گزشتہ اور دوسری یہ گزشتہ تھی، ان دو صدیوں میں اردو کے تین بڑے شاعر، غالب، انیس اور اقبال گزرے ہیں۔ ان تینوں کی کہانی، عظمت و انفرادیت کے اعتبار سے کم و بیش یکساں ہے۔ ان تینوں نے اپنے عہد کے پرانے سانچوں کو، کاری ضربیں لگا کر اپنی جدت پسند طبیعت کے مطابق ڈھال لیا۔

غالب کا ذہن بھی ان فنی تقاضوں کی آماجگاہ رہا۔ انہوں نے اپنی عقلی برتری اور اپنے حکیمانہ شعور کی بدولت، اپنے عہد پر فتح حاصل کی۔ وہ غالب ہے اور ان کا زمانہ مغلوب۔ انیسویں صدی سے لے کر آج تک جب کہ بیسویں صدی نے شعری ارتقا کے کئی مدارج طے کر لئے ہیں، غالب کو بلا اختلاف اور بے شک و شبہ ایک بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس بڑائی میں اُس کی فرزانگی کا بھی ہاتھ ہے۔ اور اُس کی

اردو شاعری کا فکری سرمایہ کہنا چاہیے۔ یہ قعیدہ (دہر جز جلاوہ یکتائی معشوق نہیں) اردو کے آفاق میں خیالات کی ایک نئی دنیا ہے۔

غالب اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے غزل کے قریب تر رہ کر، اظہار کے تسلسل کا خاص اہتمام کیا، اور اس خوبی کے تغین میں بعض معروضی رابطے بھی استعمال کئے۔ ردیف و تواتر کو ایک ایسے ڈھنگ سے چننا جو مصنوعہ خیال کے ساتھ کمنہ طور پر ہم آہنگ ہوں اور اظہار کے معاملے میں نفس معنوں کی پیشوائی کریں۔ اس خوبی کی بہترین مثال وہ غزل ہے جس میں عظمت بشر ہزارہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس عظمت کا مظہر خاص قرار دیا ہے اور کہا ہے: اصل ہستی میں ہوں مخلوق میں میرے آگے کسی کی پیش نہیں جاسکتی باز یہ پچھو! اطفال بے دنیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اور نگہ یکساں مرے نزدیک

اک بات ہے اعجاز میاں مرے آگے

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور

جز وہم نہیں ہستی اشیاء مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گردیں صحرائے بھوتے

گھستا ہے جیسے خاک پر دیارے آگے

نفسیاتی رجحان کے تسلسل کو برقرار رکھنے اور فکری سلیقے کو

ہموار و یکساں کرنے والی غزلیں وہ ہیں، جن میں غالب کی شاعرانہ

عظمت کا سراغ ملتا ہے۔ ان غزلوں کو ملاحظہ کیجئے تو ایک عظیم تر

غالب ہاتھ آتا ہے۔ ایسی چند غزلیں وہ ہیں، جن کی ابتداء درج

ذیل مطلعوں سے ہوتی ہے۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے

کیا ہوئی ظالم تری غفلت شاعری ہائے ہائے

رہنے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

ہم سخن کوئی نہ ہوا اور ہم زبان کوئی نہ ہو

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

جوش قدح سے بزم، چڑھاں کئے ہوئے

ظلمت کدے میں میرے شب بزم کا جوش ہے

اک شمع ہے دلیل سحر، سو خموش ہے

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی

میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

یہ وہ غزلیں ہیں جن میں طبیعت کے یکساں رجحان کو غلبہ حاصل ہے

ان میں خیالات کی بے ربطی اور ذہنی تلون کی کوئی کیفیت نہیں۔ نہ ان

میں کوئی فکری تردید لگی ہے۔ نہ خیالات کا کوئی تعادم ہے۔ ہر غزل واقعات

دارات کے کئے ہوئے سانچے میں ملتی ہے۔ شعور کی سطح ہموار رکھنے

کے لئے مخاطب کی ضمیریں بھی ان میں یکساں ہیں۔ اظہار معنوں میں لہجے

کی نثری خصوصیات کو قائم رکھنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ ایسے

لفظوں کا بندوبست کیا گیا ہے جو عام طور پر جملوں کی نثری ساخت میں

استعمال ہوتے ہیں۔ یہ لفظ صرف لفظ ہی نہیں، مکمل کلمے کی صورت

میں، لہجے کے مختلف وقفوں میں رابطے کا کام بھی سرانجام دیتے ہیں۔

”کیوں ہو؟“ ”کیوں نہ ہو؟“ ”اچھا۔ نہ جانیں۔“ ”تھاکیا۔“ ”ہو

کیوں؟“ ”سہی؟“ ایسی قبیل کے کلمات ہیں۔

درج ذیل مثالوں میں لہجے کی ان خصوصیات کو ملاحظہ کیجئے،

نظا لا چاہتا ہے کام کیا طغوں سے تو غالب

ترے بے ہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟

اُمس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں ساد

اس میں ہمارے مرے، قیامت ہی کیوں ہو؟

نفس میں ہوں اگر اچھا ہی نہ جانیں میرے شیون کو

مرا ہوا برا کیا ہے، نفا سخیاں گلشن کو

گھر میں غنا کیا؟ کہ ترا غم اسے غارت کرتا

وہ جو رکھتے تھے ہم، اب حسرتِ تعمیر سوچے

بہت ہی غم گیتی، مشرب کم کیا ہے

غلامِ ساقی کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے

بعض غزلیں تو خیالات کے ایسے ربط و ضبط اور بیان کے ایسے
نسل سے لکھی گئی ہیں جن میں زمانے کی ایک بھرپور وحدت کا احساس
ہوتا ہے۔ جیسے یہ غزل:

کرتا ہوں جمع پھر جگر طلت لخت کو
عمر ہوا ہے دعوتِ مزاں کئے ہوئے

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

پھر گرم ادا مانے شرر بار ہے ہوس
مدت ہوئی ہے میر چراغاں کئے ہوئے

پھر پیشِ جراحِ دل کو پہلے عشق
سامانِ صد ہزار نمکِ داں کئے ہوئے

ان غزلوں کا جو سانی سانچہ ڈھالا گیا ہے۔ اس میں جذبات کی
مکمل کہانی ملتی ہے اور اس کہانی کو جس طرح کہا گیا ہے وہ نثری لب و
لہجے کا خوبصورت اسلوب معلوم ہوتا ہے۔

غزل کی ایک روایت یہ بھی تھی کہ اپنے جذبے کو براہِ راست
اپنی زبان سے ادا کیا جائے۔ اس اظہار کے کئی تمثیلی پردے تھے۔ یہ
جواب دراصل تہذیبی جواب تھا۔ جس نے عشق کی موس اور شاعرانہ
زندگی کو علی الاعلان ہونے سے روکا۔ اسی جذبے سے محبوب کا شخص
بھی قائم نہیں ہونے دیا۔ لیکن غالب نے اس شخص کو قائم رکھا۔ براہِ راست
اظہار بھی کیا۔ بعض غزلیں تو اس حد تک راست اظہار کا ذریعہ بن گئی ہیں
کہ ان کو مستحکم حاضر کے لہجے میں لکھا گیا، جیسے یہ غزلیں:

مکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں

میں دشتِ غم میں آہوئے عیاں دیدہ ہوں

ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجددِ لاگ

سنے دانہ فتادہ ہوں۔ نے دام چیدہ سوں

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ

ہوں میں کلامِ لغز مئے ناشنیدہ ہوں

اہلِ دروغ کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
پر ماصیوں کے حلقے میں میں برگزیدہ ہوں

عشق مجھ کو نہیں، دشت ہی سہی

میری دشت تری شہرت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی

اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے

غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں

نہ سہی عشق، معیبت ہی سہی

اشعارِ غزل کی ایک معروضی صورت یہ بھی ہے کہ وہ باہم
معنوی مشابہت نہ رکھتے ہوں۔ غزل کے شعروں کی ایک تعریف
یہ بھی ہے کہ وہ مربوط نہ ہوں اور طشتِ غزل میں وہ لخت لخت
دکھائی دیں۔ لیکن غزل میں امکانی وحدتوں کے برقرار رکھنے کا جو
تجربہ غالب نے کیا تھا وہ اتنا مقبول اور کامیاب ہوا کہ اردو شاعری
اپنا مزاج تبدیل کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ چنانچہ آج کی نئی غزل لایکی
غزل سے بالکل علیحدہ دکھائی دینے لگی۔ اس امتیاز و انفرادیت کو
وحدتِ انکار کے عمل نے تعمیر کیا۔ غالب کے بعد، فانی اور پھر فانی
کے بعد اقبال کے ہاں اس حسن کی جلوہ سامانی عام ہے۔ ان شاعروں
کی بعض غزلیں تو اس حد تک افسانوی تسلسل، واقعات کا ربط،
تخیل کی یک رنگی اور تاثر کی وحدت لئے ہوئے ہیں، جیسے نظم کے
تقاضوں کا حاصل ہونا چاہیے۔ غالب کے دور میں اس تجربے کی
ایک صورت کا نام قطعہ بندِ دق، بھی تھا۔ اگر خیالِ غزل سے
باہر، ایک الگ اکائی کی صورت میں ہوتا تو قطعہ کہلاتا اور اگر
غزل کے اندر واقع ہوتا تو قطعہ بند کہاجاتا۔ دیوانِ غالب میں
ایسے کئی تجربے ملتے ہیں، غزلوں میں بھی اور غزلوں سے باہر بھی۔

غزل

جلیل عالی

جو اعتبارِ دلِ دوستان گنوا بیٹھے
گر نیز ربط میں خود سے بھی دور جا بیٹھے
کماں بدست ہیں سوئے ہمائے وقت بھی
کہ جانے تیر نشانے پہ کونسا بیٹھے
کشیدہ سر ہیں اب اپنے بھی روبرو کہ بہت
پریش خلقِ ستمگر جبیں جھکا بیٹھے
وہ بات کہتا ہے کچھ ایسے اہتمام کے ساتھ
کہ نقشِ سب کے دلوں پر جدا جدا بیٹھے
خود اپنا ہاتھ پکڑ کر نکل پڑو عالی
نہ یہ کہ کرتے رہنمٰں خضر کا کلا بیٹھے



اس تجربے کی نشان دہی کا سب سے بہتر مقام وہ ہے جہاں قید ہستی کے
ذکر کو بنیاد بنا کر یہ کہا گیا ہے :

دل - حریتِ آرزو کا گہوارہ، روح کا سرچشمہ ہے۔ جسم نے
اسے اپنا قیدی بنا رکھا ہے۔ یہ روح کے باغِ رضواں کا طائرِ خوش نصیب
ہے، قیدِ ہستی میں ناحق گرفتار ہو گیا۔ اس کی آزادی، پرواز میں ہے
جس دن اسے سوزِ ہستی جلاوے اور یہ جل جائے، اس طائر
کے نئے پروں بالِ تکمل آئیں گے اور یہ طوہلی کی طرف پرواز کر جائے گا۔
مکمل اشعار یہ ہیں :

اٹھا اک دن بگولا سا جو میں کچھ جوشِ وحشت میں
پھر آئیمہ سر گھرا گیا تھا، جی بیاباں سے
نظر آیا مجھے اک طائرِ مخرج و پرست
چلکتا تھا سر شوریدہ، دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کروا کا کام، آخر ماجرا کیا ہے
پڑا ہے کام تجھ کو کس سنگِ گرفتِ جلاں سے
ہنسنا کچھ کھل کھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یوں رویا کہ جوئے نثریں بھی پلوں کے دھان سے
کہا میں صید ہوں اس کا، کہ جس کے دم گریبوں
پھنسا کرتے ہیں طائر، روزِ آگر باغِ قنواں سے
اُسی کی زلف و رخ کا دھیان ہے، شامِ ذکرِ کچھ کو
نہ مطلب کفر سے بے اور نہ کچھ کام ایماں سے
پوچھم غور جو دیکھا، مرا ہی طائرِ دل تھا۔۔۔
کہاں کر ہو گیا تھا خاک، اپنی آواز سوزاں سے
”از نسخہ طاهر“

یہی وہ فکری اور فنی راہیں ہیں جہاں غالب کے قدموں کے
نشان الگ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ شاعری کے نگارِ خانے میں نئی
تصویر اور شاعری کے زمزمے کی نئی آواز ہے۔

غالب اور تقلید عرفی

ڈاکٹر محمد ریاض

شمس العلماء مولانا حالی کی "یادگار غالب" اب بھی مطالعہ غالب کے سلسلے میں ایک اہم کتاب ہے۔ مرزا غالب کے فارسی کلام پر تبصرہ کرنے کے بعد حالی لکھتے ہیں:

ان کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری کے گنگ بھنگ اور ظہوری سے بڑھا ہوا، مثنوی میں ظہوری کے گنگ بھنگ اور عرفی و نظیری سے بالا اور نثر میں تینوں سے بالاتر ہے۔

حالی کے اس محاکمے اور تبصرہ پر اظہار نظر کرنے سے پہلے مولانا کے فرام کر: موازنے کو ملاحظہ کرنا چاہیے مگر وہ نادر و گھمبہ صدق ہے، اور اس کی بڑی وجہ ذوق زمانہ کا خیال رکھنا ہے۔ غالب کی فارسی غزل کے ذکر سے:

"مرزا کی غزل شعرا نے ایران کے کون سے طبقے کی غزل سے مناسبت رکھتی ہے اور ان شعرا اور مرزا کی غزل میں کیا نسبت پائی جاتی ہے۔"

حالی نے نظیری نیشاپوری (۱۰۲۱ھ) اور ظہوری نیشاپوری (۱۰۲۴ھ) کو ایک ایسے غزن سے غالب کی غزل کا موازنہ کیا اور عرفی اور دیگر شعرا کا موازنہ اس لئے نہ پیش کیا کہ ان کے دواوین دست یاب نہ تھے۔ لکھتے ہیں:

"اگرچہ مقتضائے عادیہ تھا اس موقع پر مرزا کی چند غزلوں کا موازنہ ان سب لوگوں کی غزل کے ساتھ کیا جاتا جن کی غزل پر مرزا نے اپنی غزل، بلکہ اپنی شاعری کی بنیاد رکھی۔ یہ یعنی عرفی نظیری ظہوری اور غالب آملی وغیرہ مگر..... طبائع کو ان قسم کی تدقیقات سے کچھ دستیابی بھی نہیں معلوم ہوتی۔"

غالب کے اس زمانے میں سمورت حال بدل چکی ہے۔ دواوین شروع دستیاب ہیں اور ایسی تدقیقات سے کچھ ایک عام بات ہے۔ اس فرمت میں ہم مختصر دیکھیں گے کہ سید محمد جمال الدین عرفی شیرازی (م۔ ۹۵۵ھ) نے غالب کی فارسی شاعری پر کیا اثر ڈالا۔

غالب نے فارسی زبان اور ایرانی نثر اور شعر کا کافی متبہ فرمایا اور اپنی غزلیات کے مقطعوں میں ایسے شعرا کا ذکر بھی کر دیا۔ شیخ سعدی، حافظ شیرازی، عرفی، فنای، ظہوری، صاحب تبریزی اور ابن عربی کا اس کے ہاں خصوصی ذکر ملتا ہے۔ عرفی کے ذکر کا نمونہ دیکھ لیں:

قافیہ غالب چو نیست، پریں ز عرفی
گر من فرنگ بودی چہ غمتی

کلیات فارسی کے خاتمے میں غالب نے لکھا ہے: ”شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی محمد کوختائی - عرفی شیرازی اور طالب آملی کی غضب آلود بیگاہ لے، آوارہ اور مطلق العنان پھرے کا مادہ جو مجھ پر تھا، اس کو فنا کر دیا۔“ ایک جگہ کلیات فارسی کے دیباچے میں، البتہ عرفی اور زلالی خوانداری کو خاطر میں نہیں لاتے:

سج شوکت عرفی کہ بود شیرازی
مشو اسیر زلالی کہ بود خوانداری
بسو منات خیالم در آیتا بیسی
روان فروش برودر شہای ز تازی

بہر حال پیرامرو واضح ہے کہ عرفی شیرازی، غالب کے محبوب شعرا میں سے ہے اور اس کے قصائد و غزلیات نے مرزا کے اسلوب پر اثر ڈالا ہے۔ نثر میں عرفی نے بظاہر صرف رسالہ ”نقیضت“ لکھا ہے۔ غالب کی نثری تحریروں میں کثرت و وفوف کے اعتبار سے نقیضت عرفی کے اس رسالے پر فائق ہیں۔ یہیں اشعار سے البتہ موازنے پیش کرتے ہیں:

کلیات عرفی کا ابتدائیہ (ضمناً عبدالرحیم خانخانا کی

مدح) ہے۔

عرفی ہمہ لای، بدعا نیز قلم شو
بشباب کہ میدان نشو و تنگ رقم را
اسی زمین میں عرفی کی ایک معروف لغت ہے:

اقبال کرم می گزوار باب ہم را
ہمت بخوردن پشتر لا و نعم را
ہر چند کہ در کشمکش جاہ و مناصب
گناہ نبودند ہمہ دودہ ہم را
از نقش و نگار درود دیوار شکستہ
آثار پندید است صنادید عجم را
باگوہر آدم نسیم باز نہ استند
ز آبای خود بہ شرم اصحاب کرم را
دوران کہ بود تا کنڈ آرایش مسند
مداح شہنشاہ عرب را و عجم را
آرایش ایوان نبوت کہ نہ تعظیم
خاک در اوتاج خرف داد قسم را

میرزا غالب نے بھی بتقلید عرفی دو مختلف قصیدے لکھے ہیں۔
حضرت عباس بن حضرت علی کی منقبت میں ایک قصیدہ کے چند ابیات
مندرجہ ذیل ہیں:

آوارہ غربت نتوان دید صنم را
خواہم کہ دگر جگہ سازند حرم را
نازم بہ صنیعہ نہ کہ شاہان جہاں جوی
ہم بر در آن خانہ گزارند حشم را
سیم و نذر وعلی و گہران بکہ ازین چار
اوتا دلجو طالع تو فقیق کرم را

ای داشتہ در سایہ ہم تنیق و قلم را
وی ساختہ آرایش ہم علم و کرم را
جم مرتبہ خانخاناں کہ اثر فطقی
چو گل بہنگی گوشش کند جذام را
انصاف بدہ بوافرج و انوری امروز
بہر غنیمت نشاندہ عدم را

۱۔ کلیات فارسی غالبہ مطبوعہ مجلس ترقی ادب جلد سوم صفحہ ۳۵۰۔ ۲۔ دیکھیے کلیات عرفی مرتبہ غلام حسین جواہری مطبوعہ تہران ۱۳۵۰ء کلیات عرفی صفحہ ۵۔ ۸۔

رو بہت از آن تشنه جگر جوی کا زہر
 بترنگی شاہ فدا ساختہ دم را
 عباس علمدار، کہ فرماں شکوہش
 باز بچہ طفلان شہر شوکت جسم را
 غالب کا دوسرا قصیدہ، نواب وزیر محمد خان بہادر کی مدح میں ہے۔
 اس طویل قصیدہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

ای ذات تو جامع صفت عدل و کرم را
 دی بر شرف ذات تو اجماع امم را
 صد غوطہ بہ زمزم نہ دہ از بہر طہارت
 تا رخصت پا بوس تو دادند قسم را
 وقت است کہ این جمع بہر کوچہ و بازار
 پر سبز زہم منشا رسوای ہم را
 در خشم سخاوت نکتہ قطع کہ زابر
 بیرون نبود برق نقضای کرم را
 آہنگ دعا چنگ و نی و عود و نحو احمد
 اہلشیم این ساز گنم نالی قسم را
 تا چرخ کشد محل جسیں، بقا باد
 نواب فلک محل جسیں شہنم را

” حسب حال از غولیتن“ کے عنوان سے عرفی کا ایک ذوق مطلع قصیدہ

بڑا معروف ہے۔ اس کے انتہائی ہماری بعض یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ اس قصیدہ میں عرفی نے بڑی قادر کلامی کثوت دے کر خود ستارہ کے علاوہ بعض حقائق و محارف جمع کر دیے ہیں۔ چند ابیات ملاحظہ فرمائیں۔

رفتم ای غم ز پی عمر شتابان رفتم
 بشتاب ار طلبت ہست زمیں بان رفتم

مشتاب ای غم دنیا کہ مجھ کو نر سی
 بکن از دور و داہم کہ شتابان رفتم
 ایہا الناس بگو تید مبارک با دم
 کہ منم خانہ تن، در حرم جان رفتم
 الوداع ای میں درد کش پہنوش دوست
 کائیک از خوشیا بہ بوی می رہبان رفتم

تجدید مطلع

از دور دوست چگویم بچہ عنوان رفتم
 ہمہ شوق آمدہ بودم، ہمہ حرمان رفتم
 ایں ہمہ رفتم و رفتم کہ شمر دم عرفی
 بقاضای ردیف از پی بہت ن رفتم
 داود و دش بددشا قدر اندر رہم
 با شنای تو و نفری حسودان رفتم
 راہ جید شنای تو سپردم این راہ
 نیست راہی کہ توان گفت بہ پایان رفتم
 رہ نفیرین حسودان تو رفتم لیکن
 آن نیر نہ کہ بگویم بچہ عنوان رفتم

اس قصیدہ کے تتبع میں غالب کا ایک زور دار قصیدہ ہے

جس میں بادشاہ اودھ، نصیر الدین حیدر کی مدح کی گئی ہے:

” در مدح شاہ جنت مکان، نصیر الدین حیدر، سلیمان جاہ
 بادشاہ اودھ“۔ غالب نے تجدید مطلع تو نہیں کیا مگر عرفی کی زمین پر
 خوب طبع آزمائی فرمائی ہے منتخب ابیات ہیں:

گر نہ سنبلی کوہ روضہ رضوان رفتم
 ہوس زلف ترا سلسا چنبان رفتم

کار فرمائی شوق توقیب مت آورد
مردم دواز باجیب و دل و جان فستم
حالم از کثرت خوابدنی در باب
که بتاراج جگر کاوی مژگان فستم
نموان متنت جاوید گوارا کردی
ہچنان تشنہ ز جشتم حیدان فستم
پایم پرا با دوقی سفر افزد و مرا
درہ بیداری بلا ازین دندانی فستم
حالی من بنگر و از عاقبت کار میرس
عمر خود گشتم و در غصہ بہ پایان فستم
سعی در باب رملی بنو ذخیرت
دودا ہی شدہ از روزن زندان فستم
چہرہ اندودہ برگرد و فرہ آغشتہ بکنون
خود گوارا ہم کہ زد صلی بچہ عنوان فستم
گاہ از ولولہ تارنش جاوہ رنمی
سخن خود شدیم و تا بر صفایان فستم
از جفای فلک آہنگ نظم کردم
بدر بارگہ خسرو گیسوان فستم
شاہ جمہ کہ دولت بدرش ناصریت
ہجو دولت بدرش ناصریت فستم

حکیم خانانی خروانی (م ۱۹۵۵ء) کے ایک معروف قصیدہ (جزوی طبع)۔

نعتیہ کا مطلع ہے :

صبح دم چمن بکھند آہ و دود آسائمن
چمن شفق و زخون نشینم شب پالائمن

کئی متنا خورشعرا نے اس وزن اور زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ عارفی شیرازی نے
ایک قصیدہ میں خانانی کی تقلید کی داد دی ہے مگر یہاں ہم مقابلے اور موازنے
کی خاطر شاعر نقل نہیں کر سکتے۔ عارفی بانداز فخریہ فرماتے ہیں :
دو عشق را از من گرامی تر نژاد
جو ہر من کرد و در پیش گوہر آبائی من
تازش سعدی بشت خاک شیراز زچہ بود
مگر نبود اگر کرد و مولود و ماوی من
غالب کا ایک قصیدہ عارفی کی تقلید و نتیجہ میں کہا گیا ہے دو شعر ملاحظہ

ہوں :

زان نمی تو رسم کرد و فخر و دینج جائی من
دای گرا باشد ہمیں امر و زمن فروای من
رند و در آشا غالب نام درستی گری
پارہ مشک و گلاب افز و دو صہبائی من

قصائد کی تقلید میں اب ہم آخری مثال پر آتے ہیں عارفی کا ”حکیم و
نصائح و پندیات“ کا حاصل ایک قصیدہ ہے حدشہور ہے اور کئی شعرا نے
اس کی تقلید کی ہے۔ اس نو مطلع قصیدہ کے منتخب شعرا ملاحظہ ہوں :

ز خود گردیدہ بر جدی بر آئم کام جائی من
ہمان کز اشتیاق دیدش زاری ہمالی من
خود دلاوی و انگ تو شان قد و رخ سخی
ہما و آشیان و انگ تو فراشیائی من
سر روحانیاں داری دل خود را ندیدی
بخواب خود دلا تا قبلہ روحانیائی من
غزل پر دازم ایک از و بیت خود و مطلع
کم مطلع کہ حس آفتاب از فرقان بسیخی

بجواب خود در گنج قبلہ روحانیان بینی
 بہین در آئینہ آتش صدخانان بینی
 بو غلط اندر شواہد غزل عرفی تر نیم بس
 و شریعتی از آخردن خود چون حیلانی
 شعرا ملت اسلامیان بگذار اگر خواہی
 کہ دھوپ مغانی داسر ارہسان بینی
 بدام اندک شیدائیل معنی ظاہر دولت
 تو در زیر درختان بچو غلطان آشیان بینی
 تو خیزندیش خلقی پس چنین باید دعای تو
 کہ یارب آنچه بہ خلق اندیشی، ہمان بینی
 فدا تلخ تری زن چو ذوق نغمہ کم یا بی
 حمدی را تیر تری خواہم چون محل زگران بینی

اس کی تقلید میں غالب کا مذہبی قصیدہ جس کا مطلع واحد ہے۔ یہ
 قصیدہ غالب کی ہماریت فن اور ان کے لطیف مذہبی احساسات کا منظر ہے۔ ہم
 بغرض معائنہ عرفی کے متقوہ اشعار کے مقابل مثالیں نقل کرتے ہیں:

بیاد کر بلا تا آں سنمکش کاروان بینی
 کہ دودی آدم آں عجا راسا رہا بینی
 ہنشد کاروان را بعد غارت رخت و کالا
 نہ بازم بود گر ناتہ را محل گران بینی
 زمین کش چو فرسائی قدم بر آسمان سائی
 زمین کش چو گردی پا بفرق فرقہ ان بینی
 علم بگردن خاک رہگذرا افتادہ گر خواہی
 کہ بردوی زمین میں پیدا نشان کہکشانی بینی
 چہ دندان در جگر افشردہ باشی کاندلانی
 جیش جن شکی لا در شمار کشد جان بینی
 نیاری گردان کوشی کہ پایش در رکابی
 زمین گیر خود آن غلبی کہ دستش بر عنانی بینی

گر از آہن بود گو باش غم بگذازد آہس را
 سنان را ہم ز دنیا بی چو در مکان خوشچکان بینی
 بود تا نگاہ ناز از مرزش پشردھقان را
 ضربی سوسوی ہند از خاک آن شہدوان بینی
 تعالی اللہ صریح فرخ فرخندہ فرجامی
 کہ فرتاب فروغ فرخی از وی میان بینی
 ضیائی زان زیارت گاہ بروی زمین باد
 کہ خاک لکھنؤ را مردم چشم جہان بینی
 قصیدہ کے بعد اب غزل کی باری ہے۔

عرفی کی ایک غزل کا مطلع ہے:

دار صحبت ما بر حدیث زیر لبی است
 کہ اہل ہوس عوامند و گفتگو عرفی است

یہ غزل خواہہ حافظ کی ایک دلپذیر غزل کے جواب میں ہے اور
 دیگر شعر نے بھی اس کے جوابات لکھے ہیں۔ قابل نظر نکتہ یہ ہے کہ غالب کا جواب
 عرفی سے اقرب اور بظاہر اسی کی غزل کے جواب میں ہے:

عرفی

کہ لاف حسن ادب زدگو بہ نرم مخان
 بیا کہ آئینہ دہ دست شیشہ علی است
 اگر بہ دختر زردین دل ہر افشاں
 ملا متہم نکند کس، جوانی و عذابی است
 با آسمان و زمین چشم ناز کو دک است
 صلاح کار ہمیں ترک مدعا طلبی است
 قدم بیرون منہ از جہل نہ افلاطون شو
 گر گریبانہ گزینی، سر آب تشہہ لبی است

۱۔ کلیات عرفی صفحہ ۲۱۱ تا کلیات فارسی غالب جلد دوم صفحہ ۳۲۷

۲۔ کلیات عرفی صفحہ ۲۹۴

قبول خاطر معشوق شرط دیدار است
بحکم شوق تماشا کن کہ بی ادبی است
نگویمت بکرو عسایانہ جگویم
بہوش ہاش کہ انکا کش بولہی است

غالب

ظہور بخش حق ملاذریہ بی سببی است
وگرہ شرم گنہ در شمار بی ادبی است
زگیر و وارچہ غم چون بعلیکہ منم
ہنوز قصہ حلاج حرف زیر لبی است
بود بطالع ما آفتاب تحت الارض
فروغ صبح ازل در شراب نیم شبی است
عبودیت رکن اقتضای خواہش کام
و عاصیغہ امر است و امر بی ادبی است
بالغات نیرزم در آرزو چہ نزاع
نشاط خاطر مفلس نہ کیا طلبی است

آخر میں ایک ایک غزل کا انتخاب موانے کی خاطر دیا گیا جا رہا ہے۔
ہمارے خیال میں ان ہی دو غزلوں میں غالب نے عرفی کا اثر قبول کیلئے اذکار

عرفی

آن شیوہ کہ خار نگر صد قافلہ جان نیست
در سلسلہ حسن تراش نام و نشان نیست
بی لطیفش از ترک ستم کشتہ یقیسنم
این تلخی جان کند نم از نیر و کان نیست
در روز جزا دست شہیدان محبت
و سخی است کہ گیرندہ دامان غنی نیست
دل صاحب دردی است کہ دوش پیون
با آہ خراشیدہ دل مایہیان نیست
ز ہزار نگر کہ ہرہنگی بغرو شدند
آن گوہر زایا کہ در بچہ دکان نیست

تو مید مشو عرفی و انگندہ عنان ہاش
ہر چند کہ از کعبہ مقصود نکاح نیست
غالب

دل بردن از بی شیوہ عیانست و عینیت
و انی کہ ملا بر تو گمان است و گمان نیست
فرمان تو بر جان من و کار من از تو
بی پردہ بہر پردہ رولانت و رولانت نیست
داغیم ز گشت کہ بہارست و بقا ہیچ
شادیم بگلخن کہ خزانست و خزان نیست
پہلویشکانید و بہر بیخند دلم را
تا چند بگویم کہ چہا نیست و چہا نیست
غالب ملا نظر ارگ خویش توان بود
زین پردہ بہر دن اگر چہا نیست و چہا نیست

آخری غزل میں جزوی مماثلت پائی جاتی ہے۔ غالب کی مثنویاں اور ناکا
نثر عرفی کی مثنویوں اور نثر فارسی کے واحد و سلا کے سبک سے متاثر نظر
نہیں آتی۔ مولانا حالی نے فرمایا تھا کہ قصیدہ اور غزل میں غالب عرفی کے
گہ بگہ ہیں۔ جن قصائد اور غزلیات کے تتبعات کے مختصر نمونے پیش کئے گئے،
ان کے مطابق مولانا کی اس رائے سے اختلاف کرنا مشکل ہے۔ امید ہے کہ
قاری بھی کلام عرفی اور غالب کے دروین سے ان پورے نمونوں کو متعارف
و مقابلہ کر کے ہمارے ہمہوا ہو جائیں گے کیونکہ بقول بیدل:
ہر کس اینھا از مقام و حال خود گوید غبر
از زبانم حرف او گر نشنوی، باور مسکن

حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ

اعجاز الحق قدوسی

کہا جا رہا ہے بہترین مریدوں میں سے سندھ میں ایک ہزار مرید نور بکھر گئے ہیں۔
سے فرود ملتا، چنانچہ آپ اپنے شیخ کے ارشاد کے مطابق حضرت نور بکھری
کی ملاقات کے لئے بکھر حاضر ہوئے، مگر یہ اُس وقت بکھر پہنچے، جب حضرت
نور بکھری واصل الی اللہ ہو چکے تھے۔

سلسلہ سہروردیہ کے مشہور بزرگ حضرت شیخ شہاب الدین
سہروردی (متوفی ۱۲۳۴ھ) ہیں، جو نیکو خود ایدہ ان کے پیر شیخ میاں الدین ابو
نجیب اور ان کے مرشد شیخ وجیہ الدین سہروردی کے رہنے والے تھے،
جو عراق عجم کے اندر ہمدان و زنجان کے درمیان واقع تھا، اس لئے اس
مقام کی نسبت سے اس سلسلے کو سہروردیہ کہتے ہیں۔ حضرت شیخ سہروردی
کی تعینت عوارف المعارف تصوف کی بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔
حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی نے سلسلہ سہروردیہ کی نشر و اشاعت
میں غیر معمولی جدوجہد کی، ان کے بہت سے مرید اس برصغیر میں آئے
تھے خود انہوں نے ارشاد فرمایا کہ ہندوستان میں میرے کثیر خلفاء ہیں
حضرت شیخ نور الدین مبارک غزنوی، مولانا محمد الدین حاجی، شیخ میاں الدین
رومی، قاضی حمید الدین ناگوری یہ سب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی
کے خلفاء ہیں ہیں جو میں غیر منقسم ہندوستان میں جلوہ افروز نظر آتے
ہیں، مگر سلسلہ سہروردیہ کو اس برصغیر میں جس نے غیر معمولی فروغ بخشا

حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی علیہ الرحمہ گلشن سہروردیہ کے
وہ گل سرسبد ہیں کہ جن کی خوشبو سے عرفان و تصوف کی وادیاں ہمیشہ ہمکنش
رہیں گی۔ برصغیر پاک و ہند میں تصوف کے جو سلسلے سب سے پہلے آئے
ان میں سلسلہ چشتیہ اور سلسلہ سہروردیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس
برصغیر میں سلسلہ چشتیہ کے بانی حضرت خواجہ معین الدین اجمیری علیہ الرحمہ ہیں جنہوں
نے پاک ہند میں سلسلہ چشتیہ کے فیوض و برکات کو عالم کیا، حضرت خواجہ
معین الدین پر تقوی رابع کے عہد میں تشریف لائے، اور اجمیر کو
اپنا مستقر بنا کر سلسلے کا کام شروع کر دیا، چنانچہ تدریج سلسلہ چشتیہ کا نظام
پاک پٹن سے لے کر لکھنؤ اور دہلی سے لے کر دیوبند تک قائم ہوا۔

اس کے بعد اس برصغیر میں سلسلہ سہروردیہ کے بانی حضرت
بہاء الدین زکریا ملتانی ہیں، اگرچہ ان سے قبل اس سلسلے کے پہلے بزرگ
حضرت نور بکھری سندھ تشریف لائے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلسلہ
سہروردیہ کو اس برصغیر میں جاری کرنے کا شرف حضرت بہاء الدین زکریا
ملتانی کو حاصل ہوا، وہ اس وقت سندھ پہنچے جبکہ حضرت نور بکھری کا وصال
ہو چکا تھا، حضرت شیخ نور بکھری کی عظمت کا اندازہ اس سے کیئے کہ جب
حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی کو ان کے مرشد حضرت شیخ شہاب الدین
سہروردی نے خرقہ خلافت سے سرفراز فرما کر رخصت کیا تو ان سے فرمایا

سے سارا ہندوستان منور ہو گیا۔ ملتان، سندھ اور بلوچستان کے علاقے کو تو آپ کی روحانی سلطنت کہا جاتا تھا۔

دارالشکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ :

”حضرت شیخ الشیوخ سے رخصت ہو کر ملتان آئے

اور یہیں سکونت پذیر ہو گئے، اور رشد و ہدایت کے

چراغ کو روشن کیا، بہت سے لوگوں نے آپ

کی ہدایت سے برکت پائی، اور اس دیار کے تمام لوگ

آپ کے مرید محقق ہو گئے، اس دیار میں تمام مرید

آپ ہی کے ہیں“

شیخ نور محمد بخش نے اپنی کتاب سلسلۃ الذہب میں حضرت شیخ

بہاء الدین زکریا ملتانی کی تبلیغی اور اصلاحی کوششوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :

”حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ہندوستان میں

رہنمائی اور اولیاء تھے انہوں نے لوگوں کو رشد و ہدایت

فرمائی، اور ان کو کفر سے ایمان کی طرف، محصیت سے

اطاعت اور نفسانیت سے روحانیت کی طرف لئے۔

ان کی شان بڑی تھی“

انوار غوثیہ میں ہے کہ :

”حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے وعظ سن کر سندھ اور

علاقہ ملتان اور لاہور میں اہل ہندو۔ میں سے بھی بے شمار

لوگوں نے جس میں بہت سے متمول تاجر اور بعض والیاء

ملک بھی تھے، دین اسلام اختیار کیا اور حضور کے مرید

ہوئے، اس کے علاوہ حضرت نے عالمہ خلائق کو فائدہ

پہنچانے کی غرض سے زراعت اور تجارت کے کام کو

بڑھایا، اطراف ملتان میں جہاں کہیں اچھا موقع ہوا

افتادہ جنگلوں کو آباد کرایا۔

وہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی ہیں انہوں نے سلسلہ سہروردیہ کی خانقاہیں سندھ، ملتان، پنجاب اور دوسرے مقامات پر قائم کر کے اس ریختہ میں اس سلسلے کو بام عروج تک پہنچا دیا۔

آپ کا اسم گرامی یحییٰ بہاء الدین زکریا، آپ کی کنیت ابو محمد اور ابو برکات ہے آپ کے دادا کمال الدین علی شاہ خوارزم سے ملتان آئے، اور کوٹ کروڑ و نواح ملتان میں سکونت پذیر ہوئے۔

یہیں ۵۶۶ھ میں حضرت بہاء الدین زکریا کی ولادت باسعادت

ہوئی، حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی نے علوم ظاہری کی تکمیل خراسان و

بخارا میں کی، حدیث کی تعلیم مولانا کمال الدین محمد سے مدینہ منورہ میں حاصل

کی، روضۃ اقدس نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تزکیۂ قلب اور تصفیۂ

باطن کے لئے مجاہدہ کیا، وہاں سے بیت المقدس آئے پھر وہاں سے

بعثت دہلی پہنچے، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے دستِ حق پرست

پر بیعت ہو کر فرقہ خلافت سے سرفراز ہوئے

حضرت خواجہ نظام الدین میوب الہی کا بیان ہے کہ حضرت خواجہ

بہاء الدین زکریا ملتانی اپنے مرشد کی خدمت میں صرت سترہ روز رہے

اور روحانی نعمتوں سے مالا مال ہوئے، بعض مریدوں کے دل میں

شک پیدا ہوا، اور شیخ سے عرض کیا کہ ہم اتنے دنوں سے آپ کی خدمت

میں ہیں لیکن ہم ابھی تک خلافت سے سرفراز نہیں ہوئے مگر یہ ہندوستان

آیا اور تھوڑی ہی مدت میں شیخ ہو گیا حضرت شیخ شہاب الدین نے

اپنے ان مریدوں سے فرمایا کہ تم گیل لکڑیوں کے مانند ہو جن میں آگ

دیر سے لگتی ہے، بہاء الدین زکریا خشک لکڑی کی طرح تھے، جس میں

آگ جلد اثر کرتی ہے۔

حوق خلافت حاصل کرنے کے بعد آپ کے مرشد نے آپ

کو حکم دیا کہ وہ ملتان جائیں اور وہاں سلسلہ سہروردیہ کے فیوض و

برکات کو عام کریں، چنانچہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی اپنے شیخ

کے ارشاد کے مطابق ملتان تشریف لائے اور اس شہر میں آپ نے

علم و عرفان، رشد و ہدایت کی شمع روشن کی، آپ کے فیوض و برکات

اور تجارت کی طرف بھی حضرت نے توجہ دی۔

دینی اور دنیاوی امور میں عوام کی اصلاح و تربیت کی طرف خصوصیت سے توجہ فرماتے تھے۔ فوائد القواد میں ہے کہ ایک روز خراجہ نظام الدین محبوب الہی نے دینی اصلاح و تربیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ملتان میں ایک شخص سیماں نامی بڑا عابد و زاہد تھا، ایک روز حضرت بہاء الدین زکریا ملتان کے پاس گئے اور کہا اٹھو اور دو رکعت نماز پڑھو، تاکہ میں بھی دیکھوں کہ تم کس طرح نماز پڑھتے ہو؟ وہ شخص اٹھا، اور اُس نے نماز شروع کی لیکن اُس نے نماز میں حالت قیام میں دونوں قدموں کے درمیان سنو نہ فاصلہ نہ چھوڑا حضرت شیخ نے فرمایا کہ نماز میں اپنے دونوں پاؤں کے درمیان اس قدر فاصلہ نہ رکھو، جتنا سنو نہ ہے، لیکن وہ دوبارہ بھی اپنے قدموں کے درمیان سنو نہ فاصلہ نہ رکھ سکا، اور نماز شروع کر دی، حضرت شیخ نے اس سے فرمایا جاؤ اور اُچ میں مقیم رہ کر تعلیم و تربیت حاصل کرو، چنانچہ وہ اُچ چلا گیا۔

حضرت شیخ بہاء الدین اپنے مریدوں میں صحیح جذبہ پیدا کرنے اور اُن کی صلاحیتوں کو صحیح طور پر برسرِ کار لانے کے لئے ساعی رہتے تھے، آپ کی نگاہ دور رس زندگی کے ہر شعبے تک پہنچتی، اور آپ کا اصلاحی ہاتھ زندگی کے ہر شعبے میں محسوس کیا جاتا تھا۔

ایک دفعہ ایک بہت بڑا عالم و دانشور بخارا سے دہلی آیا، جب وہ ملتان پہنچا تو اپنے علمی پندار کی وجہ سے حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتان سے ملنے نہیں گیا، اُس کے ساتھیوں نے اُس سے کہا کہ نہیں حضرت شیخ سے ضرور ملنا چاہیے، وہ اپنے ساتھیوں کے اصرار پر آپ سے ملنے گیا تو اس شان سے کہ رعوت کی وجہ سے دستار کا شلہ نیچے تک ٹکا ہوا تھا، اور لیے لیے بال شانوں پر پڑے ہوئے تھے، آپ نے اُسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا دو دو ساپ لے کر آئے ہو، اس ارشاد کے ساتھ ہی اُس کی رعوت انکسار میں بدل گئی، اور اُس نے اٹھ کر سر منڈایا اور دستار کے شلے کو چھوٹا کیا، اور آپ سے بیعت ہو کر ایک مدت تک آپ کی خدمت میں رہا۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتان کے اُمینہ اخلاق میں عبادت و ریاضت تواضع اور انکسار، استغنا و بے نیازی، حلم و بردباری کا عکس نمایاں نظر آتا ہے تلاوت قرآن مجید سے غیر معمولی شغف رکھتے تھے۔ حضرت شیخ نظام الدین محبوب الہی کا بیان ہے کہ بابا فرید گنج شکر کثرت سے روزے رکھتے تھے، اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتان نقل روزے اس کثرت سے نہیں رکھتے تھے، لیکن طاعت و عبادت بہت کرتے تھے۔ تواضع اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ اپنی تعظیم و تکریم سخت ناپسند فرماتے تھے ایک مرتبہ خانقاہ میں کچھ مرید وضو کر رہے تھے اتفاق سے آپ نے ہاں تشریف لے آئے، سب مرید وضو نا مکمل چھوڑ کر آپ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے، اور سلام کیا، صرف ایک مرید وضو مکمل کر کے کھڑا ہوا، اور تعظیم بجالایا۔ آپ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا تم سب درویشوں میں افضل اور زاہد ہو۔

جہاں نازی کا یہ عالم تھا کہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتان ہیچنے مسافروں، جہانوں، اور درویشوں کے ساتھ ملکر کھاتے تھے۔

حلم و بردباری حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتان کا امتیازی وصف تھا، ایک دفعہ قلندروں کی ایک جماعت نے آپ کے پاس اُگرمال ادا چاہی، آپ نے اس جماعت سے بے زاری کا اظہار کیا، قلندروں کی اس جماعت نے گستاخی شروع کی، اور اینٹ پتھر برسانے لگے۔ فرمایا خاتما کا دروازہ بند کر دو۔ قلندروں نے دروازے پر پتھر مارنے شروع کئے آپ نے فرمایا دروازہ کھول دو، میں اس جگہ شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی کا بیٹھایا ہوا ہوں، خود اگر نہیں بیٹھا، خادم نے دروازہ کھول دیا۔ قلندر اپنے قصور پر نادام ہوئے، اور آپ سے معافی چاہی۔ آپ کی ذات ستودہ صفات میں بڑی کشش تھی، مشہور شاعر عراقی، جو آپ کے مرید و خلیفہ ہیں، آپ سے اس قدر مست اثر تھے کہ کہا کرتے تھے:

”مقتا عیس کی طرح کہ جس طرح وہ لوسہ کو کھینچتا ہے شیخ
عجب کو کھینچتے ہیں۔“

ہیں اس لئے ہم اُن میں سے چند کو یہاں نقل کرتے ہیں،
اختیار الاخیار میں ہے کہ آپ نے اپنے بعض مریدوں کو وصیت
فرمائی کہ،

”ذکر الہی کو اپنے اوپر لازم کر لو، کہ ذکر کی بدولت ہی طالب
مطلوب تک پہنچتا ہے، محبت وہ آگ ہے جو تمام
میل کھیل کو جلا ڈالتی ہے، جب محبت راسخ ہو جاتی
ہے تو اس کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کے مشاہدے کے
ساتھ ذکر حقیقت میں ذکر ہوتا ہے، جس کے متعلق
اللہ تعالیٰ کی جانب سے فلاح کا وعدہ کیا گیا ہے“

فرمایا مرید کو چاہیئے کہ،

”مراقبہ کرنے والا ہو اور اپنے اوقات کا محاسبہ کرتے والا
ہو، اور حق کے سوا ہر چیز کو اپنے دل سے نکال دے
اور اہل دنیا کی محبت کو اپنے اوپر حرام کرے اور اللہ کی
کی یاد میں مشغول رہے، اگر اُس کو حق تعالیٰ کے ذکر
سے موافقت نہ ہوگی تو وہ خدائے تعالیٰ کی محبت کی
بُرحس نہ پاسکے گا۔“

ایک دفعہ اپنے مریدوں کو لکھا کہ،

”جسم کی سلامتی کم کھاتے میں ہے، اور روح کی سلامتی
ترک گناہ میں ہے اور دین کی سلامتی حضرت
خیر الانام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجنے میں ہے“

آپ کے خلفاء کی تعداد کثیر ہے، مشہور خلفاء میں آپ کے
صاحبزادے شیخ صدر الدین عارف، حضرت حسن افغان، شیخ جمال خندا
حضرت جلال مرغینا، شیخ دکن الدین ابوالفتح وغیرہ ہیں، جنہوں نے آپ کے
بعد سلسلہ سہروردیہ کو اس برصغیر میں بام عروج تک پہنچایا۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی نے، صفر ۶۶۱ھ کو وصال فرمایا
ایک دفعہ حضرت نظام الدین محبوب الہی کی مجلس میں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی
کی وفات کا ذکر چھڑا، حضرت محبوب الہی نے فرمایا کہ ایک دن ایک بزرگ
صورت شخص ظاہر ہوئے اور ایک نفاذ آپ کے صاحبزادے حضرت
شیخ صدر الدین کو دیا اور کہا کہ یہ خط ایک صاحب کے دل پہ اور کہلے کہ یہ شیخ
بہاء الدین کو پہنچا دو، شیخ صدر الدین اس کا عنوان پڑھ کر بے حد متحیر
ہوئے، اور اپنے والد کی خدمت میں وہ خط پیش کر کے باہر آئے، پھر
اگر دیکھا کہ قاصد جا چکا تھا۔ خط کے پڑھنے کے ساتھ ہی حضرت شیخ
بہاء الدین زکریا ملتانی واصل الی اللہ ہوئے، اور آواز بلند ہوئی: دوست
بر دوست رسید، دوست دوست کے پاس پہنچ گیا، یہ آواز سنتے
ہی شیخ صدر الدین حجرے میں گئے، دیکھا کہ آپ وصال منہر پاچے تھے
اس واقعہ کے بیان کرنے کے بعد حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الہی نے
فرمایا وہ بھی کتنا اچھا زمانہ تھا، جس میں پانچ بزرگ، حضرت بہاء الدین
زکریا ملتانی، شیخ ابوالنضیر مین، شیخ سیف الدین باخرزی، شیخ سعد الدین
حمویہ، اور شیخ اسلام شیخ فرید الدین قدس اللہ سرہم زندہ تھے۔

حضرت بابا فرید گنج شکر کے ملفوظات راحۃ القلوب میں مذکور
ہے کہ جب حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی نے وفات پائی، اسی وقت
اجودھن میں حضرت بابا فرید گنج شکر بے ہوش ہو گئے، جب ہوش آیا
تو فرمایا،

”برادرم بہاء الدین زکریا کو اس بیابانِ فنا سے شہرِ بقا
کی طرف لے گئے۔“

پھر آپ نے اُنھ کو اپنے مریدوں کے ساتھ غائبانہ ناز جنازہ
پڑھی۔ آپ کا مزار مبارک متان میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔
اگرچہ تذکروں سے آپ کی کس تالیف و تصنیف کا پتہ نہیں چلتا
لیکن بعض تذکروں میں آپ کے بعض وہ نصاب اور تعلیمات ملتی ہیں
جو آپ نے اپنے مریدوں کو فرمائی ہیں، آپ کے یہ نصاب اور تعلیمات
حکمت و موعظت، رشد و ہدایت، اثر و تاثیر کا ایک بیش بہا خزانہ

غزل

سید منظر حسین رزمی

کہاں سے آئے دھواں جل کے بجھ چکا ہوں میں
خود اپنے سائے کو مڑ مڑ کے ڈھونڈتا ہوں میں
سنو سنو انہیں لمحات کی صدا ہوں میں
ہوا وہ تیز چلی ہے کہ کھل گیا ہوں میں
اندھیری رات میں درویش کی دعا ہوں میں
جو اپنی گونج میں خود گم ہو وہ صدا ہوں میں
بے فیض وقت سراپا اک آئینہ ہوں میں
تو کیسا بتاؤں کہ کیوں تجھ کو چاہتا ہوں میں
وہی ہوں آج کہ خود ہی بکھر رہا ہوں میں
کہ ظلمتوں کے طلسمات میں گھرا ہوں میں

تمام عمر کسی آگ میں جلا ہوں میں
بہت مہیب ہے دشتِ وفا کی تنہائی
وہ سخت لمحے جو اہل وفا پہ گزرے ہیں
کھلی کتاب ہوں پڑھ لو جہاں سے جی چاہے
فقیر شہر ہوں دردِ صدا لگا ہوں
غریب شہر کی آواز کون سنتا ہے
صلائے عالم ہے جو چاہے اپنا منہ دیکھے
تو اس جہاں میں کچھ ایسا خوب رو بھی نہیں
وہی ہوں میں کہ جو کل انجمن سجاتا تھا
میں روشنی کا پجاری تھا کیا ہوا اندھیر

بہت طویل ہے افنائے وفا رزمی

خلاصہ یہ ہے کہ اک آدھار سا ہوں میں

سیم و تھور کے خلاف جنگ

(ادارہ)

باعث واپڈا نے ۲۴-۹ ٹیوب ویلوں کو برقی قوت فراہم کی۔
واپڈا نے زرعی زمینوں کو بحال کرنے اور ان کے مختلف نوعیتوں
کے مسائل حل کرنے کے لئے سات منصوبے بنائے ہیں جنہیں تقریباً
۱۱۶۸۴ ملین ایکڑ رقبے کی بحالی کا کام پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان میں سے
۴ منصوبے یعنی سکارپ عسکری (دسلی رچنا دو آب) سکارپ عسکری (عج
دو آب) سکارپ عسکری (زیریں متعل دو آب) سکارپ عسکری (بالائی
رچنا دو آب) مکمل ہو چکے ہیں اور ان میں تقریباً ۵۶۵ ملین ایکڑ رقبہ
گوجرانولہ، سیالکوٹ، لائلپور، گجرات، سرگودھا، مظفر گڑھ اور جہنگ
کے ضلعوں میں درست ہو چکا ہے۔

محولہ بالا بحال شدہ علاقوں یعنی اسکارپ عسکری میں واپڈا نے
۲۰۵۸ ٹیوب ویلوں کی تنصیب اور برقیاتی وغیرہ کا کام سرانجام دے دیا
ہے اور اسی طرح اس نے اسکارپ عسکری میں ۲۲۰۵ اور اسکارپ عسکری
میں ۲۶۳۵ اور اسکارپ عسکری میں ۹۳۵ ٹیوب ویلوں کی تنصیب برقیاتی
وغیرہ کے مرحلے مکمل کر دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ سیم نالیوں اور دیگر
زمینی طریقوں سے ۵۲۵ میل لمبے علاقے کو کارآمد بنانے کے اقدامات
کئے جا چکے ہیں۔ موجودہ مالی سال کے دوران کھاری پانی خارج کرنے کے لئے
۴۰ ٹیوب ویل لگانے جا چکے ہیں۔ واپڈا نے جو ۶۸۳۳ ٹیوب ویل لگائے ہیں
اندازہ ہے کہ ان سے ۸۶ ملین ایکڑ فٹ زمینی پانی آبپاشی کے لئے فراہم ہوگا
اسکارپ کے علاقوں میں واپڈا کی سیم زدہ زمین کو بحال
کرنے کی ان کوششوں کے بڑے اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں اور
اندازہ یہ ہے کہ ان علاقوں میں سالانہ پچاس کروڑ روپے کی مالیت
کی زرعی پیداوار کا اضافہ ہو رہا ہے۔

پاکستان نے کسی زمانے میں جنوبی ایشیا کا زرخیز ترین خطہ تصور
ہوتا تھا اور اس علاقہ کی گندم برصغیر کے دور دراز علاقوں تک پہنچتی تھی۔
لیکن ادھر کچھ سالوں سے پنجاب کے نہری علاقوں میں سیم تھور کی شدت
کے باعث اس علاقے میں غذائی اجناس کی پیداوار بُری طرح متاثر ہوئی ہے
اور اس کے نتیجے میں باہر سے گندم درآمد کی جاتی رہی ہے۔ زمینیں جس
تیزی سے سیم زدہ ہو رہی تھیں اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ
ایک دور ایسا بھی تھا کہ تقریباً ہر سال ایک لاکھ ایکڑ قابل کاشت اراضی
ناکارہ ہو رہی تھی اور فی ایکڑ زرعی پیداوار اس حد تک گر گئی تھی کہ یہ دنیا
کی اوسط فی ایکڑ پیداوار کی پڑ رہ گئی تھی اور اس خوفناک صورت حال نے
زرعی شعبے میں ایک قیامت صفر برپا کر دی تھی اور اس سے ہر سال
تقریباً ۲۵۰ کروڑ روپے کا ملک کو نقصان ہو رہا تھا۔

جب عوامی حکومت ۱۹۷۱ء میں برسرِ اقتدار آئی تو اس وقت واپڈا
کے اہل ترقیاتی پروگرام میں ۳۲ فیصد کمی کی جا چکی تھی۔ اپریل ۱۹۷۲ء
میں حکومت نے اراضیات کی بحالی کے پروگرام کی اہمیت کو تسلیم کرتے
ہوئے ایک اعلیٰ سطح کی کانفرنس منعقد کی جناب ذوالفقار علی بھٹو جو اس
وقت صدرِ مملکت تھے نے یہ احکامات دیئے کہ سالانہ ترقیاتی منصوبے میں
اولین اہمیت زرعی شعبے کو دی جائے۔ اور اس کے تحت یہ ہدایت
کی گئی کہ سیم اور تھور کی لعنت کا مقابلہ ترقی اور ہنگامی انداز میں کیا جائے۔
چنانچہ زراعت کے مشیر خاص نے واپڈا اور صوبائی حکومتوں سے ایشیا
کی بحالی کے متعلق متعدد میٹنگوں میں بات چیت کی اور اس شعبے میں کام
کا بھرپور جائزہ دیا اور واپڈا کو ٹیوب ویلوں کو برقی قوت فراہم کرنے اور
دیگر کاموں کے لئے چھ کروڑ روپے کی اضافی گرانٹ دی گئی اور اسی کے



لاہور میں واپڈا کی شاندار بلڈنگ

زراعت کی ترقی کیلئے عوامی حکومت نے کثیر تعداد میں ٹریکٹر فراہم کئے ہیں





شمال مغربی سرحدی صوبہ میں دھان کاشت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے

محکمہ کاشتکاری کے تحت دیہاتوں میں گڑ سازی ایک مفید ٹھوس منصوبہ ہے





عوامی حکومت کی ہدایت پر سیم زدہ علاقوں میں ٹیوب ویلوں کی تنصیب سے اصلاح اراضی کا کام کیا جاتا رہا ہے

واپڈا کے لگائے ہوئے ٹیوب ویل آبپاشی کے لئے بھی نعمت ثابت ہو رہے ہیں





روٹی کی فصل زر بادگانے کا اہم ذریعہ ہے

آپاشی کی بہتر سہولتوں نے اصلاح شدہ زمینوں کی صورت بدل دی ہے



نئی اسکیمیں

خیسر پور ٹائل ڈریینج اسکیم زیر غور ہے اور توقع ہے کہ ماہرین کی رپورٹ کی وصولی کی بعد اس منصوبے پر کام شروع کر دیا جائے گا۔
سکھر پائلٹ پراجیکٹ میں ۱۵ نیوب ویلوں کی تنصیب تکمیل پا چکی ہے۔

صوبہ سرحد میں بحالیات اراضی

۷۲-۱۹۷۱ء میں صوبہ سرحد میں اسکارپ کا کام شروع کیا گیا تھا۔ اور پتی پائلٹ پراجیکٹ پشاور سٹی اینٹی ڈائراکٹ پراجیکٹ پر کام شروع کیا گیا تھا۔ اس منصوبے میں ۲۸ ٹیوب ویل - ۱۶ عام کنوئیں اور ۱۰۰۰ فیٹ ٹائل ڈریینز کا کام مکمل ہو چکا ہے۔ اور اب کافر ڈھیر جو مشین بہتی مرحلہ ۷۲ اسکارپ مردان اور اسکارپ بنوں پر کام ہو رہا ہے۔

وزیر اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کی ہدایت پر سیم اور تھور کی آفت پر قابو پانے کے لئے اور زیادہ کام شروع کر دیا گیا ہے۔ ۶۹ اور ۷۰ مارچ ۱۹۷۳ء میں گورنروں کی کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ سیم و تھور کی زمینیں دیا پر قابو پانے کا کام صوبائی حکومتیں پیچھے بنیادوں پر کریں نیز حکومت پنجاب سیم و تھور پر قابو پانے کے لئے اپنے اُندہ کے منصوبوں پر ایندھن برقی قوت اور قدرتی وسائل کی مرکزی وزارت پلاننگ کمیشن اور واپڈا سے مشوروں کے بعد نظر ثانی کرے۔

وزیر اعظم کی ہدایت کے مطابق واپڈا نے ملک میں سیم و تھور پر قابو پانے کے لئے ایک جامع منصوبہ ۱۹۷۳ء میں تشکیل دیا۔ اس منصوبہ کا پہلا مرحلہ ۱۱ سال کی مدت پر پھیلا ہو گا۔ ادا اس سے بڑے وسیع اڈا عربین رقبے کو فائدہ پہنچے گا۔ اس تیز رو ہنگامی پروگرام کے تحت ملک کی ندی پیداوار میں شاندار ترقی ہوگی اور یقین ہے کہ ندی شیعہ میں قرضوں بہتر نیجہ کھاد اور ذریعہ آلات کی فراہمی کے ساتھ مل کر اس منصوبے سے ملک غذائی اجناس میں خود کفیل ہو جائے گا۔

واپڈا نے عوامی حکومت کی ہدایت کے مطابق اب تین نئے منصوبے بنائے ہیں یہ اسکارپ ۷۷ (زیریں رچنا دو آب) اسکارپ ۷۸ (پنجند اور عباسیہ کنال سے سیراب ہونے والا علاقہ) اسکارپ ۷۹ (بالائی باری دو آب) ہیں ان پر کام جلد شروع کر دیا جائے گا۔ واپڈا نے صوبہ سندھ کے لئے آٹھ اسکارپوں کی منصوبہ بندی مکمل کر لی ہے جن میں آٹھ ایکڑ رقبہ کی اصلاح کی جائے گی ان منصوبوں میں تین منصوبے یعنی خیر پور پراجیکٹ میں ۴۰ ٹیوب ویلوں کی تنصیب اور لاڑکانہ شکار پور ڈریینج اسکیم ۷۱ میں ۵۴ میل لمبے علاقے میں سیم تالیوں اور دیگر ذرائع سے زمین کی اصلاح کا کام اور شمالی روہڑی کے علاقے میں ۶۶ ٹیوب ویلوں کی تنصیب کا کام انجام پا چکا ہے اسکارپ شمالی روہڑی کا دوسرا مرحلہ جس میں ۱۰۰ ٹیوب ویلوں کی تنصیب شامل تھی، بھی مکمل ہو چکا ہے دوسرے دو یونٹوں پر جن میں ۱۵ اور ۳۰ ٹیوب ویلوں کی تنصیب شامل تھی پر کام ہو رہا تھا اور یقین ہے۔ اب تکمیلی مراحل پر پانچ لگیا ہو گا۔

اسی طرح لاڑکانہ شکار پور ڈریینج اسکیم ۷۲ پر اس سال کے اختتام تک کام تکمیل پا جائے گا۔

لیفٹ بینک آؤٹ فال ڈریں

اس منصوبے کے پہلے مرحلے پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔

کوٹری سرفیس ڈریینج

اس منصوبے کو عملی جامہ حکومت سندھ کا محکمہ آبپاشی و برقابی پہنا رہا ہے اس منصوبے کے تحت غلام محمد بیراج کے بائیں کنارے کے علاقے کی اراضیات کی اصلاح کا کام ہو گا۔ تقریباً ۱۲۶۱ میل لمبے علاقے میں سیم نالیاں بنائی جا چکی ہیں۔

فیساً۔ پاکستان کا چھ ہزار سالہ قدیم تاریخی شہر

عبدالحلیم اثر

ایک عرب شاعر نے کہا ہے،

تذک آثارنا تذکر علینا فاشلو احالنا عن الآثار

د یہ ہمارے آثارِ قدیمہ ہیں جو ہماری عظمت اور شوکت پر دلالت کرتے ہیں۔ ہمارے حالات ہمارے ان آثارِ قدیمہ سے دریافت کیجئے۔

جب آثارِ قدیمہ کی دو قسمیں ٹھہریں مادی جیسے تعمیرات اور ان کے کھنڈرات اور ثقافتی جیسے ”پرانے نام“ اور ہر دور کے علمائے تاریخ۔ علمائے آثارِ قدیمہ، علمائے علم الانسنہ و علم الاصنام و علم الاایام نے اس موضوع پر قابلِ قدر تالیفات یا دکار چھوڑی ہیں۔ اس لئے ہم نے بھی مناسب سمجھا کہ اس اپنی مملکت پاکستان کے آثارِ قدیمہ پر خصوصاً ان کے پرانے تاریخی ناموں پر متذکرہ بالا علوم اور علم تاریخ و جغرافیہ کی معلومات کو سامنے رکھ کر ایک مختصر تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالیں اور اس کے نتائج مزید غور و خوض کے لئے اپنے ہمعصر پاکستانی علمائے تاریخ کے سامنے پیش کر دیں۔ وجہ یہ کہ اس موضوع پر غیر ملکیوں نے تو کافی کام کیا ہے۔ جبکہ عرب مورخین کا عقیدہ ہے صاحب البیت اور بنی بمانیہ ”گھر کے بھید گھر والا ہی جانتے“

مجلد الحلال فکلتہ بابت ۱۹۷۵ء - (اثر)

حسن الزیلات مصری نے اپنی تالیف ”الادب العربی“ میں لکھا ہے کہ مواضع اور مقامات و مالک کے نام درحقیقت ”تہذیبی اور ثقافتی آثارِ قدیمہ“ ہیں۔ کسی بھی مقام کا کوئی بھی نام ہو اور خواہ کسی بھی زبان کا ہو۔ یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ یہ نام جس زبان کا بھی ہے اس کا نام رکھنے والے تاریخ کے کسی دور میں اس نام کے رکھنے سے پہلے اس زبان، تمدن اور ثقافت کے ساتھ اسی مقام پر موجود رہے تھے۔ دیکھئے وہ خود اپنی مخصوص زبان کے ساتھ تاریخ کے دیز پر دوں کی تاریکیوں میں گم ہو گئے۔ لیکن ان کے ثقافتی آثارِ قدیمہ ان کا رکھا ہوا نام باقی رہ گیا ہے اور کئی جگہ ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ کسی قوم کے تمدنی اور تہذیبی مادی آثار مٹ گئے لیکن ان جغرافیائی خطوں میں ان کے مٹے ہوئے آثار کے نام بطور ثقافتی آثار کے ابھی تک باقی ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے صحیفہ درہوں سورت مائے آیت

علا (اصل زبان مغربی آرامی جو عبرانی کا ایک لہجہ ہے) کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے لوگوں نے خیال کر رکھا ہے کہ ہماری آبادیاں اور بقیات اب تک باقی رہنے والیاں ہیں۔ ہمارا تعلق اور آبادی نسوں کی نسل تک رہ جائے گی۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے نام اپنے مقامات پر رکھتے ہیں۔

نئے تاریخ الادب العربی طبع سرمتا ۱۹۵۶ء مجلہ ماہ نو اشاعت ۱۹۵۶ء ص ۴

یونانی مؤرخین اس قاعدہ کے تحت ایشید، افلاطون، ارسطو، ہیروڈوت کی جگہ یہ نام اس طرح تحریر میں آئے ہیں۔ ایشیدیں (افلاطونس، ارسطوس، ہیروڈوٹس) اور اسی قاعدے کے تحت انہوں نے چند ایک عہد قدیم کے پاکستانی مشاہیر کے نام دوائی نہیں کی جگہ دوائی نے سس، بکو کی جگہ بکوس، میسوی کی جگہ میسوی کوروی کی جگہ کوروس (کوروش، خورش) اور دودا (ڈوڈا) کی جگہ دودا اس تحریر کیا ہے۔ ہمیں یونانی مؤرخین کے بیانات پڑھتے وقت اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

۲۔ یونانی مؤرخین نے ہمارے اس ملک کے تاریخی نام اپنے لہجے اور اپنے قدیم یونانی حروف ابجد میں تحریر کئے ہیں۔ یہ کوئی خلاف توقع بات نہیں ہے۔ ایک قوم ایک ملک میں ایک جگہ کا نام اپنی زبان اور اپنے مخصوص لہجہ میں رکھتی ہے۔ زمانہ گزرنے کے بعد دوسری قوم وہاں آکر آباد ہو جاتی ہے۔ یہ نو وارد قوم اس ملک کے مقامات کے تاریخی ناموں کا تلفظ اپنے لہجہ میں کرتی ہے۔ مثال کے طور پر ہیروڈوٹس اور پلینی دو دونوں نے درج ذیل نام اس طرح لکھے ہیں۔ پکت، پکتین، پکتیکا۔ جبکہ قدیم اور موجودہ پشتو بولنے والے لوگ ناموں کا تلفظ حرف (ک) کی جگہ عربی حرف (خ) اور پشتو کے مخصوص حرف (بش : خ) اور حرف (ش) منقوط سے کرتے ہیں اور مندرجہ بالا نام علی الترتیب اس طرح پڑھتے ہیں (پکت : پخت : پنت : پشت) (۲) پکتین کو پکتین، پبنتین، پبنتین (۳) پکتیکا کو پکتیکا، پبنتیکا نہیں پڑھتے بلکہ پکتیکا کے دونوں حروف (ک) کی جگہ حرف (خ، بن، ش) پڑھ کر پختیکا، پبنتیکا، پبنتین کی حرف (ی) حرف (و) سے بدل کر پشتون، خا، پشتون خوا پڑھتے ہیں۔

یونانی مؤرخین نے اپنی یادداشتوں میں ہمارے اس ملک کے

شمال مغربی پاکستان میں ایک قوم کا نام ارسٹریس۔ یہ درحقیقت بینا مختلف اقوام اور قبائل کے مجموعہ کا جغرافیائی نام ہے۔ جن میں سے ایک کا نام دائی اور دوسرے کا برگ ہے۔ دائی قوم کے تذکرہ میں ان کو ایک شہر نیسا کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس تاریخی خبر کا اپنا پراچھ ہزار سالہ نام نیخا ہے جسے نیسا بھی پڑھا گیا ہے۔ یورپ کے مستشرقین نے اپنی غلطی سے یہ نام نیسا پڑھا ہے اور ہم بھی اس غلط العوام قسم کے نام نیسا سے اس کا تاریخی جائزہ لے رہے ہیں دائی کے تاریخی پس منظر اور اس کے ساتھ بکو (بکواس) پر اس کے بعد بحث کی جائے گی۔ اسے تاریخ گم گشتہ کا ایک ورق سمجھئے۔

۱۱۷۷ ارسل

شمال مغربی پاکستان کے ضلع پشاور اور جنوبی وزیرستان میں ایک قوم کا نام ارسٹریس۔ پنجاب کے جالندھر و آب میں بھی ارسٹریس نام سے ایک مشہور اور آباد قصبہ موجود ہے۔ جہاں ایک پختہ گنبد میں ایک پتھر رکھا ہے جس پر نقش قدم حضرت مشیر خدا علی المرتضیٰ موجود ہے۔ ارسٹریس درحقیقت بینا مختلف اقوام اور قبائل کا مجموعہ ہے۔ جو بنیادی طور پر عربی النسل ہیں۔ جیسا کہ گذشتہ سطور میں کہا گیا ہے۔ ان میں سے ایک قبیلہ کا نام دائی ہے اس قوم کی حقیقت جاننے کیلئے ہمیں سنہ ۱۱۷۷ ق م کے تاریخی زمانہ کی طرف لوٹ کر اپنی تاریخی تحقیق کا آغاز کرنا ہوگا۔ اس ضمن میں ہم سنہ ۱۱۷۷ ق م اور اس کے بعد سنہ ۱۱۷۷ ق م کی بھی بات کریں گے۔ اور تاریخی روایات سنہ ۱۱۷۷ ق م کے عہد کی بیان کریں گے۔ چونکہ اس تاریخی تحقیق میں ہمیں یونانی مؤرخین کے حوالوں سے بھی استفادہ اور استناد کرنا ہے۔ اس لئے اس سے پہلے یہ چند نکات ذہن نشین ہونا ضروری ہیں۔

۱۔ یونانی زبان کے گریک کے مطابق اسماء اور کلمات کے آخر میں زائد کے لاسقہ کے طور پر حرف (س) غیر منقوط کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

۲۔ تاریخ خزانہ پنجاب جلد نمبر ۱۹ صفحہ نمبر ۱۹ (طبع نوکشمور ۱۹۷۵ء)

کے لئے کہ جو عمر یا حادثوں کی وجہ سے فوجی ملازمت کے قابل نہ رہے تھے، آباد کیا تھا، وہ اس شہر کو اپنی (ایا) (نرس) کے نام کی مناسبت سے فیسا (نرس) پکارتا تھا..... ساتھ ہی اس پہاڑی کو بھی جو ہمارے قریب ہی ہے۔ اس نے مشتری سے پیدائش کی وجہ سے میرون کے نام سے پکارتا تھا۔ اور اس شہر کی بکوس کے ہاتھوں بنیاد رکھنے کی وجہ اور واضح ثبوت یہ ہے کہ سدا سبز و لایتی بیل (پودا) جو ہندوستان بھر میں کہیں بھی دستیاب نہیں ہوتی۔ ہمارے اس علاقے میں پھلتی پھولتی ہے۔

مؤرخ مذکور نے اس سے پہلے لکھا ہے کہ

واوی کنسٹے نکل کر سکندر نے باجوڑ میں قدم رکھا یہاں کے باشندے جو تاریخ میں اسپاسیائی (ASPASIANS) کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ مقابلہ کے لئے موجود تھے اریگائیئن (ARIGAIEN) کے مقام پر شدت کی لڑائی لڑی گئی تھی اور مؤرخین کے بیان کے مطابق سکندر کو باجوڑ کی مردین پر پہلی عظیم لڑائی لڑنی پڑی تھی۔ سکندر کے ساز و سامان، اس کے نظم و نسق، سامان حرب کی فراوانی اور سپاہیانہ تربیت و قابلیت کے سامنے یہ مقامی باشندے (اسپاسیائی) شہر نہ سکے تو انہوں نے اریگائیئن کو نذر آتش کر دیا تھا۔ سکندر کے افسر نے سڑجوبلے لکھا ہے کہ نیسا کے اردو الی پہاڑوں کو اس وجہ سے میرون کہا جاتا ہے کہ یہاں سدا سبز و لایتی بیل اگتی ہے۔ اگرچہ ان کا سیدہ پوری طرح پختہ نہیں سکتا اور عروسہ (ارش کی بہتات) کی وجہ سے کچھ خفیل ہی دیکھ کر جاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں جہاں تک نیسا کے جنوب میں واقع اونچے پہاڑ کا تعلق ہے اس کی میرون کی جگہ آج کل کے مورخ کہا جاتا ہے۔ پشتون زبان کے ایک لہجہ میں حرف (د) کی جگہ حرف (ی) کا تلفظ کرتے ہوئے (مورہ مان) کو میر کہتے ہیں۔ اس کا ایک دیو لائی تصور ہے کیونکہ پشتون میں سورج کو بھی میر کہا جاتا ہے اور اس دیو لائی تصور کے بکوس کی قومیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ افغانستان کے پاکستان کے پشاور کے یو سٹرائٹ قوم کا قدیم تاریخی نام ہے معاف آجاتی ہے۔ تاریخ یو سٹرائٹ صراط الحوالہ انڈیا کا انبار۔ ایضاً الحوالہ گیشس آف انڈیا (راٹر)

اطلاعات بطیموس کے بیان کے مطابق سکندر نے اس جگہ کے چالیس ہزار باشندوں کو قیدی بنایا تھا اور دو لاکھ تیس ہزار (۲۳۰۰۰۰) بیل اپنے قبضہ میں لے لئے تھے جن میں چیدہ چیدہ تعداد کو افرائیل نسل کی عرس سے یونان بھیج دیا گیا تھا۔ اریگائیئن کے محل وقوع کے پیش نظر سکندر نے اسے دوبارہ تعمیر کرنے کی ہدایت کی اور اپنے لشکر کے ان افراد کو جو مستقبل میں فوجی خدمات کے سرانجام دینے کے قابل نہیں تھے۔ اس جگہ آباد کر دیا تھا۔

تحقیقی جائزہ

یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہم اس کا تحقیقی جائزہ لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس تاریخی حوالہ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سکندر اعظم جب واوی کنسٹ (موجودہ سمت مشرقی افغانستان) سے چل کر (موجودہ پاکستان کے انتہائی شمال مغربی علاقہ) باجوڑ میں داخل ہوا تھا تو اسے سب سے پہلے اریگائیئن کے مقام پر لڑائی لڑنی پڑی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب یہ کہا جاتا ہے کہ اریگائیئن کے جھلٹے جانے کے بعد اس کی جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر سکندر نے اس کے دوبارہ آباد کرنے کا حکم دیا تھا تو ہم سمجھتے ہیں کہ صحیح حالات یورپ کے مستشرقین کے علم میں نہیں ہیں۔ وجہ یہ کہ اریگائیئن اپنی تباہی کے بعد آباد نہیں کیا گیا تھا اور اس عدم واقفیت کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اریگائیئن کا محل وقوع ہی غلط بتایا ہے۔ اس سلسلہ میں میرے مشفق دوست مرحوم انڈینکس یوسٹرائٹ نے اپنی تالیف تاریخ یو سٹرائٹ (طبع کراچی) صفحہ ۱۸۱ پر اریگائیئن کے لفظ کے متعلق گیٹس آف انڈیا سے یہ حاشیہ درج کیا ہے۔

”اریگائیئن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ نوآگئی کے قریب کوئی آبادی تھی۔ حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے جو جناب یوسٹرائٹ نے بیان کی ہے اسی طرح اسی کتاب کے حوالہ سے نیسا کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ یہ شہر باجوڑ میں ہے۔ لیکن یہ فاضل مشرق جب اس شہر کی جگہ متعین کرتے ہیں تو اس میں غلطی کر جاتے ہیں اور اسے بہانے

ہجور کے وادی سوات میں ظاہر کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں جہاں تک واقعات کا تعلق ہے۔ یہ بیان اریگائین کے صحیح جغرافیائی محل وقوع سے مردم واقفیت پر مبنی ہے۔ تاریخی مقام اریگائین اپنے جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے نواگٹی کے پاس نہیں ہے۔ بلکہ نواگٹی جو وادی چارونگ میں واقع ہے، اس کے شمال مشرق میں ایک دوسری وادی ہے جس کا قدیم نام وادئی پشت اور وادئی لراغا ہے اور موجودہ نام ہے وادئی باجوڑ۔ اس وادی کے شمال میں جب میدانی علاقہ کی سرحد مشہور تاریخی مقام پشت پر آکر ختم ہو جاتی ہے تو یہاں سے وادی ایک تنگ نئے کی صورت میں شمال مغرب کی طرف مل جاتی ہے۔ یہاں مقام پشت سے کچھ ہی فاصلہ پر بجانب شمال مشرق اور سلسلہ کوہ شنگس کی مغربی ترائی میں دو تاریخی مقامات بگلٹہ اور لکتہ کے درمیان یہ تاریخی مقام اریگائین واقع ہے۔ نواگٹی اور اریگائین کے درمیان چالیس میل سے زیادہ فاصلہ ہے۔ باجوڑ کے نقشہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ اریگائین کسی بھی صورت میں نواگٹی کے قریب کی آبادی نہیں ہے۔ یہ نقشہ ہم نے ترتیب دیا ہے یورپ کے مستشرقین کے نقشہ میں اریگائین نہیں ہے۔

لکتہ

شنگس کے ہٹ پھوچنے کے شمال مغرب میں ملکہ اسکینی کے دارالحکومت اور شاہی محلات پر مشتمل شاہی قلعے جنوب مغرب پشت سے شمال اور مشرق میں واقع لکتہ اس عہد کے مملکت باجوڑ کے حکمران کی راجدانی تھی جس کے آثار قدیمہ گہرے نام سے آج بھی موجود ہیں۔ لکتہ کے شمال میں اریگائین فوجی قلعہ اور پشت چھ ہزار سال کا قدیم ترین مقدس شہر تھا۔ دراصل گیشس آف انڈیا، ہسٹری آف انڈیا، انسائیکلو پیڈیا آف انڈیا، ایڈوانس ہسٹری آف انڈیا (موجودہ) لے یہ بگل وادی تاریخی مقام ہے جہاں میدانیہ کیریلی ہمدانی نے کشمیر سے عرتد جاتے وقت ہائی تھی۔ یہ واقعہ ۸۵۰ء سے ۸۵۵ء کا ہے۔

لے لکتہ اور اریگائین کے نام سے دو مقامات اسپین میں ہے (اٹلی سے)

اور ہٹ ہائیو گرافیکل ڈکشنری (انڈیل) وغیرہ میں باجوڑ (پاکستان) میں سکندر اعظم کے داخلہ کا راستہ صحیح طوع پر متعین نہیں کیا گیا ہے۔ اور اسی نے مشکلات پیدا کی ہیں۔ انہوں نے باجوڑ میں سکندر کی آمد کا اور اس کے اقدامات کے راستے کا جو نقشہ دیا ہے وہ باجوڑ کے مقام نواگٹی سے ہو کر گزرتا ہے تھے دوسری طرف ایرین نے ذکر کیا تھا کہ سکندر کو اریگائین پر عظیم لڑائی لڑنی پڑی تھی تو انہوں نے اریگائین کے صحیح محل وقوع کو جاننے کی کوشش کئے بغیر اریگائین کو نواگٹی کے قریب ایک مقام قرار دے دیا۔

دو مقامات

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ، ”نقل راعقل باید“ یہ بات یورپ کے ان مستشرقین کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ مملکت اسپین (ہسپانیہ) کے جغرافیائی نقشہ کو ملاحظہ کیجئے وہاں لکتہ اور اریگائین کے نام سے دو مقامات موجود ہیں۔ لکتہ اور اریگائین باجوڑ میں بھی ہیں۔ مملکت مصر میں قاہرہ سے اسی میل کے فاصلہ پر ایک علاقہ کا نام باجوڑ ہے اور اسی قاہرہ سے چالیس میل کے فاصلہ پر پشت (مورث اعلیٰ) کے نام کی طرف منسوب ایک معبد ربل پشت کے نام سے موجود ہے۔ جو سنہ ۱۰۰۰ ق م میں اس پشت کے نسل کے لوگوں نے وہاں حاکم بنایا تھا (تفصیل کے لئے ملاحظہ کریں موسیو جارج ایبرس جرمنی کی تالیف دختر فرعون۔ اردو ترجمہ از لطافت حسین مرزا طبع آگرہ پریس آگرہ) صورہ اور حیدر مملکت مصر میں دو علاقوں کے نام ہیں اور ان دونوں ناموں سے باجوڑ میں دو علاقے موجود ہیں۔ لیکن جس طرح ہم ایرین کا یہ بیان کہ سکندر نے اریگائین کے مقام پر لڑائی لڑی تھی (پڑھ کر یہ نہیں کہتے کہ سکندر نے اسپین کے اریگائین پر لڑائی لڑی تھی اور یہ لڑائی اسے اس وقت لڑنی پڑی تھی جب وہ مصر کے علاقہ باجوڑ پر حملہ آور ہوا تھا۔ ٹھیک اسی طرح ہم ایرین کا یہ بیان پڑھ کر کہ سکندر نے نواگٹی کے قریب سے ہو کر اریگائین پر حملہ

نواگئی اور آس مار کے درمیان سلسلہ کوہ کلڑی کے مغربی ڈھلان پر شال اور شنگر کے درے ہیں اور دریائے کنر کے کنارے پرودہ تاریخی مقامات چکان سرائے اور پشت واقع ہیں۔ اس پہاڑی سلسلہ کا وہ بازو جو مٹھائی (مہتہ) سے جنوب مغرب کی طرف گھوم جاتا ہے۔ اس کا نام ایل (رائی) اور اس کے جنوب مغربی سرے پر مشہور پہاڑی چوٹی شمشادہ واقع ہے۔ ایل کے ادب و تاریخ کے مشہور تاریخی شخصیت درفش کاویانی کے مہرث اعلیٰ شمشادہ کے نام کی مناسبت سے یہ پہاڑی چوٹی شمشادہ کہلاتی ہے۔

سکندر کا باجور میں داخلہ

سکندر نے باجور میں داخلہ کے لئے دریائے کنر کے کنارے کا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس نے کنر کے نواگئی پشت، چکان سرائے سے ہو کر آسمار کے مقام پر دریائے کنر عبور کرنے کے بعد افغانستان کے انتہائی شمال مشرقی علاقہ درندہ ڈاگام میں آگے بڑھ کر باجور کے اس عہد کے دارالحکومت لکھ (گبر) پر حملہ آور ہونے کا پروگرام بنایا تھا۔ ڈاگام کے مشرقی سرحد کے اختتام پر خود سکندر نے کوتل گبر سے باجور میں داخل ہونے کی تدبیر کی۔ اس کا راستہ شمال سے جنوب کی طرف جانے کا تھا اور یہاں پر اس کے جرنیل پٹولمی نے ڈاگام کے مشرق میں واقع کوتل دھلی کا راستہ یا تاکہ اس کوتل پہنچ کر اس کے جنوب میں واقع عظیم ترین چوٹی پرواق ملکہ اسکینی کے شاہی قلعہ کو فتح کر کے۔ پٹولمی نے اس قلعہ کے فتح کئے جانے کے جو واقعات لکھے ہیں وہ پڑھنے کے ہیں اور یہی وہ تاریخی قلعہ تھا جس کے نام پر آج بھی یہ پہاڑی چوٹی ”شاہلی“ کے نام سے

یا تھا۔ اس سے باجور کا نواگئی مراد نہیں لیتے۔ وجہ یہ کہ اگر سکندر راستہ باجور کے نواگئی کے پاس ہوتا تو اسے اریگین سے پہلے نیسا بچنا چاہیے تھا جو نواگئی کے قریب واقع تھا اور اس کے بعد اریگین بچتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایرین نے جس نواگئی کا ذکر کیا تھا وہ جوری میں نہیں بلکہ کنسور میں واقع ہے۔ واقعات یہ ہیں کہ نواگئی کے ام سے دو مقامات ہیں۔

نواگئی

ایک نواگئی سمت مشرق افغانستان کے وادی کنر میں ہے اور ایرین نے جس نواگئی کا ذکر کیا تھا وہ یہی ہے کہ ہمالیہ کی ایک شاخ ملکہ اسکینی کے شاہی قلعہ کے بلند ترین اور وسیع سطح چوٹی سے جومات ہزار فٹ کی بلندی پر ایک وسیع میدان کی حیثیت رکھتی ہے اور پٹولمی کے بیان کے مطابق اس کی سطح اتنی وسیع ہے کہ اس کے سرسبز میدان میں ایک ہزار فوجیوں کے لئے قلعہ کی پیداوار ہو سکتی ہے اور اس کے پھل اور مچھول اپنی مثال آپ ہیں۔ اس وادی چوٹی سے لکھ شاخ مغرب کی طرف آسمان تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ اس درمیان میں اس کے شمال میں فوجات۔ یلم اور دہ ڈاگام واقع ہیں۔ اس کے جنوب کی طرف باجور آنے کے لئے کوتل گبر اور کوتل چرتی کے علاوہ جنوبی پہلو میں مشہور تاریخی شہر چیرکنڈ (شمرکنڈ) واقع ہیں۔ یہ پہاڑی سلسلہ آسمان کے قریب جنوب کی طرف مڑ جاتا ہے اور مٹھائی کے قریب جنوب مغرب کی طرف مڑ جاتا ہے۔ آسمان سے مٹھائی تک پہاڑی کے اس حصہ میں کوتل لکڑی، شونکڑی واقع ہے۔ اس کے کوتل کے مشرق میں باجور کا وادی چارمنگ، وادی حیدر، امانیہ جنوب مشرق وادی صو، وادی انبار اور اس کوتل کے مغرب کی طرف ڈھلان اور دریائے کنر کے مشرقی کنارے پر نواگئی واقع ہے۔

لہ مملکت (پنج دہانہ) میں ایک جگہ کا نام یلم ہے (ا) سے دوسرے

لکھ شمشادہ ہونے ایک الگ مقالہ میں بحث کی ہے (اثر)

کو اسی نام سے یاد کیا گیا ہے یہاں سے سکندر نے میدان لاشور میں مغرب کی طرف آگے بڑھ کر وادی ماندل (منڈل) کے بالمقابل جنوب کی طرف چل کر دریائے گنگ کو عبور کرتا ہوا شہر نیسا جا پہنچا تھا۔

نواگئی دوئم

گیٹس آف انڈیا میں جس نواگئی کا ذکر کیا گیا ہے کہ سکندر کی آمد کا راستہ اس سے قریب ہو کر گذرتا ہے (جبکہ ہماری وضاحت کے مطابق سکندر اس کے قریب سے ہو کر نہیں گذرا اور نہ سکندر کی آمد کا راستہ ہے) اس کا جغرافیائی محل وقوع ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

کوہ لکڑی سے مشرق کی طرف پہاڑی کا ایک دوسرا سلسلہ کوہ چمر تلی اور انبار کا واقع ہے جو وادی صیدا اور وادی صور کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔ اس پہاڑی سلسلہ کے ایک کوئل کے مشرقی ڈھلان میں شہر نواگئی نمبر دوئم واقع ہے۔ اس سے کچھ ہی فاصلہ پر دریائے گنگ کے جنوبی کنارے پر شہر ڈوڈا اور اسی کنارے پر ڈوڈا سے جنوب مشرق کی طرف درہ منڈل کے مشرقی گوشہ اور کے مور پہاڑی کی شمالی ڈھلان میں شہر نیسا کے آثار قدیمہ ہیں۔ اس نواگئی کے شمال مشرق میں عظیم ترین تاریخی شہر گنگ کے آثار قدیمہ ہیں جس کا ذکر سنہ ۳۲۳ ق م کی تاریخی یادداشتوں اور سیکسٹم کے ریگ وید منڈل ۱۷ کے سوکتوں میں کیا گیا ہے۔ اس کے قریب ہی وادی چارمگ میں تاریخی مقام صیدا اس سے شمال مغرب میں وادی اوتلی ہے۔ جس میں سنہ ۳۲۳ ق م کے عہد کے تاریخی مقامات چمر تلی اور چمر کنڈ (شکر کنڈ) سمرقند واقع ہیں۔

اس نواگئی کے جنوب مغرب کی طرف کوہ ایلا زائی کے جنوب مشرق کے ایک درہ کا نام بید منی ہے۔ اور اس نواگئی کے

یاد کی جاتی ہے۔ ملکہ اسکینی نے سکندر کو لکھا کہ میرے شاہی قلعہ کو فتح کرنے کے لئے عقاب کے پر لگا کر آنے کی ضرورت ہوگی۔ اس قسم کے ناقابل تسخیر قلعہ کے فتح کرنے کے لئے پٹولی نے غالباً عقاب کے پر لگائے ہوئے۔ آج اس تاریخی قلعہ شاہی پر پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہرا رہا ہے۔

سکندر نے کوئل گبرے سے نیچے اتر کر جنوب مشرق میں واقع مقامات گبرے دار حکومت لکھنکے تک پہنچنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ مقامات لی ٹائی، اوکا شین، ہوڑی گرام، لونی گرام، شنکر گل، ہاٹ صالی سے ہو کر گذرتا تھا۔ یہاں سے سکندر پشت کے مقام پر آ نکلا اور فوجی قلعہ اریگین پر حملہ آور ہوا اور جیسا کہ کہا گیا ہے لٹائی رن بٹ، پشت، اریگین، بگل، لکھ اور تنگی کے درمیان میں لڑی گئی تھی۔ مقامی لوگ عظیم تباہی کے شکار ہو گئے تھے کہ پشت اور اریگین کے درمیان واقع میدان جنگ کو آج بھی اس عظیم تباہی کے یادگار کے طور (طوفان شا) (تباہی کی سطح مرتفع) اور رن بٹ) کہا جاتا ہے۔

ہم نے جو نقشہ شامل کر دیا ہے۔ اس میں اریگین سے بخط مستقیم شمال مشرق کی طرف سلسلہ کوہ شنکس کے انتہا پر واقع چوٹی کے اوپر ملکہ اسکینی کے قلعہ شاہی، کوئل گبرے اور اریگین کی نشاندہی کر دی ہے اور آپ دیکھیں گے کہ گیٹس آف انڈیا کے نقشہ میں سکندر کی آمد کا جو راستہ بنایا گیا ہے، وہ اریگین لکھ، پشت، رن بٹ سے ہو کر نہیں گذرتا اور اسی سے اس نقشہ کی غلطی ظاہر ہے کہ اس میں سکندر کی اریگین میں آمد ظاہر نہیں کی گئی ہے اریگین کے فتح کئے جانے کے بعد سکندر عظیم سلسلہ کوہ شنکس کے مغربی کنارے پر وادی بلو قرا کے میدانی علاقہ میں سے ہو کر شنکس کے ہٹ پہنچوٹی کے مغربی گوشہ میں واقع مقام راغنا تک پہنچ گیا تھا۔ مقدس کتاب اوستا میں جن سولہ جغرافیائی مقامات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک راخا ہے اور مملکت ہاجور

جالتا ہے۔

ج : یورپ کے مستشرقین اسے نیسا کے نام سے یاد کرتے ہیں بلکہ درحقیقت اس کا نام نہ اس وقت نیسا تھا اور نہ آج ہے اور نہ ایرین نے اس کا نام نیسا لکھا تھا۔

ایرین نے اس قدیم تاریخی شہر کا جو نام لکھا تھا وہی نام آج بھی مقامی لوگوں میں متعارف ہے۔ مقامی لوگ اپنے علاقائی لہجہ میں جن ابجدی حروف میں اس کا تلفظ کرتے ہیں۔ ایرین نے اپنے یونانی لہجہ کے مطابق اسے مقامی ابجدی حروف کی جگہ ان کے مترادف یونانی حروف میں یہ نام لکھا۔ یورپ کے مستشرقین نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا اصل نام کورون حروف میں منتقل کرتے وقت یونانی حروف کی جگہ ایسے رومن حروف لائے جن سے اس نام کا تلفظ غلط طور پر نیسا کیا گیا اور اب شہر نیسا کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور وہ ملتا نہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے مؤرخ آج تک یورپ کے مستشرقین کی پیروی میں اسے نیسا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ افغانستان کے شعبہ تاریخ کے چیئرمین شاہ علی احمد علی خاں کہڑا نے اپنے مقالہ ”مدنیت اوستائی“ میں اور کتاب ”تاریخ اجمالی افغانستان“ میں اس سے شہر میمنہ مراد لیا ہے اور یورپ کے ایک مستشرق نے اسے سوات کے منگلور کے قریب بتایا ہے اور ہمارے ایک ہم عصر مؤرخ جناب یوسفی مرحوم نے بھی باجوڑ میں کسی جگہ اس کا محل وقوع بتایا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتا سکے کہ وہ جگہ کونسی ہے۔ آگے چل کر اس کی مزید وضاحت کی جاتی ہے۔

گیٹس آف انڈیا کے متذکرہ بالا بیان میں دوسری غلطی یہ ہے کہ سکندر اعظم نے اریکان کو دوبارہ آباد نہیں کیا تھا بلکہ جب اریکان کے فتح کئے جانے کے بعد وہ جنوب کی طرف ہانکا تو کوہ ٹنگس کے جنوب مغربی پہلو میں راخا سے کچھ فاصلہ اور اریکان سے تقریباً سولہ میل کے فاصلہ پر سکندرونہ کے نام سے ایک قلعہ آباد کیا تھا اور یہ جگہ آج بھی سکندرونہ کے نام سے یاد کی جاتی ہے جو دریائے گنگ کے شمالی کنارے قوسونہ کے بالمقابل راخا کے جنوب مشرق وادی گوم کے مغرب اور

کے مشرق میں وادی لاشورا کا وسیع میدانی علاقہ ہے جو رود ہار باجوڑ کہلاتا ہے۔

نیسا

اجمالی طور پر نیسا کے محل وقوع کی نشاندہی کے بعد اس کی مزید وضاحت کی جاتی ہے اس کے شمال میں میدان لاشوراء شمال اور مغرب کے ٹکون میں ڈوڈا، جنوب میں کے مور (میسرون) کی پہاڑی، جنوب مشرق کی طرف ترسونہ اور اس ترسونہ کے مشرق میں ارنگ کی پہاڑی جس کے جنوب ڈھلان میں عہد قدیم کے ایک پیغمبر علیہ السلام کا مزار ہے۔ جس کے متعلق مقامی روایت یہ ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کے والد حضرت مہترام دلاک علیہ السلام جن کا مزار سمت مشرقی افغانستان کے وادی لغمان میں ہے) کے بھائی ہیں۔

نیسا کے آثار قدیمہ رود گنگ کے جنوبی کنارے سے شروع ہو کر کے مور (میسرون) کی نصف شمالی ترائی میں ڈھانی میل چڑھائی اور ساڑھے تین میل لمبائی میں کے مور کے نصف دامن تک چلے گئے ہیں اس شہر کی آبادی کے مور کی چوٹی کے گرد گوم کر مشرق تک چلی گئی تھی۔ یہاں ایک پُر فضا مقام کا نام تخت ہے جس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ شاہی محلات کی جگہ تھی کوئل تخت سے جنوب کی طرف آگے جا کر ایک عظیم الشان شہر کے آثار قدیمہ ملتے ہیں جو سنگ مرمر سے بنے ہوئے شاندار محلات کے کھنڈرات کی صورت میں داستانِ عبرت سامنے ہیں۔ یورپ کے مستشرقین شہر نیسا کے محل وقوع کو متعین نہیں کر سکے ہیں اس کے دو وجہ ہیں۔

الف : یہ کہ ایرین کی تالیف انڈیکا میں یہ نام جن یونانی حروف میں تحریر میں لایا گیا تھا۔ رومن اور انگریزی ابجدی حروف میں اسے صحیح شکل میں نقل نہیں کیا گیا۔ اس وجہ سے نام کا تلفظ غلط کیا لے اسپین میں ایک علاقہ کا نام ترسونہ ہے اور وہ بھی باجوڑ کے ترسونہ کے متبادی الاملاخ خلقت علاقہ ہے۔ (اثر)

پہاڑی ”کے مور“ کے شمالی تہمیٹی میں واقع ہے۔ اس وادی کے مشہور شہر نیسا کی طرف رخ کیا تھا اور جیسا کہ ذکر کیا گیا یہی وہ تاریخی شہر ہے جو بعد کے مورخین کے لئے درود سرنا ہوا ہے اور اس کا محل وقوع متعین نہیں کر سکے ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے اس شہر کے قریب واقع پہاڑ کا نام میسورن نہیں ہے جیسا کہ سٹریبون نے بیان کیا ہے۔ بلکہ اس کا نام کیمر ہے اور نیسا اس کے شمالی تہمیٹی میں واقع ہے۔

مورخین کو شہر نیسا کے محل وقوع متعین کرنے میں اس نے مشکلات پیش آ رہی ہیں کہ ایرین نے اس شہر کا نام حرف (ی) سے (NYCA) سے تحریر نہیں کیا تھا کہ اسے نیسا پڑھا جاتا بلکہ اس نے یہ نام حرف (س) سے (NYCA) ضبط کیا تھا اور اس میں بھی حرف (س) سے حرف (س) کی آواز نہیں لی گئی تھی۔ خور کیا جائے تو اطمینان خصوصاً اٹلی کی زبان اور یونانی زبان میں حرف (س) تین آوازیں دیتا ہے (س-ک-ج) ایرین نے اس جگہ کے نام (NYCA) میں حرف (ک) کی آواز اختیار کی تھی یعنی حرف (ک) کے لئے اسے استعمال کیا تھا۔ باجور کے قدیم یونانی باشندوں کے ہجہ میں اس شہر کا اصلی نام (نیسا) ہے۔ اس عہد میں جب سکندر نے حملہ کیا تھا۔ مقامی لوگ اسے نیسا کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں۔ بعد کے مورخین جن کو اس تاریخی شہر کے لوگوں کے ہجہ اور تلفظ کا علم نہیں تھا اپنی نا سمجھی سے ایرین کے تحریر کردہ نام (NYCA) کو حرف (س) کی جگہ حرف (س) سے (NYCA) نیسا لکھ کر ایک صحیح نام کو غلط بنا دیا اور چونکہ اس جغرافیائی خطہ میں نیسا کے نام سے کسی بھی جگہ آثار قدیمہ کا وجود نہیں تھا۔ اس لئے اپنے ہی ہاتھوں اس تاریخی شہر کے تعین کے امکانات کو ختم کر دیا۔

آج یہاں پٹھانوں کی جن ذیلی شاخوں کے لوگ آباد ہیں وہ حرف (ک) کی جگہ حرف (خ) کا تلفظ کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ سرزمین جن قبائل سے قبضہ میں لی تھی باجور کے وہ قدیم رہنے والے آج باجور کے شمال میں واقع کوہستانی علاقے میں آباد ہیں۔ باجور کا ایک پشتو جملہ ہے، خان پختیر راجہ (خان انیسر سے

جندول کے جنوب مغرب۔ نیسا کے شمال مشرق اور رود بار باجور کے مشرق میں ایسے جغرافیائی محل وقوع میں واقع ہے۔ جہاں سے ان تمام علاقوں پر نظر رکھی جاتی ہے اور ان کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ مشہور کتاب ژند اوستا میں جن سولہ جغرافیائی ملکوں کا نام ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک کا نام راخا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسئلہ تمام میں مملکت باجور کا دار الحکومت راخا تھا اور اسی کے نام سے یہ ملک پاؤ گیا تھا راخا اپنے محل وقوع کے لحاظ سے کچھ ہی فاصلہ پر بہانہ شمال مغرب واقع ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۰۰ء میں جب کزن باجور، سوات، اسکرود کے راستے چل کر ریاست نیپال کے مغربی دروں سے ہو کر وسط ہند پر حملہ کیا تھا تو اس نے باجور پہنچ کر قلعہ سکندر وند سے کچھ ہی فاصلہ پر بہانہ جنوب مغرب ایک عظیم الشان قلعہ تعمیر کیا تھا۔ جس کے چاروں برج اپنی جگہ قلعہ کی حیثیت رکھتے تھے اس وجہ سے چار قلعہ کہلائے اور آج کل جاہ کہلاتا ہے۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر شہنشاہ دہلی کے جرنیل زین خان کو کہ جب باجور پہنچے تو اس نے مشرق کی طرف ہٹ کر قلعہ سکندر وند سے چار پانچ میل نیچے کوہ ٹنگس کے جنوب مشرقی تہمیٹی میں دریائے ٹنگس کے شمال، وادی جندول کے جنوب اور قلعہ شال کڑ کے جنوب مغرب میں قلعہ تعمیر کیا تھا۔ اس تفصیل پیش کرنے سے مقصد یہ ہے کہ سکندر نے اپنے نام سے قلعہ سکندر وند ایک ایسی جگہ تعمیر کیا تھا جو فوجی نقطہ نگاہ سے اریگاین اور نیسا سے زیادہ اہمیت کا حامل جگہ تھی۔ اریگاین کو تعمیر نہیں کیا تھا۔

نیسا

ہم اب اپنے پہلے بیان کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ اریگاین سے چل کر سکندر نے راخا کے مقام پر پہنچ کر کوہ ٹنگس کی جنوبی تہمیٹی میں سکندر وند کے نام سے فوجی قلعہ تعمیر کرنے کے بعد دریائے ٹنگس کے شمالی کنارے پر رود بار باجور کے علاقہ میں مغرب کی طرف پیش قدمی جاری رکھی اور میدان لا شور میں سے وادی ماندل (منڈل) جو تاریخی

کناسے تک پہنچی ہوتی ہیں۔ جس کی بارہ دریاں، سیڑھیاں اور اشانان کے گھاٹ ابھی تک موجود ہیں۔ تاریخی قدامت کے لحاظ سے اگر ہم اسے برصغیر پاک و ہند کا سب سے قدیم ترین شہر قرار دیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اسی عیساکے شمال مشرق کی ایک وادی میں دو قدیم شہروں کے آثار قدیمہ موجود ہیں ایک کا نام ہے موہنجو اور دوسرے کا نام ہے داروہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سنہ ۲۵۰۰ ق م وادی سندھ کے شہر موہنجو داروہ کے بسنے والے یہاں کے دو شہروں موہنجو اور داروہ سے جانے والے لوگ تھے تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ جبکہ کتاب ریگ ویداکے پانچویں منڈل میں جن مقامات کا ذکر کیا گیا ہے وہ اسی عیساکے سرزمین سے تعلق رکھتی ہیں۔

محل وقوع

میرے گرامی قدر محترم دوست مرحوم اللہ بخش یوسفی نے اپنی تالیف ”تاریخ یوسفزائے“ کے صفحہ ۱۶۷ پر ایک نقشہ دیا ہے جس میں برصغیر پاک و ہند کے انتہائی شمال مغربی علاقہ باجوڑ میں سکندر کے داخلہ اور وادی پشاور میں اس کے جرنیل کے داخلہ کے راستوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مرحوم نے یہ نقشہ کتاب ”گیتس آف انڈیا“ سے یا کتاب ”انسائیکلو پیڈیا آف انڈیا“ یا مسٹر مارٹن کی تالیف ”پاک و ہند کے شمال مغرب کے جغرافیہ کی مطالعات“ میں سے کس سے لیا ہے۔ وجہ یہ کہ انہوں نے اپنا مأخذ نہیں بتلایا۔ بہر حال یہ نقشہ کئی اعتبار سے غلط ہے اور ہم اس کی غلط بیانیوں کی تصحیح اس طرح کرنا چاہتے ہیں کہ دوسری ضروری معلومات بھی علم میں آسکیں خصوصاً اس دوران میں مصر کی ملکہ کلوپٹرو کے جبرائید پٹولی نے جو سکندر کے افواج کے نامی گرامی جرنیل تھے، نے ”ملکہ اسکینی“ کے جس دار الخلافہ پر حملہ کیا تھا اس کا محل وقوع بھی متعین ہو سکے اور اس سلسلہ میں سب سے اہم فوجی قلعہ اریان کا محل وقوع بھی متعین ہو سکے۔ متعلقہ سلسلہ ہم نے اپنے قریب دیئے ہوئے نقشہ میں ان دونوں تاریخی مقامات کا محل وقوع متعین کر دیا ہے۔

آئے) جبکہ یہی جملہ باجوڑ کے یہ قدیم یونانی باشندے یوں ادا کرتے ہیں۔ کان پکیسے راگلے۔ اس علاقے لہجہ کے اختلاف کے مطابق شہر نیسا = (نیکا) کے موجودہ پشتو بولنے والے اسے (نیخا) کہتے ہیں۔ جبکہ حقیقت نیخا ہی اس جگہ کا قدیم ترین اور چھ ہزار سال کا پرانا نام ہے۔ ہم اس نام کے پس منظر کی تفصیل میں نہیں جاسکتے۔ مختصراً یہ کہ پشتو حروف تہجی میں حرت (ج) غیر منقوٹ کی آواز نہیں ہے۔ یہ لوگ رحمن کو رحمن اور نوح کو نوح کہتے ہیں۔ یہ لوگ حروف (و۔ ی) ایک دوسرے کی جگہ تبدیل کرتے ہیں۔ (مور : صاں) کو (میسر) کہتے ہیں۔ تو رتیکر کور : کیر۔ یشتون، پشتین، اس کی مثالیں ہیں۔ اس کے پیش نظر نوح : نیخ : فوہا : نیخا۔ نیخا : نیخا : نیکا کے الفاظ سمجھ میں آجائیں گے۔ پشتو زبان میں جدا علی کو نیکا : نیکہ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نوح : نیخ : نیخا : نیکا موجودہ بنی نوع انسان کے جدا علی ہیں۔ جنہیں ابوالہرثانی کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے انہیں نیخا : نیکا کہنا حقیقت کا اظہار ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ عیساکے آبادی قبل از طوفان نوح کی آبادی ہے اور اس بات کو اس سے تقویت ملتی ہے کہ نیسا سے کچھ ہی فاصلہ پر ایک پیغمبر کا مزار پرانوار ہے جس کے متعلق پورے تاریخی استناد سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کے والد ماجد مہتر لام (لامکت) کے بھائی کا مزار ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے ایک فرزند کا نام تھا سام اس کے ایک فرزند کا نام تھا پشت جو پشطانوں کا موزٹ علی ہے اور جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے نیکا کے شمال مشرق میں پشت نام کے ثقافتی آثار قدیمہ موجود ہیں۔ اوپر دو لہجوں مور : میسر کا ذکر کیا گیا اس کے پیش نظر نیسا کے جنوب میں واقع پہاڑ کے نام (کے مور) میون، کی یکسانیت سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس تاریخی نکتہ کے بیان کرنے سے ہمارا مقصد اس تاریخی شہر کی قدامت کی طرف اشارہ کرنا تھا جبکہ ہم اس سلسلہ میں تفصیلی معلومات رکھتے ہیں۔

شہر نیسا کی آبادی کی شمالی دیواریں دریائے گنگ کے خنہ

وادئی جندول کے جنوب مشرق میں گو سم اور جندول کے تھون میں واقع اس عہد کے عظیم اٹان قلعہ اور عظیم اٹان معبد مٹا کا ہے انہیں نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔ ہم ذیل میں یہ نقشہ ضروری اضافہ اور تفصیح کے ساتھ درج کر رہے ہیں۔

تاریخی نکتہ

ذیل میں نیسا کا جو نقشہ درج کیا جا رہا ہے، اس جغرافیائی خطہ کے صرف چند نام ہی ہم درج کر سکے ہیں۔ لاقعد نام ایسے ہیں جو ثقافتی آثار قدیمہ کی نوعیت رکھتے ہیں اور جن کا ذکر دو مشہور کتابوں ریگ وید (منڈل ۷) زمانہ سنہ ۱۲۰۰ ق م اور کتاب اوستا زمانہ سنہ ۱۰۰۰ ق م اور کتاب الاحبار اور کتاب الاساطین (تورات کے دو حصے) زمانہ سنہ ۱۲۰۰ ق م میں آچکا ہے۔ یہ تمام اس قسم کے تاریخی نکتے ہیں جو پاکستانی مؤرخین کے لئے قابل غور ہیں۔ سکندر کے حملہ کے وقت (۳۳۰ ق م) یہاں دو قوموں کا ذکر ملتا ہے۔ کینی (دقیقی) اور اسپاسینی ان میں سے اسپاسینی وہی لوگ ہیں جن کے نام کی نسبت سے یورپ کے ایک مملکت کا نام اسپین یاد کیا گیا ہے قابل غور بات یہ ہے کہ مملکت سپین کے موجودہ جغرافیائی نقشہ کے دریاؤں ندیوں، تالوں، پہاڑوں، میدانوں اور مقامات کے لاقعد نام پیش نظر جغرافیائی نقشہ کے علاقوں میں جوں کے توں موجود ہیں۔ دور دراز کے دور ملکوں میں ناموں کی یگانگت نظر انداز کرنے کی نہیں ہے۔

نقشہ میں قابل ملاحظہ باتیں درج ذیل ہیں۔

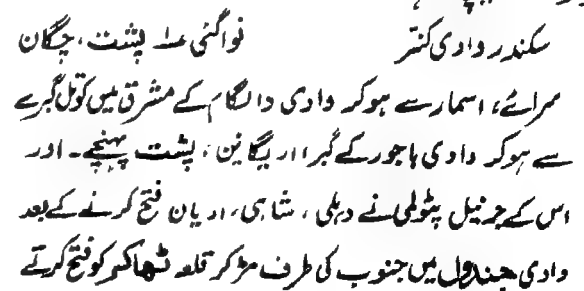
الف: یہ کہ اس نقشہ میں سکندر کا موجودہ افغانستان کے سمت مشرق کے وادی کنڑ میں دریائے کنڑ کو پشت اور جلال آباد (کامر) کے درمیان کوہ لکڑی کے مغربی ترائی میں واقع موضع فواگئی کے پاس عبور کرنا ظاہر کیا گیا ہے۔ حالانکہ سکندر نے وادی کنڑ میں دریائے کنڑ کے کنارے آگے بڑھ کر اسمار کے مقام پر دریائے کنڑ کو عبور کیا تھا اور وہاں سے مشرق کی طرف درہ داگام میں داخل ہو کر اس وقت کے باجور کے داراللمومت پشت اور اریگائن تک پہنچنے کے لئے اقدام کیا تھا۔ وہ پشت ہیں ایک پشت کنڑ میں اور ایک پشت باجور میں۔

ب: اس نقشہ میں سکندر کا باجور میں داخلہ فواگئی میں واقع وادی چارہنگ کے مغرب کی طرف سے ظاہر کیا گیا ہے۔ جبکہ سکندر نے فواگئی (مٹ) کی طرف سے باجور کے شمال میں واقع کوتل گبری سے ہو کر حملہ کیا تھا۔ خود سکندر نے اس کوتل سے جنوب مشرق کی طرف چل کر گبرہ۔ کلاہ اریگائن، پشت پر میدان کارزار گرم کیا اور اس کا جرنیل پٹولی کوتل گبری کے مقام پر اس سے الگ ہو کر بجانب مشرق چلتا ہوا کوتل دھلی (دھلی) سے ہو کر جنوب کی طرف چڑھائی چڑھا ہوا ملکہ استینی کے شاہی قلعہ پر (جو آج کل حرف شاہی کے نام سے موسوم ہے) پر حملہ آور ہوا تھا اور اس کے بعد اسے قلعہ اربان پر غورنریز لڑائی لڑنے کا

سامنا کرنا پڑا تھا اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے فتح اریگائن کے بعد سکندر نے سلسلہ کوہ شنکس کے مغربی پہلو میں اور پٹولی نے اس سلسلہ کوہ کے مشرقی پہلو میں آگے بڑھ کر ان دونوں کی فوج ہشت پہلو چوٹی شنکس کے جنوبی ڈھلوانوں اور دریائے گنگا کے شمالی کنارے پر ایک دوسرے سے مل گئی تھی اور یہاں سکندروں

نام کے قلعہ کی تعمیر کے بعد جنوب مغرب کی طرف بڑھ کر نیسا پہنچ گئی اور پھر وہاں سے فراغت کے بعد پھر ایک دفعہ بجانب مشرق چل کر

۱۔ کینی (دقیقی) کا ذکر کتاب الاحبار (دقیقیوں) اور کتاب الاساطین دونوں میں ہے اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اس قوم کے لوگ سنہ ۱۲۰۰ ق م میں، جسے اس خبر اور نقشہ کے متعلق جغرافیائی حقائق ملے تھے واضح



پشتو کہاو تیں

حسین احمد مدنی

کی ذہانت اور ایک آدمی کا جو ہر تیز کام کرتا ہے۔ ان کہادوں کے ذریعے ہم اس زبان کی تاریخی قدامت اور وسعت کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

پشتو دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس کا لڑیہ بچر بہت پرانا اور اچھا خاصہ وسیع ہے۔ اس کے الفاظ کا ذخیرہ بھی بڑا ہے۔ چنانچہ اس زبان میں ضرب الامثال بھی بہت زیادہ ہیں بلکہ کہا جاتا ہے کہ پشتو میں تو کوئی بات بغیر مثل یا کہادت کے نہیں کہی جاتی۔ پشاور یونیورسٹی کی پشتو اکیڈمی کے پچھلے چند سالوں میں بارہ ہزار سے زیادہ کہاو تیں فراہم کر چکی ہے اور ابھی تلاش جاری ہے۔

پشتو زبان اور پشتون کچر میں کہادوں کو ایک اہم مقام حاصل ہے جو شاید دوسری مشرقی زبانوں کو نہ ہو۔ یہ کہاو تیں پٹھانوں کی قومی خصوصیات کو ظاہر کرتی ہیں۔ اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ یہ ایک پختہ اور عمر رسیدہ ملی گروہ ہے اس کا معاشرہ مکمل اور ہمہ گیر ہے۔ اس کے افراد زمانے کے گرم و سرد کا تجربہ رکھتے ہیں اور ان کے کچر میں بڑی وسعت ہے۔ پشتو زبان میں ضرب الامثال کی کثرت کا بڑا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ پٹھان شروع ہی سے کٹھن اور دشوار گزار منزلوں سے گزرتے آئے ہیں۔ وہ زندگی کی بوقلمونی اور مدوجزر سے

عربی زبان کا مشہور مقولہ ہے کہ ”المثل عنی الکلام کا ملج فی الطعام“ یعنی بات چیت میں کہاو تیں ایسی ہوتی ہے جس طرح کھانے میں نمک۔ اگر کھانے میں نمک نہ ہو تو وہ بے مزہ اور پھیکا ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر گفتگو میں مقولے اور ضرب الامثال نہ ہوں تو وہ پھیکی اور بے مزہ ہوتی ہے۔

ضرب الامثال کی تعریف کرتے ہوئے مشہور یورپین ادیب چارلس انڈیل کہتے ہیں کہ

”عرب الامثال ایسے چھوٹے چھوٹے جامع مگر تیز اور چبھنے والے جیسے ہوتے ہیں جن میں انسانی تجربے اور مشاہدے ظریفانہ انداز میں بیان کئے جاتے ہیں۔“

ایک دوسرے ادیب کے خیال میں یہ ایسے مختصر اور جامع جملے ہوتے ہیں جو قوم کے احساسات و جذبات، تہذیب و تمدن، اور فہم و ذکاوت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ایک اور صاحب ان کہادوں میں معانی کے ساتھ ساتھ نمکینی اور مزاح کی آمیزش ضروری سمجھتے ہیں۔

ارل رسل کا کہنا ہے کہ کہاو تیں یا مثل میں بہت سے لوگوں

واقف ہیں۔

رکھتی ہیں۔

مثلاً،

- (۱) ”سارخسہ پیسے بنیوہ چچے وحی۔ جو ر میلہ رہا
یعنی کو اکائیں کاٹیں کر رہا ہے شاید کوئی بہان آئے گا۔
(۲) ”ہفتہ سرہ گیدر سینگے ڈاکہ حکمے و سر لہ ہدسہ
کار کوی“

یعنی اس کے پاس گیدر سنگی ہے جس کی مدد سے وہ دونوں
کو سحر کرتا ہے۔

- بعض کہاتوں میں قوی کردار اور ملی شاعر کا اظہار ہوتا ہے مثلاً،
(۱) ”منعت وخت کنبی تر بوسرم پکار راجی“
یعنی چچرا بجائی بھی سخت وقت پر کام آتا ہے۔ پٹھانوں میں
چچا زاد بجائی عموماً دشمن سمجھا جاتا ہے مگر آٹے وقت میں وہ بھی
کام آ جاتا ہے۔

(۲) ”پیرے منو کو تکٹے نہ منو“

یعنی ہم پیر صاحب کو تو مانتے ہیں مگر ان کے ڈنڈے کو نہیں
مانتے۔

- (۳) ”چہ او غوار سے پیسے دِ خولہ فخورے بہ پیسے
پیسے کمے خولہ“

یعنی جب مانگو گے اس منڈے تو کھاؤ گے کس منڈے۔

- (۴) ”چہ دِ گیدر سبکار لہ حے تو تا بیہ ورتہ دِ
امزری کوہ“

گیدر کے شکار پر جاتے وقت تیار ہی شیر کے شکار کی یاد

- (۵) ”حتک وائی خدا یہ یوخر کے او یو تیر کے رالہ
را کے بیامہ تہ دھر خہ نہ خلاص ہے“

تھک کہتا ہے کہ اے خداوند ایک گدھا اور ایک کھارڈی مجھے
دے دے پھر تو میرے رزق سے بے فکر ہو جا۔

بعض کہاتیں فرضی باتوں پر مبنی ہوتی ہیں ان میں عموماً تخیلی باتوں

پشتوں کی کہاتیں بھی عوامی ادب کا حصہ ہیں بلکہ یہ بیشتر عوام کی ساختہ
پر داخل ہیں اور سینہ بسینہ منتقل ہوتی آتی ہیں یہ زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ
کئے ہوئے ہیں۔ ان میں ایسی بھی ہیں جن کو ضبط تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔
یہ مختلف نوعیتوں کی ہیں ایک وہ جو بعض تاریخی واقعات پر مبنی ہیں دوسری
وہ جو چند مذہبی عقائد، رسوم و روایات اور توہمات کی بنیاد پر بنائی
گئی ہیں۔ تیسری بعض الہی فرضی باتوں سے متعلق ہیں جو عوام میں مانی جاتی
ہیں۔ چوتھی وہ کہاتیں ہیں جن کا تعلق قومی یا علاقائی تعصب سے ہے۔

پانچویں وہ کہاتیں جو ایک مخصوص طبقے میں مستعمل ہیں اور انکی ماحول
سے متعلق ہیں اور چھٹی قسم میں پئے، مصرعے یا شعر بطور کہات کے استعمال
کئے جاتے ہیں مگر عموماً یہ ضرب الامثال ایسے واقعات یا حالات کی
طرف اشارہ کرتی ہیں جو عام ہوں مثلاً خوک اُولوی ملاشی۔
اُولخوک اُولوی بلاشی یعنی بعض لوگ پڑھ کر عالم بن جاتے
ہیں اور بعض لوگ پڑھ کر مصیبت ہی جلدتے ہیں۔

اسی طرح کہتے ہیں کہ ”لور پیسے لو تہاے تیسرے ول“
یعنی درانتی مٹی کے ڈھیے پر تیز کرنا۔

یہ مثل کام چور اور کاحل کے لئے استعمال ہوتی ہے۔

چند تاریخی کہاتیں مندرجہ ذیل ہیں

- (۱) ”دِ سبکھ نہ ٹے تبلیا بدوی“؛ یعنی سبکھ سے اس
کا نوکر بُرا ہوتا ہے۔

- (۲) ”پیشوز برکے شوہ منبرک نہ نیسی“؛ یعنی
بلی بردگ بن گئی ابد اب چوہوں کو نہیں پکڑتی۔

- (۳) ”خرکے تر مکے لار شی۔ چہ بیرتہ شی
ہفا خردے“؛ گدھے کو اگر کوئی شخص شہر تک بھی
لے جائے۔ پھر بھی واپسی پر وہ گدھا ہی رہے گا۔

بعض ضرب الامثال عوام کے عقائد اور توہمات سے تعلق

(۱۱) ”دُسکہ حقیقت دھفہ پیہ گیر و کنہی دے“ سکھ کی حقیقت اس کی داڑھی میں ہے۔

عورتوں کے بارے میں بھی پٹھانوں کی کہاوتیں قابلِ سماعت ہیں مثلاً:-

(۱۲) ”د دہئے نہ چا تپوس او کرو۔ و یار دہوشو۔
هغه وے د کے کوئے“

کسی نے طوائف سے کہا: تیرا یار مر گیا۔ اس نے کہا کون سی گلی کا۔

(۱۳) ”دہنچے لہ یا کور دے او یا کور“

یعنی عورت کے لئے یا گھر ہے اور یا قبر۔

(۱۴) ”دہنچے عقل پیہ پوندرو کنہی وی“

عورت کی عقل اس کی ایڑی میں ہوتی ہے۔

مندرجہ ذیل مزب الامثال سے پٹھانوں کی فراست اور عاجی شعور کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔ جیسے:-

(۱۵) ”دہرہ خیتہ فارسی وائی“

بھرا ہوا پیٹ فارسی بولتا ہے۔

(۱۶) ”دوست دھفہ دے چہ پیہ سہنے کنہی دیکار
راشی“

یعنی دوست دہی ہے جو معیبت کے وقت کسی کام آئے۔

(۱۷) ”د کعقل دوست نہ ہو بنیاد دشمن
خدا دے“

بیوقوف دوست سے ہوشیار دشمن اچھا ہوتا ہے۔

(۱۸) ”د مزدور پیہ شانئے اوختہ وکھ
دخان پیہ شان کے و خورہ“

مزدور کی طرح کھاؤ اور رئیسوں کی طرح کھاؤ۔

خیالی قصوں اور افسانوں کے حوالے ہوتے ہیں مثلاً

(۱) ”ژوندی منبرکان پیہ تلمہ کسین تلم“ یعنی زندہ چوہوں کو تر از مرگ میں توں۔

(۲) ”د میبزی پیہ کور کنہی ہروخت غم وی“ چوٹی کے گھر میں ہر وقت ماتم ہوتا ہے۔

(۳) ”د خرم مرگ د سپو اختردی“ گدے کی موت کتوں کی عید ہوتی ہے۔

(۴) ”چیندخ پیہ لورہ اوختو کشمیرئے اویدو“
مینڈک ایک ڈھیلے پر چڑھ کر کہتا ہے کہ اس نے کشمیر کو دیکھا ہے۔

(۵) ”لکھ وی نو او خورہ کنی نھرا و سہ“ اگر ہے تو کھاؤ ورنہ بھوکے رہو۔

(۶) ”د ندر کار گورہ قلدئے مہ گورہ“ بہادر آدمی کے کارناموں کو دیکھو اس کے قد کو نہ ناپو۔

(۷) ”بخیلئے پیہ خپمہ کنہی معلومیگی او سرے پیہ میدان کنہی“ جو توں کی اچائی اور برائی کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب ان کو پہنا جائے اور مرد کی مردانگی میدان جنگ میں معلوم ہوتی ہے۔

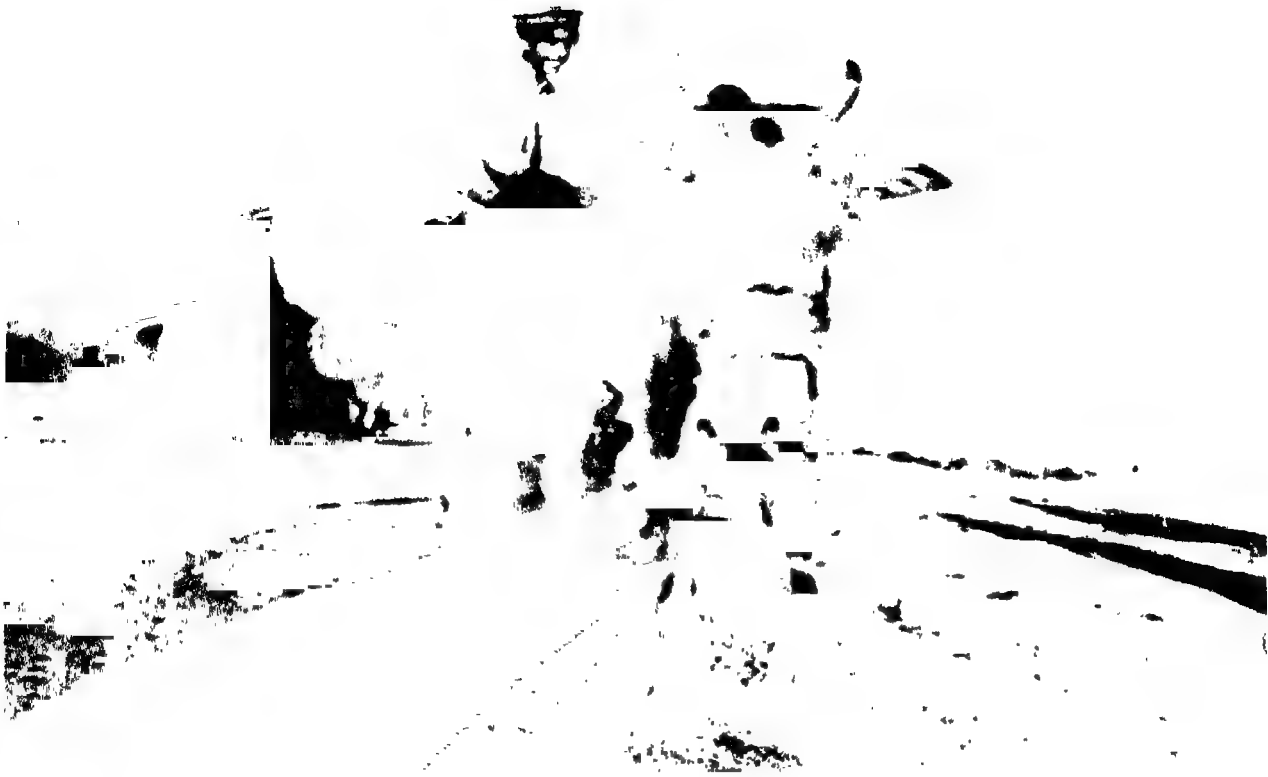
ہندوؤں اور سکھوں کے بارے میں چند مشہور کہاوتیں ملاحظہ ہوں۔ ان سے پٹھانوں اور ان غیر مسلموں کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے جیسے:-

(۸) ”دھندو کھدا دلاس پراقتل او ہندہ ول دی“

ہندوؤں کا نوح ہاتھوں کا کھونا اور بند کرنا ہے۔

(۹) ”دھندو جہرل او پیازئے خورل“ ہندو رو رہا تھا اور پیاز کھا رہا تھا۔

(۱۰) ”دھندو کیدہ دولت دے“ دولت ہندو کے داڑھی ہے۔



در کانونِ مطالعاتی ہوئے

جنگشی اور خوشدلی قبائلی جوانوں کا طرہ امتیاز ہے





نالی بچے

قبائلی جوانان مسلمانانی رقص پیش کر رہے ہیں





استاذ علمای کربلا



نقاشی عوام و ادب و مشهور در ایران

قبائلی علاقے کا ایک مکان

قلعہ جہود کا ایک منظر

- (۲۸) یہ سینڈکول کا تول یا وزن ہے دو کو اگر ترازو میں ڈالا
جائے تو چار اس سے باہر کو دتے ہیں۔
”آخرہ زمانہ شوہ۔ دچر کا نو یا رانہ
شوہ۔“
(۲۹) مرغوں کا آپس میں دوستی کرنا قیامت کی علامت ہے۔
”چند اوبدان ساتے نو درن ازہ لوبیہ جو رہ
کمرہ۔“
اگر اونٹوں کو پانا ہو تو ان کے لئے پھر بہت بڑا
دروازہ بنانا ہوگا۔
(۳۰) ”دزور وروا و بے پے لورہ خیمڑی۔“
ماقت در اور اثر و رسوخ والوں کی بات ہر جگہ مانی
جاتی ہے۔
(۳۱) ”خوک وائی خہ او کو اوٹھوک وائی خہ کو و“
بعض لوگ اتنے غریب ہوتے ہیں کہ کھانے کو انہیں کچھ نہیں
مقا اور بعض لوگ اتنے مالدار کہ مسلسل خرچ کر کے بھی ان کی
دولت ختم نہیں ہوتی۔
(۳۲) ”اوچی تہ چا وے دوہ او دوہ شوکیکی۔“
ہفتہ وے خلور دوتہئے۔“
ایک بھوکے آدمی سے کسی نے پوچھا۔ دو اور دو کتنے
ہوتے ہیں اس نے کہا چار روٹیاں۔
(۳۳) ”مخر پلار کہ او مطلب پوسے بار کہے“
یعنی مطلب کے وقت گدے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔

- (۱۹) ”سور حیات وی پکمرے دیدے“
اللہ سے سر کی سلامتی مانگو تو گڑیاں بہت ہیں۔
(۲۰) ”یو فوا ڈانگ دے او بل خوا پرانگ دے“
ایک طرف ڈنڈا ہے اور دوسری طرف چیتا ہے۔
(۲۱) ”کم دیلے دفتح کہ راغله“
کوئی دلی فتح کر کے آرہے ہو۔
(۲۲) ”هغه موچے نورے وی چہ علی نے شات وی“
وہ مکھیاں اور ہوتی ہیں جن کا نفع نہ شہد ہوتا ہے۔
(۲۳) ”آسونو لے نالونہ وھل، چن، خوھم لینے او
چتے کرے“
گھوڑوں کے نعل لگاتے وقت سینڈکول نے بھی پاؤں
اٹھائے۔
(۲۴) ”پے زورگی نہ کیبزی“
دوستی اور آپس میں تعاون زور سے نہیں ہو سکتی۔
(۲۵) ”چہ پے مہم نہ رائی۔ ناممے
تہ رائی۔“
جو کسی کے کام نہ آئے اس کا نام یاد رکھنا فضول
ہے۔
(۲۶) ”دور باب د سپی پے خولے نہ پلیتی بزی“
دریا سے اگر گت پانی پیجے تو اس سے وہ ناپاک
نہیں ہوتا۔
(۲۷) ”دچیند جا فوقول دے چہ دوہ پے تہ
کبن اچے فوخلور ترے دانگی۔“

(انشائیہ)

داستان اپنے پروفیسر بننے کی

محمد احمد شمس

جیسے عشاق و فانیہ یہ نہیں بتا سکتے کہ ان کا عشق کس لمحہ کس گھڑی، کس دن شروع ہوا تھا اور وہ اس ضمن میں روزِ اوّل کا ذکر لے کر بیٹھے ہیں یا جس طرح بعض لوگ اپنی خوبیوں اور دوسروں کی خامیوں کو اپنی اور ان کی سرشت کا حصہ سمجھتے ہیں، اسی طرح ہمیں بھی اس وقت کچھ صمیم یاد نہیں کہ ہمارے دل نادان میں پروفیسر بننے کا ارمان کب، کیسے اور کیوں پیدا ہوا۔ عین ممکن ہے یہ بھی اتفاقِ طبع قسم کی کوئی بات ہو اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب سے ہمیں حروفِ تہجی کی پہچان ہوئی تو ہم نے الفاظ، اوراق، کتب اسباق اور قلم و دوات کو مولانا کے ڈنڈوں اور اللہ کے بندوں کے مقابلہ میں، بے آزار، باوقار، دلنواز، مستند و معتبر پایا ہوا دیوں اور انہیں کتابوں سے دلچسپی ہوئی ہو اور بعد میں جس طرح برداشتِ دیگران، عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی میں بدل جاتا ہے اسی طرح کتابوں کے ساتھ ہماری یہ معصوم سی دلچسپی، اس پیشہ میں دلچسپی سے بدل گئی ہو جس میں ہمیں، اپنے خیالیِ خام کے مطابق صرف کتابوں، ان کے شائقین علم کے طالبوں اور صاحبِ علم، علم نواز اساتذہ سے واسطہ پڑتا چاہیے تھا۔

اب آپ سے کیا پردہ، ہم ابتدا ہی سے ان لوگوں میں ہیں

جنہیں کتاب سے فراغ ممکن نہیں ہوتا کیونکہ وہ کتاب خواں ہوتے ہیں، صاحبِ کتاب نہیں ہوتے۔ چنانچہ جلد ہی ہماری کتاب خوانی ایک ہم غلانی مسئلہ بن گئی۔ اور یہ مسئلہ جب ہماری تانی اماں کے زیرِ غور آیا یا لایا گیا تو بزرگانہ عفو و درگزر سے کام لے کر فرماتے گئیں: "میاں صاحبزادہ! آپ کی یہ کتاب بازی، بیس، میٹر بازی، تنگ بازی، پٹے بازی کی طرح ایک لت ہے و اہیات اور فضول مگر تیر، چند روز آپ اپنا شوق پورا کر لیں، راقم میں بلوفت اُٹے گی تو آپ سے آپ یہ لت چھوٹ جائے گی۔ آخر آپ رزق کا کیکڑا ہیں کتابوں کا کیکڑا کب تک بنے رہیں گے۔"

ان دنوں ہمارے شہر میں مسلمانوں کا ایک ہی اسکول و نائیکوول اسکول تھا اور وہ بھی مڈل، ہم نے آنسو میں تک اسی اسکول میں پڑھا۔ اس کے ناظم اور ہیڈ ماسٹر دونوں حضرات کے نہیں معلوم کیسے ہمیں باور کرایا کہ ہم اور صرف ہم ملت اسلامیہ کے مفقہ کا ستارا ہیں چنانچہ نظامتِ تعلیم کے زیرِ اہتمام ہونے والا یہ امتحان ہم جس قدر اقتیاز کے ساتھ پاس کریں گے اسی قدر اسلامیانِ ہند کا وقار اقوامِ عالم میں بلند ہو جائے گا۔ ان بزرگوں کا لگن سے قطع نظر، ہمیں خود بھی "مدرسہ حالی" اور "بانگ درا" کے چیدہ چیدہ اقتباسات سے ذاتی قسم کا علم ہو چکا تھا کہ ہم اس قوم کے نوجوان ہیں جو کہیں "جہانگیر جہاندار و جہاں بان و جہاں آرا" نہیں مگر کبھی قمرِ ملت میں نہ گرا

ہوئی ہے اس لئے ہم نے بھی یہ سوچا کہ ہماری انفرادی کوشش سے پوری ملت کا بول بالا ہوتا ہے تو یہ تو ہم خرم دم ہم ثواب والی بات ہوگی، کیا محجب ہم بھی تاریخی کردار ادا کرنے کے لئے دنیا میں بھیجے گئے ہوں!

چنانچہ ہم دل و جان سے مطالعہ میں منہمک ہو گئے اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مڈل کا یہ امتحان ہم نے اعلیٰ ترین امتیاز سے پاس بھی کر لیا مگر یہ دیکھ کر ہمیں سخت حیرت اور مایوسی ہوئی کہ جس مدت کی ناموری کے لئے ہم نے اُدھی اُدھی رات تک چراغ کا تیل جلا یا تھا دماغ سوزی کی تھی، جسے سربلند دیکھنے کے ارمان میں ہماری آنکھیں مینک آشنا اور کمرقم آشنا ہو گئی تھی، ہماری کامیابی کے بعد بھی اس کی حالت جوں کی توں رہی، انتہا تا ہم نے بھی اپنی جگہ مصمم ارادہ کر لیا کہ آئندہ ہم ملت کی فکر کو مطالعہ کی لذت پر بخون مانتے کی اجازت نہیں دیں گے۔

اب ہم جس ریاستی بانی سکول میں داخل ہوئے اس کے اساتذہ کو بھی مسلم اسکول کے اساتذہ کی طرح ہم وقت مصروف و مستعد ہر طور مطمئن و خوش دل، ہمدردیت لائق و قایم اور ہر لحاظ مشفق و مہربان پایا۔ چنانچہ مدرسے کے پیشہ کا ہم ایسا ہی احترام کرنے لگے جیسے آپ اور ہم دور سے مسجد کا احترام کرتے ہیں کہ اس میں داخل ہوتے کا خیال بھی کبھی ہمارے دل میں نہیں آتا۔ ان اساتذہ میں تقریباً سبھی پوشاک میں اتنے سادہ، طور طریق میں اتنے متحمل مزاج اور برتاؤ میں اتنے ہمدرد تھے کہ زبان، مذہب اور لباس کے اختلاف کے باوجود، ایک ہی خاندان کے افراد معلوم ہوتے تھے۔ ریاضی کے استاد کے سامنے جب کسی طالب علم کا دماغ دکھانے لگتا تھا یا زبان ڈنگا جاتی تھی یا اس کا ہاتھ یاہ تختہ پر کسی غلط بیانی کا مرتکب ہوتا تھا تو وہ بڑے ہی شگفتہ اور مہربانہ لہجہ میں اصلاح حال کا آغاز ہمیشہ اس صبر سے کرتے تھے کہ:

”سہارا مل گیا دیوار کا، اندھے عصا سمجھے“

اور پھر عجیب کرشمہ یہ ہوتا کہ اس مصرعہ کی اولین سرسراہٹ پر اس اندھے کی آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں اور دیوار کے غلط سہارے پر متنبہ ہو کر وہ اپنا عصا فوری تلاش کر لیتا تھا۔

اکبر الہ آبادی کا خیال ہے کہ زمانے کی نگاہیں کالموں پر پڑ رہی جاتی ہیں اور پھول پتوں میں نہاں ہو کر کبھی چھپا نہیں رہتا مگر ہمارا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ پھولوں کے درمیان پتہ بھی چھپتا نہیں ہے اور استاد کی نظر ناقصوں پر سب سے پہلے پڑتی ہے کہ وہی وجہ ہے کہ یہاں ہمارے اردو کے محترم و شفیق استاد کی نگاہ ہم پر ایسی اٹھی کہ ہم اردو کی بہت بہترین کتابوں اور مصنفوں سے متعارف ہو گئے وہ ہمیں بعض کتابیں پڑھنے کی تاکید کرتے اور ان پر کبھی کبھی ایک آدھ سوال بھی کر بیٹھتے۔ لیکن بغیر کھربید کے ہم سے استفادہ فرمایا ”آپ نے ییل کے خطوط“ بھی پڑھے ہیں یا نہیں؟

یہ سوال نہیں تھا ایک بجلی تھی جو ہمارے سر پر اچانک یوں گری کہ ہمارے حواس جاتے رہے اور ہم لپک ہیسی سی دہی دہی سے ”جی“ کے سوا کچھ نہ کہہ سکے چنانچہ استاد محترم نے پھر وہی سوال دہرایا۔ اس بار ہم نے نفی میں سر ہلایا اور پھر مزید وضاحت کے لئے عرض کیا: ”جی وہ کتاب کا نام ذرا غیر اخلاقی سا ہے اس نے پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی“

در اصل اس سوال و جواب سے چند روز پہلے ہم حسب عادت اسکول کے مختصر سے کتب خانہ میں ”انڈکس کارڈس“ کی گردان سے اپنے علم میں اضافہ کر رہے تھے کہ اچانک ہماری نگاہ ”ییل کے خطوط“ اڈ ”قاصی عبد الغفار“ پر ایک تانیہ کے لئے پڑی تھی مگر جیسے صالح فوجوان ناظم کے چہرہ سے فوراً نظریں ہٹا لیتا ہے ہم نے بھی اس کارڈ سے اپنی آنکھوں کو اُودہ نہیں ہوتے دیا تھا اور جب ایک عجیب سے ردعمل نے ہمیں اُگے ولے کارڈ کی طرف ڈھکیلا تو ہم یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہے تھے کہ ایسے قابل اعتراض نام کی کتاب یہاں کئی کیسے؟ وہ تو خیر گزری ہم اس اسکول میں نوازدہ تھے اور نویں جماعت میں پڑھ رہے تھے۔ اگر خدا بھی سینئر یا ڈیرینہ طلبہ میں سے ہوتے تو اس کتاب کو، اے اسکول لائبریری کے لئے خریدنے والے کو، اور اس کا انڈکس کارڈ بناتے والے کو، اسکول کی ملازمت سے برطرف کرنے کی تحریک چلا دیتے خواہ اس میں خود ہلا ہی اخراج کیوں نہ عمل میں آجاتا۔

بڑھی نے ہمارے بستہ کی تلاش لی ہو، اپنے دل مضطر کو ہم نے بار بار یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ تھا کہ دور دور سے دھڑکے جا رہا تھا کہ معیبت کبھی تنہا نہیں آتی، یہ افتاد ہم پر، صرف ہم پر، پڑی ہے کہ پوری کلاس میں ہمیں ایسی کتاب پڑھنے کو کہا گیا تو اس کے ساتھ ابھی اور بھی بہت سی پریشانیاں سامنے آئیں گی اور خفیتیں اٹھانا پڑیں گی۔

کچھ ہمارا ہی جی جانتا ہے کہ یہ راستہ کیسے طے ہوا اور کیونکر ہم گھر تک پہنچے۔ دروازہ میں داخل ہوتے ہیں ہم نے سیدھے اپنے کمرے کا دروازہ کیا اور وہاں مناسب موقع پر "لیلیٰ" کو اپنے کپڑوں کے صندوق میں چھپا دیا پھر جب جہاں اور جیسا بھی موقع ملا ہم اسے قفل خانہ، گھر کی چھت اور دیگر مقامات محفوظ کی سر کر لے اور اس کی "سٹر چین" کرتے رہے۔ چوری چھپے کا یہ مطالعہ ہمارا ضرور بینائی کے لئے چننا مفید ثابت نہیں ہوا۔

اس دوران سبھی اہل خانہ تے ہمیں بار بار ٹوکا کہ یہ وقت بے وقت عملیاتی جاتے کیوں نظر آتے ہیں؟ طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب کے بعد چھت پر کیوں جا دھکتے ہیں اور تنہائی کے اتنے شوقین کیوں ہو گئے ہیں ان اعتراضات کی اپنی طرف سے ہم نے یہ معافی پیش کی کہ ان دنوں ہیں گرمی بہت لگنے لگی ہے۔ انیس کے مرتبے پڑھ پڑھ کر ہم مناظر فطرت بالخصوص طلوع وغروب آفتاب کے گرویدہ ہو گئے ہیں اور تنہائی اس لئے ضروری ہو گئی ہے کہ ہم نے ایک مباحثہ میں شرکت کی تیاری شروع کر رکھی ہے اور اس مباحثہ کا موضوع ہے "مطلوبی نسواں"۔

"مطلوبی نسواں" کا یہ موضوع ہمیں "لیلیٰ" کے خطوط سے ہی ملتا تھا، پوری کتاب میں نام کے علاوہ ایک نقطہ بھی ہمیں قابل اعتراض نظر نہیں آیا بلکہ ہمارا دل "لیلاؤں" کے حال زار پر اتنا کڑھا کہ ہم نے اپنی احتجاجی آواز کو بھی قاضی عبدالغفار کے قلم کے ساتھ ملائے کا ارادہ کر لیا۔ پھر خیال آیا ہم ابھی زیر تعلیم ہیں، ہو سکتا ہے ہمارا پر خلوص احتجاج، صرف ہماری نوعمری کی وجہ سے بعض حلقوں میں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جائے "لیلاؤں" کے حقوق بھی ان کو نہ ملیں اور ہمارا حق خود ارادیت بھی ہم سے چھین لیا جائے۔ چنانچہ کال انڈیش کے اس مشورہ پر ہم نے اپنے احتجاج کو

جس کتاب کے نام پر ہمیں ایسا شدید اخلاقی طراہ کیا تھا۔ اب اسی کے متعلق ہم سے پوری کلاس کی موجودگی میں دریافت کیا جا رہا تھا کہ ہم نے اسے پڑھا ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے اس صورت حال میں "نہیں" پر اکتفا نہیں کی جاسکتی تھی اس لئے ہم استاد محترم کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی جسارت کر رہے تھے کہ ہم اس کتاب کے دعوے سے تبرہ نہیں مگر لائق ضرور تھے اور اس میں سارا قصور اور فتور کتاب کے نام کا تھا۔ ہمارا مافی الضمیر پاکر استاد محترم نے تبسم فرمایا اور کہنے لگے "اول تو کتاب کے نام کے سلسلہ میں کوئی مصنف قارئین سے مشورہ نہیں کرتا، دوسرے مرت نام سے، خواہ وہ مصنف کا ہو، یا کتاب کی کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی اس لئے بہتر یہی ہے کہ آپ نام کے پیر میں نہ پڑیئے بلکہ کتاب پڑھ کر مجھے بتائیے کہ موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے یہ مندرجہ یا نہیں، اگر آپ نے اسے سمجھ کر پڑھا تو شاید پھر اسے فراموش نہیں کر سکیں گے۔"

ہمارے دور کے طلبہ لیے سادہ ہوتے تھے کہ ان کیلئے حکمت دمگ مفاہات ہوا کرتا تھا اس لئے اب اس کتاب کا پڑھنا لازم ہو گیا تھا کہ تشویش بر لاحت تھی کہ اسے اپنے کارڈ پر جاری کر کے گھر تک کیسے جائیں؟ پھر اسے پڑھیں گے کن اوقات میں؟ کس تاریخ کو نے میں یا کس خال کو ٹھے پر؟ ان خطوط کا مطالعہ بزرگوں سے کیسے پوشیدہ رہ سکے گا؟ یہ الجھے ہوئے سوال کسی طرح سلجھانے نہیں سچے تھے کہ چھٹی کی گھنٹی بجی اور "لیلیٰ" کے خطوط "نصائی کتابوں کے پتہ میں رکھ کر اور بستہ کو بغل میں دیا کہ ہم یوں اسکول سے باہر نکلے گویا یہ لیلیٰ کے خطوط نہیں تھے خود بیل تھی جسے ہم بغل میں دبانے لے جائے تھے اسکول سے گھر تک یہ خوف طاری رہا کہ اگر کسی بزرگ نے راستہ کاٹا اور بغل میں چھپیں یہ لیلیٰ ان کو نظر آگئی تو.... ہم اس خیال سے لے دہشت زدہ تھے کہ تیسریں بار یہ خیال آیا مگر ایک بار بھی تو.... سے آگے نہ بڑھ سکا۔ جیسے تو سے آگے دونوں جہان کی روسیاہی کے سرا کچھ نہیں تھا، حقیقت یہ ہے کہ ہماری یہ دہشت زدگی بے وجہ اور بے بنیاد تھی چونکہ آج تک کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا کہ سر رہے کسی

جنوری، فروری ۱۹۷۷ء

نتی کر دیا اور پھر مطالعہ میں مشغول ہو گئے۔

باقی اسکول سے جو کام بچے تو دل باغ باغ ہو گیا، اختیاری مضامین، درس کتابیں، روزانہ کا تدبیری وقت سب ایک دم سے کم ہو گئے۔ گھر پر کھانے کے لئے کام بند ہو گیا اساتذہ کی شخصیات نگرانی ختم ہو گئی اور بزرگانہ سرزنش کا خطرہ بھی جاتا رہا۔ پھر سونے پر سہاگاہ لائبریری بھری پڑی تھی اور فرصت کا خزانہ ہاتھ آیا چنانچہ اس خزانہ کو ہم نے بڑی دریا دل سے غیر تصانیف کتابوں کے مطالعہ پر ٹھاننا شروع کر دیا۔ پروفیسروں سے جو کبھی کسی ایک ادھ جملے، معنون، خیال کی داد ملی تو ہمارا عام مطالعہ دو چند ہو گیا اور نصاب کی طرف توجہ ادا ہی رہ گئی مگر ”دکھ لی مرے خدا نے سری من خود سری“ کی شرم، اس بے لگام و بے سرت مطالعہ کا حشر اتنا عبرت انگیز نہیں ہوا، جتنا ہونا چاہیے تھا اور ہم باسان یونیورسٹی پہنچ گئے اور اس عزم بالجزم کے ساتھ پہنچے کہ یہاں سے جو نکلیں گے تو پھر کسی کا بلے یا یونیورسٹی ہی میں ”پروفیسری“ کریں گے۔

مقام فیض نظر میں کوئی جچا ہی نہیں

جو کوئے یار سے نکلے تو سونے دار پہلے

یونیورسٹی سے جراتناات پاس کر کے نکلے تو پاکستان بھی چکا تھا، پاکستان لئے معلوم ہوا کہ یہاں مردست ادب سے واقفیت اتنی ضروری نہیں؟ جتنی افسروں سے اور یہ بھی کہ پروفیسروں کے مقابلہ میں بنکاری کی ضرورت زیادہ ہے چنانچہ یہاں کے حالات کا جائزہ لے کر ہمارے کا بلے اڈ ہمارے یونیورسٹی کے ایک خاصے سینئر اور بے تحاشا لائق فائق ”اولڈ بوائے“ اعلیٰ سے اعلیٰ استاد کو ”اس دفتر بے معنی غرق مئے رز اولیٰ لکھ کر ایک طرف پینک دیا اور جھٹ سے اک بنک میں ملازمت کر لی، ہمیں جو نہیں اس حادثہ فاجعہ کی اطلاع ملی ہم انہماک تعزیت کے لئے ان کے ہاں مقرر ہوئے اور بڑے ہی سوگوار لہجہ میں ان سے دریافت کیا کہ ”حضرت یہ کیا آپ کے سارے پروفیسر اور ہم سبق تو یہ امید کر رہے تھے کہ آپ دیکھ و تدریس کا فریضہ انجام دیں گے، علم و ادب کی روشنی پھیلائیں گے پروفیسر ایس

بخاری، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور اے بی بریلے کا نام روشن کریں گے۔ مگر آپ نے تو ان کی امیدوں اور اپنے حقیقی جوہر کا خون کر دیا۔ آخر آپ کو سوجھ کیا جو آپ روپیہ انڈ پانی کے اندراجات، بی بیوں کھو گئے جیسے کبھی دیوان غالب اور شکسپیئر کے غلیم المیر ڈراموں میں کھوئے رہتے تھے؟ آپ نے تو اشتغالِ ساغر کھینچنے کی بجائے ابھن اُفدے قدم ہی باہر کھینچ لیا آخر ایسا آپ نے کس مجبوری کے تحت کیا؟“

ہمارے یہ معروضات سن کر ان کے چہرہ پر اس خفیت تسیم کا ایک لہرس دوڑ گئی جو مہاتما بدھ کی مورتیوں میں نظر آتی ہے اور جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کے دکھ سکھ اور نیک و بد سے ماورائے حیات اور فردان کی حدیں پار کر گئے ہیں۔ پھر وہ بڑے مطمئن لہجہ میں یوں گویا گئے ”ساحب من۔ عینیت پرستی، ایام طالب علمی کا زیور ہے مگر عملی زندگی کے لئے رنجیر بن جاتی ہے روزانہ کی زندگی میں راحت مطلوب ہے تو آدمی کو حقیقت پرست ہو جانا چاہیئے ورنہ اس کے متعلقین کی دنیا اور خود اس کی عقلی دونوں خراب و خوار ہو جاتی ہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اس وقت کل پاکستان میں کل گئی چنی دو تین یونیورسٹیاں اوسلے دے کے بیس بائیس دواں دواں کالے ہیں جن میں فی الحال کہیں بھی کسی بھی نوعیت پر وارد کی ضرورت یا گنجائش نہیں ہے اس لئے میرا تو آپ کو بھی یہ مشورہ ہے کہ آپ بھی ادھر تک ہی میں آجائے البتہ اس کے لئے پانچ ہزار ضمانت نقد بنک میں جمع کرانا ہو گا اور اتنی ہی رقم کی شخص ضمانت دینی پڑے گی۔“

ہمارے سینیئر کرم فرما کا مشورہ بہت ماثب تھا مگر بقول شمس:

درد و دام۔ پنچہ پاس کہاں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

چنانچہ ہمارے یہ زری تھے ہمیں بنک کی ملازمت سے محذور یا محروم رکھا اور ہم بہ امر مجبوری ایک تیل لکپس کے صدر دفتر میں ملازم ہو گئے۔ یہاں تنخواہ معقول تھی اور آئندہ ترقی کے امکانات بھی روشن تھے مگر یہاں ہمارا دماغی نان نفقہ بند ہو گیا یعنی مطالعہ لے لئے نزوت ملنا تھا نہ کتابیں شہر میں لائبریریوں کا کال تھا اور ہمارے پاس وقت کا۔

کی خالی اسامی کا ایک اشتہار نظر آیا اب ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ کالوں میں سبھی "پروفیسر" نہیں ہوتے، کچھ ٹیکر بلکہ جونیئر ٹیکر بھی ہوتے ہیں۔ اس پر ہمیں کچھ غصہ بھی آیا کہ ہم اب ٹیک کا باج اور یونیورسٹی کے ہر استاد کو خواہ مخواہ پروفیسر کیوں سمجھتے اور کہتے رہے تھے اور اسی نادانی میں اب ٹیک پروفیسری کے خواب یا خط میں مبتلا تھے۔

اس انکشاف حقیقت کے بعد ہم نے انگریزی محاورہ کے مطابق خود کو قدسے عقلمند مگر افسردہ محسوس کیا درخواست بھی بھیجنے کو بھیج دی مگر دل پر ایک بوجھ سا رہا کہ یہ اسامی ہمیں ملے بھی گئی تو کیا؟ ہم پروفیسر بننے سے سہے۔ جب اپنی رائجین ہم نے اپنے بنک کے سینئر رفیق کار سے بیان کی تو انہوں نے ہمیں سمجھایا "بھائی میرے ہر ملازمت میں محنت درجے محنت مراتب ہوتے ہیں اور ہر آدمی درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہے۔ آپ کا ایک نہ ایک دن پروفیسر بن جائیں گے مگر....."

"مگر کیا؟" ہم نے بے صبری سے دریافت کیا

اس مرتبہ وہ باقاعدہ مسکرائے اور بولے "مگر یہ کہ اور ملازمتوں کے مقابلہ میں شعبہ تعلیم میں ترقی ذرا سست رفتار ہوتی ہے۔ تاہم آپ کو اس پیشہ سے چونکہ طبعی مٹا سبت ہے اس لئے شاید آپ اس میں زیادہ خوش رہیں گے مگر اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجئے۔ میرے نزدیک مادی فائدہ اور آئندہ ترقی آپ کی موجودہ ملازمت میں زیادہ ہے تاہم آپ اقبال کے بہکانے ہوئے ہیں من کے سوز و سستی، جذب و شوق کے قائل ہیں اس لئے آپ کی قسمت یعنی آپ کا ٹھکانہ مجھے پہلے ہی معلوم ہے اور وہ ہے کالج کی ملازمت!"

ان کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی اور انٹرولو کے فوری بعد ہمیں تقریر نامہ مل گیا اور ہم اپنے نئے کالج پہنچ گئے۔ کالج کیا تھا، تین اکائیوں پر مشتمل ایک کھنڈر تھا۔ ایک اکائی اسٹان روم کی جو وقت ضرورت کلاس روم کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ دوسری اکائی ایک کٹا دہ ہال کی جس سے کالج کے اچھے دنوں کا تصور ابھرتا تھا۔ اندازہ لگایا جاسکتا تھا اور تیسری اکائی لیبارٹری اور پرنسپل کے دفتر کی۔ ہمیں بتایا گیا کہ تقسیم

اس لئے اس پوری ملازمت کے دوران ایک تو ہم خود ذہنی طور پر بہت نا افسوسہ لہے، دوسرے احباب نے ہمیں چین نہیں لینے دیا۔ تقریباً سبھی نے ہمیں اپنے فکروں کا نشانہ بنایا اور جی کھول کے چتیاں کیں ایک صاحب فرما رہے ہیں "بھئی پہلے زمانہ میں تو غالباً مرن فادی پڑھنے والے تیل بیچتے تھے مگر آپ نے تو غالباً انگریزی ادب میں ایم اے کیا ہے؟ پھر تیل کپنی میں کیسے درود مسعود فرمایا؟"

دوسرے صاحب اس کی توجہ فرماتے ہیں "بھائیو۔ یہ پڑھو فادی بیچو تیل" کی جو کہاوت ہے اس میں فادی سے دراصل ادب مراد ہے جو کسی زمانہ میں بہت بلند پایہ ہوا کرتا تھا یا سمجھا جاتا تھا۔ آج اس جگہ پر انگریزی ادب قائم ہے اس لئے معقول کے ایم اے تیل بیچتے اور قدرت کا قاشا دکھانے لگے ہیں۔ دراصل یہ اس کہاوت کے رخ ہونے کا جیتا جاگتا، چلتا پھرتا بلکہ اٹھتا بیٹھتا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔

تیسرے ہر باب ان دونوں کو مستحاذ انداز میں سرزنش کرتے ہیں اور ہمدردی طرف اشارہ کر کے فرما رہے ہیں "حضرات! یہ آپ کی سراسر زیادتی ہے کیا آپ نے ان جناب کو اتنا گیا گزرا سمجھا تھا کہ یہ کبھی ماسٹ پر آئیں گے ہن نہیں؟ آپ دیکھ رہے ہیں کہ بالآخر دینا نے ان کا مزاج درست کر دیا ہے ہائے سیاب اکبر آبادی۔ ساری کلیات میں میں استاد نے ایک ہی شعر کہا ہے۔ کیا خوب کہا ہے کہ:

مبادک ہو تجھے یہ خود روی لیکن یہ سنتا جا

کہ دنیا اپنے رستہ پر نکالیتی ہے انسان کو"

اس پر چوتھے صاحب چبکتے ہیں "اچھا! اس طرح تو واقعی ان کا

انسان ہونا ثابت ہو رہا ہے ہم تو اب ٹیک انہیں کرم کتابی ہی سمجھ رہے تھے، ہر حال یہ نئی دریافت ہمارے لئے نہ ہی خود ان کے لئے بہت دل خوش کن ہونی چاہیئے"

ہم نے پروفیسری کے انتظار میں، اس کی خاطر یہ سب کچھ سنا، سہا اور خاموش رہے۔ پھر ایک دن ایک دور افتادہ کالج کے لئے جو بقول ایک دوست کے "انڈیاں کے پھپھراڑے واقعہ تھا" جونیئر ٹیکر

سے پہلے یہ بیٹے کروفر کا غیر مسلم کالج تھا اور اس کی ایک شاندار لائبریری بھی تھی مگر آزادی کی افراتفری میں کسی دل چلے نے اس کے بیشتر حصہ اور کتب خانہ کو نذر آتش کر کے چراغاں کا اہتمام کیا تھا اس نے اب یہاں، یادگار و روتق محفل، پس خوردہ آتش بھی تین عمارتی ڈھلچٹے باقی رہ گئے تھے۔ لائبریری کا تھوڑا بہت سرائے سرکاری کاغذات میں ملتا تھا اور امید تھی کہ اگلے بجٹ میں کتابوں کی خریداری کی مدد پر کچھ رقم مقرر کی جاسکے گی۔

یہ مشاہدات و معلومات حوصلہ شکن تھیں اس لئے اللہ سے مرنے نظر کر کے ہم نے بڑی تندہی سے بی اے سال اول کو پڑھانا شروع کر دیا۔ اس میں صرف تین طلبہ تھے۔ تعلیمی سال ختم ہونے والا تھا مگر انہوں نے نصاب کی پانچ کتابوں میں سے ایک کتاب ابھی چند دن پہلے شروع کی تھی چونکہ پرنسپل صاحب ہی سائنس کے مضامین کے علاوہ انہیں انگریزی بھی پڑھاتے تھے اور یہ سارا تدریس کام وہ اپنے فرائض منصبی سے سوا انجام دے رہے تھے اس لئے ظاہر ہے انہیں انگریزی کے لئے کم وقت ملتا تھا۔

طلباء نے ہمیں بتایا کہ انہوں نے اردو بطور OPTIONAL مضمون لی ہے اور اس میں غالب کی ردیف الٹ کی تمام غزلیں شامل ہیں مگر کلاس میں ابھی پہلی غزل بھی نہیں شروع ہوئی ہے بلکہ سرے سے اس کا ایک پیریڈ بھی اب تک نہیں لگا ہے کیونکہ متعلقہ پروفیسر صاحب کا سارا وقت پرنسپل صاحب کے کمرہ میں صلاح مشورہ ہفتوبہ اور طلباء کی فکر میں گزر جاتا ہے۔ ہم چونکہ ذرا زیادہ ہی مستعد اور قد سے فارغ تھے اس لئے ہم نے ان کی درخواست پر انہیں غالب بھی پڑھانا شروع کر دیا۔

ابھی درس غالب کو دو ایک دن ہی گزرے ہوں گے کہ وائس پرنسپل صاحب ہمیں اشاف روم سے اٹھا کر، باہر ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے: پروفیسر صاحب یہاں آپ کا تقرر انگریزی کے شعبہ میں ہوا ہے یا اردو کے شعبہ میں؟

اس کالج میں ہمیں پہلے دن ہی سے "پروفیسر" کہا جانے لگا تھا شروع میں تو ہم نے ایک دوسرا اپنے رفقاء اور اہالیان شہر کی تصویق کی کوشش کی انہیں صاف صاف بتلا دیا کہ ہم "پروفیسر" نہیں محض "جوڈیئر لیکچرر" ہیں مگر ہماری اس تشریح یا تصریح کو کسی نے بھی درخواست نہیں سمجھا اور انہیں ہر کہہ و مہر اور یہ تکرار "پروفیسر" ہی کہے گیا تو ہم خود کو مجرم سامعوس کرنے لگے کہ ہمیں خواہ مخواہ "پروفیسر" کے لقب سے ملقب کیا جا رہا ہے حالانکہ ہم اس کے مستحق نہیں ہیں پھر ایک بزرگ نے ہمارے لئے یہ عقیدہ یوں دایا کہ یہاں کالج کا ہر استاد عرف عام میں "پروفیسر" کہلاتا ہے۔

اس لئے "پروفیسر" کے استعمال کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم نے انہیں مختصر جواب دیا "انگریزی میں"

"تو پھر آپ غالب کیوں پڑھا رہے ہیں؟" انہوں نے سوال کیا "اس لئے کہ طلباء کا نقصان ہو رہا تھا اور انہوں نے ہم سے درخواست کی تھی کہ ہم انہیں غالب بھی پڑھائیں۔"

"آپ نے اردو کے پروفیسر صاحب سے اس کی اجازت لے لی ہے؟" انہوں نے ہم پر ایک اور سوال داغ دیا۔

کیا طلبہ کو مطالعہ میں مدد دینے کے لئے بھی اجازت لینا پڑتی ہے؟ ہم نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

اب انہیں ہماری جہالت کا یقین ہو گیا اور انہوں نے سوال جواب کا یہ پیچیدہ طریقہ چھوڑ کر ہمیں غیر مبہم الفاظ میں یہ بتا دیا کہ ہم نے غالب کی دو غزلیں پڑھا کر ایک بہت ہی سنگین غلطی کی ہے جسے "پروفیسر صاحب" کے ضابطہ اخلاق میں دخل در معقولات کہا جاتا ہے۔ خیر گذشتہ راصلوۃ انشا احتیاط اب ہمارے حق میں یہی بہتر ہے درس غالب کو نقش و نگار طاق نسیاں بنادیں۔ آئندہ اپنے کام سے کام رکھیں اور پھر کسی اپنے مقبول کے علاوہ کسی کی طرف نہ آنکھ اٹھائیں نہ انگلی۔ یہ پرنسپل اور متعلقہ پروفیسر کا کام ہے کہ وہ دیکھیں یا نہ دیکھیں کہ کونسا کورس، کتنا ماک اور کیسے ختم ہو گیا یا نہیں ہو گا۔

ہم نے بڑی سعادت مندی سے پیرداتا کی نصیحت سنی، اور اس

ہیں اور ترکی بہ ترکی جواب دے رہے ہیں یا یوں سمجھئے کہ انگریزی محاورہ کے مطابق دونوں اپنے اپنے گندے کپڑے کھلے عام دھو رہے ہیں اور اس کا سارا گندا پانی ایک دوسرے پر اچھال رہے ہیں انہیں امر ہے کہ پہلے کی طرح آج بھی پرنسپل سے ان کی شکایت ہمارے نامع شفقت ہونے کی ہے مگر انہیں اس سے انکار ہے کہ وہ کبھی بھی کسی کے پھٹے ہیں اپنی کوئی ٹانگ ڈالنے کے کبھی مرتکب ہوئے ہیں۔ اس پس منظر میں دونوں ایک دوسرے کے پورے خاندان، سارے اہل خانہ، بھروسہ، علم و عمل، غرض ہر بارے میں بہت مشکوک تھے اور اپنے اپنے شکوک و شبہات بیان کر رہے تھے، اس کے ساتھ ہی ساتھ نشتر بھگست کے ایسے کچھ طوطی کی طرف بھی واضح اشارے کرتے جاتے تھے جو کچی عمر کے طلبہ کو بھی زیب نہیں دیتے۔

جب میاں سے ہمارا تبادلہ صدر مقام کے ایک مشہور رابر میں ہو گیا تو ہمیں بڑی خوش ہوئی۔ جب اس کا راج کی عظیم لائبریری میں آؤ اور بھی خوش ہوئے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ واقعی اب ٹھکانے لگے تھے رفقا نے اس نئے تبادلہ پر ہماری نمایاں مسرت کی وجہ پوچھی تو ہم نے انہیں بڑی سادگی اور صفائی سے بتا دیا کہ اور باتوں کے علاوہ سابق راجر میں لائبریری نہ ہونے کے برابر تھی مگر یہاں چونکہ لائبریری بہت بڑی اور اچھی ہے اس لئے ہم خوش ہیں کہ یہاں جی بھر کے مطالعہ کر سکیں گے۔ ہمارے اس اعتراف کا پندار پر ہمارے ایک معر رفیق نے ہمیں یوں دیکھا جیسے ایک آزمودہ کار ساٹھ سالہ پہلوان ایک سولہ سال کے بچے کی طرف دیکھتا ہے جس نے ابھی ایک کشتی بھی نہ جیتی ہو اور ہمارے حق میں

یہ دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے "خدا آپ کے اس شوق مطالعہ کو قائم رکھے" ہمیں بے سوچے سمجھے بھی ہر دعا پر "آمین" کہنے کی عادت ہے مگر اس مرتبہ ہم چپ رہے، شاید ہمیں اپنے شوق مطالعہ پر اتنا ناز تھا کہ دعا بھی آمین کہنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مگر اب سوچتے ہیں اس وقت ہم صدق دل سے اس پر "آمین" کہہ لیتے تو اچھا تھا۔ یہاں گزشتہ بیس یا بیس سال میں ہم نے بہت سی تبدیلیاں

پر فوراً عمل شروع کر دیا خدا کا شکر ہے اس کے بعد اس کالج میں چار بڑا اچھا وقت گزرا اور جتنے بھی پرنسپل آئے گئے وہ ہم سے اور ان سے خوش گمان رہے مگر ایک دن ہماری آنکھ نے ایک ایسا منظر وحشت اثر دیکھا کہ ہمارا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا اور ہم یہاں سے تبادلہ کی فکر کرنے لگے۔

ہماری کہ ایک دن جو پرنسپل کے کمرہ میں داخل ہوئے ہم نے اپنے ایک رفیق کار کو ان کے سلتے یوں کھڑے دیکھا جیسے مفرد تھانیداس کے سامنے کھڑا ہو۔ ہم اپنے پاؤں واپس ہونا چاہتے تھے کہ پرنسپل نے ہمیں ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور ہم فوراً بیٹھ گئے مگر ہمارے وہ رفیق بدستور کھڑے رہے اور ہم دل ہی دل میں حیران کیا یا اہی یہ باجرا کیا ہے اتنے میں پرنسپل صاحب نے ان کی طرف بڑی شتم آواز لگا دی کہ وہ دیکھا اور گر جے تم روزانہ لیٹ آتے ہو؟

وہ نہ ہرگز میں منٹائے "جی۔ میں تو بس آج ہی ڈا" لیٹ ہو گیا تھا جی۔ وہ کچھ گھریں میں وقت پر طبیعت خراب ہو گئی تھی جی۔ تو وہ ڈرا ان کو ڈاکٹر کے ہاں لے گیا تھا جی؟

اس حذر پر پرنسپل کا پارہ اور بھی اوپر چڑھ گیا: ایک تو روزانہ دیر سے آتے ہو، دوسرے جھوٹ بولتے ہو، نکل جاؤ میرے کمرہ سے آئندہ ایک منٹ بھی "لیٹ" آئے تو غور تمہیں گردن سے پکڑ کر کایا کی دیوار سے ادھر پھینک دے گا۔ غور پرنسپل کے چپراس کا نام تھا۔ یہ رفیق کار تو وہاں سے بے ابرو ہو کر نکل آئے مگر ہم اپنے دل کلہریج و تاب دہائے وہاں بیٹھے رہے کہ پرنسپل کا مزاج ذرا اعتدال پر آئے تو ہم عرض دعا کے اجازت طلب کریں۔ بانیہ وہ ذرا خاموش ہوئے تو ہم نے شعبہ کی ایک دو باتیں ان سے کہیں اور ان سے رخصت لے کر اسٹاف روم کی طرف چل دیئے۔ اس کے قریب پہنچے تو اندر سے بڑی مگر جدار آوازیں آتی سنائی دیں جیسے دو شیر بیک وقت دھاڑ رہے ہوں۔ اندر داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پرنسپل کے دفتر کی بیگلی بل شیر بھر بنی تھی کھڑی ہے اور ہمارے نامع شفقت دانش پرنسپل صاحب پر پے در پے زبانی کلمے کر رہی ہے اور وہ بھی خامے جارحانہ موڈ میں

غزل

محسن احسان

درد سے آنکھ ملا، دکھ سے شناسائی کر
ہر برکت ہوئی رُبت کی نہ پذیرائی کر
اپنے ہر جھوٹ کو میزانِ فراست میں نہ تول
مصلحت بینی سے یوں قتل نہ دانا کی کر
آسرنِ طرح کبھی تو بھی سمندر میں اتر
یوں نڈارے سے نہ معلوم یہ گہرائی کر
میں ہوں بے چہرہ تو کیوں رنگ تراڑتا ہے
تیرا چہرہ ہے تو پھر اپنی نہ رسوائی کر
ہر دھڑکتے ہوئے لمحے سے یہ آواز آئی
اپنے احساس کو شائستہ تنہائی کر
آسمانوں پہ ہے تو، پھر بھی تجھے پوچھا ہوں
میں زمیں پر ہوں میری حوصلہ افزائی کر
فطن کی صورت یہ تمسب تجھے کھا جائے گا
اپنی ہر سوجھ بوجھ کو محسن نہ علاقائی کر



دیکھی ہیں اور خود بھی بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ کئی انسروں کو بھگتا ہے،
متعدد تعلیمی پالیسیوں کو جنم دیتے اور دم توڑتے دیکھا تعلیم کی سیاست کی
باندی بننا۔ طلبہ کالیڈروں کے لاوڈ اسپیکر کی شکل اختیار کرنا اور ان
کے ہراول دستہ کے طور پر حرکت میں آنا، یہی ہمارے سامنے کی بات ہے
یہ سب دیکھ کر ہم اپنے مورکھ من سے بھی ایک سوال بار بار کرتے ہیں کہ
وہ "فہر علم" ہے یہ جس کی آرزو ہے کہ

چلے تھے "آپ" کو مل جائے گی کہیں نہ کہیں

"کتب کے دشت میں" عرفاں کی آخری منزل

کوئی تو ہوگا "مطالعہ کی موج کا ساحل"

کہیں تو تجا نے ڈکے کا سفینہ "عم" "علم"

ایک زمانہ تھا جب طلبہ اساتذہ کا احترام کرتے تھے۔ اب
اساتذہ کو عام طلبہ کا ادب ملحوظ رکھتے ہیں۔ "انقلابات ہیں زمانہ"۔ پتہ
طلبہ درس گاہوں میں تحصیل علم کے لئے آتے تھے اب "تحصیل وظائف"
کے لئے آتے ہیں "نخل مقصد غیر آب زر کبھی پھلتا نہیں" کل تک طلبہ
پڑھنے کے ساتھ ساتھ کھیل بھی لیتے تھے۔ اب ان کے طلبہ کے پاس چلے
کرنے جلوس نکالنے، تھرے لگاتے اور ہلڑ بازی کرنے کے بعد بھی
اگر وقت بچ رہتا ہے تو وہ اتفاقاً کچھ پڑھ بھی لیتے ہیں۔ ہر فرد بے ملت
کے مقدر کا ستارا "کبھی ان کے دماغ روشن، دل خالص، نظر حیا آمیز
ہوتی تھی اب ہر ادنیٰ تبدیلی اقبال کا یہ مصرعہ ان پر صادق آتا ہے کہ
"دماغ غائب و دل تیرہ و نظر بے باک"

خود اساتذہ کا احوال بھی متغیر ہے۔ اب یہ اپنے مضمون پر حاوی
ہونے کی بجائے کالج، یونیورسٹی اور ملک کی سیاست پر عبور حاصل کرنا
اور زبان چلانا زیادہ ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ طلبہ اساتذہ سے مساوات اور
نقاد سے تقریق برتتے ہیں۔ ترقی علم کی بجائے ترقی منصب کی فکر میں
غرق ہیں کتابوں سے دور افسروں سے قریب رہتے ہیں۔ صرف اساتذہ کو
اپنے علم کا قامن اور اپنے منصب کو اپنی سیاست مگر کی کا ثمر قرار دیتے
ہیں اور ہم حیران ہیں کہ روانہ ہوئے تھے کعبہ علم کی طرف اور اُن کے لئے

نقد و نظر

داستان صحافت از پروفیسر عبدالسلام خورشید

تبصرہ نگارہ ڈاکٹر وزیر آغا

جذباتیت سے محفوظ رہنا کس قدر ضروری ہے۔ یوں بھی صحافت تجزیہ اور تحلیل کے اس عمل کا نام ہے کہ بھی فی جذباتی خودش سے بے نیاز ہو کر حقائق اور واقعات کو پرکھتا ہے اور ان سے تاریخ اخذ کرنے کے عمل میں ایک برج کی سی بعیرت اور خشک مزاجی کو بروئے کار لاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں معتمد کے اس غیر جانبدارانہ عمل کا اعادہ کیا ہے اور یہی اس کتاب کا روشن ترین پہلو ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب کا جو متوازن رویہ اخبار اور اخبار نویس کے بارے ہے وہی صحافت کے مختلف ادوار کے ضمن میں بھی ہے۔ مثلاً پاکستان صحافت کے سلسلے میں انہوں نے یہ تو بتایا ہے کہ کس دور میں زبان بندی کا رواج تھا اور کس دور میں زبان درازی کا۔ لیکن انہوں نے زبان بندی کی مذمت اور زبان درازی کی حمایت میں کوئی جذباتی رویہ اختیار کر کے ان سے منسلک سیاسی ادوار اور ان کی شخصیتوں کو رد کرنے یا ان کا جلوس نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے قوم پرست مختلف ادوار میں صحافت کے بارے میں جملہ معلومات کو اس انداز میں پیش کر دیا ہے کہ ہر دور کا سیاسی افق واضح طور پر نظر آئے گا ہے یوں ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کا استخراج قاری پر چھوڑ دیا ہے اور اپنی رائے کو قاری پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ اس لئے بھی مستحسن تھا کہ انہوں نے کتاب کی مقاصد

”داستان صحافت“ کے مقاصد کا تعین کرتے ہوئے، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب نے لکھا ہے کہ ”اس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ عام پڑھنے والوں کو اختصار کے ساتھ صحافت کی ابتدا اور انتہا کے بارے میں معلومات دینا کی جائیں۔ بالخصوص بزرگ عظیم میں صحافت کے ارتقا سے روشناس کرایا جائے“ دوسرا مقصد انہوں نے یہ بتایا ہے کہ ”بی۔ اے۔ (صحافت) کے پریچہ اول کے لئے ایک درس کتاب دینا کی جائے۔“ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب ”داستان صحافت“ کے کسی تیسرے مقصد کا ذکر نہیں کیا لیکن اگر وہ اس سلسلے میں فقط یہ اعلان کر دیتے کہ اس کتاب کا مقصد صحافتی استدلال کا ایک مثالی نمونہ پیش کرنا بھی ہے تو اس سے نہ صرف کتاب کا سب سے بڑا مقصد بیان ہو جاتا بلکہ صحافت کے اصل مزاج کا سراغ بھی مل جاتا۔ مگر ظاہر ہے کہ وہ یہ اعلان نہیں کر سکتے تھے۔ ہر چند ڈاکٹر صاحب نے یہ اعلان نہیں کیا لیکن جس متوازن اور شہنشاہی بیٹھے انداز میں انہوں نے صحافت کے ارتقا کا جائزہ لیا ہے، اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ انہوں نے ایک صاحب بصیرت محقق کی طرح داستان صحافت کا سرخ نگاہ کر میا در صحافت کی نشاندہی کی ہے اور یہ احساس دلایا ہے کہ طوفانی موضوع پر کتاب لکھتے ہوئے مصنف کا

مل مصنف ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

جنوری، فروری، ۱۹۷۶ء

میں کوئی خیر نشان ہوتی ہے تو اس کے ساتھ بالعموم اخبار کا جذباتی نڈیر بھی منک
ہو جاتا ہے حالانکہ اخبار کا کام خبر جیا کرنا ہے نہ کہ واقعہ کے بارے میں
اشتعال پھیلانا۔ مثال کے طور پر جب اس قسم کی خبر شائع ہوتی ہے کہ
”خیرت مند شوہر نے بد چلن بیوی کو لوٹکے کے ایک ہی وار سے موت
کے گھاٹ اتار دیا“ تو عدالت کے فیصلے کا انتظار کئے بغیر ایک یکطرفہ جذباتی
دو عمل کے اظہار سے نہ صرف خبر کی حرمت مجروح ہوتی ہے بلکہ شکل مزاح
شوہروں کو اپنی مردانگی کا جوہر دکھانے کی تحریک بھی مل جاتی ہے جو خود
کیجئے تو آئین جو انفرادی کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ ایک اخبار کا اولین فرض
یہ ہے کہ وہ جذباتی طور پر ملوث ہونے بغیر خبر کو قارئین تک پہنچائے۔
دوسرے جب خبر پر تبصرو کرے تو ملکی اور قومی مفاد پر جامع مفاد کو حاوی نہ
ہونے دے۔ تیسرے خبر کو شخصی سطح پر اتار کر پاسداری یا تعصب سے
داغدار نہ کرے۔ ڈاکٹر عبد السلام خود شیعہ نے پاکستانی صحافت کے طویل
جذباتی جزو و مد کا کوئی تفصیلی جائزہ تو نہیں یا لیکن صحافت کی داستان لکھتے
ہوئے انہوں نے جابجا، چھوٹے چھوٹے مسنی خیز فقرہ میں اتنے اشارات
بکیر دیئے ہیں کہ ان کی روشنی میں صحافت کے اعلیٰ معیار کا تعین کچھ ایسا شکل
نظر نہیں آتا اور یہ کتاب کی ایک اضافی خوبی ہے۔

آخر میں مجھے ڈاکٹر صاحب نے ایک شکایت بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ
جہاں انہوں نے پرکاد کے بازو کو پھیلا کر اس میں ادبی رسائل کو سمیٹا تو ان کی
مثالی غیر جانبداری محفوظ نہ رہ سکی اور انہوں نے بعض زیادہ حجم والے رسائل
کی طرف، خانہ برانداز چمن کی روایت کے احاطہ میں، گل کے علاوہ ٹمر بھی
پھینک دیئے جبکہ ان کے مقابلے میں نسبتاً کم ضخامت والے زندہ رسائل
کو قاضی کے چھوڑوں سے بھی محروم دکھائیں نام نہیں لوں گا۔ مگر ڈاکٹر صاحب
میری بات کو خوب سمجھتے ہیں اور فی الحال یہی کافی ہے۔

کے لئے بھی لکھی ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ مصنف اپنے سیاسی نظریات
کو طلباء کے کوسے اذہان پر نقش کرنے لگے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ یا جمہوری
کا اچھا مثال ہے ورنہ آج کے نام نہاد دانشوروں میں سے اگر کسی کو
”داستان صحافت“ ایسی کتاب لکھنے کی کوفت ہوتی تو اس کا سہارا لے کر اپنے
سیاسی نظریات کی تبلیغ ضرور کرتا اور یوں کتاب کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔
”داستان صحافت“ کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر صاحب
نے صحافت کو مرکزی نقطہ مان کر اور اس نقطے پر پرکاد کی ٹوک رکھ کر،
اس کے دوسرے بازو کو اس طور گھمایا ہے کہ کاغذ پر ایک وسیع تر دائرہ
بہر آیا ہے۔ جس میں اخباری صحافت کے علاوہ ریڈیو ٹیلی ویژن، ادبی
سائل اور ڈائجسٹ رسائل تک مقید نظر آتے ہیں۔ یوں صحافت محض چند
خبروں یا اخبار نویسوں تک محدود نہیں رہی بلکہ اس میں خبر کو پھیلاتے
لے تمام ادارے شامل ہو گئے ہیں اور اس طرح بین السطور میں یہ سوال
برآیہ ہے کہ جب صحافت کی آزادی کا ذکر آئے تو کیا اس میں ابلاغ اور
بیل کے دوسرے ذرائع کی آزادی کا مسئلہ بھی شامل کیا جائے گا یا نہیں؟
زمانہ نقلی خیر سے کہیں زیادہ تصویریں خبر ساز کر رہی ہے۔ لہذا اگر تصویریں
بیکلفرڈ، جانبدار یا کٹ پھٹی ہوئی تو عامہ ملک صحافت بھی آلود یا بدیر اس
سے ضرور متاثر ہوگی۔

”داستان صحافت“ کے مطالعے سے ایک یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ
اڑی صحافت شروع ہی سے سیاسی جزو و مد کے تابع رہی ہے۔ یعنی
بافت پر کوئی سیاسی طوفان اٹھا ہے تو صحافت نے بھی اس طوفان کی
بت سے ایک طوفانی رنگ اختیار کیا ہے اور جب مطلع صاف ہوا ہے
صحافت میں جھاگ کی طرح بیٹھ گئی ہے گویا (CONSISTENCY) کا عمل
کی صحافت میں ابھی پوری طرح ظاہر نہیں ہوا اور نہ ابھی ہمارے ہاں خبر کی حرمت کو
نہ رکھنے کی کوئی پرمخوں کو شش سامنے آئی ہے۔ آج بھی جب اخبارات

لوک گیت ہمارا ثقافتی ورثہ

زمینوں ہانو

ہے، جس میں قوم کی نفسیات، اور زندگی کے بارے میں ان کا نظریہ ان کا قنویں یا رجائی نقطہ نظر ملتا ہے۔ قومی کردار کا تعین کرنے والے نے لوک گیت بہترین سرمایہ ثابت ہوتے ہیں، کیونکہ قومی فکر کے خدوخال اور اجتماعی نفسیات کے خطوط اس میں زیادہ صفائی سے ابھرتے ہیں لوک گیت اپنی سادگی، واہما کی کیفیت اور مقامی رنگ کے باعث نہایت دلپذیر اور کیف آور ہوتے ہیں ان میں اپنے علاقے کے رسم و رواج میلے پھیلے اور روایت عشق و محبت کا ذکر بے ساختگی اور حقیقت پسندی سے کیا جاتا ہے بالکل اس طرح کہ اس علاقے کی ایک بھرپور تصویر ہماری نظروں کے سامنے کھینچ جاتی ہے۔ ان گیتوں میں عوام کے دکھ سکھ، نفرتیں، سچائیاں اور بے لوث محبت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، جیسے آسمان پر ستارے غرقِ فکر ان میں زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی ملتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان میں بیان کردہ جذبات براہ راست دل پر اثر کرتے ہیں اور ان کا اثر دیر پا ہوتا ہے، یہی نہیں ان میں اپنے ماحول اور جغرافیائی حدود بندوں کی تصویر کشی بھی ملتی ہے جن سے ہمیں نہ صرف کسی ملک کے یا خدوخال کے رہن سہن کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہے بلکہ وہاں کے موسموں، پھلوں پودوں اور رسم و رواج کے بارے میں بہت کچھ جانتے اور سمجھنے میں

شکسپیر نے کہا ہے کہ جو شخص نئے پرجوم نہیں جاتا اور دلکش آوازوں کی ہم آہنگی سے پیدا ہونے والے روح پرور حسی سے لطف اٹھانے کا اہل نہیں، اس قابل ہے کہ اسے مردود قرار دیا جائے اس پر کسی اعتبار نہ کرنا چاہیئے؟

اس بات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ گیت اور موسیقی انسان کے لئے کتنی ضروری چیزیں ہیں۔ گیت کے ابتدائی بولوں کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کا جنم پہلے انسان کی پیدائش کے ساتھ ہوا ہے لوک گیت انسان کی اسی پہلی سوچ اور فکر کا نتیجہ ہے، پہلا انسان علم و فطرت کا مالک نہیں تھا اس لئے گیت کے ان بولوں میں انگھڑ بے ساختگی تھی اور یہی بول سینہ بہ سینہ چل کر ہم تک جوں کے توں پہنچے ہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہیں خود رو پھولوں سے تشبیہ دی جاتی ہے لوک گیتوں کا ایک قوم کے تمدن میں وہی مقام ہوتا ہے جو کسی ملک کے قدرتی مناظر میں خود رو پھولوں کا۔ خود رو پھولوں کی طرح لوک گیت بھی خود بخود وجود میں آتے ہیں۔ ان کا خالق کون ہوتا ہے؟ یہ کسی کے تخیل اور کسی کی قوتِ فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں ان سوالات کا یہی جواب ہے کہ لوک گیت مجموعی طور پر پوری قوم کے ذہن کی پیداوار ہوتے ہیں، اس لحاظ سے لوک گیت کی مثال ایک ایسے آئینے کی سی

مدد ملتی ہے۔

لوک گیت زندگی کی مثبت اور منفی قوتوں کا ایسا مرقع ہے جسے اگر کچا کر لیا جائے تو اس گلدستے میں رنگ رنگ کے پھولوں کی بہار نہ صرف دل و دماغ کو معطر کرنے کا سبب بنتی ہے بلکہ اس سے تہذیب و ثقافت کی دریافت کی راہیں بھی کھلتی ہیں۔ ایسی راہیں جن پر چل کر ہمیں ماضی کے نہاں خانوں میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے اور انہیں کی وساطت سے ہم اپنے گم شدہ خزانوں کا کھوج لگاتے ہیں۔ وہ خزانے جن کی دریافت ہماری اپنی دریافت ہے۔ ماضی کے ان جبر و کون ہیں سے ہمیں ان نژاد و رنگ رسائی حاصل ہوتی ہے جن کے بغیر ہم اپنے آپ کو ناقص سمجھیں کر سکتے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس قیمتی ذخیرے کو جلد از جلد محفوظ کر لیں کہ اُنے والی سلیبیں انہیں نژاد و رنگ کو اپنی تاریخ کی بنیاد بنائیں لیکن اس طرح صرف انہیں اپنی شخصیت کا امیج معلوم کرنے میں آسانی ہوگی بلکہ ان کو ہماری فکر و دانش، علم و ادب، تاریخ و سیاست، مذہب و ملت احساسات و جذبات اور عدل و انصاف کی میزان کے پلٹروں کو پرکھنے میں کسی قسم کی دشواری نہیں ہوگی۔

یہاں میں آپ کی خدمت میں چند گیتوں کے تراجم بطور نمونہ پیش کرتی ہوں اس سے آپ کو لوک گیتوں کے سحر اور ان کے گوناگوں موضوعات کا اندازہ لگانے میں مدد ملے گی۔ ایک کشمیری لوک گیت سنئے۔ اس میں کشمیر کے بچے بچے کی مطلوبی، آفتقادی بد حالی اور نا اُسودگی واضح ہے۔

برن بچے والا ہانک لگاتا ہے:

”سرہ رنگ پہاڑوں کی چوٹیوں سے میں تمہیں اتار لایا ہوں، میں لکنا کشور ہوں۔ تم سر و شمشاد کی چھاؤں میں سورج کی نیکیوں کو روں سے محفوظ بنائیں۔ اب میں تمہیں اپنے ساتھ گل گل رسوا کرتا ہوں دھوپ و سایہ حسن کی دشمن ہے اور تم لفظ بلند بگھل رہی ہو۔ لیکن اے پہاڑوں کی حسین شہزادی۔ تیرے ساتھ میں بگھل رہا ہوں۔ تو سورج کی آگ سے بگھل رہی ہے اے اے میں اپنے پیٹ کی آگ سے“

ذیل کے جگالی لوک گیت کو سن کر آپ کی آنکھوں میں وہاں کا

سارا کرب گھوم جائے گا۔ ”جلا ا گیا ہے، کھیتوں میں دھان کے نہری خنٹے جاڑے کی خشک ہوا میں ہمارے ہیں۔ پٹ سی کے کھیتوں میں کٹن لگی ہوئی ہے۔ پر دہی اپنے گھر لوٹ رہے ہیں۔ اب تم بھی آ جاؤ میرے محبوب، انتظار سے میری آنکھیں پتھر اگئی ہیں“

”میرا باپ بوڑھا ہو چکا ہے۔ بھائی کو دیا کھا گئی ہے اور میرے کھیت بھی میرے دل کی طرح اجاڑ ویران پڑے ہیں۔ اب تم واپس آ جاؤ میرے ساتھی“ اور پنجاب کے اس لوک گیت میں ایک دہریہ کی بچاؤ کی حکایت کس قدر خوبصورتی سے کی گئی ہے۔

”میرے ماں باپ نے مجھے لاڈ سے پالا تھا اور سسرال والوں نے مجھے کام پر لگا دیا، میرا گلابی رنگ اڑ گیا ہے، مجھ پر ترس کھا ڈیا“ میرے ماں باپ نے مجھے لاڈ سے پالا تھا۔ سسرال والوں نے مجھے چکے کے کام پر لگا دیا، میری پسلیوں میں سو سو بل پڑتے ہیں۔ مجھ پر دم گردہ پشتو کے ایک لوک گیت میں یہاں کے مخصوص مزاج کی جھلک اس طرح بیان کی ہے: ”دشمن کو سڑخ گویوں میں دفن کر دو کار تو سن ختم ہو جائیں تو میں لوٹیں (ذیور) رہیں لکھ کر مزید کار تو سن لا دوں گی“

اس سلسلے کو اور بھی بڑھایا جاسکتا ہے لیکن اس تقریب میں مزید تفصیل پیش کرنے سے معذور ہوں صرف اتنا کہوں گی کہ برصغیر میں سب سے پہلے دیوتندرنیارتھی کے ذہن میں لوک گیتوں کو جمع کر نیکا کا خیال آیا تھا چنانچہ اس نے اپنے اس ارادے کو عملی صورت دینے کیلئے سالہ برصغیر کا دورہ کیا تھا اور لوک گیتوں کی

تلاش کی۔ فریڈلینڈ بستی بستی ایک خانہ بدوش کی طرح گھوم پھرا اور اس تھکان اور جستجو کا نتیجہ اس کی دو کتابوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ ستیا دھنی کی دونوں کتابیں ”گائے جا ہندوستان“ اور ”میں ہوں نرندرا“ اب تک اس موضوع پر کسی حد تک مکمل اور کارآمد کتابیں تھیں ستیا دھنی کے بعد دوسرے ادبا نے بھی اس ادبی ذخیرے کو حاصل کرنے اور اس میں پوشیدہ معنی مفہوم کو پانے کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں

غزل

ماجد خلیل

ظرفِ احساس میں ڈھلنے رہتے

زندگی کوئی نیا زخم نہ دے

ہنرمند چہ سنبھلتے رہتے

مل ہی جائے گی گھٹی چھاؤں کبھی

پیار کی دھوپ میں چلتے رہتے

جوشِ فکر ہے دریا دریا

موج در موج اُبلتے رہتے

خود شناسی کی حسیں آنچلے

صورِ برف پگھلتے رہتے

ایک منزل کا تعین کر کے

ایک رفتار سے چلتے رہتے

مثلِ تحریکِ تغیرِ ماجد

ذہن بیدار میں پلتے رہتے

کی ہندیب و ثقافت کو آنکھیں پرکھنے کی کوششیں کیں اور اس کے نیچے
میں ہمیں کئی مفید اور کارآمد مضامین اور کتب مطالعے کے لئے ملیں۔
قیامِ پاکستان کے بعد فارغ بخاری صاحب نے پشتو لوگیتوں
کو جمع کر کے اس سلسلے کو آگے بڑھانے کی سعی کی تھی۔

لوگ ادب کی اس افادیت کو اس سے قبل ہماری کسی حکومت
نے قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ مقامِ شکر ہے کہ ہماری عوامی حکومت نے لوگ
کی ترویج و ترقی کے لئے سنجیدگی سے توجہ دی ہے۔ اور اس اہم کام کے
لئے ثقافت ورثے کا کوئی ادارہ تشکیل دیا ہے جس کی زیرِ نگرانی
پاکستان کے گوشے گوشے سے لوگ ادب اور ثقافت کے ذخیروں کو
تلاش کر کے جمع کیا جا رہا ہے یہی نہیں بلکہ عوامی فنکاروں کے سینوں
میں لوگ گیتوں اور داستانوں کا جو ذخیرہ محفوظ ہے اُسے قلم بند اور
ریکارڈ کرنے کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اس ادارے کی
تذیبر سرپرستی "بن پھلاری" کے نام سے افضل پرویز کی کتاب اور
"سرحد کے لوگ گیت" کے نام سے فارغ بخاری کی کتاب شائع ہو چکی
ہے "بن پھلاری" میں مرث پٹانوی اور پوٹھوہاری لوگ گیت جمع ہیں
جبکہ "سرحد کے لوگ گیت" میں پشتو، ہندکو، چترالی اور کوہستانی
لوگ گیتوں اور ان کے مختلف ہموں کا تفصیل جائزہ پیش کیا
گیا ہے۔

————— ❦ —————

بزدل

فضل قدیر

اڑس یا۔

”جیسے سے ایک لہراتا ہوا سٹرا بھرا۔“

”ہوئی تریں۔۔۔“

اور دو گد بے چھو کروں نے۔ اور جوگی تری مری۔۔۔۔۔

”تانا کو بڑے لہرا کر کورس کے انداز میں اٹھایا۔۔۔“

ایک آواز نے چیخ کر پوچھا۔۔۔ ”اچھا جی راجہ لہراسپ خاں اکیلے

ہی اکیلے ہمارے لڈو کہاں ہیں۔“

راجہ لہراسپ خاں نے جیسے مڑ کر کہا، ”بیلی میرا ٹکڑ نہیں نکاح

دے چھو اسے، بادامان تے کیسے پر دیوا لگا۔“

”او جیو، جیو میرے راجہ۔۔۔“

ایک دوسرے صاحب شستہ اردو میں گویا ہوئے۔

”یاد راجہ خدا جلد وہ دن لائے پر میرے شیر، دوپٹے سے کان

باہر نکالنے والی رسم اپنی بھ میں نہیں آئی۔۔۔۔“

”اوسے ٹکڑ نہیں سارے کس بل نعل جائیں گے۔“ راجہ نے آٹھ مارتے

ہوئے کہا۔

”بس بھڑ بھڑاتی، چڑچڑاتی چاندی چوک اسٹاپ پر ٹکی۔۔۔“

تو پھر فضا میں یہ بول لہرایا۔

”میری تری منگنی ہو۔ اوگئی۔۔۔۔“

راجہ نے جو چیخ کی سیٹ کے وسط میں بیٹھا تھا بغل میں بیٹھے اپنے

دو شرہ بالوں کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ عمال کیسے ہوئے اپنی ٹانگوں

کو سامنے والی سیٹ کے نیچے اور بہت نیچے پسارنا شروع کر دیا۔۔۔۔

ایک شرہ بالا، کمی کمی کرتے ہوئے بولا۔۔۔ ”بس بس باقی حد ادب۔۔“

بس میں معرکہ کارزار کا سماں تھا۔ کچھ لوگ چیخ رہے تھے۔ اسے

اترے دوڑا اترے دوڑ۔ کچھ کندھوں سے کندھے جوڑیے۔ بس کے اندر خرق

کرنے کے لئے سامنے شاخص، جوم کو سڑوں اور کندھوں سے دھکیا کر

زندہ رہنے کے لئے اپنے ڈھٹائی واضح کرتے ہوئے خود کو اندر کی طرف

رہی رہے تھے۔ سکتھ روڈ کے اسٹاپ پر میدان حشر کی اس بھیڑ کو

چیرتی پھاڑتی وہ زمانہ دروانے سے کتابوں کا بوجھ بغل میں دبائے،

بس کے اندر دھنسنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کا دوپٹہ اس کے سر سے

ڈھلک کر ایک دھجکی کی طرح اس کے کندھوں پر پٹ گیا۔ اس کے لمبے

بالوں والی چوٹی نہ معلوم کس طرح ناگ کی طرح ریگ کر، درشلنے کا پل

عبور کرتے ہوئے اس کے سینے پر، گرنی۔ زمانہ سیٹوں پر نیلے کوٹ

اور سرخ ٹائیاں لگائے کچھ مردانے حسب دستور ڈٹے ہوئے تھے۔

”جیسے سے ایک جیتی ہوئی آواز نے کہا۔۔۔۔۔ یڈیز فرسٹ پلیئر۔

صنف نازک کے لئے جگہ خالی کرو۔۔۔“

بس کنڈیکٹر اس طرف متوجہ ہوا۔۔۔

”یڈیز سیٹ چھوڑیں جناب۔ یڈیز سیٹ، ایک مسخرے نے

نعرہ لگایا۔۔۔۔۔“

”صنف نازک کو سامنے لیجے صاحب۔۔۔“

یڈیز سیٹ خالی کر کے یہ زندہ دل چھیلے اس سے پھیلی زمانہ

سیٹ پر اجماع ہو گئے۔۔۔۔

فرخندہ ایک طویل سانس کھینچ کر اب اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔۔۔

اس نے اپنی تباہی گھنٹوں پر ٹکائیں۔ دوپٹہ درست کیا۔ پریشان رہیں

کنپٹوں کے جیسے دبائیں اور دوپٹہ سر پر منڈھ کر کانوں کی کڑیوں میں

اور انہیں یہ بھی منظور نہیں تھا کہ فرخندہ بھی ان ہی کی طرح تیلی محلے میں آنکھیں کھول کر اسی کی تنگ و تاریک گلیوں میں ایڑیاں رگڑتی دنیا سے رخصت ہو جائے۔ تیلی محلے اور لالہ زار کالونی میں بڑا قاصد تھا مگر ایک ڈمگاتے، کیکپاتے باپ کی بے پایاں محبت، بڑی سے بڑی جست لگانے کو تیار تھی۔۔۔۔۔ آخر انہوں نے اپنی مرحوم بیوی کی رشتہ کی ایک بیوہ بہن سے نکاح کر لیا کہ اور کچھ نہیں تو گھر کھل جائے گا۔ جو ان بچی کے رشتے ناتے بھی آنے لگیں گے اور پھر قریح بات تو یہ ہے کہ یہ جہان بھٹک کچھ عورتوں ہی کا کام ہے اور وہی اسے بہتر طریقے پر کرنے کی اہل بھی ہوتی ہیں۔

خالد بی بی بڑی پختہ کار خاتون تھیں انہوں نے شروع شروع تو بچوں کو خوب پرچایا فرخندہ پر تو وہ صدقے قربان ہوتی رہیں اور دیکھنے والے بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ بھئی جس ہے ماں مرے موسیٰ جنے کی کہاوت تو یہیں قریح ہوتی نظر آرہی ہے۔۔۔۔۔

فرخندہ تو محبت کی بھوک تھی وہ بڑی تیزی سے ان کے دم میں پھنسی چلی گئی۔ اٹھتے بیٹھتے خالد بی کا نام چپنے لگی اور فخر الدین بھی بڑے مطمئن اور آسودہ نظر آنے لگے کہ خوبی تقدیر سے اس نئی بیوی کے دل میں خدائے ماننا جگا دی تھی۔ مگر پھر بہت جلد پانسہ پٹا اور پردہ اس طرح ناش ہوا کہ خالد بی نے اپنے ایک کھٹورہ رنڈوے بھائی مشاق کے لئے جو ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں فزقارہ ہموار کرنی شروع کی اور جب ایک دن سرخ رومل میں رشک منیر عطر کی شیشی کے ساتھ ایکسپرچ اس کے نکتے کے پاس رکھا ہوا ملا تو وہ حق و حق رہ گئی۔۔۔ کانپنے ہوئے ہاتھوں سے اس نے پرچہ کھولا۔ خط کے اوپر کچے خط میں لکھا تھا،

”جب سے لاگیں آنکھیاں موری۔۔۔۔۔“

اور آخر میں کہا گیا تھا ”اے جان تمنا اگر تم اس تغافل شعلہ باری سے باز نہ آئیں تو بندہ یہ بتا دیتا جا رہا ہے کہ تمہیں اٹھو اور بچاؤ گے گا اور تم ایسی جگہ پہنچ جاؤ گی کے کسی کو آواز دے کر بچا بھی نہ سکو۔۔۔۔۔“

آنکھیں ڈالیں کا زما نہ ہے۔ بے تار جوڑے پیغام پہنچ جاتا ہے۔۔۔۔۔
بس کنڈیکٹر کھڑے ہوئے لوگوں کے درمیان گستا پلتا۔ اور کوئی صاحب بغیر ٹکٹ نہ۔۔۔ کے نعرے مارتا جب لیڈیز سیٹوں کے درمیان اگر اس کی سیٹ کے قریب پہنچا تو اس نے جوتی اس کی طرف بڑھائی۔۔۔۔۔

”صدر۔ صدر۔“ اس نے بے صبری سے پوچھا۔ تو اس کے جواب میں فرخندہ نے آستلی سے کہا نہیں ”تیلی محلہ“۔۔۔۔۔

تیلی محلہ کا نام سننے ہی آج پھر معمول کے مطابق شاہ بانوں نے اچھے سے پوچھا ”اویار تاسے میرے کیا ریٹ چل رہا ہے۔ آج کل۔۔۔۔۔“

اور نوشاد نے شستہ لہجے میں ان سب سے پوچھا کیا پکڑوں کی دکان کھولنے کا ارادہ ہے۔۔۔۔۔

پھر خدا خدا کہے تیلی محلے کا ساپ آیا اور فرخندہ کتابوں کا بائیریں بگل میں مار اس قیامت سے نکلی تو نوشاد اور شاہ بانوں کی بے ٹولی اس کے ساتھ اتر پڑی۔۔۔۔۔ وہ سب آہستہ آہستہ اس کے پیچھے رہ گئے گئے۔ اور جب وہ اپنی گلی میں داخل ہوئے لگی تو اس نے آہستہ سے گردن موڑ کر کہا خدا را آپ لوگ ذرا دم کریں یہاں میرا گھر ہے جہاں میں ماں باپ کے ساتھ رہتی ہوں۔۔۔۔۔

نوشاد نے بڑے کریمانہ انداز میں کہا۔۔۔۔۔ ”دس از فاول دس از فاول۔۔۔۔۔“

شاہ بان۔۔۔۔۔ چھوڑو یار۔۔۔۔۔ اور وہ سب پلٹ پڑے۔

یہ آج کا حادثہ نہیں تھا یہ تو روز کا معمول تھا۔ یہ جماعت جاناغہ روز اسی طرح اسے لگی تک چھوڑ کر جاتی تھی۔۔۔۔۔

وہ یہ سب کچھ سہہ رہی تھی اور اس نے سہہ رہی تھی کہ خالد بی بڑی تند و تیز عورت تھیں فرخندہ کے والد شفی فخر الدین نے دھلتی عمر میں ان سے دوسری شادی اس وقت رچائی تھی جب فرخندہ جوان ہو چکی تھی۔۔۔۔۔ فخر الدین طبعاً کمزور طبیعت کے انسان تھے۔ انہیں اپنی بیٹی اور دو لڑکوں سے جو ابھی زیر تعلیم تھے محبت مٹھی مگر طویل سنسن زندگی اور خاص کر فرخندہ کے جوان ہوتے ہی لوگوں کی چہ میگوئیاں ان پر بری طرح اثر کر رہی تھیں۔ وہ لوگوں کا منہ تو بند نہیں کر سکتے تھے

۹۔ عقیق عورتوں کا عالمی سال منانے کے لئے حقوق نسواں پر ایک مذاکرہ منعقد ہو رہا تھا۔ بیگم کرنل باری، بیگم قدرت اور مس عفت جمال مجلس مذاکرہ سے خطاب کرنے والی تھیں۔

پرنسپل صاحبہ بڑی شوخ ساڑھی میں لمبوس ادھر سے ادھر دوڑتی پھر رہی تھیں۔ کالج کے بڑے ہال میں طالبات قطاروں میں بٹھا دی گئیں۔ مائیک پر اعلان ہوا اہمان خصوصی تشریف لا رہی ہیں سب ایسا وہ ہو جائیں۔

سب لڑکیاں کھڑی ہو گئیں۔ خطبہ، استقبالیہ کے بعد۔ بیگم باری نے سیولیس (۴۵۶۷۱۰) کوئی۔ جس پر فرمایا۔

”ہم عورتیں اب مٹی سے کھلونوں سے نہیں بہل سکتیں۔ یہ چند اسیانیاں یہ چند عہدے ہمارے مسائل حل نہیں کر سکتے۔ ہمیں قومی اور صوبائی سطح پر زیادہ نمائندگی ملنا چاہیے اور مس عفت جمال نے کہا۔ ”معلوم عورتوں کو کیا سمجھ پایا گیا ہے آخر مرد تو چاہے شادیاں کر سکتا ہے۔ مگر سبے چاری عورت ایک سے زیادہ خلاق بھی نہیں لے سکتی۔ اگر عورتیں بھی دو دو تین تین شوہر رکھنا شروع کر دیں تو یہ مرد خود کشیاں کر کے مرجائیں۔ ایسا کہتے ہوئے ان کے لیے نازک ناخن ہار بار بار ان کے گلے پر پڑتے اور وہ تخیل میں مردوں کے گلے گھونٹتی وہ باتیں کہہ رہی تھیں جن پر اس ملک میں کوئی بھی فہم انسان سوچنا بھی معصیت سمجھتا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں بات تو یہ ہے کہ ہمارا ملک بہت پسماندہ ہے یہاں کے تو مرد بھی ستم زدہ ہیں عزیزوں کو محبت تک کا حق نہیں ان کی جو انیاں بلبلائے گذر جاتی ہیں وہ برقعوں کی کافی کفنیوں کے علاوہ صنعت نازک کے صحیح خرد و خال تک نہیں دیکھ سکتے۔ میری تجویز تو یہ ہے کہ خاص قسم کے ڈاک کے ٹکٹ جاری کئے جائیں جنہیں دو محبت کرنے والے اپنی خط و کتابت میں استعمال کریں ان خطوط کو متعلقہ افراد کے علاوہ اگر کوئی کھوے تو وہ مجرم قرار دیا جائے۔ کوئی پرواہ نہیں گروہ کوئی دقینہ نویں باب ہی کیوں نہ ہوں۔“۔۔۔

جب کچھ ہلکے گھٹے قہقہے بلند ہوئے تو مس عفت جمال

خند میں آ گئیں۔۔۔

”آج آپ مجھ پر ہنس رہی ہیں مگر میں آپ پر رو رہی ہوں۔ احساس کمتری نے آپ سے سوچنے کی صلاحیتیں چھین لی ہیں۔“ فرخندہ کے کانوں میں یہ بول لرزے لگے۔

میری نرمی منگتی ہو اگئی۔

ابو۔۔۔ ہو۔۔۔ اگئی۔۔۔۔۔

اس کا جی چاہی جیتی ہوئی ڈانس پر چڑھ جائے اور کس جمال کا گریبان فوج کر ان سے کہے جو تم نے کبھی تیلی مجھے۔ ڈھوک زنا اور نرنگاری بازار میں سانس نہیں لی تم لالہ زار سے اٹھ کر اس اسٹیج پر ہمارے نہیں امریکی اور فرانسیسی عورتوں کے مسائل لے کر آ گئی ہو، تمہیں کچھ خبر نہیں ہے، میری تعلیم کا جنازہ نکلا چاہتا ہے۔ میرے بوڑھے باپ کی بیکی کو کون سی صلیب پر چڑھایا جا رہا ہے۔ ہنگر وہ ضبط کئے بیٹھی رہی۔ اسٹیج پر کھپتیلیوں کا تاشا ہوتا رہا۔

پھر لڑائی کے محفل برخاست ہوئی تو وہ پھر بس میں مجھ کو پرتی جادھنی۔

آج بھی نوشاہ اور اس کے شہر ہالے اس کے گرد پرا جملے ہوئے تھے۔ پچھلی سیٹ سے جب راجہ لہرا سپ کے جوتے اس ایڑیوں میں لگے، تو اس نے گھوم کر کہا۔ کیا آپ واقعی منگنی کرنا چاہتے ہیں۔“

جواب ملاٹھٹ منگنی پٹ بیبا۔۔۔۔۔

نوشاد نے بول اٹھا۔۔۔

سو بے بھابھی لادو بھیا

مورا جیا بہلا دو بھیا۔۔۔۔۔

پھر تیلی مجھے کا بس اسٹاپ آیا تو یہ جماعت آج کچھ زیادہ ہی جوش سے نیچے اترتی۔۔۔

فرخندہ آگے چلی تو یہ جماعت پیچھے پیچھے ہو گئی۔

مولانا نے مجمع کو بٹھاتے ہوئے دیکھا تو کہا: ”ڈرو نہیں بیٹا چلو،
چلو یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں سامنے میری بیٹھک ہے وہاں
بات ہوگی۔۔۔“

مختصر مجمع بیٹھک کی طرف چل دیا۔

مولانا نے چار پائی پر بیٹھتے ہوئے کہا:۔۔۔

”ہاں برخور دار تو بات یہ ہے میرے عزیز کہ شریعت کی
رو سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے اور میں تو اس بچی کی صفائگی
کی تعریف کروں گا کہ اس نے حدود و اہل کا احترام کرتے ہوئے
عقد مسنونہ کی طرف اس طرح دلیری سے قدم بڑھایا۔۔۔ میں ہی
نہیں پورا محلہ آپ کے ساتھ ہے۔ ہم سب یہ کارِ خیر سرانجام
دیں گے۔“

راجہ لہراسپ اب سکیاں بھر رہا تھا۔ ”خدا ارے مجھے معاف
کر دیجئے۔۔۔“

”اچھا تو یہ کیا بات ہوئی یعنی کہ تم اس لڑکی سے شادی نہیں
کرنا چاہتے۔۔۔۔۔“

”جی ہاں، میں نے اس سے اس وقت تک شادی نہیں کی کہ اس نے
میں سے کہا کہ ہم لاہور میں رہنے میں تو بوجہ ہی مذہبی ہیں۔۔۔
”اوجھا۔۔۔۔۔ خوب۔۔۔ خوب۔۔۔ معقول۔۔۔ حدود و اہل کو طرے
میں اتنے تیز اور سنجیدہ کی آواز میں اتنے پیچھے۔۔۔۔۔“

جمال دین حجاز نے امرہ مارا۔۔۔۔۔
”گڈے، شودے۔۔۔۔۔“

”پچھا کرتے ہوئے آئے ہیں“ احمد دین قصفانی نے گھونٹا اٹھا کر
مولانا نے رنج کر لیا۔ ”رہنے دو رہنے دو، بزدل ہیں یہ۔“
اچھا برخور دار معاملہ کی تہہ ناک پہنچ کر۔۔۔ اب فیصلہ یہ ہے
کہ زمین پر مال سے لیکر یہ مال کو کرا ب بھی کسی لڑکی کا بچا نہیں لڑوئے۔
نکاح تو لڑکی اور راجہ زمین پر بچا تو فرخندہ۔۔۔۔۔ زمین پر حقور کر وہاں
سے چل دیں۔۔۔۔۔

وہ اپنی غلی میں مڑنا چاہتی ہی تھی کہ معاً اس پر ایک دودھ
ما پڑا۔ دوسرے لمحے۔۔۔ اس کا ہاتھ راجہ لہراسپ کی کلائی پر
پوست ہو گیا۔

”آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ بولئے نا۔ میں تیار
ہوں۔ میں تیار ہوں۔۔۔۔۔“

راجہ نرے پاؤں تک کانپ رہے تھے۔

”دیکھئے چھوٹیے نا چھوڑ دیجئے پلیرز لوگ جمع ہو جائیں گے۔“
جمع ہو جانے دیجئے۔ میں واقعی آپ کو پسند کرتی ہوں۔ آپ
کے ٹھنڈے بالوں نے مجھے امیر کر لیا ہے۔ پھر اس میں کیا حرج ہے؟
”آپ کو شرم نہیں آتی مس۔۔۔ کیا نام آپ کا۔۔۔ خدا کے لئے
چھوٹیے۔۔۔۔۔ راجہ بلبلائے۔

چودھری سلامت علی پنساری، جمال دین حجاز اور محلہ کے
معزز ترین شخص مولانا قطب الدین آن واحد میں وہاں جمع ہو گئے۔
”کیا بات بیٹا۔۔۔ کیا بات چچر۔۔۔“

”یہ کالج کے منڈے چیر مارے ہیں کڑیاں نوں بچمال دین
جام نے بات مولانا کو سمجھائی۔

فرخندہ کے ہاتھ کی گرفت راجہ لہراسپ کی کلائی پر اور مضبوط ہو گئی۔
”کچھ نہیں یہ مجھے چیر پڑتے نہیں مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔
مولانا صاحب میں ان سے یہ ہی کہہ رہی ہوں کہ چلو میرے باپ کے
سامنے جل کر رشتہ مانگ لو میں تمہارے ساتھ ہوں۔“
مولانا نے داڑھی کھچاتے ہوئے کہا۔

”اے ہوں از روئے شریعت اس میں کوئی قباحت نہیں منشی فخر الدین
صاحب سلجے ہوئے آدمی ہیں یہ محلے کی بیٹی ہے، ہمارا کی بیٹی ہے ہم سب
ان پر زور دیں گے۔ چلو برخور دار چلو۔“

راجہ نے کانپ کر سب کے آگے ہاتھ جوڑ لئے۔ ”آپ لوگ
مجھے معاف کر دیں۔ دیکھئے میرے ڈیڈی سن لیں گے تو مجھے مار
ڈالیں گے۔“

افسانہ

عظیم عورت

فوزیہ رشید

مزدورت ہوئی تو وہ اپنے گھر، اپنے شوہر، سب کو خیر باد کہہ دیں گی۔ وہ اک ننھی سی جان پر یہ ظلم نہیں کریں گی چاہے خود ان کی اپنی زندگی ہی کیوں نہ تباہ ہو جائے..... نہیں خدا اتنا ظالم نہیں وہ ضرور مجھے بٹا دے گا۔

انہیں خیالوں میں عرق وہ پچھلی نشست پر ارد گرد کے ماحول سے بے نیاز بیٹھی تھیں کہ اچانک وہ رکی اور شو فرنے مطلع کیا کہ بیگم صاحبہ ہسپتال آگیا ہے۔ تب امینہ کا خیالات سے رابطہ منقطع ہوا اور ایک دفعہ پھر انہوں نے بیٹے کے لئے دعا مانگی اور سکاڑی سے نیچے اتر آئیں۔

جنرل ہسپتال میں پہلے ہی سے ایک کمرہ بک کر دایا جا چکا تھا۔ امینہ کو دیکھتے ہی کئی لیڈی ڈاکٹرز اور نرسیں ان کی طرف بڑھیں اور ایک خوبصورت پرائیویٹ کمرے تک لے گئیں۔ لیکن امینہ اب تک تصورات میں گم تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے معصوم صورتیں گھوم رہی تھیں کبھی وہ لڑکے کی شکل میں ہوتیں اور کبھی لڑکی کی۔ جب لڑکی کی شبیہ اس کی نظروں میں آتی تو وہ ایک دم بکھ سی جاتیں لیکن دوسرے ہی لمحے لڑکے کی صورت آنکھوں میں سما کر ساری کائنات کو رقصاں کر دیتی اور وہ اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت تصور کرتیں۔ خدا کو امینہ کی آزمائش مقصود تھی تبھی تو اگلے دن اس کے ہاں ایک بھول سی بچی نے جنم لیا۔ امینہ بچی کی پیدائش

بیگم رفیق دھڑکتے دل کے ساتھ ہسپتال کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ سار کی کھڑکی سے سرٹیکے آسمان پر اداس بادلوں کے ٹکڑوں کو ملتے اور جدا ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ جب یہ آوارہ ٹکڑے آپس میں ملے ملتے تو بیگم رفیق خوشی سے جھوم اٹھتیں اور جب یہ ٹکڑے ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے تو وہ اک انجان سے خوف سے تڑپ اٹھتیں اور غلوں دل سے دعا گو ہوتیں کہ اسے خدا! میری آرزو پوری کر دے مجھے ایک لڑکا عطا کر دے۔ وہ خوب واقف تھیں کہ رفیق صاحب کو لڑکیوں سے سخت نفرت ہے اور وہ کسی لڑکی کو بیٹی کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے۔ سے تقریباً ایک ماہ پہلے انہوں نے اپنی بیوی امینہ سے کہا تھا کہ اگر اسے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو اسے ہسپتال میں ہی چھوڑ آنا اور اگر تہاری تنہا کرتے ہوئے تیخ اٹھی تو میری طرف سے تمہیں بھی اجازت ہے کہ ہاں چاہے بیٹی کو لے کر رہ جانا لیکن بیٹی کو لے کر اس گھر کا رخ نہ کرنا۔ اگر لڑکی ہو گئی۔؟

یہ خیال آتے ہی وہ کانپ اٹھتیں اور سوچ کے گہرے سمندر وہ جاتیں کہ کس طرح وہ اپنی ماما کا گلا گھونٹ سکیں گی۔ کس دل کے زوہ ایسا کر سکیں گی۔ اس جگر گوشے کو جس کو انہوں نے اپنے خون کی ایک بو بوسے سینچا ہو نہیں... نہیں۔ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکیں گی۔ مگر

کی مضبوط دیوار حاصل ہے لیکن جوشیلی جوانی نے جوش مارا اور تصور میں ہی اس نے اس مضبوط دیوار کو پاش پاش کر دیا۔

اب دنواز مائیکل کے گھر آکر پڑھا کرتا تاکہ اسی بہانہ ڈارتھی کو ایک نظر دیکھ سکے۔ دنواز کی ترکیب کامیاب ہوئی اور اس نے ڈارتھی سے تعلقات بڑھائے۔ دنواز کے حسین خوابوں میں اب ڈارتھی بھی برابر کی شریک ہو گئی اور صبح شام ہنوں میں رہنے لگی۔

ایک دن جھجکتے جھجکتے دنواز نے مائیکل سے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا۔ مذہب مختلف ہونے کی وجہ سے اسے انکار کا خوف تھا۔

لیکن مائیکل نے یہ کہہ کر کہ ”اگر ڈارتھی راضی ہے تو اسے کوئی اعتراض نہیں“ اقرار کر لیا۔ اگلے ہی ہفتے دونوں نے مسجد حاکم نکاح پڑھوایا اور ہمیشہ ہمیش کے لئے ایک ہو گئے۔ شادی کو ابھی چند ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ بعض سماجی مسائل پر دونوں کی تکرار ہوئی شروع ہو گئی۔ دنواز عیسائیوں میں عودت کو ہر طرح آزاد چھوڑ دینے پر اس کے چٹکیاں لیتا اور وہ مسلمانوں میں سات پردوں میں عورتوں کو مقید کر دینے کا مذاق اڑاتی۔ دنواز بچپن ہی سے فصد کا تیز واقع ہوا تھا اور اسی فصد کی بنا پر کئی سال پہلے اپنے والدین اور رشتہ داروں سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ ایک دن معمولی تکرار پر بیوی کو اس کے والدین کے پاس چھوڑ گیا۔ ڈارتھی جو کہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اس کی منتیں کرتی رہی لیکن دنواز نے نہ کوئی بات سنی تھی نہ سنی چنانچہ بیوی کو چھوڑ کر نو دو گیارہ ہو گیا۔

پندرہ دن بعد ڈارتھی کے ہاں گول مٹول سا، خوبصورت سالن کا ہوا بیٹے کی پیدائش پڑ ڈارتھی دنواز کو یاد کر کے خوب رونی لیکن بے سود۔

اگلے دن نہ معلوم کیوں دنواز واپس پلٹ آیا اور ڈارتھی سے معافی مانگتے لگا۔ ڈارتھی جو پہلے ہی اس کی ہدائی میں بد حال تھی فوراً ہی تما گئے شکوے بھول کر خاندان کو خوش آمدید کہنے لگی۔ دنواز بھی اب ڈارتھی کے ساتھ انہی کے گھر رہنے لگا۔ لڑکے کا نام باپ کے نام پر شاہنواز رکھا۔

شاہنواز کی پیدائش کے بعد دونوں میاں بیوی پھر پیار و محبت کی زندگی گزارنے لگے۔ کبھی کبھی معمولی بات پر تھوڑی سی چپقلش ہو جاتی لیکن وہ سنگین صورت نہ اختیار کرتی۔ شاہنواز ابھی سال کا ہوا تھا کہ ایک اور انصافی سی جان نے اپنی آمد کا آلا م بجایا۔ دوسرا بیٹا ربنواز بالکل باپ کا ہم شکل تھا۔ یہ دونوں بچے سب گھروالوں کی محبت کا مرکز تھے۔ روزی اور مائیکل کو بڑھ چاہے میں دو کھلونے مل گئے ان کا سارا دن انہیں بچوں کے ساتھ گزر جاتا۔

رب نواز سات ماہ کا ہوا تھا ایک دن پھر دنواز روٹھ کر ڈارتھی کو روٹا چھوڑ کر چلا گیا۔ ڈارتھی کا خیال تھا کہ اس دفعہ بھی چند دنوں بعد خود ہی واپس آجائے گا اور معذرت طلب کرے گا۔ لیکن سال گزر جانے کے بعد بھی وہ واپس نہ آیا اسی عرصہ میں ڈارتھی ایک بچی کی ماں بھی بن گئی۔ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی دنواز کا کچھ پتہ نہ چلا۔ روزی اور مائیکل سے بیٹی کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی۔ ایک دن اچانک دل کا دورہ پڑنے سے روزی اپنے مالک حقیقی سے جا ملی۔ اب گھر کا سارا کام ڈارتھی کو کرنا ہوتا۔ صبح کے وقت کام کی زیادتی کی وجہ سے دنواز اسے بہت کم یاد آتا لیکن رات کو کئی کئی گھنٹے وہ ڈارتھی کے ذہن پر سوار رہتا اور بعض اوقات اُس کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کو یاد کر کے ساری ساری رات گزار دیتی۔

مائیکل بیٹی کی وجہ سے بہت افسردہ رہتا۔ سوچتا کہ وہ ایک معر شخص ہے اگر اسے کچھ ہو گیا تو ڈارتھی اس ظالم دنیا میں تنہا کس طرح زندگی گزارے گی۔ یہ خیال آتے ہی وہ دنواز کی واپسی کی دعا کرتا تاکہ کوئی تو اس کا سہارا ہو۔

باپ، بیٹی شام کے وقت بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی مائیکل نے دروازہ کھولا تو دنواز کا ایک دوست تھا۔ ڈارتھی خوشی سے جھوم گئی کہ کچھ تو اس کے خاوند کی خبر ملے گی۔ لیکن یہ خبر کہ ”دنواز سمگلروں کے گروہ میں شامل ہو گیا ہے اور ہر وقت جوئے اور شراب میں دھت رہتا ہے“

دلنواز بوکھلا سا گیا اُس نے جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو مائیکل کو بے انتہا غصہ میں پایا۔ دلنواز بھی کوئی کچیاں نہیں کھیلتا تھا مائیکل کو انتہائی غصہ میں دیکھ کر اُس کے قدموں میں گر گیا اور زور زور سے روتے لگا اور کہنے لگا: بابا مجھے معاف کرو میں اُشدہ کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا میں ڈارتی کو بھی ابھی ہی کہہ رہا تھا وہ مانتی ہی نہیں۔ بابا آپ ہی تو کہا کرتے تھے کہ صبح کا بھولا اگر شام کو واپس گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے ہیں اب واپس آ گیا ہوں۔ خدا را مجھے معاف کر دیں۔ مجھے اپنی خفقت سے محروم نہ کریں۔ یہ ٹھیک ہے قصور میرا ہے میں ایک مدت تک گھر نہ آیا۔ لیکن آپ کم از کم میرے سے یہ تو پوچھیں کہ اتنا عرصہ کیسے کس حال میں گزارا؟ اگر آپ یہ سن لیں گے کہ میں نے یہ عرصہ کس قدر مصیبت اور تکلیف سے بسر کیا تو یقیناً آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

دلنواز کی یہ چال مائیکل جیسے سادہ لوح اور نرم دل شخص کے لئے کافی تھی اس کا..... دل پیچ گیا اور اُس نے معاف کرتے ہوئے داماد کو گھر میں رہنے کی اجازت دے دی۔

اگلے دن دلنواز کے واپس گھر آنے کا راز افشا ہوا۔ دلنواز جمعے میں بیوی بھی ہار چکا تھا اور اب وہ بیوی کو لینے آیا تھا، یہ بات دلنواز کے دوست نے آخری وقت بتائی جب ڈارتی اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو چکی تھی۔ مائیکل اصل حقیقت جان کر بیٹی کی قسمت پر اُس پرانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔ دلنواز کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا گیا دلنواز نے بے عزتی بھلا کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ اس نے عدالت سے چارہ جوئی کی کہ بوڑھا اُس کی بیوی کو درغلا رہا ہے۔

مائیکل کے لئے یہ الزام بہت تکلیف دہ ثابت ہوا اور نہ ہی اب اُس میں اتنی ہمت تھی کہ ان تمام سنگین حالات کا سامنا کرے۔ چنانچہ ایک دن بہت سوچ بچار کے بعد مائیکل نے ڈارتی کو بتایا کہ اصل میں وہ جس کی اولاد ہے اور کس بنا پر انہوں نے لے کر پالا تھا۔ جب ڈارتی کو معلوم ہوا کہ دلتی اور مائیکل اُس کے اصل والدین نہیں بلکہ کوئی بہت بڑے زمیندار صاحب اس کے والد ہیں تو اُسے بھلا

بھاڑیں کر ٹوٹی۔ اور وہ مجھے دل کے ساتھ بچوں کی طرف دیکھنے لگی کہ اُن معصوم بچوں کا کیا قصور جو باپ کے ہوتے ہوئے باپ کے پیار سے محروم رہیں اور ہمیشہ ہی اس کے لئے ترسیں۔ ڈارتی نے ہمت سے کہا یا اور دلنواز تو ایک بچے سے خیال و ذہن سے نکال پھینکا۔ ۱۰۔ ۱۱۔ کہ جن دنوں بعد دلنواز گھر پلٹ آیا۔ لیکن اس دفعہ ڈارتی نے ذرا بھی چاہمت کا مظاہرہ نہ کیا اور وہ اس کی موجودگی سے لاپرواہی برتنی ہوئی اپنے کام میں مصروف رہیں دلنواز جو دو سال بعد گھر میں آیا تھا اُس نے بھی نہ کسی بچے کی خیریت دریافت کی اور نہ ڈارتی کی اور یہاں تک بھولا گیا کہ میں اس گھر میں ایک عرصہ بعد آیا ہوں اور اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہونے کی بجائے رعب جاتے لگا کہ میں سخت تھکا ہوا ہوں مجھے جلد جائے بنا کر دو۔ ڈارتی نے اس نے ایک نہ سن اور نفی خالدہ کے ساتھ کھینچی رہی دلنواز جو یقیناً نقشے میں تھا بیوی کی لاپرواہی دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا اور قریب پڑی دگپی ڈارتی کے سر پر اس زور سے دے ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ ڈارتی جو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی ایک دم پھٹ پڑی اور غصہ سے چلائے لگی کہ اب اُس کا اُس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں اس لیے وہ اُس کے رعب میں نہیں آئے گی جہاں اتنا عرصہ گزارا وہیں سے جا کر جائے بی۔

تہیں اس گھر کا کیسے خیال آیا تم نے آج تک کوئی پیسہ دیا ہے جو اس تلہ ٹکمانہ بچے میں چائے مانگ رہے ہو۔ جاؤ اور دفع ہو جاؤ میرے گھر سے اُشدہ کبھی اس طرف رخ نہ کرنا۔ ڈارتی غصہ میں نہ جلتے کیا کیا بولتی رہی لیکن دلنواز بجائے شرمندہ ہونے کے زیادہ اشتعال میں آ گیا اور لگا ڈارتی کی پٹائی کرنے لگے میں مائیکل دونوں نواسوں کو سیر کروا کر واپس لے آیا بیٹی کو اس بُری طرح پٹتے دیکھ مائیکل کے اوسان خطا ہو گئے۔ اُسے کچھ سوجانی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے آخر نزدیک بڑا ڈنڈا اٹھا کر اسے زور سے گھمانے لگا اور نہایت غصہ سے گریب کر لیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ دفعہ ہو جاؤ میرے گھر سے۔

تمہارا یہاں کیا واسطہ؟ یہاں کیا کرنے آئے ہو؟ میں تمہیں ہی جگہ پر ختم کر دوں گا۔ تم نے میری بیٹی پر پہلے ہی کیا ظلم کئے جواب ملنے کے لئے بھی پہنچ گئے۔ میں بیٹی کا بد دلے کر ہی دم لوں گا۔

جنوری، فروری

کو اس طرح گھورتا شروع کیا جس طرح ایک کوتوال اقبال جرم کسے اور جرم کو اور پھر بولا؟ ہاں تو صاحب! آپ نے رفیق صاحب سے ملنا چندہ مانگنا ہوگا۔ انہیں کیوں تکلیف دیتے ہو میں یہیں منگوا دیتا ہوں کتنے پیسے چاہیے ہیں۔

ڈار تھی سے یہ تو ہیں برداشت نہ ہو سکی وہ ایک دم غصہ سے چلائی، میں چندہ وغیرہ نہیں چاہیے بلکہ رفیق صاحب اور ان کی بیگم نہایت ضروری کام ہے۔
”بی بی یہاں ہر روز سینکڑوں ضرورتوں سے آتے ہیں؟ وجہ کیا؟“
رفیق صاحب سے ملاقات ناممکن ہے؟

چوکیدار سے تقریباً اودھ گھنٹہ بحث ہوئی آخر منت سماجت کے دو نوں باپ بیٹی اندر داخل ہوئے۔ اندر بھی ایک مغز پھراؤگر ملا۔ وہ اسی طرح بول رہا تھا جیسے مالک ہی ہو۔ اسی کو کرنے بتایا کہ صاحب دوسرے کمرے میں آرام فرما رہے ہیں اور وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتے ڈار تھی یہ سب دیکھ کر باپ سے بولی ”بابا! پلیز یہاں سے پاس چلیں نہیں تو اس محل میں میرا دم گھٹ جانے کا جہاں انسان کو انسان سے ملنے ہوئے منت سماجت سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن مائیکل کا الادہ کر چکا تھا کہ وہ ڈار تھی کو اس کے اصل والدین سے ملا کر ہی دم لے گا۔ چنانچہ مائیکل نے اپنی ضد برقرار رکھی اور بیگم رفیق اور رفیق صاحب کو ملاقات پر آمادہ کر ہی لیا۔ بیگم رفیق کو مائیکل نے اپنے کتے کی وجہ بتائی اور ارج سے چوبیس سال پہلے کا دور یاد دلایا جب ان کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی اور وہ اسے ہسپتال چھوڑ آئی تھیں ایک نرس کے پاس۔

مائیکل نے ڈار تھی کی طرف اشارہ کیا اور بتایا۔ یہی وہ لڑکی ہے جسے نرس روڈی کے پاس چھوڑا گیا تھا۔

رفیق صاحب اور بیگم رفیق نے قطعی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کے ہاں کبھی لڑکی پیدا نہیں ہوئی ان کے صرف دو بیٹے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کسی بھی روزی نامی نرس سے واقف نہیں۔
دونوں مایوس ہو کر واپس پلٹ آئے۔ ڈار تھی نے موکر کوٹھی کا جائزہ لیا اور دل میں سوچا کہ اس صاف ستھری اور بڑی کوٹھی کے مقیم کس قدر گندی ذہنیت اور چھوٹے ذہن کے مالک ہیں۔ جیہاں تک

مائیکل کی شخصیت بہت عظیم تھی۔ اور اپنے اصل والدین کو بغیر دیکھے نفرت کرنے لگی کہ کس قدر ظالم ہیں وہ والدین جنہوں نے کہا تک بھول کر بھی اس کو گھر نہ لے کر بیٹی کس حال میں ہے؟

مائیکل کی خواہش تھی کہ اپنی زندگی اس میں ڈار تھی کو اس کے اصل والدین سے ملا دے۔ چنانچہ مائیکل نے اپنی خواہش کا اظہار ڈار تھی سے کیا لیکن وہ بالکل راضی نہ ہوئی اور بولی نہیں بابا بلکہ میں آپ کے ہی خون سے سچی محبت ہوں؟ ”کاش! میں آپ کے خون و جگر کا حصہ ہوں؟“ اس وقت ڈار تھی بہت جذباتی ہو رہی تھی اس لئے مائیکل نے خاموش رہنا ہی مناسب خیال کیا لیکن اگلے دن اسے سمجھایا کہ شاید تمہارا اصل باپ اس وقت تمہاری کچھ مدد کر سکے۔ میرا کچھ بھروسہ نہیں کس وقت اس دنیا کو غیر آباد کر جاؤں اور میرے بعد تمہاری عزت دوسروں کے ہاتھ ایک کھوٹا بن کر اچھلتی پھرے۔ ڈار تھی کو ہر حال میں عزت عزیز تھی چنانچہ اس نے خاموشی سے باپ کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ وہ ایسے شخص کو ایک نظر دیکھنے کی روادار نہیں تھی جس نے اسے بن دیکھے صرف اس لئے ٹھکرا دیا کیونکہ وہ ایک لڑکی تھی۔ حالانکہ وہ اس کے خون کا حصہ تھی، اس کی عزت تھی۔

اگلے دن جب دونوں باپ بیٹی ”رفیق دلا“ پہنچے تو محل نما کوٹھی کی شان و شوکت دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ڈار تھی نے تو صرف انسانوں کہانیوں میں ہی ایسے جگہوں کا ذکر سنا اور پڑھا تھا۔ ارج حقیقت میں وہ ایسی شاندار کوٹھی دیکھ رہی تھی گیٹ پر ایک چوکس چوکیدار بدوق تانے کھڑا تھا۔

چوکیدار نے کوٹھ دار آواز میں مائیکل سے پوچھا کون ہو تم؟ کس سے ملنا ہے؟

ڈار تھی نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایسی پُر رعب آواز سنی تھی وہ تو ڈر گئی۔ اگر مائیکل اپنے آئے کی وجہ نہ بتاتا تو شاید ڈار تھی یہ آواز سن کر بھاگ جاتی یا بے ہوش ہو جاتی۔ مائیکل کی ملائم اور شائستہ آواز نے ڈار تھی کو تسلی دی۔

چوکیدار نے اپنی بڑی بڑی موٹھوں کو تان دیا اور ان دونوں

خرچہ چلانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ فاطمہ پہلی مرتبہ پیسے مانگنے کی غرض سے گھر سے نکل اور اپنے تمام رشتے داروں کے گھر گئی کہ شاید کوئی مدد کرے لیکن کسی نے مدد نہ کی۔

فاطمہ مایوس ہو کر واپس آئی اور سوچنے لگی کہ کیا فریب ہونا اتنا بڑا جرم ہے کہ جو لوگ اسے بیٹی کہتے تھے آج اس بُری طرح دھتکار رہے تھے۔ یہ دن ملک زندگی موت کی شمشکلی کے بعد آخر بوڑھا اپنے مالک حقیقی سے جلا ملا اور فاطمہ اس بھری دنیا میں مہتاب رہ گئی باپ کی بے وقت موت نے اسے نیم دیوانہ بنا دیا وہ سوچتی رہی کہ اب کیا کرے بچوں کو کہاں بھیجے۔ آخر اس نے دنواز کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا خاوند اعتبار کے قابل نہیں وہ کسی وقت بھی اسے بیچ سکتا ہے یا جوئے وغیرہ میں ہار سکتا ہے لیکن اس نے اپنے آپ کو بالکل اپنی قسمت اور اپنے خدا پر چھوڑ دیا۔ اور چند دن بعد وہ اس کے ساتھ پشاور چلی آئی۔

پشاور پہنچ کر کچھ دن بعد دنواز گردن توڑ بخار میں بخار میں مبتلا ہو گیا یہ ایک ایسی بیماری تھی جس کی ہوا انکب لگنے سے لوگ ڈرتے تھے۔ دنواز کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ فاطمہ نے شب و روز اس کی خدمت کی۔۔۔ ایک دن جب اسے ذرا ہوش آیا تو اس نے اپنی بیوی سے کہا تم یہاں سے بھاگ جاؤ یہ بیماری تمہیں بھی لگ جائے گی لیکن فاطمہ نے بڑے ملائم انداز میں کہا اب اس سے بڑی بیماری کیا لگے گی کہ تم جیسے سے شادی ہو گئی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ واقعی ہمارے ملک کی عورت غلیم عورت ہوتی ہے۔

اور اب وہ دونوں اغوا شدہ عورتوں کو ان کے گھر واپس لے کر پھانسی کے لئے ایک ادارہ بنائے زبردست جہاد کر رہے ہیں۔

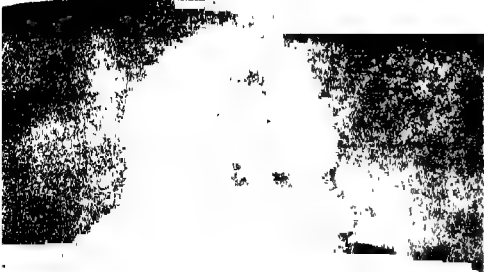
نہیں جانتے کہ ان کی کوکھ سے کتنے پھول کھلے انہیں سوچوں میں غرق و گھر پہنچ گئی۔ مائیکل کو بالکل امید نہ تھی کہ اس طرح ناکام اور یوس لوٹنا پڑے گا۔ اس کا خیال تھا کہ باپ نہ سہی ماں کے ہی دل میں مانتا ترپے گی۔ لیکن وہاں باپ تو باپ ماں کی مانتا بھی پُرسکون تھی۔ بیٹی کا سُن کر اور بیٹی کو پاس دیکھ کر نہ وہ تڑپتی نہ چلی بلکہ صاف انکار کا پیکہ بنی کھڑی رہی۔ مائیکل سارا دن بہت اداس اداس رہا۔ ڈارتنی نے جب باپ کو اس قدر افسردہ و غمگین دیکھا تو بڑی لاپرواہی سے بولی: بابا! اتنی سی بات پر غمگین ہونا امر آگئی نہیں۔ حالانکہ مجھے افسردہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ میرے اصلی والدین نے میرے منہ پر مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا مائیکل نے ڈارتنی کی ہمت کو سراہا اور پیار سے سینے سے لگایا۔

ڈارتنی کو جب معلوم ہوا کہ وہ مسلمان والدین کی اولاد ہے تو اس نے مسلمان ہونے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ دوسرے دن محلے کی مسجد میں جا کر وہ مسلمان ہو گئی اس نے اپنا نام فاطمہ رکھا۔

عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا اور اُسے دن نئی نئی چیزیں پُرتی جا رہی تھیں۔ دنواز نے دھمکی دے رکھی تھی کہ کسی دن فاطمہ کو بچوں سمیت اٹھوائے گا۔ اسی ڈر سے بے چاری سارا دن بیٹھی رہتی۔ تنہا تنہا اب سات سال کا ہو چکا تھا لیکن ابھی تک سکول اس ڈر سے داخل نہیں کروایا تھا کہ کہیں اس کا باپ اسے اٹھا کر نہ لے جائے۔

فاطمہ ابھی مصیبتوں میں گرفتار تھی کہ خدا کو اس کی اور آزمائش

منظور ہوئی اس کا باپ اچانک بیمار ہو گیا اور اسے ہسپتال داخل کر دیا گیا۔ اس کے گھر سے کا اپریشن ہونا مقصود تھا اور اپریشن سے پہلے ایک بونل خون کی ضرورت تھی۔ لیکن خون خریدتی تو کیسے اس کے پاس تو گھر کا



ایک ماہر گڑ یا ساز۔ بابا احمد یار

(ایک مختصر ملاقات)

ف رشید

ان کے ہاتھ تیزی سے حرکت کرتے ہیں اور ساتھ ہی نظریں بھی گھومتی ہیں ہر پہلو سے دیکھتے ہیں کہ کہیں کچھ غلطی باقی نہ رہ جائے۔ گڑیوں کی تخلیق ہر حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے موصوف جگہ جگہ گھومتے اور مختلف علاقوں کے لباس وغیرہ کو غور سے دیکھتے اور نان کی طرز زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر اس کو اسی انداز میں گڑ یا کی صورت میں بناتے ہیں۔

احمد یار صاحب کی گڑیاں ہمارے ملک کے سادہ دیہاتوں اور دیہاتیوں کی زندگی کی عکاسی کرتی ہیں جب ہم ان کی گڑیوں کو کنویں کے پاس کھڑے پانی بھرتے، گھڑے سروں پر بظلوں میں دالے دیکھتے ہیں تو ہمارے نظر فوراً پنجاب کی انگوٹھیوں کی تلاش میں گھومنے لگتی ہے۔ اسی طرح دلہن کو ایک مسہری پر بیٹھے شرمائے لجائے انداز میں دیکھتے ہیں اور پام بیٹھی لڑکیوں کو ڈھولک پر تھاپ لگاتے، تالی بجاتے۔ تو ہم اپنے آپ کو مشرقی دلہن کے بہت قریب تصور کرتے ہیں اور شادی کی رسوم سے بخوبی آگاہ ہو جاتے ہیں۔ نوجوان لڑکی کی خواہشات بھی اس کے سراپے کی طرح حسین و شاداب ہوتی ہیں وہ چپاکی اس لگائے درخت کے سائے تلے بیٹھی ہے نظریں دروازے پر مرکوز ہوتی ہیں اس ساری کیفیت کو گڑیوں کی صورت میں دکھانا یقیناً ایک بڑا فن ہے۔

چرخ کا استعمال ہمارے دیہاتوں میں بہت عام ہے اور ان

پچھلے دنوں مجھے فن گڑ یا سازی کے ایک ماہر جناب احمد یار سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ احمد یار صاحب پکاس پیچمن کی پیٹ میں ہیں۔ وہ ایک ایسے فن کار ہیں جو کاروباری منفعیت سے کہیں زیادہ فن کو سنوارنے اور نکھارنے کے متلاشی رہتے ہیں۔ گڑ یا سازی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس فن کو معنویت بخشنے کے لئے انہوں نے اکثر جہاں گردی بھی کی ہے اور دور دراز ملکوں میں جا کر فن کے انمول تجربات بھی حاصل کئے ہیں بنیادی طور پر وہ ایک فن کار ہیں ان کا خیال ہے کہ:

فن کا منزل ایک قوم کا منزل ظاہر کرتا ہے اس لئے فن کو ایک بلند مقام بخشنا چاہیے۔ فن کار اپنے فن کے صلے میں صرف حوصلہ افزائی اور داد چاہتا ہے اور جب یہ چیزیں مل جاتی ہیں تو اس کا فن نکھرتا جاتا ہے اور اس قدر روشن ہو جاتا ہے کہ ہر ایک کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتا ہے یہی تو فن کی معراج ہوتی ہے۔

فن کی تخلیق کرتے وقت فن کار کا سارا وجود خاص قسم کی حرکات و سکنات کرتا ہے ہینٹنگ کرتے وقت آنکھیں، دماغ اور ہاتھ بیک وقت کام کرتے ہیں ڈانس کرتے وقت پورا جسم حرکت کر کے اس کا اظہار کرتا ہے۔ اداکاری کرتے وقت، لکھتے وقت، برتن بناتے وقت مضمین ہر قسم کی تخلیق کرتے وقت پورا جسم عمل کرتا ہے۔ اسی طرح احمد یار صاحب جب گڑیاں بناتے ہیں تو

میں دیکھی لیتا تھا اس لئے میں نے اُن سے ان گزلیوں کی تیاری کے بارے میں پوچھا لیکن انہوں نے میری باتوں پر توجہ نہیں کی اور پادھی برتنی دہیں، مجھے ان کے اس رویے پر اذ حد دکھ ہوا اور جیسے ایک دھچکا سالگا کیڑا انہوں نے میرے اس تجسس کو کہ یہ کس طرح تخلیق کی گئی ہیں درخور اعتناء سمجھا مگر اگر میں نے اپنے محدود وسائل کی مدد سے اور ذہن میں خود ہی خاکہ صابنا کا ایک ہفتے کے اندر ہی یہ اعلان کر دیا کہ میں گڑیا بنانی سکھاؤں گا۔ سب رشتے داروں نے میری اس بات کو مذاق کا نشانہ بنایا لیکن میرا شوق مذاق کو فوراً ہضم کر گیا۔ بہر حال مجھے شاکر دکانے کرنے میں کچھ دقت محسوس نہ ہوئی میں نے اپنے شاگردوں کو بہت سے طریقے سے یہ کام سکھایا یعنی صرت سامان وغیرہ کی قیمت وصول کی۔ اس کے بعد کچھ اور لوگوں نے میرے ساتھ تعاون کیا اور میرا کدس کامیاب ثابت ہوا اور اسکولوں کالجوں کی طرف سے درخواستیں آئیں کہ یہاں اگر ایسا کورس شروع کریں۔ چنانچہ میں نے اس کورس کا اہتمام سارے ملک میں کیا ہر ضلع ہر صوبہ میں ایسے کورس کروائے ملک میں ہی نہیں بلکہ ملک سے باہر جا کر بھی یہ کام سکھایا۔ اور اکثر اسی نمائش وغیرہ بھی کروائیں۔ جو کہ ملک کے تقریباً ہر گوشے میں منعقد ہوئیں اور اس کے علاوہ بیرون ملک بھی نمائشیں کرائیں۔

گڑیا سازی کی افادیت کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ بچوں کو کچھ سکھانا جو یا بچپن کو ان کے مستقبل کی ذمہ داریوں سے روشناس کروا کر ہو تو یہ بہترین ذریعہ ہے نہایت مفید اور موثر مشغلہ ہے۔ بچوں کو زندگی گزارنے کے طور طریقے سکھانے میں بھی اس کی افادیت مستم ہے۔ ان کے علاوہ عوام میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے اور اعلیٰ انسانی شعور بیدار کر کے لے پٹیلوں کا استعمال بہت موثر ہے۔ پٹیلوں کی صورت میں دیکھا ہوا ڈرامہ ذہنوں پر نقش ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہماری ثقافت کا اس سے گہرا تعلق ہے احمد یار صاحب کا خیال ہے کہ ہماری ثقافت کا جتنا اظہار ان گزلیوں سے ہوتا ہے، کسی اور فن سے نہیں ہوتا۔

خواتین چرخہ چلاتی اور دھواگر تیار کرتی ہیں احمد صاحب نے اس دلچسپ شغل کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور اپنے فن سے اس کے ایسے مرتبے پیش کئے ہیں جنہیں دیکھ کر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ بابا احمد یار گڑیا سازی میں ایک انفرادی مقام رکھتے ہیں موصوف نے ایک ادارہ لاہور میں کھول رکھا ہے جہاں گڑیاں بنانی سکھا جاتی ہیں۔ گڑیاں بنانا اور دوسرے ملکوں میں ان کی مارکیٹ بنانا قومی سطح پر بہت مفید کام ہے اس سے ہمارے ملک کی ثقافت دوسرے ملکوں میں روشناس ہوتی ہے اور کس ملک کی تہذیب و ثقافت ہی اس کی قیمت متاع ہوتی ہے۔ اس سے حب الوطنی کا شعور بیدار ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں اکثر یہ دیکھتے ہیں کہ دوسرے ملکوں میں جو ثقافتی طائفے وغیرہ بھیجے جاتے ہیں اُن میں چند گانے والوں اور رقص کرتے والوں کو بھیج دیا جاتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ بھی ہماری ثقافت کا ایک حصہ ہیں لیکن گڑیا سازی ایک ایسی صنعت ہے جو ہمارے ملک، ہمارے معاشرے، ہمارے قصوں اور دیہاتوں کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ گزلیوں کو پہنانے گئے۔ باس، ان کے چہروں کے تاثرات اُن کے انداز غرض کہ ہر پہلو ہر رخ ہمارے ملک کی ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔

احمد یار صاحب سے میں نے ایک سوال کیا کہ کیا آپ مرنے ہی کا کہتے ہیں یا کچھ اور بھی کہتے ہیں اور یہ کہ آپ کو گڑیا سازی کا شوق کیونکر ہوا؟ میرا یہ سوال سن کر وہ مسکرائے اور بولے مٹی یہ اتنا دلچسپ کام ہے میں کوئی اور کام کیوں کروں مجھے اس سے عزت کی روٹی مل جاتی ہے ہاں ویسے شروع شروع میں باہر کے ملکوں میں کام کرتا تھا لیکن مجھے بچپن سے اس شوق کی یہ وجہ ہے کہ یہ کیا ایک جا پاتی خاتون تھیں اور وہ مجھے بھلانے کے لئے اکثر تخلیق قسم کی چیزیں بناتی تھیں جس سے مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ چیزیں مزدور اہلیت کی حامل ہیں اور ہماری زندگی میں اہم مقام رکھتی ہیں پھر میری زندگی میں ایک اور واقعہ ہوا وہ کچھ یوں کہ آج سے تقریباً ۲۰ سال قبل میں ایک ایسی نمائش میں گیا جہاں ہاتھ کی بنی ہوئی گڑیاں رکھی گئی تھیں۔ اور ان گزلیوں کی خالق ایک خاتون تھیں اور چونکہ میں شروع سے ایسے کام

ہیں اور دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو کوئی گڑیا بناتا ہے اُس وقت اور پیسے کو مدنظر نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اس کی کوالٹی اور پیکنگ پر زبا توجہ دینی چاہیے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ خوبصورت چیزوں کی پیکنگ اُن سے بھی زیادہ خوبصورت ہونی چاہئے تاکہ پہلی نظر میں لوگ اس سے متاثر ہوں۔

میں نے کہا ایک بات جو مجھے نہایت کھٹک رہی تھی اور میں اس بار سے میں ہمیشہ ہی سوال کرنے کی خواہش مند رہی ہوں یہ ہے کہ نمائشوں وغیرہ کا اہتمام زیادہ تر ایسی جگہوں پر کیا جاتا ہے جہاں عام آدمی نہیں پہنچ سکتا۔ انہوں نے کہا آپ درست فرماتی ہیں مجھے بھی دیکھ سہے کہ یہ نمائش وغیرہ ایک مخصوص طبقے کے لئے ہوتی ہیں میرا تو خیال ہے کہ خوش انہیں پہنچنا چاہئے جو خوشی کے لحاظ سے انعاموں اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو وہ دیکھ کر حیرت مندی ہوئے ہیں جسے مسکراہٹ سے کھل اٹھتے ہیں یہ معاملہ عداوت کا ہے جب تک شہر سے دوسرے شہر جاتا ہوں تو راستے میں ٹھہر جاتا ہوں اور یہ وہاں کے لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ میں کون سا شہر آیا ہوں تو وہ لوگ خوش ہوتے ہیں اور انہیں دیکھنے کے لئے منتظر ہوتے ہیں اور ایسے موقعوں پر مجھے دل مسرت ہوتی ہے کہ میں نے ان کو چند لمحوں کی مسکراہٹ تو دی ایک پل وہ خوش تو ہوئے اور میری شکل ہے کہ ان لوگوں کا زیادہ حق سے ان چیزوں پر ”

میں نے سوچا کہ کیا ساری صنعت کو فروغ دینے کے واسطے میں آپ کا خیال ہے؟ انہوں نے کہا اگر سرکاری سطح پر گڑیا سازی کی کوشش نہ ہو تو مستقل اہتمام کیا جانے تو وہ بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے یہ ٹریڈ شو انشاد بات ہے کہ حکومت پاکستان نے تعلیمی نصاب میں گڑیا سازی کو شامل کر لیا ہے۔

میرے خیال میں گڑیا سازی کی قومی اور بین الاقوامی نمائشیں اکثر ہوتی رہنا چاہئیں اس سے فنکاروں کو نئی راہیں ملتی ہیں اور نئے زاویے فن میں پیدا ہوتے ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں بولے کہ جب میں گڑیاں بناتا ہوں تو مجھے اس بات کو سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ میری اس تخلیق کو خراب نہیں کیا جائے گا بلکہ قندگی نظر سے دیکھی جائے گی۔ آرٹ کے فروغ دینے کے لئے ایک ادارہ ہے جہاں میری گڑیاں رکھی گئی ہیں یہ میرے لئے بہت سکون اور خوش کا باعث ہے۔

میں نے پوچھا آپ کس قسم کے لوگوں کو فن سکھا کر خوش کرتے ہیں؟ وہ بولے ”مجھے یہ بتاتے ہوئے نہایت دکھ ہو رہا ہے کہ میں نے جب کورس شروع کرنے کا اعلان کیا تو کھاتے پیتے گھرانے کی خواتین انہوں نے یہ فن سکھا اور صرف اپنے تک محدود رہنے دیا یعنی سیکھ کر اسے بروئے کار نہ لائیں۔ مجھے اس سے نہایت دکھ ہوتا ہے مجھے تو اس وقت ہر وقت ہے جب ضرورت مند لوگ اسے اپناتے ہیں یہ بہت حارہ مندانہ خیال ہے کہ جب میں نے اس فن کو اپنایا تو اس سے کچھ عرصہ بعد اسے بروئے کار لایا اور میں چاہتا ہوں کہ یہ لوگوں کی کفالت کے لئے اس کے ذریعہ نہ ہو بلکہ کام لے سکے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو ایسی خواتین سیکھیں جو ان کے فن بڑھانے کی خواہش رکھیں اور حقیقی طور پر انہیں اس فن سے متاثر ہو۔

گروہوں کی بنیاد کے لئے آپ کون کن چیزوں کو مستقل بنائیں گے؟ گڑیاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک ٹھیکس کے لئے ہیں اور دوسری سامان مثلاً کپڑا، مایوں، نم اور مٹی بالوں کے رنگ استعمال ہوتے ہیں لیکن جو گڑیاں عجایب گھر در کے لئے بنائی جاتی ہیں ان کو میں کافی احتیاط برتی جاتی ہے رنگ دیر پا استعمال کیے جاتے ہیں۔ جہز کے رنگوں کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے ایسے رنگ استعمال کیے جاتے ہیں جو دیر پا چل سکیں ”بھروسہ دارانہ رنگ دو دوں یا تکرار نہ ہونے کے لئے۔

”ابھی حال میں میں یورپ کے دورے سے واپس آیا ہوں اور اس دورے کے بعد مجھے اس کی اہمیت اور زیادہ شدت سے احساس ہوا ہے۔ یہاں گڑیاں بنانے والوں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ چھوٹے سائز کی گڑیاں بناتے پر زیادہ توجہ دیں کیونکہ باہر کے ملک میں چھوٹے سائز کی گڑیاں بڑے سائز کی گڑیوں کی نسبت زیادہ وقعت اور اہمیت رکھتی



بیگم مسرت برکی
فصل قدیم
سید علی محمد حسینی

مدیر اعلیٰ
مدیر
نائب مدیر

ماہِ تو

مارچ - اپریل، ۱۹۷۶ء
جلد: ۲۹ — شماره: ۲

چند سالانہ: نو روپے
فی پرچہ: ڈیڑھ روپے

اس شماره میں

- ۱ ف - ق
- ۲ ڈاکٹر غلام جیلانی برق
- ۳ ظہور ملک
- ۴ عبدالرحمن طاہر سودقی
- ۵ عبدالغنی شمس
- ۶ قرا محمد عثمانی / خورشید انصاری
- ۷ شریعت الحسن
- ۸ سعید احمد
- ۹ ملک حبیب الرحمن
- ۱۰ فضل احمد مدنی
- ۱۱ ایاس رانا
- ۱۲ ڈاکٹر غلام جیلانی برق
- ۱۳ ڈاکٹر صفری باؤ شکفتہ
- ۱۴ حمیر نوری
- ۱۵ سجاد حادث
- ۱۶ سید عبدالواحد
- ۱۷ محمد عبدالقدیر قریشی
- ۱۸ عبدالغنی شمس
- ۱۹ ف - ق
- ۲۰ فضل قدیم اور سعید محمد



ابتدائیہ
حسن انسانیت اور اخلاق حسنہ
ذکر میلاد النبی صلعم
نبی پر صلوة وسلام
سرچشہ آبِ بقا
نعتیں
نشد حریت
حصولِ پاکستان کے لئے مسلمانوں کی جدوجہد
رداح کی موت — بلوچستان میں سرداری نظام کا خاتمہ
معمورۃ اسلام — شہر اسلام آباد پہلی نظر میں
قرآن اور اقبال
اقبال کا فلسفہ علم و عشق
اقبال — بحیثیت فارسی شاعر
غزل
اقبال اور نظریۂ اجتہاد
اقبال کی یاد میں
شوق مدنیوی اور اقبال
عشق و غزل اقبال
اسلامی نئی زندگی پر دس گزشتہ — رفاقت

مدیر اعلیٰ: مسرت برکی۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۵۵۔ راولپنڈی

ابتداء

مارچ کا مہینہ ہمارے ان ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ہی وہ زمانہ ہوتا ہے کہ جائے کا کیلا پن ختم ہو جاتا ہے، موسم میں بڑی دلربا کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر طرف شگونے پھوٹنے لگتے ہیں، فصلیں پکنے پر آ جاتی ہیں اور پورے منظر پر ایک گہرا گرمی اور دلولے کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ہماری قومی زندگی میں یہ مہینہ ان تمام باتوں کے علاوہ ایک اور بڑی نوعیت رکھتا ہے۔ اسی مہینے کی ۳۳ تاریخ کو ۳۶ برس قبل لاہور میں بزمِ مغیر کے مسلمانوں نے اپنے علیحدہ ملکی وجود کے تحفظ و بقا کی خاطر اپنے لئے ایک علیحدہ وطن بنانے کا ایک تاریخی عزم کیا تھا جسے ہماری قومی تاریخ میں قراردادِ پاکستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اُس مقام پر جہاں یہ تاریخ ساز قراردادِ پاس کی گئی، ایک عظیم الشان مینار تعمیر کر دیا گیا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ تنہا ایک مینار اُس قومی خود آگہی کو معنی خیز نہیں بنا سکتا جس کے تحت یہ تاریخی قراردادِ تاریخ کا ایک جیتا جاگتا باب بنی۔ اس کے لئے فکرِ رسا اور مطالعہ تاریخ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے قوم میں اپنی ملکی تاریخ کے تحفظ اور اس میں کد کاوش کا شوق بھی اب پیدا ہو چلا ہے اور اس کا سہرا بھی عوامی حکومت کے سر ہے کہ اس نے پاکستان کی تاریخ کی تعلیم پر توجہ دینے کے ساتھ بانی پاکستان قائدِ اعظم حضرت محمد علی جناح کی عظیم و جلیل زندگی کو ایک منارِ علم و نور تسلیم کرتے ہوئے اس سال کو قائدِ اعظم کا سال قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت نے جو شاندار اقدام کئے ہیں ان سے ہر شخص آگاہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بابائے قوم کی زندگی کے اصرار و موز کو سمجھ کر ہی ہم پاکستان کی ضرورت و فائیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور اس نعتِ عظمیٰ کی بہتر نگہداشت کر سکتے ہیں۔

قائدِ اعظم کے ارشادات اور ان کی تحریروں اور تقریروں کے مجموعوں کے ساتھ ہمیں بزمِ مغیر کے غیر مسلم قائدین خصوصاً مسٹر گاندھی کے بیانات اور تقاریر اور دوسری کتب و دستاویز سے بھی استفادہ حاصل کرنا چاہیے تاکہ ان کی روشنی میں ہم اپنے عظیم رہنما کے پیار و دین کو اچھی طرح سمجھیں اور ان کی نکتہ شناسیوں اور حکمتِ عملیوں کے مغایم تک رسائی پاسکیں۔ "ماہِ نو" اپنے قارئین اور لکھنے والوں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ بابائے قوم کی عظیم تقاریر کا مطالعہ پیش کریں، ہمارے صفحات حاضر ہیں۔

بلوچستان میں سرداری نظام کا خاتمہ عوامی حکومت کا ایک اور عظیم الشان کارنامہ ہے۔ وزیرِ اعظم نے قوم سے کئے ہوئے ایک اور وعدے کی تکمیل کر دی ہے۔ بلوچستان میں ظالمانہ سرداری نظام دم توڑ چکا ہے اور بلوچی عوام ایک کشادہ اور روشن فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ اب انہیں بھی پاکستان کے دیگر صوبوں کے عوام کی طرح برابر کے حقوق حاصل ہیں اور صحیح آزادی سے بہرہ ور ہیں۔

عوامی حکومت کے دور میں اسلام جس طرح ایک متحرک قوت بن کر ہمارے فکر و عمل میں راہ بنا رہا ہے وہ سب پر عیاں ہے گذشتہ دنوں بین الاقوامی سمیرت کانفرنس کا انعقاد بھی عوامی دور کا عظیم کارنامہ ہے جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ سمیرت رسولِ انام کے مطالعہ کی تحریک انشاء اللہ مستقبل میں بڑی جاندار تحریک بن کر ابھرے گی جس سے عالمی فکر و نظریں میں ایک انقلاب پیدا ہوگا۔ شاید یہ نقطہ آغاز ہو۔ یورپ کی اسلام کی طرف مراجعت کا۔

ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی اپریل کے مہینے کی رعایت سے ہم نے اپنے صفحات کو ماہِ اقبل میں سما رہا ہے۔ خدا کرے اقبال سے متعلق مضامین قارئین کے لئے مفید اور معلومات افزا ہوں ؟

محسنِ انسانیت اور اخلاقِ حسنہ

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

نے قاصد سے بہت سی باتیں پوچھیں اور پھر ایک ملازم کو حکم دیا کہ حادّ شہر میں تلاش کرو اگر کوئی اور عرب مکہ سے آیا ہوا ہو تو اسے پیش کر دو۔ اتفاق سے اُن دنوں حضور صلعم کا ایک ہانی دشمن بوسفیان اس طرف بغرض تجارت گیا ہوا تھا۔ اسے دربار میں پیش کیا گیا۔ اور پھر دونوں میں یہ گفتگو ہوئی۔

قیصر: محمدؐ کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان: بہت شریف

اس پر قیصر نے کہا: نبی ہمیشہ شریف گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ تاکہ اُن کی اطاعت سے کسی کو عار نہ ہو۔ پھر پوچھا کیا دھڑے نبوت سے پہلے آپ جھوٹ بولتے تھے؟

جواب: ہاں کل نہیں۔

اس پر کہا کہ جو شخص لوگوں سے جھوٹ نہ بولتا ہو وہ خدا پر کیسے جھوٹ باندھ سکتا ہے؟ پھر پوچھا: کیا یہ شخص عہدِ وہی مان کا پاس کرتا ہے؟

جواب: ہاں، اسی سال اس سے معاہدہ کیا ہے (حدیبیہ) دیکھیں نتیجہ کیا نکلتا ہے

سوال: اُس کی تعلیم کیا ہے؟

حضرت عائشہؓ مدیقہ سے ایک صحابی نے پوچھا کہ حضور صلعم کا کردار کیسا تھا؟ فرمایا: کانِ خُلُقہ القرآن کہ قرآن پاک آپ کا کردار تھا۔ الہامی صحائف میں قرآن مکمل ترین کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر عمل کرنے والا بھی کامل ترین انسان ہو گا۔ اسی بنا پر اللہ نے رسول اکرم کو مخاطب کر کے فرمایا: وَذِکَکَ نَعْلَمُ خَلْقَکَ عَظِیْمَ۔

(کہ آپ بلا ریب عظیم کردار کے مالک ہیں)

جب فاجر حرا میں حضور صلعم نے پہلی مرتبہ جبریل کو دیکھا تو ڈر گئے۔ جلدی سے گھر پہنچے اور حضرت خدیجہ سے کہا کہ مجھے گرم کپڑوں سے ڈھانپ دو۔ ساتھ ہی فرمایا: کہ اگر ان مافوق الفطرت واقعات کا سلسلہ جاری رہا تو شاید مجھے جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ خدیجہ اکبریؓ نے جواب دیا: ”آپ ہمیشہ سچ بولتے، اقرباء کی مدد کرتے، یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں پر شفقت فرماتے اور معیبت زدوں سے ہمدردی کرتے ہیں۔ اس لئے اللہ سدا آپ کے ساتھ رہے گا اور ہمیشہ آپ کی حفاظت کرے گا۔“ (بخاری و مسلم)

حضور صلعم نے بیشتر قبائل اور ہمسایہ ممالک مثلاً ایران، حبشہ، سکندریہ اور روم کے فرمانرواؤں کو جلیبی خطوط لکھے تھے قیصر روم کی طرف ایک صحابی وجہ بن خلیفۃ الکلبی حضور کا خط لے کر گیا تھا قیصر

یہ تو بہت دور کی باتیں ہیں۔ آج سے تیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ انگلستان کے چورج نے ایک نوآموز پادری کو عمری سیکھنے کے لئے دمشق میں بھیجا تاکہ اُسے عرب راستوں میں کہیں لگایا جائے ڈیڑھ دو برس میں وہ عمری زبان کی لطافتوں سے آشنا ہو گیا ایک صبح اس نے ریڈیو کھولا تو قاری ان آیات کی تلاوت کر رہا تھا۔

اَلَمْ يَجْعَلْ اَلْاَرَضٰى مِهْبَدًا ۝ اَوْتَارًا ۝ وَخَلَقْنَا كَمَازًا وَاَجًا ۝ وَجَعَلْنَا اَللَّيْلِ يَاسًا ۝ وَخَلَقْنَا اَلنَّهَارَ مَعَاشًا ۝

وہ ان آیات کے آہنگ انداز اور ترگم سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسی روز مسلمان ہو گیا۔

حضور کے قیام مکہ کے زمانے میں قریش نے حضور کو تنگ کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی تھی جس کا سرور ابو لہب تھا اور مکہ کے ۲۵ دیگر سرکردہ افراد اُس کے ممبر تھے۔ ایک مرتبہ کمیٹی کے سامنے یہ سوال پیش ہوا کہ باہر سے آنے والوں کو محمد کے تعلق کیا کہا جائے ایک نے تجویز کی کہ ہمیں کاہن کہا جائے مکہ کے مشہور سردار دبید بن مغیرہ بول اٹھا کہ غلط کام ہوں کی بجائے نبی نجا اور محمد کا فسیح و مریوط کلام کیا۔ اگر ہم نے اُسے کاہن کہا تو قبائل عرب ہمیں جھوٹا سمجھیں گے۔

ایک اور رکن نے کہا کہ اُسے دیوانہ کہیں ایک اور بولا کہ اُس پر جادوگری کی تہمت لگائیں۔ ولید نے کہا کہاں جادو گروں کی ٹھونس ٹیکس اور جنس عادتیں کیا محمد کا روشن چہرہ اور دلکش عادات۔ اس کے کلام میں اتنی علالت ہے کہ اسے سن کر بھائی بھائی کو چھوڑ دے اور شوہر و زن میں جدائی پڑ جائے۔

سفر ہجرت میں جب حضور غار ثور سے نکل کر آئے پڑھے اور پھکی نے ستیا تو آپ ایک بڑھیا ام مہد کے پیچھے نہیں چاہنے اور پوچھا کیا کھانے کو کئی چیز ہے؟ کہا کچھ نہیں صرف یہ سوکھی بکری ہے اور میں حضور نے برتن مانگا اور اُسے دوہنا شروع کر دیا وہ برتن تین دفعہ بھر گیا۔ حضور اور حضرت صدیق نے ایک ایک پیالہ پیا اور باقی ام مہد کے لئے چھوڑ گئے۔ جب اس کا شور و اہل آیتا تو اس نے ساری حکایت سنائی اور علیہ السلام نے یہ بتایا۔

جواب یہ بھی کہ باپ دادا کے طریقوں کو چھوڑ کر ایک خدا کی عبادت کرو۔ نماز قائم کرو۔ حج لو لو۔ اپنے دامن کو پاک رکھو اور صلہ رحمی کرو۔ چند اور سوالات بھی پوچھے جن کے جواب سن کر ہر قل نے کہا کہ ہم کو آنے والے نبی کی یہی علامتیں بتائی گئی ہیں یہ تو ہمیں یقین تھا کہ اس نبی کا ظہور ہونے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں ہو گا۔ اسے ابوسفیان اگر تہاری باتیں صحیح ہیں تو وہ نبی جلد اُس مقام کا جہاں آج میں ہوں ماکہ بن جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن سلام یہودیہ ان مدینہ کے علما میں شمار ہوتے تھے اور عربی شعر و ادب میں بڑی دسترس رکھتے تھے۔ ایک دن مسجد نبوی کے پاس سے گزرے۔ اُس وقت حضور صلعم و عطر مار رہے تھے یہ رنگ کر سنے لگے جب حضور کی زبان مبارک سے یہ کلمات نکلے۔

اَيُّهَا النَّاسُ اِفْتَشُوا السَّلَامَ وَاطْعَمُوا الطَّعَامَ وَصَلُّوا اَلْاَسْرَحَامَ وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ (اے لو! سلام میں بہل کرو، غریب کو کھانا کھا دو، رشتہ داروں کو محکم کرو اور جب لوگ رات کو سو رہے ہوں تو تم نماز پڑھو)

وہ ان جملوں کی فصاحت و شعریت اور مضمون کی عظمت سے اتنا متاثر ہوئے کہ اسلام لے آئے اور صحابہ کبار میں شمار ہونے لگے۔

اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ جبار بن سلمیٰ کا ہے شیخ جسجد کے امیر طفیل کا درباری تھا جب حضور صلعم کا ایک قاصد حرام بن سلمان، طفیل کے ہاں پہنچا تو اسے جبار بن سلمیٰ کو جو سفیر کے پیچھے کھڑا ہوا تھا اشارہ کیا اور اس نے پشت میں اس زور سے نیزہ مارا کہ وہ جگر کو جیر کر نکل گیا اس پر سفیر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

فَرَّقَ رُبَّ الْقَعَمَةِ۔

(رب کعبہ کی قسم کر میں جیت گیا ہوں)

اس جملے کی فصاحت سیر کے شوقی شہادت اور مضمون کے نقاس سے قاتل آفات شریک ہو کر اسلام لے آیا۔

چہرہ روشن، آنکھیں سیاہ و درخ، بال گھنے، کلام شیریں،
اجمل الناس وابہا ثم من یقید و یخسنہم و اخلاص

من قریبہا

(دور سے دیکھو تو حسین و دلفریب، قریب سے نظر ڈالیں تو

شیرین و جلیل)

حضور صلعم ہر شخص سے حسب مراتب سلوک کرتے تھے ایک مرتبہ جب قبیلہ طے نے بغاوت کی اور تمام باغی گرفتار ہو کر حضور کی خدمت میں پیش ہوئے تو ان میں مشہور فیاض حاتم کی لڑکی بھی تھی۔ اس نے کہا کہ میں حاتم کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ جو وکرم میں مشہور تھا۔ وہ عزیزوں کو کھانا کھلاتا اور بے نواؤں کی مدد کرتا تھا یہ سن کر حضور نے اس کی طرف اپنی ہاتھ پکڑ لی کہ وہ اپنے آپ کو ڈھانپ لے پھر زاوراہ اور کچھ کپڑے دے کر اسے تمام دیگھا میروں سمیت واپس بھیج دیا۔

حضور کے انکسار کی یہ کیفیت تھی کہ جب خیبر میں فاتحانہ داخل ہوئے تو آپ ایک گدھے پر سوار تھے جس کی گردن میں رسی کی جگہ کھجور کی ایک پتلی سی ٹہنی بندھی ہوئی تھی اور فتح مکہ کے بعد شہر میں اس شان سے داخل ہوئے کہ آپ کے اونٹ پر آپ کے آزاد کردہ غلام لید کا بیٹا اسارہ سوار تھا آپ کے رحم و غفو کی بے شمار کہانیاں اور ارق تاریخی میں محفوظ ہیں۔ لوگوں نے ہر قسم کی ایذا دیں۔ لیکن آپ کی زبان سے نہ کوئی شکایت نکلی اور نہ کوئی بددعا۔

امام غزالی کی کہاتے سعادت میں طبع نول کشور ص ۲۸) میں لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلعم مویشیوں کو چارہ خود ڈالتے، دودھ خود دیتے بعض اوقات گھر کی صفائی خود کرتے۔ بازار سے اشیاء خود دو فروش خود خریدتے اور خود ہی اٹھا کر لاتے۔ ہر خرد و بزرگ کو پہلے سلام دیتے۔ صبح کے کھانے سے شام کے لئے کچھ نہ بچاتے۔ نیک نحو، کریم الطبع اور کشادہ رو، متواضع، باہمیت، رحم، فیاض، شیریں سخن، گندی بات سے متنفر اور بددعا سے بچنے کے لیے ہر ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ آپ دشمنوں کے لئے بددعا فرماتیں فرمایا

اِنِّیْ لَمْ اُبْعَثْ لِعَاثَا وَلَا کُنْ وَاٰحِبًّا وَرَحْمَةً
(میں لعنت برسالے کے لئے نہیں آیا بلکہ داعی و رحمت و نکر

بھیجا گیا ہوں)

آپ صدقہ کی کوئی چیز پاس نہ رکھتے، بلکہ پاس بیٹھنے والوں

میں تقسیم کر دیتے۔

عفو و رحم

جنگ بدر میں ستر قیدی پکڑے گئے تھے حضور نے سب کو رہ کر دیدہ بنوا لصلیق کی جنگ میں جو پانچویں یا چھٹے سال ہجری میں ہوئی تھی، سو قیدی ہاتھ لگے تھے۔ قیام مدینہ میں کوہ تنیم کے اسی باشندوں نے حضور پر حملہ کیا تھا۔ سب کے سب پکڑے گئے تھے فتح مکہ کے بعد غزوہ بنین میں چھ ہزار آدمی گرفتار ہوئے تھے حضور نے سب کو رہ کر دیا اور دنیا کو اپنے عمل سے سمجھایا کہ عفو و رحم اور درگزر کے بغیر دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔

حضور صلعم کے چند ارشادات

- ۱۔ سلطان حاکم کے سامنے صبح یوں اسب سے بڑا جہاد ہے (ترمذی)
- ۲۔ میں اور قیام کی پرورش کر لے والے جنت میں یوں ہونگے جیسے دو انگلیاں
- ۳۔ دیانتدار تاجر، نبیوں، صدیقیوں، شہیدوں اور صالح لوگوں کے برابر ہو گا۔ (ترمذی)

- ۴۔ بہترین مومن وہ ہے جس کا کردار پسندیدہ ہو (ابو داؤد)
 - ۵۔ اگر کوئی حاکم لوگوں کی ضروریات سے آنکھیں بند کرے گا تو اللہ قیامت کے دن اس کی ضروریات و حاجات سے منہ پھیرے گا (ترمذی)
- بات لمبی ہو رہی ہے اس لئے میں اسے شاعر رسول حضرت حسان بن ثابت کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

خَلَقْتَ مَبْتَرًا وَمِنْ كُنْ عَمِيْبٌ

كَأَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

(توہر عیب سے پاک پیدا ہوا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ جیسے چاہتے تھے، ویسے ہی پیدا ہوئے)

ذکر میلاد النبی ﷺ

ظہور ملک

گھر گھر میں تھی
پو جا بتوں کی
ہر اک جانب
شرک تھا پھیلا
دھندلا نقش تھا
کچھ وحدت کا

زمیر فلک اک ملک عرب
دنیا سب سے الگ تھی جس کی
چٹیل ساری زمین تھی جس کی
ریت کے ٹیلے صحرا صحر
پھیلے ہر سو غار مغیلاں
حسرت، وحشت جنگل جنگل
ڈھونڈے سے ملتا نہ تھا پانی
اور نہ کہیں تھا نام کو سبزہ
زمیر فلک اک ملک عرب وہ
لوگ وہاں کے

پھیلے راتوں کی قسم
چاند ستاروں کی قسم
آؤ سوزاں کی قسم
غم کے ماروں کی قسم
پچھلے پہروں کے نظاروں کی قسم
صبح صادق کی قسم
روح ہلال کی قسم
ابھرے خود رشید کی کمرؤں کی قسم
نور درخشاں کی قسم

اس دنیا میں
پھیلی ہوئی تھی
فلست ہر سو
نفرت ہر سو
نحوت ہر سو
بدعتی کا
چرچا ہر سو

کرتے تھے وہ ناگ کی پوجا
سورج چاند اور آگ کی پوجا
پسید کوئی جو بیٹی ہوتی
موت کی نسید سلاتے وہ اس کو

————— ❖ —————

یا دن تھا پیمان کوئی بھی — ان کو
مالک کا احسان کوئی بھی — ان کو
کچھ نہ خبر تھی ان کو ازل کی
کچھ نہ پتہ تھا ان کو ابد کا
اس صحرا کا
حال تھا کیسا
خطہ پاک وہ ہے بطحا کا

————— ❖ —————

دنیا کا یہ پیارا گلشن
جس میں
یوں تو آئیں کتنی بہاریں
ایسا منظر کب دیکھا تھا
محفل ہستی ایسی کئی تھی
سب خلقت حیران ہوئی تھی
یہ دن — کتنا مبارک دن ہے
جس کی خاطر
ہر فلک نے
لاکھوں سال گزارے تھے
لیکن — لیکن
لیل و نہار نہ بدے تھے
سینکڑوں پہلو

وحشی وحشی
ذکر خدا کا
کوئی نہ کرتا
کرتے تھے

ہر بات پر جھگڑا

نام انصاف کا تھا نہ باقی
جس کو دیکھو وہ فریادی
زخموں کا مرہم درد کا درماں
چارہ گروں کے پاس کہاں تھا
زیر فلک اک مُلکِ عرب

————— ❖ —————

ہر ہر قریب، ہر ہر بستی
ذلت، نفرت اور نخوت تھی
کیسا تمدن، کیسی ترقی
نام کو یہ شے ملتی نہیں تھی
گھر گھر رندی اورستی تھی
ہر جان بستی بستی تھی
غفلت تھی دیوانہ پن تھا
ایسا ہی کچھ ان کا چلن تھا

————— ❖ —————

خطہ پاک وہ ہے بطحا کا
آبِ جہاں سے چشمہ ہفتا کا
پھیلا جہاں سے نور خدا کا
لیکن مہرِ منتور واں پر
ظلمت کے بادل میں چھپتا تھا
لوگ وہاں کے

اور جس کے لئے ازل سے چشم براء تھے سید رحمان فلک
یہ دن — کتنا مبارک دن ہے
جس کے لئے قدرت نے ہر سو
کیسی حسین تھی
جرم سجائی

————— ❦ —————

نورِ برہمپئی کا جلوہ
حسنِ یوسفؑ اور دمِ صیسیؑ
اور یہ ساری متاعیں تھیں فقط
سرورِ عالم کے لئے
یہ دن — کتنا مبارک دن ہے
جس کی ساعت نیک اختر میں
سب قیصر و کسریٰ کے ایوان جو تھے
گر گئے ان کے چودہ کنگریے
اور سمار ہوئے سارے محفل
خٹک ہوا دریا سا وہ کا
آتشِ فارس سرد ہوئی
لیکن — سنو اب غور سے
ایوانِ کسریٰ ہی نہیں
شوکتِ روم اور اوجِ عجم
ہند ارکے سارے راج محل
خاک میں مگر خاک ہوئے
بیتِ خائے پائمال ہوئے
یہ دن — کتنا مبارک دن ہے

————— ❦ —————

اس خزاں دیدہ چین کو اک بہارِ نو ملی
شمعِ پھر روشن ہوئی
اور ہدایت کی یہ کرنیں
ہر طرف تھیں خیمہ زن
جلگہ اٹھا چس
ضجِ نوظل ہر ہوئی

پھر علی باد نسیم
پھر گوئجا ہر سو — نغمہ ہو

————— ❦ —————

وہ صاحبِ لولاک
وہ ہادیِ برحق
وہ مالکِ کوئین
پیغمبرِ آخر
وہ رحمتِ عالم
وہ روحِ حقیقت
وہ صادقِ دوران
مسجدِ ملائک
فرمودہ یزدان
وہ بولتِ قرآن
اس پہ درود
اس پہ سلام
اس پہ درود
اس پہ سلام
صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم

نبی پر صلوٰۃ و سلام

عبدالرحمن طاہر سورتی

علامہ فیروز آبادی نے صلوٰۃ کے مادہ "صل" کے الٹ پلٹ کر بننے والے جملہ مادوں مثلاً "صل" "صلو" وغیرہ کو سامنے رکھ کر اس مادہ کے ایک بنیادی معنی جمع ہونا، یکجا اور اکٹھا ہونا، جم جانا اور اجزا کا ہنگامہ ملا ہوا ہونا بتائے ہیں اور اوپر درج شدہ تمام معانی میں اس مرکزی نقطہ کو واضح کیا ہے۔

صلوٰۃ علی النبی: اپنی مذکورہ بالا کتاب میں علامہ فیروز آبادی انحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر "صلوٰۃ" کے معنی کی تلخیص یوں کرتے ہیں:

"جب تم محمد پر صلوٰۃ بھیجتے ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اے اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بزرگی و عظمت عطا فرما اس طرح کہ آپ کا ذکر اور آپ کی شہرت بلند کرے آپ کی دعوت کو غالب فرما اور آپ کی شریعت کو بقا بخشے اور آخرت میں آپ کو اپنی امت کا شافع بنا اور آپ کو بڑا اجر و ثواب عطا فرما اور انگوٹوں اور پچھلوں پر آپ کی فضیلت و برتری کو سرفرازی مقام محمود کے ذریعہ ظاہر فرما، اور آپ کو اپنے تمام مقربین اور اپنے دربار میں حاضر رہنے والوں پر فوقیت بخش۔"

سلام کا لغوی مفہوم

"سلام" سے مراد ہر قسم کی خامیوں کو ناجہیل سے پاک صاف ہونا کرنا ہیں امام راغب نے سلام کے معنوں میں لکھا ہے:

"سلام" کے معنی بغیر فنا کے بقا، بغیر فقر و احتیاج کے غنا، بغیر ذلت و ہشمت کے عزت و سر بلندی اور بغیر روگ کے صحت و تندرستی ہیں و

سلموا تسلیما

علامہ فیروز آبادی اپنی مذکورہ بالا کتاب میں محمد پر سلام کے معنی مختصر اہل بیان کرتے ہیں:

قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام کا حکم دیا گیا ہے۔
 اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يَصلُّوْنَ عَلَی النّبِیِّ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ
 آمَنُوا صَلُّوا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیْمًا
 ترجمہ: بیشک اللہ اور اس کے فرشتے صلوٰۃ بھیجتے ہیں نبی پر اسے و منوا! تم بھی ان پر صلوٰۃ بھیجو اور تسلیماً سلام بھیجو۔

(الاحزاب ۳۲-۵۶)

صلوٰۃ کے لغوی معنی

"صلوٰۃ" کا ترجمہ اردو فارسی میں "دروود اور نمانہ" کیا جاتا ہے۔ عرب میں صلوٰۃ کے معنی دعا ہیں اور برکت و رحمت بھی، مغفرت اور استغفار بھی بخارا اور تعریف بھی تعظیم کرنا اور مہربانی کرنا بھی۔ عربی کی مشہور لغت القاموس کے مصنف علامہ فیروز آبادی نے اپنی تالیف "الصلوات والبشر فی الصلوٰۃ علی خیر البشر" میں تفصیل سے صلوٰۃ کے معنی پر بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس لفظ "صلوٰۃ" کا اشتقاق "صلی" سے ہے جس کے معنی آگ ہیں اور جب ہم عصا یا بید کو آگ دکھا کر سیدھا اور سہوا کرتے ہیں تو عربی میں اس عمل کے لئے "صلیت العصا" کہتے ہیں۔ گویا نماز پڑھنے والا "مصلیٰ" نماز "صلوٰۃ" کے ذریعہ اپنے ظاہر و باطن کو سیدھا کرنا اور سدھارنا چاہتا ہے۔ "صلوٰۃ" کا ایک مفہوم والبتکی، ساتھ رہنا، جدا نہ ہونا اور چپٹے رہنا بھی ہے۔ تفصیلی نارا حاصیہ اور سیحی ناواذات لہب" میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے۔ مین آگ میں رہنا اور اس سے جدا نہ ہونا گھوڑوں میں اول آنے والے گھوڑے سے متصل جو گھوڑا دوسرے خبر پڑاتا ہے اسے بھی اسی لئے متصل کہا جاتا ہے کہ وہ اول سے ملا ہوا رہتا ہے۔

پھیلانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عمر جدوجہد کرتے رہے، لا الہ الا اللہ کو اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں کارفرما کریں، اس کلمہ کی تفسیر یعنی "قرآن مجید کے افہام و تفہیم پر توجہ دیں، اپنی آئندہ نسل کو ایسی تعلیم دیں جس کی اساس اس کتابِ غلیظ پر ہو جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور سیرِ طیبہ کا مدار تھا، دین کے بلند و عالیٰ مقصد کی تکمیل کے لئے امت سے سنت و تخریب ختم کر کے اسے متحد کریں، اس لئے کہ جو دین میں تغزین کر کے فرقہ فرقہ ہو جاتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا (دیکھئے سورۃ الانعام کی آیت ۱۵۹، اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا دِیْنُکُمْ دِیْنُکُمْ وَ کَانُوْا مِثْلَ شَاۡیَکُمْ فَکُنُوْا مِثْلُہُمْ فِی شَیْءٍ) حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوة و سلام بھیجنا بہت بڑی ذمہ داری ہے اس کو پورا کر کے لئے پہلا کام تو یہ ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ احسانات اور کارنامے یاد رکھنے چاہئیں جو انہوں نے اللہ کے نام سے انسانیت کو سر بلند کرنے کے لئے انجام دیئے، شیخ سعدی نے اپنی رباعی میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

بلغ العلیٰ بحمالہ - کشف الدجی بجمالہ

حسنت جمیع خصا لہ - صلوا علیہ وآلہ

ثانیاً ہماری پوری جدوجہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق قرآن مجید کے اصولوں سے متجاوز نہ ہو ورنہ صلوة و سلام محض نہ پائی عمل ہوگا جس کی تائید عین سے نہ ہو سکے گی۔ شاید اسی صورت حال پر یہی علامہ اقبال شرمسار کر رہے ہیں۔

چوں بنام مصطفیٰ عوانم درود

از غمالت آب می گردود و جد

عشق می گوید کہ محکوم غیر

سینہ تو از ربتان مانند دیر

تا نداری از محمد رنگ و بو

از درود و غود میا لا تا م او

"اللہم سلم علی محمد" سے مراد یہ ہے کہ اے اللہ آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت، آپ کی امت، اور آپ کی شہرت کو ہر نقص و عیب سے پاک صاف رکھئے اور زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ کی دعوت غالب و بلند ہوتی جائے، آپ کی امت بڑھتی چلی جائے اور آپ کی شہرت اور ذکر بلند ہوتا جائے۔

دعا

"سورۃ سلام" کے یہ مختصر معانی ذہن میں رکھنے کے بعد سب سے پہلے دعا کا مفہوم ابھر کر سامنے آتا ہے۔ دعا ہم اس سے مانگتے ہیں جسے ہم اپنی قولوں اور طاقتوں پر غالب جانتے ہیں اور دعا اس کے

لئے مانگتے ہیں جس سے ہمیں کچھ بھلائی اور خیر پہنچتی ہو یا اس کی توقع مہیا ہے اس کے لئے جس کے احسانات سے ہمارے دل اس کی محبت و عقیدت سے پر ہوں یا پھر جس کے لئے ہمارے دل میں نیک تمنائیں ہوں اور ہم اس کی بھلائی اور منفعت و مصلحت کے خواہاں ہوں۔

دعا کا واقعی اور مثلی پہلو یہ ہے کہ جس کام کے لئے دعا کی جائے ایک طرف تو اپنے قول و فعل اور دل سے کسی طرح بھی اس کی مخالفت نہ کی جائے، دوسری طرف اس کام کو مکمل کرنے کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لے آنا ضروری ہے۔ مثلاً اگر آپ اپنی کھیتی کو زرخیز و شاداب دیکھنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنی تمام معنوی و مادی صلاحیتوں سے اسے زرخیز بنائے میں کو شان ہو جائیں اور پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ آپ کو مزید توفیق بخشے اور آپ کی محنت کا پورا پورا پھل عطا فرمائے۔

صلوة و سلام کا تقاضا

اس مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوة و سلام پہنچنے کے لئے اولین اقدام یہ ہونا چاہیے کہ ہم پہلی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ دعوت اور آپ کی عطا کردہ تعلیمات کی خوبیوں کو معلوم کریں، ان خوبیوں کو دنیا میں پیچھا، پھلتا اور بھولنا دیکھنے کے لئے اپنی تمام مسماعی وقف کر دیں، اپنے ہر عمل سے اس خیر و صلاح کو تقویت پہنچائیں جس کو

سرچشمہ آبِ بقا

عبدالغنی شمس

حقیقت کو حقیقت بر ملا کیسے نہ اب کہیے
 بُرا ہو حسرتِ اظہار کا، اے دردِ ناکامی
 مُلکِ بکی تجلی دیکھ کر حیران رہ جائیں
 جو دروں کو بڑھادے تابِ تب میں مہرِ روشن سے
 جو انسانوں کو، انسانی شرف سے آشنا کر دے
 ٹادے راہِ حق میں، جو خوشی سے خانماں اپنا
 جو اجزائے حیاتِ بقا کو سرمدی کر دے
 ملادے خاک کی چمکی کو جو اجرامِ گردوں سے
 جو اسرارِ حق و باطل کو نظروں پر عیاں کر دے
 مٹادے جو من و تو کا اندھیرا زم ہستی سے
 لقبِ جس کو ملا ہو رحمتِ عالم کا دنیا میں
 جو خود بھوکا رہے، کھانا کھلا دے اپنا اوروں کو
 ہجومِ درد و غم میں بھی، دعا ہو جسکے ہونٹوں پر
 چراغِ راہ ہو، نقشِ قدم جس کا زمانے میں
 جہاں میں حق کے اجزا جس کی سیرت سے مرتب ہوں
 بے فیض و جی ربانی، نرالی شان رکھتا تھا

رُخِ گل دیکھ کر صلّ علی کیسے نہ اب کہیے
 کہ غیروں سے بھی دل کا مدعا کیسے نہ اب کہیے
 اسے قندیلِ عرشِ کبریا کیسے نہ اب کہیے
 اسے برقی مہر کوہِ صفا کیسے نہ اب کہیے
 اسے سرِ حلقہِ صدق و صفا کیسے نہ اب کہیے
 اسے سرِ نامہ اہلِ عطا کیسے نہ اب کہیے
 اسے سرچشمہ آبِ بقا کیسے نہ اب کہیے
 اسے آئیں شناس ارتقا کیسے نہ اب کہیے
 اسے ہر عروجِ اتقا کیسے نہ اب کہیے
 اسے انسانیت کا آسرا کیسے نہ اب کہیے
 اسے مقصودِ ہر شاہِ گدا کیسے نہ اب کہیے
 اسے صد نازشِ جو و دشنا کیسے نہ اب کہیے
 اسے اک پیکرِ صبر و رنما کیسے نہ اب کہیے
 اسے غیرتِ وہ بدر الدجی کیسے نہ اب کہیے
 اسے انساں سے کچھ ماسوا کیسے نہ اب کہیے
 ہمہ اوقات وہ پیشِ نظرِ قرآن رکھتا تھا

نعتیں

خورشید انصاری

فروغِ روحِ عالم بن کے گلشن میں بہار آئی
ہوئے قدو سیانِ عرشِ اعظم پھر تماشائی

یہ کس گل کے لئے یوں کی گئی ہے گلشنِ آرائی
زمین پر آسمان سے آج تو جنتِ انزائی
منور کس کی آمد سے ہوا یوں گلشنِ عالم
کہ ہر موجِ صبا انوار کے دریا بہا لائی

وہ اک نورِ مجسم، حسنِ مطلق، مالکِ تقویٰ
وہ اک آئینہ، ایشاں و تصویرِ شکیبائی
وہ بزمِ قدس کی قندیلِ روشنِ لمعہ تاباں
عرب کی سرزمین نے جس کے جلوں سے نیا پائی

سراپا اک مکمل عکس تو نورِ حقیقت کا
جمالِ حق کا آئینہ ترے جلوؤں کی رعنائی
تری معصوم نظروں میں خزانے نورِ ایمان کے
لبِ معجز نما میں تیرے اعجازِ مسیحائی

یتیموں نے ترے الطاف سے ہمدردیاں پائیں
اسیروں نے ترے آغوش میں جا کر اماں پائی
سبقِ توحید کا تو نے دیا ہے اہلِ عالم کو
ترے نقشِ قدم سے کھڑا روں پر بہار آئی

تکبر سے نہیں جھکتے تھے جو دربارِ خالق میں
انہیں لوگوں میں پیدا کر دیا ذوقِ جہنمائی
عرب کی دھوپ میں تو جس کو مریخ اور عطیہ تھا
فلک والوں سے پوچھے کوئی اس کلمی کی رعنائی

پھپھانہو اسے سبھی حشر کے دن اپنے دامن میں
ترا خورشیدِ جب تربت سے اٹھے لے کے اُگلوائی

قمر احمد عثمانی

پائے ناز پر سر تھا، رات میں جہاں پر تھا
اوج پر مقدر تھا، رات میں جہاں پر تھا

نور کا سندر تھا، رات میں جہاں پر تھا
اک عجیب منظر تھا، رات میں جہاں پر تھا
وہ سکون کے لمحات، وہ سکوت کا عالم
کتنے روح پرور تھا، رات میں جہاں پر تھا

ایک عالم بے چوں، اک مقام بے اطراف
ایک قصر بے در تھا، رات میں جہاں پر تھا
حور و دہلِ میکش، شیشہ و درِ بغلِ حوریں
دورِ حرام کو تر تھا، رات میں جہاں پر تھا

میرے خیر مقدم کو، میری پیشوائی میں
قدسیوں کا لشکر تھا، رات میں جہاں پر تھا
شش جہات کی دنیا، ممکنات کا عالم
میرے زیرِ شہر تھا، رات میں جہاں پر تھا

سیم تن، پری چہرہ، سر و قد، صہبہ قدر
کوئی تصویر نہ کر تھا، رات میں جہاں پر تھا
میں ہاں شبِ بطحا، اور میزبانِ آن کا
خود خدا لے برتر تھا، رات میں جہاں پر تھا

✱

نشدِ حریت

شریف الحسن

آزادی وطن نے نئی رُوح پھونک دی عہد کہن کی خستگی جان و تن گئی
 صد شکر رائگاں نہ گیا خون کشندگان شاخِ فسردہ نخلِ برومند بن گئی
 بارِ دگر ہے امتِ مرحوم کو نصیب
 عزمِ بلند، شوقِ جواں، فہمِ چون و چیت طبعِ سلیم، ذوق و جمال، انبساطِ زلیست
 حرفِ غلط ہے تفسرِ ممکن و محال
 صدقِ طلب ہے آپ ہی حلالِ مشکلات
 خیرِ الاثم ہے تجھ سے عبارتِ نثرِ ادِ نو
 دستِ رسا بڑھا پئے تسخیرِ کائنات

(انقرہ ۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء یومِ پاکستان)

حصول پاکستان کیلئے مسلمانوں کی جدوجہد

ایک جائزہ

سعید احمد

کی مخالفت اور ناپاک عوام مسلمانوں کے پختہ ارادوں کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ مسلمانوں کے مابین ایک مضبوط اتحاد کی تحریک سید جمال الدین افغانی نے عالم اسلام کو مغربی تسلط کے خطرے کے خلاف متحد کرنے کیلئے شروع کی تھی اور فرمایا تھا کہ مغرب کا وہ مذہبی جوش جو صلیبی جنگوں میں کار فرما تھا، اب بھی موجود ہے اور مغربی پالیسی کے پس پردہ ایک محرک طاقت کی حیثیت سے بہت زیادہ پوشیدہ ہے۔ ان لوگوں نے اس طاقت کو اور زیادہ بڑھا کر اسلام پر جارحیت برقرار رکھی ہے۔ خود ان کے ادب میں اسلام کے بارے میں نفرت اور تمسخر بھر پور تحریریں نظر آتی ہیں۔ اس لیے جا مخالفت سے قبل مسلمانوں کو ایسا کوئی موقع نہ ملا تھا کہ وہ اپنے دفاع کے لئے متحد ہوتے لیکن اب یہ نہایت ضروری ہو گیا ہے کہ ملت اسلامیہ مل کر اس حملے کا جواب دے۔ جمال الدین افغانی نے پورے عالم اسلام کو اتحاد کا جو راستہ دکھایا تھا برصغیر میں اس کا واضح نتیجہ سرسید احمد خان کے عمل سے ظاہر ہوا۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد کے سنگین حالات میں ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت سنبھالی۔ اس جنگ کے بعد مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا تھا ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے اور بڑے ہولناک حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ ایسے وقت

آج سے ۲۹ برس قبل پاکستان کا معجزانہ قیام عمل میں آیا جس سے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ وطن میسر آیا اور انگریزوں کی غلامی سے آزادی اور ہندوؤں کے دائمی غلبہ سے نجات حاصل ہوئی۔ یہ سب کچھ مسلمانوں کے اتحاد اور یکجہالت کا نتیجہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان اپنے اتحاد اور قومی یکجہتی ہی کی بدولت اپنے ثقافتی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی اقدار کا تحفظ کرنے کے لئے اپنا ایک علیحدہ وطن بنانے کے قابل ہو گئے۔

در اصل بیسویں صدی کے اوائل ہی میں مسلمانوں نے ہندوؤں کی تنگ دلی اور حکمرانی کی درون پرہہ تناؤں کے پیش نظر اپنے لئے ایک علیحدہ وطن حاصل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اور مستقل جدوجہد کے بعد اس مقصد کی تکمیل اور حصول کے لئے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے پاکستان کے قیام کا واضح تصور پیش کیا۔ یہ قرارداد پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات اور جذبات کی عکاسی تھی۔ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری مسلم قوم ایک آہنی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی اور صرف سات سال کے عرصہ میں مسلمانوں کے ہمدرد اتحاد و یکجہالت اور ناقابل فراموش قربانیوں نے انہیں منزل مقصود سے ہم کنار کر دیا۔ ہندوؤں اور انگریزوں

میں سرسید احمد خان نے مسلمانوں کی بے چارگی کو شدت سے محسوس کیا اور ان کے مستقبل کو سنوارنے کا بیڑا اٹھایا۔ سرسید کو مسلمانوں کو علمی میدان میں آگے بڑھانے اور ان کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے سخت جدوجہد کرنا پڑی اگرچہ حالات بڑے مایوس کن تھے لیکن سرسید نے مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی مسلم کش حکمت عملی سے باخبر کیا اور سیاسی بیداری پیدا کی۔

سرسید ہی نے پہلی مرتبہ مسلمانوں کے علیحدہ قوم ہونے کا تصور سیاسی طور پر اجاگر کیا تھا وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ایسی دو قومیں جو ایک ساتھ مل کر کبھی نہ رہ سکتی ہوں یا ہم آہنگی کے ساتھ حکومت نہ کر سکتی ہوں دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے اور نقصان پہنچانے کے درپے رہیں گی۔

۱۸۸۵ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو اس نے مسلم کش پالیسی اختیار کی۔ لیکن سرسید نے قوم پرست کانگریس کے سوانح کو پوری طرح بھانپ لیا تھا اور انہوں نے نیشنل کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کی بھرپور مخالفت کی۔ سرسید نے خیال ظاہر کیا کہ اگر کانگریس کی قراردادوں نے عملی شکل اختیار کر لی تو انگریز حکومت کے لئے اس وقت امن قائم رکھنا اور خانہ جنگی کو روکنا ناممکن ہو جائے گا۔

چونکہ کانگریس کی پالیسی ابتداء ہی سے ہندو نواز تھی اس لئے سرسید نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ آپس میں تفریق کو مٹا کر اتحاد پیدا کریں۔ اور اپنے آپ کو کانگریس سے دودھ رکھیں جو ہندوستان کے تمام فرقوں اور قوموں کی نمائندہ جماعت ہونے کی دعویٰ کرتا ہے لیکن دراصل وہ صرف اور صرف ہندوؤں کے مفادات کی محافظ اور امین ہے۔

سرسید کی اسی دور اندیشی اور انتباہ کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت نے کانگریس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کانگریس کے بارے میں سرسید کے یہ شکوک و شبہات وقت سے بہت پہلے ہی درست

ثابت ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں انگریزوں نے محض انتظامی سہولتوں کی بنیاد پر بنگال کو تقسیم کیا، تو ہندوؤں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اس تقسیم کی وجہ سے جو نیا صوبہ وجود میں آیا تھا وہ مشرقی بنگال اور آسام پر مشتمل تھا۔ یہ مسلمانوں کا اکثریتی علاقہ تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ بنگال کی تقسیم سے اس علاقے کے ستم رسیدہ مسلمانوں کا مستقبل بہتر ہو جائے گا۔ تقسیم بنگال کے بعد نئے صوبے کی تشکیل سے مسلمان ہندوؤں کے اثر اور استحصال سے محفوظ ہو جائیں گے۔ لیکن ہندو یہ کس طرح گوارا کر لیتے کہ مسلمانوں کو کبھی سہولتیں حاصل ہوں اور وہ اپنے مستقبل کے مالک بن جائیں۔ چنانچہ انہوں نے تقسیم بنگال کی منہج کا مطالبہ کیا۔ مسلمانوں پر اس کا اثر یہ ہوا کہ انہیں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ضروری اقدامات کرنے پڑے اور انہوں نے اپنے حقوق کے تحفظ اور حصول کے لئے ایک علیحدہ سیاسی جماعت بنالی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اپنے حقوق کی بحالی کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ آخر کار ان کی یہ جدوجہد بار آور ہوئی اور قیام پاکستان کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔

جس سال مسلمانوں نے اپنی علیحدہ سیاسی جماعت کی تشکیل کی اسی سال چند ماہ قبل آغا خان سوم کی سربراہی میں مسلمانوں کے ایک وفد نے شملہ جا کر اپنے مطالبات لارڈ منٹو کے سامنے پیش کئے۔ ان میں سب سے اہم مطالبہ جداگانہ انتخاب کا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندوؤں کی بے پناہ مخالفت کے باوجود اپنے جداگانہ انتخاب کے حق کے لئے تین سال تک نہایت عزم اور حوصلے سے جدوجہد کی اور ۱۹۰۷ء میں منٹو مورے نے اصلاحات نافذ کی گئیں تو اس میں انگریزوں نے مسلمانوں کے اس بنیادی حق کو تسلیم کر لیا اور اس طرح مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت سے ابھرنے کا پورا موقع مل گیا۔

ہر چند کہ کانگریس نے مسلم لیگ کے ساتھ میزبانہ انداز کے ساتھ مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کو اپنی اصول پر مبنی اقلیتی معاہدہ

میں نے شکاری کتوں کو بھی خرگوش کے ساتھ و
کلم کرتے نہیں دیکھا جو ہندوستان میں اکثریت
اقلیت کے ساتھ روا رکھتی ہے۔

نہرو رپورٹ کی منظوری کے بعد مسلمانوں میں مکمل اتفاق و
اتحاد پیدا ہو چکا تھا۔ وہ کانگریس سے بے نیاز ہو کر اپنے راستے
پر مکمل خود اعتمادی اور عزم کے ساتھ رواں دواں تھے۔ جب ۱۹۳۸ء
میں گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی تو مولانا محمد علی جوہر
نے صاف گوئی اور بے باکی سے کہہ دیا کہ جس طرح وہ انگریزی تسلط کے
خلاف ہیں اسی طرح وہ ہندو تسلط کی بھی برابر مخالفت کرتے ہیں
ہم گاندھی جی کے ساتھ شامل ہونے سے انکار کرتے ہیں۔

دوسرا اہم سبب جس نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب
کیا وہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد صورجہات متحدہ آگرہ وادھ
میں کانگریس کا مسلم کٹ اور خود غرضانہ طرز عمل تھا۔ انتخابات سے
قبل کانگریس نے مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت بنانے کا
عہد کیا تھا لیکن انتخابات کے بعد کانگریس اپنے قول و قرار سے پھر گئی
اور مسلم لیگ کو حکومت میں شامل کرنے کیلئے نامناسب شرائط عائد
کرنے لگی۔ مثال کے طور پر لیگ کو اپنی پارلیمانی پارٹی ختم کر دینا چاہیے،
لیگی ارکان کو کانگریس کے عہد نامہ پر دستخط کرنے چاہئیں، پولیس سے
تعلق رکھنے والے تمام فیصلے کانگریس پارٹی کے اکثریتی ووٹ سے کئے
جائیں اور مسلمانوں کو ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت قطعاً حاصل نہ
ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ اگر مسلمان ان شرائط کو قبول کر لیتے تو ان کی سیاسی
موت میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ لہذا انہوں نے ان شرائط کو ٹھکرا دیا
اور کانگریس کے اثرات سے آزاد رہ کر اپنے نصب العین کی جدوجہد
میں مصروف ہو گئے اس اثنا میں کانگریس نے اپنے دور حکومت میں
مسلمان اقلیتوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا اس سے مسلمان کانگریس
سے اور بھی متنفر ہو گئے۔

ان واقعات نے مسلمانوں کو علیحدگی کے بارے میں سوچنے پر

محمد علی جناح کی کوششوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ لیکن مبینہ لکھنؤ کی
یہ دوستی اور مصالحت زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ چند سال بعد
۱۹۳۸ء میں کانگریس نے نہرو رپورٹ شائع کی جس میں اس نے مسلمانوں
کے ان تمام مطالبات کو یکسر مسترد کر دیا جو لکھنؤ پیکٹ کے تحت تسلیم
کئے جا چکے تھے۔ کانگریس کے اس فوری اقدام سے مسلمانوں کو جداگانہ
انتخاب کے حق سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی۔ علاوہ انہیں مخصوص
نشتوں کا تحفظ بھی غلط طریقہ پر لیا گیا اس طرح نہرو رپورٹ
سے ہندوستان میں مسلمانوں پر کانگریس اور ہندوؤں کی بالادستی
غلبہ اور تسلط کی سازش بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی۔

۱۹۳۹ء میں کلکتہ میں کل جماعتی کانفرنس کے موقع پر محمد علی
جناح نے شرکا کو مسلمانوں کے کم سے کم مطالبات تسلیم کرنے پر آمادہ
کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی تمام تر کوششیں بے سود رہیں۔
رائیگاں ٹائیپنگ پریس میں محمد علی جناح نے ہندوستان کے
مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے اپنے چودہ نکات
پیش کئے۔

مسلمانین نے انتخابات کے سلسلے میں ہندوؤں کی زیادتی اور
مخالفت پر سختی سے پھر کلکتہ میں کل جماعتی کانفرنس میں ہندوؤں
کی جانب سے تعصبات کے مظاہرے ہوتے جن کی بنیاد پر مسلمانوں کے
درمیان اتحاد اور یکجہتی کی ایک نئی روح پیدا ہوئی۔ مسلمانوں نے
آپس کے تمام اختلافات کو ختم کر دیا اور ایک دوسرے کے قریب
آگئے۔ اب وہ مکمل طور پر بیدار ہو چکے تھے۔

لکھنؤ میں قائد اعظم نے فرمایا۔

”اکثریتی فریق نے خود ہی یہ ظاہر کر دیا ہے کہ

ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے۔“

مشہور مسلمان رہنما مولانا شوکت علی نے اکثریتی فریق کے

عجیب و غریب رویہ مدعی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

”میں پوری زندگی شکار کا دلدادہ رہا ہوں مگر

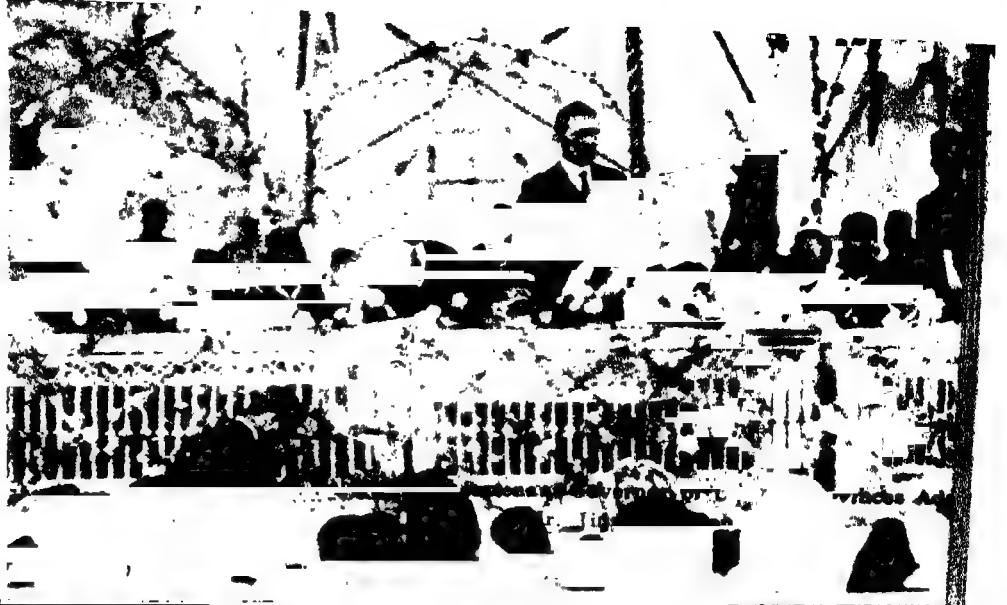
متافلہ وقافلہ سالار

(حصول پاکستان کی جدوجہد)



آغا اعظم کا شاندار جلوس

قائد اعظم کے زیرِ صدارت
مسلم لیگ ساجلاس گھنڈو
(۱۹۱۶ء)



بالندھریلوے اسٹیشن پر طلیاء کی جانب سے
قائد اعظم کا استقبال



دہلی میں قائد اعظم کا
ایک شاندار جلوس





قائد اعظم کا برطانوی حکام
سے بات چیت کے لئے
لندن میں ورود



قائد اعظم آخری برطانوی
وائسرائے لارڈ اور یسٹری
ماؤنٹ بیٹن کے ہمراہ



قائد اعظم ایک پریس کانفرنس
سے خطاب کر رہے ہیں



قائد اعظم بنیاب مسلم لیگ کے اراکین کے ہمراہ

مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس



مجبور کر دیا۔ جمال الدین افغانی نے پہلے ہی مسلم جمہوری ریاست کی جانب اشارہ کیا تھا۔ بعد میں جودھری رحمت علی نے بار بار جمال الدین افغانی کے ان الفاظ کو سراہا کہ ہندوستان کا شمال مغربی علاقہ مسلمانوں کا ہے اور مسلمان یہ علاقہ اپنے پاس رکھیں گے اور اسے مسلم مملکت بنائیں گے۔

لیکن علیحدہ مسلم مملکت کا جامع منصوبہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ۱۹۳۰ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے الہ آباد کے اجلاس میں پیش کیا اور کہا کہ ہندوستان ایک چھوٹا سا ایشیاء ہے اور یہ مختلف قوموں، نسلوں، ذاتوں، زبانوں اور مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کا بڑا عظیم ہے۔

علامہ اقبال نے ہندوستان میں مسلم مملکت کے قیام کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان اپنے لامتناہی منظر میں مختلف نظریوں، زبانوں، عقائد اور معاشرتی نظام کا حامل ہے چنانچہ ایسی نئی مملکتوں کا قیام جن کی بنیاد اتحاد بین المسلمین، نسل تاریخ، مذہب اور معاشرتی مفادات پر ہو اس کے مسائل کا حل ہے۔

۱۹۳۰ء کے آئین کے سلسلہ میں مسلمانوں کی بے اطمینانی اور بے چینی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال نے کہا کہ نیا آئین صرف ہندوؤں کو مطمئن کرنے کے لئے ہے ان کے خیال میں ہندوستان میں امن صرف اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جبکہ ملک کی تقسیم سماجی، معاشرتی، مذہبی، لسانی اور نسلی بنیادوں پر از سر نو کی جائے۔

قائد اعظم نے ۱۹۳۰ء میں پٹنہ میں ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں کانگریس کی وزارتوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے فرمایا۔

”مسلمان بچوں کو سرکاری اور مسلم اسکولوں میں بندھے ماترم گانے پر مجبور کر کے مسلمانوں کی تہذیب اور ثقافت کو کچلا جا رہا ہے اور کانگریس کے جھنڈے عمارتوں پر لہرائے جا رہے ہیں۔“

مسلمانوں کی تمام تر خواہش یہ تھی کہ صوبائی اسمبلی سے کانگریس کا راج ختم کیا جائے۔ جب کانگریس کا راج ختم ہوا تو مسلمانوں کو اطمینان ہوا اور انہوں نے ۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو یوم نجات منایا۔ قائد اعظم نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کے درمیان مکمل اتحاد و اتفاق وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور اسی کے ذریعہ سے وہ اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے ۶ مارچ ۱۹۴۰ء کو علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے انہیں نصیحت کی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلیں۔ مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کام کریں اور سیہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند ثابت قدم رہیں وہ عوام میں جوائس اور انہیں نظم کریں، انہیں تربیت دیں اور ان میں نظم و ضبط پیدا کریں۔ جو لوگ ہمارے ساتھ ہیں وہ مشکلات سے پریشان نہ ہوں اور ایک ایسی سیاسی فوج تیار کریں جسے ہندوستان دلے حسرت سے دیکھیں۔ اس طرح ہم بہت جلد آزادی کی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوں گے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں قائد اعظم نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے مسلمان اقلیت نہیں وہ ایک قوم ہیں ہم وہ علاقے حاصل کرنا چاہتے ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے یہ علاقے بنگال، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان ہیں۔

یہ قرارداد بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی اس قرارداد میں غیر مبہم الفاظ میں کہا گیا تھا کہ اس ملک میں کوئی آئینی منصوبہ قابل عمل نہیں ہوگا اور نہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہوگا جب تک حسب ذیل بنیادی اصولوں پر اس کا خاکہ تیار نہ کیا جائے۔

یعنی جغرافیائی حدود کے ذریعہ علاقوں کی حد بندی کی جائے اور جن علاقوں میں مسلمان عددی لحاظ سے اکثریت میں ہیں شمال مغربی علاقے اور ہندوستان کے مشرقی حصے وہ آزاد مملکت پر مشتمل ہوں اور خود مختار ہوں۔

پاکستان کے مقاصد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قائد اعظم نے

فرمایا:-

” ہم سب مسلمان ہیں۔ خدا ایک کتاب اور ایک رسول پر یقین رکھتے ہیں لہذا ہم کو ایک متحد قوم ہونا چاہیے۔

انہوں نے پوری اسلامی دنیا سے کہا کہ یاد رکھو ہم ایک ایسی مملکت کی بنیاد رکھ رہے ہیں جو کہ اسلامی دنیا میں

اپنا بھرپور کردار ادا کرے گی۔“

حصول پاکستان اور مسلمانان ہند کو متحد کرنے کے لئے قائد اعظم

نے ملک کے دور دراز علاقوں میں جا کر تقریریں کیں۔ ۳۴ مارچ ۱۹۴۱ء

کو انہوں نے کہا کہ جب تاریخ میں لکھا جائے گا کہ نو کروڑ مسلمان

ان تین برسوں میں کس طرح ایک جھنڈے تلے ایک پلیٹ فارم پر جمع

ہو گئے تو اسے ایک غیر معمولی کارنامہ سمجھا جائے گا۔ یہ بات مسلمانوں کی

پچھلی دو سو سالہ تاریخ میں نہیں ملے گی۔ ہمارے تمام دشمنوں اور ہمارے

سارے مخالفین کو بخند یقین تھا کہ مسلمان کبھی متحد نہیں ہوں گے اور آپس

میں لڑتے ہی رہیں گے۔“

۲۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم نے اپنے پیغام میں قوم سے فرمایا:

” آج سب سے بڑا انعام و کرام مسلمانوں کا اتحاد

اور اتحاد ہے۔ آج مسلمانوں کی ایک آواز ہے۔ آپ

لوگوں کے پاس اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے

ایک پلیٹ فارم اور ایک مرکز بھی موجود ہے۔ میں

جرات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس علاقے میں آج

کوئی دوسرا فرقہ ایسا متحد اور منظم نہیں ہے جتنا کہ

مسلمان ہیں۔“

پھر ۲۳ مارچ ۱۹۴۳ء کو قائد اعظم نے اپنے پیغام میں کہا:

” اس سے پیشتر کبھی ایک قوم نے جسے غلط انداز

میں اقلیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اپنے آپ کو

اتحاد، فعال اور طاقتور بنایا ہے۔ کبھی کسی قوم

لے ذہنی اعتبار سے اپنے اندر اس قدر ہم آہنگی، یکاگت

اور ہم خیالی کو فروغ دیا ہے اور نہ کروڑ ہا انسانوں پر مشتمل

کسی قوم نے کبھی اتنے قلیل عرصے میں اور ایسے مخصوص حالات

میں جن سے ہندوستان اس وقت دو چار ہے اپنے اندر اتحاد

کامل قائم کیا ہے۔“

اس طرح قائد اعظم ہر مرحلہ پر پاکستان کے قیام کے لئے مسلمانان

ہند کو متحد کرتے رہے۔ دوسری جانب انگریز حکمران اور اکثریتی

فرقہ ہر موقع پر مطالبہ پاکستان کو ناکام بنانے کے لئے پوری طرح

کوشاں رہا۔ قائد اعظم نے ایک ماہر سیاستدان کی حیثیت سے

پاکستان کے مخالفین کو شکست فاش دی۔

قرار داد پاکستان کے دو سال بعد عین اس وقت جب برطانیہ

جنگ عظیم میں دشمن سے نبرد آزما تھا، حکومت برطانیہ نے ہندوستانی

لیڈروں سے مصالحت کے لئے کوشش کی اور اس کام کے لئے سیٹھ نور

کرپس کو ہندوستان بھیجا تاکہ وہ ہندوستان کے مسئلے کا کوئی حل

پیش کریں۔ کرپس نے کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں سے

بات چیت کے اپنے تجاویز پیش کیں۔

کرپس تجاویز کے مطابق ایک انڈین یونین کی

تشکیل کا وعدہ کیا گیا اور اس بات کا اختیار دیا

گیا کہ اگر انڈین یونین چاہے تو وہ کامن ویلتھ سے

میلحدگی بھی اختیار کر سکتی ہے۔ تجاویز میں دستور

سازی کے لئے ایک اسمبلی بنانے کا وعدہ کیا گیا جو

جنگ کے فوراً بعد اپنا کام شروع کر دے گی۔

تجاویز میں یونین کے صدور کو یہ حق دیا گیا کہ

وہ دستور قبول نہ کرنے کی صورت میں اپنا سابقہ

حقوق قائم رکھ سکتے ہیں۔ کرپس نے یہ بھی وعدہ

کیا کہ وائسرائے کی ایکزیکٹو کونسل ماسوا

دفاع تمام تر ہندوستانی ممبران پر مشتمل ہوگی۔

ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں نے کرپس کی تجاویز پر غور کیا۔

قائد اعظم نے اپنی تقریر میں یہ خیال ظاہر کیا کہ :

”ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ ایک نئی ہندوستانی یونین بنائی جائے اور اس فرض سے ایک مجلس دستور ساز قائم کی جائے۔ یہ مجلس دستور ساز کل اختیارات کی حامل ہوگی۔ سراسیمہ و کرپس کے الفاظ میں یہ مجلس دستور ساز اپنا کام آل انڈیا یونین کے ساتھ شروع کر دے گی۔ انہوں نے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا یہ کھی طور پر مختار و محاذ دستور ساز اسمبلی جداگانہ انتخاب سے نہیں۔ پروپرتشل ریپریزنٹیشن کے ذریعہ منتخب کی جائے گی۔ جس وقت یہ مجلس قائم ہو جائے گی تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سوائے ایک یونین کے کسی اور نتیجہ پر کیسے پہنچے گی۔ اور اس وجہ سے اس کی یہ ترکیب متعین کی گئی ہے۔ قائد اعظم نے کہا کہ حقیقی مسائل کو ٹال کر اور صوبوں کے ملکی وجود پر نادا جب زور دے کر جو برطانوی پالیسی اور انتظامی تقسیم کا حادثہ ہیں ہندوستانی مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش بنیادی طور پر غلط ہے۔ مسلم ہندوستان بغیر اس کے مطمئن نہ ہوگا کہ اس کی قومی خود ارادیت واضح طور پر تسلیم کی جائے۔ اعلان میں علیحدگی کے متعلق اقلیت کو جو اختیار دیا گیا ہے وہ فریب ہے کیونکہ ایک آل انڈیا یونین کی تائید میں ہندوستان کا تمام صوبوں میں غلبہ ہوگا اور بنگال اور پنجاب کے مسلمان ہندو اقلیت کے رحم و کرم پر ہوں گے۔

قائد اعظم کے تبصرہ کی روشنی میں مسلم لیگ نے تفصیل سے کرپس تجاویز کا جائزہ لیا اور صاف کہہ دیا کہ پاکستان اسکیم کا وہ اصول جو مارچ ۱۹۴۷ء کے ریزولیشن میں درج ہے آل انڈیا مسلم لیگ کا عقیدہ قرار پا چکا ہے۔۔۔ مسلم لیگ کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ کوئی

دوسری اسکیم یا تجویز قبول کرے۔

کانگریس نے بھی کرپس تجاویز کو اپنے نقطہ نظر سے جانچنے کے بعد انہیں مسترد کر دیا۔ اور اس طرح کرپس مشن ناکام ہو گیا۔ جنگ کے بعد حکومت برطانوی نے ایک اور کوشش ہندوستان کے مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لئے کی۔ ۱۹۴۷ء کے شروع میں ایک برطانوی کابینہ مشن ہندوستان آیا جس میں کرپس کے علاوہ لارڈ پیتھک لارنس اور مسٹر ای۔ وی الگزانڈر ممبران کی حیثیت سے شامل تھے۔ ہندوستانی لیڈروں سے مذاکرات کے بعد وفد نے ایک اسکیم پیش کی جس کے تحت ہندوستان کو تین گروپوں میں تقسیم کرنا تجویز کیا گیا تھا۔ گروپ الف میں ہندو اکثریت کے تمام صوبے شامل تھے گروپ ب میں مسلم اکثریتی صوبے یعنی پنجاب، سرحد اور سندھ اور ’ج‘ میں بنگال اور آسام ہندوستانی مشن نے دستور سازی کے لئے ایک اسمبلی بھی تجویز کی جس کے ممبران کو جداگانہ انتخاب کے ذریعہ منتخب ہونا تھا۔ ہر منتخب ممبر دس لاکھ کے نمائندے کی حیثیت سے اسمبلی میں شریک ہوگا۔ سوائے دفاع، امور خراج و احوال و مواصلات تمام گروپ مختار ہوں گے۔ کسی گروپ کے صوبے اگر چاہیں تو الیکشن کے بعد اپنے گروپ سے نکل سکیں گے۔

مسلم لیگ نے اس اسکیم کو اعلان کے بیس دن کے اندر ہی تسلیم کر لیا کیونکہ اس کے خیال میں وفد کی تجاویز پاکستان کے نصب العین سے بہت قریب تھیں۔ لیکن اس کے برخلاف کانگریس نے ۷ جولائی تک ان تجاویز کو منظور نہیں کیا۔ اس سے قبل وائسرائے نے اعلان کیا تھا کہ پارٹی اس اسکیم کو منظور کرے گی اسے عبوری حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی لیکن جب لیگ نے اس شرط کو پورا کر دیا تو حکومت اپنے وعدے سے منحرف ہو گئی محض اس لئے کہ کانگریس نے اسے کھی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔

حکومت کے اس رویہ سے جو کھلم کھلانا انصافی پر مبنی تھا مسلم لیگ اور تمام مسلمانانہ ہندو فطری طور پر بڑی مایوسی

ہوتی۔ لہذا مسلم لیگ نے اپنا آئندہ لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے بمبئی میں اجلاس کیا۔ قائد نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا،

”ہم نے پاک ہاتھوں سے کام کیا۔ صرف مسلم لیگ ہی وہ پارٹی ہے جو اس گفت و شنید سے عزت کے ساتھ باہر آئی اور اس کے ہاتھ صاف ستھرے ہیں۔ مشن نے عبوری حکومت کے معاملے میں عہد شکنی کی ہے۔ مشن اس وقت مرعوب اور مغلوب ہے۔ کانگریس نے وہ طریقے اختیار کئے جن پر ایک معمولی آدمی کو بھی شرم آئے گی۔“

آخر میں مسلم لیگ کونسل نے فیصلہ کیا کہ،

”اب وقت آگیا ہے کہ پاکستان حاصل کرنے کے لئے اپنے منصفانہ حقوق کا دعویٰ کرنے کے لئے اپنی عزت ابرو رکھنے کے لئے اور موجودہ برطانوی غلامی اور مستقبل کے اس ہندو تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لئے جس کے منصوبے بن رہے ہیں راست اقدام (ڈائریکٹ ایکشن) کیا جائے کونسل نے مسلم قوم سے اپیل کی کہ اپنی نمائندہ اور مختار انجمن مسلم لیگ کی نشست پر متحد ہو کر کھڑی ہو جائے اور ہر قربانی کے لئے تیار رہے۔ حکومت برطانیہ کے طرز عمل کے خلاف علامتی احتجاج کے طور پر مسلم لیگ کو ہدایت کی کہ وہ برطانیہ کے علاقے ہونے خطایات واپس کر دیں اور جیلے میں شرکار جلسہ نے خطابات واپس کئے۔“

راست اقدام کے بعد فرقہ پرستوں نے کانگریس کی خدہ پاکر ملک بھر میں مسلم کش فسادات برپا کر دیئے۔ لاکھوں بے گناہوں کا خون ہوا اور لاقانونیت کا دور دورہ رہا۔ برطانوی حکومت نے ایسے وقت میں کانگریس کو مارنی حکومت بنانے کی دعوت دی۔ چونکہ مسلم لیگ

کے نمائندوں سے بد عہدی کی گئی تھی لہذا انہوں نے حکومت میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا مگر صرف کانگریس پر مشتمل عبوری حکومت سے مسلمانوں کی کسمپرسی کی کیفیت میں اور اضافہ کے خطرے کے پیش نظر بعد میں مسلم لیگ نے عبوری حکومت میں شرکت کر لی۔ مسلم لیگ کے نمائندوں نے عبوری حکومت میں کانگریس کے پروگراموں کو ناقابل عمل بنا دیا۔ لیاقت علی خان نے جو وزیر خزانہ تھے، ایسا بجٹ پیش کیا کہ سرمایہ داروں کے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی۔ ایک قول کے مطابق لیاقت کے بجٹ سے غریبوں کو نمک میسر ہو گیا اور امیروں کو قبر۔ بہر حال ہندوؤں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ انہیں پاکستان ہر قیمت پر منظور کرنا ہو گا۔

ادھر فروری ۱۹۴۷ء میں حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ وہ ہندوستان کو خود مختاری دے دے گا اور اسی اعلان کے ساتھ لارڈ ویل کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے ہند مقرر کر دیا گیا۔

ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان آتے ہی سیاسی لیڈروں سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ جب قائد اعظم وائسرائے سے ملے تو انہوں نے کہا کہ میں صرف ایک شرط پر گفتگو کروں گا۔ وائسرائے نے کہا کہ میں کسی شرط پر گفتگو نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف آپ کے خیالات معلوم کر رہا ہوں۔ گفتگو کے بعد وائسرائے کو کہنا پڑا، ”جناح کس قدر ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک ہیں۔“

گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ ادھر ہندو مسلم فسادات شدت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کے منظم دس مسلمانوں پر حملے کر رہے تھے۔ غارتگری اور لوٹ مار کی فضا نے شہروں سے نکل کر پُرا من قصبہ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہندو مسلم کشیدگی ختم کرنے اور ملک میں امن و امان قائم کرنے کے لئے اب حکومت کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہ گیا تھا کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے چنانچہ وائسرائے نے سیاسی لیڈروں سے گفت و شنید کے بعد تقسیم ہند

تقریر کر چکے تو انہوں نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا جو ان کی تقریر میں لکھا ہوا نہیں تھا۔

۱۰ جولائی ۱۹۴۷ء کو ایوان عام میں آزادی ہند کا بل پیش ہوا اور ۱۵ جولائی تک اس کی تیسری خواندگی بھی منظور ہو گئی۔ ۱۸ جولائی کو ملک معظم نے منظوری دے دی اس کے بعد بل نے قانونی شکل اختیار کر لی جس کی رُو سے ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں کو انگریز کی دو صد سالہ غلامی سے نجات حاصل ہوئی۔

اس طرح قائد اعظم نے اپنی اعلیٰ قابلیت، غیر معمولی ذہانت اور بے مثال دردمندی سے ہندوستان کے منتشر مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کیا اور دنیا بھر کے مسلم دشمن عناصر کی مخالفتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر کے پاکستان کی بنیاد رکھی۔ علامہ اقبال کی توقعات کے مطابق انہوں نے شمالی ہندوستان میں جو سیلاب آ رہا تھا اسے روکنے میں ملت اسلامیہ کی صحیح رہنمائی کی اور اسے اپنا ایک وطن عطا کیا۔

کی ایک اسکیم تیار کی اور وہ اسے لے کر لندن گئے۔ پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد ۷ مئی کو وائسرائے نے ایک کانفرنس طلب کی جس میں انہوں نے اس اسکیم کو پیش کیا۔ کانفرنس کی منظوری کے بعد وائسرائے خود لندن گئے جہاں تقسیم ہند کی تجویز برطانوی حکومت کے سامنے پیش کی گئی حکومت نے اسے تسلیم کر لیا۔

۱۲ جون کو وائسرائے نے ہندوستانی رہنماؤں کی ایک کانفرنس منعقد کی جس میں مسلم لیگ کی طرف سے قائد اعظم، یاقوت علی خان اور سردار عبدالعزیز نے شرکت کی۔

پنڈت نہرو نے تو اسکیم کو منظور کر لیا مگر قائد اعظم نے فرمایا کہ منظوری سے قبل لیگ کی مجلس عاملہ کی رائے لینا ضروری خیال کرتا ہوں کیونکہ اسی کو اس اسکیم کو قبول کرنے کا حق ہے اگرچہ وائسرائے نے بہت زور دیا کہ قائد اعظم اپنی منظوری کا اعلان کر دیں مگر کوئی دباؤ ان پر کارگر نہ ہوا۔

۳ جون کو سچر ایک کانفرنس ہوئی اس میں تمام لیڈروں نے اس اسکیم کی منظوری کا اعلان کر دیا۔ اسی شام تمام لیڈروں نے ریڈیو سے تقریریں کی۔ قائد اعظم نے بھی خطاب کیا جب

رواج کی موت

(بلوچستان میں سرداری نظام کا خاتمہ)

ملک حبیب الرحمن

یہ محسوس ہوا ہے کہ پاکستان کے دیگر عوام کی طرح وہ بھی آزاد ہیں اور قومی معاشرے میں ان کو بھی پاکستان کے دیگر صوبوں کے بھائیوں کی طرح ایک باعزت مقام حاصل ہو گیا ہے۔

سرداری نظام یا رواج

اگرچہ اس ظالمانہ نظام کی تاریخ بہت پرانی ہے تاہم یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اس نظام کو جسے ”رواج“ کہا جاتا ہے زیادہ پھولنے پھلنے کا موقع انگریزوں کے دور حکومت میں میسر آیا۔ ۱۸۳۹ء میں بلوچستان پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں کو افغانستان سے دو جنگیں لڑنی پڑیں۔ یہ جنگیں ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۲ء میں ہوئیں۔ چونکہ برطانوی حکومت کو بلوچستان میں اپنی طاقت کو مضبوط بنانا تھا اس لئے اس وقت کے بلوچستان کے کسٹرن سربراہ سٹیمین نے خان قلات کے ساتھ متعدد عہد نامے کئے جن کے ذریعے چاغی درہ بولان، کوئٹہ اور صوبے کے دیگر کئی علاقے برطانوی تسلط میں آگئے۔ انگریز چونکہ سارے صوبے کو اپنی عملداری میں رکھنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے وقت کے تقاضے کے پیش نظر یہی مناسب سمجھا کہ صوبے پر براہ راست حکومت کرنے کے بجائے

۸ اپریل ۱۹۷۶ء کا مبارک دن پاکستان کی تاریخ میں بالعموم اور بلوچستان کی تاریخ میں بالخصوص سنہرے دن کے نام سے یاد کیا جائے گا کیونکہ یہی وہ دن ہے جس نے ہزاروں سال پرانے سرداری نظام کے نحوس ستارے کو فضا میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ڈوبتے دیکھلے۔

اپنے دو ہفتوں کے دورے کے خاتمے پر وزیر اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اسی دن کوئٹہ میں مرووں اور خورتوں کے ایک عظیم الشان جلسے سے خطاب کرتے ہوئے سرداری نظام کے خاتمے کا اعلان کیا۔ نعروں اور تالیوں کی گونج میں جناب بھٹو نے متعلقہ آرڈیننس کا ایک نسخہ ہاتھ میں اٹھا کر ڈرامائی انداز میں کہا: ”میں نے اس جاہل نظام کا خاتمہ اس تلوار پر یعنی آرڈیننس کے وار سے کیا ہے۔ اسی موقع پر بلوچستان کے سب سے بڑے سردار جناب میر احمد یار خان نے بھی اعلان کیا۔“

ج سے میں آپ کا سردار نہیں بلکہ خادم ہوں۔“ اس محسوس اور جرأت مندانہ فیصلے نے بلوچستان کے عوام میں خوشی کی لہر دوڑادی ہے اور صوبے بھر میں جگہ جگہ عوامی جشن مناتے جا رہے ہیں۔ اس صوبے کی بلوچ آبادی کو زندگی میں پہلی

بلوچی سرداروں کے ذریعہ حکومت کی جائے۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے اپنے ان وفادار دوستوں کو اس بات کی گلی چھٹی دے دی کہ وہ اپنے علاقوں کے عوام پر جس طرح چاہیں حکومت کریں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ نظام اور بھی بھیاک اور گھناؤنا ہوتا چلا گیا۔

رواج کا اصل روپ

سرداری نظام کا دوسرا نام ”رواج“ ہے۔ رواج کے تحت ایک عام بلوچ نہ صرف خود بلکہ اُس کا خاندان، اُس کی کمائی اور اُس کے مال مولشی تک قبیلے کے سردار کے رحم و کرم پر ہوتے تھے انہیں اس بات کی مطلقاً اجازت نہیں ہوتی تھی کہ اپنے سردار کے خلاف کچھ کہہ سکیں۔ بٹائی کے علاوہ یہ بے چارے ”چبارک“ ”شنگ“ اور ”ہفتک“ کی صورت میں سردار کو ٹیکس ادا کرتے تھے ٹیکس ادا نہ کر سکنے کی صورت میں انہیں سردار کے غضب کا نشانہ ہونا پڑتا تھا۔ اور سردار چونکہ مطلق العنان ہوتا ہے اس لئے وہ ہر طریقہ استعمال کر کے ٹیکس وصول کر لیتا تھا۔ سردار اتنے وسیع اختیارات کا مالک ہوتا تھا کہ اگر کسی فرد یا گروہ کو لوٹنا یا قتل کرنا چاہے تو وہ بلا جھجک کر سکتا تھا اور کوئی اس سے باز پرس نہیں کر سکتا تھا سردار کے احکام کی تعمیل کرانے کے لئے اُس کی اپنی پولیس۔ اپنی عدالت اور جیل خانے ہوتے تھے یہ سردار اپنے علاقوں میں کسی بھی ترقیاتی کام کی اجازت نہیں دیتے تھے اب تک ان علاقوں میں حکومت کے معمولی اہل کار بھی نہیں جاسکتے تھے۔ ان علاقوں میں سرکبیں بھی نہیں تھیں اور نہ دیگر ذرائع حمل و نقل۔ سرداروں کی ان چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے عوام موجود دور کی تمام سہولتوں سے محروم تھے اور یہ علاقے ایسے نظر آتے تھے جیسے یہ پانچ چھ سو سال قبل کی آبادیاں ہوں۔ سردار ہر ایسے قدم کے مخالف تھے جس سے لوگوں کی حالت سدھر سکے۔

وہ انہیں عمر بھر جاہل رکھنا چاہتے تھے کیونکہ عوام میں بیداری پیدا ہونے سے سرداری نظام کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ اور تو اور ان علاقوں میں مذہبی پرچار کی بھی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ بیگار کے علاوہ سردار اپنے قبیلے کے لوگوں سے جنگی خدمات بھی حاصل کرتے تھے۔ اور حکومت سے لوگوں کے نام پر مقیم وصول کر کے اپنے خزانے پر کرتے رہے تھے۔

لوگوں کے مقدمات کا سردار خود فیصلہ کرتے تھے۔ اور مجرموں کو جیل بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ جیل خانے کیا تھے عذاب گھر تھے۔ بد نصیب قیدیوں کو ان تنگ و تاریک اور غلیظ کونٹھریوں میں ایسی ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑتا تھا جن کے بیان سے ہی انسان کے رد نگلے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک بدتر بن ایذا رسانی کے طریقے کا نام کاٹھ میں ڈالنا ہے۔ کاٹھ یہ ایک وزنی لکڑی کا کندہ ہوتا ہے جس کے عین بیچ میں ایک بڑا سوراخ ہوتا ہے۔ قیدی کا ایک پاؤں اس سوراخ میں سے گزار کر سوراخ کو لکڑی کی ایک موٹی اور مضبوط میخ سے تنگ کر دیا جاتا ہے اور پاؤں اس میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ قیدی بے چارہ اس وزن کی وجہ سے نہ آسانی سے لیٹ سکتا ہے اور نہ بیٹھ سکتا ہے۔ اگر ضروریات کے لئے اٹھ کر چلنا پڑے تو وہ پہلے اس کندے کو ایک رسی کے ذریعہ ٹخنے سے اوپر کو اٹھاتا ہے اور جب چلتا ہے تو رسی کے ذریعہ کندے کو تھامے دکھتا ہے۔ چند دن پاؤں کندے میں رہنے سے ٹخنہ اور ٹانگ کا کچھ حصہ برسی طرح زخمی ہو جاتا ہے اور قیدی کو ان زخموں کی مرہم پٹی خاص مٹی سے کرنا پڑتی ہے۔

ایذا رسانی کا دوسرا طریقہ ”جولان“ کہلاتا ہے۔ اس میں ایک ٹانگ ایک قیدی کی اور ایک ٹانگ دوسرے قیدی کی زنجیر سے اکٹھی باندھ دی جاتی ہیں۔ یہی نہیں ان قیدیوں کو ہتھکڑیاں بھی لگائی جاتی ہیں۔ ٹانگیں زخمی ہونے کے علاوہ

حکومت کو سرداروں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ یہ حکومت کے کسی قانون کی پابندی نہیں کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اب تک بلوچستان میں نہ تو بندوبست ہو سکا اور نہ ہی زرعی اصلاحات کا نفاذ۔ سردار میر اس قانون کو ٹھوکر مار دیتے تھے جس سے ذرہ برابر بھی ان کی آن بان اور اختیار پر اثر پڑتا ہو۔ ان سرداروں نے زرعی اصلاحات کی بھی شدید مخالفت کی اور اپنے قبیلوں کے لوگوں کو مسلح کر کے دشوار گزار پہاڑی علاقوں اور دروں میں بھیج دیا جہاں سے وہ حکومت کے خلاف پشاور، حویلی، اسفہال کرتے رہے۔ محقر یہ کہ ان سرداروں نے پاکستان کے اندر اپنی خود مختار سلطنتیں قائم کر رکھی تھیں اور ان تک حکومت پاکستان کی رسائی خطرے سے خالی نہ تھی۔ بلوچانہ کے کل ایک لاکھ چونتیس ہزار باون (۱۳۴۰۵۲) مربع میل رقبے میں سے مرث ۱۳۵ مربع میل سے کچھ زائد رقبے پر حکومت پاکستان کا عملی تسلط تھا۔ اس صوبے کے ۲۲ سردار ایسے بھی ہیں جنہوں نے اب تک زرعی اصلاحات کے سلسلے میں اپنی زرعی جائیداد کے فارم تک پُر کرنا گوارا نہیں کیا۔ اس ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ سرداری الاؤنسوں کے علاوہ ان کی پولیس (لیویز) کے تمام اخراجات بھی حکومت پاکستان کو ادا کرنا پڑتے تھے۔

اب جبکہ سردار ختم کر دیئے گئے ہیں اور ”درواج“ دفن ہو چکا ہے، امید ہے کہ زرعی اصلاحات کے تحت لاکھوں ایکڑ زمین صوبے کے چھوٹے کاشتکاروں اور مزارعوں میں تقسیم کرنے کے لئے حاصل کی جاسکے گی۔

صوبہ بلوچستان

بلوچستان کا صوبہ جس کی سرحدیں جنوب مشرق میں سندھ کے ساتھ، شمال مشرق میں پنجاب کے ساتھ، شمال میں صوبہ سرحد

ان دونوں قیدیوں کو درونگ اذیت پہنچتی ہے۔ اگر ایک لیٹنا چاہتا ہے تو دوسرے کو بھی لیٹنا پڑتا ہے اور اگر ایک اٹھتا ہے تو دوسرے کو بھی ساتھ اٹھنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ حواج مزدی کی فراغت کے لئے بھی دونوں کو اکٹھے جانا پڑتا ہے یہ سزا کیا ہے شکنجہ موت میں کس کرتا پاتا ہے۔

ایذا دسانی کا ایک نیرا طریقہ یہ ہے کہ قیدی کی ڈاڑھی نوچ لی جاتی ہے اور منہ کالا کر دیا جاتا ہے۔ جسمانی اور ذہنی طور پر اذیت تک ہونے کے ساتھ ساتھ یہ طریقہ اس لئے بھی رسوا کن ہے کہ روایتی طور پر ایک بلوچ اپنی ڈاڑھی کو نہایت مقدس سمجھتا ہے وہ اس پر کسی دوسرے کا ہاتھ بھی نہیں برداشت کر سکتا چہ جائیکہ اسے نوچ لیا جائے چنانچہ بلوچوں کے عظیم رہنما میر جاگر خان کے متعلق مشہور ہے کہ اسے آزمانے کے لئے کسی بلوچ سردار نے ان کے دودھ پیتے بچے کو ان کی گود میں ڈال دیا تھا اور جب بچے نے میر جاگر خان کی ڈاڑھی کو اپنے ننھے منے ہاتھوں سے چھوا تو والد نے تلوار نکال کر اپنے بچے کا سر قلم کر دیا۔

صدیوں کی غلامی نے ان لوگوں کی روح کو بھی مردہ کر دیا ہے۔ وہ سردار کولونیا میں طاقت کا ایک عظیم سرچشمہ سمجھے ہیں اور اس حد تک اس سے خوف کھاتے ہیں کہ اس کے حلف کو قرآن اور رسول کی حلف سے بھی مقدس تصور کرتے ہیں۔

سرکش سردار

بلوچستان کے سردار طاقت کے نشے میں یہاں تک سرکش ہو گئے تھے کہ وہ حکومت پاکستان کو خاطر میں ہی نہیں لاتے تھے چنانچہ پچھلی حکومتوں کے خلاف سرداروں نے پہلی بار ۱۹۵۹ء میں اور دوسری بار ۱۹۶۳ء میں بغاوت کی اور دونوں موقعوں پر

بلوچستان میں صبح نو

نرسودہ سروداری نظام کا خاتمہ



دو بلوچ معززین سروداری نظام کے خاتمے پر اپنے تاثرات کا اظہار کر رہے ہیں

ایک معراور معزز بلوچ اپنے تاثرات پیش کر رہے ہیں



ظلم و استحصال کی زنجیروں ٹوٹ گئیں



ایک نجی جیل خانہ کی بمیانگ کوٹھری

جیلوں کی کھڑکیوں پر خاردار تار



قرکی سے تاریک سال کوٹھریاں

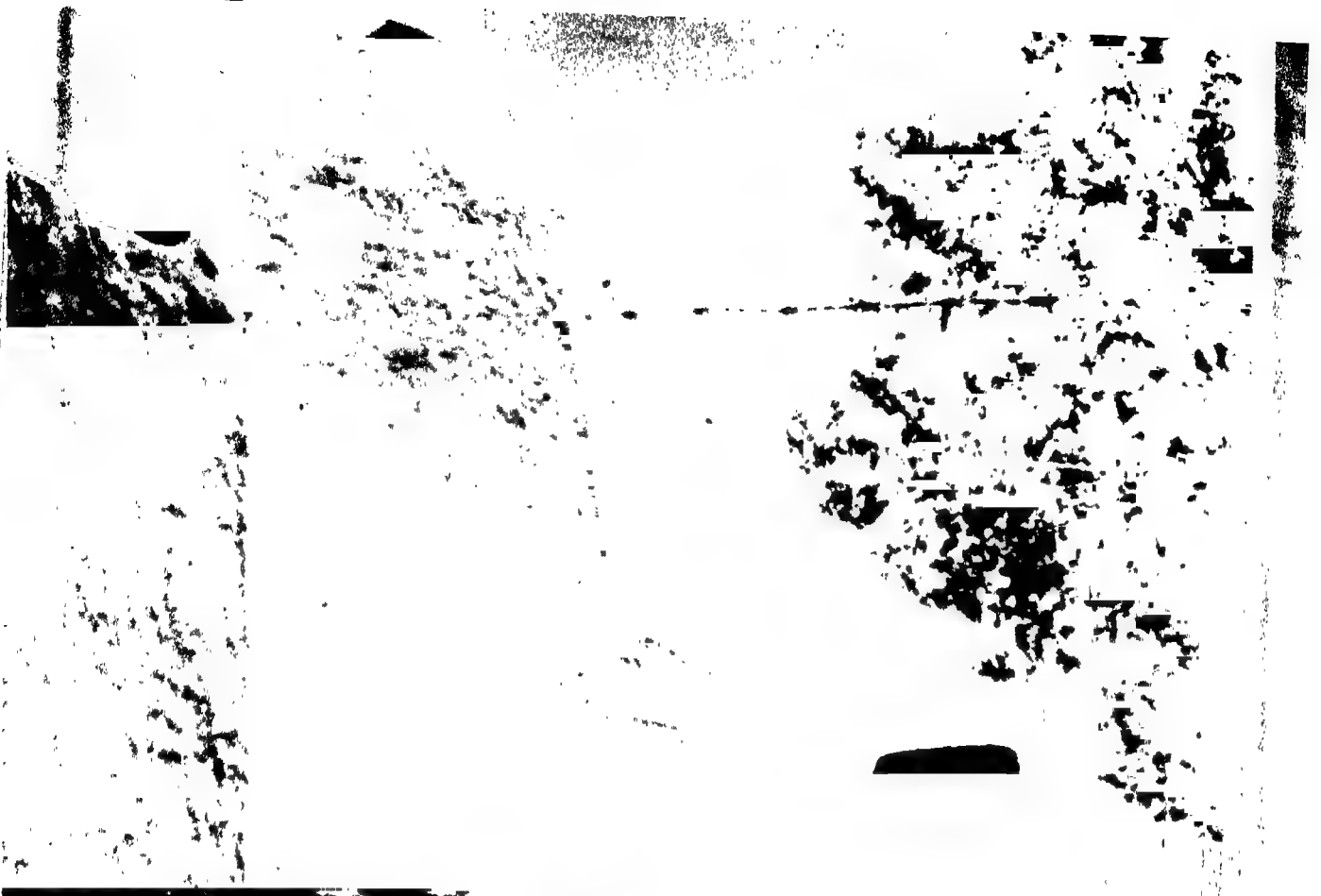


جانوروں کے
سے بدتر جگہ



ایک اور بھیانک زندان





ایک قلعہ میں سردار کا ایک بچی قید خانہ



قلعہ کی حدود میں ایک اور بچی قید خانہ

میں پھیل گئے۔ پندرہویں صدی کے آخر میں بلوچوں کی بحاری اکثریت نے ترکوں۔ منگولوں اور مغلوں کے حملوں سے بچنے کی خاطر کرمان کا رخ کیا اور تلات کے پہاڑی علاقوں تک پہنچ کر آباد ہو گئے۔ سولہویں صدی کی ابتداء میں یہ موجودہ بلوچستان اور سندھ تک پھیل گئے۔ ان کے مشہور قائد میر جاگر خان نے بلوچوں کی سلطنت کی طرح ڈالی تھی۔ جس میں موجودہ بلوچستان کے علاوہ ڈیرہ غازی خان۔ ملتان اور ساہیوال کے علاقے بھی شامل تھے۔ میر جاگر خان کو بلوچ اعظم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بلوچ ایک جفاکش، بہادر، جنگجو اور مہمان نواز نسل ہے۔ بلوچوں کو خانہ بدوش زندگی پسند رہی ہے۔ یہ گھڑ سواری۔ تیراندازی، شکار، سیر و تفریح انشانہ بازی نیزہ بازی اور کشتی لڑنے کے بے حد شائق ہیں۔ بھڑکریوں کے ریوڑوں کے علاوہ یہ عمدہ نسل کے اونٹ اور گھوڑے بھی پالتے ہیں اور ان سے باربرداری اور سواری کا کام لیتے ہیں۔ بلوچ صرف ایسے کھیلوں کے شائق ہیں جن میں شجاعت۔ مردانگی۔ ہمت اور بہادری کا نمایاں پہلو ہو۔ ان کے لوگ گیتوں میں سوت، لڑوگ، حالو، داستانگ، یاد داستان، ملید، زہروگ اور دیہی بہت مقبول ہیں۔ ان کے علاوہ کیلو۔ آمبہ اور موتک بھی عام گائے جاتے ہیں۔ لیکو ساربانوں کا گیت ہے اور آمبہ کرانی پھیروں کا دیہی رومانی گیت ہے اور موتک مرثیہ ہے۔

بلوچوں کا سب سے مقبول لوک ناچ ”چھپ“ ہے جو شادی بیاہ یا عید کے تہوار کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ ان کے موسیقی کے مشہور ساز شے پر جا (ڈھول)۔ سرور (ستار)۔ دمبورگ (سامنگی) نر (دانسری) اور

کے ساتھ اور شمال مغرب میں ایران اور افغانستان کے ساتھ ملتی ہیں، پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۳۴،۵۲۰ مربع میل ہے۔ مگر اس کی آبادی چوبیس لاکھ اکتالیس ہزار سے کچھ متجاوز ہے باقی صوبوں کے مقابلے میں سب سے کم ہے۔ آبادی کی اکثریت بلوچوں کی ہے جو چار سو سے زائد چھوٹے بڑے قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں یہاں پٹھانوں کی آبادی دوسرے درجے پر ہے۔ بلوچ اس صوبے کے مرکزی اور جنوبی حصوں میں اور پٹھان شمالی حصوں میں آباد ہیں۔ بلوچوں کی زبان بلوچی اور پٹھانوں کی پشتو ہے۔ بلوچوں کے مشہور قبیلے مری۔ گبئی، میٹگل، گمسی، دیسانی، زرک زئی اور نوشیروانی ہیں۔

بلوچوں کی تاریخ اور ثقافت

بعض مورخین کے مطابق بلوچوں کا سلسلہ نسب حضرت نوح سے جاملتا ہے۔ مشہور مورخ (RAWLINSON) لکھتا ہے کہ حضرت مسیح سے دو ہزار چار سو سال قبل کے زمانے میں بابل پر ایک شہنشاہ کی حکمرانی تھی جس کا نام نمرود یا بلوس تھا۔ یہ شہنشاہ حضرت نوح کے بیٹے حام کی ساتویں اور ان کے پوتے کش کی چھٹی پشت میں سے تھا۔ اس شہنشاہ کے خاندان والے اپنے آپ کو بلوس (بلوچ) کہتے تھے۔ اور اس شہنشاہ کے پرستش کرنے والوں کو بلوسی (بلوچی) کہا جاتا تھا بلوچوں کے نزدیک یہ بات قرین قیاس ہے کہ یہ وہی نمرود ہے جس نے حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈلوا دیا تھا۔

جب بابل اور شام وغیرہ پر ایرانی شہنشاہ سائرس اعظم نے حملہ کیا تو بلوچ اپنا وطن (شام۔ عراق وغیرہ) چھوڑ کر ایران کے شمالی علاقوں کردستان، گیلان اور آرمینیا میں آباد ہو گئے۔ زیادہ تر آبادی کرمان کے صوبے میں تھی۔ عربوں نے جب ایران پر حملہ کیا تو یہ کرمان چھوڑ کر ایران کے دیگر حصوں

چنگ ہیں -

بلوچی دستکاریاں جن سے بلوچی فن کی نفاست عیاں ہوتی ہے نہ صرف پاکستان میں بلکہ غیر ممالک میں بھی بہت مقبول ہیں۔ ریشی کڑھائی کا کام اور شیشے کا کام کئے ہوئے دستی بیگ، ٹی کوزیاں، بٹوے، چادریں اور خواتین کے لباس کی باہر کے ممالک میں بے حد مانگ ہے اور ان اشیاء کی برآمد سے پاکستان کو لاکھوں روپوں کا غیر ملکی مسکنہ حاصل ہوتا ہے۔

جاگ اٹھا بلوچستان

موجودہ قیادت کے برسرِ اقتدار آتے ہی پاکستان نے جن رفتار سے ترقی شروع کر دی۔ اس کے پیش نظر یہ نہایت ضروری ہو گیا تھا کہ ملک کے تمام پسماندہ علاقوں کی ترقی کی رفتار تیز سے تیز کر دی جائے تاکہ وطن غیر معمولی سرعت کے ساتھ آگے بڑھنے سے قابل ہو جائے چنانچہ اسی خیال کو مد نظر رکھ کر پچھلے دواڑھائی برسوں میں ہمارے قلمبر عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ملکیت، بجلی، صوبہ سرحد، قبائلی علاقوں اور بلوچستان کے طوفانی درے کئے۔ عوام سے مل کر ان کے مسائل دریافت کئے۔ ان کی تعلیمی، اقتصادی، صنعتی، زرعی اور صحت کی پسماندگی کا پچشم خود معائنہ کیا اور حکم دیا کہ ان علاقوں کی ترقی کو اولیت دی جائے اور تمام منصوبے برقی رفتار میں کے ساتھ مکمل کئے جائیں۔

ان احکامات کے صادر ہوتے ہی قومی طور پر منصوبہ بندی کی گئی۔ ہر ذریعہ فنڈ فراہم کئے گئے اور کام نہایت سرعت سے شروع ہو گیا۔ اب بلوچستان نہایت تیز رفتار سے بدل رہا ہے ”کل اور آج اور“ والی بات ہے۔ صوبے کے دور دراز اور دشوار گزار علاقوں میں بھی سڑکیں پہنچ چکی ہیں۔ ان علاقوں

میں اسکول، ہسپتال اور بجلی کی ہوائیں فراہم کر دی گئی ہیں ڈاک اور تار کا مواصلاتی نظام قائم ہو چکا ہے۔ علاقائی تعاون برائے ترقی کی شاہراہ کے منصوبے کے ذریعے جلد ہی کراچی کو کوسٹ سے اور کوسٹ کو ایران سے ملا دیا جائے گا۔ ٹرانسپورٹ کی سہولتوں کے پیش نظر اب سفر میں دقتیں بہت حد تک ختم ہو چکی ہیں۔ اس صوبے کی ترقی کے لئے صوبائی بجٹ کے علاوہ وفاقی حکومت نہایت فیاضی سے فنڈ فراہم کر رہی ہے۔ صوبائی بجٹ پچھلے چند برسوں میں تین کروڑ سے بڑھ کر تقریباً ساٹھ کروڑ تک جا پہنچا ہے۔ صنعتی میدان میں ایک ارب تین کروڑ روپوں کی لاگت سے کپڑے کے دو بڑے کارخانے اور ایک سیمنٹ کا کارخانہ لگایا جا رہا ہے یہ کارخانے حکومت ایران کی امداد سے لگ رہے ہیں۔ موٹر سائیکلوں کے ایک کارخانے نے جو کہ اٹھل میں لگایا گیا تھا موٹر سائیکلیں بنانی شروع کر دی ہیں۔ اسی طرح تعلیم اور صحت کے میدان میں بے پناہ ترقی ہو رہی ہے۔ اب بلوچستان کی اپنی یونیورسٹی اور متعدد کالج ہیں۔ ان میں ایک میڈیکل کالج، ایک انجینئرنگ کالج، ایک ٹیکنیکل کالج، ایک کیڈٹ کالج، ایک کامرس کالج بھی ہے۔ اسکولوں اور ہسپتالوں کے جال بچھا دیئے گئے ہیں۔ تعلیم نہ صرف لڑکوں میں بلکہ لڑکیوں میں بھی عام ہو رہی ہے۔ پینے کے پانی اور آبپاشی کے کسی منصوبے مکمل ہو چکے ہیں اور متعدد ایسے ہیں جن پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ جنگلات کو فروغ دیا جا رہا ہے اور یہاں کی معدنی دولت سے فائدہ اٹھانے کے لئے رات دن کام ہو رہا ہے۔ اب مردانہ نظام کے خاتمے پر زرعی اصلاحات کا نفاذ ہو جائے گا اور لاکھوں ایکڑ زرعی اراضی حاصل کر کے عزیب کا شکاروں اور مزارعوں میں مفت تقسیم کی جائے گی۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو صوبہ بلوچستان پر خاص توجہ دے رہے ہیں کیونکہ وہ چاہتے

جہالت۔ بھوک اور افلاس اور بیماریوں کے خلاف حکومت کے ساتھ مل کر اس وقت تک مقابلہ جاری رکھیں گے جب تک کامیابی نصیب نہیں ہو جاتی۔

بلوچستان میں گیس ہے اور تیل بھی ہے۔ تیل اگر دریافت ہو گیا تو یہ نہ صرف بلوچستان کا نقشہ بدل دے گا بلکہ پاکستان کے اقتصادی ڈھانچے میں بھی ایک عظیم انقلاب لے آئے گا۔ آئیے! ہم سب مل کر تن دہی سے محنت کرتے رہیں تاکہ بلوچستان کے لئے دوسرا سنہرا دن بھی قریب تر ہو جائے۔

ہیں کہ ان کا بلوچستان کو ترقی یافتہ صوبوں کی صف میں شامل کرنے کا وعدہ جلد از جلد پورا ہو جائے۔ تیل کی تلاش جاری ہے۔ پاکستانی اور غیر ملکی فرمیں کروڑوں روپے تیل ڈھونڈنے کے سلسلے میں خرچ کر رہی ہیں اور سرداری نظام کے خاتمے کے بعد جس دن تیل دریافت ہوا وہ دوسرا سنہرا دن ہو گا۔ اس صوبے کے لوگ جاگ اٹھے ہیں اور انہوں نے سدیوں لپیٹے جسی کے دائرے کو توڑ دیا ہے۔ انہیں اب معلوم ہو گیا ہے کہ وہ بھی پاکستانی معاشرے کے اُسنے ہی اہم باشندے ہیں جتنے کہ دوسرے یونٹوں کے۔ چنانچہ آج انہوں نے بھی عہد کر لیا ہے کہ وہ استعمالی نظام

پاک جمہوریت

سالانہ چندہ، دس روپے قیمت فی پرچہ پچاس پیسے

باتصویر دیدہ زیب آفرٹ چھپائی
علمی ادبی معاشرتی اور سیاسی مضامین کا مرقع
سرچی سباق

افسانے اور نظمیں — صفحہ طلباء اور طالبات

پتہ۔ پاک جمہوریت ۶۔ فین روڈ لاہور — ٹیلی فون نمبر ۶۷۴۲۳

معمورۂ اسلام!

(شہر اسلام آباد پہلی نظر میں)

فضل احمد صدیقی

یہ دامن کہسار میں اک شہر نگاراں،
 رعنائیِ فطرت میں فسوں کا رئی انساں،
 تنظیم بہاراں کا سماں چار طرف ہے
 سکد سا سلیقہ کا رواں چار طرف ہے
 خوش رنگ درختوں کی اُٹھان عظمۃ اللہ
 ایک ایک شجر کار چٹان عظمۃ اللہ
 یہ سبزہ خوابیدہ یہ سخاں گل تر
 یا قائم و محمل ہے کہ پھیلی ہے زمیں پر
 بالیدگیِ حسن قطاروں میں مقید
 اک جوشِ نمو لاکھ نظاروں میں مقید
 شمشاد و سمن، سرور سہی راہ نما ہیں
 قامت بھی یہاں جلوہ و قیمت سے سوا ہیں
 تعمیر میں اک جہد مسلسل کی لگن ہے
 صنایعِ پیہم میں بھی عظمت کا چلن ہے
 سڑکیں، روشیں، کنج و خیاباں نظر افروز
 شب تابئی بلور و چراغناں نظر افروز
 گہانگِ حیات آتی ہے جھونکوں سے ہوا میں
 برغیز کے نعروں کی ہے اک گونجِ فضا میں
 آبادیِ اسلام ہے معمورۂ کو سے
 ایمان کے دیئے جلتے ہیں اس مجمع کی نو سے
 محکم ہے یقین شہر کا اور عزم جری ہے
 ہر آن نگہدار یہاں کوہ مری ہے
 تخیل مگر تشہد تکمیل ہے اب بھی
 ہے دھوپ کے دریا میں رواں سایہ شب بھی
 بستی سے خلاؤں کے بھی ڈانڈے سے ملے ہیں
 اس شہر کے شجرے میں بڑے گاؤں پڑے ہیں

قرآن اور اقبال

الیاس رانا

دوسروں کو بھی اس عمل کی نصیحت کرتے تھے کہ "قرآن مجید پڑھتے رہو تاکہ قلب میں محمدؐ کی نسبت پیدا ہو"

علامہ کو قسطنطنیہ کی فکر کی جانب سب سے پہلے ان کے والدین گور نے ان کے اوائل مسرد میں توجہ دلائی تھی۔ ایک دن وہ مسجد کو حسب معمول تلاوت سے کہہ رہے تھے، تلاوت کے بعد ان کے والدین گور

نے ان سے کہا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ قرآن تم پر ہی اترا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔ غالباً اسی واقعہ کے ضمن میں

علامہ اقبال لہنی تصنیف تشکیل جدید الہیات اسلامیہ المعروف خطبات مدراس کے پہلے خطبے میں بیان کرتے ہیں۔

"جیسا کہ صوفیہ اسلام میں ایک بزرگ کا قول ہے کہ جب تک مومن

کے دل پر بھی کتاب کا نزول ویسا نہ ہو جائے جیسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا تھا اس کا سمجھنا محال ہے۔ یاسی خیال کو علامہ اقبال اس شعر میں بیان کرتے ہیں

قرآن پاک کامل صحیفہ ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ قرآن مملو ہے کے لئے خاص طور پر اور تمام دنیا کے لئے عام طور پر کتاب میں ہے۔ قرآن صراطِ مستقیم کی جانب ہمارے رہبری کرتا ہے اور خطبات سے نور کی طرف ہیں لاتا ہے۔ قرآن ہر مسلمان کے گھر میں موجود ہوتا ہے، اکثر گھروں میں طاق پر سجا ہوا رکھا رہتا ہے۔ کچھ گھروں میں اس کی تلاوت بھی کی جاتی ہے مگر چند اور صرف چند اربابِ دل ایسے ہوتے ہیں جو اس کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس کے ہر لفظ اور ہر آیت پر غور کرتے ہیں اس سے اپنے دماغ کو منور کرتے اور اس کی حکمت سے استفادہ کرتے ہیں۔ لیکن ایسے افراد معدودے چند ہی ہوتے ہیں جو اپنے قلب و فکر کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ دوسرے افراد تک اس کا پیغام اس انداز میں پہنچانا اپنا مشن بنالیں کہ کروڑوں بندگانِ خدا اس سے کسب فیض کر سکیں۔

علامہ اقبال ایسے ہی صاحبِ دل مشنری تھے جو اپنی روح کی عین ہرگز سے قرآن کے معانی و معانی کا ادا کرتے تھے خود تلاوت قرآن فرماتے تھے

ترے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کثافت
قرآن سے علامہ کو جو لگاؤ اور شوق تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے
کہتے ہیں :-

شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے
نغمہ اللہ جھومیرے رگ و پے میں ہے
اقبال نے ایک موقع پر سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا :-

"قرآن کا مل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت
ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیاسیات انسانی کے لئے
نام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں
فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔"
ایک اور موقع پر الہیات اور قرآن کے یہی تعلق کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر
نکلسن کو لکھتے ہیں۔

"قرآن صرت الہیات کی کتاب نہیں بلکہ اس میں انسان کے معاش اور
معاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے پوری قطعیت سے کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے
کہ اسکا تعلق الہیات ہی کے مسائل سے ہے۔"
لیکن اس کے ساتھ ہی وہ قرآن کو ایک - نئے زاویہ نگاہ سے پڑھنے
اور سمجھنے کا درس دیتے ہیں۔

"قرآن کو اس زاویہ نگاہ سے منٹ پڑسکر کہ ہمیں فلسفے کے مسائل بھلنے
لگا۔ اسے اس زاویہ نگاہ سے پڑھو کہ اللہ تعالیٰ نے میرا کیا رشتہ ہے اور کائنات
میں میرا کیا مقام ہے؟ قرآن اس لئے ازل ہوا ہے کہ وہ انسان میں خدائے
ربط قلبی کا اعلیٰ شعور پیدا کرے تاکہ انسان اس ربط کی بدولت مشیت ایزدی
سے ہم آہنگی پیدا کر سکے۔"

اس خیال کو خطیادول میں یوں بیان کرتے ہیں۔

"قرآن مجید کا حقیقی مقصد تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر ان گوناگوں
روابط کا ایک اعلیٰ اور بزرگ شعور پیدا کرے جو اس کے اندر کائنات کے
درمیان قائم ہیں۔"

قرآن کے مطالب پر صدیوں سے غور و فکر جاری ہے اور یہ سلسلہ
اب تک جاری رہے گا۔ یہ ایک ایسا چشمہ ہے جو کبھی خشک نہیں ہو سکتا۔
اس سے بے شمار تشنگان نے اپنی سیرابی کی ہے اور ان گنت افراد اس
سے قیضیاب ہوئے ہیں اسی خیال کی جانب اقبال توجہ دلائے گئے کہتے ہیں،
"جس قدر انسان کا ذوق و وجدانی اور اخلاقی و روحانیت پر تکیہ کرتے
جانبیں گے اس قدر اس پر قرآن کے مطالب اُشکاد ہوتے جائیں گے۔"
اقبال کو قرآن سے جو عقیدت تھی اس کے متعلق مرزا جلال الدین
بیرسٹر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

"مطالب قرآنی پر ان کی نظر ہمیشہ رہتی۔ کلام پاک کو پڑھتے تو اس
کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے بلکہ نازک کے دوران میں جب باوازی بلند
پڑھتے تو وہ آیات قرآنی پر فکر کرتے اور ان سے متاثر ہو کر رو پڑتے۔
ڈاکٹر صاحب کی آواز میں ایک خاص کشش تھی جب وہ قرآن پاک کو باوازی
بلند پڑھتے تو سننے والوں کا دل پگھل جاتا۔"

علامہ کے نزدیک قرآن کو سمجھنے اور اس کی تفسیر لکھنے کے لئے عربی
زبان و ادب میں خاطر خواہ استعداد اور عرب قدیم کے علمی سرمایہ پر نگاہ اٹھانے
کے ساتھ بلند سی علم ہونا ضروری تھا اس کے متعلق ان کو
اکثر شکوہ رہتا تھا کہ مسلمان عربی زبان سے بیگانہ ہیں۔ ایک نئے نئے پر علمانہ رویہ
"قرآن اس اعتبار سے بڑا ہی مظلوم صحیفہ ہے کہ جسے دنیا میں اور کوئی
کام نہیں ملتا وہ اس کے ترجمہ و تفسیر میں مصروف ہو جاتا ہے حالانکہ یہ نہایت
ہی اذک اور محتاط ذمہ داری ہے۔"

اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس جانب اشارہ بھی کیا ہے :

احکامِ قرآن حق ہیں ، مگر اپنے مفسر

تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پازند !

اقبال کے نزدیک مومن کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی روشنی میں اپنے آپ کو ڈھالے۔ جناب
سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم قرآن ناطق تھے اس لئے اقبال کہتا ہے کہ مومن
کو بھی آپ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرنی چاہیئے،

نام طریقت ہے۔

روزگار فقیر جلد اول کے صفحہ ۱۸۳ پر درج ہے کہ علامہ یوسف سلیم
چشتی نے سوال کیا کہ آپ کے فلسفہ خودی کا ماخذ کیا ہے تو علامہ نے فرمایا
کہ یہ آیت استحکام خودی پر دال ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا تَقْتُلُوا
مَنْ هَلَكَ إِذَا هَلَكَ نَفْسُكُمْ إِلَى اللَّهِ مَوْجِعُكُمْ جَمِيعًا
فِي نَفْسِكُمْ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (سورۃ مائدہ آیت ۱۰۵)

اقبال کے ہاں خالق اور مخلوق کی خودی الگ الگ ہیں البتہ خالق کی
خودی سے مخلوق کی خودی منسل ہونے کی پیہم کوشش کرتی ہے اور کاملین کو یہ
مقام بھی میسر آجاتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
اقبال نے کیا خوب کہا ہے میں تو شراب والا ہوں گا گوید ہوں چکا ہوں
یہ شعر ملاحظہ ہو:-

شا دیا مرے ساتی نے عالم من و تو
پلا کے مجھے سے لالا اے اے جو
یرے پی کر اقبال کی لے اور نے ہندی نہ رہی مجازی ہو گئی اور
توحید کا جلوہ سایہ ننگن ہو گیا۔

خودی کا ستر نہاں لا اے اے
خودی ہے تسخ نال لا اے اے

قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" اور اس کے ساتھ ہی سورہ
بج میں آیت ہم میں تو ہے تو زمین کو خشک دیکھتا ہے پھر جب ہم اس پر
پانی نازل کرتے ہیں تو پہلے اور ابھرے لگتی ہے اور قسم قسم کی نفیس چربی
اگاتی ہے۔ اس قرآنی حکمت کو الارض للہ کے زیر عنوان بالی جوبیل میں بیان
کرتے ہیں:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن

تماری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

قرآن کریم جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کائنات میں ارتقائی کشش
جاری ہے۔ اسلام رجائیت کی تعلیم دیتا ہے فزویت کی نہیں۔ اسلام کردار
کی تعمیر میں جدوجہد کی ضرورت پر زور دیتا ہے لیس للسان الاما معنی کا
درس دیتا ہے۔ اسلام میں زندگی کو فعال اور با عمل گزارنے کی تعلیم ہے لیکن
بعد ازاں ہمارے صوفیائے کرام نے کچھ تو وقتی تقاضوں کی خاطر اور کچھ عیسائی
رجائیت سے متاثر ہو کر ترک دنیا کی تعلیم دین شروع کر دی جو کہ اسلام کی دنیا
کے خلاف تھی اسی رجحان کے خلاف اقبال کہتے ہیں۔

اس قرآن میں ہے اب ترک جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہر و دیں کا امیر !

نیکوہ میں اقبال نے خدائے تعالیٰ سے امت مسلمہ کی زبوں حالی اور
خواری کا شکوہ کیا ہے لیکن جواب شکوہ میں اس خواری کے وجوہ بیان کئے
ہیں۔ مسلمان بیتی میں اس لئے جاگے ہیں کہ انہوں نے تعلیمات قرآنی سے
روگردانی اختیار کر لی ہے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک و فداں ہو کر

اقبال کا بحیثیت شاعر ایک نہایت بلند مقام ہے۔ ان کی اردو اور
فارسی شاعری کو نہ صرف اسلامی حاکم بلکہ یورپی اور ایتھان حاکم میں امتیازی
حیثیت حاصل ہے ان کے کلام کا کئی غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے ان
کے نظریہ خودی پر بہت بحث کی گئی ہے اس پر تنقید بھی کی گئی ہے اور دلو
تحسین بھی ملی ہے۔ اقبال کے نظریہ خودی کے متعلق بہت سی متضاد باتیں کہی گئی
ہیں کوئی اسے نطشے کے خیالات کا عکس قرار دیتا ہے تو کوئی برگساں اور
دلیم جیمز کے نظریات کی پرچھائیں بتاتا ہے خودی کا مطلب احساسِ فرمن
معرفت حق اور تعین ذات ہے اور اقبال کے نزدیک خودی کا عکس نال
نران کے سوا اور کہیں نہیں چنا چر ان کے نزدیک حدود خودی کے تعین
کا نام شریعت، اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا

آپ نے مطلب بتانے سے انکار کر دیا۔ وجہ پوچھیں تو فرمائی گئے
”میں مطلب بتا کر تمہیں مقید نہیں کرنا چاہتا۔ ہو سکتا ہے کہ تم مجھ سے اچھا
مطلب نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ۔“

ایک دن میں قرآن حکیم کی تلاوت کر رہا تھا جب میں اس آیت پہنچا
”تحقیق ہم نے تمہاری طرف کتاب نازل کی جس میں تمہارا ذکر ہے“
تو مندرجہ بالا شعر کا مطلب واضح ہو گیا۔ قرآن حکیم انسان کی ترجمانی
کرتا ہے ”مناہین“ ہیں تو ہم، انعت علیہم ہیں تو ہم مغضوب علیہم ہیں تو ہم۔
قوانین خداوندی پر ایمان لاکر اس کی کرم نوازیوں سے شاد کام ہوتے ہیں تو
ہم ان سے سرتابی کر کے نامراد یوں سے ہم کنار ہوتے ہیں تو ہم۔

اقبال کے کلام میں سے اگر ان اشعار کو لے لیا جائے جو آیات قرآنی
کے تراجم ہیں یا تفسیریں ہیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اقبال نے کہا
جہاں تک میرا اپنا مطالعہ قرآن ہے، اسلام کا مقصد اتنا ہی نہیں کہ افراد
کی اخلاقی اصلاح کر دی جائے، اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ سمدیہ کی مگر نیل
انقلاب بنی نوع انسان کی پوری اجتماعی زندگی میں برپا کیا جائے اور فوجی
ونسلی زلویہ فکر کو بدل کر ان کی جگہ خالص انسانی شعور و احساس پیدا کیا جائے۔
کیا اس امر سے انکار ممکن ہے کہ اقبال نے قرآن کے انقلابی پیغام
کو اپنی شاعری کی بنیاد بنایا ہے۔ اقبال نے وطنیت کے بت کو پاش پاش کیا۔
فرنگی تہذیب کے ظلم کا پردہ چاک کیا۔ اور مسلمانوں کو درس دیا کہ وہ آپس
میں متحد ہو جائیں۔ انہوں نے ملت بیٹا کے سامنے اپنے خطبات کذریعہ
فتراتی تعلیمات کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اتحاد بین المسلمین کا قہر
وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں تفرقت ڈالو

سے لیا ہے۔ اسی تصور کو وہ شعر کی زبان میں کہتے ہیں۔

ایک ہوں مسلم وطن کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابناک کا شغور

اور یہ اتحاد و وطنیت پرستی کے مروجہ سیاسی مسکوں اور نظریات کی بنا
پر رکھی نہیں ہے بلکہ یہ قرآنی احکامات کی پابندی کرنے اور تعلیمات قرآنی پر

پالتا ہے نیر کو مٹی کی ستار کی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے صاب؟
کون لایا کھینچ کر دیکھم سے باد سگوار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا یہ نور آفتاب؟
کس نے بھری مریںوں سے خوشہ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خجئے انقلاب؟
وہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!
تیرے ابا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

اقبال نے نہ صرف خودی کا تصور قرآن سے لیا بلکہ انہوں نے حاجی اقبال نے
سے استفادہ حاصل کر کے اس کی روح کو اپنے شعروں میں سمو دیا ہے اقبال
کے اشعار قرآن کی آیات کی تفسیریں ہیں۔

سراج تناسل اپنے معنوں دانائے راز میں اقبال کے کلام کے اس
پہلو پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں۔

”کلام اقبال بطور خاص مطالعہ کرنے سے بلاشبہ یہ حقیقت سامنے آجاتی
ہے کہ آپ نے جو کچھ سمجھا قرآن حکیم سے سمجھا اور آپ کی شاعری کا اصل مدعا
صرف یہی ہے کہ قرآن کے بصیرت افروز پیغام کو دنیائے انسانیت میں عام
کر دیا جائے۔ آپ کی مسلسل سعی کا یہ اثر ہوا ہے کہ اربع سینکڑوں ادیبان فکر
اقبال کا مطالعہ قرآن کی روشنی میں کرتے ہیں اور ان کی رائے ہے کہ کئی بار لیا
ہوا کہ قرآن کے کسی مشکل مقام پر پہنچ کر دیکھ گئے تو آپ کے ایک شعر نے ذہن
میں بجلی کی طرح کوئٹہ کر صبح راستے کی طرف راہنمائی کر دی اور اگر آپ کے کسی
شعر میں الجھن پیدا ہوئی اور مطلب سمجھ میں نہ آیا تو قرآن حکیم کی کسی آیت نے
اسے واضح کر کے ذہن نشین کر دیا۔“

”ایک مرتبہ راجہ حسن اختر مرحوم و معذور کی خدمت میں حاضر تھا
گشتگو کا موضوع کلام اقبال تھا۔ راجہ صاحب نے فرمایا کہ چند دن ہوسنے میں
نے غلام صاحب سے اس شعر کا مطلب پوچھا ہے

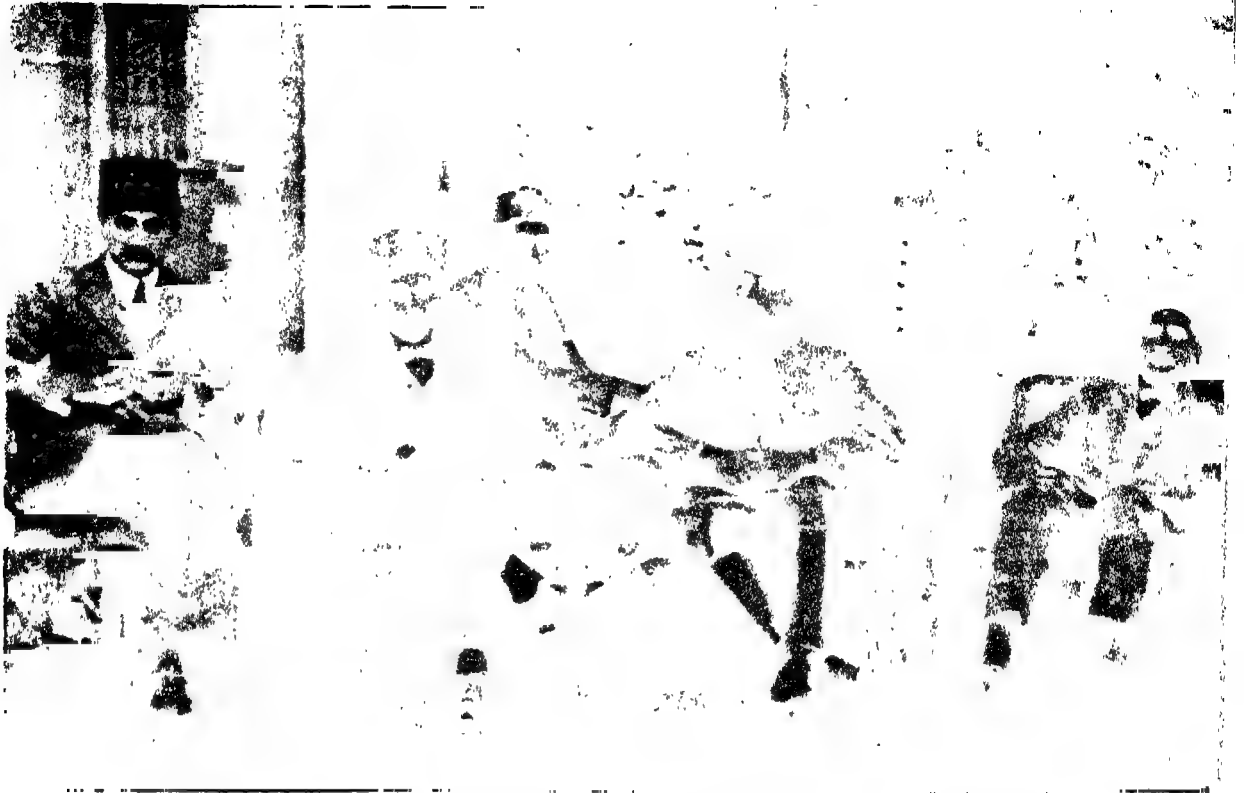
محمد بھی تھا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف تیسری ترجمان تیرا ہے یا میرا

مری نواسے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ اُتشِ اشامی
(اقبال)

علامہ اقبال معروف مطالعہ



علامہ اقبال کے والد بزرگوار شیخ نور محمد



مولا نواز قبال افغانستان کے ہر ایک سلسلے سردار عبدالقدوس کے ہمراہ

گول میز کانفرنس میں علامہ قبال مولانا شوکت علی کے قریب بیٹھے ہیں





گول میز کانفرنس کی ایک در تصویر میں علامہ اقبال بھی شریک ہیں

علامہ اقبال حیدر آباد دکن میں (۱۹۲۹ء)



اسپین کی مسجد قرطبہ میں
علامہ اقبال معروف عبادت



علامہ اقبال
دورہ کابل کے موقع پر
سربراہ مسعود کے
بمراہ

عل پیرا ہوتے سے ممکن ہو گا۔ قرآن سے روگردانی کرنے سے تو مسلمان ہی
تام نہیں رہ سکتی۔ ایسے میں اتحاد بین المسلمین کا کیا سوال؟
مگر تو میخا ہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ فتنہ آن زیستن

اقبال کے فارسی کلام میں بھی جا بجا اردو کلام کی طرح قرآنی بصیرت
کا پرتو نظر آتا ہے ان کے کئی فارسی اشعار آیات قرآنی کی تفسیر ہیں۔ ایسی
چند مثالیں درج ذیل ہیں:

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ
بے شک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے
اقبال کے اشعار ملاحظہ ہوں،

لا اله الا الله صدف، گو ہر نماز
قلب مسلم راجع اصغر نماز
در کتب مسلم مثال خنجر است
قاتل فحشا و بغي و منکر است

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي هُوَ الْغَنِيُّ
لے لوگو تم (بھی) خدا کے محتاج ہو اور اللہ تو بے نیاز
(اور خود تمام) خرمیوں والا ہے۔
اقبال اس کی تفسیر بیان کرتے ہیں:-

بے نیازی رنگ حق پوشیدن است
رنگ غیر از پیرہن شریفیدن است
برسرای باطل حق پیسیدن
تینغ لا موجود الا ہو، بزین

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا
وہ ذات پاک ایسی ہے، جس نے پیدا کیا تمہارے
قائدے کے لئے جو کچھ زمین میں موجود ہے سب کا سب۔
کلام اقبال پر غور کیجئے:

من تجویم در گذر از کاغ و کو
دولت تست این جهان رنگ و بو
دانه دانه گو ہر از خاکش بگسید
میدچوں شاہیں ز افلاکش بگسیر

اقبال کے کلام میں کئی تراکیب قرآنی قصص سے ماخوذ ہیں اور کئی
قرآنی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں ان میں چند ایک لا اله الا الله، تم باذن اللہ،
چوب کلیم، موسیٰ و فرعون و طور، نعرۃ لاتذر، شریک ذمہ لا قبولہ، آتش قہر
براہیم کا ایال، لوح و قلم، اللہ ہوا جیسے الفاظ اور تراکیب بطور مثال ہیں۔
اقبال نے قصہ آدم کے قرآنی حقائق کی نہایت ہی عجیب، دلکش اور
روح پرور جذبہ کے ساتھ تفسیر بیان کی ہے۔

قصہ ہبوط آدم کی تفسیر انہوں نے خطبات مدلس کے تیسرے خطبے
ذات البیہ کا تصور اور حقیقت دعائیں کی ہے لیکن اس کا انداز فلسفیانہ ہے جبکہ
بال جبریل میں شاعرانہ اور عارفانہ انداز میں اس کی تفسیر موجود ہے۔ فرشتے
آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

علا ہونی ہے تجھے روز و شب کی بے تابی
خبر نہیں کر تو خاک ہے یا کر سیما بی
ستا ہے خاک ہے تیری نمود ہے لیکہ
تو کی سرشت میں ہے کو کبھی و جہتانی
ہبوط آدم کے بعد، روح ارضی آدم کا استقبال عجیب والہانہ انداز
میں کرتی ہے۔

کھول آنکھ، زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوہ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکہ بین و رجا دیکھ
ہیں تیرے تھوڑے ہیں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضا میں

اور اقبال کو صحیح معنوں میں اسم یا سہمی بنانے میں قرآن حکیم کا نہایت ہی اہم اثر ہے۔ قرآن کی جھلک اقبال کی زندگی اور اس کے کلام اور تحریروں میں نمایاں ہے۔

اقبال نے خود قرآن کے متعلق اپنی فارسی شاعری میں جو کچھ کہا ہے اس میں چند چیدہ چیدہ نمونہ کلام پر میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔

نقش فتداں تا دریں عالم نشست
نقش ہائے کاہن و پاپا شکست

جز بہ تران ضیعی رو باہی است
فقر قرآن اصل شاہنشاہی است

قاض گویم آنخپہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چہیزے دیگر است
کلام اقبال میں قرآن پاک پر علامہ نظم "کتاب زندہ" پر مضمون کے لائق ہے اس کا آخری شعر ہے۔

نوع انساں را پیام آخرین
حابل او جمۃ للعالمین

یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ !

سچے کا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے!
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے تاشے!
ناپید ترے بحر تھیل کے کتاشے!
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے ٹرائے!
تعمیر خودی کو اثر آو رسا دیکھ !

عقد شد جہاں تاب کی ضو تیرے شر میں!
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں!
مجھے نہیں بچنے ہوئے فردوس نظر میں!
جنت تری پنہاں ہے تمہے خون جگر میں!
اسے پیگہ گل کو شش پیہم کی جزا دیکھ!
اقبال کی شخصیت اور خیالات اور احساسات پر قرآن نے نہایت ہی گہرا اثر ڈالا ہے۔ اقبال کو مرد قلندر کا خطاب دہلنے، اس کو ایک شکر شاعر بنانے، اس کی شخصیت میں ایسی بے نیازی پیدا کرنے پر (چرچا ہے شاہوں میں تیری بے نیازی کا)

اقبال کا فلسفہ علم و عشق

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

کا اُساسی عنصر کون سا ہے؟۔ اور اس میں یہ نظم و نسق اور حسن کیسے پیدا ہوا؟ کسی نے پانی کسی نے خاک، اور کسی نے آگ کو بنیادی جوہر قرار دیا۔ اس نگرین رفتہ رفتہ لطافت آتی گئی اور فیثاغورث نے اعلان کیا کہ یہ نظریہ ریاضی کا ایک کھیل ہے۔ اور یہ مختلف اشیاء ریاضیاتی اعداد و تناسب سے وجود میں آئی ہیں بسقراطہ، افلاطون اور ارسطو کے ہاں حقیقی وجود صرف عقل کا ہے۔ اور کائنات کے خارجی مظاہر فریب نظر ہیں، فلسفہ آج بھی یہی کچھ کہہ رہا ہے۔ یعنی مسائلِ حیات کو الجھا رہا ہے۔ ہماری حیرت (تفکیک و تذبذب) میں مزید اضافہ کر رہا ہے۔

خود واقف نہیں ہے نیک و بد سے

بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی سے

اقبال یہ نہیں کہتے کہ عقل بیکار محض ہے بلکہ وہ اس پر زور دیتے ہیں کہ عقل سے وہی کام لیا جائے جو وہ کر سکتی ہے۔ مثلاً کائنات میں غور و تدبیر، ایجاد و تحقیق، عناصر کی تسخیر، فضا اور روشنی سے توانائی حاصل کرنا۔ طاقتور آلاتِ سمعی و بصری کی ایجاد سے سمیع و بصیر بننا علوم و فنون میں اضافہ تہذیب و تمدن کی رفتار کو قائم رکھنا و تسلسل ہذا۔ علم و خرد سے حقیقتِ حیات دریافت کرنا اور اس امر کے متعلق کچھ پوچھنا جس نے کائنات کو ایک رشتہ وحدت اور یکپارچگی

نتائج کے لحاظ سے اقبال کے ہاں علم و عقل ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ بازی گاہِ حیات میں دونوں پٹنے رہے۔ عہد جتنا ہے رومی ہمارے رازی تحملِ لبالی یک صورتِ رومی کا ہاتھ پہنچا۔ اور عہد بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم ہر برٹ اسپنسر کا قول ہے:

KNOWLEDGE ENDS IN WONDER

”علم و آگہی تجیرِ ختم ہو جاتے ہیں،

”دنڈ سے“ مراد حیرت۔ تفکیک اور تذبذب ہے یہی علمِ بے عشق کا

مائل ہے۔

ان کو راز جو بنا یا

رازِ آس کی نگاہ سے چھپایا

بیٹا ہے ذوقِ آگہی کا

کھلتا نہیں بھیدِ زندگی کا

حیرتِ آغاز و انتہا سے

آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

فلسفہ لا انتہا زما نوں سے یہ سوال پوچھ رہا ہے۔ کہ اس کائنات

نظم و نسق میں باندھ رکھا ہے، ایسا ہی ہے جیسے کسی انجینیر سے کوئی پوچھے۔
کرملیر یا کالرا، اور ٹی بی کے جراثیم میں کیا فرق ہے؟
اس دنیا میں ایک بھی ایسا حکیم و فلسفی موجود نہیں۔ جریر بتا سکے
کہ حیات کیا ہے؟ کہاں سے آتی ہے۔ اور موت کے بعد کہاں چلی جاتی ہے؟
یہ تو آخر بڑے بڑے مسائل ہیں۔ یہاں تو اتنا بتاتے والا بھی کوئی نہیں۔ کہ
نہیں کیا ہے اور جمائی کیا؟ فکر کیا ہے اور نظر کیا؟ ان حالات میں ہم عقل کو
کیوں راہبر بنائیں؟

عشق کی حقیقت

کائنات کی سب سے بڑی حقیقت خدا ہے۔ جو قوت۔ روشنی۔ جمال
اور جلال کا ماحذول ہے۔ اس کا قرب تو انائی و عظمت عطا کرتا ہے اور بعد
اسی طرح ناچیز و حقیر بنا دیتا ہے، جیسے کوئی قطرہ سمندر سے اچھل کر ساحل کی
ریت پر آگرے اور وہیں فنا ہو جائے۔

اللہ سراپا خیر ہے۔ اور صرف خیر کو پسند کرتا ہے۔ حدیث میں وارد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ جَبِيْلٌ وَّيُحِبُّ الْجَمَالَ

(خدا جمیل ہے۔ اور صرف جمال کو پسند کرتا ہے)

انسانی عمل میں کچھ برے ہیں۔ مثلاً ظلم، بدکاری، چوری وغیرہ
اور کچھ اچھے مثلاً خدمت، محبت، عبادت، دیانت وغیرہ، ہر اچھا عمل
حسن ہے جو عامل کو حسین، عزیز اور عظیم بناتا ہے۔ اللہ ایسے ہی لوگوں کو
پسند کرتا اور حضور پر کی اجازت دیتا ہے۔ اچھے عمل سے ایک قسم کی فرحت
جنم لیتی ہے۔ جو بڑھنے لگے تو سوز و گداز میں بدل جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے
جہاں حیات کچی جان اور کچی تسلیم جان کہلاتی ہے۔ جہاں ناز و نمود و گلستاں
ہیں جاتے ہیں۔ جہاں زندگی کا سیلاب تمام رکاوٹوں کو پھیلا تگ کر منزل کی
طرف بے عبا بڑھنے لگتا ہے۔ اور جہاں:

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کے ہاتھ

غالب و کارا فرس، کارکش، کارساز

عصر رواں اس حقیقت سے غافل ہے کہ جسم کیفیات روح سے

دبدم متاخر ہوتا ہے غم سے چہرہ مرجھا جاتا ہے اور خوشی سے چمک اٹھتا ہے
ہمارے عمل چہرے پر کچھ اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ ایک شرابی
جواری، چور، ڈاکو اور حرام کھانے والے کی صورت اتنی مسخ ہو جاتی ہے
کہ اسے دیکھ کر نفرت و کراہت ہوئے لگتی ہے۔ دوسری طرف ایک راستباز
عابد اور خدا ترس کا چہرہ اتنا دلکش حسین اور جاذب بن جاتا ہے جیسے
اس کی جبین میں چاند و دُوب رہا ہو۔

تعصّبہم بسبب ماہم (بقہ ۲۶۳)

(تم انہیں ان کی جبینوں سے پہچان لو گے)

انسانی صورت و شخصیت اعمال و انکار کے سلسلے میں پیہم طبعی

رہتی ہے۔ اعمال اچھے ہوں تو صورت بھی جمیل ہو جاتی ہے ورنہ
تبیح بن جاتی ہے۔ یقین نہ آئے تو اپنے بدکاروں، بے نمازوں اور
اوباشوں، شرابیوں کی شکلیں دیکھو۔ یا لمحدوں کے کھر دے چہرہ
پر نظر ڈالو۔ ساتھ ہی کسی پارہ سا کے چہرے پر بھی ایک ہنگامہ ڈال لو
آپ پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ جسمانی حسن حسین روح سے جنم لیتا ہے
دہریوں نے خدا کا انکار کر کے اور مغرب نے عملاً خدا کو حرم دل سے
نکال کر خود کو مایوسینوں کے سمندر میں ڈبو لیا ہے اور اپنے جسموں
میں قبا حنین بھری ہیں۔

دانشِ مغرب حجابِ اکبر است

بن پرست و بت فروش و بت گراست

ہا زندانِ مظاہرِ بستہ

از حد و دیرِ برونِ تاجستہ

در صراطِ زندگی از پافتاد

بر گلوے خویشیِ خنجر نہاد

سکون و مسرت کا سرچشمہ ایک مطمئن روح ہے۔ اور

روح کو اطمینان اللہ کے ذکر سے ملتا ہے۔ ذکر الہی سے غافل انسان

کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا، خواہ وہ کسی ریاست کا سربراہ کیوں نہ ہو

اور نہ وہ دنیا کو آرام و راحت پہنچا سکتا ہے۔ دوسروں کو راحت صرف

بقول اقبال:

پائے در زنجیر تو جہات عقل
کشتیش طوفانی ظلمات عقل
موسمی بریجا نہ سینائے عشق
بے خبر از عشق داز سودائے عشق

پھر ان کی ملاقات حضرت شمس تبریزی سے ہو گئی اور ان کا علم عشق
میں بدل گیا۔

امام غزالی (۱۱۱۱ء) بھی اس کشمکش میں مبتلا رہے (المنقذ من الضلال)
خود اقبال بھی برسوں یہ سوچتے رہے کہ وہ سوز و روی کو اپنائیں یا پیچ و تاب
رازی کو۔ اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے:

من بندہ آزادم عشق است اما من
عشق است اما من عقل است غلام
عشق کا سرمایہ عزم و یقین ہے اور عقل کا وطن تجھیں۔ عقل کی پرداز
آسان تک ہے اور عشق کی لامکان تک:

عشق سلطان است و برہان مبیں
ہر دو عالم عشق را زیر نگین
عشق با تان جوین خیمہ کشاد
عشق در اندام مہ چاکے ہناد
کویہ نمرود بے ضربے شکست
شکر فرعون بے حربے شکست

اقوام مغرب

اقوام مغرب عشق سے محروم ہو کر بہت کچھ کھو چکی ہیں ان سے سکون
قلب چھین گیا۔ وہ اُس سوز و ساز جذب و شوق اور سرور و مستی سے
بیگانہ ہو گئیں جو حیات کا مقصد بھی ہے اور حاصل بھی۔ انہیں نہ نازک
دولت ملی نہ نیازی۔ ان کے پاس صرف علم ہے۔ برکش اور باطنی علم۔
جو انسانی لبتیوں پہاگ اور موت برساتا ہے اگر ساتھ عشق بھی ہوتا

خدا کی ہدایات پر عمل کرنے سے پہنچ سکتی ہے جو شخص اللہ سے کٹا ہوا ہو۔ سانی
قدروں سے نا آشنا ہو جزا و سزا کا قائل نہ ہو اور صرف دنیوی مال و
منازع کو سب کچھ سمجھتا ہو وہ دوسروں کے آرام کا خیال کیوں رکھے گا؟
وہ انسان کیسے کہے گا؟ اور خواتین کو کیوں مقدس و محترم سمجھے گا؟

عصر حاضر را خرد زنجیر پاست
جان بے تالے کہ تو خواہی کجاست
از درون این گلے بے حاصل
بس غنیمت داں اگر روید دے

انسان اشرف المخلوقات ہے وہ خدائے ماعلا و برتر کے سوا کہیں اور
سرمیں جھکا تا۔ مغربی مادیت نے طرح طرح کے صنم تراش لئے ہیں اور
انسان کو رب العرش کی عبادت سے ہٹا کر پیٹ پوجا پر لگا دیا ہے یہ اسکی
انتہائی توہین ہے۔ بے شک روٹی کما نامرغ ہے لیکن روٹی کی عبادت
کفر ہے انسان کی عظمت و غیرت روٹی سے نہیں بلکہ:
خودی کا سیر نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فان لا الہ الا اللہ

علم و عشق میں فرق

توانائی کے آغاز دو ہیں اول تو کائنات۔ جو مختلف توانائیوں
مثلاً فولاد کو تیل وغیرہ کا ستور و دم ہے۔ دوم رب کائنات۔ کائنات کے
محازن تک صرف علم کا ماتہ پہنچ سکتا ہے۔ اور کوئی بے علم ان سے فائدہ نہیں
اٹھا سکتا۔ رہا رب کائنات تو اس کی خلوت میں صرف عشق (یعنی اطاعت
عبادت) ذاتی جبین سائی اور ایمانی) جاسکتا ہے۔

عقل گو آستان سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

علم زندگی کا جلال ہے اور عشق جمال، دونوں مل جائیں
تو حیات کمال حاصل کر لیتی ہے۔

اقبال کے مرشد حضرت رومی برسوں صیاد عقل کے نچیر رہے

ماہیچ سہ ماہی، اپریل، ۱۹۷۶ء

کے ہاں ملتی ہے، جیسی کا ایک اور حکیم ہرثو وسعدی سے متاثر تھا۔ شکر نظامی سے راگر شاعر رمی سے اور لان ہیمز حافظ سے درست کہا تھا اقبال نے:

یوں محسوس ہوتا ہے کہ فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا
آدم اور اس کے دہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے اس کا
ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں آئین سٹائٹ اور ہرگساں کی تصانیف

میں ملتا ہے: (دیباچہ پیام مشرق)

اقبال نے ایک مقام پر عقل و عشق کا ایک مکالمہ پیش کیا ہے جس میں
عقل کہتی ہے کہ میں اسرار حیات کھولتا ہوں عقدا ہائے زندگی کو سلجھاتی اور
انسان کو وسیع دھیر بناتی ہوں عشق جواب دہاں کہتا ہے:

چو با من یا ربو دی نور بو دی
تبریدی از من و نور تو نار است

یعنی اے عقل جب تک تو میرے ساتھ رہی تو نور تھی۔ لیکن
مجھ سے کٹ جانے کے بعد تو نار بن گئی ہے۔
اور میرے اس مقالے کا حاصل بھی یہی ہے:

یہ اس کی سرکشی کو روکتا اور اس کے منہ میں لگام دیتا اب ان کے پاس علم کا امرت
نہیں بلکہ زہر ہے:

من درون مشیشہ ہائے عصبر ما ضر دیدہ ام
آنچنان زہرے کہ از دوسے مارم در پیک و تاب
انقلاب ابے انقلاب

یہ تسلیم کہ ہمارے لئے علم اتنا ہی ضرور ہے جتنی غذا و ہوا۔
لیکن علم ایک اسب سرکش ہے جیسے صرف عشق رام کر سکتا ہے۔ اس لئے
عقل و عشق کو جادہ حیات میں ہم سفر ہونا چاہیے۔

عشق چوں با زیر کی ہم بر شود
نقش بند عالم دیگر شود

مغرب کے چند علماء و متشرقین نہ صرف، اشعار مشرق کو مغرب
کی زبانوں میں منتقل کر رہے ہیں بلکہ ان میں سے بعض انہیں اپنا رہے ہیں۔
مشہور جرمن شاعر گوئٹے کا دیوان مغرب شاہد ہے کہ مغرب اپنی بے جان اور
سرد مادیت سے تنگ آکر مشرق سے سوز و حرارت کی بھیک مانگ رہا ہے اسکے
دیوان میں وہی روشنی گرمی اور توانائی پائی جاتی ہے جو حافظ شیرازی اور رمی

اقبال - بحیثیت فارسی شاعر

ڈاکٹر صفحہ صغریٰ بانو شگفتہ

ادب و فن نے بہت کچھ لکھا ہے اور اب تو اقبال کی شہرت وطن کی حدود و ثغور سے ماوراء ہے اور وہ حقیقت میں پورے عالم کی متاع عزیز ہیں تاہم اقبال دوستی میں ایران کو گوئے نسبت حاصل ہے۔ ایران کی زبان فارسی ہے اور اقبال کا بیشتر کلام فارسی ہی میں ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اقبال کی فارسی گوئی پر گفتگو کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر جنوبی ایشیا سے فارسی زبان کے تعلق پر گفتگو کر لی جائے۔

یہ امر مسلم ہے کہ جنوبی ایشیا میں فارسی اور دین اسلام دونوں ایران ہی کی راہ سے داخل ہوئے۔ سندھ میں محمد بن قاسم کا حملہ اور پنجاب میں محمود غزنوی کے حملے اشاعت دین اسلام کی تبلیغ اور فارسی عربی کی ترویج میں ممد و معاون رہے۔ محمد بن قاسم شیراز کے گورنر تھے۔ گو خود عرب نژاد تھے مگر ان کی فوج کا بیشتر حصہ ایرانیوں پر مشتمل تھا جنہوں نے سندھ میں آکر بودو باش اختیار کی۔

غزنوی دور (۹۷۲-۱۱۸۶ء) میں سلطان محمود غزنوی نے جہاد کا ارادہ کیا اور ہندوستان پر متعدد حملے کئے اس نے پنجاب و کشمیر کی تسخیر کی اور یہاں باقاعدہ حکومت قائم کی اور اس سرزمین سے ایسا تعلق استوار کیا کہ جب آخری غزنوی بادشاہ سلطان خسروک

یہ دنیا حقیقت میں ایک ایسی جلوہ گاہ ہے جس کے دامن میں ممتاز شخصیتیں اپنی تمام دانائیوں کے ساتھ چھپی ہوئی ہیں اور پھر مہر درخشاں کی طرح ایک معین وقت پر افق زلیست پر نمودار ہوتی ہیں زندگی کی راہوں کو روشن کرتی ہیں اور آخر غروب ہستی کے بسیر استراحت پر محو خواب ہو جاتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ممتاز ہستیاں ہی زمان و مکان کی زینت ہیں۔ گلشن حیات کی نادر اور پرکشش کلیاں ہیں جو شاہکار جہاں کہلانے کی مستحق ہوتی ہیں اور یہی نہیں یہ ہستیاں تو حقیقت میں رہنمائے بشریت ہیں۔ سرزمین مشرق جی کا حسن سراپا تو رحمت و آغوشِ وحی و الہام اور گہوارہ فلسفہ و ادیان بھی ہے۔ اسی مشرق نے اپنی آغوش میں بے شمار برگزیدہ ہستیوں کو پروان چڑھایا ہے جن میں سے ایک محمد اقبال لاہوری بھی ہیں۔“

جی ہاں یہ گہرے آب و آواز یہ دلہانہ ہر یہ عقیدت کے کلمات ایران کے ایک دانشور ڈاکٹر ابوتراب رازانی کے لبوں سے نکلے ہیں۔ اقبال جیسے عظیم منفرد مفکر کی زندگی اور فکر و فن پر بڑے بڑے علمائے

نے جب غزنہ میں غوریوں سے شکست کھائی تو اس نے لاہور ہی کی راہ اختیار کی چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ لاہور اس دور میں علم و ادب کا مرکز ہونے کی بنا پر غزنی ثانی کہلایا۔

غزنوی دور کے تمام سلاطین دلدادگان علم و ادب اور علوم اسلامی کے سرپرست رہے عصری فرخی، عسجدی، فردوسی اور متوجہری اس دور کے مشہور فارسی شعرا تھے۔ خود اقبال کے اشعار میں متوجہری کی تقلید ملتی ہے۔ فارسی بڑی آب و تاب سے اس خطے میں داخل ہوئی اور بتدریج ترقی کرتی رہی۔ غزنوی حکمرانوں کے بعد بھی سلاطین غوری (۱۲۰۶ - ۱۲۸۸) سلاطین خلجی (۱۲۹۰ - ۱۳۲۰) سلاطین تغلق (۱۳۱۳ - ۱۳۲۰) سلاطین سادات (۱۴۵۱ - ۱۴۱۳) سلاطین لودھی (۱۵۲۶ - ۱۵۵۱) اور سلاطین مغل (۱۵۵۷ - ۱۵۲۶) اس برصغیر پر حکمرانی کرتے رہے اور ان اور ان میں فارسی کشمیر، پنجاب، راجپوتانہ، سندھ، آسام، بہار، بنگال، گجرات، حیدرآباد وکن اور گولکنڈہ تک پہنچ گئی اور اس تمام دور میں فارسی زبان کا ادب اپنے کمال پر پہنچ گیا اور کشف المحجوب تاریخ بہت ہی ترجمہ کیلید و دمنہ سیاست نامہ سیرالملوک، لباب الالباب جیسی کتابیں وجود میں آئیں۔ مغلیہ دور تو علم و ادب کے اعتبار سے سنہری دور کہلاتا ہے۔ مغلیہ سلاطین و شہزادگان بڑے علم دوست، دانش گستر اور بہز پرور تھے۔ انہوں نے ہر طرح شعرا اور ادبا کی سرپرستی کی۔ وہ مناظر قدرت کے بھی بڑے دلدادہ تھے۔ ان کے گرمیوں کے ایام اکثر جنت نظیر کشمیر کی فردوس نظر وادیوں میں گزرتے، یہاں فطرت کی رنگینیوں سے محفوظ و مسرور ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شعر و نغمہ سے لطف لینے کے لئے جوتی کے شعرا اور مغنیوں کو بھی اپنے ساتھ رکھتے۔ چنانچہ اس دور میں شاہوں کی ہم جلسی کا شرف عرفی کلیم صاحب اور غنی جیسے فارسی گو شعرا کو میسر آیا۔

خلاصہ کلام یہ کہ شہر لاہور اور کشمیر کی سرزمین علم و ادب

کے اعتبار سے ہمیشہ زرخیز رہی۔ کشف المحجوب تصوف پر پہلی جامع کتاب ہے جس کے مولف سرمد صوفیاشخ ابوالطین علی بن عثمان بھویری ہیں جنہیں عرف عام میں داتا گنج بخش بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نادر کتاب لاہور ہی میں تصنیف ہوئی۔ اسی طرح کیلید و دمنہ کا پہلو ہی نام کیلگ و دمنگ تھا اور سنسکرت میں اس کا نام کرٹکا و دمنکا تھا۔ اسے نوشتیر و ان علول (۵۷۹ - ۵۳۱) کے زمانے میں اس کا طبیب برزویہ کشمیر سے ایران لے گیا۔ اس اہم کتاب کا فارسی میں ترجمہ ابوالعالی نصر اللہ نے (۱۱۴۳ - ۱۱۴۲) میں کیا۔ بہرہ نوع تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ لاہور اور کشمیر کی سرزمین زمانہ قدیم سے گہر دروازہ پیدا کرتی رہی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے دور استبداد میں بھی کشمیر اور لاہور میں فارسی زبان کی ترویج کرنے والے موجود تھے۔ چنانچہ برصغیر کی تاریخ میں مسلمانوں پر ایک ایسا وقت آیا جب وہ اپنی اجتماعی زندگی کے تاریک ترین دور سے گزر رہے تھے۔ ایسے میں ایک کشمیری برہمن خاندان میں ایک خورشید صبح آفرین طلوع ہوتا ہے۔ جو زیور علم سے مزین ہو کر نہ صرف پوسے مشرق کو بلکہ تمام دنیا کے اسلام کو اپنے آتشین انکار سے روشن و مسنود کر دیتا ہے جس کا نام نامی محمد اقبال ہے۔ یہ وہ دور تھا جبکہ تقریباً تمام مشرق وسطیٰ پر انگریزوں کا تسلط تھا۔ اور مسلمان حکومتیں اپنی شان و شوکت جاہ و جلال کھو بیٹھی تھیں۔ ترک حکومت روہڑوال تھی۔ یونان ۱۸۲۹ء میں ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ بلغاریہ کے نام سے ایک نئی حکومت وجود میں آئی۔ قبرص انگلستان سے جا ملا۔ تہر سوز نے انگریزوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کر رکھی تھی۔ گویا کہ ایشیا پر انگریزوں کا کامل تسلط تھا۔ ایسے میں ہمارے قومی شاعر سیالکوٹی میں آنکھ کھولتا ہے۔ لاہور میں پرورش پاتا ہے اور بقول ڈاکٹر مشائخ فریدانی جو پاکستان میں ایران کے سابق سفیر رہ چکے ہیں اور فارسی زبان کے ایک برگزیدہ دانش مند بھی ہیں

اقبال نے فارسی زبان کو اس دور میں زندہ

سے چار انگوٹھیاں اقبال کو بطور ہدیہ بھیجیں تھیں۔ اگرچہ یہ نظم ان کے مجموعہ کلام میں چھپ نہ سکی مگر اقبال نامہ میں یہ پوری نظم موجود ہے۔ ۱۹۰۴ء تک اقبال نے جستہ جستہ فارسی اشعار کہنے شروع کر دیئے تھے۔ چنانچہ نظم ہلال اور التجائے مسافر میں بھی پہلے بند میں فارسی شعر ملتے ہیں۔ ان کی نظم ”ہلال“ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تیری نظر کو رہی دید میں بھی حسرت دید
خنگ دلی کہ تپید و دمی نیا سائید
تپش ز شعلہ گرفتند و بر دل تو زدند
چہ برق جلوه بخاشاک حاصل تو زدند

اور یہ التجائے مسافر کا ایک شعر ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زار توام
اگر گشادہ جبینم گل بہار توام

یہ توجیدہ چیدہ اشعار تھے مگر فارسی غزل یا مسلسل فارسی

نظم اقبال نے یورپ میں کبھی۔ شیخ عبدالقادر نے مقدمہ ہانگ درا میں ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ اقبال اپنے کسی دوست کے یہاں مدعو تھے جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی خواہش کی گئی۔ اقبال نے یہاں اعتراف کیا کہ انہوں نے اب تک مستقل فارسی نظم کہنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ لیکن اس فرمائش نے ان کے قلب میں ایک ایسی تحریک پیدا کی کہ دعوت سے واپسی پر گھر آئے اور تمام شب فارسی میں شعر کہتے رہے۔ صبح اٹھ کر شیخ عبدالقادر سے ملے اور دو تازہ غزلیں سنا ڈالیں۔ لیکن اس کے بعد فارسی شعر نہ کہہ سکے اور وطن لوٹنے تک (۱۹۰۸ء) تقریباً چار پانچ سال تک ان کی فارسی گوئی پر جمود طاری رہا۔ لیکن راقم السطور کا خیال ہے کہ وہ ان ایام میں اپنے کو فارسی شاعری کے لئے آمادہ کرتے رہے۔ اقبال کے شعری آثار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں فارسی شعرا سے ہمیشہ لگاؤ رہا۔ ان کے کتب خانے میں فارسی اساتذہ کے دواوین ان کی لائبریری کی زینت رہے۔ خود یورپ میں علیہ یکم

کیا جبکہ وہ دم توڑنے والی تھی اور فقط لوح مزار یا پھر یونانی جلیکوں کے نسخوں کی پرچیوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسے میں اقبال کے فارسی اشعار نے اس مدہم چراغ کی روشنی کو دو چند کر دیا۔ اقبال خود اپنی فارسی دانی کے سلسلے میں کہتے ہیں۔

”لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ اقبال کو فارسی کیسے آگئی۔ جبکہ اس نے اسکول یا کالج میں یہ زبان نہیں سیکھی، یہ معلوم نہیں کہ میں نے فارسی زبان کی تحصیل کے لئے اسکول ہی کے ذمے سے کس قدر محنت کی اور کتنے اساتذہ سے استفادہ کیا ہے۔“ (اقبال مر)

جہاں تک اقبال کے اساتذہ کا تعلق ہے، یہ امر مسلم ہے کہ اقبال میں ذوق فارسی کی روح ان کے استاد مولوی سید میر حسن صاحب نے پونکی۔ مشرق میں میر حسن اور مغرب میں نکلسن اور براؤن نے اس آتش کو اور بڑھایا۔ ادھر لاہور میں سر تھا مس آرٹلڈ نے اقبال کی علمی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے، بلکہ بقول احمد سروش، ”سر تھا مس آرٹلڈ نے صحیح معنی میں اقبال کے وجدان و فکر کا انکشاف کیا۔“

چنانچہ ایک طرف میر حسن کی معنوی بصیرت، دین سے لگاؤ اور انسان دوستی کا اثر اقبال پر پڑا اور اس کے نتیجے میں واقعی ان کی روح بشر دوستی، اور اسلامی تمدن اور عشق رسول و آل رسولیں ڈوب کر سراغ زندگی پا گئی۔ اور دوسری طرف آرٹلڈ نے اقبال کے ذہن کو مغرب کے بہترین افکار سے آشنا کر دیا۔ مگر فارسی گوئی کی ترغیب بیشتر مولوی میر حسن نے دلائی۔ اگرچہ فارسی سے خود اقبال کو فطری طور پر لگاؤ تھا اور کبھی کبھار فارسی میں شعر کہہ لیتے تھے۔

۱۹۰۲ء میں پہلی مرتبہ انہوں نے ایک نظم لکھی جس کا پہلا بند اردو اور دوسرا فارسی میں تھا۔ دراصل یہ نظم اقبال نے اظہار تشکر کے طور پر منشی سراج الدین کو بھیجی تھی، جبکہ انہوں نے کشمیر

شعر برائے شعر اور ادب برائے ادب ان کا نظریہ نہ تھا۔ بلکہ اب شعر
برائے زندگی، اور ادب برائے حیات ان کا مقصد بن چکا تھا۔ چنانچہ
اسرارِ خودی کے مقدمہ میں خود فرماتے ہیں: ے
شاعری زینِ مثنوی مقصود نیست
بت پرستی بت گری مقصود نیست

ہندیم از پارسی بے گمانہ ام
ماو نو باشم تھی پیسانہ ام
حسن انداز بیان از من مجبو
خوانسار و اصقہان از من مجبو
گرچہ ہندی در عذوبت شکر است
طرز گفتار و سبب شیریں تر است
فکر من از جلوہ اش مسکور گشت
خامر من شاخ نخل طور گشت

پارسی از رفعت اندیشہ ام
در خورد با فطرت اندیشہ ام
مندرجہ بالا اشعار میں ہندی سے مراد اردو ہے۔ گویا انہوں
نے خود اقرار کیا ہے کہ میری وسعت فکر کے لئے فارسی جیسی
شیریں وسیع دامن رکھنے والی زبان ہی موزوں ہو سکتی ہے اور
جس نے میرے قلم کو نخل طور پر بنا دیا ہے۔ جو میری طبیعت
فطرت کے لئے بہت موزوں ہے۔ اس کے علاوہ خود
”عجم“ سے محبت کا اعتراف اور اس کی بیداری کی سعی
کے ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں: ے

عجم از نعمہ ام آتش بجان است
صدای من در ای کاروان است
دیدہ از خاک عجم تورانی است
لاجرم طرز نگہ تورانی است
یا پھر وہ مشہور غزل جس کا مطلع ہے۔

لے اقبال سے پہلی ملاقات پر یہ احساس کیا کہ گویا اقبال کو پورا یونان
حافظ تقریباً حفظ ہے۔ اس کے علاوہ عجم کی تاریخ و تمدن و فلسفہ
سے ان کا لگاؤ ان کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری DEVELOPMENT
OF METAPHYSICS IN PERSIAN سے ہی ظاہر ہے۔

احمد بیرجندی (ایرانی دانشمند) اقبال کے اس لگاؤ کے
متعلق کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

”حق تو یہ ہے کہ اقبال کو ایرانی ادب سے
والہانہ عشق تھا اور برصغیر میں فارسی شاعری کی
اشاعت و ترویج میں اقبال نے ایک اہم کردار
ادا کیا ہے۔ وہ واقعی دانے راز اور خود گاہ
تھے نہ فقط یہ بلکہ محبِ دین، محبِ مشرق اور
بالخصوص محبِ ایران تھے۔“

اقبال کی مستقل فارسی شاعری ان کی معروف و مشہور مثنوی
در اسرار و رموز سے شروع ہوتی ہے۔ اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء میں
طبع ہوئی جہاں تک فارسی میں شعر کہنے کا تعلق ہے تو اس کی سب
سے نمایاں وجہ ان کا فارسی زبان کی طرف میلان و رجحان ہے،
جس کی بنا پر انہوں نے فارسی کی تاریخ ادبیات کا وسیع مطالعہ کیا۔ ادیبانِ
ہرمان کی بیتی نگاہ ہی۔ قبل از اسلام، ایرانی حکومتوں کی تاریخ و تمدن کو لکھنے والا ماد
ہنجا منشی، اشکانی، سامانی یہ تمام ادوار ان کی نگاہ سے پوشیدہ
نہ تھے۔ پھر اسلام سے عشق کی بنا پر اسلامی تاریخ ان کی رگ و
پے میں سما چکی تھی۔ قبل از اسلام، ارسطو، افلاطون، افلاطونیاں
جدید اور بعد از اسلام فلسفہ اشراقی و فلسفہ تشکیکی کا عمیق مطالعہ
تھا۔ الغرض ادبیاتِ عجم کے اتنے وسیع مطالعہ کے بعد فارسی
مثنوی لکھی۔ اور سب سے اہم وجہ تو یہ تھی کہ اقبال فارسی زبان کو
تمام ممالک اسلامی تک رسائی کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ اقبال اپنے پیغام
خودی اور پھر رمزیت بے خوفی کو عالمگیر بنانا چاہتے تھے، ورنہ

چون چراغ لاله سوزم در خیابان شما
ای جوانان بچم، جان من و جان شما
عجم کے مقابلے میں عرب والوں سے گلہ مندیں کہتے ہیں:
نوائی من یہ عجم آتش کمن از دخت
عرب ز نغمہ شو قم ہنوز بی خبر است

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فارسی شاعری میں انہوں نے کن شعرا کی تقلید کی اور اسلوب شاعری کو نسل ہے۔ جہاں تک سبک ہندی کا تعلق ہے اقبال نے اس سبک کے سختی سے پیروکار ہیں اور نہ ہی انہوں نے اس سبک سے قطعی پرہیز کیا ہے۔ چنانچہ ان کی فارسی شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم شعرا کی پیروی بھی کی اور ان پر اعتراضات بھی کرتے رہے۔ خود سبک ہندی میں شعر کہنے والوں کی پیروی بھی کی ہے۔ اور ان سے شکایت بھی ہے۔ پھر اسرار خودی میں شعرا کے متعلق کہتے ہیں۔

کاروانہا گرچہ زین صحر اگداشت
مثل گام ناقہ کم غوغا گداشت

بہر نوع سبک ہندی میں انہوں نے نظیری کی تقلید کی ہے اسی طرح عرفی اور غالب کی پیروی میں بھی اشعار ملتے ہیں: دراصل اقبال جمال و جلال دونوں کے قائل ہیں مگر مسلم میں جلال کا پہلو نہ ہو تو انہیں کلمہ گو ہونے پر شک ہوتا ہے۔ چونکہ کلمہ میں بھی جلال کا پہلو نمایاں ہے، اور جہاں کہیں کسی کلام میں جوش و دلولہ نظر آتا اسے وہ قبول کر لیتے ہیں۔ عرفی کا ذکر شعر میں اس طرح ہے۔

حدی را تیز تر خوانم چو عرفی
کہ رہ خوابیدہ و محمل گران است

اور نظیری کے اس شعر کو مشنوی اسرار خودی شروع کرنے سے پہلے جگہ دی ہے۔

نست در خشک و تر ہمیشہ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کفم
اسی طرح غالب کی بھی پیروی کی ہے غالب کا شعر ہے۔
سوخت جگر تا کجارج چکیدن دھم
رنگ شوی خون گرم تا بہ پریدن دھم
اقبال کہتے ہیں۔

مثل شرر زہ راتن بہ تپیدن دھم
تن بہ تپیدن دھم بال بہ پریدن دھم
سبک ہندی سے قطع نظر مشنوی میں اقبال نے مولانا رومی کی تقلید کی ہے جس کا اعتراف جگہ جگہ کرتے نظر آتے ہیں، چنانچہ اسرار خودی کے مقدمہ میں کہتے ہیں۔

رومی خود بنمود پیر حق سرشت
کو بحر پہلوی قرآن نوشت
باز بر خوانم ز فیض پیر روم
دفتر سربستہ اسرار علوم
شعلہ دگر ز دہخس و خاشاک من
مرشد رومی کہ گفت منزل کبریا است
موجم و در بحر او منزل کفم
تا در تا بندہ امی حاصل کفم

بہر نوع مولانا رومی تو ان کے پیرو مرشد تھے۔ لیکن مکت، فلسفیانہ اور صوفیانہ افکار میں اقبال، رومی کے علاوہ سنائی، عطار، عراقی اور محمود شبستری سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ انیس شاملو، کلیم، صائب اور جامی کے اشعار تفسیم کے طور پر کلام میں لائے ہیں۔ نہ فقط یہ بلکہ گاہے گاہے ان کے اشعار میں نفائی، جلالی، علی قلی سلیم، رضی دانش، خاقانی، بیدل اور غالب کا رنگ بھی ملتا ہے۔

عزل میں اقبال نے حافظ کا انداز بیان، عرفی کا جوش اور

نظیری، جلال و جمال اپنا ہے۔ حافظ کے متعلق تو خود کہتے ہیں کہ جب میں حافظ کے رنگ میں غزل کہتا ہوں تو حافظ کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے، چنانچہ کہتے ہیں:-

تنم گلی ز خیا بان جنت کشمیر

دل از حرم حجاز و نواز شیراز است

بہر نوع ان کی غزلوں میں بھی ان کا پیغام جھلکتا ہے اگرچہ تغزل کمال پر ہوتا ہے مگر ساتھ ساتھ مسائل حکمت و فلسفہ بھی وجود ہیں۔ اور شاید ان کا یہ اسلوب جس کے وہ خود موجد ہیں ادبیات فارسی کی تاریخ میں پہلی بار وجود میں آیا ہے۔

بہر نوع پیام مشرق کے پیشتر تھے اور زبور عجم میں ان کی غزلیات کے بہترین نمونے ملتے ہیں جن میں حافظ کے بعد رومی، سعدی، عراقی، جامی اور سبک خراسانی میں منوچہری اور ناصر خسرو ملوی کی تقلید نظر آتی ہے۔

غزل کے علاوہ رباعی، قطع، مسطر، ترکیب بند، مستزاد اور قصیدہ بھی فارسی میں ملتا ہے۔ قطعات و رباعیات، پیام مشرق اور ارغمان حجاز میں ملتی ہیں۔

نظموں میں سعدی کا رنگ اختیار کیا ہے۔ انہیں کی طرح عنوانات قائم کر کے نظم کہی ہے جیسے ”قطرۂ آب اور طیارہ“ اس میں سعدی کے اشعار کی نظمیں بھی ہیں۔ قطعات میں شاہین ماہی جو ناصر خسرو کی تقلید میں ہے۔

ان کی نظموں میں جوش، ولولہ، غیرت، جدت اور شیرینی سب ہی کچھ شامل ہے۔ ان کی ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہ بحر فتم و گفتم بہ موج بے تابی

ہمیشہ در طلب ہستی چہ مشکلی داری؟

ہزار لولو و لالاست در گریبان

درون سینہ چون گوہر ولی داری؟

تیبید و از لب ساحل رمید و بچی گفتم

اس نظم میں اقبال بہت ہی دل پذیر انداز سے بتاتے ہیں کہ کس طرح میں سمندر کے پاس گیا اور موج بیتاب سے استفادہ کیا کہ آخر تجھے کیا مشکل ہے جو ہمیشہ طلب میں بیتاب ہے میرے تو گر بیان میں ہزار ہا لعل و گوہر ہیں مگر کیا میرے سینے میں جو گوہر قلب ہے آیا اس کی نظیر تیرے پاس ہے۔ اور وہ جواب میں کسماسی، تڑپی اور لب ساحل سے فرار کیا اور کچھ نہ کہا۔ خلاصہ کلام یہ کہ ان کی فارسی شاعری میں خواہ وہ کسی صنف

میں ہو شیرینی، زیبائی، آہنگ، موسیقی، رمزیت، رومانیت، کلاسیکیت، جدت، وسعت فکر، ہیجان، تخیل، استعارہ، مبالغہ، سوز و گداز، سرشاری فکر، شوخی، طنز، طبع، حسن لفظی و معنوی عرض ہر طرح کی چاشنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام تقریباً ہر زندہ زبان انگریزی، اردو، ہرمنی، فرانسیسی، عربی وغیرہ میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ لیکن ایران اور ایرانیوں نے حق ادا کر دیا کسی ایرانی دانشمند نے انہیں ”ماہتاب در شام شرق“ کے نام سے، کسی نے ”خود آگاہ دانامہ راز کے نام سے اور کسی نے ”برگزیدہ نثرین محصولات زمانہ مکان“ سے۔ کسی نے ”گل سرسبد عالم وجود“ سے، کسی نے ”شاہکار جہاں خلقت و رہنمائے بشریت“ سے، کسی نے ”برگزیدہ ترین گویندگان قرن اخیر“ کہہ کر پکارا حتیٰ کہ ایک ایرانی دانشمند نے ہمارے اس قومی شاعر کو ”ایران کی نو سالہ ادبی تاریخ کا خلاصہ کہہ کر یاد کیا ہے۔

ان دانشمندوں کے بالترتیب اسماء یہ ہیں۔ غلام حسین یوسفی، احمد میر جندی، ڈاکٹر رازانی، استاد فروز انفر اور بہار نہ جانے کتنے ایرانی شعرائے اقبال کی برسی کے موقع پر صد ہا تحفیں و آفرین کے اشعار ہدیہ عقیدت کے طور پر پیش کئے ہیں۔ جہاں تک ایرانی شعراء اور دانشمندوں کی اقبال دوستی کا تعلق ہے اس ضمن میں ہمارے ایک پاکستانی دانشمند ڈاکٹر عرفانی نے ایک گراں بہا کتاب ”اقبال ایرانیوں کی نظر میں“ لکھ کر حق دوستی

غزلے

اداکار۔ یہ پیش بہا کتاب تقریباً ۲۸ ایرانی دانشمندوں کے افکار کی جلوہ نمائی کرتی ہے۔ اس میں دانش گستر و دانش پرور شاہنشاہ آریامہر کے پیغام کا ترجمہ بقول معروف "کلام الملوک ملوک الکلام" درج کیا جاتا ہے جو یوم اقبال کے موقع پر جاری کیا گیا اور بعد میں سماجی پاکستان (تہران) میں شائع ہوا۔

ترجمہ: "پیام شاہنشاہ آریامہر"

حصیر نوری (ڈھاکہ)



برق ستم گرا کے پشیاں ہے آسمان
گلشن میں اٹھ رہا ہے لگا تار اب دھواں
اہل چین ذرا مری ہمت کی داد دو
پھر بکلیوں کی زد پہ بناتا ہوں ایشیاں
کتنی ہے صبح و شام کی گردش میں زندگی
یہ وقت ہی بتائے گا بدلے گا کب سماں
سوچا ہے پھر بلائیں گے ہم ان کو پیالے
مانا کہ ان دنوں ہیں وہ کچھ ہم سے بدگماں
آنکھوں میں ہیں سبھی کے اندھیرے بھرے ہوئے
جلتے ہیں دل کے داغ دکھائیں کسے یہاں
شاید نہیں ہے اس بھری مغل میں کوئی شخص
شاید کہ داستاں ہے مری سب کی داستاں
طوفاں میں اپنے ہاتھ سے پتوار بھی مٹی
کشتی ہے بادباں کے سہاے پر اب واں
مہر سکوت لب پہ لگاؤ ذرا حصیر
ماحول ہونہ جائے کہیں تم سے بدگماں



یوم اقبال کی مناسبت سے ہم ایک بار پھر مشرق کے ادیب عرفان کی اس نامی گرامی شخصیت پر درود بھیجتے ہیں اور اپنی قلبی سرت کا اظہار کرتے ہیں کہ گذشتہ سالوں کی طرح آج پھر اس عظیم شاعر اور مفکر کی یاد پورے احترام کے ساتھ منائی جا رہی ہے۔ اقبال لاہوری کی ذات ایران کے لوگوں کی نظر میں دو سبب سے محترم اور باعث دلچسپی ہے ایک یہ کہ اقبال اپنی ساری زندگی اخلاق و روحانیت کے انتہائی اعلیٰ اصولوں اور انسان دوستی و نیک نیتی کے فلسفوں کے علمبردار رہے۔ دوسرے یہ کہ وہ نہ فارسی ادب کے مخلص دوست تھے بلکہ وہ بذات خود موجودہ صدی کے فارسی بے سہترین نمائندہ بھی تھے اور یہ بات نادیکھی گئی ہے کہ ایک غیر ایرانی شاعر نے فارسی زبان میں اس قدر روان اور دل نشین شاعری کی ہو۔ پیام مشرق، زبورِ عجم اور ارمغان حجاز جیسے مجموعہ ہائے کلام بے شک فارسی ادب کے خزانے میں نفیس ترین اضافے ہیں لیکن اقبال کی شاعری نہ فقط لفظی فصاحت سے مزین ہے بلکہ اس میں ایک اعلیٰ اور معنی آفرین روح اور فلسفہ جلوہ فرما ہے۔ ہم اقبال لاہوری کو ان کی اس روح و فکر کی بناء پر ایک حقیقی انسان شمار کرتے ہیں اور ان کے لئے اس مقام کے قائل ہیں جو بے شک انسانیت کے حقیقی خدمت گاروں کو میسر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہم دعا کرتے ہیں کہ ان کی روح پر اپنی ابدی رحمتیں نازل فرمائے اور دنیا کے لوگوں کو اس روحانیت و محبت سے نوازے جس کیلئے اقبال نے انتھک قلم فرسائی کی ہے۔

اقبال اور نظریہ اجتہاد

سجاد حارث

اقبال کا اقبال کی جن تحریروں کی جانب کم سے کم توجہ دی گئی ہے ان میں مسئلہ اجتہاد سرفہرست ہے۔

قیام پاکستان کے چند ہی برسوں بعد ملک میں جو سیاسی صورت حال پیدا ہوئی اس کے تحت اقبال کا اصل چہرہ بالکل اندھیرا چھپانے کی سعی کی گئی۔ قدامت پسند اور جامد فکر رکھنے والے دانشوروں نے اقبال کے مجتہدانہ اور حرکی تصورات کے گرد ایک مضبوط گیرا محال لیا تاکہ وہ اپنے مخصوص مفادات کے پیش نظر فکر اقبال کا مرقع وہ پہلو ہی عوام الناس کو دکھا سکیں جو ان کے نزدیک بے ضرر ہو سکتا تھا تاہم چند برس پیشتر جب سرمایہ داروں کاگیرداروں اور استحصالی طبقات کے خلاف ملک گیر سیاسی جہم کا آغاز ہوا ملک کے سیاسی اور تاریخی عمل میں ایک نیا ابعاد آیا اس وقت اقبال کو ان مفاد پرست اور رجعت پسندوں سے پہلی بار نجات حاصل ہوئی۔ اس سے پہلے اقبالیات کے ان نام نہاد دانشوروں نے قومی شاعروں کو محض درسگاہوں ادبی محفلوں اور قوالوں کی محفلوں میں تھکا کر رکھا تھا۔ استحصال دشمنی اور مساوات کے نعروں نے اقبال کو اب قومی چیلانے پر بحث کا موضوع بنادیا ہے۔ اب لوگ اقبال کے افکار و نظریات کو ملک کی معروضی صورت حال کے حوالے سے دیکھنے لگے ہیں۔

محمد سرسید سے اقبال تک دانشوروں اور مصلحین کی ایک پوری کھپ

علامہ اقبال کی شخصیت دو واضح عناصر کی آمیزش اور انجذاب سے بنتی ہے۔ ان میں سے ایک فکر اقبال ہے اور دوسرا عہد ان کا لئی ہے۔ عام طور پر ہم شاعر۔ اقبال کو زیادہ تفصیل اور توصیفی انداز سے جانتے ہیں مگر۔ اقبال کو ہم بہت کم جانتے ہیں یعنی صرف اس حد تک جانتے ہیں کہ ان کے فکری نظام کے موضوعات اور عنوانات کیا ہیں۔ یہی اس ضمن میں تفصیلات سے کا حق آگئی جو کہ یہاں جو کہوں کا کام ہے فکر و مطالعے کا متقاضی ہے اس لئے بالعموم لوگ اس مقدس پتھر سمجھتے ہوئے محض چوم کر چھوڑ دیتے ہیں یوں تو ہمارے ملک میں افسوسناک شرح خواندگی کے باعث ایک بڑی اکثریت اقبال کے مجتہدانہ تصورات سے نا بلکہ نظر آتی ہے تاہم دانشور طبقے کی ایک تلیل تعداد جو اقبال کے تصورات و نظریات کا علم اور شعور رکھتی ہیں ہے، ان کے ہاں عام طور پر جذباتی اور دوائیاتی رویہ زیادہ نظر آتا ہے۔ عقلیت پسندی نیز تحلیل و تجزیہ کا رجحان ان اصحاب کے ہاں خال خال ہی ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک اقبال کی شاعری کی تشریحات پر جتنا لکھا گیا ہے، رویہ تغیر سیاسی سماجی اور معاشی حالات کے تناظر میں اقبال کے فکر و فلسفہ پر مقلبتا کم سوچا اور تحریر کیا گیا ہے اس سلسلے میں اگر کچھ تحریریں ملتی ہیں تو تو وہ بد تغیر الفاظ ایک ہی ذہنی سلچنے سے نکل ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان تحریروں میں بالعموم اقبال کے فکروں کو پیرا فریز کرتے ہی کی سعی بلیغ نظر

کا قتل عام تک کیا ہے۔ بعض مواقع اور مقامات پر اس نوع کا ملی اتحاد اور جوشِ اخوت یقیناً ملتا ہے لیکن یہ اتحاد اور یہ جذبہ بالعموم دیر پا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس اتحاد کی بنیاد میں ملکیت اور فرمانبرداریوں کی ذاتی مصلحتیں مادی اور سیاسی مقادرات زیادہ اہمیت رکھتے تھے، روحانی رشتے ان مقادرات اور مصلحتوں کے تابع ہوا کرتے تھے اور یہ بات ان مالک اور خطوں میں جہاں ملکیت سرمایہ داری اور جاگیر داری کے باقیات موجود ہیں اُجڑ بھی اتنی ہی پچ نظر آتی ہے جتنی کہ پہلے تھی۔

علامہ اقبال کے پیشِ نظر نہ صرف برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی مادی خوشحالی سیاسی آزادی اور روحانی بیداری کے مسائل تھے بلکہ وہ دنیا کے تمام مسلمانوں۔ بلکہ اس سے بھی اُگے بڑھ کر۔ پوری بنی نوع انسان کی بہتری اور بہبود کے خواب دیکھتے تھے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ محض مجرد فلسفے سے سیاسی مادی اور روحانی بلندیوں تک نہیں پہنچا جاسکتا۔ مادی حالات انسانی معاشرے اور افراد کے اذہان و کردار بدلنے کے لئے صحیح فکری زاویوں اور ایک ٹھوس لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ اقبال نے ماضی کی تاریخ کا بھی مطالعہ کیا تھا اور حال کے سیاسی واقعات اور گرد و پیش کی دیگر تحریکات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ انہیں اس بات کا بے حد قلق تھا کہ صدیوں سے ایشیائی مالک سیاسی غلامی اور ذہنی افلاس میں مبتلا ہیں۔ اسلامی دنیا میں تاتاری غارت گری کے بعد علوم و فنون کے چرلغ بجھ گئے ہیں اور جو مالک آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور رہے ہیں وہاں ملکیت اور مطلق العنانی نے ایسے حالات پیدا کر دیئے جن سے ملت اسلامیہ کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا گیا۔ ان مالک میں بتدریج تحقیق و اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا۔ نت نئے مسائل پیدا ہوئے لیکن انہیں وقت کے تقاضوں کے مطابق حل کرنے کے بارے میں سوچنا بند کر دیا گیا۔ اسلاف پرستی اس درجہ ترقی کر گئی کہ علوم و خواص جامد اور متقلد بن کر رہ گئے۔ ادب و سیاست نے دین اور دنیاوی معاملات میں حبسِ استبدادی طریقے اختیار کئے تو وہاں علمائے سوء کی کثرت نظر آنے لگی ہر نیکیاں تحقیق جذبہ اور ترقی پسند نقطہ نظر توئی فروشوں کی ریشہ دوانیوں اور غیظ و

نفرات ہے جن کے بچے اور سرگرمیوں کے شیعے اگرچہ مختلف ہیں لیکن مطلق نظریہ ہے یعنی قوم کی اصلاح احوال۔ اور ان تمام اصلاحی خیالات اور جذبات کی زیریں سطح پر سیاسی غلامی کا المیہ احساس بھی بدستور کار فرما نظر آتا ہے۔ تاہم اقبال اور دیگر مصلحین کے مابین ایک بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ اقبال کے عہد اور اس عہد سے پیشتر کے تمام مصلحین کی فکر و نظر محض برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی اصلاح تک محدود رہتی ہے لیکن اقبال اپنے وسیع مطالعے مشاہدے اور فکر و بصیرت کی صلاحیتوں کی بنا پر قومی ہستی اور سیاسی غلامی کا تجربہ زیادہ وسعت نظر سے کرتے ہیں، وہ سفید غلام آقاؤں کو بین الاقوامی اتحادات اور محاشی و تاریخی رشتوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں وہ ان کی حریصانہ نظریں پہنچاتے ہیں ان کے استعماری اور استعمالی عزائم کو اچھی طرح جانتے ہیں اور پھر وہ ان حالات میں جب رنگ و نسل کے بتوں کو اور جزائیاتی حد بندیوں کو توڑ کر ملت میں جذبہ ہوجانے کی تلقین کرتے ہیں تو سیاسی مفہوم میں یہ بات بڑی معنی خیز اور دور رس اثرات کی حامل بن جاتی ہے۔ ان کے کلمات و مشاہدات نے ان پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ بین الاقوامی استعداد کی قوت کا کلبانی سے متاثر بین الاقوامی نقطہ نظر اور بین الاقوامی اتحاد کے ذریعے سے ہی کیا جاسکتا ہے اسی کے تحت اقبال اس دور میں قومیت کے پرستار نہیں رہتے بلکہ اسے وہ مغرب کی سازش اور شاخسانہ قرار دیتے ہیں اور اس کی شدید مدد سے مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر اسے ہم اقبال کی سیاسی حکمت عملی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے اس نظریے کے لئے دلائل اور جواز اسلامی معتقدات سے ہی ہمیا کرتے ہیں لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ یہ اسلامی معتقدات تو صدیوں سے موجود تھے لیکن اقبال سے پہلے چند استثنائی مثالوں سے قطع نظر ملت اسلامیہ کے اتحاد اور جذبہ اخوت کو کسی نے بھی اس انداز سے نہ ابھارا تھا نہ اس کی ضرورت محسوس کی تھی جیسی کہ اقبال کے ہاں ہم دیکھتے ہیں بلکہ یہ کہنا شاید حقیقت پسندی ہوگی کہ تاریخ اسلام اور عالمی تاریخ میں اس نوع کے متعدد واقعات ملے ہیں جب ایک ہی ملت کے حکمران اور عوام آپس میں دوست و گریباں ہوئے ہیں، ایک دوسرے کو بڑی شمشیر زری کرنے کی کوششیں کی ہیں، ایک تاجدار نے دوسرے تاجدار کا ملک لوٹا لیا و متاعِ تباہ کیا ہے اور بے گناہ بھلا

اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ نظری طور پر مسلمانوں کے سوا داخلہ نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ مباحث اور گفتگو میں خلوص دل سے ہر فرد اجتہاد کی اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کرتا ہے لیکن جب اس پر عمل کرنے کا دست آتا ہے تو اس پر ایسی شرطیں عائد کر دی جاتی ہیں جن کو بقول اقبال پورا کرنا ناممکن تو کیا سرے سے محال نظر آتا ہے۔

اقبال اپنے اس خطبے میں اس ذہنی روش کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں جس نے قانون اسلام کو عملاً مترسار جامد بنا کے رکھ دیا ہے۔ وہ اس کی درج ذیل وجوہ بتلاتے ہیں۔

(۱) دولت عیاسیہ کے دور میں معتزلی عقل تحریک اور آزاد خیالی جس کی وجہ سے عباسیوں کو خطرہ محسوس ہونے لگا تھا اور جنہوں نے اگے چل کر قدیم الحیال علماء کی اس لئے حمایت کی کہ تحریک عقلیت کے اندر بعض ایسی باتیں مضمر تھیں جن کے سیاسی نتائج ان کے لئے بڑے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ چنانچہ قدیم الحیال علماء نے فہمی مسائل کی حدود کو ہر طرف سے متعین کر کے سرے سے اجتہاد کا دروازہ ہی بند کر دیا۔

(۲) رہبانی تصوف کا نشوونما غیر اسلامی اثرات کے ماتحت رفتہ رفتہ غور و فکر تک محدود ہو کر رہ گیا تھا اس روش کا ایک سبب بنا مذہبی پہلو سے دیکھا جائے تو تصوف عبارت ہے اس بغاوت سے جو فہمائے متقدمین کی عقلی جہد تراشیوں کے خلاف پیدا ہوئی فلسفۂ مونث کا قبول میں تصوف اور اعتزال کا راستہ اور طریقہ کار ایک جیسا ہو گیا اور مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ اس میں جذب ہو کر رہ گئے نتیجتاً اسلامی ریاست کی باگ ڈور اب متوسط درجے کے افراد بلیغ علم عوام کے ہاتھوں میں آگئی انہیں اپنی عاقبت اس میں نظر آئی کہ مذہب فقر کی اندھا دھند تقلید کرتے چلے جائیں۔

۳- تیرھویں صدی کے وسط میں اسلامی دنیا کا ذہنی مرکز بغداد تباہ و برباد ہو گیا۔ سیاسی زوال و انحطاط کے اس دور میں قدامت پسند مفکرین نے اپنی ساری کوششیں مسلمانوں کی حیات ملی کو ایک

غضب کا شکار ہو گیا۔ جب کبھی اور جہاں کہیں دین کے نام پر اس قسم کا استبداد روا رکھا گیا ہے وہاں ذہن ٹھہر گئے علم و فن کے چراغ بجھ گئے اور قدامت پسندی اور روایات کی پرستش کا دوسرا نام مذہب بن گیا زندگی اور معاشرہ چونکہ جامد و مہری ہوئی حقیقتیں نہیں ہیں تغیر پذیر اور انقلاب فریں حقیقتیں ہیں اس لئے زندگی جب منت نئی منزلیں طے کرتی ہوئی لگے بڑھتی ہے انسانی فکر اگر وہ تغیر زندگی کا ساتھ نہیں دیتی تو پورا معاشرہ انتشار اور تضادات کا مغلوب بن جاتا ہے چنانچہ علامہ اقبال اپنے خطبے "الاجتہاد فی الاسلام" کا آغاز ہی اس بنیادی نکتے کی وضاحت سے کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

"تہذیب و ثقافت کی نظر سے دیکھا جائے تو بحیثیت ایک تحریک کے اسلام نے دنیائے قدیم کا یہ نظریہ تسلیم نہیں کیا کہ کائنات ایک ساکن و جامد وجود ہے۔ برعکس اس کے وہ اسے متحرک قرار دیتا ہے۔"

(تخلیل جدید۔ الہیات اسلامیہ ترجمہ از سید نذیر نیازی ص ۲۳۵) دنیا کے وہ تمام لوگ جو زندگی اور انسانی معاشرے کے بارے میں سائنسی نقطہ نظر اور رویہ رکھتے ہیں اپنے تمام تر مباحث کا نقطہ آغاز ہی اس اولین حقیقت کو ٹھہرتے ہیں۔ اپنی شاعری میں علامہ اقبال ملّا پر جو طبع طہر کے تیر چلاتے ہیں اس کی بنیادی وجہ ملّا کی جاذبہ فکر اور تحقیق و تجربے سے اس کا گریز پارہاں ہے۔ اگرچہ وہ اللہ کی اطاعت فطرت صحیحہ کی اطاعت سمجھتے ہیں جو ایک قائم و دائم وجود کی حیثیت رکھتی ہے تاہم اس کے فوراً بعد ہی وہ ملّا اور ملّا پرست جامد اذہان کو یہ بھی سمجھاتے ہیں۔

"لیکن دوا می اصولوں کا یہ مطلب تو ہے نہیں کہ اس سے تغیر اور تبدیلی کے جملہ امکانات کی نفی ہو جائے اس لئے کہ تغیر وہ حقیقت ہے جسے ترکان پاک نے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی آیت ٹھہرایا ہے۔ اس صدمت میں تو ہم اس شے کو جس کی فطرت ہی حرکت ہے حرکت سے عاری کر دیں گے۔"

(تخلیل جدید الہیات اسلامیہ ترجمہ از سید نذیر نیازی ص ۲۳۵) اگے چل کر وہ اس امر کی صراحت کر دیتے ہیں کہ اسلام کی ہیئت ترکیبی میں جو عنصر حرکت اور تغیر قائم رکھتا ہے یا رکھ سکتا ہے وہ اجتہاد ہے

ایک دھجک اور یکساں صورت میں تبدیل کرنے پر مرنے کو دیں تاکہ اس طرح ملک میں مزید انتشار نہ پیدا ہو۔

علامہ اقبال نے اجتہاد کے خاتمے کی جن وجوہ کو بیان کیا ہے وہاں واقعات اور حقائق کی رو سے تو یہ قطعاً درست ہیں تاہم اگر اس امر کا تجزیہ کیا جائے کہ زیریں سطح پر اس اصل وجوہ کیا تھیں تو یہ بات سمجھنا مشکل نہ ہوگی کہ ہر دور میں اجتہاد کے دروازے اس بالائی طبقے نے بند کئے ہیں جو سماجی اور سیاسی سطح پر تغیر اور انقلاب کو اپنے مخصوص مفادات کے منافی سمجھتے تھے۔ یہ دولت عباسیہ کا دور رہا ہو یا وہ دور جب بقول اقبال اسلامی ریاست کی باگ ڈور بے علم عوام کے ہاتھوں میں تھی یا فتنہ تاتار کے بعد سیاسی زوال و انحطاط کا دور رہا ہو ہر زمانے میں حکمران اور مقتدر طبقے کے یہ سیاسی اور معاشی مفادات ہی تھے جو اجتہادی کوششوں اور اس کی مختلف النوع صورتوں کو اپنے لئے خطرہ سمجھتے تھے اور یکساں و یک رنگ صورت حال کو قائم و دائم رکھنا اپنی دولت و طاقت کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبے میں جن نین وجوہ کو بیان کیا ہے اس میں وہ مقتدر اور حکمران طبقے کے سیاسی اور معاشی مفادات کی جانب بین اسطور اشارے کر چلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بشیر احمد ڈالپے مضمون ”فکر اقبال - مسئلہ اجتہاد میں“ ان ان اواد میں فقہی اجتہاد کی کوششوں کے باب میں واضح طور پر کہتے ہیں کہ علامہ اقبال کے نزدیک یہ ”غیر فہری حدود بندی“ تھی۔

فتنہ تاتار کے دور پر غور کرتے ہوئے علماء کے تحریری عمل پر اقبال نے پہلے غلط نتائج کا استغراب کیا تھا قومی وحدت کے پیش نظر وہ اجتہاد کے مقابلے پر تقلید کی حمایت کر بیٹھے تھے لیکن بعد ازاں انہیں اپنا نقطہ نگاہ غلط معلوم ہوا اور پھر اپنے خطبات میں اپنے نتائج اور فیصلے پر انہوں نے خود تنقید کی۔ اب نئے سرے سے انہوں نے اپنے خیالات کا جائزہ لیا اور توڑنا شیرازہ بندی کے نام پر اجتہاد کی نفی کو ناپسندیدگی سے دیکھا۔ اب انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ قومی شیرازہ بندی سے انحطاط کا کلی طور پر راستہ بند نہیں کیا جاسکتا اور اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا۔

”اگر یہ صورت اگر قوم کے زوال و انحطاط کو روکنا ہے

تو اس کا یہ طریق نہیں کہ ہم اپنی گزشتہ تاریخ کو بے جا احترام کی نظر سے دیکھنے لگیں یا اس کا احیاء خود ساختہ ذرائع سے کرتے آگے چل کر وہ اس نکتے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”لہذا تو نے انحطاط کے سد باب کا اگر کوئی ذریعہ فی الواقع موثر ہے تو یہ کہ معاشرے میں اس قسم کے افراد کی پرورش ہوتی رہے جو اپنی ذات اور خودی میں ڈوب جائیں کیونکہ ایسے ہی افراد جن پر زندگی کی گہرائیوں کا انکشاف ہوتا ہے اور ایسے ہی افراد وہ نئے نئے معیار پیش کرتے ہیں جن کی بدولت اس امر کا اندازہ ہونے لگتا ہے کہ جانا ہوا حل سرے سے ناقابل و تغیر تبدیل نہیں ہے۔ اس میں اصلاح اور نظرنانی کی گنجائش ہے۔“

(تشکیل جدید ایبیات اسلامیہ ترجمہ از نذیر نیازی صفحہ ۲۳۳)

علامہ اقبال ان سطور میں جن افراد کی پرورش اور سرپرستی کا ذکر کر رہے ہیں ایسے افراد کی پرورش اور نشوونما مخصوص معروضی حالات کے بغیر سوچی بھی نہیں جاسکتی۔ اگر کسی معاشرے میں مذہب کے نام پر تحقیق اور آزادی فکر پر قدغن لگا دی جائے اختلاقی نقطہ ہائے نظر پر فتنوں کی حواریں نکلا دی جائیں اجتہادی نظریات پر نفرت اور پہلاری کا اظہار کیا جانے لگے اظہار اور ضمیر کی آزادیاں سلب کر لی جائیں تو ایسے تحدیدی اور استبدادی حالات اور مسموم فضا میں افراد پر زندگی کی گہرائیوں کا انکشاف ہونا امر محال ہے اور اگر کوئی سخت جان فرد ان حالات میں نئے معیار پیش کرنے کی جرأت بھی کرے گا توں تنہا اور ہلاکت کا شکار ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔

مذاہب و مذاہب کے لئے معاشرے کے لئے پیدا کرنے کے لئے معاشرے کا معروضی اور مادی ڈھانچہ تبدیل کرنا اولین فرض بن جاتا ہے ہمارے ملک میں جب تک جاگیر دارانہ نظام اور اس کے پیدا کردہ ادارے موجود ہیں مگر یہ آزادی اور تحقیقی جذبے ہلاکت کے شکار ہوتے رہیں گے۔ مستحق نظام کی ضرورت اور پھیلاؤ سے ہی انہیں زندہ کیا جاسکتا ہے۔

گزشتہ صدیوں میں ملت اسلامیہ جس جمود اور ذہنی پستی میں ڈوبا رہی ہے علامہ اقبال کا نکتہ و نظر اس انناک صورت حال کو ختم کرنے کی طلیقہ

مارچ - اپریل، ۱۹۷۹ء

فلاح و بہبود کے لئے عقل اور اپنے تجربات سے کام لے سہی و جہر ہے قرآن میں بار بار انسانی عقل اور تجربے پر بے غفلت اور تاریخ کے مطالعے پر زور دیا گیا ہے علامہ اقبال نے جس زمانے میں اجتہاد کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اگرچہ آج کی دنیا میں سیاسی صورت حال مقابلہ کا کافی تبدیل ہو چکی ہے تاہم اس باب میں ان کے خیالات و نظریات کی صداقت، آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اجتہاد کے تیسرے ماخذ اجماع پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "بہر حال یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ اس وقت دنیا میں جو نئی ترقی ابھر رہی ہیں کچھ ان کے اور کچھ مغربی اقوام کے سیاسی تجربات کے پیش نظر مسلمانوں کے ذہن میں بھی اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے مخفی امکانات کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ بلاد اسلامیہ میں جمہوری روح کی نشوونما اور قانون ساز محاسن کا بتدریج قیام ایک بڑا ترقی یافتہ قدم ہے۔"

(تشکیل جدید البیات اسلامیہ ترجمہ از سید نذیر نیازی صفحہ ۲۶۸)

تیسری دنیا میں آج جو ذہنی انقلاب اُ رہا ہے اور ایک نئے اقتصادی نظام کا نقشہ ترتیب پا رہا ہے عالمی استعمالی اور استعماری قوتوں پر ضرب کاری کا جو عمل شروع ہو چکا ہے یہ عالمگیر سیاسی اور معاشی تبدیلیاں علامہ اقبال کے اجتہادی نظریات سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں تیسری دنیا کے ممالک میں ملوکیت، سرمایہ داری، جاگیر داری، اور استعمار کے خلاف جدوجہد چل رہی ہے اس تحریک میں علامہ اقبال کے خوابوں کی تعبیر برآسانی دیکھی جاسکتی ہے۔

کرتا ہے۔ ان کا واضح طور پر نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن زندگی کا محرک تصور پیش کرتا ہے اور امتحانی نظریہ قرآنی عقائد کے عین مطابق ہے چنانچہ وہ معاشرے میں سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں اور تغیرات کو امر لازم سمجھتے ہیں۔ اپنے خطبے "اجتہاد فی الاسلام" میں قرآن کے اس محرک نظریے پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔

اگرچہ مذاہب کا یہی دعویٰ تھا کہ ان کے استدلال اور تغیرات حرف آخر ہیں۔ مگر نہیں۔ اندر میں صورت مسلمانوں کا آزاد خیال طبقہ اگر اس امر کا دعویٰ کرے کہ اسے اپنے تجربات علیٰ ذہان زندگی کے بدلتے ہوئے احوال و ظروف کے پیش نظر فرقہ و قانون کے بنیادی اصولوں کی از سر نو تعبیر کا حق پہنچتا ہے تو میرے نزدیک اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو غلط ہو۔

قرآن پاک کا یہ ارشاد کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے بجائے خود اس امر کا متقاضی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے یہ نہیں کرے اپنے لئے ایک نئی تصور کرے۔

(تشکیل جدید البیات اسلامیہ ترجمہ از سید نذیر نیازی صفحہ ۲۶۹)

علامہ اقبال اسلام کے آغاز کو درحقیقت استقرانی یعنی سائنٹیفک ذہن کا آغاز سمجھتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام میں چند بنیادی ہدایات دینے کے بعد انسانی کو یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ اپنے حالات اور زمانے کے تغیرات کے مطابق اپنے لئے قوانین وضع کرے، معاشرتی زندگی میں سیاسی اداروں اور اقتصادی ڈھانچے کا تعین کرے اور مل و انسانی زندگی کی

اقبال کی یاد میں

سید عبدالواحد

اور وطنیت کے چکر میں سرگرداں اور پریشان تھی۔ ایک وقت تو ایسا تھا کہ دنیا کے مسلمان قومیت کے شکار بن کر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ اور اس برصغیر میں تو ہمارے دشمنوں کی حیلہ سازی کے نتیجے میں قومیت کے مسئلے اتنی اہمیت اختیار کر لی تھی کہ اگر خداوندِ کریم اس ملت کی راہبروں کے لئے قائد اعظم اور علامہؒ کو نہ بھیجتا تو اس مس ملت کا مستقبل بہت تاریک ہوتا۔ بڑے بڑے عالم اور مولوی حریفانِ عباد کی سیاسی چالوں کا شکار ہو گئے تھے۔ وطنیت اور قومیت کے تصور سے جو ستم کاریاں یورپ میں ظہور پذیر ہوئی تھیں ان کو بھلا کر ہندو پروردہ پیگنڈ سے کے زیرِ اثر یہ سادہ لوح اور کچھ فہم راہبرانِ ملت مسلمانوں کو اپنائے وطن کی عبادی کا شکار بنانے پر تیار تھے۔ ویسے تو انسانی اخوت اور اسلامی مساوات کے نظریوں کی روشنی میں جب علامہ نے وطنیت اور قومیت کے نظریات کا جائزہ لیا ہو گا تو اس کو انسانی فلاح اور یہودی کے خلاف ایک سم قائل پایا ہو گا مگر جب یورپ کے قیام کے دوران وہ ان نظریات کے سم خریفانہ اثرات دیکھ کر اس کے سخت مخالفت ہو گئے تھے اور انہوں نے اس زہر کے خلاف قومیت کے نظریہ کی بیخ کنی کا تہیہ کر لیا اور عمر بھر وہ اپنے کلام میں وطنیت کو انسان کے لئے مضر ہی تصور کرتے رہے۔

اقبال تبا پوشد در کار جہاں کو شد

دریاب کہ درویشی بادلنِ کلا ہے نیست

علامہ اقبال کی شخصیت ایسی جامع کالات تھی کہ خود قدرت کو ایسے جامع کالات کی آفرینش پر ناز ہے۔ ان کی شخصیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعر بھی ہیں حکیمِ مکملہ دان بھی، جہاں ان کے کلام میں درد و سوز کی فراوانی ہے وہاں قلندر کی شان بے نیازی بھی۔ ان کے کلام میں جہاں حسن و عشق کی سرستی کا ذکر ہے وہاں فلسفیانہ موشگافیاں بھی ہیں اور ان سب کے علاوہ حسنِ شاعری کا کمال بھی موجود ہے۔ ایسا کمال کہ جس کی مثالیں دنیا کے ادب میں شاید و نادر ہی ملتی ہیں خود علامہ کو بار بار یہ خیال آتا تھا کہ کہیں ان کے کلام کے مطالعہ کرنے والے کلام کی عرا فریبوں میں الجھ نہ رہ جائیں اور ان کے پیغام کو نظر انداز کر دیں۔ اس لئے بار بار کہتے تھے،

رازِ حرم سے شاید اقبال باخبر ہے

ہیں اس کی گفتگو کے اندازِ مہرمانہ

بصیرت افزوز نگاہ جو عیب اور جو کموری جہاں دیکھتی ہے اس کی اصلاح کی فکر میں مشغول ہو جاتی ہے۔ ہر قوم اور ہر ملت کے افراد کو مختلف زمانوں میں مختلف امراض سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایک عرصہ سے یورپ کے سیاست دانوں کی ریشہ دوانیوں سے ملتِ اسلامیہ قومیت

علامہ فرماتے ہیں :-

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کا بیاں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو لے شرمندہ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
قباد اودہ رنگ نسب ہیں بال و پرتیسرے
تو لے مرغ حرم اڈنے سے پہلے پریشاں ہو جا

یہ سب کچھ پیغام علامہ نے اپنے دلکش اور سحر آفریں کلام کے ذریعہ دیا ہے۔ پیغام جس دلکش اور دلاؤ بزر زبان میں پیش کیا گیا ہے اس کی مثالیں دنیا کے چوٹی کے شعرا کے یہاں بھی بمشکل مل سکتی ہیں۔ علامہ کی غزلوں کا مقابلہ حافظ، نذیری اور غالب کی غزلوں سے کیا جاسکتا ہے تو ان کی رباعیوں کا مقابلہ عمر خیام سے کیا جاسکتا ہے ان کی مثنویوں کا مقابلہ رودکی اور سنائی کی مثنویوں سے کیا جاسکتا ہے۔ بعض نظیوں جرمین شاعر گوشتے کی نظموں کے مقابلہ میں پیش کی جاسکتی ہیں اور ویسے گوشتے کی بعض نظموں کا ترجمہ بھی علامہ نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کیا ہے۔ ایک نظم دانستے کی نظم کے مقابلہ میں پیش کی جاسکتی ہے۔ الغرض شرف جتنا تخریق بال کی شاعری پر کرے بجا ہے۔

علامہ کے نثر اور کلام کی غایت ایک ہے اور وہ ہے ارتقاء انسانیت۔ اس ارتقاء کے لئے وہ ایک ایسا انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے انسان کو وہ اعلیٰ مرتبہ حاصل ہو جائے جو قدرت کا مقصد ہے اس انقلاب آفرین جذبہ کے تحت علامہ کی خواہش صرف یہ ہے کہ انسان کو وہ اعلیٰ مقام میر جو قدرت کا مقصد اس کی آفرینش سے ہے۔ الغرض دنیائے ادب میں علامہ کی مثال ملنا دشوار ہے۔

مسلمانوں کو مخاطب کر کے علامہ کہہ گئے ہیں :-

سبق پھر پڑھ صداقت کا عداوت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا
یہ نمکین سرگزشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے
اب دیکھنا یہ ہے کہ اس پاسباں کا حق ہم کیسے ادا کرتے ہیں۔
ایک بار علامہ نے لکھ دیا :-

اس دور میں سے اور ہے، جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صمم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیر میں اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
باد و ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانہ کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے
ایک جگہ تو علامہ سات کہہ دیا :-

جو کرے گا امتیاز رنگ خوا، مٹ جائے گا
ترک خرگا ہی ہو یا احمدی والا کبیر

علامہ نے نسل اور رنگ اور قوم سے اسلام کے بالاتر ہونے کی بابت بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ دراصل وطنیت اور علاقہ داریت کو بت پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔

شوق سندیلوی اور اقبال

محمد عبداللہ قریشی

کرنے کا طریقہ انہوں نے یہ سوچا کہ اپنے عصر کے تمام صاحب کمال شعرائے اردو کی شاعری اختیار کر کے سب سے اصلاح لی جائے اور ان کی درگاہ ادب اسے فائدہ اٹھا کر اس امر کو آشکار کیا جائے کہ ”ہر گئے راز نگ دلوئے دیگر است“

گویا ہر شاعر اور ہر استاد سخن کی زبان اور اس کے مذاق میں کتنا اختلاف ہوتا ہے۔ انہوں نے مختلف اوقات میں اپنی پندرہ سولہ فرس اس زمانے کے منتیں نامور اور مستند شعرا کی خدمت میں بغرض اصلاح بھیجیں اور سب سے ادب آموزی کا فخر حاصل کیا۔

کچھ عرصہ تو یہ کاروبار چلتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس ہرجائی پن کا راز فاش ہو گیا اور بعض اساتذہ نے اصلاح سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس طرح یہ سلسلہ ختم ہو گیا مگر شوق سندیلوی نے غضب یہ کیا کہ ان سب غزلوں کو اصلاحوں سمیت ۱۹۲۲ء میں یک جا کر لے ایک کتاب کی صورت میں شائع کر دیا۔ مزید تم یہ کیا کہ اس سلسلے میں حضرات اساتذہ کے جو نجی خطوط ان کے نام آئے تھے، وہ بھی شائع کر دیئے۔ شوق صاحب نے تو ان سادہ دل استادوں کو بنایا۔ لیکن نقادان سخن کو طبع آزمائی کا ایک مضمون ہاتھ آگیا۔ چنانچہ کتاب چھپنے کے بعد سے تک ان اصلاحوں پر نقد و نظر ہوتا رہا اور بعض خطوں کا مذاق

لے ہاتھام محمد عبداللہ قریشی، مطلع انور پریس، محلہ بنی اسرائیل، علی گڑھ

سندیلو کے شرفار میں سے ایک صاحب محمد عبدالعلی خلیف مولوی علی حسن نے شوق تخلص اختیار کر کے ۱۹۱۲ء میں شعر کہنے شروع کیے۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی شاعری کا بچپن کس استاد کی آغوش تربیت میں گزارا لیکن طبیعت میں شعریت ضرور تھی۔ بہت کم کہتا ہے مگر جو کچھ بھی کہتا ہے، اچھا کہتا ہے۔ کلام جا ندار ہے۔ ان کے ناما منشی عاشق علی اٹا دہیوں کلکٹر کے سررشتہ دار تھے۔ ختم خانہ جاوید کا بیان ہے :

”وہاں ان کی ملک کچھ مکان تھے جن کے مالک بعد میں شوق صاحب ہوئے۔ یہ پیسے سندیلو کے بینک گھر میں پھر میونسپل کمیٹی میں ملازم رہے۔ وہاں سے مستعفی ہو کر ایک وقف کے مدد میں جو سندیلو میں ہے، معلم اعلیٰ ہوئے۔ تعلیم انٹرنس تک ہے طبیعت میں مزاج اور دل لگی کا مادہ از حد ہے، جو کبھی کبھی ستم ظریفی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔“

شوق سندیلوی صاحب شعور کی حدوں میں داخل ہو کر خود ایک خوش فکر شاعر بن گئے، تو انہیں ادب کی خدمت کہنے اور فن غزل گوئی کو ترقی یافتہ صورت میں دیکھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ اس شوق کی تکمیل کے لئے انہوں نے ایک عجیب منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے کو کامیابی سے ہم کنار

لے ختم خانہ جاوید جلد پنجم صفحہ ۱۷۶-۱۷۷

میں اس رنگ شاعری سے بے بہرہ ہوں۔ اس واسطے آپ
کی تعمیل ارشاد سے قاصر ہوں۔ بظاہر کوئی قلمی اس میں
نظر نہیں آئی۔

مخلص محمد اقبالؔ

۴ نومبر ۱۹۷۷ء

لیکن شوق اس سے دل برداشتہ نہیں ہوئے، مایوس ہو کر
نہیں بیٹھ گئے۔ اس کو سب سے جواب کے بعد بھی وہ برابر حضرت علامہؒ
غزلیں بھیجتے اور اصلاح کا مطالبہ کرتے رہے۔ آخر ان کی استقامت اور
مستقل مزاجی نے اقبالؔ کو اس حد تک مائل کر ہی لیا کہ جب مندرجہ
ذیل غزل ان کے پاس اصلاح کے لئے پہنچی تو انہوں نے شروع سے
آخر تک اسے پڑھا اور اس کے متعلق اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے

اب اپنا دل تنگ ہے زندانِ تمنا

اندسے یہ جوشِ فسادِ انِ تمنا

کیا ڈالیں کسی آرزوئے تازہ کی بنیاد

نظروں میں ہے بربادیِ ایوانِ تمنا

بچکی کی صدا، سب جسے سمجھے دمِ آخر

ٹوٹتا یہ قفلِ درِ زندانِ تمنا

جز خواب نہیں وعدہ باطل کی حقیقت

جز وہم نہیں موجدِ طوفانِ تمنا

نیری نگہِ لطفِ تھی تہیدِ محبت

میری نگہِ شوق ہے عنوانِ تمنا

اے قافلہ یاسِ گذرِ دل میں نہ ہو کر

پامال نہ کر گورِ غریبِ انِ تمنا

اے شوق ہے اب رنج کو پرواز بھی دشوار

پیوست کیجئے میں ہے پیکانِ تمنا

علامہ اقبالؔ نے غزل ملاحظہ فرمانے کے بعد شوق کو یہ مختصر سا

خط لکھا،

اڑایا جا کر ہا کیونکہ ان میں طرح طرح کی فرمائشیں اور مطالبات تھے۔

اس کتاب کا نام ”اصلاح سخن“ ہے۔ ۲۳۴ صفحات کی اس کتاب
کے شروع میں نیاز فتح پوری مرحوم کی ”تقریب“ مولوی عبدالمحکم شرر کا
دیباچہ سلطان حیدر جوش کا مقدمہ اور شوق کی اپنی التماس ہے۔ پھر
سردار غزلیں اور ان پر اساتذہ کی اصلاحیں ہیں۔ مشاہیر شعرا میں
احسن مارہروی، آرزو لکھنوی، اطہر ہاپوڑی، علامہ اقبالؔ، حضرت اکبر
اللہ آبادی، بیخود دہلوی، بیخود موہانی، ثناء لکھنوی، جلیل ماک پوری، رفیع
غیر آبادی، سائل دہلوی، شاد عظیم آبادی، شفیق عماد پوری، شوق قدوائی۔
شوکت میرٹھی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، فانی بدایونی، محشر لکھنوی،
مصطفیٰ خیر آبادی، ناطق لکھنوی، نظم طباطبائی، وحشت لکھنوی اور دیگر
کئی اہم نام نظر آتے ہیں۔ ہر شعر کی اصلاح متعدد ناقدانِ سخن کے قلم سے
پہلو پہ پہلو اور جدا جدا دکھائی دیتی ہے۔ نقوش الفاظ و معانی کی گونا گوں
قطع و برید ہر صاحبِ فکر کے سامنے کلامِ شوق کے محاسن و معائب کے
علاوہ خود مصلحانِ سخن کے ذہن و دماغ کے متعلق ایک لطیف موازنہ و
مقابلہ بھی پیش کرتی ہے۔ اس موازنے اور مقابلے سے اُن کوئی واسن
بچا کر نکل گیا ہے، تو وہ حضرت اکبر اللہ آبادی اور اقبالؔ ہیں، جو کسی کو
شاگرد بنانے کے روادار ہی نہ تھے۔ پھر بھی چلتے چلتے انہوں نے کوئی
نہ کوئی مفید شورہ دے دیا ہے۔ اصلاح کا یہ سلسلہ ۱۹۷۷ء سے
۱۹۷۳ء تک جاری رہا۔ پھر بند ہو گیا۔ بعض اساتذہ کے جو خطوط و خطبات
ادبیہ کا گنجینہ معلوم ہوئے، مزنب نے انہیں نیچے کے طور پر کتاب کے
آخر میں درج کیا ہے۔ یوں علامہ اقبالؔ کے بھی تین چار خطوط محفوظ ہو گئے
ہیں۔ وہی اس مضمون کی اساس ہیں۔

شوقؔ سندیلوی کی پہلی غزل پر ہی جس کا مطلع یہ تھا ہے

خواب میں ان کا گلے مل کے جدا ہو جانا

دل کے ارمانوں میں اک حشرِ پسا ہو جانا

اقبالؔ کے معذرت کرتے ہوئے ۴ نومبر ۱۹۷۷ء کو لکھا،

”مکرم بندہ! سلام سنوں۔“

”مخدومی! السلام علیکم؛

آپ کی غزل بہت اچھی ہے۔ زبان کی اصلاح تو
میں کیا کروں گا، خیالات ماشاء اللہ خوب ہیں۔

اے قافلہ یاس..... الخ

اس شعر کا پہلا مصرع پڑھ نہیں سکا۔

مخلص

محمد اقبالؒ

حضرت علامہ کا جواب اتنا مختصر تھا کہ شوق آئی اس سے تسلی
نہ ہوئی۔ انہوں نے اپنے اشعار کی خوبیوں اور خامیوں پر تفصیلی روشنی
ڈالنے کے لئے دوبارہ لکھا مگر یہ شاہین پھر بھی زیرِ دام نہ آیا۔ اقبالؒ
نے اپنی پہلی رائے کا اعادہ کرتے ہوئے اس میں ذرا سا اضافہ کر کے
واب دیا؛

”مکرم بندہ تسلیم۔

مجھے آپ کی غزل میں کوئی خامی نظر نہیں آتی

اگر آتی تو کم از کم آپ کی توجہ ضرور دلاتا۔ اے

قافلہ یاس..... الخ۔ مجھ سے پڑھا نہیں گیا اور نہ

مصرع کسی طرح سمجھ میں آتا ہے۔ یہ پہلے بھی عرض

کر چکا ہوں۔ باقی اشعار خوب ہیں۔

جز خواب نہیں وعدہ باطل کی حقیقت

جز وہم نہیں موجب طوفانِ تمنا

پُرانا اور مبتذل مضمون ہے۔ آپ کے باقی اشعار

میں تازگی پائی جاتی ہے۔

مخلص محمد اقبالؒ

جب شوق نے دیکھا کہ اقبالؒ شاید ان کی اردو غزلوں پر
الاح سے کتراتے اور پہلو تہی کرتے ہیں اور وہ آسانی سے قابو میں
نہیں آتیں گے تو آخری حربے کے طور پر ایک اور تریب لڑائی اور
مندرجہ ذیل فارسی نعتیہ غزل اصلاح کے لئے ان کی خدمت میں

روانہ کی ہے

دلا باشِ قربانِ آں ملک گیرے

کہ بے تاج و اورنگ بخند میرے

بہ حسن و جمالے عذیم المثلے

بوصف و کمالے ندارد نظیرے

بہ رد ماہتا بے بہ منو آفتابے

بہ خولا جوابے فقیدان نظیرے

تیمیر غیر محمد و در ملک باطن

بظاہر بہ قید تعین اسیرے

بجائے جوابے علیٰ انتخابے

عجائب شہنشاہِ عزائب و ذریعے

ز صبح تو خامش بود شمع ہستی

بیا شاہ شاہاں کہ میر و فقیرے

برآں شاہ کو نین لے شوقِ نازم

کہ خوش حال بودہ بہ فرشی حصیرے

بیر نشانے پر بیٹھا۔ اقبالؒ نے پوری توجہ سے غزل دیکھی۔ اگرچہ

یہ ان کے معیار پر کسی طرح پوری نہیں اترتی تھی، پھر بھی انہوں نے

مروت سے دو مصرعوں میں ذرا ذرا سی تبدیلی کی، ایک شعر کو قلمزد

کرنے کا مشورہ دیا اور غزل واپس کرتے ہوئے نہایت صاف بیانی

سے لکھا؛

”حسن اعتقاد کی داو دیتا ہوں۔ زبان غزل

میں فارسیّت کی شان نہیں ہے۔“

۱۔ اقبال کا مشورہ: بوصف و کمالے فقیدان نظیرے۔

۲۔ ایضاً: بہ خولا جوابے ندارد نظیرے۔

۳۔ خوب شعر ہے۔ اقبالؒ۔

۴۔ اے اقبالؒ نے قلمزد کر دیا۔

جدھر نگاہ پھری سامنے وہ شکل تھی شوقِ
یہ رنگ آنکھ کا اب جوشِ انتظار میں ہے

نگاہِ شوق کی گرمی سے اڑ جاتا ہے رنگ اس کا
تیری تصویر تجھ سے بھی زیادہ نا زمینیں نکلی

ہستی کا کچھ آسرا نہیں ہے
یہ نقش تو دیر پا نہیں ہے
کشتی کا خدا تو ہے نگہبیاں
کیا ڈر ہے جو نا خدا نہیں ہے
بیجا ہے ہزاروں کا شکوہ !
یہ کون کہے بجا نہیں ہے

غفلت سے آنکھ کھول کے دیکھا تو یہ کھلا
ساری خرابیوں کی بنا مادّ من میں تھی بے

سے فہمخانہ جادید جلد پنجم صفحہ ۱۷۷ - ۱۷۸ +

ہممہ غیر محدود در ملک باطن
بظاہر بہ قید تعین اسیرے
خوب شعر ہے -

محمد اقبالؔ

اس کے بعد یہ سلسلہ بالکل بند ہو گیا۔ اگر اقبالؔ استاد کی
شاگردی کے چکر اور اصلاحوں کے جھمیلوں میں پھنسے رہتے تو وہ مفید
کام بھی نہ کر سکتے جس کے لئے قدرت نے انہیں پیدا کیا تھا۔ شوق بھی
اپنی دل لگی اشعار اور ستم خیزی سے بدنامی مول نہ دیتے تو اپنے اس
قسم کے اشعار کی بدولت قابلِ ذمہ شعرا کی صف میں آ سکتے تھے

زبان سے اُن نہ کرنا شمع ساں جل جل کے مرجانا
بالآخر رفتہ رفتہ صبرِ ہستی سے گزر جانا

حیات و موت بیمار امید و بیم کی کیل ہے ؟
نہ جینا سہل ہے جس کا نہ ہے آسان مرجانا
بہی دو حرف آہِ مرد کے شرحِ غم دل ہیں
طویل اک داستان ہے جس کو تم نے مختصر جانا

مالِ کار اپنی ہستی موبہوم کا یہ ہے !
حیات چند روزہ وہ بھی غفلت میں گزر جانا
زبان پر ذکرِ دل میں یاد اور سر میں نرا سودا
نظر کو جستجو تیری جہاں جانا جدھر جانا



محنت بر غزل علامہ اقبال

عبد الغنی شمس

بہر گام کوہ گراں اور بھی ہیں رہ شوق میں، مفتخو اں اور بھی ہیں
تیرا آسمان، آسمان اور بھی ہیں ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
نہ حرف آنے دے کاہشیں آرزو پر ہے موقوف سب کچھ یہاں جستجو پر
بھروسہ تو رکھ صرف اللہ پر قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیایاں اور بھی ہیں
نہ کر اپنی بے دست و پائی کا ماتم کئے جادو مادم یونہی سعی پہیہم
ہے ذوق طلب تیرا سب پرستم اگر کھو گیا اک نشین تو کیسے غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں
شب غم کا باقی کہاں ہے اندھیرا سحر مسکرائی، ہوا اب سویرا
نہ کر کوہ و صحرا میں دم بھر لیرا تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسمان اور بھی ہیں
رموز خودی، بیخودی میں نہ کہہ جا زمانے کے چہرے کے کلیجے پہ سپہ جا
حوادث کے دھارے پہ تو یوں نہ بہتا اسی روز شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
افتق سے تجھے یہ کسی نے صدا دی مسلمان کو زیبا نہیں نا مرادی
بڑے صاچل اسی طرح وادی بہ وادی تو اپنی ہی منزل پہ کم ہونہ بادی
کہ پیچھے ترے کارواں اور بھی ہیں
رہا ہوں میں اک بیوطن سا وطن میں نہ ابھری مری موج گنگ و جن میں
گزارے ہیں ایام رنج و محن میں گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

نئی زندگی

ف۔ ق

ملوکیں گہلین درناؤ کو ہلو اشته گنجانی
شتہ بے موکل عائی یار نصیب وچے غمگدانی

کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

بادل نے اپنی سحرانگیز آواز سے کہا کوٹھ سے بڑا سردار آیا مٹوا
ہے ٹکری یوسف نے میری ڈیوٹی لگانی ہے کہ بستی سے ۳۰ مرغیاں
پیدا کر کے دوں۔ تمہارے ذقے ۲ مرغیاں ہیں.....
تاج نے مرغیوں کی طرف نظریں گڑ دتے ہوئے کہا.....
ہماری مرغیاں تو ابھی بچیاں ہیں انہیں لے جاؤ گے تو ان کی ماں روئے
گی.....!! یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر بھر گئیں۔

یہ ادا بادل کو ایسی پسند آئی کہ اس نے کہا ”اچھا جی۔ یہ بات
ہے تو بہار گت چاچا کو صرف میرا سلام دے دینا اور کہہ دینا کہ تمہارے
حقہ کی مرغیاں میں نے پیش کر دی ہیں۔“ تاج، بادل کے لہزائے بل کھائے
انداز پر اسی وقت ریجھ گئی۔ اس واقعہ کے بعد کسی نہ کسی پہلے بادل
براہر اس سے ملتا رہا۔ کبھی وہ کاریز پر اس کے ہاتھوں سے بڑا گھڑا
مخام کر چپکے سے کہتا ”متے نازک ہاتھ بوجھ اٹھانے کے لئے نہیں
ہوتے.....“ تو وہ شرم سے سرخ ہو جاتی..... اور کہتی۔ ”اد مستان
ذرا ہوش کر آس پاس کھڑی لڑکیاں کہیں مجھے نشانہ نہ بنالیں اور

د بہادر جوان آخر تو نے سرسبز و شاداب کو ہلو چھوڑ ہی دیا میرا
محبوب اجانت لئے بغیر مجھے چھوڑ گیا۔ دیکھئے قسمت پھر کب ملاتی ہے۔
تاج بی بی کے لبوں پر یہ دلدوز بول ایک انجان تئیر میں لرز
اٹھے..... اور وہ پھونس سے بنی اپنی خستہ حال ماڑی (جھونپڑی)
میں کھڑی اپنے محبوب بادل کے گھوڑے کے سموں سے اٹتے ہوئے
غبار کو تک رہی تھی.....

بادل جس کی مستیں ابھی بیگ رہی ہیں، بلا کا منجلا ہے۔
بہادری اور حاضر جوابی اُسے درٹ میں ملی ہے۔ دن بھر کے کھیتی کسان کے
کام سے فارغ ہو کر وہ طنبوڑے پر بڑے شیریں نغمے الاپتے ہیں۔ اس
کے مردانہ حسن نے پہلی مرتبہ تاج بی بی کے دل پر اس وقت کند
ڈالی تھی جب وہ بڑے سردار کی کوٹھ سے آمد پر گھر گھر پھر کر سائش
آرام کی مختلف چیزیں جمع کر تا پھر رہا تھا..... تاج بی بی کے باپ
بہار گت خاں کے ذقے دو مرغیاں تھیں۔ بادل جب بہار گت کی ماڑی
پر پہنچا تو وہ کاریز کی طرف گیا ہوا تھا۔ تاج بی بی بیٹھی اون کات
رہی تھی۔ جب بادل مری اس کے دروازے پر پہنچا تو ایک دم اس

ایسے موقع پر تاج اس کے چٹائی بیٹی۔ اور اسے طعنہ دیتے ہوئے کہتی۔۔۔ تم مری کبھی انگریزوں سے لڑے تھے۔ کسی پچھلے جنم میں اب تو تمہارا سردار اور سردار زادے سوٹ پہنتے ہیں گٹ پیٹ انگریزی بولتے ہیں۔ اور تمہارے تن پر تو یہ صحیح شلوار تک نہیں..... بادل کھسیا کر اس کی کلائی میں ایک زور کی چٹکی لیتا۔ چڑیل دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں تو اداں فول منت بکا کر مجھے وہم آتا ہے اگر کہیں یہ بات سرداروں کے کانوں تک جا پہنچے تو مجھے ادب مجھے دونوں کو کاٹھ میں دے دیں۔ کاٹھ کا لفظ سن کرتاج بی بی کو جگر جھری سی آگئی پچھلے سال کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب اس کے باپین دن کاٹھ میں پڑے رہے تھے اور ان کی خلاصی جب ہی ہو سکتی تھی جب اس نے کوہلو کے بازار میں جا کر اپنے کانوں کے کاٹھ جو اس کی ماں کی آنکھ نشانی تھے فروخت کر کے ٹکری صاحب کو جو بڑے سردار کے مقرر کردہ ایک دستہ کے سالار کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو انسانی ریوڑ کو سردار کے اشاروں کے مطابق ہانکتے ہیں بقایا رقم پیش کی تھی۔ ہوا یوں کے بہار گ خاں نے ایک چھوٹے سے افتادہ قطع پر کمٹی کاشت کر لی تھی اور یہ کام ٹکری صاحب کی اجازت سے ہوا تھا پر جب فصل فروخت ہوئی تو کل سو روپے ہاتھ آئے۔ ٹکری صاحب کو جو ہی فصل کی فروخت کی خبر ملی تو وہ بڑے سردار کی جانب سے ٹیکس لینے آدمکے۔ انہوں نے اپنی لوٹ یک جیب سے نکالی۔ اور حساب یوں لگا یا۔

۴ روپے
۲ روپے
۲ روپے
۲ روپے
۷ روپے
۱۰ روپے
۳ روپے
۲ روپے

۲ روپے

ذقات انہیں طرح طرح کی کہانیاں گڑھنے پر آمادہ نہ کر دے۔۔۔!!
یہ باتیں سن کر بادل نور سے قہقہے مارنا شروع کر دیتا ناج
بی بی غصے سے بے قابو ہو کر گھڑا سنبھال کر گھر کی طرف دوڑنا شروع کرتی
مگر عشق اور مُشک چھپا یا نہیں جا سکتا کچھ ہی دنوں میں ان کی محبت کے
چرچے پورے کولہو میں ہونے لگے۔۔۔۔!!

پھر جب میر مہرام خان جو ایک چھوٹے سردار ہیں یہ بات
سُنی کہ بادلِ خاں مری، بہارِ گِیاں بگٹی کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا
ہے تو انہوں نے اس پر بہت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور بادل کے
باپ سے کہا۔ دیکھو آج کل سرداروں اور بگٹیوں میں تعلقات کچھ پہلے
جیسے نہیں رہے ہیں۔ بڑا سردار اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتا اور اب تو
وہ ہم کو بار بار کہلوارِ باجے کہ تم چوڑیاں پہن لو۔ پھر بادل ابھی نو عمر
ہے اس نے کسی لشکر کے ساتھ کوئی معرکہ نہیں لڑا ہے۔۔۔۔۔ بڑے
سردار کو خبر ہو گئی تو خواہ مخواہ جان مصیبت میں آجائے گی۔ وہ اسے
اپنی آن کا مسئلہ بنائے گا۔۔۔۔۔ غرض اسی کھڑی تیغ نے تاج اور بادل
کو ایک دوسرے کی دائمی رفاقت کے بندھن میں نہ بندھنے دیا۔ مگر
یہ دونوں۔ کوہلو کے ریتیلے ٹیلوں کے پیچھے ایک دوسرے سے ملتے رہے۔
کبھی بادل اُسے اپنے نئے سناٹا اور کہناتہ شعر میں نے کہے ہیں
میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ میں بھی اپنے جدِ بزرگوار کی طرح ایک
بڑا شاعر بن جاؤں۔۔۔۔۔ میرا سکر دادا انگریزوں کا بڑا دشمن تھا۔
جب انگریز مریوں سے لڑے تو اس نے کیا خوب شعر کہے تھے۔

پیدنگی آتکا مورانا

چغلاں آڑ ستھا ٹورانا

بنی بے عزتیں جیانا

ولمن شته سلما

(فرنگی آہستہ آہستہ بڑھتا رہا۔ غدار اس کی راہنمائی کرتے رہے)

نشیبی ملائے کے بے غیرت انگریزوں کو یہاں لے آئے۔ وطن

غیرت دار مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔

نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارا کام ہی محنت کرنا اور اپنے بڑوں کی خدمت کرنا ہے۔ ہم گھوٹے سے بھی زیادہ وفادار ہوتے ہیں۔ گھوٹے کو تو مٹی بھر دانا اور گھاس دے کر سنسناتی گولیوں میں جھونکا جاسکتا ہے لیکن ہم اپنے مالکوں سے مٹی بھر دانا اور گھاس بھی نہیں مانگتے۔ تمہیں تو یاد ہوگا کہ پچھلی ہول گرڈ بڑ میں بڑے سردار کے حکم پر ہم لوگ پہاڑوں پر جا چڑھے تھے اس وقت ننہارا بابا بیمار تھا۔ میں گیا تھا۔ کئی کئی ہفتے ہم نے پتے اور جڑیں کھا کر نکال دیئے پھر کہیں کچی مکی نصیب ہوئی۔۔۔ بیٹا بلوچ بیٹوں کو بہت کچھ سہتا پڑتا ہے۔ شکر کرو ننہارا بابا مرا نہیں زندہ ہے۔ میرے دادا خدا بخشنے سنایا کرتے تھے ایک باز جھالا دان کے ایک سردار نے غصہ میں آکر ایک نافرمان کو زندہ گڑوا دیا تھا۔ شکر کی بات ہے اب اگلا سا وقت نہیں رہا اب تو ہمارے سردار بہت کچھ پڑھ لکھ گئے ہیں، دلالت تک پڑھ آئے ہیں۔۔۔۔۔ بیٹا ایسے وقت میں پیسے کو عزیز نہیں رکھتے اگر ڈھکا چھپا کوئی

کل جمع چھبیس روپے ہتھیلنے کے بعد انہوں نے بطور رشیک پونے تیرہ روپے کا حساب بتایا اور یہ بھی ہتھیا کر اب بٹائی پر آئے۔ اور اس کے حساب کو کچھ اس طرح پھیلایا کہ خود ان کے حساب سے بابا کے ہاتھ میں کل پندرہ روپے بچتے تھے۔ اب قصہ یہ تھا کہ بابا نے ٹکڑے پر کاشت کسی کاہل بیل کرائے پر لے کر کی تھی۔ پھر کٹائی کے وقت انہوں نے دو مزدور بھی ساتھ لگائے تھے ٹیکس اور رشیک ادا کرنے کے بعد ان کے ہاتھ میں بٹائی دینے کو رقم نہیں تھی وہ کرایہ اور مزدوریاں پہلے ہی دے چکے تھے۔ جب بابا نے ٹکری صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر عرض کی، سائیں اب کچھ مکت باقی نہیں تو ٹکری صاحب انہیں اپنے ڈپرے ہم لے گئے اور وہاں انہوں نے بوٹے بابا کا پیر ٹکڑی کے ایک ٹنگے میں کس دیا۔ وہ دن بھر دھوپ میں پڑے کراہتے رہے کبھی کھڑے ہو جلتے کبھی ٹیرے ہو کر زمین سے ٹیک لگالیتے۔ رات گئے جب بوٹے بجا رھاں لے آکر بابا کی بیٹا سائی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس وقت بجا رھاں نے تسلی دی، بیٹا ہم بلوچوں کو اتنا کمزور دل



اور شدہ مراد کی طرح ہماری داستان محبت بھی زندگی کا روپ لے لے۔ بادل نے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھاتے ہوئے کہا ”تا جو تو نے میرے دل کی بات چرائی ہے۔۔۔ پر شاید تو یہ نہیں جانتی کہ یہاں کوہلو میں کوئی مدرسہ نہیں کوئی پڑھا لکھا نہیں اور اگر کوئی ہے تو وہ سرداروں کے ڈر کے مارے کسی کو پڑھاتا نہیں۔۔۔“

”اُونھ چل کم ہمت۔۔۔ تو شہر کیوں نہیں بھاگ جاتا۔ کوئٹہ، سکھر کہیں تو تجھے پناہ مل ہی سکتی ہے۔“ اُس نے اپنی اڈھنی کو بل دیتے ہوئے بڑا سامنے بنا لیا۔۔۔ بادل نے کہا: ”پاگل ہو گئی ہے تاجو کیا۔ اگر کوئٹہ یا سکھر میں جا کر میں تعلیم حاصل کر لوں تو کیا کبھی کوہلو میں واپس آ سکتا ہوں۔۔۔؟ کیا پھر بھی تیری صورت دیکھ سکتا ہوں۔۔۔؟“

”ہاں ٹھیک کہتا ہے تو۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔“ تاجو نے ایک لمبا سانس لیا پھر کچھ توقف کے بعد وہ بھرائی آواز میں بولی۔ ”تو ایسا کر مجھے بھول جا، اپنی زندگی بنالے۔۔۔ میں تیری یاد کو سینے سے لگا کر وقت کاٹ لوں گی۔۔۔“

بادل نے غمگین اور اٹل انداز میں کہا ”مجھے ایسی تعلیم کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہ ہرگز منظور نہیں۔۔۔ کچھ دوسرے گھوڑوں کی تیز ٹاپوں کی آوازیں سن کر وہ چمکنے ہو گئے۔ بادل نے کہا ”معلم ہوتا ہے ٹکری صاحب بستی کی طرف جا رہے چلو اب ٹکری کی طرف چلیں۔۔۔۔۔“

جب وہ دونوں قدم قدم چلتے، کوہلو کے بازار سے گزرتے تو انہوں نے عجب کھرام دیکھا۔ ٹکری ایک ٹبے پر کھڑے تھے ان کے باڈی گارڈز انہیں تھامے آواز و مستعد انداز میں ٹھہر رہے تھے ڈھول پر تھاپ پڑ رہی تھی۔ ہر طرف سے لوگ دوڑ دوڑ کر غول در غول ٹیلے کے پاس پہنچ رہے تھے۔ مجمع دم بدم بڑھ رہا تھا۔۔۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ الگ گمراہ ہو گئے۔ کوآٹھوں میں لئے ایک طرف دیک کر کھڑے ہو گئے۔

زیر پٹا ہو تو نکال دو۔ پھر بھی رقم پوری نہ ہو تو کچھ ادھار سا بندوبست کر دوں گا اپنا دل چھوٹا مت کرو۔۔۔“

اگلے دن کانٹے کسی طرح تیس روپے سے زائد میں نہ بک سکے اور پھر کہیں تیس روپے دن سولہ روپیہ قرض کا بندوبست ہوا تو بابا کی نجات ہوئی۔۔۔۔۔ ان کس مشکل سے وہ نکلے۔ کرہستے اس کا کندھا تھامے گھر تک پہنچے تھے۔ اہلی تو یہ۔۔۔“

وہ کاٹ کاٹ سن کر گہری سوج میں ڈوب گئی تھی، چاک بادل نے اس کے ایک مٹکا رسید کیا۔ ”ارے کیا سوچنے لگی پگی۔“ اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیا کہے۔۔۔۔۔ دور افتی پر نظریں گڑبڑ اس نے سرخ سورج کو دیکھا۔ ہوا میں اڑتے ہوئے شکرے نے اس کی نظریں اپنی طرف منقط کر لیں۔۔۔۔۔

اس نے بادل کو اٹھلی سے اشارہ دیتے ہوئے کہا۔ وہ دیکھو کتنا آزاد پرندہ ہے۔۔۔ کاش کاش۔۔۔ بادل نے منہ چڑایا کاش تو ایک چڑیا ہوتی اور کاش میں ایک باز ہوتا۔۔۔ جھٹ جھٹ شکار کر لیتا۔۔۔ ٹیلے پر بیٹھ کر کرم کرم چباتا۔۔۔ ہا۔۔۔ وہ شراوت سے ہنسنا۔۔۔“

”تاج نے خلاف معمول اس پر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔۔۔ بادل غور سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔۔۔“

”ہیں اری تجھے کیا ہو گیا ہے کہاں بہہ نکلی ہے۔۔۔“ اس نے اس کے ایک چپٹ لگائی۔۔۔۔۔ تو وہ ایک دم چونک پڑی۔۔۔ جیسے گہری نیند سے کسی نے اسے جگا دیا ہو۔۔۔ ہیں ہیں کیا کہہ رہے تھے تم۔۔۔۔۔ اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا تو بادل نے پھر اسے ایک چپٹ رسید کی اور بولا۔۔۔ ”یہ ہی کہہ رہا تھا کیا سوچ رہی ہے“ تاج نے ایک لمبا سانس لے کر اس کی مضبوط کلائی اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ”بادل تو کچھ پڑھ لکھ کیوں نہیں پیتا۔ تو کبھی کبھی بڑے اچھے گیت بناتے ہیں میں سوچ رہی ہوں تو اگر پڑھ لکھ لے تو اور بھی اچھے گیت بنا سکتا ہے۔ شاید معافی

پر کونج کا.... حالات کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے.... ٹکری کو...
گی ہوا ہے۔ خدا خیر کرے؟ تو تاجو کی رنگت زرد پڑ گئی اس۔
باپ کو ٹکسی جھلتے ہوئے کہا "بابا اب تو تم بہت بڑے ہو گئے ہو
کاٹھ سے نکلنے کے بعد جو بنجار تمہیں آیا تھا اس نے کسی کام کا نہ
چھوڑا۔ تم کہاں پہاڑوں کی خاک چھان سکتے ہو اب۔"

بڑے بہارگ خان نے آسمان کی طرف نظر اٹھاتے ہو
کہا۔ "بات تو ٹھیک ہے بیٹا پر جب ہمارے سردار ہمیں چھوڑ
تب کی بات ہے۔ یہ خوشامدی ٹکری اگر ریوڑ کی طرح بانکتے امیر
پہاڑوں پر لے جانے پر اڑ گئے تو میں بوڑھا کیا کر سکتا ہوں۔
ہی ہو گا.... بیٹا اور تو کچھ ہے نہیں ایک گلے ہے دودھ۔
بھی اتر گئی ہے کوئی بڑا وقت دیکھنا تو بیچ ڈال... میں نے بجا
سے کہہ دیا ہے کہ میری عدم موجودگی میں اپنی بیوی کو تمہارے پاس
بھیج دے.... اس کے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی خطرہ نہ ہو گا۔"
کئی راتیں آنکھوں میں کٹ گئیں اور آخر ایک رات پوچھ
بابا نے اسے جگایا۔

"تاجو۔ تاجو۔ اٹھ بیٹھ بیٹا۔ ذرا سی مٹی تھیلے میں بھر
دے ٹکری کے آدمی اطلاع دے گئے ہیں لشکر پہاڑوں کی طرف جا رہا
ہے۔ فرنگی نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ جلدی جلدی آنکھیں
مٹی وہ اٹھی۔ آج بوڑھے باپ کی بے چارگی ناگ کی طرح اس کی روج
کو ڈستی معلوم ہوئی.... وہ بے حد بوڑھا اور کمزور نظر آ رہا
کاپتے ہاتھوں سے اس نے مٹی تھیلے میں بھری۔ اور ایک پتھر اس
میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"بابا! دیکھ والے اب تمہارے وانتوں سے نہیں

چھیں گے۔ کسی پتھر پر رکھ کر انہیں کوٹ لیا کرنا۔"

بہارگ نے راتوں کنڈھے پر ٹکائی اور تیز قدموں سے کوہلو
کے بازار کی طرف چل دیا.... صبح کاذب کے جھپٹے میں ٹکری ٹیلے
پر چڑھے۔ ایک ایک کو سلام علیک سلام علیک کہہ رہے تھے ساتھ

تھوڑی دیر میں ٹکری صاحب نے گلے کی رگیں پھیلا کر
چینا شروع کر دیا۔ "بہادر بلوچو موت سے کھیلنے والے
جاننا زور فرنگی ہمارا پرانا دشمن اپنی فوج کے ساتھ ہمارے علاقے
میں آ گیا ہے وہ ہماری بستیوں کو مٹا دے گا۔ ہماری عورتوں
کو بے عزت کرے گا۔ ہوشیار ہو جاؤ.... اپنی عزت اپنی ناموس
کھیلنے اپنے ہتھیار تیز کر لو۔ کڑا وقت آنے والا ہے۔ اپنے سردار
کے جھنڈے کو تھامے آگے بڑھو.... فرنگی کو اپنی بستیوں میں
نہ داخل ہونے دو...."

بڑی دیر کے بعد جب مجمع چھٹا تو گنتی ڈاڑھیوں والے
بلوچوں نے ایک دوسرے سے اچھبے میں پوچھنا شروع کر دیا۔
ارے یہ وہی فرنگی پھر زندہ ہو گئے جن کی کہانیاں ہمارے دادا
پر دادا سنایا کرتے تھے۔ کمال ہے۔ بھئی یہ کن پہاڑوں کی اوٹ
سے یہاں آ پہنچے.... انہیں یہاں کے راستے کیسے معلوم ہو گئے
پہلے سرداروں کے بڑوں نے انہیں یہاں پہنچایا تھا پھر ہمارے
بزرگوں نے اپنا لہو بہا کر انہیں اس زمین سے نکالا اور اب
پھر ایک صدی بعد آ گئے۔ بوڑھے بہار خان نے کہا۔ "فرنگی
ہزار سال بعد بھی اپنا بدلہ لینا ہے۔ اس نے اپنے پوچھے منہ
سے یہ ابیات پڑھنا شروع کر دیں۔

ولانت بیٹھ ٹھگائی

تینڈھی اوسگ دیاٹی

دش واشہ یہ منائی

کھنڈ پھپھو بھائی

(عوام کو سنگ بٹائی کے ٹیکسوں تلے دبا دیا بدستی

میں لوگوں نے خود ہی وطن ان کے حوالے کیا)

اور پھر جب رات گئے بہارگ خان نے مٹی کی خشک مٹی
پانی کے گھونٹوں سے حلق میں اتارتے ہوئے تاجو سے کہا۔ "بیٹی
ذرا ہوشیار رہنا.... کچھ نہیں معلوم کب حکم ہو جائے پہاڑوں



کوہلو کی بستی ڈھنڈار اور ویران سی ہو گئی۔ گھروں میں عورتوں بوڑھوں اور بچوں کے علاوہ کوئی جوان نہ رہا۔ دکاندار البتہ اطمینان سے اپنا دھندہ کرنے کو موجود تھے۔

اس دن سہ پہر کو ساری بستی لڑا اٹھی ہر ایک کے منہ پر غنا فرنگی آگئے فرنگی آگئے۔۔۔۔۔ عورتیں اور بچے کچے ملاٹوں کی چھتوں پر چڑھ گئے۔۔۔۔۔ سہمی ہوئی عورتوں اور ڈرتے لرزتے بڑے بوڑھوں کی نظریں سڑک پر لگی تھیں۔ کچھ دیر میں کچھ چیمپیں اور ٹرک غنیں کرتے کوہلو کے بازار میں نمودار ہوئے۔ ان فوجی گاڑیوں سے کچھ سپاہی اور افسرانے۔۔۔ آرام آرام سے قدم اٹھاتے وہ کوہلو کے بازار کا حائرہ لینے لگے۔ پھر انہوں نے مسجد کا رخ کیا۔ عورتوں نے کوٹھوں پر کھسک کر بیٹھیں۔ ارے فرنگی اب مسجد میں جا رہے ہیں شاید مسجد ڈھا دیں گے۔ مائی گیتی نے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا میں اپنی جان دے دوں گی۔ مسجد کی بے حرمتی نہیں ہونے دوں گی!! پھر تھوڑی دیر بعد مسجد سے اذان کی آواز

ہی وہ نام بنام ہدایت سے رہے تھے۔ چاکر خان تم پچاس آدمی کی ٹکڑی کی سالاری کرتے ٹکل چلو۔ برک خان تم اپنے گھوڑے کے ساتھ علاقہ دیکھتے قافلہ کی راہ بناتے چلو۔ اوتے۔۔۔ بڑی دیر میں آیا بادل خان۔ چل بیٹا پیل خدا بخش کی ٹکڑی میں مل جا۔ پیل برا بیٹا شاہنشاہ گھوڑا تیرا خوب جاندار ہے۔۔۔۔۔

بادل نے کہا ”ٹکڑی صاحب فکر نہ کر دگھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر راستہ مجھے کچھ نہیں کہتا۔۔۔۔۔ وہ تیزی سے مڑا اور سراپہ عورتوں کے قریب رک کر تاجو کو ڈھونڈنے لگا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے اس کے گھر کی طرف گھوڑا موڑا۔ تاجو اپنی ماٹی کے سامنے کھڑی اس راہ کو تنگ رہی تھی جس پر اس کا ہاپ گیا تھا۔ وہ ادنیٰ تو اتنے سویرے اٹھ گئی ہے“ اس کا پرانا کھنڈرا پن اس قیامت صغریٰ میں بھی ابھی زندہ تھا۔۔۔ تاجو نے اس کی بات کا جواب دینا چاہا مگر اس کے ہونٹ پھر پھڑا کر رہ گئے اور آنکھیں نیکنے لگیں۔۔۔۔۔ اس نے اس کے بازو میں ایک چٹکی بھری۔ ”اری چٹکی تو بلوچ ہے یا کوئی بھانن۔۔۔۔۔ فکر نہ کر خدا نے چاہا تو جلد لوٹ آئیں گے۔۔۔۔۔“

تاجو نے ایک آہ بھر کر کہا خدا ایسا ہی کرے۔ پر بات یہ ہے بادل کہ اب واپس آکر یہاں سے نکل چل یہ کوئی زندگی نہیں ہے کہ اونٹوں کے گلوں کی طرح ہمیں ہانکا جائے۔۔۔۔۔

”چپ چپ پگلی۔۔۔۔۔ چپ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے اپنے لیے بالوں کی ایک لٹ نوچی اور اس کی مٹھی میں تھما دی۔۔۔۔۔ ”لے یہ رہا میں اسے گھے میں لپٹ لیتا۔۔۔۔۔ ایک شور بلند ہوا۔ چلو چلو۔ گھوڑ سوار دو کچ کر دو۔ اللہ اکبر۔۔۔۔۔ اس نے تاجو پر آخری نظریں ڈالیں اور گھوڑے کو ایک ایرٹھ لگائی۔۔۔۔۔ وہ اس کے گھوڑے کی ٹاپوں سے اڑتے خبار کو پیار بھری نظروں سے دیکھتی، گنگٹانے لگی (توڑے) نوجوان آخر تو نے سر سبز دشا داب کوہلو چھوڑ دیا نا) صبح ہوتے

بلند ہوئی اور فوجیوں نے صغیں باندھنا شروع کر دیں۔
تاجو نے مائی گیتی سے کہا: "لو! تم کہتی تھیں مسجد کو شہید
کریں گے یہ تو نماز پڑھ رہے ہیں۔"

مائی گیتی نے اس کی بات زور سے دہرائی: "... نماز پڑھ
رہے ہیں نماز..... اسے نماز..... یہ کیسے
فرنگی ہیں۔۔۔؟

انہیں نماز پڑھتے دیکھ کر بڑے بوڑھوں کو کچھ حوصلہ
ہوا۔ کچھ بوڑھے مرد کچھ عورتیں اور بچے ڈرے ہوئے، کچھ
دوڑ ان کی حرکات کا مشاہدہ کرنے لگے۔۔۔ دیکھتے دیکھتے
خاصا جمع ہو گیا۔۔۔۔۔!

نماز ختم ہوئی فوجی مسجد سے باہر نکلے۔ ان کے چہروں
پر عجب نور تھا۔ ایک فوجی افسر نے مجمع کے پاس جا کر پوچھا:!!
"کیا آپ لوگ نماز نہیں پڑھتے؟" مجمع پر سناٹا طاری تھا۔

فوجی افسر نے پھر ایک صوبیدار کو اشارہ کیا۔ صوبیدار
نے بلوچی میں یہی بات پوچھی! ایک بوڑھے بلوچ نے افسر کے
قریب آکر کہا: "صاحب ہم آپ کی بات سمجھتے ہیں، ہم نماز پڑھتے
ہیں پر ہم حیران ہیں آپ فرنگی کیسے نماز پڑھتے ہیں۔ ہمیں تو یہ
بتایا گیا تھا کہ فرنگی کی فوج آرہی ہے، مسجدیں شہید کر دیں گے۔
آپ لوگ تو ہمیں مسلمان دکھائی پڑتے ہیں؟"

فوجی افسر مسکرایا اس نے صوبیدار سے کہا ذرا ٹرک ادھر
لے آؤ۔" ٹرک جیسے ہی قریب آیا۔ افسر اس کی چھت پر چڑھ
گیا۔ اس نے نہایت سنبھلے ہوئے انداز میں تقریر کی۔

"بلوچ بھائیو! جہنواؤ اور بچو! ہماری سمجھ میں بھی اب یہ
بات آگئی ہے کہ آپ کو ہبکا یا گیا ہے۔۔۔ ہم لوگ فرنگی نہیں
دیکھو ہماری کمال دیکھو۔ دیکھو ہمارے بال دیکھو۔ اور کچھ
دیکھنا چاہتے ہو تو ذرا خاموشی سے میری زبان سے قرآن سنو۔
پھر اس نے بڑی خوش الحانی سے الحمد شریف کی تلاوت کی۔"

بڑے بوڑھوں نے حیرت سے انگلیاں دانتوں میں دبائیں
فوجی افسر نے کہا بھائیو پورے ملک میں مسلمانوں کی
حکومت ہے۔ انگریز کو گئے ۲۸ برس گزر گئے ہم سب آزاد
ہیں اور ہمارا ملک پاکستان ہے ہم یہاں مسجدیں شہید نہیں
مسجدیں آباد کرنے، اسکول اور ہسپتال بنانے اور آپ کو کھانا
سرداروں سے آزاد کرانے آئے ہیں۔ آپ لوگ ہرگز، ہرگز نہ بھڑکنا
ہمارے ساتھ تعاون کریں گے۔

یہ باتیں کہہ کر فوجی افسر بچے کو دا اور اپنے دستے کو
کیمپ لگانے کی ہدایت دینے لگا۔

دوسرے دن کو ہلو کے لوگوں نے ان عجیب و غریب
فرنگیوں کو بستی کا بازار صاف کرتے۔ اور اسکول کی عمارت
کھڑکی کرانے کے کاموں میں مصروف پایا۔ اور تیسرے روز تو
ٹالپوں نے عجب ہی کر دیا۔ آٹے، چینی، نمک اور سبز بیلوں سے بھرا
ٹرک بیچ بازار میں اتار کر نہایت سستے داموں اناج بیچنا
شروع کر دیا۔۔۔۔۔ کچھ لوگوں نے حوصلہ کرتے ہوئے افسروں کو
بتایا کہ ان کے پاس اناج خریدنے کو پیسے نہیں تو فوراً غریب
اور نادار لوگوں کو مفت اناج کی تقسیم شروع ہو گئی۔۔۔۔۔ اور
ایک ہفتہ بعد تو یوں لگنے لگا جیسے کوہلو میں کسی بڑی دھوم دھام کی
شادی کا اہتمام ہو رہا ہے۔ اب ان فوجیوں نے ہسپتال کی تعمیر
شروع کر دی تھی اور بوڑھے، بچے اور عورتیں تک ان کا ہاتھ بٹا
رہی تھیں۔ کچھ عرصہ بعد ہنسٹا مسکراتا اسکول ایک پھولوں کی کیر
کی طرح بھر گیا۔ اور ننھے ننھے بچے قاعدے تھاے اس کے کپاؤنڈ
میں خوشی سے اچھلتے کودتے نظر آنے لگے۔۔۔۔۔

پھر ایک دن مائی گیتی نے تاجو کو یہ خبر سنا کی کہ پاکستان
کہتا ہے یہ ماٹیاں خراب ہیں کوہلو کے لوگوں کو بچے مکان ملیں
گئے جن میں بجلی کی روشنی ہوگی اور بستی کے اندر ٹھنڈا پانی
ملے گا۔۔۔۔۔ مفت ملے گا۔۔۔! یہ بات سنی تو تاجو کا دل ایک دم

ایک دن بستی میں یہ غفلتہ بلند ہوا کہ پاکستان کا کوئی بڑا افسر کو بلو میں آنے کا، لوگوں سے ملنے کا، ان کا دکھ درد سننے گا.....!!

سب لوگ فوجی بستی کے ملحق میدان میں جمع ہوئے۔ کسٹرن صاحب نے بستی کا معائنہ کیا لوگوں کا حال احوال لیا اسی دن ایک ٹیلی بہادر بلوچوں کی پہاڑوں سے اتری تھی۔ انہوں نے اپنے ہتھیار و کام کو دیئے.....! افسروں نے سب کی تعریف کی..... اور جب بادل نے بوٹھے بہارگ خان کو سہارا دیتے ہوئے اس کی بندوق اس کے کندھوں سے اتار کر سامنے بچھی میز پر رکھی تو اس سے ضبط نہ ہو سکا اس نے افسروں سے کہا۔ اب ذرا آپ اس میرے بوٹھے چچا کو دیکھیں اس نے راستہ کا بڑا حصہ میرے کاندھوں پر چڑھ کر طے کیا ہے۔ کیا یہ عمر پہاڑوں پر جا کر لڑنے کی ہے...؟ صاحبو! یہ ظالم سردار ہمیں جھپڑوں کی طرح ہنکاتے پہاڑوں پر لے گئے تھے۔ وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ مجمع کو چیرتی تاجو بے اختیار میں پھنکتے باپ سے آکر لپٹ گئی..... دونوں در در سے نفرت..... آخر فوجی افسر نے صوبہ دار سے کہا.....

”بابا کو ہسپتال پہنچاؤ..... آخر یہ تمہارا ہسپتال اسی دن کے

بوڑھا گوشت

فضلِ قدیر

میں جب بارگ کی تازہ ہوا میں اپنے پیچیدوں کو ورزش دے کر پھر اسی گلی سے گزرتا ہوں تو حشر کا میدان گرم ہوتا ہے ہر دکان پر حریص اور کنگلے گاہکوں کے جم غفیر کھڑے لطیفانہ نظروں سے گوشت تازہ ہوتے ہوئے ہیں ایک آواز بلند ہوتی ہے۔

اماں پہلوان یہ نہیں یہ تو نرئی الا بلا ہے ذرا ادھر کا یہ سینہ کاڑنا۔
ہاں ہاں یہی یہی میاں! دوسری آواز اٹھتی ہے۔
”میاں پہلوان یہ آج نرئی ہڈیاں کیوں بھرے دیتے ہو کچھ تو خدا کا خوف کرو!“

کھٹ کھٹ قہقہہ کرتا ہوا پہلوان میل کثیف بقیان سے پسینہ پونچھ کر اپنی چکن چڑی باتوں سے کسی نہ کسی طرح گاہکوں کو نیبیڑ ہی دیتا ہے۔ وہ ہاتھ کی صفائی کا استاد ہے۔ اوپر اوپر دیدہ رو بوٹیوں کے ساتھ ہانسی ہانسی کرتے کرتے کچھ نہ کچھ چھپڑے ہر گاہک کے متھے ضرور چپکا دیتا ہے۔

روزِ جمع میں اس پتل گلی سے گزرتے باغ کی طرف جاتا ہوں یہ گلی مروہ جیہ کی طرح گناہ زن اور اندھیری ہے ہر طرف کوڑے کوکٹ کے ڈھیر بے ہمتائی ہوئی مکھیاں، بھونکتے ہوئے لاغر اندام کتے ایک ایسا معمول ہیں جن سے مغرب نہیں۔

یہ کل فصا بوں کی گلی ہے اور گوشت کی باس اس میں ہر وقت موجود رہتی ہے۔ پو پھٹنے قصاب ریڑھوں، بایسکلوں اور گدھا گاڑیوں پر گوشت کے لہو لہان بوٹے دستیوں، پٹھ اور رامیں لاد کر اس گلی میں آ موجود ہوتے ہیں۔ اچھے اور توانا جانوروں کی رانیں اور پٹھ زنجیروں سے باندھ کر دکان کے سامنے لٹکا دیتے ہیں۔

میں جب نیز قدموں سے آتو کرتا اس متعفن گلی کو لالچتا ہوں تو دودھ تک اس گلی کی آوازیں میرا تائب کرتی ہیں۔

”میاں کیا گول بوٹی ہے حلوان کا گوشت ہے کیا جاندار گوشت ہے کیا سرخ سرخ۔ دست ہے....“

مدرست پسند طبیعت پر بھی شاق گذر رہی ہے۔۔۔ گزشتہ سال میں نے سنسکریٹ میں پانچ سال کے شوق شدہ پانچ بھائیوں کو درجہ جوڑ دیا جو سروسے کیا تھا اس میں پسپا نوے فیصد لوگ زندگی میں یکسانی کی کلفت کا شکار نکلے میں نے ایڈا ہو کے ہوم اینڈ سوشل سائنس انٹیٹیوڈ میں ایک مقالہ بھی پڑھا تھا اس مقالے میں میں نے کچھ بہت پتے کی باتیں بیان کی تھیں اس تفصیل میں جانے کا تو میرے پاس فل حال وقت نہیں لیکن ایک گڑبگ بات بتانے دیتا ہوں اس سے تمہارا دوتا تھا کہ طرح اور بہت سے شریف آدمیوں کا بہت بھلا ہوگا۔

میں نے سمٹ کر کہا۔ فرمائیے میں ہمہ تن گوش ہوں۔

بقراط نے ماتھے سے عینک نیچے سرکانی اور بولے ذرا یہ سوچ لو کہ اس نسخے کو اُڑانے کے لئے تمہیں تھوڑا سا اپنی سطح سے نیچے اُتانا ہو گا! میں نے کہا۔ اُس کی فکر نہ کرو ہم نے ڈیڑھ سو سالہ انگریزی دور میں نیچے آنے میں خاص مہارت پیدا کر لی ہے ویسے بس اوپر چڑھنے کے بجائے سن سے پھسل کر نیچے اُجھانا آسان ہے۔“

وہ دھڑ دھڑا کر ہنسا اور اس نے آنکھائی چرجیل کی شان میں کچھ ناداجب کلمات کہے اور پھر مربیانہ انداز میں بولا۔ انگریزوں نے تمہیں ہنس سے غلط پٹیاں پڑھا دی تھیں وہ حقیقت اُن کی شہنشاہت پر ہنسی کے مفادات کے عین مناسبت، یہ تھا کہ تم میں احساس کمتری پیدا کریں۔ اور تمہیں بار بار تلقین کریں کہ اپنا معیار زندگی بڑھاؤ بجلا مسمر توں کے بغیر زندگی کو کوئی اہمیت برقرار رہ سکتی ہے۔ !

میں نے سو فیصد اُس سے اتفاق کیا۔ پھر اُن نے سنائی۔ اور ایڈا ہوئے
شادی شدہ جوڑوں کے بیچ و بیچ مسائل سمجھانے شروع کئے۔ میں نے
کہا ”پروفیسر مجھے سنائی ہے کوئی دلچسپی نہیں مجھے تو یہ بتاؤ کہ میں اپنی لکچر
جوڑو سے پڑا رہتی ہوں جو اچھور ہوا جا رہا ہوں اس کا حل کیا ہے ؟
وہ پھر تورو سے دھڑ دھڑا کر ہنسا اور اُس نے کہا تم دونوں کو اپنی سطح سے
فسانہ نیچے آنا پڑے گا۔ تم ذرا اپنی بیوی سے کچھ اجازت ادافوں میں درشیزگی
قائم رکھو اور تم سے کنواری نازنینوں کی طرح بچکتی اور کتراتے ہو اس طرح

میں بچپن سے گوشت کھانے کا عادی تھا مگر مجھے مدت تک سنت اور ان کے گوشت میں کوئی امتیاز نظر نہ آ سکا۔ اس گل سے سالہا سال کی یاری نے مجھے اب لمبی غذاؤں کا ماہر بنا دیا ہے۔ اور اس ممنوعہ پر مغربی دنیا تک میں جا کر یکچہرے دے سکتا ہوں۔ یہ بات میں بڑی جسارت سے کہہ رہا ہوں اس لئے کہ اسپیشلسٹ اور اکسپرٹ کی تسلی سوائے مغربی دنیا کے کہیں اور پروان نہیں چڑھتی۔ گزشتہ چند سالوں میں اسپیشلسٹوں کی فصل کچھ اس طرح ابد اکرم پیدا ہوئی ہے کہ بارش کی بوندوں کی طرح ہم انڈر ڈیولپڈ قوموں پر برساتی جا رہی ہے اور پھر بھی ختم نہیں ہوتی۔

اسپیشلسٹوں کا ذکر چل پڑا تو مجھے گھریلو زندگی کا وہ بظرا صفت بیرونی
ماہر یاد آگیا جس کی ہمسری کا شرٹ کچھ دن ہوئے مجھے میسر آیا تھا میں لاہور سے
پشاور ایک ملازمت کے انٹرویو میں جا رہا تھا اور یہاں بظرا گھریلو زندگی کے
ایک سیمینار میں شرکت کے لئے پٹلی جا رہے تھے۔ ایک مختصر یا بھی تھا
سے ہم ایک دوسرے سے ایٹ ہوم ہو گئے اور امریکن ایڈ سے لے کر۔

ویٹ نام تک سارے موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا اور سفر کرتا رہا۔ کجرات کے قریب کھیتوں میں جرقہ ہوئی بھینسوں کی طرف انگلی اٹھا کر اس نے کہا۔ ”یہ جانور تمہاری بدقسمتی کا نشان ہے خدا را ایسے اپنی زندگی سے نکال دو۔ یہ نہایت کمزور اور لڑھکھا جانور ہے اس کا دودھ پی بی کر تم سست

اور لڑھکھڑھاتے جا رہے ہو۔ تبہیں احساس نہیں یہ کتنا بے وقوف جاؤ ہے۔
 - مگر اس نے کہا بیٹھو پر ایک دھپ ماری اور منہ کر کہا۔..... تم پہ کتے ہو میں نہیں
 اپنی بیوی سے خاصہ بے زار ہوتا جا رہا ہوں..... یہ بات سن کر وہ اچھل
 دوڑا نہ ہو بیٹھا..... اب گفتگو اس کی تلمرو کی حدود میں آئی تھی۔ اس نے
 اس کا سدا وجود چمک اٹھا اس نے عینک ماتھے پر چڑھاتے ہوئے مجھ
 سے پوچھا۔ تم اپنی بیوی سے بے زار ہو۔ ”کیوں؟“

میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا وہ اس جانور کی طرح لدھڑا ہو گئی ہے۔

وہ بڑے زور سے ہنسا اور اُس نے ایک طویل قہقہہ لے کر کہا۔
 "ہاں بھئی..... ٹھیک ہے گھوڑوں زندگی کی ناخوشگوار یکسانی اور مداروں تباہی

میں برس کا میرا سن ہو گا اور قوت اور بل کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا پچ جان میں اپنے آپ پر آپ عاشق ہو گیا تھا۔ بس جی اللہ تبارک بھلا کرے میں شام کو جو سلک کا لاپہ اور دو گھوڑے بوسکی کا کرتہ پہن کر گوہر جان کے یہاں پہنچا تو اُس کے چمکے چھوٹ گئے بڑی خاطر کی۔ دے گلاس پر گلاس لٹی کا۔ اور تعالیٰ بحر خالص گھس کی مٹھائی سامنے رکھی۔ اس وقت اس کا سن ڈھل رہا تھا مگر شوق نہ سن دیکھتا ہے نہ سال یثوق تو شوق ہے۔

میں نے ہمہ تن گوش ہو کر کہا پھر؟ اس نے ایک سرد آہ کھینچ کر کہا اُس وقت دل میں استاد کی بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اگر کشتی مارنی ہے تو عزت سے دور رہ میں نے باؤجی گوہر جان سے کہا بائی جی مجھے معاف کرو۔ اس نے بڑے لاپٹ ڈالے بولی ہزار روپیہ مہینہ جیب خرچ لئے جاؤ ہم سے۔ میں نے کہا بائی جی آپ کو مجھ سے لینا کیا ہے میں پہلوان آدمی ہوں صوفی منش۔ میں آپ کے کس کام کا۔ اور خاموشی سے وہاں اٹھ آیا۔ اب کہیں کہیں پھینا دا ہوتا ہے اس عمر میں صبح سے شام قیہ کوٹتے دل اُوب جاتا ہے۔

پہلوان سے میری یاد اللہ برابر بڑھتی گئی اور وہ روز گوشت کے کسی نہ کسی پہلو پر مجھے طویل پیکر دیتا رہا گوشت کے اس سیر حاصل مطالعے نے مجھے اب کچھ ایسا کر دیا کہ ساری دنیا میں گوشت ہی گوشت بکھر نظر آنے لگا۔ جوان کی دوپہر جب چڑھی تو خوب سے خوب تر کی تلاش میں ادھر ادھر مادا پھرتے لگا۔ مال روڈ کے چکر پر چکر لگاتا رہا ہر طرف انسان کم گوشت کے ڈھیر نہ پاؤں نظر آئے۔

وہ جاڑوں کے آخری ایام کی ایک اداس تمام تھی ماحول کی گھٹتی سے اکتا کر مال پر اُٹلا کچھ دیر مٹر گشت سے بعد ایک رستوران میں جا بیٹھا یہ رستوران گزشتہ دس برس سے میری تنہائیوں کا سرکاری رہا تھا میں یہاں کی ہر شخصیت سے آشنا ہوں۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے خوشی جیسے سامنے ادھیڑ سے بڑھے اُڑے ہوئے ہیں۔ آج اس رستوران میں داخل ہوا تو منشی جن کا پس منظر تھا۔ اور جب میں نے پاس آرام کرسی پر لمبے

مارے گھرنے تعریف کی واقعی بہت ملائم ہوئی تھی۔ پھر صورت یہ ہوئی کہ روز میں سیر سے لوٹتے وقت پہلوان کی دکان سے گوشت خریدنے لگا۔ کچھ دن تو گوشت کی واہ واہ رہی مگر جب بعد میں تنقید کا دروازہ کھل گیا تو مجھے پہلوان سے شکایت کرنی پڑی۔

میری شکایت سن کر پہلوان زور سے ہنسا۔ اور اُس نے ہمہ تن پسینہ پونچھ کر کہا۔

”میاں روز روز حلوہ نہیں کھایا جاتا پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ سب روز گوشت ایک سا ہو تو حکمت کیسے پیدا ہو۔ اچھے بُرے کی تمیز کیسے آئے۔“

مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے کہا یہ اچھی دلتاں آپ مجھے سکھاتے ہیں کہ گھر میں بیٹھنا مشکل ہو گیا ہے روز تو تو میں میں سے ناک میں دم اگیا ہے پہلوان نے قیہ کوٹتے ہوئے کہا کوئی نہیں یہ چکر پیر تو زندگی کا حصہ ہیں۔ ابھی جوان ہو ذرا سفیدی اُٹے کی تو بات سمجھ لو گے۔ چلو آج دیکھو کیا ادلے کی بوٹی دے رہا ہوں بڈھا بھی آرام سے لقمہ بنالے گا۔“ اُس نے ایک ماہر گاریگر کی طرح گوشت کی ایک داس سے چن چن کر بوٹیاں تراشنا شروع کر دیں۔ بابو جی ساری دنیا میں گوشت کی خریداری ہے۔ گوشت کی ساری لپلا ہے جب جوان تھا تو ایک کلو گھٹنے گیا دو ایک کشتیاں ماہیں تو بڑا چرچا ہوا ایک دن گوہر جان نے بلوایا کہ بچا اب سے جو پہلوان آیا ہے ذرا اُس کی ملاقات ہم بھی کریں۔ بس میاں میرے جب اس کے آدمی نے مجھے یہ پیغام دیا تو میں بڑا حیران ہوا کہ یا اللہ میں ٹھیک پہلوان میرا رتدی کے پاس کیا کام۔ بس جی خدا بھلا کرے آپ کا میں نے اس کے ذکر سے کہلایا کہ بائی جی کو سلام دو اور کہو ہم پہلوان لوگ صوفی ہوتے ہیں ہمارا آپ کے پاس کیا کام۔ مگر میرے ساتھ کے یادوں نے کہا واہ بھئی پہلوان بھلا جانے میں حرج بھی کیا ہے بھلا ایک عورت کیا تمہیں پنجبرے میں بند کر لے گی سو بابو جی میں نے بھی کچھ خیال کسے کہا اچھا بائی جی کو سلام دینا شام کو انہیں گے۔ باؤجی خدا بھوٹ نہ بلوائے کوئی

مگہ پہلوان کو ڈھونڈتے تھیں۔ پہلوان کی دکان وہاں کہیں نظر نہ آئی کی جگہ ایک چائے کا ہوٹل قائم تھا۔۔۔ میں نے آؤ بازو تقریباً دو تو ایک مختصر سے کونے میں پہلوان کو ایک موٹے سے پر جھونٹے پایا۔ ۱۱ کے سامنے سگریٹ ماچس کا خانچہ تھا اس پر مکھیاں بٹھنا رہی تھیں ان کا جسم بری طرح جھول گیا تھا۔ اور جب میں نے ان کا شانہ پکڑ کر انہیں جھینگر کر خود کو بشکل بیچڑایا تو وہ بڑے اداس لہجے میں بولے: ”بھیا گڑ بڈھا ہو گیا ہے۔ اب کچھ ہی دن میں کیڑے مکوڑوں کی خوراک بننے والا لہڈے نے ہمیں ہاتھ پکڑ کر دکان سے اتار دیا۔ اگر لوگ مجھے فضائی فضا دے کہتے ہیں اب یہ ہوٹل نکال کر ایڈی پو لو بن گیا ہے۔۔۔۔۔ پھر وہ اپنی مخصوص ہنس پھنسے۔ وہ میں نے کہا نا بالو جی گوشت بڈھا ہو گیا ہے بڈھے گوشت کا کوئی خریدار نہیں۔ اور اب کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ وہ گوہر جان کلا والی کی بات، مان لیتا تو بڑھا وقت تو ٹھکانے سے گزر ہی جاتا۔۔۔ میں پکینڈور پر چڑھے سفید بالوں کو کھاتا کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پہلوان نے میری طرف دیکھ کر کہا جی کس سوچ میں پڑ گئے آپ اجی گوہر جان بڑی اوپنی زنائی تھی۔ اور پھر انہوں نے جب اس قصہ کو مکمل شروع کیا تو میں نے بات کاٹ کر کہا ”پہلوان گوہر جان کا قصہ میں سن چکا ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اب ریشاٹر ہو جاؤں اور اپنے بوڑھے وجود کے ساتھ مفاہمت کرتے ہوئے میں اُس گلی کو اکہتر ہستہ عبور کرتے لگا رہا

موٹے مالک سے دریافت کیا تو انہوں نے انتہائی سادگی سے برا سامنا کر کہا۔ جی ان کی بس چھٹی کر دی ہے۔ اب کام ان سے ہوتا نہیں بوڑھے بہت ہو گئے ہیں۔ کئی بل لکھنا بھول جیتے ہیں۔

میں نے اپنے دل میں کہا پرچہ ہے بوڑھے گوشت کا کوئی خریدار نہیں اور پچکے سے ہوٹل سے مرک آیا۔ ادھر ادھر گھوم پھر کر جب گھر کی طرف چلا تو قصابوں والی گلی میں پہلوان کی دکان پر خاموشی سی طاری تھی وہ دکان بند کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے مجھے دیکھ کر ایک لہڑائی ستائے انداز میں انہوں نے سلام علیکم (سلام علیکم) کا نعرہ مارا میرے قدم اگے بڑھنے سے ٹک گئے۔۔۔۔۔

میں نے کہا پہلوان خیریت تو ہے؟ وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ سب خیریت ہی ہے بالو جی۔۔۔۔۔ پھر ایک لمبا سانس لے کر وہ منہ میرے کان کے پاس لا کر کھسپھانے۔۔۔ ”ہوٹل بازیاں ہو رہی ہیں۔ ہوٹل بازیاں۔ آج صاحبزادے نے گلے سے ساٹھ روپے نکال لئے ہیں۔ کچھ نہ پوچھو بالو جی۔ کوئی دن دیکھ لو گے دکان سے مجھے ہاتھ پکڑ کر اٹھا دے گا۔۔۔ گوشت بڈھا ہو گیا ہے تاہم تو جانتے ہی ہو اس دنیا میں گوشت ہی پوچھا جاتا ہے؟“

میں ان کی ڈھارس بندھانے کے لئے کچھ اوندھے پونے نیلے کہہ گھر آ گیا۔ کچھ عرصے بعد مجھے ملازمت کے سلسلے میں کراچی جانا پڑا جہاں سے میں سات سال بعد لوٹا۔۔۔۔۔ قصابوں کی گلی لانگھتے ہوئے میری نگاہیں

اقسامه

رفاقت

سعیدہ عبدل

[illegible]

یہ نہیں کہ شوپارہ کی خوبصورتی یا گہما گہمی میں کوئی فرق پڑا ہو بلکہ اب تو
ہاں پہلے سے بھی زیادہ رونق اور چہل پہل تھی۔ رات گئے تک ساتھ والے
چھوٹے چھوٹے خوشنما بنگلوں میں مغربی موسیقی کے ریکارڈ چننا کتے اور اس
کی تیز دھن پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مست ہو کر ٹیک کر رہے۔ لیکن اسے
ان باتوں سے وحشت ہونے لگتی۔ اسے اگر کسی بات سے سکون ملا تو وہ
صبح صبح کی چہل قدمی تھی۔ نور کے تڑکے کا سہانا سہانا وقت پر نندوں کے
خوش الحان گیت ننھے ننھے باغیچوں میں کھلے ہوئے شبنم میں نہانے پھولوں کی
پیاری پیاری خوشبو اور تروتازہ ہوا کے خوشگوار جھنکے۔۔۔ اسے اب حیرت
کو دیکھنے انہیں محسوس کرتے اور اپنے آپ میں جذب کر لینے میں بڑا لطف
آتا تھا وہ چائینیز شو میکر۔ چونگ با کے یہاں کے بنے ہوئے کالے

آج تقریباً بارہ سال بعد سمرنا اپنے میکے واپس آئی تھی۔۔۔ اور اتنی طویل مدت بعد آئی تھی تو کس حال اور کن حالات میں۔۔۔ نہ پایا نہ گھر کی دہلیز پہنچنے میں پائپ دبا نے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہتے ہوئے ملے اور نہ اسی حلقہ نے پھیل ہوئی بانہوں کے ساتھ تیزی سے اگے بڑھ کر اسے سینے سے لگایا۔ نہ شہاب بھیانکے اپنی پٹیلیاں پر ہلکی ہوئی گھٹنگریالی لٹوں کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیچھے منسود کرتے ہوئے اگر اس کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگا کر پیار کیا اور نہ ہی چھوٹی بہن روزینہ اس کے گلے میں بانہیں مائل کر کے زور سے چیخی۔ "ارے اپنی انگلیں۔۔۔ بلکہ وہ قہقہوں اور خوشیوں بھری چیخوں سے گونجتا ہوا بھرا پٹا خوشگوار گلاب کھنڈر کی طرح ویران ہو چکا تھا اور اس پر قبرستان جیسا ہولناک ساٹا چھایا ہوا تھا وہ بے اختیار ہو کر امی کے پلنگ پر گر پڑی اور تکیے پر منہ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔۔۔ کچھ دیر یوں ہی صاف شفاف ٹمکیہ جھگڑنے کے بعد اس نے سسکیوں کے درمیان آہستہ سے کہا۔ "امی آپ تو میری ذرا سی پریشانی پر بالک ٹھٹھکی تھیں اور اب جبکہ میں بالکل بے اسرار ہو کر دنیا میں تنہا ہو کر نجف و زاد ہو کر آپ کے پاس آئی ہوں تو آپ نہیں ملتیں۔ مجھے آپ کی ہمدردی کی ڈھادس اور پیاد کی اشد ضرورت ہے۔۔۔ خدا کے لئے صرف چند لمحوں کے لئے واپس آجائیے۔۔۔ میں

سوئیٹس کے وانگ شو میں بڑا آرام محسوس کرتی ہوئی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ہوا کی سناڑ کی گونجی سانسوں میں سموتی شو پارہ سے کئی میل اگے نکل جاتی پھر وہاں کے فیشن ایبل بازار بند پر دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ چلتی پریڈنسی روڈ سے ہوتی ہوئی گھر واپس آجاتی اسے سب کچھ ویسا ہی معلوم ہوتا جیسا آج سے بارہ تیرہ سال پہلے تھا۔ اس حسین وادی کے وہ پرکیت تھا۔ وہ قدم قدم پر بکھری ہوئی دل دریاں وہ سفید سفید جینے تنوں والے نیلگوں آسمان کو نکتے ہوئے لمبے سفید کے درختوں کی قطاریں وہ عظیم الشان چار کے دروں کے جھنڈ وہ سیب آلو بخارے اور چیری کے سکرلتے ہوئے شلوے ... وہ پھاروں کے ڈھلان پر اونچے نیچے پھرتے شال کے بھساتے کھٹ وہ خدا میں پھیلی ہوئی زعفران کی دل بھا دینے والی خوشبو اور اس طرح حسن و دلربائی میں ڈوبی ہزاروں دبیریں سب کچھ اپنی اپنی جگہ ویسی ہی دلکش تھیں ... البتہ اس کے دل کی کائنات میں سدا کے لئے خزاں نے اپنا ڈیرہ جمایا تھا۔ ادھر اس کا عزیز شوہر دل کے دور سے میں ہمیشہ کی عیند سو گیا۔

ادھر شفیق اور پیاری ماں اشد کو پیادوں ہوئی۔ باب کا سایہ پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔ وہ بیوگی کا بیباک بادل پہنے دور داز کے دیس ناٹھیریا سے پکے آئی تو دل اجڑ چکا تھا۔ دوست اسباب اور عزیز واقارب اس کی جڑاں سال بیوگی کا افسوس کرتے ... اس کے غم میں شریک ہوتے اور دکھ درد بانٹنے کے لئے برابر آتے رہے۔ ... لیکن کافی دنوں انہیں پروا نہ تھی کہ بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے ان کی باتوں میں بناوٹ اور تصنع کی آمیزش ہو ... جیسے وہ لوگ اس کی بد حالی احساس محرومی اور یکپہلی کا تصور ڈال رہے ہوں۔ اور پھر ایک دم سے اس کا جی چاہا کہ یہ رسمی گفتگو کرنے والے لوگ اس کی تنہائی میں غفلت نہ ہوا کریں ... تنہائی ... کتنی عزیز تھے۔ یہ یہ تنہائی بھی۔ کوئی ساتھ دے یا نہ دے لیکن یہ ساتھ نہیں چھوڑتی۔ مرتے دم تک غم خواری کرتی ہے۔ کتنی بے غرض رفیق اور انہیں ہوتی ہے یہ۔

اس نے اپنی دس سالہ سرخ و سفید پیاری سی بیٹی کو ای پریڈنسی

کو نوٹ میں داخل کر دیا جس میں بچپن میں اس نے خود بھی پڑھا تھا اور خود وہیں ٹیچر کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ ان کے پرنے چوکیدار مضمون بیٹی زینما اس کے گھر کا کام کا کچ کرنے صبح ہی صبح آجاتی اس کی ماں نوراں کھانا پکا دیتی سمرتا کا وقت بھی اسکول میں اچھا گزر جاتا اور پیسے بھی اچھے خاتمے مل جاتے کچھ پیسے وقت بے وقت کے لئے بینک میں بھی جمع تھے ... اس نے یہ پیسے اپنے میاں کے شراب اور چوٹے سے بڑی ہمتیاں جھیل کر بچائے تھے۔ بس اس کی اسی عادت سے وہ بے حد نالاں تھی۔ پھر بھی وہ جیسا بھی تھا اس کا شوہر تھا اور شوہر جیسا ہی ہو ایک عورت کی عزت کی زندگی کے لئے بڑا سہارا ہوتا ہے ... خیر ... زندگی اب ایک ہیچ پرگ گئی تھی اور وہ رفتہ رفتہ اس خاموش زندگی کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ لوگوں نے بہت چاہا کہ وہ حسب سابق کلب کی ممبر بنے سوشل فکشنز اور پکنک پارٹیز میں شریک ہو اور پہلے کی طرح وہاں کی ہنسی گرل کھلائے۔ لیکن اس نے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ان مشاغل سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

جب کچھ ماہ و سال اسی ہی پرسکون تنہائیوں اور گہری خاموشیوں میں گند گئے اور وہ اپنے اوپر بیٹی ہوئی قیامتوں کو کچھ کچھ بھولنے لگی تو اچانک ذہن کے نہ جانے کون سے پردے کے پیچھے سے ایک دھندلی سی تصویر ابھری اور پھر اس کے نقوش بتدریج گہرے ہوتے ہوتے ایک بالکل صاف اور واضح تصویر کا روپ دھار گئے۔ سمرتا نے چونک کر اسے دیکھا ... یہ تو شرجیل تھا ... اس کی پہلی اور آخری محبت اور یکایک وہ پندرہ سولہ سال پہلے کی دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ نوجوان کا زمانہ تھا۔ ایسے میں زندگی کتنی حسین اور دلچسپ معلوم ہوتی ہے ... اس دن وہ لوگ سونا باغ پکنک کے لئے گئے بھٹے تھے واپسی میں دریائے جہلم پر ان کا شکارہ پرسکون رفتار سے بہہ رہا تھا وہ اور اس کی سہیلیاں کوئی خوبصورت لے والا کیت دم سروں میں گارہی تھیں کہ دفعتاً ساتھ ساتھ چلتے والے شکار سے آواز آئی۔ یہ رفتار شان کے خلاصہ ہے تیز چلاؤ۔ چلو ہو جائے مقابلہ تمہارے گنگس لی کوک اور ہمارے تھلاور گارڈن۔ کا یہ دونوں شکاروں کے نام تھے۔ اس جاذب نظر لڑکے کا یہ کہنا تھا کہ شکار کا یہ

یہ سیر و تفریح اور خوشباشی کے ایام طویل سے طویل تر ہوتے گئے۔ اتنے بہت سے آسودہ حال جوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولی ایک جگہ جمع ہو جائے تو کوئی نچلا کیسے بیٹھ سکتا ہے۔ چند دن بعد ایک لمبی سیر کا پروگرام بنایا۔ چند دن کی وادی تھی جہاں پوری جماعت ٹٹوؤں اور حجروں پر لد کر روانہ ہوئی۔ جب چڑھائی شروع ہوئی تو منظر اور بھی زیادہ خوشنما ہو گیا۔ سمرنا اور شرجیل کے گھوڑے سب سے پیچھے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ شرجیل کے بائیں ہاتھ پر ہیب کھڑ تھا۔ اس نے چلتے چلتے آہستہ سے سمرنا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں اس کھڑ میں اتفاقاً گر جاؤں تو یہ کتنی دلفریب موت ہوگی کیونکہ تم..... اس کے منہ سے بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ اچانک سمرنا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا..... شرجیل پاگل مت بنو تم تو مجھے مار رہی ڈالو گے۔ چلو تم اپنا گھوڑا اس طرف لے آؤ۔۔۔“

یہ حسین لمحہ شرجیل کی زندگی میں کیسا تیناک تھا..... اس کے منہ سے سرشاری کے عالم میں نکلا۔ زندگی کے سفر میں اتنا خوبصورت ساتھی ہو تو میں کیا شدا مد نہ جمیل ڈالوں.....؟

پک ناک بہت ہی پر لطف رہی ایک لکڑی کے خوشنما ہٹ میں مزے مزے کے کھانے کھائے گئے۔ اس کے بعد ناش کے مختلف کھیلوں کی بازی جمی پھر سریلی آوازوں کے گانے ٹیپ کئے گئے کچھ لڑکیاں اور لڑکوں نے مغربی موسیقی پر ٹیک اور جرک کیا شام کی چائے جلدی پی کر سب گھر روانہ ہو گئے..... کیونکہ راستہ میں انہیں وہ پل بھی دیکھنا تھا جو برف سے ڈھکا ہوا تھا۔

جب یہ لوگ قہقہوں ہنسی کی پھلجھڑیوں گنگناہٹوں اور خوبصورت باتوں میں مگن وہاں تک پہنچے تو برف کا اتنا بڑا سا پل دیکھ کر حیران رہ گئے۔ دو بڑی بڑی پتھر کی چٹانوں کے بیچ میں یہ برف کی بہت بڑی اور بہت موٹی چٹان یا پل رکھا ہوا تھا اور اس برفیلے پل کے نیچے

نے رفتار تیز کر دی۔ لڑکیاں بہت جیتی چلا نہیں لیکن تو یہ کیجئے ان پر جیتے کا بہت سوار تھا۔ وہ طوفانی تیزی سے اڑے چلے جا رہے تھے۔ آخر منزل مقصود پر پہنچ کر سمرنا نے اس خوش شکل لڑکے شرجیل کی وہ خبر لی کہ اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے اور وہ لگا ہاتھ جوڑے اور معافی مانگئے۔

اس دن تو سمرنا شرجیل کی آنکھوں میں لپٹنے لے پندیدگی کی گہرائی دیکھ سکی تھی کیونکہ وہ سخت غصے میں تھی لیکن رفتہ رفتہ جب دونوں خاندانوں میں دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے اور جلد جلد بات چیت ہونے لگی تو دونوں نے محبت کی لہروں کو خاما گرم پایا۔

سب سے زیادہ قریب وہ اس وقت ہوئے جب پہلا گم میں دونوں خاندانوں کے نیچے پاس پاس نصب ہوئے۔ ہر سیر و تفریح ہر پکنک کے پروگرام میں دونوں خاندانوں کے افراد کی شرکت لازمی ہوتی تھی۔ روزانہ شام کو سب ایک ساتھ ہی نکلتے لیکن آگے بڑھتے بڑھتے بڑوں کی ٹولی جوان لڑکیوں کی ٹولی سے خود بخود الگ ہو جاتی اور اکثر ایسا ہوتا کہ سمرنا اور شرجیل کسی نہ کسی حیلے سے اپنے بھائی بہنوں اور کزن وغیرہ کی ٹولی سے کٹ کر الگ آگے کبھی پیچھے رہ جاتے۔

ایک بے حد حسین شام جبکہ شاہ خاں اور سائے والے سب سے اونچے پہاڑی چوٹی کے عقب میں جاتا ہی چاہتا تھا موسم نہایت ہی خوشگوار اور پر لطف تھا قدرت کی ہر شے سے خوبصورتی کی شعائیں پھلتی رہی تھیں۔ بچے ہر سیر اور شرجیل ندی کے کنارے شقائق پھتکے ہوئے پانی میں پاؤں ٹپکاتے بیٹھے تھے شرجیل کی ہر شوق نگاہیں سمرنا کے عارضی ٹکڑوں کی بناٹیں لے رہی تھیں۔ وہ ان ٹکڑوں کے بار کو محسوس کر رہی تھی لیکن انجان بن کر بولی۔ ”شرجیل دیکھو پانی کے نیچے یہ رنگیں سنگریزے کتنے پیارے لگ رہے ہیں۔ وہ ایک سیکڑ لکڑی اور پھر اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”اوہ۔۔۔ یہاں قدرتی مناظر اپنے اصل روپ میں جلوہ گر ہیں۔۔۔۔۔ اتنے پرکشش اتنے مسحور کن کہ جی چاہتا ہے کہ ساری عمر یہیں بتا دوں۔“

شرجیل نے مدہوش ہو کر کہا۔ ”لیکن اس سے کہیں زیادہ قیامت خیز پہاڑ بنا دے والا حسن قدرت کے اس جیتے جاگتے شاہکار کا ہے۔“

کر کہا:

”میرے اوپر بھروسہ نہیں ہے تم کو۔“

سمرنا نے نیچے گرے ہوئے سوکھے پتوں پر نظر گاڑ کر کہا: میں اپنے بارے میں تو کچھ وثوق سے کہہ بھی سکتی ہوں لیکن دوسرے کیا سوچ رہے ہوں گے یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں۔“ اور میں اسی وقت اپنے آپ ہی اس کی شرمائی شرمائی نظریں اوپر اٹھیں۔ نگاہوں کا ایک لطیف تصادم ہوا نظروں کا ایک حسین ٹکراؤ اور چند ثانیے کے لئے وہ نگاہیں ساکت ہو کر رہ گئیں فضا پر ایک ایسا سکوت چھایا رہا جس میں نفوس کی حسین گنگنا ہٹ سکتی دل پہنچ لینے والی موسیقی کی نرم پھوار تھی فرشتوں کا گیت تھا حوروں کا تقدس تھا۔ آج شاید پہلی بار سمرنا کی پُرکشش آنکھوں میں پیار چمک اٹھا تھا اور پھر وہ جادو بھرے لمحے بڑی سرعت سے گزر گئے۔ سمرنا اپنی نگاہوں کے پیمانے چمکانے کے بعد لمبی پلکوں کی چلمن گرا کر گھبرائی گھبرائی سی بیٹی تھی لیکن شرجیل اس کے نشے میں یوں مرشار تھا جیسے دنیا کو بھول بیٹھا ہو۔ پھر اسی نے ہر سکوت توڑی اور سحرزدہ سے انداز میں آہستہ سے کہا:

”سمری تم میرے چمن حیات میں ایک بہار جانفزا بن کر آئی ہو۔ تمہیں پالینے کا تصور کتنا سرور لگتا ہے میرے لئے۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ اگر تم نہ ملیں تو یہ گلشن جل کر راکھ ہو جائے گا میں ناخست و تاراج ہو جاؤں گا، تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔ بولو کیا تم یہ گوارا کر سکو گی۔“

سمری نے اس کے جواب میں ہلکے سے اپنا سر نیچے میں ہلا دیا۔ شرجیل کے لئے یہ ہی بہت کافی تھا اس نے اسی ایک اشارے میں اپنی ساری زندگی کی خوشیاں وابستہ کر دیں اور اس کا دل آنے والی مسرتوں کے خوش آئند تصور سے جھوم جھوم اٹھا۔ وہ دونوں محبت کے متوالے اسی طرح اپنی پاکیزہ، سادہ اور

سے ایک پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سے گرتا ہوا پہاڑی نالہ اچھلتا کودتا اور بے حد شور مچاتا نیچے چلا جا رہا تھا۔ سب قدرت کا کیرشمہ دیکھ کر بے حد محظوظ ہوتے ہوئے گھر جانے کے لئے اپنے گھوڑوں پر سوار ہونے لگے۔ اتفاق سے اس وقت سمرنا کو ناشپاتی کے ایک بڑے سے درخت پر ایک بہت پیاد ا طوطا نظر آیا۔ اس نے آج تک اتنا بڑا اتنا رنگین اور خوبصورت طوطا نہ دیکھا تھا۔ وہ چپکے چپکے اس کے قریب جا کر اسے دیکھنے لگی۔ شرجیل اسے بلانے آیا تو سمرنا نے ہونٹوں پر انھلی رکھ کر اسے چپ رہنے کو کہا۔ دونوں اس حسین طوطے کو اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ بڑے بڑے قوس وقوع جیسے پیارے رنگوں والے پر پھر پھر اسما اڑ نہیں گیا۔ زرینہ، ہمیں ملہو شاہد اور عدنان ان کو پکار پکار کر چلے گئے تھے۔ اب جو یہ لوگ اس جگہ آتے جہاں گھوڑے کھڑے تھے تو دیکھا کہ کاررواں کوچ کر چکا ہے سمرنا کے گھوڑے کا ہاتھ پائی پینے گیا ہوا تھا گھوڑے کی رکاب کافی اونچی تھی۔ شرجیل نے سمرنا کی مدد کرنا چاہی لیکن اس نے منع کر دیا اور ایک پتھر بدھ کر دیا کہ جیسے ہی پاؤں رکاب میں ڈالنا چاہا نہ جانے ایک دم سے گھوڑے کو کیا ہو گیا۔ وہ پہلے بڑے زور سے ہنہنایا۔ پھر بڑی تیز رفتار سے اس طرف بھاگ گیا جدھر سے ابھی یہ لوگ آئے تھے۔ اب ہاتھ کا انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ دونوں ایک پتھر پر پڑنے لگے۔ سمرنا نے سنجیدگی سے کہا۔ یہ تو بڑی مشکل ہو گئی۔ نہ جانے وہ لوگ کتنے آگے نکل گئے ہوں گے۔ شرجیل مسکرا کر بولا۔

”گھبراہٹ نہیں۔ ہم لوگ بہت تیز دوڑ کر جلدی سے ان کو پکڑ لیں گے۔“

اتنے میں ہاتھ پائی پی کر واپس آ گیا۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ اس کا گھوڑا بھاگ گیا ہے وہ عود بھی سر پر پاؤں رکھ کر اسے پکڑنے کے لئے دوڑ گیا۔

سمرنا پھر فکر مندانہ لہجے میں بولی، شرجیل اب کیا ہو گا۔
”شرجیل نے نہایت سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں جھانک

جلاد کے روپ میں ابھرتے دیکھا۔ شروع شروع میں اس کو ایسا لگا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا اور وہ غم سے پاگل دیوانی ہو جائے گی۔ لیکن یہ سب کچھ بھی تو نہ ہوا۔ امیر کبیر سسرال کی ہنگامہ خیز زندگی اور پھر شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریاں اور فرائض۔ ان سب نے مل کر اس کے دل سے شرجیل کی یاد کو محو کر دیا۔ اس کا سادہ اور بھولا دل اس زندگی کی رنگینیوں اور دلچسپیوں میں بہل گیا۔ اور وہ دور دراز افریقہ میں زندگی کے دن بنانے یا بھونکنے کے لئے زندہ رہی۔ وہ اپنے آتی بابا کے پاس کئی بار آئی اور گئی۔ ان کے دلوں میں بھی اس کے لئے وہی شفقت اور محبت عود کر آئی تھی جو اپنی پیاری بیٹی سے پہلے تھی اور اس کا دل بھی ان کی طرف سے آئینے کی طرح شفاف ہو چکا تھا۔ اور اب اتنے عرصے بعد جب اسے یہ سب کچھ بڑی شدت سے یاد آرہا تھا وہ سوچنے لگی کہ اصل معنوں میں وہ شرجیل کو کبھی نہ بھلا سکی تھی وہ ہمیشہ سے اس کے دل میں رچا بسا ہوا تھا۔ نس نس میں ہمیشہ سے سمایا ہوا تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ یہ دوسری بات تھی کہ کچھ سالوں تک اس کا خیال خارجی حالات کی وجہ سے گہرے پانیوں میں ڈوبا رہا۔ لیکن آج وہ پھر اپنی تمام عنایتوں کے ساتھ اس کے دل کی دنیا میں شورش طوفان بن کر ابھر آیا تھا۔ زندگی کے نئے لمحے پرانے لمحوں کی جگہ لیتے رہے اور نئے ماہ سال پرانے ماہ و سال کی اور سمرنا کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی اپنی بیٹی حسنہ بڑی ہو گئی اور وہ حیرت سے دیکھتی رہ گئی کہ کس طرح تاریخ بار بار اپنے کو دہراتی ہے۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے ابھی کل ہی تو وہ خود حسنہ کے برابر تھی۔

حسنہ جب میٹرک میں پہنچی تو اس کی ایک خوبصورت سے لڑکے دانی سے دوستی ہو گئی۔ اکثر یہ لڑکا حسنہ کے گھر آجایا کرتا تھا۔ سمرنا کو وہ بہت اچھا لگتا تھا۔ اس لئے کہ نہ صرف وہ خوب رو اور بھولا بھالا تھا بلکہ نہایت تہذیب یافتہ اور خوش اخلاق بھی تھا۔ حسنہ اور اس لڑکے دانیال

معصوم باتوں میں کچھ ایسے کھوئے کہ وقت کا احساس ہی جاتا رہا جب اپنے دلکش خوابوں سے چونکے تو دیکھا کہ قافلے والے ان سے بہت دور جا چکے ہیں۔۔۔ ان کے دل کو ان جانے خوف نے دبوچ لیا۔۔۔ گھر پہنچ کر لوگ انہیں شک و شبہ کی نظروں سے دیکھیں گے۔ سہیلیاں اور رقابت میں ڈوبے پھیرے میرے بھائی کیسی چٹکیاں لیں گے۔۔۔ گھر پہنچ کر وہی ہوا جس کا خدشہ سمری کو کھائے جا رہا تھا۔ ان دونوں نے لاکھ اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کیا لیکن مانتا کون تھا۔

اس انجانے حادثے کے نتیجے میں شرجیل اور سمرنا پر سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ کچھ دن عجیب کمپرسی کی حالت میں گزر گئے۔ پھر حالات نے بڑی تیزی سے پلٹا کھایا۔ وہ محفل برخواست ہوئی تو شرجیل کو ہوٹل میں منجمنٹ کا کورس کرنے ملک سے باہر جانا پڑا۔ اور ستم یہ تھا کہ وہ اس طویل سفر پر جانے سے پہلے اس سے مل بھی نہ سکا۔

ادھر سمرنا کے ابا جان کے ایک بچھڑے ہوئے پرانے دوست لاگوس (نا۔ نیجیریا) سے آئے ہوئے تھے ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات اس قدر بڑھے اور تجدید محبت اس طرح ہوئی کہ ان کے صاحبزادے نوید شہزاد سے آناٹا سمرنا کی شادی طے کر دی گئی۔ اس غریب کے لئے شرجیل کی جدائی کیا کم سوہان روح تھی کہ اوپر سے یہ ظلم و ستم ٹوٹ پڑا۔ وہ بہت جی پی چلائی۔ مگر ہمارے گھروں کی تہذیبی و معاشرتی منافقت نے آزاد خیالی اور دینی نو سیت کے ان گنت روپ دھار کر سب کچھ ملیا میٹ کر دیا اور پھر وہ چونکہ ایک بار بدنام ہو چکی تھی اس لئے اسے خاندان اور صرف خاندان کی ناک اونچی رکھنے کے لئے سوچنا تھا۔۔۔۔۔ زندگی کے اس موڑ پر کئی بار اس کے لئے سب لوگ اجنبی بن گئے کئی بار اس نے اپنے باپ کو اندھیروں میں ڈوبتے اور کوٹھالنے

میں بڑی دہننی ہم آہنگی تھی۔ حالانکہ ابھی دو قوں بچے ہی تھے پھر بھی ان کی آنکھوں میں ایک دوسرے کے لئے پسندیدگی کی جھلک کو سرزنس نہ بھانپ لیا تھا۔

ایک روز دانیال کے یہاں ڈرن تھا۔ حسہ کے ساتھ سمرنا بھی مدعو کی گئی تھی۔ سمرنا نے بہت پیچھا چھڑایا لیکن حسہ جان کو لگ گئی کہ آپ کو جانا ہی پڑے گا۔ سمرنا اب خاموش زندگی کی عادی ہو گئی تھی بادل ناخواستہ حسہ کی خاطر چلی گئی۔

ڈرائیونگ روم کے دروازے بردانی کے ساتھ ایک لاپتے قد کا خوش شکل آدمی مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی سمرنا کا دل ایک بار بڑی زور سے اچھلا اور پھر ڈوبنا ہوا محسوس ہونے لگا لیکن بہت جلد اس نے اپنی حالت پر قابو پایا۔۔۔۔۔ تو اسے آج معلوم ہوا کہ دانی شرجیل کا بیٹا ہے۔ سمرنا اور شرجیل کو ایک دوسرے کو پہچاننے میں کوئی وقت نہ ہوئی۔ سمرنا کو دیکھتے ہی شرجیل چند لمحوں کے لئے مبہوت ہو کر رہ گیا مگر پھر فوراً ہی اسی طرح خاطر ملاقات میں لگ گیا جیسے آج پہلی ملاقات ہو۔۔۔۔۔ اس کے بعد کبھی ملنے ملانے کا سلسلہ جاری رہا لیکن سمرنا اور شرجیل کو اپنے بچوں کے سامنے برابر اس قسم کی ایکٹنگ کرنا پڑی جیسے وہ ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے نہیں۔ پہچانتے نہیں۔ اکیلے میں ملنے کا اب کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔ سمرنا نے دیکھا کہ شرجیل کی آنکھوں میں اب بھی وہی چمک وہی سحر اور وہی کشش ہے اور بے ساختہ اس کا جی چاہا کہ اس سے طویل باتیں کرے اور پھر ملنے کے وقت سے اب تک کی ساری رام کہانی سنائے مگر پھر اس نے سوچا کہ اب اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔

ادھر شرجیل کے دل میں ہزاروں گلے شکوے مچل رہے تھے

وہ سمرنسے اس کی بے وفائی کی وجہ پوچھنے کے لئے بے چین تھا۔

ہلکی ہلکی خوشگوار سردیوں کی ایک سہانی صبح سمرنا حسب معمول اپنی چہل قدمی کے لئے نکلی ہوئی تھی کہ ”تخت سلیمان“ پہاڑ کے دامن والی سڑک پر بالکل اچانک ہی شرجیل سے ٹکھیر ہو گئی۔ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔۔۔ سمرنا کا دل بے تحاشہ تیزی سے دھڑکنے لگا۔ شرجیل کی آنکھوں میں دکھ کے سائے لرزاں تھے اور دل میں طوفانوں کا ریلہ تلہلہا رہا تھا۔ اس نے التجا کی کرکسی پُر سکون گوشے میں چل کر بیٹھا جائے لیکن سمرنا نے اس کی خواہش مسترد کر دی۔۔۔۔۔ مجبوراً چلتے چلتے اسے باتوں کا آغاز کرنا پڑا۔ اس نے راستے کے کسی خوبصورت موڑ پر نظر میں جما کر ہو لے ہو لے لرزتی آواز میں کہا۔۔۔۔۔ ”میں اتنے سالوں سے تمہاری تمنا میں جلتا رہا ہوں۔ تمہاری محبت کی“۔۔۔۔۔ اچانک سمرنا نے بات کاٹ دی۔۔۔۔۔ کیا یہ اچانہ ہو گا کہ ماضی کی راکھ ہم نہ کر بیڑیں۔۔۔!؟

”مجھے اب بھی تمہاری قربت کی شدید آرزو ہے۔ کیا ہم شادی“ شرجیل کی بات سمرنا نے پھر کاٹ دی۔ شادی میں کیا رکھا ہے۔ ”سمرنا کے لبوں پر یہ کہتے ہوئے ایک ایسی مسکراہٹ کھیل گئی جس میں طنز بھی تھا اور حسرت بھی۔“ شادی تو میں نے بھی کی تھی، شادی تو تم نے بھی کی تھی۔ اصل چیز تو یہ دلوں کی رفاقت سو وہ ہم الگ رہ کر بھی ایک دوسرے کو دے سکتے ہیں۔ اور پھر اس سے بڑھ کر تمہیں اور کیا چاہیئے کہ چند سالوں بعد میں نے اپنا زندگی بھر کی کمائی اپنی سب سے عزیز اور پیاری بیٹی حسنہ تمہارے بیٹے کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اسے ہی سب سے بڑا تعلق سمجھنا۔ دلوں کی رفاقت روحوں کا ملاپ ہے“





بیگم مسرت برکی
فضل قدیر
سید علی محمد حسینی

مدیر اعلیٰ :
مدیر :
نائب مدیر :



مئی — جون — ۱۹۷۶ء
جلد ۲۹ — شماره ۳

چند سالہ : نو روپے
فی پرچہ : ڈیڑھ روپیہ

اسے شمارے میں

۲	وفا راجی	ابتدائیہ
۳	نسیم سحر	حضرت لعل شہباز قلندر کی صوفیانہ شاعری
۷	سلمان صدیقی	غزل
۸	فضل قدیر	اسلام آباد کا جشن بہار (نظم)
۹	سید محبوب علی	آخری مغل تاجدار کے ایام کرب و بلا
۱۳	خواجہ شبلی پانی پتی	نیابٹ اور اقتصادی جائزہ
۱۹	قیصر سہا پوری	پیکر شرافت — مولانا حالیؒ
۲۷	سلطان محمد بسمل	تحریک پاکستان اور طلباء کے عمل کردہ
۲۸	روح افزا حمید	بڑھے چسپو
۲۹	پیر زادہ عاشق کیراٹوی	سرزمین چنگیز خان سے
۳۳	ایم فیروز شاہ	غزل
۳۵	ملہ شاد ارشدی	اردو شاعری میں آزاد نظم اور تشریف نظم کی تحریکیں
۳۹	ڈاکٹر سید حسین جعفر حلیم	غزل
۴۰	از آغا سلمان باقر	غزل
۴۱	ابراہیم کاظمی	غزل کا افسانہ — ایک تجزیہ
۴۲	سلیم خان گمتی	دکھتے بہترین (افسانہ)
۴۷		لاہور (افسانہ)

محمد شید پر نثر، اسلام آباد

ادارہ مطبوعات پاکستان — پوسٹ بکس نمبر ۲۵۵ — راولپنڈی

ابتدائیہ

مسلم ملت نے برصغیر کی تقدیر بنانے میں ہمیشہ عظیم کردار ادا کیا۔ مئی ۱۹۴۷ء میں یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے بریٹش راج کے خلاف ایک زبردست جنگ آزادی کا آغاز کیا۔ یہ کوشش برقی قسمی سے ناکام ہوئی لیکن اس کے اثرات بہت دور رس اور نتیجہ خیز تھے۔ اس نے پوری قوم کو احساس کمتری سے نکال دیا اور برصغیر کے بایسوں پر یہ ثابت کر دیا کہ غلامی ان کا ازلی وابدی مقدر نہیں اگر وہ کوشش کریں تو غلامی کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار نہیں لے سکتے ہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ غیر مسلم مؤرخین مسلمانوں کے اس عظیم کردار پر پردے ڈالنے کی مسلسل کوششوں میں مصروف نظر آتے ہیں چنانچہ اس کے پیش نظر ہم مئی کے اکثر شماروں میں اس داستان پارینہ کو بیان کرتے ہیں اس مرتبہ بھی ہم نے اسی کا اہتمام کیا ہے۔

خدا کا بڑا شکر ہے کہ عوامی حکومت نے بے مثال فراست اور دانشمندی سے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو ایسی بنیادوں پر استوار کر دیا ہے کہ آج پاکستان کا وقار بیرونی دنیا میں بہت بلند ہو گیا ہے۔ وزیر اعظم نے حال ہی میں شمالی کوریا، چین اور افغانستان کے دوڑے کئے ہیں ان دوروں میں ملک کو بڑی کامیابی میسر آئی ہے۔ دوستی و خیر رگالی کے ساتھ ساتھ پاکستان کے مبسنی برحق موقف کی پُر زور تائید کی گئی ہے۔ وہ دن دور نہیں کہ امن و آشتی حق و انصاف کا بول ہوگا اور پاکستان کے جملہ مسائل خیر و خوبی سے سلجھ جائیں گے۔

۷۷-۱۹۷۶ء کا وفاقی بجٹ عوامی حکومت کا ایک بڑا کارنامہ ہے اس بجٹ میں جس طرح زرعی شعبے کو پوری امداد دی گئی ہے۔ اس کی مثال گذشتہ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بجٹ کا ہر طبقے نے خیر مقدم کیا ہے۔ یقین ہے۔ آنے والے مالی سال میں ملک میں ترقی کی رفتار اور زیادہ تیز ہو جائے گی۔

خدا کرے یہ شمارہ مرغوب قارئین ہو۔

حضرت نعل شہباز قلندر کی صوفیانہ شاعری

وفاراشدی

کے عروج کا زمانہ تھا۔

سیاسی لحاظ سے حضرت شہباز کا زمانہ برصغیر میں ذہنی خلفشار اور روحانی انتشار کا زمانہ تھا۔ سماج میں اسلامی عقائد اور دینی اقدار متزلزل ہو رہی تھیں۔ ہندو فلسفہ اور رسم و رواج نے قوم پرستی کو غالب کر دیا تھا۔ اضطراب و انقلاب کے پُر آشوب اثرات نے دلوں میں بے کیفی اور مایوسی کی لہر دوڑا دی تھی ایسے تیرہ و تاریک حوصلہ شکن ماحول میں شہباز قلندر نے اپنی عارفانہ اور بصیرت افروز شاعری اور نغمت سے ایک جہاں کو متور کیا۔ آپ ان مشائخ دین میں سے تھے جنہوں نے فقر و درویشی کے ساتھ ساتھ جدوجہد اور تعمیر شخصیت پر زور دیا۔ شہباز کے نزدیک زندگی خالق دو جہاں کی وہ مقدس امانت ہے جس کو حسن و جمال کا دلکش و دلغواز روپ دینا قرآن میں شامل ہے زندگی کی رعنائیوں، لطافتوں اور دلکشی سے لطف اندوز ہونا ہر انسان کا حق ہے۔ تاہم جمال کائنات میں حسن ازلی کا حقیقی عکس دیکھنے کے لئے ہمت و نیت کے مرحلوں سے بھی عارف کو گذرنا ہوتا ہے۔

شہباز نے مقامات سلوک و رہ معرفت کے حصول کی خاطر صوبتیں پھیلیں۔ اپنی زندگی کو شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک۔ کے مصداق بن گیا۔ حقیقت و معرفت کی جستجو کی جگہ کائنات مظاہر قدرت،

حضرت عثمان مروندی عرف نعل شہباز قلندر، صرف ایک سالک کامل اور عارف کامل کی حیثیت سے بلند مرتبہ رکھتے تھے بلکہ ایک شاعر اور مفکر کی حیثیت سے بھی ان کا مقام بلند تھا۔ وہ جس پایہ کے صاحب علم و فضل اور صاحب تقویٰ و معرفت تھے اسی پایہ کے معلم و مقرر اور شاعر بھی تھے۔ عربی و فارسی علوم و ادبیات پر کامل دسترس رکھتے تھے۔

یہ وہ دور تھا جب سندھ میں سومرو خاندان برسر اقتدار تھا۔ بزرگوار پاک و ہند شیخ عبدالقادر جیلانی، سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء، شیخ علی ہجویری عرف داتا گنج بخش لاہوری، شیخ جلال الدین تبریزی، قطب لائق خواجه قطب الدین بختیار کاکی، شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر پانی پتی، شیخ فرید گنج شکر (پاک پتن) اور شیخ بہلول الدین ذکر یا ملتان جیسے مشائخ دین اور اولیائے کبار کے علم و عرفان اور روحانی فیضان کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ کفر و الحاد جبر و استبداد کی ظلمتیں توحید و رسالت حقیقت و معرفت کی روشنی سے چھٹ رہی تھیں حضرت عثمان شہباز افغانستان روس ترکستان ایران کے بعض شہروں مثلاً بخارا سمرقند شیراز وغیرہ بھی تشریف لے گئے۔ شیخ سعدی، فرید الدین عطار اور مولانا جلال الدین رومی وغیرہ جیسے یکتائے روزگار اباب علم فکر بقید حیات تھے۔ لیکن ہے ان حضرات سے بھی حضرت شہباز کی ملاقاتیں ہوئی ہوں گی یہ زمانہ عربی فارسی ادبیات

اور مناظر فطرت کے اسرار ہائے دروں بروں سے واقعہ و باخبر ہونے کی خاطر دور دراز ملکوں کی سیروسیاحت کی۔

شیخ پہلو الدین زکریا ملتانی جلال الدین تبریزی ابوعلی قلندر جیسے عالی مرتبت سائیکین عارفین اور صالحین کی صحبتوں اور محفلوں سے فیضیاب ہوئے اس عہد میں ملتان سندھ کا ایک حصہ تھا اور اپنی دینی و ملی خدمات کی بدولت دینی و روحانی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ حاکم ملتان خان شہید حضرت شہباز کی روحانیت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے آپ کے لئے ایک خانقاہ بنوائی اور وہاں سکونت کی درخواست کی لیکن آپ خانقاہ نشین بزرگوں میں نہ تھے۔ آپ فرمودہ خیالات جو دایمیز و غیر متحرک زندگی کو موت کے مترادف سمجھتے تھے۔ آپ نے خانقاہ یا آستانہ میں نظر بند ہو کر بند و وعظ کو شعار بنانا ملت اسلامیہ کے لئے مفید نہ پایا۔ ویس ہی قریہ قریہ سیر کی جہاں گئے وہاں ہر چھوٹی بڑی چیز کا مطالعہ کیا۔ حد نظر تک جلوہ ہائے رنگ کی اصلیت و مابینت کے کھوج لگاتے ہیں زندگی کا بیشتر حصہ صرف کر دیا۔ اس طرح تجربات و مشاہدات کے آئینے اور علم و آگہی کی روشنی میں فلسفہ تصوف و نظریہ توحید کی تشریحات کیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت شہباز مولانا رومی کی دینی تعلیمات اور اسلامی رجحانات سے متاثر تھے۔ شاعری میں آپ نے کسی حد تک دنیائے استغاثہ بھی کیا ہے۔ اور ان کا اتباع بھی عشق مجازی کی خارجی کیفیتوں سے گذر کر عشق حقیقی کی روحانی لذتوں سے سرشار ہونا کوئی آسان کام نہیں یہ منزل بڑی محنت اور ایثار کے بعد میسر آتی ہے۔ بقول مولانا رومی:-

ہرچہ گویم عشق ما خرچہ دیاں

چوں بر عشق ایم فخل باشم ازاں

گفتہ او گفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

انکار و مطالب مثنوی روم کی طرح شہباز کے فلسفہ عشق میں جو سوز و گداز ذوق و شوق بے خودی و سرستی توپ و جستجو ہے، وہ معارف عشق کی دیل خودی و خود آگہی خدا شناسی و خدا پرستی کی اُئینہ دار ہے:

عشق دوست ہر ساعت درون ناری رقص
گئے برخاک می غلم گئے برخاوی رقص
من بندہ خدایم، ہم شاہ و ہم گدایم
ہم وصل ہم جدیم، مست آست ہستم
من مرغ لا مکانم جگر لا مکان ندانم
بر تخت قدیام مست آست ہستم
اں رہ کہ قدسیاں راد شوار محنت آید
از فکر حق تعالی آساں شد است مارا
بت خاں جہاں بسیار سیر کریم
اُئینہ خود پرستی ایماں شد است مارا
اوصاف ذات خود را ایزد بداد مارا
با ذوق این معانی عرفاں شد است مارا
دریائے بے نہایت پایاں کجاست اورا
بجگر بغیر کشتی پایاں شد است مارا

شہباز کا عشق کیفیت و جنون اور جذب سرشاری کی بے پناہ قوت رکھتا ہے۔ ان کے پاس خدا کا تصور عقل و فہم کے عین مطابق ہے۔ عاشق و معشوق کا دامن نہیں چھوڑتا اور رشتہ محبوی کی استواری میں دیوار و ارگند جاتا ہے۔ مقام عشق کی اس منزل پر عاشق کو محبوب کی رفاقت عرفان ذات میں گم کر دیتی ہے۔ وہ نہ صرف اسرار عاشقی سے وابستگی محسوس کرتا ہے بلکہ بشریت کی اعلیٰ منزل پر نظر آتا ہے۔

ہمت بلند باید عشاق مست منے را
سرد خیس ہمت در عاشقاں گنجید
درد و عالم عاشقاں راجز خدا مقصود نیست
در شہود چشم ایشان غیروی مشہود نیست
عاشقاں اور دو عالم جز خدا محبوب نیست
پیش مجنوں بیچ کس جز نقش بیسلی کی بود؟
بغیر عشق بنود فہم کردن سراں دلبر

کالِ عشق باید در میان خاصگان دیدم
عاشقان را زده تورشش چه آید در نظر
عاشق سرمست را دیوانگی از سر گرفت
در عقل نگنجیم کہ آن نور خدا ایم
در فہم نیائیم کہ بے نام و نشانیم
حافظ شیرازی نے شانِ قلندر اور فلسفہ حیات کا رخ پیش کیا ہے۔
شہباز قلندر اس کے ایک پیکرِ جمال تھے حافظ کہتے ہیں۔۔
بر درِ قلندر رنداں قلندر باشند
کہ شناسند رموز افسرِ تاشہنشا ہی
دیوان حافظ شعر و نفاذ و معرفت و عرفان کا حیات افزہ مجموعہ
ہے اس قسم کے اشعار سے انکا کلام ملوے۔

اُنانکہ خاک را بہ نظر کیا کنند
ایا بود کہ گوشہ چشمی بہا کنند؟
حافظ کی شمع غزل نے شہباز قلندر کے فالوس تخیل سے روشنی
پائی تھی۔ زبان و بیباں طرز و اسلوب کے اعتبار سے حافظ ان کے ہم کلام
معلوم ہوتے ہیں عشق، شراب، ساقی، جام، بینا، عینا، ہوش، مدہوشی، ہستی
سرمستی، جمال و جلال وغیرہ الفاظ حافظ کی طرح کثرت سے ملتے ہیں۔ شہباز
نے کدہ حق میں باذہ عشق کی مستی و بے خودی کو معراجِ عشق سے تعبیر کرتے ہیں۔
سرمستی و مدہوشی اپنے محبوب حقیقی کے وصل اور قربت کی لذتوں سے ہلکا
کرتی ہے۔ عالم ہستی میں راہ عشق کی حقیقتوں کا ادراک ہوتا ہے چند اشعار
ملاحظہ ہوں۔

ایا عثمان مروندی چرا مستی در این عالم
بجو مستی و مدہوشی دگر چیز نہ دام
زمنم بعرضش اکبر خردم شراب اطہر
و اصل شدہ و سالم مست است ہستم
آیت زمی بخندم زاہد کمند مگر یزم
نوشتم و نا ستیزم مست است ہستم

جام ز عشق نوشم و دنیا و دیں فندم
جز این دگر نہ گوشت مست است ہستم
دریا شراب آدم در دل فرو سپادم
بے بقا ندارم مست است ہستم
در کونے میفر و شاں عشاق جام نوشاں
افادہ ستیز جو شاں مست است ہستم
زاہد نہ گریزد عابد نہ ستیزم
سرمست مے پرست مست است ہستم
چون بخوردم آن شراب لم یزل از دست دوست
بعد خوردن جساں گہی مست و گہی ہشیار شد
با دست خود پیالہ دانی چه ذوق دارد؟
یا ذوق آن پیالہ باغ جساں نگیند
صوفیا سماع کو معراج الروح کہتے ہیں بسلسلہ چشتیہ و قادریہ
کے بزرگان دین جو کیف اُمیز سرور کے بڑے شیدائی تھے۔ ان کے
زمانے میں عام موسیقی کی اجتماعی سرپرستی سے اس فن کی ترقی و ترویج
ہوئی۔ محفل سماع میں لوگ گیتوں نے جنم لیا۔ سندھ اور پنجاب کی کافیاں
سابق مشرقی پاکستان کے عارفانہ مرشدی حکیت صوفیا نے خیالات و موضوعات
کے اُمیدوار ہیں۔ علوم میں روح کی بیداری اور قلوب کی صفائی میں قصوں
نغمہ کا خاص حصہ رہا ہے۔

حضرت شہباز سماع کی محفلوں میں اپنے ہم مشرب فقیروں،
درویشوں کے ساتھ عربی و فارسی کلام وقت اُمیز بچے اور سحر انگیز اکاواں
میں پڑھتے تھے اکثر اپنا کلام بھی عالم محویت و بے خودی میں سناتے تھے۔

بیا اے مطرب ساقی سماع شوق در دل دہ
کہ من در شادی و صلش قلندر واری رقص
مرا مخلوق می گوید گدا چنداں چه می رقصم
بدل دایم اسرارے ازاں اسرار می رقصم
خلائی مگر کن درین ملامت زیں سہب ہر دم

مگر تازم بریں دوستے کر پیش یاری رقصم
اگر صوفی شدم یارم بیساتا خندقہ پوشم
اگر زتار بر بستند دداں زتار می رقصم
منم عثمان مروندی کر یار خواجہ منصورم
طامت می کند خلقے کر من بردار می رقصم
دیدار حق تعالیٰ در مان درد ماستد
دیدہ بغیرہ بیجا حرمان شدست مارا
رقصیم برقصیم کر خوباں جبہ نیم
نازیم بنازیم کر در عین عیانیم
نہ اکیم نہ بادیم نہ خاکیم نہ آتش
مایم بہر صورت و ماکون و مکاتیم

شہباز نے خدا اور انسان کے رشتہ محبوبی کو اسلامی تعلیمات و جہات کے اُٹھنے میں دیکھا ہے ان کا فکری و ذہنی دائرہ قرآن حکیم اور احادیث نبوی کی روشنی سے تاباں و درخشاں نظر آتا ہے وحدت الوجود وحدت و کثرت ہمہ اوست از ہمہ اوست جیسی صوفیانہ اصطلاحوں کو منفرد انداز و دلکش سادہ اسلوب میں ڈھال دیا ہے۔ وہ وحدت و کثرت کی نیزنگیوں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور حیات و کائنات کے اسرار والوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔

ہمچو در لباس صوفت باش
با صفت ہائے خدا موصوفت باش
دوئی از سر بدر بردم یکے دیدم دو عالم را
یکے ہمیں یکے جویم یکے داتم یکے خوانم
مایم عین وحدت آزاد ہم نہ کثرت
باشد نہ بیچ کلمت مست است ہستم
در میان عارفان سر پہاں یافتم
ہر کراں جستہ بودم عین نمود را یافتم
کور مادہ زاد ہرگز می نہ بیند آفتاب

صد ہزاراں شکر واجب چشم بینا یافتم
چوں وجود کس بنا شد بالحقیت جو خدا
اں وجود عین سابق عین خود را یافتم
ہمہ وحدت ہمہ کثرت ذکر است ہم ہمہ وحدت
ولیکن اختلافش در میان حکم اں دیدم
یہ جہاں رنگ و بو چند روزہ ہے اس کائنات بے ثبات میں کسی
چیز کو بقائے دوام نہیں۔ انسان بھی دار فانی سے دار بقا کی راہ یکتا ہے مرنے
ایک اللہ کی ذات ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ شہباز نے
اس نکتے کو شعری لہجے میں یوں بیان کیا ہے۔۔

فانیست ہمہ چیز کہ ایں دار بقا نیست
بردار دل خویش کر ایں جائے وفا نیست

حضرت قلندر شہباز تارخ اسلام اور اسلامی دنیا پر عمیق نظر رکھتے
تھے۔ انبیائے کرام اور اکابرین کی زندگی و شخصیت اور ان کے افکار و نظریات
کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ جہاں وہ خاص کر روایات و کرامات سے مستفیض ہوئے
وہاں اپنے عمر کے حالات و کوائف سے پوری طرح آگاہ و باخبر تھے۔ اس لئے
ان کے کلام میں تعلیمات و اصطلاحات کی کئی عمدہ مثالیں ملتی ہیں عارفانہ شاعری
میں ایسے جلال و جمال حسن و کمال اور ہجو و مبالغہ کے حیات آفرین نمونے
شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔

من اں دم کہ در بحر جلال اللہ بودستم
بگوہ طوبی با موسیٰ کلیم اللہ بودستم
ہر آہ زندہ ہم بودم ہر خضرے زندہ بودستم
ہر اسکندر در اں شکر ہر لشکر گاہ بودستم
ہر اسماعیل پیغمبر ہر ابراہیم بن اذرہ
دراں سر وقت قربانی ہر قرباں گاہ بودستم
گئے بر تخت گریا تم گئے بردار خستہ انم
عجائب جا کہ من دیدم کہ دیدست و ندیدستم
حقیقت شریعت سرایت کے رموز و نکات کو جس دل کش انداز

میں پیش کیا ہے اس سے آپ کی نگاراد غلط اور سا کا نہ سمجھتے اٹھلا ہے۔ شکر زبان میں اظہار و ابلاغ کی یہ ادا دینی تیلینے دا شاعت کے لئے بے حد موثر ثابت ہوئی ہے۔

اسلام من بہ دینائے کہ موجیش اودی خوا راست
نہ کشتی اندر آں دیا نہ صلاں عجب کا راست
شریعت کشتی دارد طریقت بلویان او
حقیقت لنگے دارد کہ راہ عقل دشوار است
نہ از حق چنین آمد مگر از جان می ترسید؟
ہزار جان مشتاقان دریں دیا نگوں بار است
ایا عثمان مروندی سخی با پردہ داراں گو
نیای در جہاں بارے جہاں پراز اختیار است

ذکر و فکر صبر و شکر توکل و قناعت اخلاص و ایثار خلوص و محبت
عرفت و رواداری نیکی و سپائی صدق و صفا امانت و سخاوت شرافت
دانا نیکی اعلیٰ صفات ہیں۔ حضرت شہبازان خوبیوں کے عمل پیرے تھے
اس لئے ان کے فکر و عمل میں گداز تھا، سپائی تھی اور ایک عالم کو اپنی
ذات گرامی کی ہر من موافق کرنے کی بھرپور صلاحیتیں تھیں۔ آپ نے زندگی
کے ان پہلوؤں پر عمل کرنے کی پر زور تلقین کی ہے۔ آپ کے اکثر اشعار
اس قسم کی تعلیمات کی ترجمانی پوری توانائی و رعنائی سے کرتے ہیں۔

حضرت شہباز کی شاعری تمام تر حمد و نعت اور منقبت جیسی اہم
امانات پر حاوی ہے، غزلوں کے جو اشعار پیش کئے گئے ہیں وہ خالق
کائنات اور وجود یا ثبات کی حمد و ثناء کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں
عنود سرور کائنات رحمت عالم محسن انسانیت سے والہانہ عشق اور بے پناہ
عقیدت کے مظہر ہیں آپ کی نعت کا یہ شعر بہت مشہور ہے
کعبہ عشاق باشد روئے احمد در جہاں

صد ہزاراں روئے خراباں منزل مظہر گرفت
حضرت لعل شہباز قلند دے بڑے خوبصورت قصیدے
کہے ہیں ان میں رسول مقبولؐ اور حضرت علیؑ رحمہ اللہ و چہرہ کی شان میں
کہے ہوئے قصیدے بہت پر زور اور پراثر ہیں۔

غزل

نیم سحر

کس کیفیت میں جس کے لئے گزارنا !
تیرے ہی خدو خال کے پیسکر اُبھارنا
جب بھی اُداس ہوتا، تجھی کو پکارنا
ایا نہ تیرے درد کو اب تک سہارنا
اے دوست برقرار ہی رکھ تو یہ فاصلے
مرغوب ہے یہ زہر بدن میں اُتارنا
پتھر ہوں میں تو مجھ کو نہ رکھنا سنبھال کر
شیشہ ہوں میں تو تم مجھے پتھر نہ مارنا
پہلے ہی غم نصیب ہے دل، یہ بھی سوچنا
لے کی تیغ تیغ چھین مت اتارنا
مانند زلفت یار پریشان میں بھی ہوں
اے دستِ انبساط مجھے بھی سنوارنا



اسلام آباد کا جشن بہار

سلمان رضوی

خوش رنگ گلابوں کا چمن دیکھ رہے ہیں
 ہم اپنے گلستان کی پھبن دیکھ رہے ہیں
 مہر پھول کے ہونٹوں پہ تبسم کی کرن ہے
 فن کار کا منہ بولتا فن دیکھ رہے ہیں
 لگتا ہے کہ ہر غنچہ دہن بول اُٹھے گا
 تصویر کا بے ساختہ پن دیکھ رہے ہیں
 تھالوں میں سجے ملکہ فطرت کے جواہر
 اے مادرِ گیتی تیرا دہن دیکھ رہے ہیں
 سبزہ ہے کہ بلقیس کے دربار کی محفل
 پانی ہے کہ سورج کی کرن دیکھ رہے ہیں
 یہ رات کی رانی کے محلات کی خوشبو
 حوریں ہیں اگر پھول تو غلمان ہیں غنچے
 پاکیزگی ارضِ وطن دیکھ رہے ہیں
 محنت کا یہ اعجاز کہ پتھر کی سلوں پر
 ہم سنبل و ریحان و سمن دیکھ رہے ہیں
 آرائش گل اپنی جگہ خوب مگر ہم
 سلمان تیرا رنگ سخن دیکھ رہے ہیں

آخری مغل تاجدار کے ایامِ کرب و بلا

فضل قدیر

کمال یاری اور سخا کی سے اس عظیم قائد سے آخری تاجدار مغلیہ بادشاہ سے کم بدسلوکی روا نہیں رکھی انہوں نے اس نابغہ روزگار سیاست دان آزادی کے اس نڈر اور بیباک سپاہی کی شخصیت کے متعلق لعن و طعن اور افتراء پروازی کی ایسی ہم چلائی کہ اگر برصغیر کے مسلمان ان تمام پُر فریب حکمت عملیوں سے ناواقف ہوتے جو انگریز نے اپنے ڈبڑھ سو سالہ دور حکومت میں انہیں ذلیل و خوار کرنے کے لئے استعمال کی تھیں تو وہ یقیناً بظن ہو جاتے۔ اُسے مفرد، متکبر اور آزادی کی راہ کار و ڈاٹا ہر کیا گیا۔ اسے ضدی، متعصب اور متعصب بنا کر پیش کیا گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے اس دور میں قوم اپنی تاریخ سے آگہی رکھتی تھی جو کچھ اس پر بیت چکا تھا اس کا اندازہ اُسے تھا..... مگر آج صورت کچھ مختلف ہے حصولِ پاکستان کے بعد جو نعمتیں ہمیں ملی جو آرام و سکون مستر آیا اس میں جو نسل پرستان جڑھی اس کے بڑبان ان شائد کا تصور نہیں کر پاتے جمہ سے گزشتہ پوری ایک صدی جنوبی ایشیاء کے ستم رسیدہ مسلمان دوچار رہے۔ اپنی تاریخ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس داستان درد کو اور کبھی نہیں تو کم از کم، مرنی کو مزدور ہرائیں جو بدیشی سامراج نے ہم پر توڑی تھی۔ اس لہزدہ خیز داستان کو سن کر ہمارے نوجوانوں، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو یہ عزم اپنے قلوب میں کرنا چاہیے کہ اس پاکستان کو جو عظیم محنتوں اور قربانیوں کا ثمر ہے، اپنی جانوں سے زیادہ عزیز رکھا جائے گا۔ ہم اس کی متبرک خاک پر کبھی حملہ آوروں کے قدم نہیں پڑنے دیں گے۔ ہم ہر اس حربے کو ناکام بنادیں گے جو وطن عزیز کی سالمیت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اندرونی اور بیرونی سازشوں کے تحت

۱۸۵۷ء کو تین ہندوستانی رجمنٹوں نے جو میرٹھ میں مقیم تھیں اپنے انگریز افسروں کو گولیوں سے اڑا لیا۔ میرٹھ چھاؤنی کو لپی ملنے تباہ کر دیئے کے بعد انہوں نے دہلی کا رخ کیا اور لٹے ہوئے ضعیف و نحیف آخری مغل تاجدار بہادر شاہ کو شہنشاہ ہند کا مرتبہ دے کر بدیشی سامراج سے نجات کیلئے ایک عظیم جنگِ آزادی کا آغاز کیا۔ اس محاربِ عظیم کو انگریزوں نے سپاہیوں کے غدر کے نام سے یاد کیا اور ہمیشہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ ایک ہڑلوگ تھی جس کے بنیادی مقاصد لوٹ مار اور افراطی تفری کے علاوہ اور کچھ نہ تھے نیز یہ کہ اس غدر کو محسن کش بادشاہ دہلی نے ہوا دی تھی..... اس نے سلطنتِ برطانیہ کا ولیدِ خوار اور رعایا ہونے کے باوجود اپنے محسنوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی سازش کی۔

بادشاہ دہلی یقیناً ایک عظیم مجاہد تھے عمر کی آخری حدود پر پہنچنے کے باوجود انہوں نے برصغیر کی پہلی جنگِ آزادی میں جو کردار ادا کیا وہ ہماری تاریخ کی متاعِ عزیز ہے۔ تاہم جس محسن کشی کا انہیں طعنہ انگریز مورخ دیتے آئے ہیں اس کی قلعی ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ گزرنا خود ان کی قوم کے دانتوں کھل چکی تھی پھر بھی جس ظلم اور سفاکی سے انہوں نے برصغیر کی مسلم حکومت کو تباہ کیا تھا اس پر پردے ڈالنے کا کام وہ آخر تک انجام دیتے رہے حتیٰ کہ وہ زمانہ آیا جب ہندوستان کے مسلمانوں کے بے تاج بادشاہ مسلم عوام کے ہر دلعزیز رہنما قائدِ اعظم محمد علی جناح اپنی ملت کے حقوق کے حصول کے لئے تاجِ برطانیہ کے نمائندوں جنرل و لول اور آخری وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اپنے تاریخی مذاکرات میں مصروف ہوئے۔ ان مذاکرات کے دوران تاجِ برطانیہ کے کیت پرورد نمائندوں نے

برائے کار لایا جاتے تھا۔

ہمارے دشمن پوری طرح یہ سمجھ چکے ہیں کہ پاکستان کو فوجی قوت سے زیر نہیں کیا جاسکتا اس لئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب فلسفے اور نظریات کے رخ پر اپنے موچے باندھ رہے ہیں اور ہماری صفوں میں نظریاتی شگاف ڈالنا چاہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ایک صدی قبل میکالے نے اپنے قطعی منصوبے کے تحت نظریاتی بنیاد کو تہہ بالا کرنے کی کوشش کی تھی جس کی تصویر علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کھینچی تھی۔

سینے میں رہے راز ملوکا نہ تو بہتر

گرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو

ہو جائے ملائم تو جہد چاہے لے پھر

مہر حال مقام شکر ہے کہ دشمنان وطن کے مقابلے کے لئے عوام کا مقبول رہنما ایک چٹان کی طرح صفت آراء ہے اور اب ہم سب کا فرض ہے کہ اس کے ہاتھ مضبوط کریں اور نظریاتی انتشار کا شکار نہ ہوں۔

بہادر شاہ پر جس عسکری کا الزام انگریز مورخین نے لگایا ہے کی قطعی اس دور کے ایک انگریز صحافی ٹائمز کے نمائندے ولیم ہارڈنیل کی اس ڈائری سے کھلتی ہے جو اس نے اس عظیم جنگ آزادی کے ایک سال بعد ہندوستان میں رہ کر لکھی اور جو اس کے مراسلوں کی صورت میں ٹائمز میں شائع ہوتی رہی۔ رسل جب ہندوستان پہنچا تو فوجی نوعیت سے جنگ آزادی ختم ہو چکی تھی تاہم اس نے لالہ لالہ مقدس کے لئے منظر بہادر شاہ کو لال قلعہ میں اسیر دیکھا۔ اس نے نکتہ پر انگریزوں کے دوبارہ قبضے کے ہولناک مناظر دیکھے۔ اس نے مسلمانوں کے خلاف تیغ ستم کو پوری طرح چلتے دیکھا۔ یہ کیسا خوفناک وقت تھا لاکھوں بیگنہ محض اس لئے نشاء ستم تھے کہ ان کا تعلق اس ملت سے تھا، عظیم مظل جس کے افراد تھے۔

جنگ آزادی کے دوران کانپور میں ۲۲ صاحب دھوڑ موہنت نے جب انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ تو کچھ انگریز عورتیں اور بچے اس وقت قتل ہو گئے جب جنرل ہیولاک نے نانا بربلغار کڑی ان عورتوں اور بچوں کی لاشوں کو ایک کنویں میں پھینک دیا گیا یہ واقعہ یقیناً افسوسناک تھا مگر یہ طے ہے کہ یہ سوچے سمجھے کسی منصوبے کے تحت رد نہ کیا گیا تھا یہ گڑبڑ اور بلوہ کی فضا میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ مگر اس وقت کے مجنون انگریز جنرلوں نے جس طرح اس کا انتقام لیا، اس کی داستان سر جارج کیسبل نے اپنی کتاب ”میموارز آف

مالی انڈین کیریئر“ (MEMOIRS OF MY INDIAN CAREER)

مطبوعہ لندن ۱۸۹۳ء میں ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

”بعد کو جب اس قتل عام کے اسباب کی احتیاط سے تفتیش کی گئی تو ہمکچہ بات تحقیق نہیں ہوئی کہ اس معاملے میں کوئی سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ نیل (برگیزڈ جنرل نیل) نے وہ باتیں کہیں جو اس قتل عام سے کہیں زیادہ تھیں۔ ہیولاک جب تک کانپور میں رہے، انہوں نے اُسے (نیل کو) دبائے رکھا۔ لیکن جوں ہی ان کی پیٹھ اُدھر سے مڑی تو نیل نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ خون بہانے کے ایک مذہبی قصاب کو پورا کر رہا ہو۔ جس انداز میں اس نے صوبیداروں اور مسلمان سول افسروں کو احکامات دیتے یہاں تک کے انہوں نے چیخے چلاتے اپنی زبانون سے خون چاٹا۔۔۔۔۔ اگر حقیقت میں یہ لوگ اس قتل عام کے مجرم ہوتے۔ تب بھی یہ انتہائی افسوسناک کارروائی تھی لیکن نیل یہ بات خود نہیں کہتا کہ وہ اس قتل عام کے مجرم پائے گئے تھے۔“

اصل معاملہ یہ تھا کہ برگیزڈ جنرل نیل کے ہتھے جو مقتول آدمی خاص کر مسلمان چڑھتا تھا اسے پکڑ کر اس مقام پہلے جایا سہا تا تھا،

جہاں یورپین عورتیں اور بچے مقیم تھے۔ وہاں خون کے جوہر بہتے باقی رہ گئے تھے انہیں صاف نہیں کیا گیا تھا۔ مظلوم مشکوک لوگوں کو پکڑ کر وہاں لے جایا جاتا اور ان سے حکماً یہ خون ایسے طریقوں سے صاف کروایا جاتا تھا انہیں انتہائی ناگوار ہول نیل کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

”ہر شہر پسند کو متعلقہ مکان پر لے جایا جائے گا، اور اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ خون کے دھبوں کا ایک چھوٹا حقہ صاف کرے اور یہ کام اس کے جذبات کے استے برعکس کروایا جائے گا جتنا ممکن ہو۔ پروڈوسٹ مارشل ہر اس شخص پر جو اس کام کو کرنے پر معزمن ہو گا کوڑا استعمال کرے گا۔ اپنے حق کے وجہ پوری طرح صاف کر دینے کے بعد مجرم کو فوراً پھانسی دے دی جائے گی اور ان قہر نے لے ایک پھانسی قریب ہی کھڑی کر دی گئی ہے۔“

آگے چل کر نیل لکھتا ہے :

ہمارے سول کورٹ کے ایک مسلمان افسر نے جو ایک بڑا ہمدعا ش ہے اس پر کچھ اعتراض کیا۔ اس کے کوٹے لگوئے گئے اور اس سے خون کے دھبوں کا کچھ حصہ زبانی سے چٹوایا گیا۔

(پیش نامہ مائی اٹلین میوٹنی ڈائری انڈیکل ریڈرڈ ص ۱۵ مطبوعہ کیسل اینڈ کمپنی لندن)

رسل نے ٹی اے جونی دلی کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اُس نے بڑے تاجدار ہند بہادر شاہ کو لال قلعہ میں بیماری اور پریشان حالی میں نہ ٹلائے فیصلہ سننے کا منتظر پایا۔ جس کا ڈراپ سین رتھون میں ایک بوسیدہ قبر ہے۔ دہلی کا آنکھوں دیکھا حال ڈراپ سن کی زبانی سنئے۔

”میں مغل اعظم کے اس عظیم شہر رملی کے متعلق اپنے اولین تاثرات

مشکل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہی وہ شہر تھا جہاں سے وہ لوگ اٹھے تھے جنہوں نے کچھ ڈنگے کاتے کاپتے عرب تاجروں (انگریزوں) کو خدمت اور اطاعت کے عوض ہندوستان میں زمین حاصل کرنے و غیرہ کے حقوق عطا کئے تھے یہی وہ شہر تھا جو ایک سال قبل ایک زبردست بغاوت کا مرکز بنا ہوا تھا۔

”میری نگاہیں کنارِ حسا ان بلند و بالا قدیم دیواروں کی طرف مرکوز تھیں یہاں میں یہ بات ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس ملک میں جہاں سے ہندوستان پر حکومت کی جا رہی ہے وہاں نفوس بھی ایسے نہ ہوں جنہوں نے ابھی دو سال قبل تک یہ سنا ہو کہ دہلی کا بادشاہ ایک زندہ انسان ہے یا یہ کہ وہ اپنی انتہائی سقیم حالت اور اپنی قوم کی انتہائی ذلت کے باوجود شہنشاہ اکبر کا خلف ہے اور اس کی پکی کچی عظمت کے آثار اس قدر تھے کہ ہندوستان کا گورنر جنرل بھی اس سے برابری سے نہیں مل سکتا تھا اور یہ کہ دہلی کے برطانوی افسر اس سے معاملات میں وہ تمام ظاہری عزت و احترام ملحوظ رکھتے تھے جسے ایک شہنشاہ کو اپنے خادموں سے طلب کرنے کا حق حاصل ہے۔

”شہنشاہ دہلی کے متعلق انگلستان میں انگریزوں کی بڑی تعداد کو پہلی مرتبہ جس حقیقت کا علم ہوا وہ یہ تھی کہ وہ (شاہ دہلی) ایک ایسی بغاوت کا برائے نام سربراہ تھا جس نے ان کی ہندو مملکت کی نیلواں کو ہلا دیا تھا۔ اس پر آج اپنے محسنوں کے خلاف اسٹھ کھڑے ہونے کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ وہ یقیناً ایک کمزور اور سنگدل ضعیف آدمی تھا، لیکن بہر حال ایک ایسے شخص پر جس نے اپنے بزرگوں کے مقبوضات اور علاقوں کو بتدریج بزدل قوت یا دوسرے طریقوں سے غصب ہوتے دیکھا اور یہ نوبت آگئی ہو کہ اب اس کے پاس خالی خولی انقلاب ہی رہ گئے ہوں اور اسے بھی بڑے کیرجن کا خزانہ خالی ہوا اور محل ایسے تلاش شہزادوں اور شہزادیوں سے بھرا ہو جن کا اس سے خونی اور نسلی تعلق ہو کیا اُسے کمپنی کا اپنی اس حالت پر پہنچ

نیا بجٹ اور اقتصادی جائزہ

سید محبوب علی

پڑا ہے انہیں کم کرنے کے لئے ٹیکس ادا کرنے والوں کو مراعات دی جائیں۔

وزیر خزانہ نے بتایا کہ حالیہ کساد بازاری اور اندرون ملک بعض دشواریوں کے باوجود مجموعی طور پر قومی معیشت کا مشکل ترین دور گزر گیا ہے۔ حکومت نے جو اقتصادی اصلاحات نافذ کی ہیں ان کی بدولت پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے اور معیشت نے ایسا رخ اختیار کیا ہے کہ عوام کی زیادہ سے زیادہ ضرورتیں پوری ہونے لگی ہیں۔

پیداوار میں اضافہ

موجودہ مالی سال میں مجموعی قومی پیداوار میں ۵ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ پچھلے سال عالمی اقتصادی صورت حال کی وجہ سے مجموعی قومی پیداوار میں صرف ۲.۲ فیصد اضافہ ہوا تھا۔ اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ سلاوہ سے سلاوہ تک کی مدت میں مجموعی قومی پیداوار میں کوئی بھی اضافہ نہیں ہوا تھا ۵ فیصد اضافہ ایک نمایاں کامیابی ہے لیکن تیز رفتاری سے ترقی کے لئے یہ اضافہ کافی نہیں ہے۔ اس کے لئے کم از کم ۸-۹ فیصد سالانہ اضافہ ہونا چاہیے۔ پاکستان اس منزل تک پہنچ سکتا

وفاقی وزیر خزانہ رانا محمد حنیف نے ۵ جون ۱۹۷۵ء کو قومی اسمبلی میں ۷۷-۱۹۷۴ء کا قومی بجٹ پیش کیا اور حسب دستور اس سال بھی بجٹ پیش کرتے ہوئے ملک کی اقتصادی صورت حال کا جائزہ دیا۔

قومی بجٹ کے اعلان کے وقت عام طور پر سب کی توجہ ٹیکسوں کی کمیوں کی طرف ہوتی ہے۔ اس لئے کہ بجٹ کا یہ پہلو ہر شخص کے ذہنی اور خاندانی بجٹ پر اثر ڈالتا ہے۔ لیکن ٹیکسوں کی تفصیلات معلوم ہونے کے بعد عوام نے اطمینان کا سانس لیا کہ ان کے روزمرہ کے استعمال کی کسی چیز پر براہ راست کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا گیا اور نہ ان چیزوں پر موجود ٹیکسوں میں اضافہ کیا گیا۔

جیسا کہ وزیر خزانہ نے بتایا ٹیکس لگاتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔

- ۱۔ صنعتوں اور مکانات کی تعمیر میں نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی جائے۔
- ۲۔ برآمد بڑھا کر اور درآمد گھٹا کر ادائیگیوں کا توازن بہتر بنایا جائے۔
- ۳۔ پرائیویٹ سیکٹر میں بچت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔
- ۴۔ افراط زر کی وجہ سے لوگوں کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا

کیا جاسکے۔ اس کے لئے یہ انتظام کیا جا رہا ہے کہ آبپاشی کے لئے زیادہ سے زیادہ پانی، کیمیا کی کھاد اور فصلوں کے تحفظ کی سہولتیں دستیاب ہوں اور زرعی پیداوار کی قیمتیں مستحکم رہیں۔

جہاں تک پانی کا تعلق ہے تو بیلابند سے آئندہ فصل بربج کے لئے پانی ملنے کی پوری توقع ہے۔ اس سال سیم اور کھور پر قابو پانے کی کئی اسکیمیں مکمل کر لی جائیں گی۔

پچھلی اسکیموں میں جو ٹیوب ویل بے کار ہو گئے ہیں ان کی مرمت کی جائے گی۔ ڈیزل سے چلنے والے دس ہزار ٹیوب ویل لگانے کے لئے مالی امداد دی جائے گی۔ صوبائی حکومتوں سے کہا گیا ہے کہ جو نہریں خراب ہو گئی ہیں ان کی صفائی اور مرمت کا انتظام کیا جائے۔

پاکستان میں کیمیا کی کھاد کا استعمال پچھلے سال چار لاکھ ۲۵ ہزار ٹن سے بڑھ کر اس سال پانچ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن ہو گیا ہے۔ پھر بھی یہ مقدار موزوں مقدار کی ایک چوتھائی ہے۔ آئندہ سال کیمیا کی کھاد کا استعمال ۶ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن تک بڑھانے کی جوہیز ہے۔ اس سال کیمیا کی کھاد کی قیمت میں پہلے ہی دس فی صد کمی کر دی گئی ہے۔

اس سال کیڑا لگ جانے کی وجہ سے کپاس کی فصل خراب ہو گئی۔ اب یہ انتظام کیا جا رہا ہے کہ کپاس کی اگلی فصل کاشت کرنے سے پہلے کپاس کے بیج میں دوا لگائی جائے۔ پھر پودوں پر دوائیں چھڑکنے کے انتظام میں بھی توسیع کی جا رہی ہے۔ صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ کپاس کی فصل پر دوائیں چھڑکنے کا خاص طور پر بندوبست کیا جائے۔

اس سال سبزیاں، ترکاریاں بھی دافر مقدار میں پیدا ہوئی ہیں۔ اگر حکومت ان کی محدود درآمد کا انتظام نہ کرے تو منڈی میں ضرورت سے کہیں زیادہ سبزیاں ترکاریاں آجائیں تو اور بہت سستے داموں بکتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اگلے سال کاشتکار سبزیاں نہ بوتے اور

حقائق کساد بازاری کی وجہ سے عالمی منڈیوں میں پاکستانی مال کی قیمتیں گر گئیں اور ملک کے اندر کپاس کی فصل خراب ہو گئی۔ اب عالمی کساد بازاری ختم ہونے کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اور ملک کے اندر پیداوار بڑھانے کے لئے مزدوری تدبیریں اختیار کر لی گئی ہیں۔ توقع ہے کہ آئندہ سال مجموعی قومی پیداوار میں ۸ فیصد اضافہ ہوگا۔

زراعت

موجودہ مالی سال میں اقتصادی صورت حال کا سب سے خوش آئند پہلو یہ رہا ہے کہ زرعی پیداوار میں اضافہ کار حجان دوبارہ شروع ہو گیا ہے۔ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۲ء تک زرعی پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۵ء تک برائے نام اضافہ ہوا جس سے بہ مشکل پچھلے سالوں کی کمی پوری ہو سکتی تھی۔ موجودہ مالی سال میں زرعی پیداوار میں ۸ فیصد اضافہ ہوا جو پچھلے تین سال کے دوران مجموعی اضافے کے برابر ہے۔ کپاس کے سوا تمام بڑی بڑی فصلوں کی پیداوار میں مجموعی طور پر ۵۰ فیصد اضافہ ہوا۔ گندم کی پیداوار میں ۷ فیصد چاول کی پیداوار میں ۱۲ فیصد اور گنے کی پیداوار میں ۲۰ فیصد اضافہ ہوا۔

ایک مختص اندازے کے مطابق اس سال ۸۱ لاکھ ٹن گہوں پیدا ہوا۔ ہو سکتا ہے اصل پیداوار اس سے بھی زیادہ ہوئی ہو۔ حکومت نے گندم کی فصل بازار میں آنے سے بہت پہلے اس کی سرکاری خریداری کا بندوبست کر لیا تاکہ فصل آنے پر بازار میں گندم کی قیمت بہت زیادہ نہ گر جائے اور کاشتکار کو نقصان نہ ہو۔ ۷۳ روپیہ فی من کے حساب سے گندم کی سرکاری خریداری جاری ہے۔ اور اب تک آٹھ لاکھ من گندم خریدی جا چکی ہے۔

اگلے سال کے ترقیاتی منصوبے میں زراعت پر خاص توجہ دی گئی ہے تاکہ زرعی پیداوار میں ۸ فیصد اضافے کا ہدف پورا

عوام کو دشواری کا سامنا ہوتا۔

توقع ہے کہ زرعی میدان میں مناسب تبدیلیوں کی بدولت اگلے سال کم سے کم ۹۰ لاکھ ٹن گہوں پیدا ہوگا جس سے ملک گہوں کے معاملے میں قریب قریب خود کفیل ہو جائے گا۔

اس سال کپاس کی فصل خراب ہو گئی اور صرف ۲۹ لاکھ گانٹھ روٹی حاصل ہو سکی۔ توقع ہے کہ اگلے سال فصلوں کو کیڑوں مکوڑوں سے بچانے کے مناسب انتظام کی وجہ سے ۵۰ لاکھ گانٹھ روٹی پیدا ہو سکے گی۔ یہ مقدار زیادہ نہیں ہے۔ مامی میں بھی ۳۹ لاکھ گانٹھ تک روٹی پیدا ہو سکی ہے۔

صنعت

پچھلے چند سال میں صنعتی پیداوار میں تھوڑا بہت اضافہ ہوتا رہا ہے۔ یہ اضافہ پہلے سے لگائے ہوئے کارخانوں کے بہتر استعمال سے ہوا ہے۔ عوامی حکومت نے قومی تحریک میں لی ہوئی اور نجی صنعتوں میں سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کے لئے جو اقدامات کئے ہیں ان کی وجہ سے صنعتی سرمایہ کاری میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ خاص طور پر بناسپتی گھی، شکر اور کپڑے کے کئی کارخانے لگے ہیں۔ فولاد، کیمیائی کھاد اور سیمنٹ کے کارخانے بھی لگائے جا رہے ہیں لیکن ان میں پیداوار ذرا دیر سے شروع ہوئی ہے اس لئے خیال ہے کہ فولاد، سیمنٹ اور کیمیائی کھاد کی مزید پیداوار دو سال یا اس سے زیادہ عرصے بعد شروع ہوگی۔

پاکستان کی سب سے بڑی صنعت کپڑے کی صنعت ہے یہ صنعت ۷۵-۱۹۷۴ء سے عالمی منڈی میں کساد بازاری کا شکار ہے۔ توقع ہے کہ دنیا میں کساد بازاری کم ہونے کے ساتھ ساتھ کپڑے کی کھپت بڑھے گی اور پاکستانی کپڑے کی منگ میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن بد قسمتی سے عالمی منڈی میں کپڑے کی مانگ ابھی تک کساد بازاری سے پہلے کی سطح تک نہیں پہنچی۔ البتہ

اب پہتری کے آثار پیدا ہوئے ہیں اور موجودہ سال کے آخر تک عالمی منڈی میں کپڑے کی مانگ بڑھی ہے۔ توقع ہے کہ ۷۷-۱۹۷۶ء میں عالمی منڈی میں کپڑے کی مانگ معمول پر آجائے گی۔ اگر پاکستان کے پاس داخلہ مقدار میں روٹی ہوئی تو وہ کافی کپڑا بنا کر برآمد کر سکے گا۔

نئے مالی سال میں صنعتی پیداوار میں ۹ فیصد اضافہ کی توقع ہے۔ موجودہ کارخانوں میں اس میں اضافے کی گنجائش موجود ہے۔ توقع ہے کہ اگلے سال سوت کی پیداوار میں ۱۲ فیصد، شکر کی پیداوار میں ۸ فیصد، کاغذ اور گتے کی پیداوار میں ۲۴ فیصد، کپڑے کی پیداوار میں ۱۰ فیصد، بناسپتی گھی کی پیداوار میں ۱۳ فیصد اضافہ ہوگا۔ اس اضافے کا اعزاز موجودہ کارخانوں کی گنجائش سامنے رکھ کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ شکر کے دو اور کارخانے اور بناسپتی گھی کے بھی کئی کارخانے لگائے جا رہے ہیں۔

آئندہ سال صنعتی شعبے میں سب سے زیادہ خرچ کرانی میں فولاد کے کارخانے پر ہوگا۔ اس لئے کہ فولاد کو بنیادی صنعت کی حیثیت حاصل ہے۔ صنعتی شعبے کے لئے مجموعی طور پر چار ارب ۵۲ کروڑ روپیہ رکھا گیا ہے۔ اس میں سے دو ارب روپیہ فولاد کے کارخانے پر خرچ ہوگا۔ توقع ہے کہ تین چار سال کے عرصے میں اس کارخانے میں فولاد تیار ہونے لگے گا۔

کیمیائی کھاد کی صنعت میں بھی کافی سرمایہ لگایا جا چکا ہے لیکن اس کی کھاد کی پاک عرب فیکٹری سندھ میں تیار ہونے والی کھاد پر مان تیار کرنے لگے گی۔ میرپور ماتھیلو میں پاک سعودی فریڈائزر فیکٹری میں بھی اس سال کافی کام ہوگا۔ یہ فیکٹری ۱۹۷۵ء میں مکمل ہوگی۔ ہزارہ میں کیمیائی کھاد کا کارخانہ لگایا جا رہا ہے ان دنوں اس کارخانے کے یوریا پلانٹ کی تعمیر ہو رہی ہے۔ کیمیائی کھاد کی ایک اور فیکٹری صادق آباد کے قریب قومی فاؤنڈیشن

لگا رہی ہے۔

سیمنٹ کی پیداوار بڑھانے کے لئے ایک کارخانہ کو باٹ میں لگایا جا رہا ہے۔ اور سیمنٹ کے ”مستحکم اور جاوداں“ نامی کارخانوں میں توسیع کی جا رہی ہے۔

تیل اور گیس

وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کی ہدایت پر ۱۹۷۶-۷۷ء کے دوران تیل اور گیس کی تلاش پر خرچ دوگنا کیا جا رہا ہے۔ ایل اینڈ گیس ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے لئے ۲۴ کروڑ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ اگلے سال کنویں کھودنے کی چار حیدر مشینیں خریدی جائیں گی اور چار جدید کنویں کھودے جائیں گے۔ اب تک کسی سال سرکاری خرچ پر ایک یا دو سے زیادہ کنویں نہیں کھودے گئے۔ ملک میں تیل اور گیس کی تلاش کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے۔ حکومت تیل تلاش کرنے والی آٹھ کمپنیوں کے مشترکہ منصوبوں میں شریک ہوگی۔

برآمدات

۱۹۷۵-۷۶ء کے دوران برآمدات کی صورت حال عام طور پر پہلے سے بہتر ہوئی ہے۔ پہلے نو مہینوں میں برآمدات سے ۸۵ کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر کا غیر ملکی زرمبادلہ کمایا گیا۔ بعد میں ہر مہینے اوسطاً دس کروڑ ڈالر کا مال برآمد کیا گیا۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۷۵-۷۶ء کے دوران برآمدات سے مجموعی آمدنی ایک ارب دس کروڑ ڈالر سے کہیں زیادہ ہوئی ہے۔ اور پچھلے سال کے مقابلے میں دس فیصد زیادہ ہے۔ یہ اضافہ اس حقیقت کے باوجود ہوا ہے کہ کپاس کی فصل خراب ہو گئی اور عالمی منڈی میں چاول کی قیمت گر گئی۔ توقع ہے کہ آئندہ سال برآمدات سے ایک ارب ۲۵ کروڑ ڈالر کا غیر ملکی زرمبادلہ کمایا جائے گا۔ جو ۱۹۷۵-۷۶ء کے مقابلے

میں ۲۳ فیصد زیادہ ہوگا۔ اگلے سال روٹی اور کپڑے کی برآمد میں نمایاں اضافے کی توقع ہے۔ عالمی اقتصادی صورتحال میں بہتر ہونے کی وجہ سے پاکستان کی دوسری برآمدات میں بھی اضافہ ہوگا۔

درآمدات

۱۹۷۵-۷۶ء میں درآمدات کی مجموعی مالیت کا تخمینہ دو ارب بیس کروڑ ڈالر ہے۔ پچھلے سال بھی درآمدات کی مجموعی مالیت تقریباً اتنی ہی تھی۔ آئندہ سال اشیائے صحت اور خام مال کی درآمد میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ ابلتہ مشینیں پہلے سے زیادہ منگائی جائیں گی اور اس طرح درآمدات کی مجموعی مالیت دو ارب پچیس کروڑ ڈالر تک پہنچ جانے کی توقع ہے۔

سالانہ منصوبہ

۱۹۷۶-۷۷ء میں ترقیاتی منصوبوں پر پبلک سیکٹر میں ۲ ارب ۵ کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔ اس میں سے ۱۷ ارب روپیہ وفاقی حکومت سالانہ ترقیاتی منصوبے پر خرچ کرے گی۔ ۱۳ ارب ۵ کروڑ روپے کی ایک اور رقم پبلک سیکٹر کے ادارے براہ راست خرچ کریں گے۔ اس طرح پبلک سیکٹر کے خرچ میں ۱۹۷۵-۷۶ء کے مقابلے میں ۲۰ فیصد اضافہ ہوگا۔ پرائیویٹ سیکٹر میں ۱۶ ارب ۵ کروڑ روپیہ کا سرمایہ لگایا جائے گا۔ پبلک اور پرائیویٹ سیکٹروں میں مقررہ سرمایہ کاری کا تخمینہ ۲۷ ارب ہے جو مجموعی قومی پیداوار کا ۱۸ فیصد ہے۔ ۱۹۷۵-۷۶ء میں یہ شرح ۱۷ فیصد تھی اور عوامی حکومت کے اقتدار سنبھالنے کے وقت صرف ۱۶ فیصد تھی۔

۱۷ ارب کے سالانہ ترقیاتی پروگرام میں سے قومی اقتصادی کونسل وفاقی حکومت اور اس کے اداروں کو ۱۳ ارب

میں ۸ فیصد اضافہ۔

۲۔ صنعت میں جمود کی کیفیت ختم کر کے صنعتی پیداوار میں

۹ فیصد اضافہ۔

۳۔ مجموعی قومی پیداوار میں ۸ فیصد اضافہ۔

۴۔ برآمدات میں ۲۳ فیصد اضافہ کر کے ادائیگیوں کا

توازن بہتر بنانا۔ ساتھ ہی ساتھ اشیائے صرف کی دکان

قالبوں میں رکھی سہائے گی اور صرف مشینوں کی درآمد میں

اضافہ کیا جائے گا۔

۵۔ پبلک سرمایہ کاری میں ۲۰ فیصد اضافہ اور نجی سرمایہ کاری

کی حوصلہ افزائی۔

۶۔ انفرادی زر ختم کرنے کی کوششیں جاری رکھنا اور قیمتوں

میں استحکام پیدا کرنا۔

وزیر خزانہ نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا تھا کہ ہماری یہ

کوشش ہوگی کہ قیمتوں کے استحکام پر اثر ڈالے بغیر ترقی کی رفتار

بڑھائی جائے۔ ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ زرعی اور صنعتی پیداوار

میں اضافہ کے لئے ہر قسم کی ترقیب اور سہولت فراہم کی جائے۔

ترقیاتی پروگرام کے لئے رقم مہیا کرنے کی طرف سے جو تدبیریں اختیار

کی گئی ہیں ان میں ایسی بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ جہاں کہیں چھوٹ

یا رعایت واقعی ضروری تھی وہاں چھوٹ اور رعایت دی جائے۔

اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ برائیاں بیٹ بکڑ میں بچت اور

سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی ہو۔ توقع ہے کہ اس سال ترقی کی جو رفتار

قائم کی گئی ہے اس میں آئندہ سال اور اضافہ ہوگا۔ ہمارا قوم سے

یہ وعدہ ہے کہ جب تک اقتصادی ترقی کے فائدے عام نہیں ہو

جاتے ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

۵۰ کروڑ روپیہ خرچ کرنے کی منظوری دے چکی ہے۔ صوبائی حکومتوں

کے سالانہ ترقیاتی پروگرام پر تین ارب ۵۰ کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔

صوبوں کے لئے ۲ ارب ۵۰ کروڑ روپیے کی جو رقم رکھی گئی ہے

اس میں سے ۲ ارب ۵۰ کروڑ روپیہ چاروں صوبوں میں ان کی

آبادی کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ صوبہ سرحد اور

بلوچستان میں سے ہر ایک کو ۵۰ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ فالتو دیا جائے

گا۔ تاکہ وہاں ترقی کی رفتار تیز کی جاسکے۔ صوبوں کے لئے رقموں

کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

پنجاب ایک ارب ۸۹ کروڑ ۸۰ لاکھ روپیہ

سندھ ۷ کروڑ ۹۰ لاکھ روپیہ

صوبہ سرحد ۵۹ کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ

بلوچستان ۲۹ کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ

صوبائی حکومتیں ان رقموں کے علاوہ اپنے وسائل سے ترقیاتی

پروگرام پر مزید رقمیں خرچ کر سکیں گی۔

وفاقی حکومت ترقیاتی پروگرام پر ۱۳ ارب ۵۰ کروڑ روپیہ

کی جو رقم خرچ کئے گی وہ ۱۹۵۵ء کے اصل پروگرام کے مقابلے

میں ۳۰ فیصد زیادہ ہے۔ وفاقی حکومت کی طرف سے وفاق

کے زیر انتظام قبائلی علاقوں پر ۲۲ کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ ادا کر

پر ۱۲ کروڑ ۹۰ لاکھ روپیہ اور شمالی علاقوں پر ۷ کروڑ ۳۵ لاکھ

روپیہ خرچ کیا جائے گا۔

مستقبل کا منصوبہ

آئندہ مالی سال کے لئے جو اقتصادی منصوبہ تیار کیا گیا

ہے اس کے مقاصد درج ذیل ہیں۔

۱۔ زرعی شعبہ میں ترقی کی رفتار بڑھا کر زرعی پیداوار

پیکر شرافت — مولانا حالیؒ

خواجہ شبلی پانی پتی

ہیں۔ مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ تم جلتے ہو کہ میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہ ملتا اور ایسے مواقع سے الگ تھلک رہتا تھا۔ مگر اب جب کوئی حاکم پانی پت آوے گا یا جب کوئی ڈپٹی کمشنر کراں بدل کر آوے گا۔ لا محالہ وہاں جانا پڑے گا۔ بھلا میں کہاں اور یہ دردِ سر کہاں؟

سر سیدؒ نے مولانا کو فخر قوم، فخر شعراء اور فخر علماء کے القاب سے نواز کر ان کی عزت افزائی فرمائی — سر سید فرماتے ہیں،

”ہم کو خدا کا شکر کرتا چاہیے اور فخر کرنا چاہیے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا کہ آئندہ زمانہ میں جب کہا جائے گا کہ فخر قوم، فخر شعراء اور فخر علماء زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا اندرونی جذبہ کا اور ان سے نجات دینے والا قوم کا کون ہے؟ تو کہا جائے گا ”حالی“ — (مجموعہ لیکچرز سر سید صفحہ ۴۷۴)

ایک اور جگہ تحریر کرتے ہیں:

”بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں جب خدا مجھ سے پوچھے گا کہ ”تو کیا لایا“ تو میں کہوں گا کہ ”حالی سے مستی لکھو لایا ہوں اور کچھ نہیں۔“ (مکتوبات سر سید صفحہ ۳۱۲)

نواب عماد الملک مرحوم فرماتے ہیں:

”سر سید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے مولانا

مولانا حالی شرافت و اخلاق کے پیکر اور عالمِ باعمل تھے۔ ان کے کردار اور گفتار میں ذرہ برابر بھی تضاد نہ تھا۔ مولانا نے اردو زبان کو بے بہا تالیفات سے مالا مال کیا۔ اردو نظم کو ایک نئی سمت عطا کی اس کے علاوہ مسلمانوں کی ترقی اور ان کی بہبودی میں جو کوششیں کیں تعلیمِ اطفال اور تعلیمِ نسوان میں جس قدر بلیغ سعی کی وہ کوئی دھکی چپی بات نہیں۔ بلند پایہ اخلاقی مضامین کی بدولت ان کو ”سعدی ہند“ کہا گیا۔ فرسودہ اور کہنہ شاعری کے جسدِ بیجان میں آپ نے زندگی کی جو روح پھونکی اس کے باعث قوم نے آپ کو ”مجددِ نظم اردو“ کا خطاب دیا بقول حنیف آجاندہ صری صاحب ہے

سخن کی اک نئی دنیائے عالی شان پیدا کی
بتائے خود ہی پیکر اور خود ہی خاں پیدا کی

مولانا کو حکومتِ وقت نے علمیت اور فنیت کی بنا پر ”شمس العلماء“ کا خطاب عطا کیا اور مولانا شبلی نعمانیؒ کے مطابق ”مولانا آپ کو تو نہیں لیکن ”شمس العلماء“ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اب سہا کہ اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی۔ بخار کی حالت میں اسی قدر لکھ سکتا تھا۔“

(شبلی، ۳ جون ۱۹۰۷ء)

مولانا حالی نام و نمود اور شہرت کے بالکل خواہاں نہ تھے۔ لہذا جب مولانا کو یہ خطاب ملا تو آپ نے اپنے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین مرحوم کو ایک خط میں یوں تحریر فرمایا:

”اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے کہ جس کی ہمارے بہت سے ہم چٹم آرزو رکھتے

کا پایہ بہت بلند تھا۔ اس بات میں سرسید بھی انہیں نہیں پہنچتے تھے۔
محمد کی تنہا لکھتے ہیں :

”آپ کے اوصاف کا احاطہ کرنا مشکل ہے آپ انسان تھے فرشتہ صفت۔ آپ فرشتہ تھے مگر انسانی خصائص کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے وہ المینان اور سکون قلب میسر ہوتا تھا جو ادیار کرام کی صحبت میں لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کامل انسان کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔“

غلام مصدق فرماتے ہیں :

”مولانا خوش خلق با اخلاق، راقم اسطور سے جو ایک ملاقات ہوئی تھی اس میں ان کا انتفاع اور بیاد برتنا و ایسا حیرت انگیز تھا کہ طبیعت کو دلی لطف اور روحانی خوشی تا ہنوز حاصل ہوتی ہے۔“
بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

مولانا بہت ہی سیر چشم تھے ہوس و طمع تو آپ کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی چنانچہ مولانا کی مقبول عام نظمیں اور کتب میں بغیر آپ کی اجازت سیکڑوں تاجران کتب چھاپ لیا کرتے تھے مگر آپ نے کبھی کسی کو منع نہیں فرمایا بلکہ آپ سے جب بھی اشاعت کی اجازت چاہی تو آپ نے بڑی دریا دلی سے فوراً اجازت دے دی۔ ایک دفعہ مولوی نظام الدین صاحب ایڈیٹر ”ذوالقرنین“ نے مولانا حالی سے ان کی چند رباعیاں چھاپنے کی اجازت طلب کی تو مولانا نے جواب میں لکھا : ”آپ شوق سے ان رباعیوں کو جو ”علی گڑھ گڑٹ“ میں چھپی ہیں چھاپ لیں اور جو رباعیاں دیوان میں موجود ہیں اور منشی رحمت اللہ علی نے ان کو چھاپ چکے ہیں ان کو آپ بھی چھاپ لکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ کوئی تازہ کلام ان کے سوا موجود نہیں۔“

مولانا حالی کی اس صفت کا مولانا محمد علی جوہر یوں ذکر کرتے ہیں۔
”اگر ”حیات جاوید“ اور ”مسدس حالی“ کا مصنف شہرت پسند ہوتا اور کسب شہرت کرتا تو بلا خوف تردد کہا جاسکتا ہے کہ اس کا نام دنیاوی اور مادی نقطہ خیال سے بہت بلند ہوتا۔ لیکن اس نے کبھی بازار میں پکنا گوارا نہ کیا۔ مولانا حالی کا یہ امتیازی کیرکٹر تھا جو ہمیں اپنی قوم میں بہت کم نظر آتا ہے۔ وہ وضع اور عزم کے پکے تھے۔“
مولانا حالی کسی کی نہ غیبت کرتے تھے اور نہ برائی کرتے تھے۔ بلکہ ان دنوں عیوب کو ناپسند فرماتے تھے۔ اگر کوئی آپ کی محفل میں کسی کی برائی یا غیبت کرتا تو آپ اسے سختی سے منع فرماتے چنانچہ مولانا نے کس پیار سے انداز میں ان عیوب کی نشان دہی کرتے ہوئے قوم کو ٹوکا ہے۔ فرماتے ہیں :

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں

بد گوئی خلق ہے ہر اک محبت میں

اوروں کی برائی ہی یہ ہے فخر وہاں

خوبی کوئی باقی نہیں جس امت میں (حالی)

خواجہ غلام الثقلین فرماتے ہیں :

دو مولانا یونانی خیال کی رو سے معتدل اور متوسط

کامل انسان اور صوفیانہ خیالات کی رو سے ایک

صاحب باطنی ولی تھے کبھی کسی کی برائی ان کی زبان

سے نہ سنی گئی۔ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا

پسند فرماتے تھے۔ عزیزوں سے محبت رکھتے غریبوں

کی امداد کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ نیک آدمیوں

کی قدر دانی کرتے تھے۔ اخلاق میں، عادات میں

برتاؤ میں، مروت میں، فیاضی میں، علی درجہ کا اعتدال

تھا۔ محبوب اہل بیتؑ اور صوفی منش ”سنی“ تھے۔

مولانا کے پاس بیٹھنے سے اور باتیں سننے سے نہایت

بد باطن شخص بھی روحانی فیض پاتے تھے۔ ہر اک کی

طرف سے دل کو صاف رکھتے اور ہر ایک کو نیک سمجھتے تھے۔

چنانچہ خود فرماتے ہیں ۷
میں بتاؤں آپ کو اچھوں کی کیا پہچان ہے
جو میں خود اچھے وہ اوروں کو نہیں کہتے بُرا
ایک اور جگہ فرماتے ہیں ۸

نیکوں کو نہ ٹھیرا بیو بد اسے فسر زند
اک آدھ ادا ان کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں
ہوا میں اگر گلے سڑے دانے چند
موجود ہنر ہوں ذات میں جس کی ہزار
بد ظن نہ ہو عیب اس میں اگر ہوں دوچار
طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر
کر حسن و جمال کا نہ اس کے انکار

مولانا بہت ہی عالی ظرف انسان واقع ہوئے تھے۔ مدرس کی مقبولیت اور مقدمہ شعرو شاعری کی اشاعت سے طرز قدیم کے پرتالان نے ملک بھر میں مخالفت کا شدید طوفان بپا کر دیا۔ اور درحیک سے درحیک جملے مولانا کی ذات پر کیے لیکن یہ مولانا ہی کی ایک واحد شخصیت تھی جس نے مخالفت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور اعتراضات کا نہ خود جواب دیا اور نہ کسی کو جواب دینے دیا۔ ”ادوہ پنچ“ لکھنؤ میں اعتراضات کا لامتناہی سلسلہ زیر عنوان جاری رہا ہے

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے

میدان پانی پت کی طرح بائمال ہے

اس کے علاوہ ”اردوئے معلیٰ“ میں بھی مولانا حسرت موہانی نے مولانا حالی پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی اور یہاں تک لکھ دیا کہ ”سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر تخریب زبان کوئی ہو نہیں سکتا“

اور وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا

اچھا ہے۔ ایک دفعہ مولانا حالی علی گڑھ تشریف لے گئے اور سید

زین العابدین مرحوم کے یہاں قیام کیا۔ ایک دن حسرت موہانی مولانا حالی سے ملاقات کے لئے آئے۔ چونکہ سید زین العابدین شوخ

طبع واقع ہوئے تھے اس لئے وہ ”اردوئے معلیٰ“ کے دو تین

پرچے اٹھا لئے اور بولے ”اسے مولانا یہ دیکھے آپ کے متعلق

یہ کیا تحریر کیا ہے؟“ سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر تخریب زبان

کوئی ہو نہیں سکتا۔ وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اردو کی خدمت

سے روکیں اتنا اچھا ہے۔ مگر مولانا ذرا بھی مگدثر نہ ہوئے۔

کہا تو مسکرا کر یہ کہا ”نکتہ چینی اصلاح زبان کا ایک بہترین

ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں“ اور فرماتے ہیں ۹

اعتراضوں کا زملنے کے ہے حالی یہ نچوڑ

شعرا ب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

کیا بتاؤں کس طرح سب نکتہ چیں ہوئے چپ

سب کچھ کہا انہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

عزیمیکہ دنیانے دیکھ لیا کہ اس شعر و سخن کی لڑائی میں بھی

میدان پانی پت مولانا ہی کے ہاتھ رہا ہے

وہ حالی جس نے ابدالی سے بڑھ کر معرکہ مارا

تکلم سے مسخر کر لیا ہندوستان سارا

(حقیق جان دھری)

مولانا میں ہمدردی اور رحمدلی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا

ہوا تھا۔ آپ اپنوں اور غیروں کی بلا امتیاز ہر ممکن امداد فرماتا کرتے تھے

بلکہ مولانا صحیح معنوں میں ”ارْحَمُوْهُمْنَ فِي الْاَرْضِ وَيَرْحَمْهُمْ مِّنْ

فِي السَّمَاءِ“ اور ”كَرَّحَمٌ مِّنْ كَرِّحَمٍ“ کا عملی نمونہ تھے آپ نے

ان احادیث کو اپنے اشعار میں کس خوبی اور سلیس و بلیغ پیرائے

میں ادا کیا ہے۔

مئی، جون ۱۹۷۶ء

میں چینی کا شربت بنا کر خوب پیا کرتا تھا۔ اس طرح چینی اور بسکٹ جلدی ختم ہو جایا کرتے تھے۔ جب اور جس وقت بھی یہ کہتا کہ مولوی صاحب چینی اور بسکٹ ختم ہو گئے تو فوراً منگایا کرتے تھے اور کبھی یہ نہیں کہا کہ ابھی تو چینی منگائی تھی اتنی جلدی کس طرح ختم ہو گئی۔ گرمی سردی میں ہر قسم کے کپڑوں کا خیال رکھتے تھے۔ بیمار ہوتا تو بڑی فکر کرتے اور تو اور ڈاکٹر حکیم کو بلا کر خود دکھاتے اور توجہ سے علاج کر داتے۔ میں اپنے مزاج کے مطابق مولوی صاحب پر غصہ ہو جاتا اور دیر تک بڑبڑاتا رہتا۔ مگر مولوی صاحب کچھ بھی نہ کہتے۔ میرا یہ برتاؤ دیکھ کر اگر کوئی مولوی صاحب کی توجہ میری اس حرکت پر بھی دلاتا تو مولوی صاحب کہتے،

”ہاں بھائی کبھی ہم اس پر ناراض ہو جیتے ہیں کبھی ہم پر ناراض ہو جیتے ہیں آج اس کی باری ہے۔ اچھا میرا کیا ہرج ہے ناراض ہو لینے دو۔“

مولانا کا ایک اور ملازم نانوں خان کہتا ہے کہ،
 ”ایک مرتبہ مولانا حالی دہلی گئے وہاں پر نواب خواجہ دو کے یہاں مولانا کی دعوت تھی۔ اسی دن اتفاقاً میں بیمار ہو گیا۔ مولانا کو سخت پریشانی ہوئی مولانا نے فوراً حکیم کو بلوایا اور بڑی توجہ سے علاج شروع کر دیا اس دوڑ دھوپ میں مولانا معروف ہی تھے کہ نوب صاحب کا ایک آدمی مولانا کو بلانے کے لئے آیا۔ آپ نے نوب صاحب کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ نانوں خاں کی طبیعت خراب ہے اور میں اس کی دیکھ بھال میں معروف ہوں۔ اس عذر کے لئے شرمندگی کے ساتھ معافی چاہتا ہوں۔“
 اس ملازم کی زبانی ایک اور واقعہ ضبط تحریر ہے۔
 ”سردی کا موسم تھا میں نے کوئی کپڑا سردی کے لئے نہیں بنوایا تھا۔ مولانا کو جب یہ معلوم ہوا، مولانا نے اپنی نئی روٹی کی واسکٹ اتار کر دے

”خدا رحم کرتا نہیں اسے بشر پر
 نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
 کسی کے گرفت گلاں جاتے سر پر
 پٹے غم کا سایہ نہ اس بے اثر پر
 کرو مہر بانی تم اہل زمین پر
 خدا مہر ہاں ہوگا عرش بریں پر“

اسی سلسلہ میں مولانا کے چند واقعات بھی پیش خدمت ہیں،
 مامی نامی ایک عزیز عورت کو مولانا نے اپنے مکان کا ایک حصہ دے رکھا تھا۔ اس کا خود کا بیان ہے کہ مولانا مجھ سے بہت ہی حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔ سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے اور مالی امداد بھی کر دیا کرتے تھے۔

مولانا نے عطار اللہ نامی ایک ملازم رکھا ہوا تھا۔ جو کہ بالکل معذور تھا۔ کانوں سے بہرا، ہاتھوں سے لنگھا اور وہ پیروں سے نکلوا اس کے علاوہ مزاج کا غصیلا تھا۔ اکثر مولانا سے بھی بے ادبی سے پیش آہاتا تھا۔ لیکن مولانا کا اس کے باوجود اس سے برتاؤ مہربانہ اور ہمدردانہ تھا۔ ایک صاحب نے مولانا کا یہ برتاؤ دیکھ کر مزاحیہ انداز میں کہا،

”مولانا اگر عطاء اللہ خوش قسمتی سے بالکل اندھا بھی ہوتا تو آپ کے نقطہ نگاہ سے اس میں ایک اور خوبی کا اضافہ ہو جاتا۔“

چنانچہ مولانا کا جو اس سے برتاؤ تھا وہ عطاء اللہ کی زبانی سنئے۔ ”مولوی صاحب بڑے ہی اچھے آدمی تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کوئی چیز بازار سے منگائی اور روپیہ دیا۔ باقی پیسے گئے بغیر جیب میں ڈال لیا کرتے تھے۔ مولانا کو چائے کی عادت بھی تھی اور چائے سے آنے والوں کی تواضع بھی کرتے تھے۔ چونکہ اس کا انتظام میرے سپرد تھا۔ اس لئے یہ سب چیزیں میرے ہی پاس رکھی رہتی تھیں۔ میرا جب دل چاہتا یا بھوک لگتی تو بسکٹ کھایا کرتا تھا۔ گرمی کے موسم

دی“

مولانا ایک دفعہ آپ وہاں تبدیل کرنے کی عرض سے اپنے ایک عزیز ڈاکٹر لیاقت حسین کے ہاں فرید آباد چلے گئے۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب کی ملازمہ وزیرین کا چھوٹا بچہ بیمار ہو گیا۔ اور ساری رات روتا رہا۔ جب مولانا نے متواتر بچہ کی رونے کی آواز سنی تو بے چین ہو گئے اور اپنے بستر سے اٹھ کر وزیرین کو آواز دی، بچہ کا حال دریافت کیا اور فرمانے لگے کہ اگر اس وقت ڈاکٹر کی یاد دوا کی ضرورت ہو تو کچھ انتظام کیا سہلے۔ وزیرین نے کہا کہ ”نہیں مولوی صاحب صبح دیکھی جائے گی۔“ لیکن مولانا کا خیال رات بھر بچے ہی کی طرف لگا رہا۔ صبح اٹھتے ہی جب ڈاکٹر لیاقت حسین صاحب مولانا کے پاس آئے تو فوراً مولانا نے کہا۔

”آپ پہلے وزیرین کے بچے کو دیکھ آئیے وہ بیچارہ رات بھر بخار ہونے کی وجہ سے روتا رہا۔ چنانچہ جب تک بچہ اچھا نہ ہو لیا برابر اس کی دوا کرتے رہے۔ اور روزمرہ اس کی حالت اور کیفیت دریافت کرنے برابر جاتے رہے۔“

فرید آباد میں قیام کے دوران مولانا حالی کو ایک پُر لطف واقعہ درپیش آیا۔ مولانا کے خط بنانے کے لئے ایک نائی آیا۔ اس نے خط بنانے کے دوران مولانا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”جی حضور مولوی صاحب! خدا آپ کو خوش رکھے ایک کام تو ہمارا بھی کر دیجئے بسمدی لڑ آپ کی جان و مال کو دعا دیتا رہوں گا۔ کام یہ ہے کہ ہمارا ایک عورت پر دل آگیا ہے۔ ہم نے اس سے شادی کرنی چاہی وہ تو راضی ہو گئی مگر خدا سستیاس کرے اس کے رشتہ داروں کا کہ انہوں نے خدا واسطے کے پیر میں آکر اسے بہکا دیا اور نہ معلوم میری طرف سے اس کے کان میں کیا چھوٹا کہ اب وہ عورت بھی فریٹ ہو گئی ہے۔ میں نے ہر چند کوشش کی مگر وہ کینٹ کسی طرح گھٹلے ہی میں نہیں آتی بس حضور کوئی ایسا تعویذ مجھے لکھ دیں کہ اس کے بھائی بند اور وہ

خود ہاتھ جوڑتے پھریں اور خوشامد کرتے پھریں مولوی صاحب یہ کام تو آپ کو کرنا ہی ہو گا۔ چاہے خط کے پیسے آپ نہ دیں مگر تعویذ ضرور لکھ دیں۔ میں نے آپ کی بڑی تعریف سنی ہے۔ اور میں بغیر تعویذ لئے یہاں سے ہرگز نہ ٹلوں گا۔“ لطف یہ کہ مولانا حالی نے اس عجیب و غریب مسئلہ کو حل کرنے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ جب دوسرے دن قصبہ کے ذی وجاہت اور با اثر اصحاب مولانا کے پاس جمع ہوئے تو مولانا نے نہایت شد و مد کے ساتھ چھوٹا حجام کی سفارش کی اور کہا جس طرح بھی ممکن ہو آپ صاحبان کوشش کریں کہ اس عورت کے والدین اس سے شادی کر دیں۔ لوگوں نے کہا۔

”حضرت چھوٹے ساتھ شادی کرنا عزیز لڑکی کو تہا اور برباد کرنا ہے۔ کیونکہ وہ نہایت آوارہ، نشہ باز۔ جواری اور عیاش آدمی ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو بیچاری کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ جب مولانا کو یہ حالات معلوم ہوئے تب حاکم مولانا اس کی وکالت سے دستبردار ہوئے۔“

مولانا انور احمد مرحوم ایک دفعہ مولانا کے یہاں پانی پیت مہمان ہوئے۔ رات کا وقت تھا سردی کا موسم تھا۔ مولانا انور کہتے ہیں کہ

”رات کے بارہ بجے تھے مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص میری رعنائی کو آہستہ سے چھو رہا ہے۔ میں نے چونک کر پوچھا کون؟ مولانا حالی نے کہا،

”وہ میں ہوں۔ آج سردی زیادہ ہے مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کے پاس اوڑھنے کا سامان کافی نہ ہو تو یہ کیل لایا تھا اور آپ کو اوڑھا رہا ہوں“ انور صاحب کہتے ہیں کہ ”مجھے ان کی شفقت کا ایسا اثر ہوا کہ عمر بھر نہ بھول سکتا۔“

ملازم کر لیا اور اس کے بعد محمد علی ہائی سکول (جو کہ بعد میں گورنمنٹ نے تحویل میں لے لیا تھا) امرالئی برار (جو کہ اب مدھیہ پردیش ہے) میں ہیڈ ماسٹری کی ملازمت دلائی۔

ایک مرتبہ ایک شخص مولانا کے پاس آیا۔ اور کہا کہ نواب کنگ پور کے ہاں ملازمت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ایک سفارشی چٹھی مجھے لکھ دیں اور اس میں یہ تحریر کر دیں کہ حامل رقعہ میرا رشتہ دار اور عزیز ہے۔ اور جو سلوک آپ ان کے ساتھ کریں گے۔ وہ میرے ساتھ کریں گے۔ مولانا نے اسی طرح لکھ دیا۔ ایک صاحب جو اس وقت مولانا کے پاس بیٹھے تھے کہنے لگے کہ مولانا یہ تو آپ کا رشتہ دار نہیں تھا۔ پھر آپ نے ایسا کیوں لکھ دیا۔ مولانا نے فرمایا ہے ”بنی آدم اعضاء یکدیگر بند“ اگر اتنا بھی ہم اپنے بھائیوں کے لئے کام نہ آسکیں تو ہماری حالت پر افسوس ہے۔ ذرا سوچو تو سہی اگر صرف اتنا لکھ دینے سے اس شخص کو نوکری مل جائے تو اس میں میرا کیا ہرج اور نقصان ہے۔“

”ہیں وہی انسان جو آتے ہیں ہم جنسوں کے کام ورنہ ہیں انسان سے سو بار بہتر جاسور“ (حالی)

مولانا حالی حسن اخلاق کا زندہ نمونہ تھے۔ وہ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آتے تھے چنانچہ مولوی عبدالحق مرحوم فرماتے ہیں۔

”طالب علمی کے زمانہ میں علی گڑھ میں مولانا حمید الدین مرحوم اور میں جب مولانا سے ملنے گئے تو مولانا مرقہ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ہم اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوئے۔ مولانا حمید الدین نے کہا بھی کہ آپ ہمیں تعظیم دے کر محبوب کرتے ہیں۔“

مولانا نے فرمایا کہ :

مولوی عبدالحق مرحوم تحریر کرتے ہیں ”ایک دفعہ مولانا حالی نواب حیدر آباد کی دعوت پر جوہلی میں شرکت کے لئے حیدر آباد دکن تشریف لائے۔ ایک صاحب مولانا موصوف سے ملنے کے لئے ٹم۔ ٹم۔ ٹم پر آئے۔ وہ صاحب بالکل دروازے کے سامنے اتنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دروازے سے دو قدم لگے جا کر کھڑی کی۔ یہ حضرت اس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور کئی ہنڑ اس عریب سائیس کے نگائے۔ یہ نظارہ مولانا برآمدہ میں کھٹے دیکھ رہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مولانا کا چہرہ متغیر تھا۔ آپ برآمدہ میں ٹپٹے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے۔ ”ہائے ظالم نے یہ کیا کیا۔“ اس روز دوسرے کا کھانا مولانا نے اچھی طرح نہ کھایا۔ اور کھانے کے بعد قیلوے کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوئی۔ فرماتے تھے۔ ”یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہنڑ میری پیٹھ پر مارے ہیں۔“ اس کیفیت سے جو کہ ب اور در مولانا کو تھا وہ شاید اُس پر نصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔“

مولانا خواجہ تصدق حسین صاحب مرحوم کو ایک عزیز کے متعلق لکھتے ہیں۔

”اس بات کی بھی مجھے کچھ پرواہ نہیں ہے کہ وہ اپنی قدیم عادتیں چھوڑیں یا نہ چھوڑیں۔ اپنی بیوی بچوں کی خبر لیں یا نہ لیں اور اپنے باپ دادا کا چلن اختیار کریں یا نہ کریں۔ میں بہر حال ان کی اعانت کرنے کو موجود ہوں۔“

راقم اطراف کے تائے خواجہ لطیف احمد (مرحوم) فرمایا کرتے تھے کہ :

”مولانا حالی کے میرے والد مرحوم سے بڑے گہرے تعلقات تھے مولانا اکثر ہمارے یہاں آیا جایا کرتے تھے ہم سب بھائیوں سے بڑا انس تھا۔ چنانچہ مولانا نے مجھے علی گڑھ میں داخل کرایا۔ اور جب میں نے بی۔ اے کر لیا تو اینگلو عربک کالج دہلی میں

آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی کروں۔ ہندو
آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔“

مولانا حالی جہاں خود ہمدرد وطن قوم تھے وہاں دوسروں
کی قومی خدمات کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ مولانا
ظفر علی خاں جو کہ مولانا حالی کے بچوں کے برابر تھے ان کی قومی خدمات
کو کس طرح کن الفاظ میں سراہتے ہیں اور کتنی قدر و منزلت کی نظر سے
دیکھتے ہیں ذرا غور فرمائیں۔ ”مجھے تو مسلمانوں کے دکھڑے لے اتنی مہلت
ہیں نہیں دی کہ تیجہ کے مناظر پر کچھ طبع آزمائی کرنا مولوی اسماعیل میرٹھی
بھی اب ہماری طرح پایہ تکاب ہیں صرف پنجاب میں آپ جیسے چند لوگوں کی
صورتیں نظر آتی ہیں بشرطیکہ آپ کو فکر معاش دم لینے دے۔ اس کے
غلاوہ مولانا حالی نے جنگ بلقان سے متاثر ہو کر ایک طویل نظم لکھی جس
میں مولانا ظفر علی خاں کی خدمات پر داد تحسین یوں دی۔

اے مالکِ دفترِ زمیں دار
اے نازشیںِ قوم و فخرِ اقراں
اے دین کے امتحان میں جہاں باز
اے نصرتِ حق میں تیغِ عسریاں
اے صدق و صفا کی زندہ تصویر
لے شیرِ دل لے ظفر علی خاں
بلقان و طرابلس میں ناگاہ
اٹھا ستم و جفا کا طوفان
ہمدردیِ اہلِ دین نے آخر
جو ہر ترے گردے نمایاں
مشرق میں ہوں دردِ دل سے بے چین
مغرب میں سُنیں جو رنجِ اخوان
سو زخمِ دینِ حق سے جہن کے
سینے ہوں کبابِ دل ہوں بریاں
زندہ ہے وہ ملک اور وہ ملت
ہوں زندہ دل ایسے جس میں انسان

جو ملک و وطن کے ہوں فدائی
جو قوم کے نام پر ہوں متدباں
کاش ایسے جتنے سدا وہ فسرند
جو قوم کے درد کے ہوں ددماں
ہاں اس میں نہیں مبالغہ کچھ
سنتا بھی ہے اے ظفر علی خاں

اپنے زمانہ کے با عظمت و بار خست انسان نے اپنی منکسر المزاجی
کا انہار خراجِ تصدق حسین مرحوم کے خط میں یوں کیا ”جب میں زمانہ
کی نگاہ میں اپنی قدر و منزلت کا اندازہ کرتا ہوں تو اس سے زیادہ نہیں
پاتا کہ ایک مشہور گویا جہاں کہیں جاتا ہے امراء اس کی خاطر کستے ہیں
اور اگر وہ خود نوکری چاہتا ہے تو تھوڑی بہت نوکری بھی ہر جگہ اس
کو مل جاتی ہے لیکن اگر وہ گھر بیٹھے اپنے دوستوں اور عزیزوں کی
سفارش کرنی اختیار کرے تو کوئی اس کی طرف التفات نہیں کرتا یہی حال
میر ہے۔ اگر میں خاص اپنی ذات کے لئے کہیں جا کر کچھ فائدہ حاصل کرنا
چاہوں تو شاید کسی قدر کامیابی ہو جائے لیکن یہ ہرگز امید نہیں کہ میری
سفارشوں کی بھی ایسی ہی قدر پرورش ہو جیسی مجھ کو اپنی

حق کو ہوتا ہے جنہیں دینا میں کرنا سر بلند
خصلیتیں یہ برگزیدہ ان کو ہوتی ہیں عطا

غرضیکہ علم و ادب کی یہ شمع جو ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں روشن
ہوئی اور جس کی روشنی سے تمام ملک روشن ہوا۔ اور جس نے لاکھوں
دلوں میں جوت جگائی وہ ہمیشہ کے لئے ۱۳ صفر ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء کی رات کو گل ہو گئی۔

جگا کر خباکیوں کو گنبدِ افلاک کے نیچے
وہ حالی سو گیا اپنی وطن کی خاک کے نیچے
آپ کو حضرت یوحنا شاہ قلندر و عتہ اللہ علیہ کے مزار مبارک
کے احاطہ میں جگہ نصیب ہوئی۔

تحریک پاکستان اور طلباء علی گڑھ

قیصر سہانپوری

یونیورسٹی کے طلباء نے ہندوستان کے شہروں اور دور دراز گاؤں میں پھر پھر پاکستان کی صبح ضرورت کا احساس دلایا۔ اور مسلمانوں نے مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر پاکستان حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

اس سلسلہ میں مجھے بھی مسلم لیگ کا کام کرنے کے لئے یوپی اور پنجاب کے شہروں اور دیہات میں جانا پڑا۔ یہ وہ دن تھے جب علی گڑھ کے طلباء تقریباً ہر روز ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بھیجے جا رہے تھے۔ میں بھی طلباء کی ایک پارٹی کے ہمراہ لاہور جانے کے لئے علی گڑھ ویلے اسٹیشن پر پہنچا۔ جب دہل جانے والی گاڑی پلیٹ فام پر رکی تو ہم نے جلدی جلدی سامان ریل کے ڈبے میں رکھنا شروع کر دیا۔ مسلم لیگ کا سبز پرچم ریل کے ڈبوں کے باہر دسی سے باندھ دیا۔ ہماری پارٹی تقریباً پچاس طلباء پر مشتمل تھی۔ ہم لوگ جلدی جلدی گاڑی میں سوار ہونے لگے جس ڈبے میں میں اور میرے ساتھی سوار ہوئے تھے، اس ڈبے میں زیادہ تر ہندو جا سبھاٹی بیٹھے تھے ہم لوگ نعرہ تکبیر، نعرہ توحید مسلم لیگ زندہ باد، پاکستان لے کے وہیں گئے کہ نعرے لگا رہے تھے۔ جب ہندوؤں نے ”پاکستان لے کے رہیں گے“ کے نعرے سنے تو صبر کا دامن چھوڑ دیا اور ایک دوسرے سے اس طرح گویا بچھے ”مسلم لیگ نے لوگوں کا وقت خراب کرنے کے لئے ان کو ایک طرح سے بھینٹ چڑھا دیا ہے“ ایک کہہ رہا تھا ”پاکستان کیا بلا ہے مسلمان سہانے خواب کی

جب انگریزوں اور ہندوؤں نے تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے تو قائد اعظم نے چیلنج کیا کہ اس کا فیصلہ انتخابات کے ذریعے کیا جائے چنانچہ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی مرکزی قانون ساز اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے جس میں مسلم لیگ کو زبردست کامیابی ہوئی۔ مسلم لیگ کی فتح سے انگریز اور ہندو یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے اور پاکستان کا مطالبہ بالکل صحیح ہے۔ اس الیکشن میں چند مسلمان ایسے بھی تھے جو کانگریس، جمعیت العلمائے ہند، احرار اور خاکسار تحریکوں سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے ہر مقام پر ال اٹھیا مسلم لیگ کی سنت تریں مخالفت کی مگر مسلم لیگ کو فتح ہوئی اور اس کے نتیجہ میں پاکستانی وجود میں آ گیا۔

اس الیکشن میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء نے مسلم لیگ کا ساتھ دیتے ہوئے اہم کردار ادا کیا۔ قائد اعظم کے فرمان پر مسلمانان ہند جو حق الیکشن کا کام کرنے کے لئے ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئے انہیں اس سخت ترین مقابلہ کو کے عمام کو مسلم لیگ اور پاکستان سے روشناس کرایا اور بتایا کہ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے کیا جذبات ہیں؛ اگر خدا نخواستہ پاکستان حاصل نہ ہوا تو مسلمانوں کا انجام رزمِ صرف اُن کا جو مسلم لیگ تھے بلکہ اُن کا بھی جو ہندوؤں کے ساتھ ہیں، انتہائی دردناک ہو گا۔ علی گڑھ مسلم

خان مرحوم سے ملاقات ہوئی وہ ہم لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہم لوگوں کو "زمیندار" اخبار کے دفتر میں چائے پلائی گئی۔ اس وقت لاہور میں ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد کافی تھی۔ ہم لوگ کالی اچکنوں پر برس رنگ کی ساٹن کی پٹی جس پر لفظ "مسلم لیگ" کالے رنگ میں چھپا ہوا تھا، باندھے ہوئے تھے۔ سکھ اور ہندو ہم لوگوں کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

کچھ دیر "زمیندار" کے دفتر میں ٹھہر کر مسلم لیگ کے برجگشی بلاڈنگ کے سامنے تھا۔ یہ بلاڈنگ اُس زمانے میں مسلم لیگ کے ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال ہو رہی تھی یہاں پر مسلم لیونیورسٹی علی گڑھ کے ایک پروفیسر عمر علی خان مرحوم جو میرے دادا کا کزن حافظ محمد فیاض خان مرحوم مسلم لیونیورسٹی علی گڑھ کے پرنسپل آفیسر کے دوست تھے، موجود تھے۔ اور لوگوں کو ٹھہرانے اور مختلف جگہوں پر روانہ کرنے کا انتظام کر رہے تھے۔ میں میاں افتخار الدین کے تلم جاب عمر علی مرحوم کی معرہ علی گڑھ سے مزدوری خط لے کر آیا تھا بیری دیوٹی پر تھی کہ خط لاہور میں عمر علی صاحب کو پہنچا دوں۔ پروفیسر عمر علی مرحوم مسلم لیونیورسٹی علی گڑھ میں ریاضی کے پروفیسر تھے اور اُن کے والد سر سید احمد خان کے خاص کارندے رہے تھے۔ ان کو سر سید احمد خان نے "منش" کا خطاب دیا تھا۔ ہر آدمی ان کو منشی ہی کے نام سے پکارتا تھا۔ یہ اکثر ہمارے یہاں آتے رہتے تھے بغیر میں سے وہ خط عمر علی مرحوم کو پہنچا دیا۔

ایک رات لاہور ٹھہر کر دوسرے دن ہماری پارٹی گوجرانوالہ کے لئے روانہ ہوئی اُس گاڑی پر مسلم لیگ کے پرچم لہرا رہے تھے۔ ہم قعوں کی گرجا میں گوجرانوالہ اسٹیشن پہنچے۔ یہاں بھی مسلم لیگ کارکن اور عوام جگہ استقبال کے لئے موجود تھے ہم لوگوں کو ایک جلوس کی شکل میں مسلم لیگ کے دفتر لے جایا گیا۔ وہ پہلو کا رام کرنے کے بعد ہم لوگ جلوس کی شکل میں قعرے لگاتے اور نظمیں پڑھتے

ہم جہانان علی گڑھ دین پر مٹ جائیں گے
پرچم اسلام پاکستان پر لہرائیں گے

رہے ہیں۔ پاکستان کس طرح بن سکتا ہے؟ ان باتوں پر ہی گفتگو نہیں کیا بلکہ ہمارے چند ساتھیوں سے کہا "دوسرے ڈیے میں چلے جاؤ کیونکہ تم لوگ پاکستان کی باتیں کرو گے اور ہم لوگوں کو غصہ اُٹے گا۔ بیکار میں ایسی ویس بات نہ ہو جائے؟"

حبیب میرے ساتھی اور میں ڈپے سے اترنے کو تیار نہ ہونے تو ایک ہندو نے ہمارے ایک ساتھی کو چھیننے کے لئے باہر دھکیل دیا۔ ہم لوگ برابر ضبط سے کام لے رہے تھے۔ یہ وہی ریلوے اسٹیشن تھا جہاں کسی مسافر لڑکے کو کوئی جبری نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ آج اُس ریلوے اسٹیشن پر ایک جا سمبھائی ہندو نے ایک طالب علم کو دھکا دیا جیسے ہی اُس نے دھکا دیا۔ طالب علم نے اُسے ایک زوردار گھونٹہ رسید کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ علی گڑھ کے طلباء کا وقار و افتخار اپنے سرورج پر تھا ایک طالب علم کے ساتھ ناروا سلوک کا آخری جواب یہی ہو سکتا تھا۔ گھونٹہ کھا کر ڈپے میں موجود لوگوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اب کسی شخص کی مجال نہ ہوئی کہ ہمارے خلاف بات کرے۔ جب

لیاقت علی مرحوم نے جو خود بھی علیگ تھے ہندوستان کو گھونٹہ دکھایا تھا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علی گڑھ کے طالب علم کا وہ گھونٹہ اُن کو یاد آگیا ہوگا۔ ہماری ریل گاڑی ۸ بجے شب ہی ریلوے اسٹیشن پہنچا ہمارا قافلہ کھانے سے فارغ ہو کر لاہور جانے والی گاڑی کے انتظار میں پلیٹ فام پر پہنچا۔ قزوئی دیر بعد لاہور جانے والی گاڑی فرنیچر میل آگئی اور ہم لوگ گاڑی میں سوار ہو گئے تمام رات سفر کرنے کے بعد صبح ۹ بجے کے قریب لاہور پہنچ گئے لاہور ریلوے اسٹیشن پر ہمارا شاندار استقبال ہوا۔ مسلم لیگ کارکن اور طلباء سے جو پہلے لاہور پہنچ گئے تھے لاہور اسٹیشن پر استقبال کی تیاریاں کر رکھیں تھیں اور خود بھی استقبال کے لئے موجود تھے۔ ہم لوگ ایک جلوس کی شکل میں میکوڈوڈ پر "زمیندار" اخبار کے دفتر آئے۔ مولانا کفر علی

بڑھتے چلو

سلطان محمود بیل

شکست و یاس کی ظلمت مٹا کے بڑھتے چلو
دلوں میں عزم کی شمعیں جلا کے بڑھتے چلو
اگرچہ سینکڑوں صبر آزما مراحل ہیں
وہ حیات میں تم سُکرا کے بڑھتے چلو
ازل سے برسرِ پیکار حق سے ہے باطل
غرور و سطوتِ باطل مٹا کے بڑھتے چلو
خلوص و جہر و محبت، مروت و شفقت
دل و نگاہ میں اپنے بسا کے بڑھتے چلو
اگر کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
کلامِ شاعرِ ملت سنا کے بڑھتے چلو
پنے خراجِ عقیدت حضورِ قائمِ قہم
سرِ نیاد کو اپنے جھکا کے بڑھتے چلو
خدا کے واسطے فرقہ پرستیاں چھوڑو
خدا، رسولؐ کا پرچم اٹھا کے بڑھتے چلو
وطن کی آن پر کٹ جانے سر جھکا نہ کبھی
وطن کی شان کو بے عمل بڑھا کے بڑھتے چلو



شہر کی سڑکوں پر نکل آئے۔ لڑکوں کی اکثریت ہمارے ساتھ تھی۔ جب احزابیوں نے ہماری آمد اور جلوس کی خبر سنی تو انہوں نے بھی ایک مختصر جلوس نکالا۔ جب یہ جلوس ہمارے قریب سے گزرا تو انہوں نے ہماری خلافت نعرے لگائے اور کہنے کے ٹوٹ پھوٹے۔ کہا۔ احزاب والے تو کہیں پاکستان کے خلافت تھے۔ جب شام ہو گئی تو ہمارا جلوس ختم ہو گیا اور ہم لوگ واپس مسلم لیگ کے دفتر آ گئے۔

دوسرے دن تانگوں میں سوار ہو کر گوجرانوالہ کے دیہات میں پہنچے۔ اُن دنوں اس علاقے میں اتنی زیادہ دیت اڈتی تھی کہ ہم لوگ چادیں لپیٹ کر سفر کرتے۔ مگر پھر بھی منزل مقصود پر پہنچ کر ہم ریت سے اٹے ہوئے ہوتے۔ گوجرانوالہ کالج کے طلباء ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے جگہ جگہ مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں تقریریں کیں اور اپنی تقریروں میں بتایا کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا چاہیے کیونکہ یہیں اسلامی حکومت قائم کرنا ہے جس کا نام "پاکستان" ہوگا۔ اگر ہم مسلمان ایک جگہ جمع نہ ہوں تو ہم مٹ جائیں گے۔ کیونکہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ مسلمان آزاد ہو کر اپنا الگ وطن بنائیں۔ وہ ہم پر راج کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے غلامی کی زنجیریں توڑ دو۔ ہم اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتے جب تک پاکستان نہ حاصل کر لیں۔ ہندو چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنا مذہب تبدیل کر کے ہندو مت اختیار کر لیں۔ مرنے اس صورت میں وہ ہندوستان میں رہ سکتے ہیں۔ ہماری اس تبلیغ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں بھی ہم گئے ہمارے نعروں کا جواب دیا گیا ہے کہ رہیں گے پاکستان پر اور اس طرح سامنے برصغیر میں پاکستان کے لئے فضا ساز گاہ ہو گئی جہڑٹا کے کوئے کوئے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء آ گئے اور اپنے مشن میں کامیاب ہو کر واپس لوٹے جس کا حسین نتیجہ پاکستان پر ہماری سامنے موجود ہے۔ پاکستان پائندہ باد ۛ

اپور تاش

سرزمین جنگیز خان سے

روح افسزاجیدر

اور یورپ کے دیگر ملکوں سے کاریگر آکر خان اعظم کے لئے سونے چاندی کی جواہرات جڑی گھڑیاں بناتے تھے اور اٹلی کے سنگتراشان کے ہاتھوں میں سنگ مرمر کے مجسموں کا جادو جگاتے تھے اور یہ سب کچھ بارہویں صدی میں روپذیر ہوا تھا۔ ترک اور مغل سب کا بھروسہ جنگیز خان اور ہلاکو خان سے جاملتا ہے۔ ہلاکو خان کی اولاد خوارزم اور بغداد فتح کر کے کچھ عرصہ بعد اسلام سے متاثر ہو کر مشرق بہ اسلام ہو گئی تھی۔ اس سلسلہ میں شاعر مشرق نے کہا۔

”پاسبان مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے“

اور ادھر ۱۵۷۵ء میں بابر کی فوج دریاؤں میں گھوٹے دوڑاتی ہوئی دہلی پہنچ گئی۔

اس مناسبت سے منگو لیا جلتے ہوئے میں نے رائی اور کاکو کو لکھا کہ ہم ”GRAND FATHERS“ کے ملک میں جا رہے ہیں

آج شام ساڑھے چھ بجے ہم ماسکو کے ہوائی اڈے ”شیریمیتو“ SHEREMETEV سے اولن باتور ULAN BATORE روانہ ہوئے۔ اولن باتور منگولیا کا دارالخلافہ ہے۔ خیال تھا کہ گرمیوں میں وہاں ہوائیں چونک دہاں سردی جلد شروع ہو جاتی ہے مگر وہاں کی حکومت نے ۲۰ اکتوبر کو سفارتی کاغذات پیش کرنے کی تاریخ مقرر کی۔ حکومتوں کے مزاج کچھ قدیم شاعروں کی مجھوتوں سے مختلف نہیں ہوا کرتے۔ سر تسلیم خم ہے.....

مجھے مدت سے منگو لیا دیکھنے کا شوق تھا۔ اس سرزمین کو.... جہاں جنگیز خان کی اولاد نے اپنے دبدبہ کا ڈنکا بجا دیا تھا یہ سرزمین طویل ترین عرصے تک ان کے پیر سے اڑاتی رہی۔ انہوں نے اپنی فتوحات سے مشرق سے عرب تک ایک آگ سی لگا دی تھی۔ منگو لیا میں اولن باتور کی شمال کی طرف اونچے پہاڑوں پر ان کا دارالخلافہ تھا جہاں برطانیہ

پانچ گھنٹوں کا فرق ہے۔ گویا اس وقت ہم پاکستان سے بہت مشرق کی طرف آ گئے تھے۔ وہاں بارش ہو کر تھی تھی۔ ہوا بہت سرد چل رہی تھی۔ ہمیں لینے کے لئے عکسہ استقبالیہ کے افسر اعلیٰ اور ایک منگولین ترجمان خاتون موجود تھے۔ ایر پورٹ پر کوئی نمٹ گھٹنا پڑا اور پھر اپنے مہربان ترجمان کے ساتھ ہوٹل پہنچے۔ دامن کوہ بلکہ یوں کہیے کہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھرا ہوا یہ چھوٹا سا شہر ہے۔ دریائے طولی اس شہر کے وسط سے گزرتا ہے۔ دریا پار کرتے ہوئے ترجمان نے بتایا کہ اس پر پل بنایا ہوا ہے۔ اور بہت سی سرکاری عمارتیں اور رہائشی فلیٹ نئے بنے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ سڑکیں وسیع ہیں اور شہر کے ارد گرد بلکہ وسط شہر میں بھی یورج (YURUT) یعنی منگولی نیچے کوڑے سے نظر آتے ہیں۔ منگولی شروخ سے ہی انہیں خیموں میں

رہتے تھے اور یہیں معلوم ہوا کہ شہر کی ساٹھ فیصد آبادی اب تک ایسے ہی خیموں میں رہتی ہے۔

ہوٹل کے بارے میں ماسکو میں چند یورپین سفیروں اور اس کی بیگمات نے بہت ڈرایا ہوا تھا۔ اس لئے ڈرتے ڈرتے وہاں قدر رکھا۔ مگر ایسا برا بھی نہ تھا۔ اچھے خاصے صاف کشادہ کمرے تھے اور صاف ہی غسل خانہ تھا۔ سینٹرل ہیٹنگ CENTRAL HEATING اور ٹی وی موجود تھا کھانا، البتہ میں نے وہاں کے مکروہ طعام میں نہیں کھایا۔ کیونکہ غلام گروش ہی سے چربی کی مخصوص بو آتی تھی۔ ایک دن سفیر کے ہاں کھانا کھایا جو حسن اتفاق سے بغداد میں چودہ سال پہلے ہمارے ساتھ تھے اور ان سے بہت دوستی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ نیاپلی اور کٹر بڑی بڑی سرکاری سنگین عمارتیں جینیوں نے بنائی ہیں۔

مدارس میں منگولی زبان ہے لیکن روسی لازمی ہے اور صاب عمارتوں اور شاہراہوں کے نام روسی زبان کے رسم الخط میں لکھے ہوتے ہیں۔ ایک دوپہر میں برطانوی سفیر کے ہاں کھانا کھایا۔ دونوں میاں بیوی بہت غلیظ اور متنازع ہیں۔ سفیر کی بیوی MRS PONSOVY

(یہ بھی ایک لطیفہ ہے جسے پھر کبھی پیش کروں گی) دفتر سے ہمارے مسکریڑی دوم ایاز امیر صاحب ساتھ تھے۔ ایاز امیر صاحب کی بیوی شہناز ریڈیو کے ہر دلعزیز میوزک ڈائریکٹر سرور نیازی صاحب کی بیٹی ہیں۔ شہناز کی امی میری پرانی دوست ہیں۔ شہناز کو دیکھ کر مجھے وہ زمانہ یاد آ جاتا ہے جب ہم نے ریڈیو شریع شریع میں خریدا تھا۔ میں اپنے میں پڑھتی تھی اور والد محترم ریڈیو سے صرف خبریں ہی سننا پسند کرتے تھے اور موسیقی سے انہیں دلچسپی خاص نہیں تھی۔ سردیوں کے زمانہ میں بیٹھنے کے کمرہ میں آتش دان کے قریب بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھا کرتی اور رات کو اپنے مرحوم مرحوم آواز میں ریڈیو کو کھولتی تو ”ایک صاحب“ کی آواز میں نیازی صاحب کی مسحور کن آواز سنی جاتی۔

غیر تھا۔

”میں کیسے بھلا دوں تھے میں کیسے بھلا دوں“ تقریباً چھ گھنٹے کی پرواز کے بعد ارکٹر پہنچے۔ یہ شہر قدیم جمیل ”بیکل“ کے قریب ہے۔ یہ جمیل دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے گہری جمیل ہے۔ جرمنی سے آتے ہوئے وہاں کے وزارت خارجہ کے معاملات پاکستان PAKISTAN AFFAIRS کے سیکریٹری سرٹان نے جو دو سال پہلے پاکستان بھی تشریف لے گئے تھے۔ ہماری اوداعی دعوت میں سجاد حیدر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ ”میری دعا ہے کہ ہماری آپ کی دوستی اتنی ہی عظیم اور گہری ہو جتنی جمیل بیکل ہے۔ چمکیز خان کی قدیم تاریخ میں بھی جمیل بیکل کا ذکر ہے اس وقت تک صبح کے چار بج چکے تھے۔ صبح صادق کی روشنی میں ہوائی جہاز سے جمیل کا بے پناہ پانی ڈوتا ہوا جھللا رہا تھا۔ اس پانی میں ایک عجیب سی دھت کھوئی ہوئی نظر آتی ہے جو مکان اور لامکان سے بلے نیاز ہے۔

ہم اپنے وقت کے اندازے کے مطابق صبح چھ بجے اولن باتور پہنچے۔ وہاں کی گھڑی گیارہ بج رہی تھی یہاں اور وہاں کے وقت میں

سک اور اٹلس پر نازک گلکاری سے بنائی گئی ہیں۔ ان تصویروں میں شکار کے مناظر سوتی اور ریشی دھاگوں سے کاڑھے ہوئے ہیں اور بیچ بیچ میں باریک پچھے موتی، سونے چاندی اور جواہرات سے جالی بنائے ہوئے ہیں۔ اس قدر پیچیدہ اور نفیس کام میں نے تو کبھی نہ دیکھا۔ آخری کمرہ میں تمام موسیقی کا سامان تھا جیسے طبل اور نقاسے وغیرہ اور منگولین موسیقی کا ایک خاص باجا جو کہ ڈنگلی کی شکل کا تھا چرتے ہال میں سولہ بچاریں رات دن چنگیز خان کی مال و دولت، عزت اور زندگی کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اس کمرے کی دیواروں پر چیتے کی کھالیں لگی ہوئی تھیں۔ نویں ہال کے عبادت خلتے میں چنگیز خان خود عبادت کرتا تھا۔ اس کمرے کی تصویریں سب سے خوبصورت اور نمایاں آرٹ کے نمونے تھے۔ یہ راتابہزار خان کے ہاتھ کے بنے ہوئے تھے جو فوٹیت خان کا بیٹا تھا اور بچپن سے اسے تصویریں بنانے اور خیمہ سازی کا از حد شوق تھا۔ اس نے خان بننے کے بعد بھی یہ شغل جاری رکھا۔ عبادت گاہ کے بعد دوسری عظام گردش میں چلتے ہوئے دوسری عمارت میں داخل ہوئے جو خان کا محل تھا۔ اس میں بڑا خان بڑی شان سے رہتا تھا۔ ان کمروں میں اس کی اور اس کی بیگم کی ذاتی اشیاء سلیقہ سے غائب کی گئیں تھیں۔ کئی کمرے مختلف نوادرات کی غائب گاہ بنے ہوئے تھے۔ ان نوادرات میں خوبصورت قالین، فالوئس، گلدان، اٹلس کے لباس، سونے چاندی کے کھانے کے ظروف، سنگ مرمر کی میزیں، سونے چاندی اور ہاتھی دانت کی منتقش میز اور کرسیاں، تخت اور چھپر کھٹ ریشمی پردوں کے ساتھ پیچھے موتیوں کی جھاریں لنگ رہی تھیں۔

بیچے کی منزل میں سب سے زیادہ اہم تاریخی اور قدیم چیز جو نظر آئی وہ خان کا خیمہ ہے۔ باہر سے اس کی چھت کھالوں کی بنی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہاں کی گھبلان خاتون نے مجھے کمال حیرانی کے ساتھ خیمے کے اندر جانے کی اجازت دی۔ (اللہ جگ کر جاتا ہے) اس گول سے کمرے میں ایک

پاکستان بننے سے پہلے پشاور میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد فوج میں تھے اور یہ خاتون غالباً تیرہ سجدہ سال کی عمر تک لاہور میں رہیں۔ وہاں کی باتیں دلی اشتیاق سے پوچھ رہی تھیں۔ ان کے اس جذبہ کے مد نظر میں نے ان کی ملاقاتی کتاب میں اردو میں ”پشاور کی طرف سے سلام محبت لکھا۔ وہ لوگ اپنے لئے پھل، سبزیاں، گوشت، مچھلی اور بھول بیگ سے منگواتے ہیں۔ ان کا ایک کوریئر (COURIER) سفارتی بیگ لے کر ہر ہفتہ سرکاری ڈاک آؤٹن با تو ر لاتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ قاصد برطانوی عملے کے لئے سودا سلف بھی لے آتا ہے گھوڑے شہر میں نظر تو آئے تو کم از کم ہماری ترجمان کہتی تھیں:

کہ ہم لوگ شہر میں رہ کر بالکل بیکار ہو گئے دیہاتوں میں تو بچے چھوٹی عمر میں ہی شہسوار کی سیکھ لیتے ہیں۔ مذہب ان کا بدھ مت تھا مگر اب کیا ہے کسے معلوم!! البتہ (MONSTRY) عبادت گاہ جب کہ دیکھی تو (MRS. PONSOVY) اب بھی صبح کے وقت اس میں عبادت ہوتی ہے۔ تاریخی جانب گھر تو بند تھا غالباً مرمت ہو رہی تھی۔ بہت افراد کے بعد خان کا محل (PALACE) دیکھا۔ یہ سٹیٹ میوزیم کا حصہ ہے اور منگولیا کے قدیم شاہی خاندان کا موسم سرما کا محل ہے یہ بادشاہ یا خان مذہب پشیمابھی ہوا کرتے تھے۔ یہ محل چینی اور منگولی گائیگوں نے دس سال کے عرصے میں تعمیر کیا تھا اس محل کے فصیح جہاں اور باہر سے ایک چینی بگودا کی شکل میں منتقش لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان بیچہ دریچ

لکڑی کی جالیوں میں ایک بھی کیل استعمال نہیں کی گئی تھی۔ پہلا حصہ ڈیوڑھی کا تھا جو بڑا تھا اور جو خان اعظم کے لئے تھا۔ اس کے بعد ایک کے بعد ایک کئی عبادت خانے ہیں جن میں قدیم منگولین دیوتاؤں اور جہانمائی کی تصاویر اور مجسمے رکھے ہوئے ہیں۔ ان تصاویر اور مجسموں میں منگولین، چینی اور تبتی آرٹ کی آمیزش نظر آتی ہے کئی بت قدیم منگولین دیوتاؤں کے چاول کے باریک کاغذ اور مٹی کو گوندھ کر بنائیں اور منتقش بنائے گئے ہیں۔ اس عبادت خانے کے چند کمروں میں دیوار گیریاں، چینی

کوٹ تیار ہوتے ہیں (سب ہی عمدہ ہوتے ہیں) سب کے سب منافع کے حساب میں خود ہی لے جاتے ہیں۔ دروغ برگردان راوی۔
'اولن باتور' سے یاد آیا کہ یہ لفظ 'باتور' بہادر کی خرابی ہے۔

اصل لفظ بہادر ہے جس کا وہی مطلب ہے جو ہماری زبان میں ہے اور یہ لفظ منگولیا سے نکل کر تبت، نیپال اور ہندوستان میں استعمال ہونا شروع ہوا۔ مثلاً واشرائے بہادر۔ اب ان کے یہاں بگڑ کر باتور بن گیا۔ اس شہر کا قدیم نام UREA اب انقلاب کے بعد اس کا نام اولن باتور میں بدل دیا گیا ہے اولہ کے معنی سُرخ ہوتے ہیں۔

چنگیز خان کے دادا کا نام بارتان بہادر تھا۔ بہادر کا مطلب منگول زبان میں شجاع کا ہے۔ چنگیز خان کا دادا ایک شجاع سپاہی تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے، تیسرا بیٹا یوگے چنگیز خان کا باپ تھا۔ چنگیز خان کی ماں یوتون کو یوگے نے پہلے پہل گھوڑا گاڑی میں دریا عبور کرتے دیکھا تھا۔ اس وقت یوتون ایک خوبصورت لڑکی تھی لے یوگے نے کس طرح جیتا اپنی جگہ ایک دلچسپ داستان ہے۔ بڑی عمر میں یوتون میں جس کے ساتھ ساتھ وقار اور دبدبہ بھی آگیا تھا۔ چنگیز خان اپنی ماں کے حکم کو عبادت سمجھتا تھا اور اس سے بہت خائف رہتا تھا۔ وہ ایک دیر اور غنور خاتون تھی جس نے اپنے بیٹوں کو نہایت محنت سے شرافت، شجاعت، اور خوداری کے اصول پچھن سے سکھائے تھے۔ مچھائے گوبن کے اوپر کایہ حصہ جہاں جہاں سے منگول تاتار اور

ترک اُسے دلاور سپاہیوں، جنگجو بہادروں اور برق رفتاد گھوڑوں کے لئے تاریخ عالم میں مشہور ہے۔ اس وقت کے منگولوں میں رواج تھا کہ قبیلہ کے سردار کے بیٹوں کی شادیاں دو روزہ کے قہیلے کے سرطوں کی بیٹیوں کے ساتھ کرتے۔ اس طرح اُن کی نسل تازہ دم رہتی اور مختلف علاقوں کے با اثر سردار مددگار اور دوست بن جاتے۔ اس خیال کے مد نظر چنگیز خان کی نسبت واوئی سمجھنے کے سردار کی بیٹی برتر سے ہوئی جس کا علاقہ چین کے بالکل قریب تھا۔ اور اُن کا چینی سوداگر

دریا کو کوزے میں بند کیا ہوا نظر آتا ہے۔ اندر کی چھت اونٹن شاہوں سے منظم ہوئی ہے۔ ایسی خوبصورت شاہیں جیسے کہ جامہ وادوزمین پر نرم و گرم قالین نیچے کے عین وسط میں بڑی سی انگلیٹھی چاندی کے جیسے عربی میں منقلہ کہتے ہیں گولی گولی دیواروں کے ساتھ گولائی میں دیوان جن پر قالین اودان پر جنم کے گدے جی پر کارچوب کا کام، ان کے اوپر کنو اب کے سینکھنا گئے۔ ان دیواروں کے سامنے تھنی تھنی سبک ونازک میزیں ہاتھی دانت اور آبنوس کی بنی ہوئی تھیں ان کے اوپر چاندی کے عوداں خوشبو جلانے کے لئے طلائی شمع دان۔ سامنے کے بڑے دیوان کے سامنے ایک خوبصورت کرسی شہ نشین کھجے۔ بڑی میز پر دو خوبصورت چاندی کے اونچے اونچے چائے دان جن میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ چاندی کی سینی میں چینی کی نازک نازک پیالیاں۔ دوسری طرف ایک بڑا سا خوبصورت طلائی سادار، ایک چھوٹی سی انگلیٹھی پر مستقل رکھا رہتا ہے جس میں چائے

کا پانی دن رات گرم رہتا ہے۔ یہ منگولیا کی تہذیب کی ہلکی سی جھلک ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ یہ چنگاریاں کس خاکستر کی باقی ہیں ترجمان خاتون سے معلوم ہوا کہ ان کا پس سہن اب بھی چینیوں کے بہت قریب ہے ان کی طرح یہ بھی پانی بالکل نہیں پیجتے۔ ہر وقت چائے پیجتے ہیں چائے کو چائے ہی کہتے ہیں۔

اپنے بزرگوں کے سامنے ننگے سر بیٹھنا گستاخی سمجھتے ہیں۔ عورتیں اب بھی منگول لباس پہنتی ہیں لیکن اب نئی تہذیب کے زیر اثر لمبے لمبے کھلمکھم لبادوں کے ساتھ پاؤں میں لمبے بوٹ ہاتھ میں بٹوہ اور چھاتالے کو نکلتی ہیں۔ مگر میں ایک دلکش بیٹی اور سر پر ایک بنارسی قسم کا دھال۔ ان کے بادلوں کی تراش خراش دیکھ کر مجھے مثل بیگمات کے لباس کا خیال آتا ہے مگر وہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

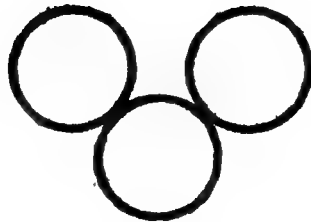
انڈسٹری بہت کم ہے۔ فری کھانوں کے کوٹ بنائے جاتے ہیں۔ وہ بھی زیادہ تر باہر کے ملکوں میں بھیجے جاتے ہیں۔ بلقادیہ والوں نے ایک کارخانہ فر کے کوٹ بنانے کا لگایا ہے۔ مناسب کہ ہر سال جن قدر فر کے

کا ڈھکن تھا اور اس پر کچھ قدیم منگلی زبان میں لکھا ہوا تھا قیمت صرف پانچ سو۔ مجبوراً ایک نئی دکان سے جو سیاحوں کیلئے بنائی گئی ہے اور جس میں مرفٹاکر کا کاروبار ہے چند چیزیں ملتی ہیں۔ مثلاً منگولی لباس، جو یورپین عورتیں بہت شوق سے خرید کر ہاؤس کوٹ یا شام کے لباس کی صورت میں پہنتی ہیں۔ فرکوٹ۔ چمڑے کے بٹوے۔ اونی قالین، (جیسے ہمارے بلوچی بندے) دھات تانبے اور چاندی کے چائے کے پیالے۔ تجھے چاندی کا ایک کٹورہ نما پیالہ پسند آیا جو دہلی کا نقش کٹورہ معلوم ہوتا تھا اس پیالے میں خوش کی تقریبات میں چائے پی جاتی ہے۔ میں نے سوچا عثمان میاں کے لئے ایک پیالہ خرید لوں۔ ان کے سگ کو تفرق کہتے ہیں پیالے کی قیمت سیس ڈالر کے برابر ہے۔۔۔۔۔ جو جھگی سہی لیکن چلنے تقریب کچھ تو ہو وہاں کی جو یاد رہے۔

چند چھوٹی چھوٹی اور مسترق روغن مٹی کی رنگین پیالیاں خریدیں چھٹا دینے کے لئے چار ڈالر کی پیالی چھوٹی سی۔ جب ایاز اور میں اس فقرہ خرچی کے بعد ہوٹل گئے تو سجاد صاحب حسب عادت بہت تادرا خرچہ کر کے مٹی کی بیکار پیالیاں اٹھا لائے ہو۔ اس سے کہیں بہتر ہمارے گہرات میں پیالے ملے تھے کہ جناب درست! لیکن ان کی کیا بات ہے یہ تو تاریخی پیالے ہیں

سے لین دین تھا چنگیز خان اس وقت نو سال کا تھا۔ اور اس کی منگیت برتر دس سال کی تھی۔ چنگیز خان کا نام تیسویں ایک بہادر تاتار کے نام پر رکھا گیا تھا بارہویں صدی کا پروردہ اٹھائے تو معلوم ہوگا کہ چنگیز خان کا ایک ادنیٰ پیالہ صوبہ تائی بہادر نے کو دیا فتح کرنے کے بعد شاہ محمد کو شکست دی بہتر سے جاری کیا پہنچا اور اسے فتح کرتا ہوا بحیرہ کیسین کے کنارے گھوٹے دوڑاتا چند سال بعد روس، پولینڈ، ہنگری، سربیا، بلغاریہ سب کو زیر نگینی کرنے کے بعد دیوانائے کے دروازے پر جادو تنگ دی۔

ماضی سے پھر حال کی طرف اُنا پڑا۔ ترجمان کے ساتھ یہاں کی بڑی بڑی دکانیں دیکھیں۔ دکانوں میں روسی مصنوعات زیادہ تھیں کھانے پینے کی کچھ چیزیں "ہینوٹی" سے بھی تھیں۔ مثلاً پھلوں کے ٹین اور کیوں کے مربے وغیرہ۔ کچھ چین کے اٹلس اور کنو اب بھی موجود تھے لیکن بہت ہلکے تھے۔ سوچا کہ کچھ تو وہاں کی یادگار چیز لی جائے۔ قدیم زمانے کے آرٹ کے نمونے تو خرید نہیں سکتے تھے اگر مل بھی جاتے تو ان کی بلیک مارکیٹ کی قیمت کو ادا کرتا۔ اسی ترجمان نے ایک چھوٹی سی دکان دکھائی۔ ایک بوسیدہ الماری میں ایک قدیم ترین اور نگام چاندی کے کام کی نفرائی۔ سوچا کہ خرید لوں عثمان میاں کو ایسی چیزیں بہت پسند ہیں مگر جب قیمت معلوم کی تو فقط پانچ ہزار تفرق تھی اور ایک قدیم شکستہ سیسٹار کی بوتل جس پر شکستہ ہوا مونگے



غزلے

پیرزادہ عاشق کیرانوی

حیراں ہوں اپنے دیدہ حیراں کو کیا کہوں
 دیکھوں تجھے تو پھر مہتاباں کو کیا کہوں
 نقش و نگارِ بزمِ نگاراں کو کیا کہوں
 پھولوں کا ذکر کیا ہے گلستاں کو کیا کہوں
 امکاں نہ گفتگو کا رہے جب کسی طرح
 اس وقت اس کی جنبشِ مژگاں کو کیا کہوں
 نسبت رہی نہ کوئی جہانِ خراب سے
 سنگِ درِ حبیب کے عرفاں کو کیا کہوں
 مشکل بہت ہے گو ترا ملنا جہان میں
 پھر بھی خیالِ وصل کے امکاں کو کیا کہوں
 اپنا حصارِ ذات ہی کیا کم ہے دوستو
 دیر و حرم کو کیا کہوں، زنداں کو کیا کہوں
 مانوس ہو گئے ہیں غمِ روزگار سے
 آرزو گانِ گردشِ دوراں کو کیا کہوں
 رکھانہ اہرمن نے کسی کام کا مجھے
 لیکن خیالِ رحمتِ یزداں کو کیا کہوں

جب خود کو دیکھتا ہوں تو عاقل ہوں سوچتا
 آوارگانِ کوچہ، جاناں کو کیا کہوں

ایم فیروز شاہ

ہیں ان نظریات کی املیت اور صداقت سے کوئی غرض نہیں۔ تاہم یہ امر واقع ہے کہ ان نظریات کی وجہ سے لوگوں میں زندگی کو نئے زاویوں سے دیکھنے کا شعور پیدا ہوا۔ اس کا ہمارے پڑھے لکھے طبقے پر کافی نمایاں اثر ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور ہیئت اور مواد کے بارے میں ذہنوں میں انتشار (CONFUSION) پیدا ہو گیا۔ سرسید احمد خان، ڈپٹی مندر احمد۔ مولانا الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی کے نفوذی اور شعری کاوشیں اسی دور انتشار کی نمائندگی کرتی ہیں کہ ایک طرف تو ان کی ہمدردیاں ملکہ و کنوریہ کے زمانے اور عہدِ دل کے پیٹرن (PATTERN) سے وابستہ تھیں۔ اور دوسری طرف وہ ہیئت پر مواد کی ترجیح، نظم کے میدان میں نئے تجربات اور نثر میں روشن ضمیر اور روشن دماغ برصغیر کے علمبردار تھے۔ یوں ان کے ہاں نئے عہد کی معنوی ترتیب کا ادراک بے حد مبہم ہے۔ تاہم اس ابہام اور کنفیوژن کو ہم سنگ میل یوں کہہ سکتے ہیں کہ اردو نظم کو پہلی دفعہ ایک مستقل اور واضح بنیاد میسر ہوئی جس نے اردو شاعری کو ایک نئی فضا میں لا کھڑا کیا۔ اور یہ گویا تازہ ہوا کا ایک ایسا جھونکا تھا جو بخند کرے میں مقیم انسان کو اچانک دروازہ کھلنے پر بغل گیر ہو کر نوید جاں فرما

”..... ہر عہد اپنے وقت میں بھر پور طریقے سے زندگی کا احساس دلاتا ہے۔“

ہر دور کے سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی رجحانات اس وقت کی اقدار حیات کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ کسی دور کا ادب اس زمانے کے رجحانات کا عکاس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں نظم جدید یا آزاد نظم کی تحریک با بند نظم کی مستحکم روایات کے خلاف علم بغاوت کے طور پر ابھری۔ کیونکہ وہ دور پابندیوں اور قیود کا تھا۔ اور ہر نوجوان اور حساس ذہن معاشرے کے سیاسی سماجی اور ادبی رجحانات سے بیزار نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ اردو ادب میں بھی بغاوت کا عنصر در آیا اور شاعری کی مروجہ روایات اور قواعد کو چیلنج کر دیا گیا۔

انیسویں صدی کے اواخر تک اردو شاعری کی معنوی ترتیب مسلمہ قواعد و ضوابط کی حدود میں مقید رہی تھی۔ رنگینی، الفاظ اور صوتی دلکشی کو اعلیٰ تخیل اور معنوی حسن پر بالعموم ترجیح دی گئی تھی۔ انیسویں صدی میں دنیا میں ایک فکری انقلاب آیا۔ یعنی مارکس - فرائیڈ - آئن سٹائن - میکس پلانک ایسے مفکرین کے نظریات دنیا کے سامنے آئے۔ اگرچہ یہاں

سناتا ہے۔۔۔۔۔ آگے چل کر انہی بنیادوں پر ترقی پسند تحریک شروع ہوئی۔

ترقی پسند تحریک کا بنیادی نصب العین بھی یہی تھا کہ انسان کے مسائل کا تعلق کسی مافوق الفطرت ہستی سے نہیں بلکہ برصغیر پر مستطاب سامراجی نظام سے ہے۔ انسان کا استحصال کرنے والے تمام ادارے درحقیقت ادب دشمن ہیں۔۔۔۔۔ پس ایک ایسے ادب کی ترویج کی جائے جو براہ راست انسانی مسائل سے متعلق ہو۔

حیرت اور مواد دونوں اس مقصد کے مرہون منت ٹھہرے۔ اور یوں ادب برائے زندگی کا نعرہ لگا یا گیا۔ اس ادب برائے زندگی کے توسط سے پھر ادب نے سماجی رجحانات سے خاصا اثر قبول کیا۔ اور اس عہد کی سیاسی، سماجی اور ادبی اقدار کے خلاف مہنوں میں پکٹنے والا لاوا اظہار کی راہ پا کر بہہ نکلا۔ نوجوان ذہن جو انتشار کا شکار تھے انہوں نے کلمہ کھلا سماجی دوایات سے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ انہیں معاشرہ ایک ایسا قفس محسوس ہو رہا تھا۔ جس میں انہیں حبسِ دوام کی سزا سننا کر بھیج دیا گیا ہو۔ چنانچہ انہوں نے معاشرے سے بغاوت اور فرسودہ قیود کے خلاف آواز بلند کی۔۔۔۔۔ ادب میں اس کا لازمی نتیجہ یوں ظہور پذیر ہوا کہ جدید شعراء نے عزل کی مروجہ روایت اور قافیہ کی بندشوں سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے نظم جدید کو قافیہ رویت کی قید سے چھڑانے کا جواز کچھ یوں پیش کیا کہ۔۔۔۔۔ شاعری دراصل پروانہ تختیل اور رعنائی خیال کا نام ہے۔ جذبے کو اس کی پوری شدت کے ساتھ منظرِ عام پر لانا تخلیقِ شعر کا عمل کہلاتا ہے۔ لیکن پابندِ نظم میں قافیہ رویت کی پابندی کی وجہ سے خیال مجروح ہو جاتا ہے اور شاعر خیال کی بجائے قافیہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

چنانچہ آزاد نظم کے نام سے ایک نئی منفِ شعر معرض وجود میں آئی۔ جسے نظم جدید بھی کہا گیا اور ڈاکٹر ابوالعین صدیقی کی زبان میں نظم غیر متعلق بھی۔۔۔۔۔ آزاد نظم میں قافیہ رویت کی

پابندیوں سے آزادی کے باد صفا اوزان کا خیال رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس کا ایک مخصوص صوتی آہنگ نمایاں طور پر برقرار رہا۔

تشریح شروع میں آزاد نظم کی شدید مخالفت کی گئی۔ ایک اعتراض یہ بھی ہوا کہ یہ محض چند باطنی لوجوانوں کے فکری انتشار کا نتیجہ ہے اور بس۔۔۔۔۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہر عہد کا ادب اپنے دور کے سماجی رجحانات کی عکاسی کرتا اور ان سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔ ادیب یا شاعر اپنے زمانے سے کٹ کر نہیں جی سکتا۔۔۔۔۔ چنانچہ یہ تحریک بھی اپنے وقت کے رجحانات کا حاصل تھی۔۔۔۔۔

آزاد نظم کے بانیوں میں تین نام بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ ن۔م۔راشد، میراجی اور تصدق حسین خالد۔ ان میں سے خالد نے اگرچہ کسی خاص تخلیقی ایج کا مظاہرہ نہیں کیا تاہم ان کی بعض نظمیں خاصی اچھی ہیں۔ لیکن راشد اور میراجی کی نظمیں اس عہد کے ان باطنی رجحانات کی مکمل نمائندگی کرتی ہیں جو نوجوان اور حساس ذہنوں میں لاوے کی طرح کھول رہے تھے۔ ن۔م۔راشد اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں۔

درختوں کی شاخوں کو اتنی خبر ہے

کہ ان کی جڑوں کو کھلی ہو چکی ہیں

مگر ان میں ہر شاخ بزدل ہے

یا مبتلا خود فریبی میں شاید

کہ ان کرم خوردہ جڑوں سے

وہ اپنے لئے تازہ نم ڈھونڈتی ہیں

میراجی کی ایک نظم ”شام کے راستے پر“ میں واضح طور پر سماج

کے خلاف نفرت کے جذبات ملتے ہیں۔

اور دل کہتا ہے یہ درو دل سوختہ ہے

ایک گھنگھور سکون۔۔۔۔۔ ایک کڑی تنہائی

میرا اندوختہ ہے

مجھ کو کچھ فکر نہیں آج یہ دنیا مٹ جائے
مجھ کو کچھ فکر نہیں آج یہ بے سار سماج
اپنی پابندی سے دم گھٹ کے فسانہ بن جائے
میں ہوں آزاد — مجھے فکر نہیں ہے کوئی
ایک گھنگور سکون — ایک کڑی تنہائی
میرا اندر دھت ہے

آزاد نظم روایات کے خلاف بغاوت کا وہ تند و تیز ریلو تھا۔
جو اپنے راستے میں آنے والے ہر بند کو ریت کی مانند بہا لے گیا اور
آج جبکہ اردو ادب کے تمام اہل رائے، اہل قلم آزاد نظم کو بطور
ایک منفی شعر کے تسلیم کر چکے ہیں، ایک نئی تحریک آہستہ آہستہ
ابھر رہی ہے — جسے اس کے حامی ”نثری نظم“ کا نام دیتے
ہیں اور جس کے بارے میں ملتانز شاعر انور مسعود کا کہنا ہے۔

اس کی حالت کرتی تھی کچھ ایسی ہی غم آزی
اس کے لئے یہ تازہ صدمہ آفت جاں ہے گویا!
اس سے پہلے کبھی نہ اس نے اتنے اشک بہائے
نثری نظم کا سن کر یادو بہت کبیرا رویا!

در اصل اردو ادب میں یہ تحریک انگریزی ادب کی پروڈیوم
(PROSE POEM) سے متاثر ہو کر شروع کی گئی ہے۔ لیکن اس کی
سب سے بڑی حامی یہ ہے کہ اس میں شعریت ہونے کے باوصف
شعری آہنگ موجود نہیں ہوتا جو ”نظم“ کا لازمی اور شناختی
غصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معروف شاعر ریاض مجید نے اس صنف
کے لئے ”نظم“ کا نام تجویز کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اگر ایسی تحریروں کو نظمیں کہہ لیا جائے تو کیسا
رہے؟ اس لفظ میں ہیئت کا ۲/۳ نثری پن اور
تخلیقی مواد کا ۱/۳ شعری پن (نثر سے نث اور
نظم سے م) موجود ہے۔ یوں یہ تعریف اسم یا
مشقی بھی ہوگی اور خالصتاً نثر و نظم ہی نہ ہوگی۔

لیکن اس صنف ادب کے حامی اسے نظم ہی کہوانے پر مصر ہیں
اور اس سلسلے میں عجیب عجیب توجیہات پیش کر رہے ہیں۔ مثلاً اس
تحریک کے ایک نمایاں پرچارک مبارک احمد کا کہنا ہے۔
”میرے نزدیک فن کی دنیا میں آئندہ کے لئے قواعد
اور پیمانے وضع کرنے والے حقیقتاً مجرم اور فساد
تھے۔“ (فن کی نئی توجیہ۔ مطبوعہ نولٹے وقت)

”نثری نظم“ کے ایک اور موید انیس ناگی کا کہنا ہے۔
”شاعر کا جذبہ باقی مجاہد، انفرادیت اور اتنا کہ
باوجود زندگی کی قبولیت کے حوصلے سے پیدا ہوتا
ہے اور اس تجربے کی ترسیل کے لئے ایسج
(IMAGE) یا خیال بنیادی چیز ہے۔ اس کا
متنوع استعمال آج کا موثر ترین ذریعہ ہے۔“

نثری شاعری کے باوا آدم افتخار حالب کی مرتبہ کتاب
”نئی شاعری“ میں اس قسم کی بہت سی باتیں کہی گئی ہیں جن میں کئی
”شعرا“ نے اعلان کیا ہے کہ۔

”ہمارا جذبہ بخود ہی انتہائی گہرا اور وسیع ہے جن
کے متحمل پرانے اوزان نہیں ہو سکتے۔“

ایک اور ”نثری شاعر“ فہیم جوتی کہتے ہیں۔

”مروجہ شعری اسلوب آج کے جذبہ باقی بھرانوں اور
معاشرتی سطح پر جنم لیتی ہوئی مستعار حقیقتوں کے
اتصال سے طلوع ہوتے ہوئے رابطلوں کا احاطہ
نہیں کر سکتا۔ زندگی اب کسی تزلزل کی نغمگی کی
متحمل نہیں ہو سکتی۔ اوزان اور بحور فرد کے احداث
کے تنوع کا ساتھ نہیں دے سکتے کہ LYRICISM
کا دور اب لگ گیا۔“

سعادت سعید بھی نثری نظم کی حمایت میں یوں دلیل دیتے

ہیں۔

ہے۔ جو علم کی صدقہ کے وسیع اور ذہنی افق کے کشادہ ہونے کے باعث موجودہ صدی میں نمودار ہو رہا ہے۔

معروف شاعر حضرت احسان دانش اس صنفِ ادب کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

”اسے جدید نثر یا نثرِ جدید کہہ لیجئے۔ کیونکہ میرے نزدیک وہ شاعری ہی کیا ہوئی۔۔۔۔۔ جس کے لئے کہا جائے سا تو اس شعرِ سادہ تو شعرِ سنانے کے اور اگر تجربہ کرنا ہے تو اسے نظم کا نام ہی کیوں دیا جائے؟“

ذوالفقار احمد تابش کہتے ہیں۔

”نثری نظم کے نام سے آج کل جو پیش کیا جا رہا ہے اسے نثری صنف کے طور پر قبول کرنے کو ہمت نہ نہیں۔ اگر آج ”نثری نظم“ کہی جاسکتی ہے تو پھر ”نثری غزل“ کیوں نہیں؟ نثری قصیدہ کیوں نہیں؟“

”نثری نظم“ کی حمایت میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ شاعری کا مقصد عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنا ہے تاکہ معاشی تبدیلیوں کے لئے ان کے ذہنوں کو تبدیل کیا جاسکے اور چونکہ پابند اور آزاد نظم کی قیودِ ابلاغ کے راستے کا پتہ نہیں بلکہ نثری نظم لکھی جانی چاہیئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اوراق کے سلسلہ میں بڑی خوبصورت بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں۔

”ہماری رائے میں اگر واحد مقصد عوامی رابطے کی مہم کو کامیابی سے ہمکنار کرنا ہے تو پھر اس کے لئے نظم قطعاً کارآمد نہیں بلکہ نثرِ لطیف بھی بے کار ہے۔ کیونکہ اظہار کے یہ سارے سانچے اپنے بالواسطہ انداز اور نیکی پیکروں کے حوالے سے بات کرنے کے رویے کے ابلاغِ عام کے ان

اصل مسئلہ شعری ہیئت کا نہیں، مواد کا ہے۔ ہر عہد مخصوص موضوعات کا عہد ہے۔ اور ہر موضوع اپنے جلو میں اپنی ہیئت لاتا ہے۔ نثری نظم ہمارے عہد کے عظیم اور تازہ موضوعات کا مکمل اظہار کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل کے نوجوانوں نے اس صنف کو اپنے لئے منتخب کیا ہے۔“

ان صاحبانِ فکر کی آرا کی روشنی میں اس امر کا اندازہ لگانا محال نہیں کہ نثری نظم اوزان کی حدود سے مکمل ترین آزادی کا نام ہے اور اس کے حامی محض خیال کی بلند پروازی کو ہی شاعری کی اولین و آخرین صفت گردانتے ہیں۔ ان کی اس منطق پر پیشمار اعتراضات کئے گئے ہیں اور تاریخِ ادب کے حوالے سے ”نثری نظم“ کو ”انشائے لطیف“ کہا گیا ہے۔ معروف ادیب اور ممتاز شاعر جناب احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا اور مہربا لکھنوی کے بقول ”نثری نظم“ چند مستثنیات کو چھوڑ کر بطور ایک علیحدہ صنفِ ادب کے ابھی تک اپنا وجود تسلیم نہیں کر سکی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے ”نثرِ لطیف“ کا نام دیا ہے اور اردو ادب کی تاریخ سے حکیم یوسف حسن اور ڈاکٹر تاثیر وغیرہ کی تحریروں کا انتخاب دیکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ نثرِ لطیف پہلے بھی لکھی جا رہی تھی۔ اس وقت لے فقط انشائے لطیف ہی کہا گیا۔ ورنہ اپنی ہیئت اور مواد کے لحاظ سے وہ بالکل وہی چیز ہے جسے آج کل ”نثری نظم“ کہا جا رہا ہے۔ پس اسے اس کی اصل ہیئت یعنی نثر کی طرح لکھا جانا چاہیئے۔ تاکہ اس صنفِ ادب کا دوسری اصناف میں گڑبڑ ہونے کا خدشہ تشنہ تکمیل ہی رہے۔ کیونکہ دراصل یہ صنفِ ادب وہی چیز ہے۔ جو آج سے پہلے نثری صنف میں شمار کی جاتی رہی۔۔۔۔۔ اگرچہ پہلے بھی لکھی جاتی رہی لیکن یہ دور اس کی پذیرائی کا دور ہے اور اس کی وجہ ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں یہ ہے کہ۔

”نثرِ لطیف اس نئے منطق کی سیاحت کے لئے نہایت موزوں

غزل

ارشاد ارشد

مدارج تک کہاں پہنچ سکتے ہیں جن تک صرف
کاروباری زبان کو رسائی حاصل ہے۔ مثلاً کسی
جلسے کا ایک شعلہ بیان مقرر اپنی نثر سے جو کام
لیتا ہے وہ نظم یا نثر لطیف دونوں کے بس کا
روگ نہیں۔۔۔ کیونکہ ادب قاری کو ”دواور
دوچار“ قسم کے ابلاغ سے نہیں بلکہ اپنی پُر اسرار
خوشبو، لطیف آمیزگ اور نئی سرزمینوں کی سیاحت
کے عمل سے متاثر کرتا ہے اور یوں قاری کے
سارے جذباتی نظام کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔“
آخر میں معروف شاعر اور ادیب سید ضمیر جعفری کی توضیح
زیر بحث پر راجحی اغلباً حرف آخر کے طور پر پیش کرتا
چاہوں گا۔ آپ کا کہنا ہے،

”فی زمانہ نثری نظم کا کھڑاگ بڑے لمطراق سے
پیش کیا جا رہا ہے۔ دل چاہے مانے نہ مانے۔
دماغ چاہے نہ قبول کرے مگر نثری نظم کا شاعر
سامعین کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گیا ہے کہ
میں بھی شاعر ہوں تمہارا مجھے تسلیم کرو
مجھ کو ہر بات گوارا مجھے تسلیم کرو“

بہر حال اپنا اپنا نظریہ ہے۔۔۔۔۔ اپنی اپنی
سوچ ہے۔۔۔۔۔ تاہم اس امر سے انکار کسی ادیب/نظم کو
ہوگا کہ نثری نظم یا نثر لطیف بہر طور ایک صنف ادب ہے۔
بلکہ ہر اہل ذوق ایسی تخلیقات کے لئے دامن دل کشا اور چشم
شوق داسکے گا۔۔۔۔۔ تاہم بحیثیت ایک صنف کے
اس کے مقام کا تعین خود طلب مسئلہ ہے۔ جس پر تمام اہل فکر
اصحاب کو صحت مند جذبے کے تحت مل کر سوچنا چاہیے اور
یہ بھی ہوگا جب انتہا پسندی کا راستہ ترک کر کے، اوجہ استدلال
اختیار کی جائے گی۔

ایک ہی شخص بدلتا رہا پسیر کتے
مری آنکھوں نے دکھائے مجھے منظر کتے

بیج تم آج کدورت کے جو بوجھاؤ گے
کل کو ہو جائیں گے یہ پیڑ تناور کتے

مرے ہونٹوں پر ہمیشہ یہ بادل چپ ہے
زلزلے آئے مگر روح کے اندر کتے

جس کا چہرہ تھا ہکتے ہوئے پھولوں جیسا
اُس نے ہاتھوں میں چھپا رکھے تھے پتھر کتے

اپنی رائے کا ہی اظہار کیا تھا میں نے
استیوں سے نکل آتے ہیں غجر کتے

گھیر لیتی ہیں مجھے یوں قری خوش کن یادیں
جیسے بیٹھے ہوں منڈیروں پہ کبوتر کتے

ایک بھی وار نہ آندھی کا یہ سہم پائیں گے
پیڑیوں تو نظر آتے ہیں تناور کتے

اس کے تو خواب ہیں پتھر کے زلزلے جیسے
اُنے انسان کی ہدایت کو پیہر کتے

سوکھے پتے کی طرح اب ہیں ہوا کی زدیں
ہم ہوا کتے تھے ارشد کبھی خود سر کتے

غزلے

ڈاکٹر سید حسین جعفر حسین

آج کچھ درد بھرے نالے زباں تک پہنچے
دیکھئے اس کا اثر کتنا وہاں تک پہنچے

جبکہ عقل و خرد و ہوش کے پر جلتے ہوں
فہم و ادراک ہے کیا شے جو وہاں تک پہنچے

میکدے چھان لئے دیر و صرم دیکھ لئے
جستجو میں تری ہم دیکھ کہاں تک پہنچے

بزم میں آج نہ محسوس ہمیں رکھ ساقی
دردِ ساغر ہی سہی تشنہ دہاں تک پہنچے

اپنی محرومی قسمت کا گلہ کس سے کروں
بے اثر جبکہ ہر اک بات وہاں تک پہنچے

دامنِ ضبط و تحمل کہیں چھوٹے نہ حسین
نیشِ بے مہری قاتلِ رگِ جاں تک پہنچے

افسانہ

منٹو کا افسانہ۔ ایک تجزیہ

از آغا سلمان باقر

جاتا ہے۔

افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے مختلف موضوع اور ہئیت رکھتا ہے اور وہ اس لحاظ سے منفرد اکائی اور امتیازی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اور اس میں واضح طور پر صریح ایک چیز کی ترجمانی، وضاحت، مصوری ہوتی ہے ایک کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، غرض افسانے میں جو کچھ پایا جائے وہ ایک مرکز رکھتا ہے، عام طور پر افسانہ نگار افسانے کی بنیادی ضروریات اور خصوصیات سے غفلت بہت کر افسانے تحریر کر دیتے ہیں اور پھر وہ افسانے قاری کے ذہن پر گہرا اثر نہیں چھوڑتے، افسانے کی حقیقی خصوصیات کو اردو کے افسانہ نویس پریم چند نے مد نظر رکھا ہے۔ منٹو کا افسانوی مطالعہ، ایک ہمہ گیر مشاہدہ ہے اور منٹو ماحول کے انتہائی نازک اور باریک پہلو کو افسانے کا پس منظر اور نقطہ عروج بناتے ہیں اور اس کے واقعات کے کردار اس پس منظر میں اس طرح جذب ہوتے ہیں۔ جیسے وہ لازم و ملزوم ہیں۔ منٹو کے افسانے میں یہ سادہ علم عموماً ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لئے کام میں لایا جاتا ہے۔ اس طرح کے افسانوں میں نیا قانون خوشیاں نوا اور نیا سال پڑھنے کے بعد افسانہ نگار (منٹو) کے تخیل، فکر اور تجویز حیات کا عکس آنکھوں میں گھوم جاتا ہے اور پھر یہی عکس یا تصور قاری کے ذہن پر کردار کا تصویر ذہنی کیفیت

منٹو کا افسانہ کلرک، مزدور، طوائف، کشمیر، بٹی، جلی، لاہور، نظم اسٹوڈیو، کالج، بازار، ہوش، منچے، جوان، بوڑھے، عورتوں، مردوں کی ذہنی اور جنسی الجھنوں کی واضح نشاندہی کرتا ہے اور اس سلسلے میں یہ ایک علامت بھی جاتا ہے، وہی علامت جو معاشرے کا تصور ہے۔ منٹو کے افسانے کا فن مختلف عورتوں کے اظہار پر ایک نئی لطافت اور گواہی کے ساتھ اجاگر ہوتا ہے۔ بعض کرداروں کا ذکر وہ جس اولئے خاص سے کرتے ہیں، وہ ادھر موقع پر نمایاں نہیں ہوتی اور بعض باتیں کہنے اور بعض رد و رد اشکار کرتے ہیں منٹو کو ظاہر اور باطن کا احساس ہے۔

منٹو کے فن کی سرخ "احساس" کا ادراک ہے، ان احساسات کو پھیلانے کے لئے وہ تخیل، فکر اور ذہنی کاوش کو بروئے کار لاتے ہیں اور جس حد تک وہ اپنے فن سے رشتہ جوڑتے ہیں اور ذہنی کاوشوں کی بدولت اظہار و ابلاغ کے لیے اچھے سے اچھے اور نئے سے نئے وسیلے ان کے ہاتھ آتے ہیں۔ یہی وہ منزل ہے جہاں معنیت کا تخیل اور فکر، جو حقیقت میں اس کی شخصیت کے مختلف اجزاء اور عناصر ہیں، ابلاغ کے وسائل میں بہت نئے رنگ بھرتے ہیں یہی انداز منٹو کے افسانے کا اسلوب ہے اور یہی شخصیت اور عمل دخل کے ساتھ تحریر کے اتنی پہلوؤں کا نیکہا پن اور اس رنگ کی شوقی ہمیشہ قائم رہتی ہے انہیں باتوں سے فنکار کے فن ارتقا کا سراغ مل

جیت اس میں پائی ہے۔ تمہید کی دلکشی اور افادہ اور خیال کی کشش قاری کو افسانہ پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ منٹو کے افسانے کی تمہید ایک مکمل افسانہ ہے اور یہ تمہید قاری کے ذہن کو سمجھوڑ کر رکھ دیتی ہے، اُسے حیرت زدہ کر دیتی ہے، اور ذہنی سطح پر محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ اپنے اندر کچھ لے کر آئے ہیں۔ افسانہ پہچان کی تمہید ملاحظہ ہو۔

— ایک نہایت ہی تھوڑا کلاس ہوٹل میں دیسی دہسکی کی بوتل ختم کرنے کے بعد طے ہوا کہ باہر گھومنا جائے اور ایک ایسی عورت تلاش کی جائے جو ہوٹل اور دہسکی کے پیدا کردہ محککہ کو دور کر سکے؟

— ”پہچان —“

مذکورہ تمہید میں مذکور کسی کردار کا تعارف ہے۔ اور نہ کسی فضا اور ماحول کا ذکر ہے۔ مذکورہ خبر ہے اور نہ ہی چونکا دینے والا انکشاف ہے۔ یہ افسانہ کا اشارہ جو تمہید کی صحت میں پیش کیا گیا ہے۔ قاری کو مستقبل کا احساں دلاتا ہے اور معصوم قاری فوراً افسانے کے اس جال میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ ایک دوسرے افسانے میں تمہید کا انداز ملاحظہ ہو۔

— ”دن بھر کی تھکن مانی وہ ابھی ابھی بستر پر لیٹی تھی اور لیٹے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کینٹی کا داروغہ صفائی، جیسے وہ سینٹھ کے نام سے پکارتی تھی، ابھی ابھی ہڈیاں پسلیاں سمجھوڑ کر، شراب کے نشے میں چور، گھر کو واپس گیا تھا۔ وہ رات کو یہیں ٹھہر جاتا، مگر اُس کو اپنی دھرم پتی کا بہت خیال تھا جو اُس سے بے حد پریم کرتی تھی۔“

منٹو نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنے منصب کو پوری طرح پہچان لیا ہے۔ اور اپنے ترکش کے ہر تیر کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگایا ہے۔ انہی تیر میں سے ایک تیر اُس کے افسانے کی تمہید ہوتی ہے، جو ہر افسانے میں نیا کام کرتی ہے۔ مگر داد کو متعارف کرنے کا، ایک خاص فضا یا ماحول کا، ایک پھر کتنی ہوئی خبر سنانے کا، کسی کردار کی ذہنی کشمکش کی مصوری کر کے لکھنے والے واقعات کے لئے زمین ہموار کرنے کا اور کبھی کبھی ایک

کا نقش بٹھاتا ہے۔ منٹو کے افسانے پڑھتے ہوئے ایک نئے ماحول اور ایک نئی فضا کی ان گنت دیکھی اور نام دیکھی تصویروں کا ادراک ہوتا ہے لیکن افسانہ ختم کر لینے کے بعد یہ نقوش بھی رخصت ہو جاتے ہیں لیکن پڑھنے والے کے ذہن پر ایک تاثر چھوٹتا ہے جس سے قاری کو معاشرے کے حقائق کو سمجھنے میں زیادہ آسانی محسوس ہوتی ہے۔ ان افسانوں کے کردار افسانہ نگار نے انسانی کے باوجود ایک جذباتی کیفیت کا اظہار ہیں اور پھر جو کردار آتا ہے وہ ایک مخصوص مزاج اور منفرد خصوصیات کا عکس ہوتا ہے۔ لیکن افسانے کے اختتام کے بعد صرف ایک تنہا متاثرہ واقعہ ذہن کے پردوں کو سمجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ منٹو کے افسانے کی یہ نمایاں خصوصیات ہیں جو ان کے فن کی سراج ہیں۔

منٹو کے افسانے کا فن مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان منزلوں میں بعض ترقی کی ہیں اور بعض منزل کی، لیکن منٹو نے ہر منزل پر اپنے منصب کو یاد رکھا ہے وہ بات کو ایک مکمل افسانے میں قاری کے ذہن تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس میں وہ کامیاب و کامران لڑتے ہیں افسانہ نگاری کے اس بنیادی اصول نے یہ بات بھی سکھائی ہے کہ کہانی ختم ہونے کے بعد ذہن پر ایک واحد تاثر قائم ہونا چاہیے۔ لیکن اس واحد تاثر کو قائم رکھنے کے لئے مختلف فن اور تکنیکی وسیلوں کی شدت سے ضرورت ہے اور یہ وسیلے اگر پوری ذمہ داری اور پورے فن احساس اور خلوص کے ساتھ کا ہیں نہ لائے جائیں تو فن کے تاثر کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے اور اس طرح افسانے کی وحدت میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

اس فن بحث میں افسانے کی تمہید کا ذکر بھی آتا ہے افسانے کی تمہید افسانہ نگار کی بڑی اہم اور دشوار منزل ہے۔ افسانہ نگار اگر افسانے کی ابتدا میں اپنے قدم گاڑ کر لکھے اور تاثر کے عمل کو تیز تر اور شدید کر دے تو افسانہ کا باقی افسانہ، اس تمہید کے باعث فن کی مندرجہ لیں خیالات سے قدم سے قدم ملا کر طے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمدہ افسانہ نگار اپنے افسانے کی تمہید سے غفلت نہیں برتتے۔ تمہید کے باعث افسانے سے زیادہ افسانہ سمٹ کر چند فقرہ میں سمویا جاتا ہے اور سعادت حسن منٹو نے اپنی

”مجھے زندہ رہنا ہوگا۔“

۳ اس کے اسی دھبے پہلے میں عزم کے اٹھاتے اس کی تسکین
ہوئی جوانی کو اذیت دیتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر میں اپنے غیث
پر چلا گیا اور سو گیا۔

(شہ نشین)

ایک دوسرے افسانے کا انجام ملاحظہ ہو:-

”پہلے پہل تو میں بہت متحیر ہوا کہ یہ کس کی حرکت ہے مگر فوراً
ہی سب معاملہ صاف ہو گیا۔ سیوا جی، میری غیر حاضری
میں اپنی ہمسایہ سلطنت پر تہایت کامیابی سے چھاپا مار
گئے تھے۔“

(میرا اور اُس کا انتقام)

اُن کے ہر افسانے کا انجام ایک نفسیاتی اور جذباتی کشش کا اسیر ہے
منو نے جذبات، نفسیات اور فن سے رشتہ جوڑنے اور انہیں مضبوط بنانے
میں ہمیشہ اپنی کہانیوں کے انجام سے کوئی نہ کوئی کام لیا ہے۔

منو کو فن کے ان مراحل کا پورا احساس ہے اسی لئے اُن کا ہر افسانہ
آغاز سے انجام تک بعض واضح مراحل طے کرتا ہے اور اس طرح ہر انجام میں
ایک منطقی جواز پیدا کرتا ہے اور مربوط و مبسوط اعجاز میں قاری کے سامنے
کہانی پیش کرتا ہے اس منطقی کا احساس قاری کو نہیں ہوتا لیکن وہ اس کے تاثر
سے متاثر اور مسرور فرود ہوتا ہے۔ منو کا افسانہ شروع ہونے کے بعد
نہایت دھیمی اور پرکشش چال چلتا ہے اُس کے قدم، نرم اور توانا ہوتے
ہیں جس طرح وہ آگے بڑھتا ہے اُسی طرح وہ دل و دماغ پر قیغہ مستحکم کرتا
چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی دھیمی اور پختگی چال افسانے کے انجام پر
آجاتی ہے اور افسانہ شروع سے آخر تک اس کا ساتھ انتہائی آرام سے
دیتا ہے اور قاری اس باعث انتقام پر ایک طرح کا سکون محسوس کرتا ہے
اور ایک بے نام سی سوچ یا احساس، اس کے ذہن میں جم لیتی ہے یہ سوچ
یا احساس افسانہ نگار سادہ حسیں منو کے افسانے کی فنی، تہیہ کی اور اختتامی
کامیابی کی دلیل اور وضاحت ہے۔

کئی طے جملہ مطلب پورے کرنے کا، لیکن ان گونا گوں کاموں کے علاوہ جو کام
منو کے افسانے کی تہیہ کرنے اپنے ذمہ لے لیا ہے یہ ہے کہ قاری کے
ذہن کو بیدار کر کے، اُس کے دل میں گدگدی پیدا کر کے یا اس کے ذہن
میں آگے بڑھنے کی خواہش پیدا کر کے افسانہ پڑھ لینے پر آمادہ کر دے۔
منو کی فنی کامیابی کی یہ بڑی اہم منزل ہے اور یہ منزل طے کرنے کے لئے اس
نے پورے سوچ بچار سے قدم اٹھایا ہے۔

تہیہ افسانے کا آغاز ہے اور افسانے کی آخری منزل یا انجام بھی
تہیہ کی اس نوعیت کے تحت افسانہ نگار تہیہ سے قاری کے ذہن اور دل پر قیغہ کرنا
ہے اور افسانے سے دلچسپی لینے پر مجبور اور مائل کرتا ہے۔ افسانے کے
کمنے والے حصے سفر کی کٹھن منزلیں ہیں اور اس حصے سے سفر (قاری)
کو منزل تک پہنچانے کے لئے ایک گائیڈ یا رہبر ہوتا ہے جس کا نام ہے
افسانہ نگار۔ یہی افسانہ نگار ہر افسانے میں مختلف کرداروں میں ظاہر ہوتا ہے۔
پھر افسانہ نگار کو ایسے انجام کی جستجو کرنی پڑتی ہے، جو فنی حیثیت سے طے کی
ہوئی منزلوں کا منطقی نتیجہ بھی ہو اور قابل قبول بھی افسانے کے خاتمے پر
افسانہ نگار کی ذرا سی سستی، ذرا سی تن آسانی، ذرا سی غفلت یا تھوڑی
سی سہل نگاری افسانے کا خون کر دیتی ہے۔ افسانہ، واقعات کی ایک مربوط
زیجیر ہوتا ہے، جس کا پہلا سرا، آخری سرے سے اور ہر سرا ایک دوسرے
سے پیوست ہوتا ہے۔ اگر یہ پیوستگی قریب سے نہ ہو تو افسانے کے
تشیب و فراز، کوفت اور غفلت کا باعث بھی بن سکتے ہیں منو نے اپنے
افسانوں کی فنی انجام کی ان نزاکتوں، کو پوری طرح محسوس کرنے کے بعد
”انجام“ سے قاری کے ذہن کو متاثر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کسی بھی
افسانہ نگار کے فن کی پیشگی کا اندازہ کرنے کے لئے آغاز یا تہیہ کے بعد اُن کا
کی منزل کو دیکھ لینے سے افسانے کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ منو
اس میں کہاں تک کامیاب و کامران ہوئے ہیں اس کا فیصلہ بھی ایک افسانہ
کا انجام ہی کر سکتا ہے۔

”وہ دیر تک سوچتی رہی۔ وہ اب زیادہ تہیہ پر مبنی تھی۔“

تھوڑی دیر کے بعد اُس نے بڑے دھبے پہلے میں کہا۔

دہکتی لہریں

اکبر کا قلی

میں وہ تمام باتیں ایک پل کے اندر گھوم گئیں۔

اُس نے ذرا دل کڑا کر کے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنی طبیعت پر پوری طرح قابو پاتے ہوئے طویل گل کی طرف بڑھا اُس نے مسکرا کر کہا۔
”کہو طویل گل کیسے آئے؟ اور طویل گل نے بڑی تمکنت کے ساتھ اپنے تیشے کو فضا میں لہراتے ہوئے کہا شیردل تمہارے دن بڑے آگے ہیں میں نے بہت چاہا کہ تم حرام کی موت نہ مرو لیکن تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے اور مجبوراً مجھے یہ قدم اٹھانا پڑ رہا ہے تیار ہو جاؤ اب مرنے کے لئے“

شیردل کے ذہن میں وہ تمام باتیں گھومتی گئیں جو اُس کو کبھی کبھی اس کا چچا جبرو ستایا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا شیردل تم ابھی بچے ہی تھے کہ تمہارے والد نے طویل گل کے بڑے دادا کو قتل کر دیا تھا اور پھر وہ گاؤں سے بھاگ کر انگریز کی فوج میں بھرتی ہو گیا تھا لیکن اللہ کا کرنا کچھ ایسا ہی تھا کہ تمہارا والد چار سال فوج میں رہنے کے بعد جنگ میں انگریزوں کی طرف سے لڑنا لڑتا مارا گیا طویل گل کے والد نے کئی مرتبہ مجھ پر حملہ کیا لیکن یہ میری قسمت تھی کہ میں ہر بار اُس کے حملے سے بچ نکلا اور پھر جب مجھے تمہارا خیال آتا تو میرا کلیجہ منہ کو آجا تا کہ میرے بھائی کی تم نشان ہو اور پھر تمہاری جان کی خاطر میں نے جہر گر میں درخاست دے کر جہر گر کے سامنے طویل گل کے باپ سے معافی مانگ لی اس کی

شیردل پہاڑ کے دامن میں بیٹھ ہوئے دریا کے کنارے بیٹھا تھا اور ہاتھ میں بکریاں ہانکنے والی چھڑی پکڑے پانی کی لہروں سے کھیل رہا تھا وہ حد سے زیادہ معنوم تھا اُسے وہ کہ لالی کا خیال سارہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ لالی کبھی اتنی دیر نہیں لگاتی تھی وہ ہر روز دوپہر ہوتے ہی یہاں پہنچ جایا کرتی تھی اب نہ جانے کیا بات ہے کہ دن ڈھلنے کو آیا لیکن وہ اب تک نہیں آئی اس نے ایک لمبا اور گہرا سانس لیا اور ترس ہو گیا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں لالی کا بھائی ہاتھ میں تیشے لے کھڑا اُس کو قہراً لودنگا ہوں سے دیکھ رہا تھا۔

شیردل نے سوچا کہ اس کو یہاں سے فوراً بھاگ جانا چاہئے لیکن پھر اُسے فوراً اپنا وہ عہد یاد آ گیا جو اُس نے اسی دریا کے کنارے اور اسی مقام پر لالی سے کیا تھا جب لالی نے تم لودنگا ہوں سے بڑے پیار بھرے انداز میں شیردل سے کہا تھا شیردل میرا بھائی طویل گل بڑا ظالم ہے اور پھر تمہارے خاندان سے ہمارے خاندان کی پرانی دشمنی بھی تو چلی آ رہی ہے اگر خدا نخواستہ طویل گل کو ہماری محبت کی خبر ہوگئی تو پھر تم مجھے اور شیردل نے لالی کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا لالی میں خاندانی آدمی ہوں جب تک میرے دم میں دم ہے میں تم کو نہیں بھولوں گا میں تم کو نہیں بھول سکتا۔ میں تم سے کبھی بے وفائی نہیں کروں گا۔ اس کے ذہن

لکھا کر اپنی حویلی میں آیا تو وہاں اُس کا باپ اور چچا دوسرے گاؤں سے آئے ہوئے جہانوں کے ساتھ معروف گفتگو تھے اس نے چپکے سے قیصر اٹھایا اور دریائے جانب چل دیا لیکن نہ جانے نواب خان کو اکیس کیا سوچیں کہ اُس نے زمان سے کہا کہ تم جلد جاؤ اور طوطی گل کو واپس بلا لاؤ اور زمان تیزی سے طوطی گل کے پیچھے ہو گیا۔

اگر وہ چند منٹ بھی دیر کر دیتا تو معاملہ بگڑ چکا تھا طوطی گل نے جو نہیں شیر دل پر پیشہ اٹھایا ہیچے سے کسی نے اس کے کندھے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ کر اس کو اپنی طرف کھینچ لیا اس نے مرکز دیکھا کہ اس کا چچا زمان تھا پال گل ہو گئے ہو کیا؟ حویلی میں چلو وہاں ساتھ والے گاؤں سے جیل خاں صاحب آئے ہوئے ہیں جن کے لڑکے جبرو کی پورے علاقے میں دھوم مچا رہے ہیں کہ وہ پڑھ لکھ کر نہ صرف بڑا بابو بن گیا ہے بلکہ اب وہ بیج بھی بن گیا ہے وہ اس خوشی میں سارے گاؤں کو دعوت ہی دیتے نہیں آئے بلکہ انہوں نے سب خاندانوں کو حویلی میں اکٹھا کر رکھا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم سارے گاؤں کو بھائیوں کی طرح رہنا بھی سکھانا چاہتے ہیں ہم سب کے پرلے اختلاف بھی ختم کرائیں گے اور آج تمام خاندانوں کی آپس میں صلہ کر اگر ہی واپس جائیں گے کہ انسانی برادری بھڑی کی طرح زندگی گزارے حویلی میں سب لوگ اکٹھے ہو چکے ہیں بس اب تمہارا اور شیر دل کا اختلاف ہے میں تم دونوں کو لینے کے لئے آیا ہوں جلدی چلو جب وہ تینوں حویلی میں پہنچے تو اُس وقت ایک عجیب منظر تھا کہ سب لوگ آپس میں گلے مل رہے تھے اور بیج صاحب کے چچا مراد خان کہہ رہے تھے کہ میرا بیٹا کہتا ہے میں علم کی روشنی اپنے تمام بھائیوں کے گھر وندوں میں پہنچا کر ہی دم لوں گا۔ اب شام ہو رہی تھی اور حویلی کے چراغوں کی روشنی دور دور تک سامنے پھول پر نویں بکیر رہی تھی پچ

انہیں یہ باتیں کرتے کرتے ہم اور ہوجاتیں اور وہ کہا کرتا شیر دل تم میرے بھائی کی نشانی ہو دیکھو تم ان سے زیادہ نہ ملا کر تمہارا ان سے زیادہ ملنا اچھا نہیں یہ ایک نہ ایک دن خرابی کا باعث ہو گا لیکن شیر دل اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا وہ کیا کرتا کہ وہ تو لال کو دل سے بیٹھا تھا وہ اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا تھا اور پھر لال ہی تو شیر دل کو دل و جان سے چاہتی تھی لال نے کئی مرتبہ شیر دل سے کہا تھا کہ شیر دل عورت صرف ایک دفعہ ہی محبت کیا کرتی ہے میں تمہاری ہو چکی ہوں مرن تمہاری نیکی دیکھنا تم کہیں مجھ کو چھوڑ نہ دینا کہ میں تو اب تمہارے بغیر نہیں جی سکوں گی اور پھر وہ دونوں اکثر سوچا کرتے کہ ہماری محبت کا کسی اور کو علم نہ ہو لیکن عشق اور مشک چھپائے سے بھی کہیں چھپتے ہیں آخر لال کے خاندان کو اس بات کا علم ہو ہی گیا کہ شیر دل لال سے محبت کرتا ہے اور پہلے تو طوطی گل نے کافی پیچھا کیا وہ کسی طرح دونوں کو باتیں کرتے پکڑے اور دونوں کا کام تمام کر دے لیکن شیر دل بھی اس سے باخبر تھا اس نے لال کے گھر آنا جانا بند کر دیا اور اب ان کی ملاقاتیں بجائے گھر کے دریا کے کنارے ہونے لگیں شیر دل بکریاں چرانے آتا تو لال گھر سے موقع پا کر دوپہر کو وہاں پہنچتی اور دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن آخر ایک دن یوں سے جمعہ خاں نے ان کو یہاں دیکھ لیا جمعہ خاں خود تو کمزور آدمی تھا وہ تو کیا کرتا لیکن وہ ایک عرصہ سے طوطی گل کے خاندان کے کمزوروں پر گزارا کر رہا تھا وہ طوطی گل کے گھر کا کام کاج کرتا ان کے بیٹوں کی حفاظت کرتا دیکھ بھال کرتا اور بس دو وقت کا کھانا کھا لیتا وہ ملک حرام نہیں کھانا چاہتا تھا کہ وہ اس واقعہ کو نظر انداز کر دیتا۔

اس نے ساما ماجرا طوطی گل کو کہہ سنایا اور طوطی گل ایک دفعہ پھر اپنے سے باہر ہو گیا اس نے کافی کوشش کی کہ وہ دونوں کو موقع پر پکڑ سکے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور آخر اس نے ایک دلی تنگ آکر اپنے دل سے یہ فیصلہ کیا کہ وہ آج شیر دل کو زندہ نہیں چھوڑے گا وہ گھر سے کھانا

انسان

لانیو

سلیم خان گئی

انگ کرسکتی تھی۔ طبعی موت بہت دور تھی کیونکہ وہ ابھی بوڑھا نہ ہوا تھا۔ اس کا جسم مضبوط تھا اور اس میں ابھی جیتے کی سی پھرتی تھی۔ اس کی انگلیں انگلیں نہ تھیں دو لادھتے جن سے شعلے لپکتے تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے پاس لانیو تھی جو آواز سے زیادہ تیز بھاگتی تھی اور شیر خان کی سیٹھی کا مفہوم سمجھتی تھی!

لانیو ایک سدھائی ہوئی گھوڑی تھی اور اپنے مالک اور کام کو خوب سمجھتی تھی۔ شیر خان لے بی کے میل مویشیاں سے ایک یوٹھ سے بلوچ سے خرید کر لایا تھا اور اسے سال بھر سدھاتا رہا تھا۔ وہ سرحدی علاقے اور سرحدی پٹی کے اپنی اچ سے واقف تھی۔ ایک بار شیر خان نے شام کے وقت لانیو کو دس میل دور ایک گاؤں میں کھلا چھوڑ دیا اور خود ایک دوسرے راستے سے ایک دوسرے گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے گاؤں آگیا۔ لنگہ دل سویرے اس نے دیکھا کہ لانیو جو ملی میں گھڑی ہے۔ ایک تاریک رات جب وہ چرس نیچ کر سرکڑوں کے جنگل میں سے آ رہا تھا تو سرحدی محافظوں نے اس پر فائرنگ کی۔ اس نے گھوڑی سے چھلانگ لگانی زمین پر گرا، سیٹھی بھاٹی اور گھوڑی سرپٹ بھاگ گئی۔ سرحدی محافظ گھوڑی کے پیچھے بھاگے اور شیر خان جنگل میں چھپتا رہا۔ اس نے ایک دوسرے کے پاس دوسرے گاؤں چلا گیا۔ سویرا ہونے سے پہلے گھوڑی جو ملی میں تھی!

یہ ایک تاریک رات تھی اور لانیو جو ملی میں خنجر کھڑی تھی جو ملی جو گاؤں سے دو فرلانگ دور تھی۔

یہ ایک سرحدی گاؤں تھا۔ شکر گڑھ سے مشرق کی جانب دس میل کے فاصلے پر۔ اس گاؤں سے آگے سرکڑوں اور ایوے کا جنگل تھا۔ اور اس جنگل میں پاکستان اور ہندوستان کی سرحدی پٹی تھی۔ پٹی کی دونوں جانب دونوں ملکوں کے محافظ دن رات پہرہ دیتے تھے۔ سرحدوں کے یہ محافظ جان پر کھیل کر اپنا فرض پورا کرتے تھے۔ لیکن ایک خطرہ تاریک راتوں میں جیسٹم ہو کر ان کے سروں پر منڈلاتا تھا اور یہ تھا اسمگلنگ کا خطرہ۔ چاندنی راتوں میں اسمگلنگ ختم ہو جاتی لیکن تاریکی آتوں میں قاپاچی کی یہ قسم اپنے شباب پر ہوتی۔ اور یہ ایک تاریک رات تھی اور لانیو جو ملی میں کھڑی تھی۔ جو ملی جو گاؤں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔

لانیو شیر خان کی گھوڑی تھی جس کے قدیے وہ اسمگلنگ کرتا تھا اور غیر خان پور سے سرحدی علاقے کا بدنام ترین اسمگلر تھا۔ وہ چرس کا دھندا کرتا تھا۔ وہ کئی بار پکڑا گیا۔ سزا ہوئی۔ جرمانے ادا کئے لیکن اسمگلنگ کے کاروبار سے باز نہ آیا۔ یہ دھندہ اس کے خون میں کچھ اس طرح سے پراچ بس گیا تھا کہ مرث موت ہی لے لے گا لے گا دوا سے

کہا جاتا ہے کہ ایک رات شیرخان چرس نے سرحد پار جانے والا تھا کہ پیٹ کے درد کی وجہ سے بندھال ہو گیا۔ اسے درد سے آخر پریشانی رہتی جتنی اس بات سے کہ جس سکھ اسمگلر سے وعدہ کیا ہے وہ کیا سوچے گا؟ اور ممکن ہے وہ اسے وعدے کا کیا آدمی سمجھنے لگے۔ چنانچہ اس نے چرس دو تھیلوں میں ڈال کر لانیو پر رکھ دی اور آدمی رات کو لے حویل سے باہر نکال دیا۔ دوسرے دن سویرے لانیو واپس آگئی دو تھیلوں میں انڈین کرنسی تھی اور ساتھ یہ رقم کہ چرس اصل ہے اور پوری ہے جن لوگوں کو اس بات کا پتہ چلا انہوں نے بر ملا کہا کہ شیر انسان سے زیادہ بھلا ہے اور انسان سے زیادہ وفادار بھی۔۔۔۔۔

لیکن شیرخان ہر بار اس طرح کا خطرہ مول دے سکتا تھا کیونکہ اسے لانیو کی عقلی اور وفاداری پر تو اعتبار تھا لیکن ہندو اور سکھ اسمگلروں کی نیت پر یقین نہ تھا اس لئے اسے لانیو کے ساتھ تاریک راتوں میں سرکڑوں کا جھگ پاد کر کے سرحد پار جانا پڑتا تھا۔ اور یہ ہندو تاریک راتوں میں پہل تاریک رات تھی اور لانیو حویل میں کھڑی تھی۔ حویل جگاؤں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔

رات جب بارہ کا غل ہوا تو شیرخان کمرے پستول باندھے آیا اور چرس کے تھیلے لانیو پر رکھ کر سرحد کی طرف چل پڑا۔ یہ کالا اور بارہ ہندو دن جاری رہا وہ کبھی شام کو روانہ ہو جاتا کبھی رات دس بجے کبھی رات بارہ بجے کبھی آدمی رات کے بعد چاند کے گھٹنے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی روانگی بندھ جاتی تھی اور پھر چاندنی راتیں آگئیں اور چاندنی راتوں کے ساتھ شیرخان کا بیٹا سردار خان بھی آیا، جو لاہور کے ایک کالج میں این اے کا طالب علم تھا۔

سردار خان گاؤں آیا تو ایک دن گلی میں اس کا سامنا عارف سے ہوا جو اس کی حکایت تھی اور ایک دوسرے گاؤں میں انٹرمیڈیٹ کی جامعہ کی طالب تھی۔

”عارف! پڑھ کر کیا بنو گی؟“ سردار خان نے پوچھا

”کچھ بھی نہیں“ وہ شرمناک بولی

”میں تو بی لے کر کے قریب میں کپتان میں جاؤں گا“ سردار خان بولا

”کپتان میں کر کیا کرو گے؟“ عارف نے پوچھا۔

”مک کی حفاظت کروں گا۔ سرحد پر پہرہ دوں گا“ وہ سیدہ تان کھلا

”تایا جانی تو جینے میں پندرہ بار سرحد پار جاتے ہیں۔ پہلے ان کو روکنا

عارف نے دو ٹوک کہا۔

”مجھے یہ بات آج مولوی صاحب نے بھی بتائی ہے۔ اور یہ بھی بتایا

ہے کہ اصل قصور ابا جان کا نہیں۔ لانیو کسے اگر لانیو ہو تو ابا جان کھل

نہیں کہہ سکتے۔“ سردار خان بولا۔

”تو دونوں کو روکو“ عارف نے برا سامنے بنا کر کہا۔

”دونوں کو روک دوں گا“

”وعدہ کرو“

”وعدہ رہا“

اور سردار خان جلدی جلدی قدم اٹھا کر حویل کی طرف چل پڑا۔

لانیو حویل میں آگئی تھی سردار خان کو معلوم تھا کہ اس کا باپ اپنا پستول لے

چھپاتا ہے۔ اس نے حویل کی ایک تاریک کوٹھڑی میں جا کر کڑی کے

منہ وچے سے پستول نکالا۔ کمر کے ساتھ باندھا اور باہر آکر لانیو پر زہین

ڈال کر اس پر سوار ہو گیا۔ لانیو کا رخ سرحد کی طرف تھا۔

سرکڑوں کے جھل میں جا کر اُس نے لانیو کو کھڑا کیا اور پیچھے

اترا۔ پستول نکالا اور لانیو پر شابڑ توڑ سات فائر کئے۔

جب سرحدی محافظ سردار خان کے پاس پہنچے لانیو دم توڑ

چکی تھی۔

اگلے دن شیرخان نے گاؤں والوں کو چوپال میں بلایا اور سہانگ

سے توبہ کا اعلان کیا۔ ساتھ ساتھ اس نے گاؤں والوں کو عارف اور سردار

کی ممکن توڑنے کا بھی فیصلہ سنایا۔

ہفت روزہ

پاک جمہوریت

لاہور

سالانہ چندہ: دس روپے قیمت فی پرچہ پچاس پیسے

بالصویر دیدہ زیب آفٹ چھپائی



علمی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی مضامین کا مرکز

عربی اسباق

افسانے اور نظمیں ————— صفحہ طلباء اور طالبات

پتہ: پاک جمہوریت ۶ فین روڈ لاہور ————— ٹیلی فون نمبر ۶۷۴۲۳

میراں بیگم سترت برکی
میرزا فضل قدیر
نائب مدیر، سید علی محمد حسینی



جولائی - اگست - ۱۹۶۶ء

جلد ۲۹ — شماره ۴

چند سالہ، فنیہ
نی پور، ڈیڑھ روپے

اسے شمارے میں



خواجہ قلام فرید خان

ترجمہ اداہ

اداہ

مارک جمالی

ڈاکٹر قلام جمالی بری

سیلم خان لکھی

شیخ حبیب

آغا بیگ

سید رشید

ریاضی

تہذیب

تہذیب

تہذیب

تہذیب

تہذیب

تہذیب

تہذیب

تہذیب

پہلے آزادی اور کشمیر

عالمی مسائل پر قائد اعظم کا ایک انٹرویو

ایک بروقت قدم

خسرو

کاظم اعظم

کاظم اعظم کی یاد میں

آر. بی. ای. کی کتاب انگریزوں کی

دور قریب کی کتاب کاغذ کاغذ

شہداء کی یاد میں

کرمی کی زبان

تہذیب

تہذیب

تہذیب

تہذیب

تہذیب

تہذیب

ابتداء

..... تعمیر جہاں خیز

وقت دبے پاؤں پانی کے سرسراتے ہوئے ریلے کی طرح گزر جاتا ہے۔ گذری ہوئی گھڑیاں فنا کے عنبر میں مدفون ہو جاتی ہیں لیکن ان لمحات سے وابستہ یادیں ہمارے تخیل و تفکر میں کہکشاں بن کر چمکتی ہیں اور ان کی روشنی ہمیں نئی منزلوں کی آگہی و بصیرت عطا کرتی ہے۔

سنو! سنو! کہکشاں سنو! رہی ہے داستان
وہ داستان کہ ہم جسے کہیں، سہیث کن فکاں

پاکستان کی عظیم مہم حضرت قائد اعظم کی ولولہ خیز قیادت میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو فتح و نصرت کے پھر پرے اڑاتے سر ہوئی اور دنیا کی پانچویں سب سے بڑی اسلامی مملکت معرض وجود میں آگئی۔ قدم قدم پر اپنی منزلیں تراشتا تجلیوں کا یہ قافلہ کتنا تابناک تھا۔ آج بھی لوگوں کی نگاہوں میں گورنر جنرل ہاؤس سے قائد اعظم کی بصورت سبکدوش مجلس قانون ساز میں تشریف آوری انتقال اقتدار کی رسم کا منظر زندہ ہے۔ لوگوں کی یادوں میں انصار و مہاجرین کا مثالی وہ بھائی چارہ بھی زندہ ہے جسے دیکھ کر دنیا دنگ رہ گئی تھی اور اللہ والوں نے کہا تھا مدینہ کی تاریخ ارض پاک میں دہرائی گئی ہے۔

آج ہم پاکستان کے تیسویں جشن استقلال پر جب پورے قومی افق کا سائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کو مضبوط و مستحکم بنانا قیام پاکستان کی مہم سے کسی طرح کم عظیم مہم نہیں اور یہ مہم بلاشبہ سر کر لی گئی ہے۔ پاکستان کو اب کسی داخلی انتشار کا خطرہ نہیں۔ اس کے عوام ہلکے نہیں۔ انہیں دوبارہ ایک عظیم قیادت میسر آگئی ہے اور وہ جو آج سے بہت پہلے شام مشرق نے کہا تھا ”معار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز“ تو اقبال کے مخاطب معمار حرم کے لئے تعمیر جہاں کے امکانات ہر طرح روشن ہو چکے ہیں، ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ لیا گیا ہے۔ علاقائی تعصبات اور قبائلی اور گروہی مفادات کی ہوناک آمدھی ختم ہو چکی ہے اور اب تعمیر کے نئے افق ہمارے منظر میں اسلامیان عالم کی شیرازہ بندی کی سعادت بھی عوامی حکومت کو میسر آئی اور اب وہ اندرونی استحکام، اقتصادی ترقی اور کامیاب خارجہ حکمت عملی کے ساتھ تیسری دنیا کی چارہ جوتی کیلئے آگے بڑھ رہی ہے۔ رفیقہ پاکستان کا جیالا نا خدا نندوں جوں سے کھیلنا اپنی ہمت کے کارواں کو سال مراد کی طرف لئے بڑھ رہا ہے۔ ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ اس عظیم جدوجہد میں اپنا کردار ادا کرے اور اپنے محبوب راہنما کے ہاتھ مضبوط کرے۔ ہمیں توقع ہے کہ ملت کا ہر فرد ایک مرتبہ پھر پاکستان کے عظمت و وفار کی خاطر اپنے آپ کو وقف کر دینے کا عہد کرے گا۔ خدا ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

یوم آزادی اور کشمیر

خواجہ غلام دین وائی

تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے اکھنڈ تجارت کا سپنا یوں یکلخت ٹوٹ جائے گا۔ فرمان نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: ”مومن کی فراست سے ڈرنا چاہیے“۔ اس کی سچائی آج ہر ایک کے سامنے تھی اور آج قائد اعظم کی عظیم شخصیت اپنی تمام تر وسوسوں اور دنیا پاشیوں کے ساتھ ہر ایک کی آنکھوں میں تھی۔ ان کے متعلق ببل ہند مردہ بنی ٹائیڈ ونے کیا خوب پیشین گوئی کی تھی، ”کون ہے جو راز ہائے فردا کو منکشف کر سکے؟ کون ہے جو ان خفیہ قوتوں کو جیلہ نگاہ میں لاسکے، جو سرگرم عمل ہو کر بعض اوقات ہمارے خواب و خیال کو حقیقت میں تبدیل کر دیتی ہیں پھر بھی شاید کتاب مستقبل میں مرقوم ہو چکا ہے کہ وہ جو اپنی ادلعری سے مسلمانوں کا گھوکھلے بنا چاہتا تھا۔ ہماری قومی جدوجہد کے شاندار اور نازک صعدتِ حال میں ہندوستان کی آزادی کا میز بنی (اطالیہ کا نجات دہندہ) بن کر خیر فانی ہو جائے گا۔“

مسلمان قوم کو بہر حال اپنے سہل انکار ماضی کا کفارہ ادا کرنا تھا۔ انہیں آزمائشوں کی بھٹی میں سے گذرن بن کر نکلنا تھا۔ انہوں نے مسلسل قربانیاں کیں، مصائب سہے اور خاک و خون سے گزر کر ایک ایسی مثالی مملکت تک پہنچے جہاں وہ اپنا سراٹھا کر چل سکتے تھے، جہاں وہ اپنے مذہب کے بتائے ہوئے راستہ پر اپنی زندگیاں گزار سکتے تھے۔ آج اگر کوئی پاکستان کے استحکام یا کشمیر کی آزادی کے بارے میں کچھ دہم رکھتا ہے تو اس کو ۱۹۴۰ء اور

بیورلی نکولس (BEVERLY NICHOLAS) نے

۱۹۶۶ء میں اپنی مشہور کتاب ورڈکٹ آن انڈیا (VERDICT ON INDIA) میں لکھا تھا:

”یہ تصوراتی مملکت (پاکستان) ہر مسلمان کے ذہن میں موجود ہے اور وہ دن دور نہیں کہ یہ ایک دھماکے کے ساتھ دنیا کے نقشے پر ایک حقیقت بن کر اُبھرے۔ مسٹر جناح اس انقلاب آفریں دور کے ہیرو ثابت ہوں گے۔ دس کروڑ مسلمان ان کے ایک اشارہ چشم پر سب کچھ کر گزرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ شرف کسی اور کو اس ملک میں حاصل نہیں ہے۔“

۲ جون ۱۹۴۷ء کو لوگ ابھی نیند سے بیدار ہی ہوئے تھے کہ آل انڈیا ریڈیو نے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا اعلان سنایا کہ برطانوی حکومت نے تقسیم ہند کا فیصلہ کر لیا ہے مسلمانوں کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی پاکستان کا خواب شرمندہ تعبیر ہو چکا ہے لیکن قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت ان کے خلوص، ذکاوت و فراست، ذہانت و معقولیت، اخلاص اور تدبیر کا یہ ایک منہ بولتا اعجاز تھا اور اب مسلمانوں کی امیدوں اور آرزوؤں نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔

مغل سلطنت کے زوال کے بعد ۱۸۵۷ء کے مولناک اخراجات نے مسلمانوں کی یکساں سیاسی تباہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ صدین پھر سے ایک آزاد اور خود مختار قوم بن کر اُٹھے۔ ہندوؤں کی ہیرت مسلمانوں سے بھی بڑھ کر تھی وہ یہ

کے منشا کے مطابق کرے۔ چنانچہ ۱۹ جولائی ۱۹۷۷ء کو آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل نے یہ قرارداد پاس کی کہ ریاست جموں و کشمیر ہر اعتبار سے پاکستان کا جزو لاینفک ہے۔ اس لئے ہمارا جہ پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کرے۔ مسلم کانفرنس کے علاوہ کسان، مزدور کانفرنس اور دیگر سیاسی جماعتوں اور عظیم شخصیتوں جیسے پنڈت پریم ناتھ، بزانہ وغیرہ نے ہمارا جہ کو یہی رائے دی۔ سیاسی کشمکش اپنے عروج پر تھی کہ ۱۹ اگست ۱۹۷۷ء کا تاریخی دن آیا اس دن فرزند کشمیر شاعر مشرق علامہ اقبال کے مقدس خواب کی عملی تفسیر حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کے ہاتھوں ہوئی۔ قائد اعظم کو کشمیر اور کشمیری عوام سے وابہانہ محبت تھی۔ وہ کشمیر میں دسیاحت کیلئے نہیں سہانے تھے کشمیر کے مسلمانوں کی بنیضیں ٹولنے اور ان کے دلوں کی دھڑکنیں سننے سہانے تھے۔

۱۷ جولائی ۱۹۷۷ء کے مسلم کانفرنس کے تاریخی سالانہ اجلاس میں جب غازی انور اکبر آبادی اپنے مخصوص پُر جوش ترنم سے فضا پر بھائے ہوئے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ وقت کی رفتار ڈگ گئی ہے، وہ بڑے وابہانہ انداز میں بڑھ رہے تھے۔

ہمت ہے فوج، فوج کا سردار ہے جناح
اسلامیوں کے ہاتھ میں تلوار ہے جناح
ہمت تھی بے زبان، زبان مل گئی جناح
شوق جہاد قوم کا اظہار ہے جناح
”مولانا“ وقف دہریں۔ ”علامہ“ دہن غیر
یہ سب بھار راہ میں کہہ سار ہے جناح
دشمن ہزار ادھر، تن تنہا ہے یہ ادھر
بے ہاک ہے، بیٹور ہے خود دار ہے جناح
باطل سے جنگ، حق کا تحفظ، فلاح عام
گردن حق یہی ہے، تو دین دار ہے جناح

۱۹۷۷ء کا درمیانی دور تصور میں لانا چاہیے۔ جب برصغیر کی آزادی کا ساحل دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن مسلمانوں کو اپنی آزادی کی منزل کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی اور خطرہ دم بدم بڑھ رہا تھا۔ کہ وہ اکثریت کے بحر فنا میں گم ہو کر رہ جائیں گے۔ لیکن قوم کو وہ قیادت میسر آ چکی تھی جس کا صدیوں سے انتظار تھا۔

جب ۳ جون کے پلان کا اعلان ہوا تو ریاست جموں و کشمیر کے طول و عرض میں مسلمانوں کے دلوں میں جوش اور ولولے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جموں کے قلعہ باہو سے لے کر سرری نگر کے قلعہ ہری پربت تک کی فضا پاکستان زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد کے روح پرور نعروں سے گونج اٹھی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۷۷ء کی تاریخی قرارداد پاکستان کے بعد ان کی اپنی تحریک آزادی کا دھارا برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک میں مل چکا تھا اور اب ریاست کی مسلم تحریک بھی حقیقت کی تحریک تکمیل پاکستان ہی تھی۔ کشمیری عوام کو یقین تھا کہ ریاست کی ڈوگرہ شاہی ۸۰ فیصد مسلم آبادی کی امنگوں کو کھل نہیں سکتی اور نہ ریاست کے جغرافیائی، اقتصادی اور تاریخی حقائق کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ کشمیری مسلمانوں کے دلوں میں قائد اعظم کا یہ فرمان جوا انہوں نے مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ سرری نگر، جولائی ۱۹۷۷ء سے خطاب کرتے ہوئے دیا تھا، گونج رہا تھا۔

”عزت کا ایک اور من ایک راستہ ہے، وہ ہے اتحاد و اتفاق۔ ایک پرچم، ایک نصب العین، ایک پلیٹ فارم۔ اگر آپ نے یہ حاصل کر لیا تو آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ مسلم لیگ اور ہماری خدمات تائید و حمایت آپ کے قدموں پر ہوگی؟“

کشمیری مسلمانوں کے قلب و جگر میں اپنے اس محسن حقیقی کے الفاظ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کانگریس نے خطرے کو جان بیا لیکن ڈوگرہ راجہ اپنی جگہ شش و پنج میں تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے زبردست دباؤ تھا کہ ہمارا جہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ مسلمانوں

اب دیکھ آنکھ کھول کے، اور دُور دُور دیکھ
مے قوم ترا دیدہ بیدار ہے جناح
ہر سوبہ بند ہوئی صدا زندہ باد کی
اسلامیان ہند کا سردار ہے جناح

اس وقت ہر مسلمان مجھ پاکستان بنا آنے والے اس دن کا
منظر تھا جس دن صدیوں کا اندھیرا چھٹنے والا تھا۔ جس دن حقیقی
آزادی کا اجالا ہونے والا تھا۔ اور جب وہ دن ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء
کو طلوع ہوا تو کشمیری مسلمانوں کی بے پایاں خوشی اور مسرت
جنوں کی حد کو چھو رہی تھی۔ ساری ریاست شادمانی کے نشے میں
تھوم رہی تھی۔ سری نگر شہر کا یہ سال تھا کہ ہر گھر پر ہلالی پرچم لہرا
رہا تھا۔ گلی کو چوں میں پاکستان زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد
کے نعرے گونج رہے تھے۔ سری نگر کا پہلا پُل امیر اکبر جو شہر کا
سب سے ستھرا اور فیشن ایبل علاقہ تھا عجیب منظر پیش کر رہا تھا
چوک میں مسلمانوں کا ہجوم ٹھانٹیں مار رہا تھا۔ ہلالی پرچم یوں تو
ہر جگہ لہرا رہا تھا لیکن رسمی طور پر اس کو لہرانا تھا۔ اس مقصد کے
لئے مشہور ہوٹل گیسٹ ہاؤس کو منتخب کیا گیا۔

منظر آباد کے نوجوان رحمت اللہ خان چغتائی کا یہ ہوٹل
سیاسی گرمیوں کا مرکز تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہی ہوٹل پاکستان
کے جاں نثاروں کا بھی اڈہ تھا۔ جہاں راقم، قریشی محمد یوسف مرحوم،
محمد اسماعیل ساسو، غلام محی الدین رہبر، خواجہ غلام احمد تزاری، خواجہ غلام
محی الدین ترنبو، میر عبد العزیز ایڈیٹر ملت، محمد امین حیدر اور دوسرے
قائد اعظم کے شیدائی نوجوان پاکستان کے بارے میں اپنی سجد و جہد کے
منصوبے بناتے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ، خواجہ غلام محمد صادق بخٹی
غلام محمد نیشل کالفرنس کے لیڈروں کی بھی یہی بیٹھک تھی۔ لیکن ۱۴
اگست ۱۹۴۷ء کے دن مادرِ گیسٹ ہاؤس کی کج دیج ہی نزلی
تھی۔ رحمت اللہ چغتائی کی تو خوشی بیان سے باہر تھا۔ گول مٹول
چہرے پر اکڑی ہوئی مچھلیں، اور سر پر سردار گپڑی کا لہرانا ہونا

طرہ لئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ہلالی پرچم بلند ہوتے ہی اللہ اکبر
پاکستان زندہ باد اور قائد اعظم زندہ باد کے نلک شکاف نعرے
یہ ایک ناقابل فراموش منظر تھا۔ بلاشبہ چغتائی ریاست کا خوش قسمت
ترین انسان تھا۔ لیکن اکتوبر ۱۹۴۷ء کی خزاں کے ساتھ چغتائی کو
بھی اپنی خوش بختی کی خزاں دیکھنا پڑی۔ اپنے وطن میں بیماری نوجوانوں
کی موجودگی پر غم کرنے والے غداروں نے رحمت اللہ چغتائی سے
سارے بدلے چکا دیئے۔ اور آخر وہ اپنے پاکستان میں چلا آیا۔
شہر کے ڈاک خانوں اور تار گھروں پر جس طرح ہلالی پرچم
بلند کئے گئے اور رات کو چراغاں کیا گیا وہ ایک الگ داستان ہے
۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو سری نگر بلاشبہ ایک دلہن نظر آ رہا تھا۔ مسلمانوں
نے مسجدوں میں نماز شکرانہ ادا کی، کشمیر باا اور مساکین میں کھانا تقسیم
ہوا۔ سری نگر کے علاوہ بارہ مولہ، بانٹری پورہ، سوپور، بیجاپور،
اسلام آباد، شوپیاں، جموں، پونچھ، باغ، مظفر آباد، اوڈی، اپاہی
راجورلی اور کشمیر میں جلسے ہوئے۔ ہلالی پرچم لہرائے گئے۔ اور
قرار دادوں کے ذریعے ڈوگرہ حکمران پر واضح کیا گیا کہ ریاست جموں و
کشمیر مسلم اکثریت کی ریاست ہے اور جغرافیائی، مذہبی، اقتصادی و
تاریخی طور پر پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ کشمیری مسلمانوں کی پاکستان
سے اس دہانہ محبت کا شعلہ آج بھی بھوک رہا ہے۔ کشمیر کے بارے میں قائد اعظم
محمد علی جناح نے مسلم کانفرنس کے ڈل گیٹ کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا
”کشمیر ایشیا کی انگوٹھی کا ٹکڑہ ہے۔“ ظاہر ہے کہ قائد اعظم کے ان احساسات کی تکمیل
اُس وقت ممکن ہے جب اہل کشمیر کو آزادی اور خود ارادیت کا حق مل جائے اور
وہ پاکستان میں کشمیر کے ”کان“ کو عملی شکل دیں اور سامراجی شکنجے سے رانی نکال
کر لیں۔ یہ منوال موجودہ پر مزم قیادت کو دیکھتے ہوئے کچھ دُور نہیں اور اس میں
مجھ کوئی شک و شبہ نہیں کہ قائد اعظم پاکستان ہی کے نہیں مقبوضہ کشمیر کے عوام
کے بھی ہمیر دیں۔ انہوں نے مسئلہ کشمیر کو سرد خانے سے نکال کر پھر زندہ کر دیا اور
جہاں ملت کے بہت سے مسائل ان کے ہاتھوں سلجھے ہیں وہاں یہ عظیم مسئلہ بھی
ان ہی کے ہاتھوں سلجھے گا۔

اک دانش نوراتی اک دانش برہانی

(مالیہ مسائل پر قائد عوام کا ایک انٹرویو)

تقریباً ادارہ

وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو سے ویانا (آسٹریا) کے اخبار دوخن پریس (WOCHEN PRESSE) کے چیف فارن ایڈیٹر ڈاکٹر ویسا۔ او۔ میزیل نے ۱۹ مارچ کو راولپنڈی میں ایک ملاقات کی اس ملاقات کے دوران وزیر اعظم نے جو انٹرویو اس مشہور صحافی کو دیا اس کی تفصیل تارنمین کی آگہی کے لئے ذیل میں پیش کی جاتی ہے، ہوتی جائے گی۔

ایڈیٹر: آپ نے مختلف مواقع پر پاکستان کے ہندوستان کے ساتھ تعلقات کی راہ میں تین مسائل کو حائل قرار دیا ہے۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ان پر مجموعی انداز میں بات چیت ہونا چاہیے یا علیحدہ علیحدہ۔

وزیر اعظم: ہندوستان کے ساتھ میں نے شملہ مذاکرات میں پہلے ہی ان مسائل پر ہندوستان سے گفت و شنید کی بات مسدود کر دی تھی۔ ہندوستان کی جانب سے ایک تجویز یہ تھی کہ ہم اپنے مسائل بالقطع انداز میں دیکھ کر حل کرنے کی کوشش کریں میں نے ان سے کہا کہ جملے مسائل بہت پیچیدہ ہیں اور یہ مسائل و معاملات اتنی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ کہ انہیں ایک چمک انداز میں حل نہیں کیا جاسکتا ان کے لئے ہمیں مذاکرات کا دائرہ وسیع تر کرنا ہوگا پہلے چھوٹے مسائل حل کرنا ہوں گے اور ان کے حل ہو جانے سے جو خوراک ملے گی اور خیر مگالی پیدا ہوگی اس سے پھر ہم بڑے مسائل کی طرف پیش قدمی کریں گے۔

ایڈیٹر: جناب والا کیا آپ مشرق وسطیٰ کے مسئلہ کو حل کرنے کے

ایڈیٹر: جناب والا جب کوئی شخص مشرق بعید اور مشرق قریب کی سیاحت کرتا ہے تو اُسے بھر ہند میں ایک غلام نظر آتا ہے جس میں عظیم طاقتیں اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے کی کوشش محسوس ہوتی ہیں۔ کیا یہ امر پاکستان جیسی کچھ چھوٹی قوموں کے لئے خطرہ کا باعث نہیں؟

وزیر اعظم: یہ امر اپنی ذات میں کوئی خطرہ نہیں بنتا۔ خطرہ تو قوت کے اس توازن سے پیدا ہوتا ہے جو آج دنیا میں قائم ہے بڑی طاقتیں بھر ہند میں موجود ہوں یا نہیں، کمزور ملکیتیں ہمیشہ خطرات کی زد میں ہوں گی۔ یقیناً ان کی موجودگی خطرے میں اضافہ کا باعث تو ہو سکتی ہے لیکن خطرہ پیدا نہیں کرتی۔ میری رائے میں یہ حریفانہ کشمکش اور یہ طویل عرصے کی موجودگی بڑی شدت اور سرگرمی کے ساتھ جاری رہے گی۔ آپ سمجھتے ہی ہیں کسی بات کی تمنا کرنا اور اقوام متحدہ میں جا کر پُر تقدس قراردادیں پاس کروانا ایک علیحدہ بات ہے اور حقائق کا سامنا کرنا جدا بات ہے۔ بہر حال حقیقت اپنی جگہ موجود ہے اور میری رائے میں جیسے جیسے وقت گزرے گا یہ صورت حال وسیع تر اور شدید تر

لئے قدم بہ قدم پیش قدمی پسند فرمائیں گے؟
وزیر اعظم: وہ ایک بالکل ہی مختلف نوعیت کا معاملہ ہے جیسا کہ میں نے کہا آپ کو ہر صورت حال کی سٹنگ کو دیکھنا ہو گا ہر صورت حال کی اپنی مختلف نوعیت کی سٹنگ ہوتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس معاملہ کے لئے مرحلہ بہ مرحلہ حل کے بجائے جینیوا کے بسیار پہلو انداز کے مذاکرات زیادہ بہتر رہیں گے۔

ایڈیٹر: کیا آپ کے پاس ایسے شواہد ہیں کہ ہندوستان کشمیر پر سنجیدگی سے گفتگو پر آمادہ ہو؟

وزیر اعظم: اب تک تو ہر حال ہندوستان نے کشمیر پر سنجیدگی سے بات چیت سے پہلو تہی کی ہے۔ سابق میں ہندوستان نے کئی مرتبہ کشمیر پر مذاکرات میں حصہ لیا ہے لیکن وہ تمام باتیں بے نتیجہ رہیں۔ اس کے معنی ہر حال یہ نہیں ہیں کہ ہم مذاکرات کے ذریعہ مسئلہ کے حل کو مسترد کر دیں۔ میری رائے میں تنازعات کے حل کا موثر ترین ذریعہ بالمشافہ اور براہ راست بات چیت ہے۔ اگر براہ راست بات چیت تعطل کا شکار ہو جائے اور براہ راست بات چیت سے نتیجہ پر پہنچنا ممکن نہ رہے تو پھر بسیار پہلو انداز کے مذاکرات سے معر نہیں ہو سکتا تاہم، پہلا زور براہ راست بات چیت پر ہونا چاہیے۔

اب آپ مجھ پر ایک جوابی سال داغ سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ اگر جموں و کشمیر کے تنازعات کو حل کرنے کی تمام کوششیں سابق میں ناکام ہو چکی ہیں تو مستقبل کی ایک کوشش کی کامیابی کے امکانات کہاں سے پیدا ہو جائیں گے۔ اس سوال کے لئے میرا جواب بہت سادہ اور آسان ہے۔ ہم اب ۷۴ء یا ۱۹۷۲ء میں نہیں ہیں، ہم اب ایک مختلف ماحول میں ہیں۔ دنیا میں بہت کچھ ہو چکا ہے، ایشیا میں بہت کچھ

ہو چکا ہے اور برصغیر کے دریاؤں سے بہت سا پانی گزر چکا ہے۔ وقت نے یہ دکھا دیا ہے کہ اس تنازعہ کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ بعض اوقات اگر آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ تنازعہ گہرے سکتے میں پڑ جاتا ہے مگر وہ مر نہیں جاتا۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ تنازعہ پھر سے زندہ ہو جاتا ہے مگر یہ حل نہیں ہوتا۔ ہر حال تنازعہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ خواہ یہ مدہم خروش رکھتا ہو یا تیز۔ خواہ یہ امن کا وقت ہو یا جنگ کا، اسے مٹایا نہیں جا سکتا اور اسے اس وقت تک مٹایا نہیں جا سکتا جب تک اس کے حل کیلئے کوئی کوشش نہ کی جائے۔

پھر مجھے اس بات پر بھی یقین ہے زود یا بدیر بروہا اور سوجہ بوجہ ہندوستان میں پیدا ہو گی۔ ہندوستان کو اس تعطل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے برعکس اس کے میں تو یہ کہوں گا کہ ہندوستان نے اس کی بدولت بہت سی تکالیف سہی ہیں۔ ہم اس مسئلہ کو حل کرنے کی ضرورت کا احساس رکھتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ ہندوستانی دماغوں میں بھی اسے حل کرنے کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گا۔ ایڈیٹر: کشمیر پر اقوام متحدہ کی ان غیر مبہم واضح قراردادوں پر غور کرتے ہوئے جواب بھی کتابوں میں موجود ہیں کیا آپ نے کبھی کشمیریوں کے لئے وہ اقدامات طلب نہیں کئے جو مثال کے طور پر فلسطینیوں کے لئے کئے جا رہے ہیں۔

وزیر اعظم: نہیں ہماری صورت حال تاریخی اعتبار سے مختلف ہے برصغیر کی تقیم اور وہ تمام کمشنٹ جو اس وقت کے لئے ہو پھر ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ۔ اگر ان سب کو یکجا کیجئے تو ظاہر ہو گا کہ اقوام متحدہ کی قراردادیں تاریخی عمل کے مطابق ہیں۔

ایڈیٹر: وزیر اعظم آزاد کشمیر نے کہا ہے کہ کشمیر بوسہ دنیا میں آزادی

جولائی، اگست ۱۹۷۱ء

یعنی ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات کو اس ملک کے اندرونی معاملات کے آثار و حواظ کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

ایڈیٹر: لیکن کیا آپ یہ خیال نہیں کرتے کہ ہندوستانی حکومت پر اندرونی دباؤ کچھ ناماقبت اندیشانہ اقدام کا باعث نہیں بن جائے گا۔

وزیر اعظم: یہ اتنا سہل نہیں ہے۔ ہم چمکے ہیں۔ ناماقبت اندیشانہ اقدام سے بڑی پیچیدہ صورت حال پیدا ہو جائے گی اور ہندوستان کو کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ بنگلہ دیش کی طرح یہ ایک آسان معاملہ ہوگا تو ایسا نہیں ہوگا۔ پنجاب کے میدان سندھ کے رگزار اور ہمارے علاقے کے پہاڑ اس لئے نہیں ہیں کہ ہندوستان انہیں روند کر مٹائے۔

ایڈیٹر: جی ہاں میرا مطلب ہے وہاں بنگلہ دیش میں تو ایک محصور.....

وزیر اعظم: ہاں وہ تو ایک جزیرہ تھا۔ وہاں واقعی جنگ کا کوئی اسکوپ نہ تھا۔

ایڈیٹر: تو آپ یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ نظام میں کسی مبارزت و مقابلہ کا کوئی خطرہ نہیں۔

وزیر اعظم: میں بہت جلد اسے اتا نہیں دیکھتا۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہمیں چوکنا رہنا ہوگا اور گزشتہ ۲۸ برسوں کے تجربات کو بھی نظر میں رکھنا ہوگا میں کوئی پیش گوئی نہیں کرتا۔ تاہم میں خوف و ہراس کی پالیسی کا بھی پرچار نہیں کرتا چاہتا۔

ایڈیٹر: شہنشاہ ایران نے جب وہ ہندوستان میں تھے کہا تھا اور میں نے بھی ان سے بات کی تھی کہ ایران عربوں کا حامی ہے وہ

اقوام متحدہ کی قرارداد ۲۴۲ اور ۳۳۸ پر مبنی دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ وہ علاقے کی تمام ملکیتوں کے حقوق تسلیم

کی تحریکوں کو اس لئے دیکھ رہا ہے کہ ان کے تجربات سے کچھ سیکھے۔ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ گوریلا انداز کی جدوجہد کی سوچ رہے ہیں؟

وزیر اعظم: میں نہیں سوچتا ایسا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایک گوریلا جدوجہد کا آغاز کرنے والے ہیں ہر حال ہو سکتا ہے دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کے ضمن میں وہ یہ کہہ رہے ہوں۔ لیکن جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ ہم اولاً افہام و تفہیم کے ذریعے اس جھگڑے کے پڑاؤ میں حل پر توجہ مرکوز رکھیں گے۔

ایڈیٹر: کیا کشمیر کے لئے آزادی اگر وہ ایسا چاہیں.....

وزیر اعظم: ہم اس تاریخی عمل کے پابند ہیں جن کی جابر پوشی اقوام متحدہ کی قراردادیں کرتی ہیں۔

ایڈیٹر: کیا اسی میں رائے شماری بھی آتی ہے؟

وزیر اعظم: اس میں کشمیریوں کے لئے رائے شماری بھی شامل ہے کہ آیا وہ ہندوستان کے ساتھ شریک ہوں گے یا پاکستان کے ساتھ۔

آپ یہاں یہ نکتہ دیکھئے کہ نہ پاکستان اور نہ ہی ہندوستان تقسیم کی طرفدار کی کہہ سکتے ہیں۔ اقوام متحدہ کی قراردادیں تاریخی عمل سے مطابقت رکھتی ہیں اور رائے شماری کشمیریوں کی مرضی سے متعلق ہے کہ پاکستان میں شریک ہوں یا ہندوستان میں۔

ایڈیٹر: کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان میں موجودہ سیاسی رجحان پاکستان کے لئے کوئی خطرہ..... یعنی ان کا جمہوریت سے بے ہمتا۔

وزیر اعظم: ہندوستان میں جمہوریت جب اپنے شباب پر تھی تو ہمیں ان کی سہاریت برداشت کرنی پڑی۔ اس لئے ہم بنیادی سوال

۲۵ اگست ۱۹۷۱ء

ایڈیٹر: اب اگر مجھے آخری سوال کرنے کی اجازت دیں تو پوچھوں کہ کیا آپ فیروز آبادیہ ملکوں کی پالیسی سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہیں؟ کیا آپ یہ خیال نہیں کرتے کہ ہمیں متبادل تعلقات ہوتے ہیں۔ پاکستان کے لئے بڑی طاقتوں میں سے کسی ایک سے دوستانہ خطرناک ہو سکتی ہے۔ لیکن یورپ پاکستان کے ساتھ تعلقات میں ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

وزیر اعظم: جی ہاں، ٹھیک ہے۔ میں نے اس کے متعلق اپنی کتاب آڈائی موہوم میں ۱۹۶۷ء میں لکھا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ یورپ کی شخصیت ابھرنے کی امید ہے اور میں نے ایشیاء اور یورپ کے مثبت تعلقات قائم ہونے کو کہا تھا۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ہماری دولت مشترکہ کو چھوڑنے کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہم یورپی شخصیت کو مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ برطانیہ یورپ کا حصہ ہے اور بھارت اپنی وسیع اور دوری دورانیوں کو مختلف شکلوں میں نہا نہیں سکتا۔ اسے بہر حال اپنے مستقبل کو یورپ سے منسلک کرنا ہوگا۔ بہر حال یہ ایک پہلو تھا۔ آنے والے واقعات کے ارتقاء پر نظر رکھتے ہوئے ہم نے سوچا ہم شکر گزاری کے ساتھ دولت مشترکہ سے اور بھاری ذمہ داریوں سے علیحدہ ہو جائیں۔

میرے نزدیک دولت مشترکہ ایک مبہم ادارہ ہے اور یہ محض ایک گورنر ہونے والے کی چیز ہے۔ پس جوں ہی یورپ ایک قوت کے مرکز کی حیثیت سے ابھرتا ہے اور برطانیہ اس میں بھرپور طریقہ پر شامل ہو تو پھر ہمیں تین گونوں کے بجائے چار گونوں کی دنیا مل جاتی ہے۔ اور مضبوط تعمیر و دستوں کے بجائے چار دستوں پر ہی ہوتی ہے۔

ایڈیٹر: ایک نگوں آسان چیز ہے۔

وزیر اعظم: لیکن یہ چیز ہے کہ دنیا کی چار شاخیں ہوں۔

ایڈیٹر: آپ کا شکریہ!

وزیر اعظم: آپ کا بھی شکریہ!

گرتا ہے اور یہی کچھ صدر سادات نے بھی کہا ہے۔ کیا آپ کی رائے بھی یہی ہے؟

وزیر اعظم: جہاں تک ان قراردادوں کا تعلق ہے یہ وہ قراردادیں ہیں جنہیں اقوام متحدہ نے منظور کیا ہے اگر عرب ملکوں نے ان کی تائید کی ہوتی تو اقوام متحدہ انہیں منظور نہ کرتی۔

ایک مرتبہ جب ایک قرارداد اکثریت سے منظور ہو جاتی ہے تو اس قرارداد کی پابندی لازم آجاتی ہے۔ یہ پابندی اس کی عمل پذیری کے معاملہ میں نہیں اخلاقی نوعیت میں ہوتی ہے ان قراردادوں پر سلامتی کونسل میں ویٹو استعمال نہیں ہو سکتا اس لئے ہم قدرتی طور پر ان کی تائید کرتے ہیں۔ مگر ان قراردادوں کے بعد بنیادی نوعیت کی کچھ تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ تنظیم آزادی فلسطین (P.L.O) کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔

حقیقت میں اسے لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس (فروری ۱۹۷۱ء) میں تسلیم کیا گیا اور پھر رباط کانفرنس میں اس کی حمایت کی گئی اور اردن، لاہور اور رباط دونوں جگہ اس حمایت کا ایک فرقہ تھا۔ پس اس لئے اب یہ فلسطینی مہاجرین کے ایک غیر متعلق مسئلہ کا معاملہ نہیں رہا۔ اب آپ فلسطین کے ایک وجود سے معاملہ کر رہے ہیں اور اس وجود کی نمائندگی فلسطین کی تنظیم آزادی ہے۔ زور دیا ہے وزیر قرارداد کے اس جوت کو بڑھ کرنا ہوگا اور یہ ضرور ہوگا۔ ایڈیٹر: لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ علاقے کی تمام ملکوں کے وجود کے حق کو اور مزید ایک فلسطینی ریاست کے وجود کے حق کو تسلیم کرنا ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے؟

وزیر اعظم: یقیناً نہیں اسے تمام عرب ریاستوں نے تسلیم کر لیا ہے۔

ایڈیٹر: ہاں مگر میرا خیال ہے یہ اس کا مخالف تھا۔

وزیر اعظم: سوال یہ ہے کہ آپ اسرائیل کے بغیر ایک جینیٹا کانفرنس کا تصور پس کر سکتے۔ اب بہر حال عرب ملکوں نے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔

ایک بروقت قدم

آٹا پیسنے، چاول چھڑنے اور روٹی بسینے
کے کارخانے حکومت کی تحویل میں!

ادارہ

گئیں، کبھی پتھر اور کھریا۔ اس افسوسناک صورت حال سے تاثر ہو کر عوامی حکومت نے مفاد عامہ میں یہ قدم اٹھایا ہے حکومت کے اس اقدام سے اب آٹے کی تلوں کے نظام کی سائنسی طریقوں پر تنظیم کی جائے گی۔ مختلف مراحل پر آٹے کے سپل، کٹے کئے جائیں گے اور کسی بھی مرحلہ پر اگر ان کے معیار میں کوئی کمی یا نقص پایا گیا تو متعلقہ لوگوں کو سخت سزائیں دی جائیں گی۔ یقین ہے کہ آئندہ عوام کو آٹے سے متعلق کوئی شکایت نہیں رہے گی۔ اور عوام کی صحت پر اس کا خوشگوار اثر پڑے گا۔

آٹے کی تلوں کے قومی تحویل میں پہلے جانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ بیج کے ابجنٹ اور آٹھینے اب کاشتکاروں اور ٹیلو ہولڈروں سے ناسامائز منافع نہیں کما سکیں گے۔ آٹا پیسنے کے نرخوں کو بھی معین کیا جائے گا۔ اور تلوں میں کام کرنے والوں کے مفادات کا خاص انداز سے تحفظ کیا جائے گا اور انہیں وہ تمام مراعات دے جائیں گی جن کا اعلان حکومت کی لیبر پالیسی میں وقتاً فوقتاً کیا گیا ہے۔

چاول چھڑنے کے کارخانوں کے قومی تحویل میں آجانے سے بھی بڑے درجے فائدے حاصل ہوں گے۔ اس کا اولین فائدہ دھان کے کاشتکاروں کو پہنچے گا انہیں اب اپنی فصل کی مفصل

۱۷ جولائی ۱۹۷۶ء کو وزیر اعظم پاکستان نے آٹا پیسنے، چاول چھڑنے اور روٹی بسینے کے بڑے بڑے کارخانوں کو حکومت کی تحویل میں لینے کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

”غذا میں ملاوٹ ایک لعنت ہے جس کا خاتمہ ہمارے ملک سے ہو سانا چاہیے میں بے غل و غش ہو کر اپنے عوام کو غذا کی کمی اور بیماریوں کا محض اس لئے شکار ہوتا نہیں دیکھ سکتا کہ آٹا پیسنے کی ریس ہمارے کنٹرول سے باہر ہیں۔ میں اپنے عوام کی صحت کو یہ خطرہ نہیں برداشت کر سکتا۔ کوئی بھی ترقی پسند سماج عوام کی اس بے حرمتی کی محض اس لئے کہ یہ (مصنعت) نجی ملکیت میں ہے اجازت نہیں دے سکتی۔“

غذا میں ملاوٹ ایک انتہائی گھناؤنا سماجی گناہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آٹے میں ملاوٹ کی سماجی ترقی اور نہایت سنگینی کے ساتھ عوام کی صحتوں سے کھیلنا تھا۔ حکومت کے مسلسل نتیجہ کے باوجود بڑے بل مالکوں نے کبھی اپنے اخلاقی فرائض صحیح انداز میں انجام نہیں دیئے اور آٹے میں جو ہماری غذا کا جزو اعظم ہے، برابر ملاوٹ کرتے رہے۔ کبھی آٹے میں سوکھی روٹیاں پیس کر ملائی

جولائی، اگست ۱۹۷۷ء

پاکستانی روٹی دس ادوی منڈیوں میں اپنا وقار بحال کر سکے گی اور اس کے نتیجے میں اس کی مانگ بھی بڑھے گی اور قیمت بھی۔
کاشتکاروں کو اب کپاس کے مناسب قسم کے بیجوں کے انتخاب میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی اور یہ بیج انہیں نہایت مناسب نرخوں پر دستیاب ہوں گے۔

قومیائی ہوئی یٹوں میں بننے والی سائنسی طریقہ پر نکالا جانے والا اور یہ کوشش کی جائے گی کہ اس کی بھرپور مقدار حاصل کی جائے۔

روٹی بیٹنے کی صنعت سے خود غرض سرمایہ داروں اور ایجنٹوں کے نکل جانے سے حکومت کے لئے یہ ممکن ہو سکے گا کہ وہ اس صنعت میں زیادہ سے زیادہ توسیع اور اصلاحات کر سکے اور سائنسی ذرائع اور تکنیک کو استعمال کر کے بہتر فوائد حاصل کر سکے۔

حکومت نے آٹا پیسنے، سہاول چھڑنے اور روٹی بیٹنے کے کارخانوں کو اپنی تحویل میں لے کر یہ اعلان بھی کیا ہے کہ ان کارخانوں کے مالکوں کو مناسب معاوضہ ادا کیا جائے گا جب وہ یونٹوں کو نقد معاوضہ دیا جائے گا اور بڑے یونٹوں کو بونٹکی صورت میں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے یونٹوں کو جنہیں بیرونی کمپنیاں مناسب سائنسی انداز میں چلا رہی ہیں مستثنیٰ قرار دے دیا جائے گا۔

حکومت نے یہ بھی اعلان کر دیا ہے کہ قومی تحویل میں لئے جانے والے یونٹوں کے ملے اور مزدوروں کے حقوق اور ملازمت کا ہر طرح تحفظ کیا جائے گا اور انہیں کسی قسم کا اکھاڑ بھٹا کا سامنا نہیں ہوگا اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام مزدور اور کارکن جو ان صنعتوں میں کام کر رہے ہیں پہلے سے زیادہ خوش اسلوبی سے زندگی گزار سکیں گے اور انہیں ہر قسم کے مراعات جن کا لیبر پالیسی میں اعلان کیا جا چکا ہے میسر ہوں گی۔ توقع ہے کہ مل مزدور اور تکنیکی عملہ اب پہلے سے زیادہ مستعدی اور ہافٹناتی سے پیداوار بڑھانے پر اپنی توجہ مرکوز کر سکے گا اور یوں ملک اور قوم کا حقیقی فائدہ ہوگا۔

قیمت ملے گی اور اب وہ ایجنٹوں اور آرٹھیوں کے استعمال سے ہر طرح آزاد ہو جائیں گے۔ سہاول کے استعمال کا مکمل سائزہ یا سائزہ گا اور اس کی تقسیم اور قیمتوں کو سائنسی انداز میں کنٹرول کیا جائے گا۔ اور نفع خوری کو عوام کی جیبوں پر ڈاکر ڈالنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔

ان فوائد کے علاوہ سہاول چھڑنے کے عمل میں سہاولوں کے ٹوٹنے اور ضائع ہونے کی مقدار کو کم سے کم کر دیا جائے گا۔ نیز ان کی قسم وار درجہ بندی بڑے پٹوس سائنسی طریق کار پر کی جائے گی۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ بیرونی منڈیوں میں پاکستانی سہاول کی ساکھ بڑھ جائے گی اور اس کی مانگ میں دن دو نارات چوگنا اضافہ ہوگا۔

روٹی دھننے کے بڑے کارخانوں کے قومی تحویل میں چلے جانے سے بھی ملک اور قوم کو بڑے فائدے حاصل ہوں گے، سب سے پہلے کپاس کے کاشتکاروں کو مناسب اور معقول قیمتوں کی ضمانت میسر آئے گی اور وہ اپنا مال براہ راست ملوں کو فروخت کر کے نقد پیسے وصول کر سکیں گے۔ اس سے پہلے آرٹھی اور ایجنٹ انہیں قیمتوں کی ادائیگی میں سخت پریشان کرنے تھے اکثر صورتوں میں وہ ان کی فصل کی قیمت قسطوں میں ادا کرتے انہیں بہانوں اور حیلوں سے ٹالتے رہتے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان کی پیداوار کا نرخ گرا دیتے اور اپنی چالبازوں سے انہیں ابھرنے اور کھل کر کام کرنے کا موقع نہیں دیتے تھے۔ روٹی کے کاروبار میں سٹہ بازوں نے الگ طوفان مچا رکھا تھا نرخوں کے گھٹنے بڑھنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہوا کرتا تھا۔ اب اس کا احتمال ختم ہو جائے گا۔ اور بننے سے پاک روٹی کے اندرون ملک استعمال کو بھی سائنسی انداز میں کنٹرول کیا جائے گا۔ روٹی کی قسموں کا امتیاز قائم رکھا جائے گا اور اس میں کسی قسم کی گڈ نہ نہیں ہونے دی جائے گی اس کے معنی یہ ہوں گے کہ

غزلے

عارف مجازی

کسی صورت بھی میرے غم کی شدت کم نہیں ہوتی
 بدلتا ہوں جو پہلو بھی تو رقت کم نہیں ہوتی
 جو ہو ذوق یقیں دل میں تو پھر فکرِ گماں کیسی
 بچھڑ جانے سے، دوری سے محبت کم نہیں ہوتی
 ہر اک مشکل میں تیرا غم ہی دل کے کام آتا ہے
 مگر پھر بھی ترے غم کی ضرورت کم نہیں ہوتی
 دل آزاری بُری شے ہے، دلوں کو توڑ دیتی ہے
 اگر دل میں یہ گھر کمرے تو نفرت کم نہیں ہوتی
 میں وہ نقشِ تمنا ہوں مٹائے مٹ نہیں سکتا
 اگر رنگت بھی اڑ جائے لطافت کم نہیں ہوتی
 چھپائیں لاکھ ہم عارفِ خیالِ حسن کو یسکن
 حقیقت کو چھپانے سے حقیقت کم نہیں ہوتی

حضرت قائد اعظم

ڈاکٹر محمد اسلام جیلانی بیرق

اجیری جیسے صد ہا پاکیزہ نفوس پر نظر پڑتی ہے۔ اس لئے مسلم قوم صرف ان افراد کو قیادت کے لئے منتخب کرتی ہے۔ جن میں عظیم اسلاف کی صفات یعنی دیانت، تقویٰ، فیاضی، جذبہ خدمت، خلوص اور خدا ترسی کسی حد تک موجود ہوں۔ قائد اعظم کے ہمراہ کتنی ہی بلند پایا شخصیتیں تھیں مثلاً:-
نواب محمد اسماعیل، چندر ریجر، عبدالرب نشتر، یاقوت علی خان دہلوی۔
لیکن قوم نے قائد اعظم کو منتخب کیا کیونکہ اس کے بلند معیار پر ہم بھی
پورے اترتے تھے۔ یہ حضرت قائد کے خلوص و ایمان کا نتیجہ تھا۔
کہ دس کروڑ مسلمانان ہند کی ایک مڑوہ، افسردہ، مایوس اور ہمتشور
بھیڑ منظم ہو کر اس رفتار سے آگے بڑھی کہ منزل نے ٹپک کر اس
کے قدم چوم لئے۔

جس طرح انگریزوں کو شکل و قوت میں چرچل کا تھا، روس کو لینن اور چین کو ماؤ زے تنگ، اسی طرح مسلمانوں کو قاضی اعظم نصیب ہوا۔
یڈر عموماً عوام کی پیروی کرتے اور وہی بات کہتے ہیں۔ جو عوام کو پسند ہو۔ لیکن قاضی اعظم نے یہی بات کہی اور صرف وہی کروڑ مسلمانان ہند سے منوالی بلکہ تمیں کروڑ چند ہندوؤں نیز اس مہیب قوت کو جمع کیا۔ جس کی قلمرو پر سوچ کبھی منسوب نہیں ہوتا تھا۔

دراز قد، ہلکا بدن، پُر وقار، خوش اطوار، بلند کردار،
عظیم سیاست کار، مہذب، خلیق، زیرک، نفیس، فطین، جینیش،
صاف، اجلے، پاکیزہ، دلکش شخصیت، صاحب یقین، پُر خلوص، گفتار
میں حرارت، رفتار میں زلفے، جلال و جمال کا حسین امتزاج سب
کے لئے ایک کمال کتاب، بے غرض، امت کے لئے وقف اور ہر دامن سے
پہنچنے والے یہ تھے ہمارے قائد و رہبر۔

دفعۃً جس سے بدل جاتی ہے تقدیرِ اہم
ہے وہ قوت کہ حریف اس کی نہیں مقلِ سلیم
ہر زمانے میں دیگر گروں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیرِ محمد ہے کبھی چوبِ سلیم
(اقبال)

مسلمت ایک مارشل قوم ہونے کے علاوہ اپنے ماضی میں
یہاں شہ کے خوبصورت نمونے رکھتی ہے۔ جب یہ ماضی کی طرف
اسکھ اٹھا کر دیکھتی ہے تو اسے سیاسی دنیا میں غائبے راشدین،
عمر بن عبد العزیز، ہارون، مامون، سنجار اور سامان، حکم جیسے لوگ
نظر آتے ہیں۔ کشور علم میں خزانے، رومی اور سینا جیسے ہزار اعلیٰ کا
تھے ہیں، اہم تصوف میں خواجہ غلام، خواجہ بہاء الدین، خواجہ بکھش اور خواجہ

مردِ سپاہی ہے تو تیری ذرہ لالہ
سایہِ قمشیر میں تیری پنہا ہلا لہ - (اقبال)

پاکستان کا اولین تصور سرسید احمد خان کی تحریروں میں
 ملتا ہے۔ جب ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے یہ مطالبہ کیا کہ اردو کو
 دیوناگری خط میں لکھا جائے تو سرسید (۱۸۹۸ء) نے اردو کی
 پُر جوش حمایت شروع کر دی۔ اور اپنے ایک انگریز دوست ٹیکسپیئر
 کو جو ایک ضلع میں کلکٹر تھے لکھا۔

”مجھے یقین ہو چکا ہے کہ دونوں قومیں ہندو اور مسلمان کسی مقصد کے لئے بھی مل جل کر کام نہیں کر سکتیں۔ گو اس وقت ان میں کلمہ کھلا عداوت نہیں ہے لیکن نام نہاد تعلیم یافتہ لوگوں کی وجہ سے مستقبل میں لاتعداد مجید گیاں ہونی لازمی ہیں۔“

۱۹ اپریل ۱۸۷۰ء کو مرید نے نواب محسن الملک

کوئی

ہندوؤں کے لسانی مطالبے کی وجہ سے مسلم - ہندو اتحاد ناممکن ہو گیا ہے..... اگر ہندوؤں کا یہ مطالبہ جاری رہا تو ایک دن ہندو اُردو کو قطعی طور پر مسترد کر دے گا۔ اور ہندو و مسلم مکمل طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں گے:-

(صلاح الدین ٹانہیک :- تحریک آزادی۔ لاہور ۱۹۷۷ء ص ۱۹۹)

پاکستان کی حمایت میں دوسری آواز علامہ اقبال کی تھی۔ آپ نے ۲۹ دسمبر ۱۹۴۷ء کو الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلمانوں کی نجات ایک ایسی آزاد اسلامی مملکت کے قیام میں ہے جو مسلم اکثریت کے تمام حوصلوں پر مشتمل ہو اور جس میں مسلمان اپنے عقائد اور روایات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

اس سلسلے میں تیسری آواز چودھری رحمت علی ہوشیار پوری (۱۹۵۱ء) کی تھی۔ یہ کیرجہ میں زیر تعلیم تھا۔ ۱۹۳۲ء میں اس نے دو مضامٹ شائع کئے۔ پہلے کا نام تھا: ”اب یکا کبھی نہیں“ اور دوسرے کا ”تحریک پاکستان“ ان میں رحمت علی نے مسلمانوں کے لئے ایک الگ ریاست کا مطالبہ کیا تھا اور اس کا نام پاکستان تجویز کیا تھا۔ یہ دادرہ کے لفظ پاکستان ”چودھری رحمت علی کی اختراع ہے۔“

قائدِ اعظم اور پاکستان

قائد اعظم پہلے کانگریسی تھے۔ یہ سنہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کانگریس میں رہے اور اس تمام مدت میں مسلمانوں کے حقوق کے لئے لڑتے رہے۔ پھر سنہ ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ساتھ ہی کانگریس کے ممبر بھی رہے۔ مقصد یہ کہ کانگریس کو چمکانے کے لئے قابلیت، خطابات اور منطق کے علاوہ وہ دس کروڑ مسلمانوں کے انخلاء کا اثر بھی استعمال کر سکیں۔ لیکن سالہا سال کی گفت و شنید بیکار گئی اور ہندوؤں کی روش میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

سائیکس ہندو مسلم اتحاد و اخوت کے بڑے بڑے اعلان کرتی تھی لیکن عملاً وہ سخت مسلم کش تھی۔ ہندوؤں نے مسلمانوں پر ملامت و تہمت لگنے دروازے بند کر رکھے تھے۔ اوقات نماز میں مساجد کے سامنے سے ڈھول اور نغارے بجاتے ہوئے گزرتے تھے۔ عرم کے جلو صوں پر پتھر برساتے تھے۔ مسلمانوں کو میچھ اور شودر سمجھتے تھے۔ مسلمانوں سے ہاتھ ملانے کے بعد ہاتھ کو گھائے کے گوبر سے پھونک کر کے صابن سے دھو لیتے تھے۔ ان کے نیکلام، دیانند اور راجپال سرور برکات صلح کو برا کہتے تھے۔ ان کے ملاپ اور پرستاب فرخ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکاتے تھے اور ٹیل جیسے سائیکسی اس پھول ڈال چکے تھے۔

اس تشویش ناک صورتِ خلل پر قابو پانے کے لیے قائدِ اعظم نے ہوا
 زور لگایا۔ کانگریس ہائی کمان کے ارکان سے بار بار ملنے۔ لیکن کانگریس نہ
 ممانی۔ مہاتما گاندھی کانگریس کے غیر متنازعہ سربراہی دور و ممانی یہ نہ تھے۔

نئے مطالبات

۱۹۷۴ء میں قائد اعظم نے اپنی فہرست میں چند اور مطالبات کا اضافہ کر دیا۔ یعنی:-

- ۱۔ پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں نیز ملازمتوں میں مسلمانوں کو آبادی کے مطابق نمائندگی دی جائے۔
- ۲۔ سندھ کو کمیٹی سے کاٹ کر الگ صوبہ بنایا جائے۔
- ۳۔ سرحد اور بلوچستان کو باقاعدہ صوبوں کا درجہ دیا جائے۔ لیکن کانگریس نے انہیں رد کیا۔

گول میز کانفرنس

جب ہندو مسلم اختلافات نے فسادات کی شکل اختیار کر لی، تو برطانیہ نے لندن میں گول میز کانفرنس کا انتظام کیا اور اس میں ہندوؤں، مسلمانوں سکھوں اور ریاستوں کے ۲ نمائندوں کو دعوت شرکت دی۔ ان میں سولہ مسلمان تھے یعنی قائد اعظم، سر آغا خان، نواب جتاری، محمد علی جوہر، اے کے فضل الحق، سر عبدالقیوم، میاں محمد شفیع وغیرہ۔

باقی مندوبین ہندوؤں، شودروں، اسکھوں، پارسیوں اور عیسائیوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ دوسری کانفرنس ستمبر ۱۹۴۷ء اور تیسری نومبر ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ ان کانفرنسوں میں تقریریں ہوتیں۔ کمیٹیاں بنیں۔ انگریز نے بھی زور لگایا۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

قائد اعظم کا قیام ولایت میں

پہلی کانفرنس کے خاتمے پر قائد اعظم ولایت ہی میں رہ گئے تھے۔ دوسری کانفرنس میں وہیں سے شامل ہوئے اور تیسری میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا:-

”ہندو ذہن، ہندو جذبات اور ہندوؤں کے رویے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اتحاد کی اب

اور مہاسبھاکی تمام اقتدار ساور کر کے ہاتھ میں تھی۔ سادہ کر انتہائی متعصب، اسلام دشمن، فتنہ پسند اور لٹ مار دہ گئے تھے۔ گاندھی جی بڑے ذہین سیاستدان تھے۔ جب قائد اعظم کے سامنے لاجواب ہو جاتے تو کہتے:-

”میں یہ بات کانگریس سے کیسے منوا سکتا ہوں۔ میں تو اس کا چار آنے والا ممبر بھی نہیں ہوں۔“

مولانا ظفر علی خان نے یہ شعر اسی زمانے میں کہا تھا:-
بھارت کی بلاتیں دو ہی تو ہیں اک سادہ کر اک گاندھی ہے
وہ جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے یہ کمر کی تختی اندھی ہے

چودہ پوائنٹس

جب قائد اعظم کوئی بات کانگریس سے نہ منوا سکے، تو انہوں نے ۱۹۴۷ء میں لیگ کے پلیٹ فارم سے چودہ پوائنٹس کا اعلان کیا اور دھمکی دی کہ اگر کانگریس نے ان چھوٹے چھوٹے مطالبات کو تسلیم نہ کیا، تو وہ کانگریس سے الگ ہو کر کوئی اور راہ عمل سوچیں گے۔ ان نکات میں سے چند ایک یہ ہیں:-

- ۱۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ مقرر کیا جائے۔
- ۲۔ قانون ساز اسمبلیوں میں مسلمانوں کی نشستیں مخصوص کی جائیں۔
- ۳۔ انتخابات جدا گانہ ہوں۔
- ۴۔ اردو کو ہندوستان کی قومی زبان قرار دیا جائے۔
- ۵۔ ہندو ماترم کا ترانہ نہ گایا جائے۔
- ۶۔ مسلمانوں کو پوری مذہبی آزادی ہو۔
- ۷۔ گائے کی قربانی پر کوئی پابندی نہ ہو۔
- ۸۔ مسلمانوں کے پرسنل لار اور کلچر کا تحفظ کیا جائے۔

اس قسم کے بے ضرر سے چودہ مطالبات تھے، جنہیں کانگریس نے مسترد کر دیا۔ اور قائد اعظم کانگریس سے الگ ہو گئے۔

کوئی امید نہیں۔“

(اقتباس از میٹا مسٹر جناح ص ۷)

واپسی

جب ہندوستان فسادات کی آگ میں جلنے لگا اور حالات بہت بگڑ گئے تو قائد اعظم کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں مسلمان کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں، اور ہمیشہ کے لئے غلام نہ ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۴۷ء میں واپس آ گئے یہاں اگر سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ تمام بڑے بڑے شہروں مثلاً بمبئی، کھنؤ، علی گڑھ، کلکتہ، پٹنہ، دہلی، مدھاس، ڈھاکہ، کراچی، لاہور اور پشاور میں لاکھوں کے اجتماعات کو خطاب کیا۔ آپ جہاں جاتے مہلوں پر جلسے نکلتے اور فضا اٹے کے رہیں گے پاکستان کے نعروں سے گونج اٹتی۔ پیری اور جیماری کے باوجود آپ نے ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک ۳۷ اجتماعات کو خطاب کیا۔ اور ظہور پاکستان کے بعد ایک سال میں ۳۷ ہفت روزہ لکھے۔ ان تقاریر کا مجموعہ بھی تھا کہ ہم ننگ نظر چند روزوں کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہمیں اپنی روایات، تہذیب اور مذہب کی حفاظت کے لئے ایک الگ ملک چاہیئے۔ ایک آدھ نمونہ حاضر ہے،

۱۹۴۷ء میں لیگ کا سالانہ اجلاس کھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ اس انتہائی پر رونق اور عظیم اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا۔

”ہندوستان میں آٹھ کروڑ مسلمانوں کو کسی بات کا

ڈر نہیں ہونا چاہیئے ان کی تقدیر خود ان کے ہاتھوں

میں ہے۔ وہ باہم بیوستہ ٹھوس انداز میں منظم متحد

قوت سے ہر خطرہ کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ صادق اور

وفادار رہے تو کامیابی آپ کی ہی ہوگی۔“

(میٹا مسٹر جناح ص ۹۹)

قرارداد لاہور کے بعد ایک اخباری بیان میں فرمایا۔

”ہم ایک قوم ہیں اپنی منفرد تہذیب و ثقافت زبان ادب، آرٹ، فن، تعمیر اپنی قدروں، اخلاق، مضامین، رسم و رواج، تاریخ، روایات، رجحانات اور آرزوؤں کے اعتبار سے بین الاقوامی قانون کی ہر نوعیت سے ہم ایک قوم ہیں۔“

(میٹا مسٹر جناح ص ۱۲)

ایک اور موقع پر فرمایا۔

”مجھے بات صاف صاف لفظوں میں جس حد تک میں بیان کر سکتا ہوں بتا دینا چاہیئے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا مقصد ہندوستان کے شمال اور مشرق میں ایسی آزاد ریاستیں قائم کرنا ہے جن کے ہاتھ میں دفاع، خارجہ معاملات، مواصلات، کسٹمز، کرنسی اور زرمبادلہ کا کنٹرول ہو۔“

(میٹا مسٹر جناح ص ۱۲)

قائد اعظم کو طلبہ سے بڑی محبت تھی آپ ان کی ہر دعوت کو قبول فرمایا کرتے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں آپ کو اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ نے دعوت دی۔ کالج کے میدان میں وسیع پیمانہ پر اجتماع جسے ہندو لیبر، نعروں اور کیتوں سے پوری طرح آراستہ کیا گیا تھا۔ جب قائد اعظم شہر آئے تو فک لشکان نعروں، پھولوں اور ہاروں سے استقبال کیا۔ قائد اعظم نے کہا، ”ختم تک تقریر کی۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ دوران خطاب فرمایا۔

”ہم بوڑھوں کا کام آزادی کا ہے بھول اور جوانوں کا فرض اس کی حفاظت ہے۔“

”اخلاق و عزت کے بلند معیار ضرور برتنے، بھلائی

بھرم ڈگریوں کے ساتھ اگر کردار کا انحراف ہو تو سمجھیے

آپ کی قوت صنائع ہوؤ۔ جس دن آپ نے تعمیر کر لیا

اور ایک مکمل نمونہ ایمان داری اور شرافت کا بن گئے

جولائی، اگست ۱۹۷۶ء

۱۱ جولائی ۱۹۷۶ء کو حیدرآباد دکن میں ایک جلسہ عام سے خطاب

کرتے ہوئے کہا :-

”اس وقت میدان سیاست میں ہندو مسلم کی جنگ ہو رہی ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ کون جیتے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ہم قرآن مجید کو اپنا راہبر بنا کر شیوہ صبر و رضا اختیار کریں۔ تو ہم کم ہونے کے باوجود اسی طرح فتح یاب ہوں گے۔ جس طرح مثنیٰ بھر مسلمانوں نے ایران و روم کی سلطنتوں کو الٹ دیا تھا۔“ (ایضاً صفحہ ۴)

۲۹ اگست ۱۹۷۶ء کو عید کے موقع پر فرمایا :-

”و رمضان کا مبارک مہینہ ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ سخت کوشی اور قربانیوں کے بغیر کوئی شخص اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمانان ہند اس مبارک موقع پر یہ عہد کریں کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں مل کر کام کریں گے کیونکہ درخشاں ماضی اور عظیم تاریخی روایات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا خواب اسی طرح پورا ہو سکتا ہے۔“ (ایضاً صفحہ ۵)

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا :-

”کلام اللہ میں انسان کو خدا کا علیحدہ کہا گیا ہے۔ اس لئے ہم پر قرآن کی پیروی فرض ہے اور یہ ضروری ہے کہ ہم دوسروں سے ایسا ہی سلوک کریں، جیسا کہ خدا نوع انسان سے کرتا ہے صوم و صلوٰۃ سے باطن روشن ہوتا ہے۔ باطن کی اس روشنی اور ہدایات کی روشنی میں سوچتے ہو قرآن حکیم نے دی ہیں، اور یاد رکھئے کہ ہمارے رسول پاک کے نزدیک سب سے بڑا عمل خدمت خلق اور رواداری تھا۔ یہی زندگی کا مہم جو یہی عین اسلام بلکہ روح اسلام ہے۔“ (ایضاً صفحہ ۱۸)

تو یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے قائد اعظم نے پاکستان کا مطالبہ

کیا تھا ؟

اس دن سمجھ لئے کہ آپ کا وطن پاکستان آپ کا ہو جائیگا۔

(ماخوذ از بیاض خود)

پاکستان کیوں ؟

قائد اعظم نے پاکستان حاصل کرنے کے لئے تنگ و دو کیوں کی ؟ اس

کا جواب انہی سے سنئے :-

”اگر حکومت برطانیہ چاہتی ہے کہ برصغیر کے لوگ ایک پُر امن زندگی بسر کریں تو اس کی سیدھی راہ یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی بڑی قوموں کیلئے علیحدہ علیحدہ منطقہ مقرر کر دے تاکہ وہ اپنی خواہشات، اعتقادات اور روایات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ ہندو مسلم کا تعلق مختلف تہذیبوں سے ہے۔ ان کے تاریخی مآخذ، اکابر، ادب، رہنما اور زبانیں الگ الگ ہیں۔ انہیں ایک گاڑی میں جوتنے سے کشمکش میں اضافہ ہوگا۔ ہماری تمنا یہ ہے کہ ہم اپنی روحانی و اخلاقی قدروں کے مطابق زندگی بسر کریں۔“

(مارچ ۱۹۴۰ء - اجلاس لاہور سے خطاب)

۲۶ مئی ۱۹۴۰ء کو فرمایا :-

”ہم اس ملک میں باعزت زندگی گزارنا اور آزاد و بیناتوں میں اسلام کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔“

(خطبات قائد اعظم - از رئیس جمہوری صفحہ ۲۳۹)

اپریل ۱۹۴۰ء کو اجلاس - راس میں ارشاد ہوا :-

”ہم ایک الگ ملک اس لئے لینا چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی اپنی تاریخ اور اخلاقی قدروں کے مطابق بسر کریں۔ اپنی ہی زبان استعمال کریں۔۔۔ جب وقت آئے گا۔ تو ہماری ریاست میں آباد اقلیتیں دیکھیں گی کہ مسلمان نہ صرف منصف بلکہ فیاض بھی ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں اسلام کی روایات ہی یہی ہیں، اور اسلام یہی سکھاتا ہے۔“ (ایضاً صفحہ ۲)

قائد اعظم وادی کشمیر میں

سلیم خان گنی

کی شادی ۱۹۱۸ء میں رتن بائی سے ہوئی تھی اور کشمیر کی سیر میں اُن کی بیگم اُن کے ہمراہ تھیں۔ آپ نے یہ سفر راولپنڈی مری کوہالہ مظفر آباد کے راستے کیا تھا۔ آپ راولپنڈی تک ریل گاڑی کے ذریعہ آئے اور راولپنڈی سے سرینگر تک آپ نے راولپنڈی کے ایک ٹرانسپورٹر سے کار لے کر سفر کیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قائد اعظم نے کشمیر کا پہلا سفر ۱۹۱۹ء میں نہیں کیا۔ اس سفر کی کہانی مذکورہ مسلمان ٹرانسپورٹر نے راولپنڈی کے روزنامہ ”بادشمال“ میں تحریر کی تھی جو سید تمیم جعفری کی ادارت میں چھپتا تھا۔ مذکورہ مضمون تاحال نایاب ہے۔ اگر کسی صاحب کے پاس مذکورہ مضمون ہو تو وہ براہ کرم ”مدیر“ ماہ ”۱۰“ یا راقم کو ارسال فرمائیں۔

قائد اعظم مرحوم و مغفور دوسری بار ۱۹۲۵ء میں کشمیر گئے۔

یہ موضوع نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ وادی کشمیر کی طرح خوبصورت بھی ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح کتنی بار وادی کشمیر میں تشریف لے گئے اس موضوع پر کشمیر کے ایک صحافی پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اپنی انگریزی تصنیف ”کشمیر میں جدوجہد آزادی کی تاریخ“ میں روشنی ڈالی ہے اس موضوع پر مظفر آباد (آزاد کشمیر) کے ایک دانشور اور محقق سید غلام حسن شاہ کاتلی نے بھی خاص کام کیا ہے۔ آزاد کشمیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس خواجہ محمد یوسف مراد نے ۱۹۷۵ء میں اس موضوع پر ایک مقالہ تحریر کیا جو بعد میں آزاد کشمیر ریڈیو سے بھی نشر ہوا۔ تاہم یہ موضوع ابھی تشنہ ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت آزاد کشمیر یا حکومت پاکستان اس موضوع پر مواد فراہم کرنے کے لئے کسی محقق کی خدمات مستعار لے۔ میرے خیال میں اس موضوع کے لئے مراد صاحب سے بہتر محقق نہ مل سکے گا۔

قائد اعظم سب سے پہلے ۱۹۱۹ء میں کشمیر تشریف لے گئے اُن

نے حنیفہ سے عدت ختم ہونے کے کچھ گھنٹے بعد نکاح کیا تھا۔ عدالت عالیہ نے اس دعویٰ کے لئے سند مانگی تو قائد اعظم نے برجستہ فرمایا کہ اس مقدمہ میں میرا بیان قانون کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ کشمیر ہائی کورٹ نے ہر عمل کو باعزت بری کر دیا۔ قائد اعظم نے ہر عمل سے کوئی فیس نہ لی کیونکہ وہ تحریک حریت کشمیر کے کارکن تھے۔ جسٹس خواجہ محمد یوسف صراف دوسرے مقدمہ کے بارے میں لکھتے ہیں :-

”دوسرا مقدمہ سوپورس کے خواجہ عبدالعزیز پنڈت اور حکومت کے درمیان تھا۔ یہ دیوانی نوعیت کی اپیل تھی۔ اس میں قائد اعظم کو غالباً آٹھ سو روپے فیس ادا کی گئی جو انہوں نے انجمن نعت الاسلام سرینگر کے ہائی سکول کو بطور چندہ دی۔“

تیسری بار قائد اعظم ۹ مئی ۱۹۴۴ء کو سرینگر تشریف لائے اور ۲۳ جولائی ۱۹۴۴ء کو واپس تشریف لے گئے جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ ۱۹۴۴ء میں قائد اعظم برصغیر کے تمام مسلمانوں کے مسلمہ لیڈر تھے اور ہندوستان کے مسلمان آپ کو قائد اعظم کا خطاب دے چکے تھے تین سال بعد پاکستان بننے والا تھا اور یہ خیال عام تھا کہ کشمیر پاکستان میں شامل ہوگا کیونکہ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ آپ کو کشمیر آنے کی دعوت دی جا چکی تھی۔ مولوی محمد سعید، خواجہ غلام محمد صادق جروا اور شیخ عبداللہ آپ کو دہلی میں مل چکے تھے اور کشمیر آنے کی دعوت دے چکے تھے۔ شیخ عبداللہ چاہتے تھے کہ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس میں صلح صفائی ہو جائے۔ قائد اعظم سوچیت گڑھ کے رستے ریاست میں تشریف لائے۔ آپ کا غیر مقدم شیخ محمد عبداللہ اور بخش غلام محمد نے کیا سوچیت گڑھ سے جموں اور جموں سے سرینگر آپ کو عظیم ترین جلوس کی شکل میں لایا گیا اس سفر کے دوران آپ نے رات بانہال میں گزاری بانہال سے سرینگر کا فاصلہ اسی میل ہے جو عام طور پر دو گھنٹے میں بذریعہ کابلے کیا جاتا ہے لیکن جلوس کی وسعت کا اندازہ لگائیے کہ یہ فاصلہ گیارہ گھنٹوں میں طے ہوا سرینگر میں داخل ہوتے ہی آپ نے پرتاب پارک

آپ کا دوسرا وفد سیاسی اور پیشہ ورانہ اعتبار سے بے حد کامیاب رہا ریشم خانہ کی بغاوت کے بعد کشمیری مسلمانوں کا جذبہ حریت شعلہ ستاباں کی شکل اختیار کر چکا تھا چودھری غلام عباس خان مرحوم کی زیر قیادت مسلم کانفرنس نے اہل کشمیر کو تحریک آزادی کشمیر کی شاہراہ پر لاکھڑا کیا تھا اور کشمیر کے سیاسی نقشہ میں ایک نیا رنگ بھرا تھا۔ کشمیریوں کو بزدلی کا طعنہ دینے والے اب کشمیریوں کو سربکف اور کھن بردوش میدان عمل میں دیکھ رہے تھے۔ اس سیاسی فضا میں مسلم کانفرنس نے قائد اعظم کو ایک دعوت میں ہمت فرمانے کی استدعا کی جسے قائد اعظم نے بے حد مسرت کے ساتھ قبول کر لیا۔ مسلم کانفرنس کے سیاستمدار کے جواب میں قائد اعظم نے مسلم کانفرنس کے زعماء کو اتحاد کی تلقین فرمائی اور یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ اقلیتوں کا تعاون و اشتراک حاصل کرنے کے لئے پوری کوشش کریں قائد اعظم نے اس بار جن دو مقدموں میں حصہ لیا ان میں سے ایک مقدمہ ایک سیاسی کارکن ہرعلی کا تھا جو کشمیر ہائی کورٹ میں زیر سماعت تھا۔ ہرعلی پر الزام تھا کہ انہوں نے ایک خاتون حنیفہ بیگم سے عدت کے دوران نکاح کیا ہے۔ ہرعلی کو ماتحت عدالتوں سے سزا ہوئی تھی۔ ہرعلی سیاسی کارکن تھے اور قائد اعظم سے آپ کی ملاقات اسی حوالے سے ہوئی۔ قائد اعظم نے ان سے کہا کہ وہ پیش کی تاریخ سے ایک دن پہلے مقدمہ کے کاغذات ان کو دیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور قائد اعظم دوسرے دن کشمیر ہائی کورٹ میں پیش ہوئے عدالت کا کمرہ کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ قائد اعظم کے مقابل ریاست جموں و کشمیر کا ایڈووکیٹ پنڈت امر ناتھ کاک تھا جو ذہانت فطانت اور پیشہ ورانہ جہاد میں ریاست کا چوٹی کا وکیل خیال کیا جاتا تھا۔ قائد اعظم نے عدالت عالیہ کو بتایا کہ عدت کا حساب کتاب عیسائی کیلنڈر کے مطابق کیا گیا ہے کیونکہ ہرعلی مسلمان ہیں اور مسلمان عدت کا حساب قمری کیلنڈر سے کرتے ہیں، اگر قمری کیلنڈر کے مطابق عدت کا حساب کیا جائے تو معلوم گا کہ ہرعلی

وسیع احاطہ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں قائد اعظم نے تقریر فرمائی
حاضرین اجلاس کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ جب آپ تقریر کے
لئے کھڑے ہوئے تو پندرہ منٹ تک تالیوں کی گونج سنے
احاطہ کا احاطہ کر لیا۔ ہر طرف سے تالیاں اور نعرے اٹھ رہے تھے۔
لوگ پگڑیاں اور ٹوپیاں اٹھا رہے تھے کہ آپ نے ہوا میں اچھال دیے
تھے کچھ حاضرین خوشی کے مارے رو رہے تھے عجیب منظر تھا۔ آپ
نے اردو میں تقریر کی اور بر ملا فرمایا کہ اہل کشمیر کی امداد ہندوستان
کے مسلمانوں کا مقدس فریضہ ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی
طرف سے وہ اہل کشمیر کو امداد کا پورا پورا یقین دلاتے ہیں۔

۲۳ جولائی کو آپ جہلم ویل روڈ سے راولپنڈی کے لئے
روانہ ہوئے۔ راستے میں آپ نے بار مولا، اوڈی اور مظفر آباد میں
منعقدہ عام جلسوں میں تقریریں کیں۔ مظفر آباد میں آپ نے ایک
رات کے لئے قیام بھی فرمایا۔ آپ نے یہ رات دو میل کے اس ڈاک بنگلہ
میں گزاری جس میں دو سال بعد پنڈت جواہر لال نہرو چند گھنٹوں کے
لئے قید رہے۔ اگلے دن آپ راولپنڈی چلے آئے۔

مریگر میں آپ نے سرمہ رتب علی کی کوٹھی کو شک میں قیام کیا
حکومت ریاست جموں و کشمیر نے آپ سے سرکاری جہان خانہ میں بطور
سرکاری جہان ٹھہرنے کی استدعا کی جو آپ نے قبول کر لی۔ یہ دعوت دو
ہفتوں کے لئے تھی لیکن آپ سرکاری جہان خانہ میں ایک ہفتہ ٹھہر کر
واپس کو شک آ گئے۔

میں ایک بہت بڑے جلسہ عام سے خطاب فرمایا اور کہا کہ اہل کشمیر
نے میرا شانہ استقبال کیا ہے۔ یہ جلسہ نیشنل کانفرنس یعنی شیخ عبداللہ
کی نگرانی میں ہوا اور اس میں سپانسامہ بھی شیخ عبداللہ نے پیش کیا۔
قائد اعظم نے سپانسامے کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ان کا استقبال
جس عقیدت اور شان سے ہوا ہے یہ دراصل ہندی مسلمانوں کی
عزت افزائی ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ استقبال میری ذات کے
لئے نہیں ہندوستان کے مسلمانوں کے فائدہ کی حیثیت سے
کیا گیا ہے۔

مریگر میں آپ کو کئی دعوتیں دی گئیں لیکن دو دعوتیں یاد آگئیں
ہیں۔ ایک دعوت علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی طرف سے تھی۔
دوسری دعوت میرٹھ کشمیر حضرت مولانا محمد یوسف شاہ مرحوم نے
دی جس میں تین سو جہانوں نے شرکت کی۔ اس دعوت میں قائد اعظم
شیروانی اور شلوار پہن کر تشریف لائے اور پہلی بار فرش پر بیٹھ کر
کشمیری انداز میں کھانا تناول فرمایا۔ آپ کے لئے جو کھانا تیار کیا گیا
اُس میں مرغ مصالحہ کم ڈالا گیا تھا۔ کھانے کے دوران سالن کے
چند چھپٹے آپ کی شلوار پر گہرے دعوت کے بعد میرٹھ مرحوم نے
آپ کو کشمیری پوشاک پیش کی، اس کے علاوہ آپ کو شلوار دہی کے جوتے
اور کشمیری شال بھی پیش کی گئی۔ آپ نے کشمیری شال اہل کشمیر کی طرح
اڑھس اور حاضرین دعوت سے مخاطب ہو کر بولے کیا اب میں کشمیری لگ رہا ہوں؟
ارجون کو مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس جامع مسجد کے



”آر۔سی۔ڈی۔ انقلاب آفریں دور میں“

شبیم حبیب

نے ایک اور اہم بات یہ کہی تھی کہ آر۔سی۔ڈی میں کسی اور ملک کی شمولیت کے ضمن میں یہ دیکھنا ہوگا کہ جو ملک اس ادارے میں شمولیت کا خواہاں ہے آیا وہ امن پسند مجر ہے۔

اس کافرنس میں جو دیگر فیصلے کئے گئے ان میں سے اہم یہ ہیں۔

(۱) آر۔سی۔ڈی ممالک کو دس سال کے عرصے کے اندر اندر آزاد تجارتی علاقہ بنا دیا جائے۔

(۲) صنعت، زراعت، ٹیل اور ٹیل کی مصنوعات، تجارت،

بینکاری، بیمہ کاری، سیاحت، ٹرانسپورٹ، مواصلات، فنی تعاون، پبلک ایڈمنسٹریشن، ثقافتی اور ابلاغ عامہ کے میدانوں میں موجودہ تعاون کو اور وسعت دی جائے۔

(۳) آر۔سی۔ڈی جہاز ران کمپنی کا قیام عمل میں لایا جائے اور تینوں ممالک کے درمیان جہاز رانی کے راستے میں جو دشواریاں حائل ہیں وہ دور کی جائیں۔

(۴) مختلف شعبوں میں ہمزمنوں کی علاقائی مانگ کے پیش نظر تین تربیتی مراکز قائم کئے جائیں۔ ان میں سے سائنس اور ٹیکنالوجی کا ادارہ ایران میں اکنامکس (اقتصادیات) کا

ترکی کے مشہور شہر ازمیر میں آر۔سی۔ڈی (علاقائی تعاون برائے ترقی) کے ممبر ممالک کے سربراہوں کی حالیہ کانفرنس میں علاقائی تعاون برائے ترقی کے پروگراموں پر بدلتے ہوئے عالمی حالات کی روشنی میں غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لئے ممبر ممالک ایک عہد نامہ کریں گے جسے ”عہد نامہ ازمیر“ کا نام دیا جائے گا۔ اس عہد نامے کا مسودہ تین ماہ کی مدت کے اندر اندر تیار ہو کر تینوں ممبر ممالک کے دستخطوں کے لئے پیش کر دیا جائے گا۔

آر۔سی۔ڈی میں جو وسعت اس معاہدے میں ملحوظ رکھی گئی ہے اس کا اندازہ وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کا وہ مضمون فراہم کرتا ہے جو ازمیر کانفرنس سے قبل اخبارات میں شائع ہوا تھا اور دوسرا ترکی وزیر خارجہ جناب احسان صابری کا وہ اخباری بیان ہے جو آپ نے کراچی میں گذشتہ سال نومبر کے مہینے میں دیا تھا آپ نے اپنے بیان میں کہا تھا آر۔سی۔ڈی ممالک کی مشترکہ دفاعی صنعتوں کی بنیاد پہلے ہی رکھی جا چکی ہے۔ آپ نے آگے چل کر اپنے بیان میں یہ بھی فرمایا تھا کہ ایک ملک کے دفاعی کام کی ذمہ داری کسی غیر ملکی ٹھیکیدار کو نہیں سونپی جا سکتی۔ اپنے بیان میں جناب احسان صابری

وقت بہت زیادہ ہے اور یہ ممالک دیگر ملکوں کے ساتھ اپنے
روایتی اقتصادی تعلقات جاری رکھ کر بھی ایک دوسرے کے
ساتھ مشترکہ صنعتی، فنی، تجارتی، مواصلاتی، معاشی اور ثقافتی
میدانوں میں رابطے قائم رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ جو خواب بارہ سال
قبل دیکھا گیا تھا وہ آہستہ آہستہ شرمندہ تعبیر ہو رہا ہے اور وہ
منصوبے جو بہت حد تک خیالی تصور ہوتے تھے اب عملی جامہ
پہن رہے ہیں۔

گو اس ادارے کو گزشتہ برسوں میں کافی وقتوں کا سامنا
رہا اور یہ قابل قدر ترقی کرنے سے قاصر رہا۔ تاہم ممبر ممالک نے
اسے تمام ضروری مدد اس لئے بہم پہنچائی کہ انہیں پتہ چل گیا تھا
کہ یہ ادارہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کی پوری
اہلیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی بات کے پیش نظر تینوں ممبر ملکوں
کی حکومتوں کی وزارتوں کو نسل کے نمائندوں نے اپریل ۱۹۷۲ء
میں اپنے مشترکہ اعلامیہ میں اس ادارے کی مقصدیت اور افادیت
پر پوری تسلی کا اظہار کیا اور کہا کہ عالمی اقتصادی میدان میں
اہم اور دؤر رس ترقی کے پیش نظر اس ادارے کو اور مستحکم
بنانے کے لئے تمام ضروری اقدامات کئے جائیں۔ چنانچہ وعدہ
کیا گیا کہ مشترکہ صنعتیں لگائے۔ فنی ماہرین کے تبادلوں، مواصلاتی
نظام اور بین علاقائی تجارت کے سلسلے میں ایک دوسرے پر انحصار
اور تعاون کو مزید فروغ دیا جائے گا۔

صنعتوں کا قیام

صنعتوں کے قیام کے سلسلے میں اس بات کو پیش نظر رکھا گیا
تھا کہ سبید پرز کی صورت ایسی صنعتیں قائم کی جائیں جو تینوں ممالک
کی ضروریات پوری کریں اور ان کی منصوبہ بندی کرتے وقت
یہ خیال رکھا جائے کہ ان صنعتوں میں سے کوئی بھی دوسرے پن
کا شکار نہ ہونے پائے تاکہ ہر ممبر ملک اقتصادی طور پر مضبوط بھی

اسکول اسلام آباد (پاکستان) میں اور سیاحت اور ہوٹل کی
انتظامیہ کا ادارہ ترکی میں قائم کیا جائے۔ ان کے علاوہ
اسلام آباد (پاکستان) میں ایک سائنس فاؤنڈیشن بھی کھولا
جائے گا جو ممبر ملکوں کو زیادہ سے زیادہ ہنرمندوں اور
ماہرین کی مطلوبہ تعداد مہیا کرے گا۔

(۵) ثقافتی اور دوستانہ وفدوں کے تبادلوں کو فروغ دینے
کے لئے ایک یوتھ فاؤنڈیشن قائم کیا جائے۔

(۶) تینوں ممبر ممالک کے مرکزی بینک اپنے اپنے ملک کے
برآمدی تاجروں کو ممبر ممالک کے درمیان برآمدات کے
لئے قرضوں کی سہولتیں فراہم کریں اور۔

(۷) سفر کی سہولتوں کے پیش نظر شاہراہ آر۔ سی۔ ڈی کی
تعمیر و ترقی اور تینوں ممالک کو ملانے والی ریلوں کے
نظام کو اڈیت کا درجہ دیا جائے۔

علاقائی تعاون برائے ترقی کا ادارہ

علاقائی تعاون برائے ترقی یا آر۔ سی۔ ڈی کا ادارہ جو اہ جولائی
۱۹۷۴ء کو استنبول میں ترکی، ایران اور پاکستان کے سربراہوں کی
کانفرنس کے موقع پر وجود میں آیا۔ دراصل ان تینوں ممالک کے
باشندوں کی دلی خواہش کا نتیجہ ہے۔ اور یہ خواہش کوئی سیاسی
خواہش نہ تھی بلکہ مقصد یہ تھا کہ چونکہ یہ تینوں ممالک جغرافیائی،
تاریخی، ثقافتی، مذہبی اور تمدنی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں اس
لئے یہ مشترکہ طور پر ایک ایسی تنظیم بنالیں جو ان کی ترقی کے لئے
اقتصادی، معاشی اور ثقافتی میدانوں میں موثر علاقائی تعاون کی
حاصل ہو۔ چنانچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب یہ ادارہ ایک
اہم، فعال اور طاقتور ادارہ بنتا چلا جا رہا ہے جس کا مستقبل نہایت
درخشندہ اور تابناک ہے۔ گزشتہ بارہ برسوں کے دوران اس کی
کارگزاری سے یہ ثابت ہوا ہے کہ آر۔ سی۔ ڈی ممالک کی اقتصادی

ایران کے ساتھ فروری ۱۹۷۵ء کے ایک معاہدے کے تحت پاکستان میں کپڑے، اکھاڑ اور سینٹ کے مشرکہ بڑے بڑے کارخانے بھی قائم کئے جا رہے ہیں۔

تیل اور تیل کی مصنوعات

تیل اور تیل کی مصنوعات کے میدان میں تینوں ملکوں کے تعاون کو اہمیت دی گئی تھی مگر اس ضمن میں لا تعداد پیچیدگیوں اور دشواریوں کے پیش نظر ابھی تک یہ معاملہ گفت و شنید اور وضاحتوں تک محدود ہے۔ دراصل اس صنعت میں تینوں ممالک میں مشترکہ تیل کی دریافت اور اسے کام میں لانا۔ تیل صاف کرنے اور تیل کی مصنوعات کے مشترکہ کارخانے لگانا اور اسے تقسیم کرنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لانا پہنچانا اور منڈی میں پہنچانا شامل ہیں اس لئے اس صنعت کے منصوبوں کو ابھی تک عمل شکل نہیں دی جا سکی۔

پاکستان میں گلیسرین کا جو کارخانہ کام کر رہا ہے اس کی پیداوار ترکی درآمد کر رہا ہے۔ ترکی کا ڈوڈی۔ سیل بینزین کا کارخانہ ۱۹۷۴ء سے پیداواری دور میں داخل ہے اور یہی حال ترکی کے پولی تھین کے کارخانے کا ہے۔ ایران میں سیاہ کاربن کا کارخانہ بھی پیداواری دور میں داخل ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ کپرو کیلیم پولی بوتھاڈین ربڑ۔ ایرو میٹکس (خوشبو یا ت) اور پلاسٹک سائیزر کے کارخانے ایران اور ترکی میں آئندہ چند برسوں تک کام شروع کر دیں گے۔

اس صنعت کے سلسلے میں کچھ اور پہلوؤں سے کامیابی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ممبر ملکوں کی سرحدوں پر موٹے گاڑیوں اور موٹی جہازوں کے لئے تیل حاصل کرنے کے سٹیشن قائم ہو چکے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ تیل اور تیل کی مصنوعات کے ماہرین اور تربیت حاصل کرنے والوں کے تبادلے بھی تینوں ملکوں میں تسلی بخش حد تک ہو رہے ہیں۔ تیل

ہو جائے اور غیر ملکی قرضوں پر اس کا انحصار بھی کم ہو جائے۔ اسی اصول کے تحت ایسی کئی پیماس مشترکہ صنعتیں لگانے کی منظوری دی گئی۔ ان میں سے ۱۸ صنعتیں اب پیداواری دور میں داخل ہو چکی ہیں۔ ان ۱۸ میں سے ۹ صنعتیں پاکستان میں قائم کی گئیں، اور باقی ترکی اور ایران میں۔ جو صنعتیں پاکستان میں لگائی گئیں وہ یہ ہیں:-

- ۱- کرنسی نوٹوں کے نئے کاغذ کا کارخانہ۔
 - ۲- بال بیرنگ بنانے کا کارخانہ۔
 - ۳- تیل بنانے کا کارخانہ۔
 - ۴- شاک ایسورر برہنگوں کا کارخانہ۔
 - ۵- مشینی اوزار بنانے کا کارخانہ۔
 - ۶- گاڑیوں کے گیر بجس اور ڈیفینش بنانے کا کارخانہ۔
 - ۷- یو ری فارمل ڈی ہائیڈ کا کارخانہ۔
 - ۸- میتھونال اور گلیسرین بنانے کا کارخانہ۔
- جو کارخانے ترکی اور ایران میں قائم کئے گئے وہ یہ ہیں:-
- ۱- المونیم کا کارخانہ۔
 - ۲- ٹنگسٹن کار ہائیڈ بوریکس اور بورک ایسڈ بنانے کا کارخانہ۔
 - ۳- سینٹری فیوگل پیش فلڈ بنانے کا کارخانہ۔
 - ۴- ہائی ٹینشن انسولیٹرز کا کارخانہ۔
 - ۵- ٹیٹر اسائیکلین بنانے کا کارخانہ اور کئی ایک دوسری صنعتیں ان کے علاوہ متعدد ایسے صنعتی منصوبے ہیں جن کا قیام اصولی طور پر منظور کیا جا چکا ہے اور ابھی پیداواری دور میں داخل نہیں ہوئے یا ان کے متعلق ابھی گفت و شنید جاری ہے۔
- متذکرہ بالا صنعتی منصوبے پیداواری دور میں داخل ہو چکے ہیں اور ان کی پیداوار کے تبادلے ممبر ممالک میں پہنچنے شروع ہو گئے ہیں۔

جولائی، اگست ۱۹۷۶ء

خاص شعبوں میں تحقیق کے لئے مینیجروں اور عملے کو ضروری تربیت دی ہے۔

سلسلہ مواصلات

آر۔ سی۔ ڈی کے تینوں ممبر ملکوں کو آپس میں ملانے کیلئے ایک شاہراہ پر کام شروع کیا گیا تھا جو اب قریب قریب مکمل ہو گئی ہے۔ اس شاہراہ کی کل لمبائی ۷۷۱ کلو میٹر یا ۲۴۵۳ میل ہے ایران میں اس شاہراہ کی لمبائی ۲۶۵۶ کلو میٹر (۱۶۶۳ میل) پاکستان میں ۳۱۷ کلو میٹر (۸۰۰ میل) اور ترکی میں ۲۰۶ کلو میٹر (۱۲۸ میل) ہے۔ تجارتی نقطہ نگاہ سے یہ شاہراہ بڑی اہمیت کی حامل ہے اور اس کے مکمل ہونے سے آر۔ سی۔ ڈی کے تینوں ممبر ملک ایک دوسرے کے اور قریب ہو جائیں گے۔

ریلوے لائن

اس شاہراہ کے علاوہ ۵۵۰۰ کلو میٹر (۳۴۲۲ میل) لمبی ریلوے لائن بھی آر۔ سی۔ ڈی کے ممبر ملکوں کو آپس میں ملانے لگی۔ اس ریلوے لائن کا ایران میں صرف ۶۰۰ کلو میٹر (۳۷۲ میل) لمبا ٹکڑا بننا ابھی باقی ہے جو اہمیت ۱۰۰ گنا تک مکمل ہو جائے گا۔ اس کے مکمل ہو جانے پر یہ ریلوے لائن صرف بین الاقوامی سفر اور سامان کی ترسیل کے لئے سہولتیں بہم پہنچائے گی بلکہ ایشیا، افریقہ اور مواصلاتی نظام سے بھی جاملے گی اور اس طرح مشرقی ایشیا سے روانہ ہو کر خشکی کے راستے یورپ اور یورپی منڈیوں تک رسائی ہو جائے گی۔

ہوائی رابطہ

گو موجودہ صورت میں ان تینوں ملکوں کی قومی ہوائی کمپنیوں نے ایران انیر۔ پی۔ آئی۔ اے اور ٹی۔ اے۔ ڈی کے درمیان محدود قسم

اور تیل کی مصنوعات کی صنعت کے متعلق تینوں ممالک میں معلومات کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ایران کی نیشنل آئیل کمپنی کرود آئیل کی بین الاقوامی فروخت میں اپنی سالانہ فروخت کی پالیسیوں کے طے ہو جانے پر پاکستان اور ترکی کو اولیت دے گی۔ اسی سلسلے میں ترکی تک تدریجی گیس کی پائپ لائن بچھانے کے لئے بھی حالات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

تجارت

تجارتی میدان میں بد قسمتی سے کوئی ترقی نہیں ہوئی حالانکہ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ آر۔ سی۔ ڈی کا ایوان تجارت و صنعت آر۔ سی۔ ڈی کی جائزہ دانی کمپنیاں اور آر۔ سی۔ ڈی کی مشترکہ بیمہ کمپنیاں قائم کی جائیں گی اور آر۔ سی۔ ڈی کے تجارتی معاہدے وغیرہ کئے جائیں گے۔ آر۔ سی۔ ڈی کی علاقائی تجارت تینوں ممبر ممالک کی عالمی تجارت کا صرف ۲ فیصد رہی۔ چنانچہ جب علاقائی تجارت اور اقتصادیات کے وزیروں کی میٹنگ ستمبر ۱۹۶۸ء میں ہوئی تو یہ معاملہ UNCTAD کے حوالہ کیا گیا اور جب مئی ۱۹۷۱ء میں ازبکستان میں علاقائی سربراہوں کی کانفرنس ہوئی تو اس میں متعلقہ علاقائی وزیروں کو ہدایات دی گئیں کہ وہ سبلہ از جلد ایسے اقدامات کریں جن سے کسٹم وغیرہ کی پابندیوں اور مشکلات کو کم کیا جاسکے۔

بیمے کا مشترکہ نظام

بیمے کے مختلف شعبوں میں ۱۹۷۳ء تک ۴۴ کمپنیوں کا اشتراک عمل میں آچکا تھا جن کی سالانہ بیمہ اقساط کی آمدنی ڈیڑھ کروڑ ڈالر تک تھی۔ اس کے علاوہ آر۔ سی۔ ڈی کے بین الاقوامی سکول نے جو سلسلہ میں قائم ہوا تھا خاص

کے مواصلاتی سیاروں کا شیڈن اس سال کام شروع کر دے گا تو علاقائی مواصلاتی نظام مزید فعال اور کارآمد ہو جائے گا۔ علاقائی تار اور ٹیلی فون کے پیغامات کے لئے رعایتی شرح مقرر ہے۔

فنی تعاون

فنی تربیت۔ ماہرین کے تبادلوں اور طلباء کے وظائف کے سلسلے میں بھی تسلی بخش تعاون کا مظاہرہ ہوا ہے۔ دراصل آر۔سی۔ ڈی کے تعاون کے پروگرام کی بنیاد ”اپنی مدد آپ“ اور اقتصادی ترقی کے لئے علاقائی وسیلوں پر انحصار کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ لہذا اب تک اس پروگرام کے تحت ۱۶ فنی ماہرین کو کان کنی۔ زراعت۔ صنعت۔ سائنس۔ صحت اور دیگر مختلف شعبوں میں تربیت دی جا چکی ہے۔ اس کے علاوہ ۶۸ ماہرین نے ممبر ملکوں کی اپنے اپنے شعبوں میں مدد کی اور ۱۰۰ وظائف پوری کئے گئے۔ اب تک اس پروگرام کے تحت ۴۵ سیمینار منعقد کئے جا چکے ہیں۔ اس میدان میں آر۔سی۔ ڈی کی علاقائی مشاورتی کونسل برائے سائنس و ایٹمی ریسرچ نے بھی تینوں ملکوں کے درمیان تعاون بڑھایا ہے اور تینوں ملکوں کی ایٹمی توانائی کی تنظیموں کے سربراہوں کی میٹنگ سے اس تعاون میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

اسی طرح ثقافتی، سماجی اور ابلاغ عامہ کے میدانوں میں بھی آر۔سی۔ ڈی کے طے شدہ پروگراموں کے تحت خاصا تعاون ہوا ہے اور کھیلوں کے سلسلے میں بھی تعاون کی رفتار کافی حد تک تسلی بخش رہی ہے۔

آر۔سی۔ ڈی کا تنظیمی ڈھانچہ

آر۔سی۔ ڈی کے ڈھانچے کے اہم اور بڑے ادارے یہ ہیں۔

(۱) وزارت قونسل۔ (۲) علاقائی منصوبہ بندی کی کونسل۔

التعاون جاری ہے تاہم سامان کے رسد کے سلسلے میں ایک مشترکہ ہوائی کمپنی کا قیام ضروری ہے۔ اس ضمن میں اقوام متحدہ کے ایک ماہر کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جس نے اپنی رپورٹ جلد مرتب کر کے آر۔سی۔ ڈی کے ایکٹریٹ کو پیش کر دی ہے۔

جہاز رانی

آر۔سی۔ ڈی کے لئے ایک جہاز ران کمپنی ”آر۔سی۔ ڈی شپنگ کورپوریشن“ کا قیام جولائی ۱۹۷۷ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ اس میں پاکستان کے ۴۴ فیصد حصص ہیں اور ایران اور ترکی کے اٹھائیس فیصد شپنگ کورپوریشن اب تک قریباً تمام بڑی بڑی علاقائی جہاز ران کمپنیاں شامل ہو چکی ہیں۔ اس کے جہاز ممبر ملکوں کے درمیان چلنے کے علاوہ امریکی راستوں پر بھی چلتے ہیں۔ کورسز کے اندر تینوں ممالک کی جہاز ران کمپنیوں کا تعاون قابل تائید ہے۔ اب جبکہ نہر سوئز کھل گئی ہے اس کا مستقبل زیادہ متاثر ہو گیا ہے۔

ڈاک اور تار کا نظام

تینوں ممالک کے ڈاک اور تار کے محکمے ایک دوسرے سے پورا پورا تعاون کر رہے ہیں اور علاقائی ڈاک کے لئے خاص شرح مقرر ہے۔ علاقائی ہوائی جہاز کمپنیوں کے ذریعہ ڈاک کی ترسیل زیادہ سے زیادہ ہو رہی ہے۔ علاقائی ڈاک کے محکموں کا آپس میں رابطہ رہتا ہے۔ بعد اب ایک علاقائی پوسٹل یونین بنانے کا معاملہ بھی زیرِ غور ہے علاقائی ڈاک اور تار کی انتظامیہ ہر سال ۲۱ اپریل کو آر۔سی۔ ڈی کے ڈاک کے یادگاری ٹکٹ جاری کر کے اس ادارے کی سالگرہ مناتی ہے۔

ستھران کا بین الاقوامی مائیکرو ویو کنٹرول سینٹر تسلی بخش طور پر کام کر رہا ہے اور پاکستان کے مواصلاتی سیاروں کے شیڈن کی خوش اسلوبی سے استعمال میں لائے جا رہے ہیں۔ جب ترکی

جولائی، اگست ۶۶ء

رابطہ قائم رکھتی ہے یہ کمیٹی علاقائی منصوبہ بندی کو
کی رپورٹوں کے وزارت کو نسل کے فیصلوں کے اور
مشترکہ اعلامیوں کے مسودے تیار کرتی ہے۔

۴۔ آر۔ سی۔ ڈی کی خاص خاص شعبوں کے لئے
ہیں اور ان کی ذمہ داریوں کے متعلق ان کے ناموں سے
پتہ چل سکتا ہے۔ مثال کے طور پر صنعتی کمیٹی - تجارتی کمیٹی
وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ آر۔ سی۔ ڈی کے سیکریٹریٹ کا مستقل قیام نھرن
ہے۔ اس کے سیکریٹری جنرل کی تقرری تینوں ممبر ملکوں
رسمندی سے ہوتی ہے۔ ہر تین سال کے بعد نئے سیکریٹری
جنرل کی نامزدگی کی جاتی ہے۔ ہر ممبر ملک ایک ایک
سیکریٹری جنرل اور دو ڈائریکٹروں کا تقرر کرتے
اس سیکریٹریٹ کے موجودہ عملے میں ایک سیکریٹری جنرل
تین ڈپٹی سیکریٹری جنرل اور چار ڈائریکٹر ہیں۔ جو
سیکریٹری جنرل ڈاکٹر احمد مینائی ہیں جو ایران
منجھے ہوئے سفارتی عہدیدار ہیں۔ آر۔ سی۔ ڈی
کا رگزارسی کی سالانہ رپورٹ بھی سیکریٹریٹ مرتب
کرتا ہے۔

(۱۱) آر۔ سی۔ ڈی کی کمیٹیاں۔

(۱۲) آر۔ سی۔ ڈی سیکریٹریٹ۔

(۱۳) آر۔ سی۔ ڈی ماہرین کی ایجنسیاں مثلاً

(۱۴) ثقافتی انسٹیٹیوٹ۔

(۱۵) بیمہ کاری کا مرکز۔

(۱۶) شپنگ سروسز

۱۔ آر۔ سی۔ ڈی کا سب سے بڑا اور آخری فیصلے کرنے والا
ادارہ وزارت کو نسل تینوں ممبر ملکوں کے خارجہ امور کے
وزراء پر مشتمل ہوتا ہے۔ عام حالات میں اس کو نسل کا
اجلاس ۶ سے ۹ مہینوں کے اندر بلا یا جاتا ہے۔ اجلاس
کے لئے جگہ کا تعین باری باری ہر ممبر ملک میں
ہوتا ہے۔

۲۔ علاقائی منصوبہ بندی کو نسل تین ممبروں پر مشتمل ہوتی
ہے جو تینوں ممالک کے منصوبہ بندی کے سربراہ ہوتے
ہیں۔ یہ اپنی سفارشات وزارت کو نسل کو پیش کرتی
ہے اور اس کا اجلاس وزارت کو نسل کے اجلاسوں سے
قبل ہوا کرتا ہے۔

۳۔ رابطہ کمیٹی

یہ کمیٹی آر۔ سی۔ ڈی کی مختلف کمیٹیوں کے درمیان



اُردو قصیدہ نگاری کے ارتقاء کا مختصر جائزہ

آغا سہیل

اقبال کرم می گزرد ارباب ہم را
ہمت نغور و میشترو لا و نعم را
بے برگی من داغ نہد در دل سامان
بے مہری من زرد کند روے دم را

کے نغے الاپتا رہا۔ اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ اُردو میں اُردو
عرفی پیدا نہ ہو سکا۔ دکن میں نصرتی کے علاوہ اور کسی شاعر کے
قابل ذکر قصائد نہیں ملتے، شمالی ہند میں سودا نے قصیدے کی
طرف توجہ کی اور اپنے پر شکوہ، مہتمم با شان اور بانگے انداز بیان
کی خوب داد و صول کی، اس میں شک نہیں کہ الفاظ کی رد و بدلہ
اور پر شکوہ لغات اور اس کے گستاخ کے استعمال میں سودا
کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی وہ خود کو عرفی عصر بھی سمجھتے تھے
لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرفی کا سادہ فہم اور عرفی کا مزاج ان کو یہ
نہ تھا۔ وہ محض نقل پر قادر تھے سودا ہی کرتے رہے اور عرفی کی شخصیت
زمینوں میں قصائد لکھتے رہے مگر وہ طعرات جو عرفی کی شخصیت
کا جز تھا سودا کو میسر نہ تھا۔ سودا کا مشہور قصیدہ

اٹھ گیا بہمن دوسے کا چمنستان سے عمل
تیغ اُردی نے کیا ملک خزاں متاصل

اُردو میں قصیدہ نگاری کی تاریخ اتنی شاندار نہیں ہے
جس قدر کہ فارسی ادب کی ہے۔ کیونکہ آئرانہ نظام حکومت اور
آئرانہ طعرات کو ایران سے ایک خاص نسبت رہی ہے تاہم ہرگز
میں بھی فارسی قصیدہ گو شعراء کی کمی نہیں۔ اکبر اور جہانگیر کے دربار
میں عرفی اور نظیری کے علاوہ بھی ایسے ایسے شعراء ملتے ہیں کہ جو
فی البدیہہ قصیدے لکھنے میں اور ارتجالاً شعر کہنے میں اپنا ثانی نہ
رکھتے تھے۔ نظیری اور عرفی کے باہم مقابلے ہوتے تھے تو قصیدہ
نگاری کی ایک فضا پیدا ہو گئی تھی۔ عرفی نے قصیدے میں ایک
واقع مقام بنالیا اور وہ سر دربار ایسے ایسے قصائد پڑھتا تھا کہ
اہل دربار انگشت بدندان رہ جاتے تھے۔ عرفی کے قصیدے میں
ممدوح عموماً سرور کوئین کی ذات بابرکت ہوتی یا حضرت علی ممدوح
ہوتے اگر کسی آمر مطلق کی شان میں قصیدے لکھنے کی نوبت آتی
جاتی تو اسے ہرگز ممدوح نہ بنانا بلکہ معشوق بنا کر پیش کرتا، اور
اگر دس اشعار ممدوح کی شان میں کہتا تو بیس اشعار پہلے اپنی
شان میں کہہ لیتا۔ تسکینِ نوحہ کا یہ انداز باغیانہ اور متکبرانہ سمجھا
جاتا تھا لیکن اکبر اور جہاں گیر نے کبھی عرفی کی اس شاعرانہ کجلائی
سے تعرض نہ کیا اور عرفی بدستور

عرفی کی زمین میں ہے لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ دونوں کا مقابل ایک فضول اور بھل سا خیال ہے یا غفلانہ خوش فعلی، کیونکہ عورتی نے قصیدے کے معروضی مزاج کو داخل اور درونی بنایا اور اسے اپنے واردات قلب کو بیان کرنے کا وسیلہ قرار دیا، سودا کا مزاج معروضی تھا۔ داخلیت وہ اس میں داخل نہ کر سکے جس کے سبب عرفی نے قصیدے کو بحیثیت صنف ادب کے کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا ذوق نے بھی سودا کا اتباع کیا اور زیادہ تر انہیں کی زمینوں میں قصائد لکھے، مجاہد سے اور روزمرہ کے بیان میں یدِ طولیٰ حاصل کیا مگر سودا کے فن کی بازگشت کے سوا اور کچھ ذوق کے فن قصیدہ نگاری میں خاص جذب و کشش نظر نہیں آتی، غالب نے جو ذوق کے ہم عصر بھی تھے اور ظفر کے دربار سے وابستہ تھے اپنے ڈھنگ اور اپنے مزاج پر قصائد کا طور باندھا، کچھ سودا اور عرفی محو طوطا رکھا لیکن ان کے قصائد میں رنگ غزل جھلکتا رہا البتہ فارسی میں غالب کے قصائد ایک خاص طعنہ رکھتے ہیں۔

منیر شکوہ آبادی، امیر دینائی، جلال لکھنوی اور تسلیم وغیرہ کے قصائد و ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں لیکن یاد رہے کہ سودا، ذوق اور غالب کے زمانوں میں پھر بھی بادشاہت قائم تھی بار بار موجود تھے اور جاگیر داری نظام کا وہی شان و شکوہ تھا اس لئے قصیدے کی صنف کسی حد تک نہ گئی، منیر، امیر، جلال اور تسلیم وغیرہ کے زمانے میں برٹے نام بھی بادشاہت نہ تھی، اگر تھی تو وہ سات معزز اہل تھی اور یہاں محض اس کے نمائندے موجود تھے جن کے مغربی خدم و ہشم مشرقیت کو بار نہ ہانے دیتے تھے۔ نیز یہ کہ جاگیر داروں کا حال بھی متحان کے دلائل یا لگان و باداریوں کے متحمل نہ تھے تاہم چھوٹی موٹی مولیٰ ریاستوں سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ ان شعراء کی پذیرائی میں کرتی تھیں۔ لیکن جو کچھ کرتی تھیں وہ بقدر سدرت کا درجہ رکھتا تھا، اسی راج محسن کوردی، صنی لکھنوی، عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی، نجم آفندی، زمر دہلوی اور جمیل مظہری وغیرہم نے بھی قصائد لکھے اور اس

صنف کو زندہ رکھنے کی سعی کی لیکن چونکہ ان شعراء کے قصائد میں بیشتر روحانی تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر میر بنائے ارادت و عقیدت نعت اور منقبت کے مضامین باندھے گئے۔ اس لئے قصیدے کی صنف ایک طرح سے معدوم ہونے لگی۔ ان تمام شعراء نے حضور سرور کائنات کی شان میں نعتیہ اور حضرت علی کی شان میں منقبتیہ قصائد لکھ کر ہر چند کہ فنی مہارت کا ثبوت بہم پہنچایا۔ لیکن قصیدے کی صنف میں جب دنیاوی ممدوح کے اوصاف کے بیان میں مبالغے اور غلو سے کام لیا جاتا تھا اور ضائع لفظی و معنوی کا بے دریغ استعمال ہوتا تھا تو شاعر کا کمال کھلتا تھا اور اس کے جوہر نظر میں آتے تھے۔ عقیدت و ارادت کی فضا خواہ کتنی ہی مقدس کیوں نہ ہو اس فضا میں کہنے اور سننے والے کے لئے جو جبر کا پہلو نمایاں ہے وہ دراصل اس کے بیان کے عجز کا پہلو ہے۔ پاکستان میں بھی بعض مرثیہ گو شعراء نے قصیدے سے رجوع کیا ہے اور ان میں بعض کا ذکر کیا جاسکتا ہے لیکن بجائے خود صنف قصیدہ میں بطور خاص کوئی بھی قابل ذکر نہیں ہے کیونکہ ان سب نے جزوی حیثیت سے قصیدے کے خال خال اوصاف میں اکادکا اشعار کہہ لیئے ہیں بجائے خود صنف کو مفروضہ شکل میں استعمال نہیں کیا۔

بناوٹ یا بنیت میں قصیدہ غزل کی صنف سے مختلف نہیں ہے لیکن مراحل اس کے پانچ اہم اجزاء قابل توجہ ہوتے ہیں جنہیں مطلع، تشبیب یا تمہید، گریز، مدح اور انکسار مدحا اور دعا کہتے ہیں، دعا پر خاتمہ کلام ہوتا ہے۔ عام طور پر تشبیب کے اشعار بہاریہ یا شہابیہ ہوتے ہیں یعنی شاعر یا تو بہار سے تشبیب کا آغاز کرتا ہے یا شباب کے مضامین نظم کرتا ہے۔ تشبیب کا حصہ جس قدر شاندار ہوتا ہے قصیدے کی ساخت اسی قدر اچھی اور اس کی اٹھان اتنی ہی دلچسپ ہوتی ہے مثلاً سودا کا مشہور قصیدہ جس کا مطلع اوپر درج کیا گیا کہ:

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستان سے عمل
یتخ اُردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

بہت جاندار ہے کیونکہ آگے چل کر بہار کا جس طرح ذکر
یہ ہے وہ اپنی جگہ مکمل بھی ہے اور بجائے خود صنائع و بدائع کے لحاظ
یہ سادہ توجہ بھی مثلاً صفت حسن تعلیل کے لحاظ سے یہ اشعار
ملاحظہ فرمائیے :

سجدہ شکر میں ہے شاخِ ثمرِ داد ہر ایک
دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عز و جل
واسطے خلعتِ نور و زکے ہر باغ کے بیج
آبجو قطع لگی کرنے روشش پر مخمل
دوسرے اشعار میں صفت حسن تعلیل کے علاوہ بھی دوسری
عینیں قابلِ توجہ ہیں :

بخشتی ہے گلِ نورِ ستہ کی رنگ آمیزی
پوششِ چینٹ قلم کار بہرِ دشت و جبل
مکس نگین یہ زمیں پہ ہے کہ جس کے آگے
کارِ نقاشی مانی ہے دوم وہ اول
سایہ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر
سازِ لعل میں جوں کیجئے زمر و کحل
بار سے آبِ رواں عکسِ جہاں گل کے
لوٹے ہے ہرنے پہ ازیں کہ ہوا ہے بے کل
آبجو گرد چمن لہو خود رشید سے ہے
خطِ گلزار کے صفحے پہ ملائی سجدول
چشمِ زکس کی بعارت کے زلیں ہے درپے
غنجِ لالہ نے سرمے سے بھری ہے مکمل
لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں لیس
پاؤں گھمتی ہے صبا چمن میں گلشن کے سنبل

اس تشبیہ میں بہار کا زور ہے، سودا نے تشبیہ میں
مراعات بھی کی ہیں مثلاً رزمیہ بھی بیان کئے ہیں شجاع الدولہ
نے حافظ رحمت خاں کو شکست دی تو سودا نے قصیدے کی تشبیہ

میں رزمیہ لکھ دیا۔ یہاں تک بھی فینیت ہے لیکن بعض اوقات تعجیب
رو و کار قسم کی ہجو یہ منظومات کو بھی قصیدہ کہا گیا، سو غلط ہے،
کیونکہ ان کا نام قصیدہ رکھ دینے سے ان کا مزاج نہیں بدل سکتا
یہ صاف صاف ہجوئے کلام ہے۔ اس کی معروفیت ہر چند کہ تاریخی
معاشرتی پس منظر سامنے لاتی ہے اور واقعات پر نکتہ چینی کرتی ہے
لیکن یہ قصیدہ نہیں ہے اسے ہجو کے ذیل میں جگہ ملنا چاہیئے۔

سید انشاء اللہ خاں انشاء نے بھی سعادت علی خاں کی شان
میں قصیدے لکھے لیکن ان میں وہ طنز وہ شکوہ اور وہ متانت
نہیں ہے جو ہونا چاہیئے۔ ذوق نے لائقِ قضاوند لکھے اور انہیں
قضاوند کے بل بوتے پر غالب سے نکتہ واں شاعر سے ٹکرتی اور
اپنا لوہا منوایا، تہنیتِ حسن نور و زکے تشبیہ میں وہی دم خم ہے جو
سودا کی بہار یہ تشبیہ کا حصہ ہے۔ پہلے مطلع ملاحظہ فرمائیے :

دہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر
حیاں ہو سامہ سے تحریرِ نغمہ مانے مریر
زماں سے ذکر اگر چھیر ٹیئے تو پیدا ہو
نفس کے تار سے آوازِ خوشتر از ہم وزیر

اب تشبیہ ملاحظہ کیجئے :

ہوا یہ باغِ جہاں میں شگفتگی کا جوش
بکلیدِ قفل و دل تنگ، و خاطرِ دل گیر
کرے ہے دا، لبِ غنچہ در ہزار سخن
چمن میں موجِ تبسم کی کھول کر نجیر
کچھ، بسا لہوئے چمن سے دور نہیں
جو دا ہو غنچہ منقارِ بلسل تصویر
اثر سے بادِ بہاری کے ہلہاتے ہیں
زمیں پہ ہمسرِ سنبل ہے موجِ نقشِ حیر
نکل کے سنگ سے گر ہو شرارہ تخمِ فشاں
تو سبز، فیضِ ہوا ہے ہو وہ، برنگِ شہر

اور غلط تشبیہ ملاحظہ ہو

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرسیاہ

کہ جیسے سہائے کوئی پہلِ مست بے تخیل

ہر ایک خانہ پہ گل، ہر ایک سائے عیش

ہر ایک دشتِ جن، ہر چمن بہشتِ نظیر

ہر ایک قطرہ شبنم، گہر کی طرح خوش آب

ہر اک گہر، گہر شبِ چسپاں پر تنویر

اس حصے میں دوسرے اشعار بھی لائقِ توجہ ہیں کہ ان میں محاورے

اور روزمرہ کا مزہ ہے :

سنواری ہے جو شام اپنی زلفِ مشکیں کو

سوا دھنک ختن پر ہے لاکھ آہو گہر

ہمنے چراغِ تو ایسی ہنسی میں پھول بھریں

حیا سے رنگ گلِ آفتاب ہو تغیر

عجب نہیں ہے کہ آرائشِ زمانہ سے

حنائی پنچہ ہوں تاک و خیال و بیدارِ بخت

اسی قصیدے میں مطلعِ ثانی کے بعد ذوق نے علمِ نجوم

بہشتِ منق اور فلسفہ کی بعض اصطلاحات کو استادانہ اور عالمانہ

رنگ میں پیش کیا ہے اور ان سے رعایتِ لفظی و معنوی کے کمالات

دکھائے ہیں بعض مقامات پر سجعِ بندی سے بھی کام لیا ہے اور ریز

کا معنوں نہایت اہتمام سے ادا کیا ہے اور پھر لب و حکمت کی

اصطلاحات پر اپنی قدرت دکھائی ہے۔ علومِ مرتجع و متداولہ کا

دلنشین استعمال، ان کی اصطلاحات کا جی بھر کے ذکر کر کے کامیاب

اگر کسی صنفِ سخن میں مل سکتا ہے تو وہ صرف قصیدہ ہے۔ اور ذوق

نے ان مواقع کا خوب استعمال کیا ہے۔ گریز کے بعد مدح ہے اور

مدح کے شغایاب ہونے پر تہنیت دی گئی ہے اور علم کا زور

صرف کیا گیا ہے۔ مدح میں مبالغہ، غلو اور تملق کے معانی ہیں

لیکن حسنِ ادا کو ہاتھ سے نہیں ہالے دیا گیا ہے بلکہ خوبی اور

خوبصورتی کو ہر ہر پہلو سے نکھارا ہے ذرا مدح پر یہ اشعار بھی

ملاحظہ فرمائیے :

عجب نہیں یہ ہوا سے کہ مثلِ نبضِ صبح

کرے اگر حرکت موجِ چشمہ تصویر

شہنشاہِ ترے یمنِ شفا کے کامل سے

جو لا علاجِ مرض تھے وہ ہیں علاجِ پذیر

کہ چوب گل کو اگر ماریں بیدِ مجنوں پر

تو صورتِ بشر ہو شش مند خوشِ تقریر

اشارہ فہم ہو ایسا کہ وہ بیان کرے

نہاں برگ سے گونگے کے خواب کی تعبیر

یہ میل، کحلِ بصارت ہو ملکِ خطِ عیار

تو چشمِ دائرہ عین بھی ہو چشمِ بصیر

نہ برقِ کونپِ دلرز نہ ابر کو ہو ز کام

نہ آب میں ہو رطوبت نہ خاک میں تبخیر

بدل گئی ہے سلاوت سے تلخی دارو

شرابِ تلخ بھی ہے میکشوں کو شکر و شیر

قوتی ہے قوتِ تاثیر سے دوائے طبیب

غنی قبول کی دولت سے ہے دعائے فقیر

اور دوسرا قطعہ بند اسی سلسلے میں ملاحظہ ہو

شکستِ دل کو ترے یمنِ تندرستی سے ق

کرے درست اگر مومیا فی تدبیر

تو موئے کاسہِ پینی کو چارہ سازِ قضا

نکالے کاسہِ پینی سے مثلِ موئے غیر

کھجائے سرجو کھی مُفسدانِ سرکش کا

علاجِ خارشِ سر ہو، بنا خنِ شمشیر

بنا ہے نقشِ شفا خانہ ہزارِ شفا

ہر ایک خانہِ تعویذ صاحبِ تکبیر

ہر ایک اسم ہزیمت میں اسم اعظم ہے
ہر ایک نسخہ شفا میں ہے نسخہ اکیر

شہا ہے دم سے ترے زندگانی عالم
یہ تیرا دم ہے وہ مجاز عیسوی تاثیر
تو ہے وہ حامی دنیا و دین زمانہ میں
کہ تجھ سے زیبا ہے دنیا کو دین کی توقیر

کیا شہان سلف نے مسخر ایک جہاں
کئے ہیں تو نے شہنشاہ دو جہاں تخیل
سم سے شام ملک زرفشاں ہے پنجد مہر
نثار کرتا ہے ہر روز ایک گنجِ خیر

فلک پہ کرتا ہے ہر شب ادا جو سجد و شکر
نشان سجدہ ہے زیب جبین ماہ منیر
اسی طرح دم میں مطلع ثالث آتا ہے اور عقول عشرہ کے

حوالہ سے اصطلاحات فلسفہ کا سلسلہ چھڑھاتا ہے اور مدح جاری
رہتی ہے، ممدوح کے علم، حکمت اور تدبیر کے بیان کے بعد گھوڑے
اور ہاتھی تک کی تعریف کی جاتی ہے اور پھر اظہار مدعا اور دعا
کے بعد خاتمہ لیکن کمال یہ ہے کہ مطلع ادنیٰ سے لے کر مقطع تک
بہار کے مضامین کو نہیں چھوڑا۔ مرزا غالب کا ممدوح بھی وہی
ہے لیکن وہ قصیدے میں وہ اہتمام نہیں کرتے جس کو ذوقِ ضروری
سمجھتے تھے، پھر بھی حاذ بیت پیدا ہوتی ہے اور توجہ ان پر
مرکوز ہو جاتی ہے، ملاحظہ ہو۔

ہاں مہ نو، سنیں ہم اس کا نام

جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح

یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب

بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسمان نے بھار رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ عالم خواص

جبذا اے نشاطِ عام عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے
نلے کے آیا ہے عید کا پیغام

اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا، اگر سب نے جان لیا

ترا آقا اور ترا انجم
راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں تمام

گریز دیکھئے :

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں

ایک ہی ہے امید گاہِ انام

رعایت دیکھئے :

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش

غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام !

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو

تب کہا ہے بطرزِ استغنام

مہر تاباں کو ہو تو، اے ماہ

قرب ہر روزہ برسِ میلِ دوام

تجھ کو کیا پایہٴ روشناسی کا

جز جتِ قریب عید ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو

پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب لو کہہ
اے پری چہرہ پیک تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ نامیہ سا
ہیں مہر و زہرہ و بہرام
اب مدح ملاحظہ ہو:

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نام شاہنشاہ بلند مقام
قبلہ چشم و دل بہادر شاہ
منظر ذوالجلال والا کرام
شہسوار طریقتہ انصاف
نو بہار حدیقتہ اسلام
جس کا ہر فعل صورت اعجاز
جس کا ہر قول معنی الہام

بزم میں میزبان قیصر و جم
رزم میں استاد رستم و سام
یہ ابھی تک تمام تر مدح شخص غائب کی ہو رہی تھی اب
یہی شخص غائب شخص حاضر یا شخص مخاطب بن جاتا ہے گویا
قرآن حکیم کے سورہ حمد میں جس طرح اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے
کرتے براہ راست اس سے خطاب شروع ہوتا ہے وہی تکنیک
مدح میں غالب نے مدح کے لئے وضع کی ملاحظہ ہو:

اے ترا لطف زندگی افزا
اے ترا عہد فرخی فرجام
چشم بد دور خسروانہ شکوہ
لوحش اللہ عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے قیصر دم

جرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام

ماہ بن ماہتاب بن، میں کون
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
میرا اپنا جسد معاملہ ہے
اند کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص
گر تجھے ہے امید رحمت عام
جو کہ بختے گا تجھ کو فر فرودخ
کیا ندے گا مجھے مئے شگام؟

جب کہ چودہ منازل ملک
کر چکی قطع تیری تیزی گام
تیرے پر تو سے ہوں فروغ پذیر
کوئے و مشکوئے سخن و نظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا ایک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پر چل نکلا
تو سن طبع چاہتا تھا لگام
زہر غم کر چکا تھا میرا کام
تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
سے خواری کا سوا ملا حظہ ہو

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہو زلیت تلام
کعبے میں جا بجا میں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دینیں ہرام

اُس قدر کا ہے دور مجھ کو نقد
چرخ نے لی ہے جس سے گردش وام

چھپتا ہوں کہ ان کو قصہ آئے
کیوں رکھوں درہ غالب اپنا نام؟

دارت ملک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تور و خسرو بہرام
زور بازو میں ملتے ہیں تجھے
گیو و گورڈ و بیژن و رام
تیر و تلوار کی تعریف قطعہ بند کی صورت میں ملاحظہ ہو۔
مرجا موشگافی، تاوک
آفریں آبداری مصمم
تیر کو تیرے، تیر غیر ہدف
تیغ کو تیری تیغ خصم نیام
ممدوح کے ہاتھی اور گھوڑے کی تعریف قطعہ بند کی شکل
میں ملاحظہ ہو۔

رعد کا کر رہی ہے، کیا دم بند
برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیل گراں جسد کی صدا
تیرے رخش سبک عنان کا خرام
اور اسی طرح قطعہ بند کی صورت میں ممدوح کے قتل عام کا
سین طریقہ بھی ملاحظہ ہو۔
فن صورت گری میں تیرا گذر
گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام
اس کے مغروب کے سرفراز
کیوں نمایاں ہو صورت ارقام
اور اب ذرا قصیدے کے آخری اشعار ملاحظہ ہوں۔
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے یالی و ایام

اور ان اوراق میں بکلیک قضا

مجملًا مندرج ہوئے احکام

لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش
لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
آسمان کو کہا گیا کہ کہیں
گنبد تیز گرد نیلی فام
حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
خال کو دانہ، اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضع سوز و غم و دم و آرام
مہر رخشاں کا نام خسرو روز
ماہ تاباں کا اسم شمع شام
تیری توفیق سلطنت کو بھی
دی، بدستور، صورت ارقام
کاتب حکم نے بموجب حکم
اس رقم کو دیا طراز دوام
ہے ازل سے روائی آغاز
ہو ابد تک رسائی انجام
غالب نے ذوق سے ہٹ کر قصیدے میں بھی اپنی انفرادیت
قائم کی۔ اس چھوٹی سی مزمع بحر میں سادگی و پُر کاری موجود ہے
قصیدے کا اہتمام و انتظام وہ نہیں ہے جو ذوق کے یہاں
نظر آتا ہے نہ زبردستی کا اظہارِ ملیت ہے پھر بھی قصیدے میں
سجاویت ہے، حسن ہے، محاورے اور رد و مزہ کا مزہ بھی ہے
واقفیت بھی ہے، ضائع بھی ہیں خاص طور پر حسنِ تعلیل سے
بہت اچھا کام لیا گیا ہے اور پھر قصیدے کے تمام مرحلے موجود
ہیں کہ مطلع، تشبیب، اگریر، مدح، اظہارِ مدعا اور دعا سب اپنے
اپنے مقام پر وقیع ہیں۔

محمد حسین آزاد نے ذوق کے قصائد اکٹھا کر کے طبع کرائے
انہیں سرشاہ سلیمان نے دوبارہ مدون کیا اور ایک بار اسے پاکستان

ایک ادارہ سے ایک ادیب شہیر کے مقدمے میں کر کے طبع کروایا گیا، لیکن اپنی جگہ ہر پھر کر وہی بات رہی کہ سودا، ذوق، غالب، محسن کا کوروی، معنی لکھنوی، عزیز لکھنوی، میر شکوہ آبادی، جلال اور تسلیم وغیرہ نے ہر چند کہ اردو قصیدے کے تہذیبی سرمائے کا تحفظ کیا لیکن نہ تو اسے فارسی قصیدے کا ہمرہ بنا سکے اور نہ اس میں کوئی اضافہ کر سکے۔ خاص طور پر شعرائے متاخرین نے اس صنف میں قطعاً کوئی اضافہ نہیں کیا۔ نہ ہم کوئی قاتنی پیدا کر سکے نہ عرفی، پھر بھی سودا، ذوق، غالب نے اردو ادب میں اس صنف کو زندہ کر دیا ہے اور ہمارے ایک تہذیبی سرمائے کو زمانے کی دستبرد سے محفوظ کر دیا ہے۔

یہ زمانہ قصیدے کا نہیں ہے، اور نہ آئندہ و بعید آئندہ میں قصیدے کے زمانے کا اعادہ ممکن ہے، ممکن ہے کہ اس کی کوئی اور شکل منبغین ہو جائے تاہم اس قدر یاد رکھنا ضروری ہے کہ موجودہ زمانے کے اقدار اگر قصیدے کے جھوٹ مبالغے، غلو اور تملق کے منافی ہیں تو اس سے بھی بڑی لعنتیں سچ مچ ہمارے اس معاشرے کو محیط ہیں جن میں ”سچ“ اور ”حق“ کو بری طرح کچلا جا رہا اور انسانوں کے اس انبوہ میں ایک محشرستان برپا ہے ہر شخص نفسی نفسی کے کرب سے دوچار ہے اور روز بروز اپنی ذات کے

خول میں بند ہوتا جا رہا ہے اور یہ خول روز بروز تنگ اور تنگ تر ہوتا جا رہا ہے، قصیدے کی صنف معروضی ہے اور اگر کبھی کبھی بعض شعراء نے اس میں داخلیت کی جھوٹ بھی ڈالی ہے تو یہ محض ایک خوش رنگ عکس یعنی HADE ہے یا شخصیت کا پرتو ہے جس سے اس کی معروضیت کے اصل مزاج میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، یہ مہلک قسم کا گھٹن معاشرے کے رگ و پے میں لگتا جا رہا ہے۔ ہمارے اقدار کا یہ درخت متفرق نہ زمین پر ڈھیر ہوا سچا ہوتا ہے یہ گھٹن صنف قصیدے کے لئے بھی حاکم لیوا ہے کیونکہ اکبر اعظم اور جہاں گیر جیسے آدمیوں کے سامنے کلمہ حق، قصیدے کی شکل میں کہتے والا، کوئی کجکلامہ، کوئی عرفی پیدا نہیں ہوتا، تفصیح روزگار لکھنے والا کوئی سودا اب نہیں پیدا ہوتا، کوئی عرفی وقت بیاں نگ دہل سرور بار اس قسم کے اشعار نہیں پڑھنا کہ

اقبال کرم می گزد ارباب ہم را
ہمت نخورد نیشتر دلا و نعم را
بے برگئی من داغ نہد در دل سامان
بے مہری من زرد کند روی درم را



رشید الدین فضل اللہ

(دنیا کا سب سے پہلا مورخ)

سید رضا سعید

قومیں کیونکر وجود میں آئیں اور یہ دنیا مختلف ملکوں اور سلطنتوں میں کیسے تقسیم ہوئی؟ اس نے عرب کی تاریخ بڑی تفصیل سے بیان کی ہے اور رسول مقبول صلعم اور خلفائے راشدین کے بعد خلافت کے تفصیلی واقعات لکھے ہیں حتیٰ کہ ۱۲۵۸ء میں منگولوں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور خلافت کا خاتمہ کر دیا۔

پھر اس نے یہودیوں، ایران، وسط ایشیا، ترکی، چین اور برصغیر کی تاریخ بھی مختلف ابواب کے تحت رقم کی۔ برصغیر کے تحت رشید الدین نے گوتم بুদ্ধ اور بودھ مذہب کے بارے میں بھی بڑی تفصیل سے لکھا ہے کتاب کی دوسری جلد کئی حصوں میں منقسم تھی، منگولوں کے بارے میں تھی یہ واقعات زیادہ تفصیل سے اس نے لکھے گئے ہیں کہ رشید الدین منگول شہنشاہ الحان اولجیتو کے دربار میں ملازم تھا اور اسی نے اسے تاریخ لکھنے کا حکم دیا تھا۔ پروفیسر ٹاگن نے کتاب کے ان حصوں کا مسودہ شہد میں برآمد کیا تھا لیکن پروفیسر بونیل کے بیان کے مطابق اب یہ حصے ناپید ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس جلد کے بھی دو حصے تھے۔ ایک حصے کے مقدمے اور چار ابواب میں مشہور ترک اور منگول قبائل کے حالات اور ان کے آپس میں مل کر دوسرے قبیلے وجود میں آنے کے واقعات ہیں دوسرے حصے کے مزید تین حصے کئے گئے ہیں۔

ماہر یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے سربراہ، پروفیسر جان اینڈ ریو بونیل کی تحقیق کے مطابق اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ دنیا کا پہلا باقاعدہ مورخ ہونے کا سہرا ایران کے دانشور رشید الدین فضل اللہ کے سر ہے کسی ایک دربار سے وابستہ رہ کر روزنامے یا کسی فاتح کے لشکر کے ساتھ رہ کر سفر نامے لکھنا اور بات ہے لیکن باقاعدہ عالمی تاریخ مرتب کرنا ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس میں اولیت کے سلسلے میں مسلمانوں کے سوا کوئی اور فخر نہیں کر سکتا۔

رشید الدین فضل اللہ نے تیرھویں صدی کے بالکل شروع میں یعنی اریح۔ جی۔ ویلز سے چھ صدی قبل یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔ بد قسمتی سے اس کی تصنیف جامع التواریخ، کے صرف دو نسخوں کی چند جلدیں دریافت ہو سکی ہیں۔ باقی جلدیں اب تک نہیں ملی ہیں۔ ان میں پہلا نسخہ ۱۳۰۶ء میں مکمل ہوا تھا اور دوسرا ۱۳۱۰ء میں۔ پہلے نسخے کی زمین اور دوسرے کی چار جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ مشہور مستشرق، پروفیسر کارل جان لکھتے ہیں رشید الدین سے پہلے تو کیا، اس کے بعد بھی کئی صدی تک دنیا میں کسی کو عالمی تاریخ مرتب کرنے کا خیال نہیں پیدا ہوا۔

رشید الدین نے اپنی کتاب کا آغاز حضرت آدم سے کیا اور پھر تیاہ کہ آدم کی اولاد کس طرح دنیا کے مختلف خطوں میں پھیل جاتے

لیکن منگولوں کے ابتدائی حالات کے بارے میں ابھی ک دنیا کے پاس رشید الدین کی تحریروں کے سوا کوئی دوسرا ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ خود چنگیز خاں نے اہتمام کیا تھا کہ منگولوں کی کتاب ایک سنہری کتاب میں مرتب کرائی تھی۔ یہ سنہری کتاب خزانے میں رکھی جاتی تھی اور اُنے دن کے واقعات اس میں رقم کئے جاتے تھے۔ منگول شہنشاہ الحان اولجیتو کی اجازت سے رشید الدین کی رسائی اس پہر کتاب تک تھی۔ بعد میں امتداد زمانہ کے ہاتھوں سنہری کتاب توفان ہو گئی، صرف رشید الدین کی تحریروں پر باقی رہ گئی۔

رشید الدین جسے رشید طبیب بھی کہا جاتا ہے، ۱۲۵۴ء میں ہمدان میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ اس کے ماں باپ یہودی تھے۔ ہمدان اس زمانے میں یہودیوں کا بڑا مرکز تھا اور وہاں ان کا ایک کالج بھی تھا جس میں مذہبی علوم کے علاوہ دیگر علوم کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ رشید الدین اسی کالج کا فارغ التحصیل تھا۔ عبرانی اس کی مادری زبان تھی لیکن اسے عربی، فارسی اور بعض دوسری زبانوں پر بھی قدرت حاصل تھی۔

ایران کے دوسرے منگول حکمران، الحان اباقر کے عہد میں اسے دربار میں ملازمت مل۔ یہ واقعہ ۱۲۷۸ء میں پیش آیا۔ دیار میں مسلمان علماء کی موجودگی کی وجہ سے رشید الدین میں اسلام کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ سب سے پہلے اس نے قرآن پاک کا مطالعہ کیا اور پھر احادیث پر مبنی کے بعد ۱۲۸۸ء میں پرفضا و رغبت اسلام قبول کر لیا۔ اپنی غیر معمولی اہلیت کی بنا پر رشید الدین نے بڑی ترقی کی جس برس تک دربار سے وابستہ رہتے کے بعد الحان اباقر کے پوتے الغازان کے عہد میں نائب وزیر اعظم کے عہدے پر پہنچ گیا۔ اس وقت وزیر اعظم صدر الدین سنان تھا جو خود بھی لائق آدمی تھا۔ ۱۲۰۲ء اور ۱۲۰۳ء میں الغازان نے مصر کے ملکوں کے خلاف فوج کشی کی تو رشید الدین بھی ساتھ تھا۔ اس جہم کے دوران رشید الدین نے ایک بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ دریائے فرات کے مغربی ساحل پر واقع شہر دباط الشام کے حاکموں سے بات چیت کر کے انہیں ہتھیار

پہلا چنگیز خان کے اباؤ اجداد، دوسرا خود چنگیز خاں اور تیسرا اس کے جانشینوں کے لئے وقت ہے۔ حصہ دوس میں تین جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کی ایک پوری جلد منگول شہنشاہ الحان اولجیتو کے لئے وقت ہے، ۱۲۲۶ء سے ۱۲۴۲ء تک منگولوں نے روس اور مشرقی یورپ پر جو حملے کئے تھے ان کا تفصیلی حال ان میں بیان کیا گیا ہے۔ ان ہی حملوں کے دوران منگولوں کے مشہور اور بے پناہ سترے لشکر کی تشکیل ہوئی تھی اسی جلد میں جنوبی چین کے خلاف فوج کشی کا بھی حال بیان کیا گیا ہے یہ فوج کشی ۱۲۶۸ء اور ۱۲۶۹ء میں کی گئی تھی اور اس کے نتیجے میں منگول شہزادے قبلاخان کا خاندان چینی شہنشاہوں کا یوآن خاندان کہلایا۔

قبلاخان کے عہد کے واقعات مشہور اطالوی سیاح مارکو پولو نے بھی لکھے ہیں لیکن اس کا بیان محض ایک روز نامے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا جبکہ رشید الدین نے باقاعدہ تاریخ مرتب کی ہے اس سے موازنہ کرنے پر پتہ چلا ہے کہ مارکو پولو کا سفر نامہ اعتبار کے قابل نہیں ہے مثال کے طور پر جنوبی چین کے خلاف جہم کے دوران سیانگ یا ٹنگ کا تاریخی حاصرہ ۱۲۷۸ء سے ۱۲۷۹ء تک جاری رہا مارکو پولو نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے کہ اس حاصرے کے دوران قبلاخان کو عیسائی انجینیروں اور ماہرین کی خدمات حاصل رہیں اور صرف مارکو پولو کے باپ اور چچا بلکہ خود مارکو پولو نے ہی خدمات کی گئی۔ لیکن رشید الدین نے لکھا ہے کہ یہ انجینیروں اور ماہرین سب مسلمان تھے اور ان کی مہینتوں کی مدد سے قبلاخان کو فتح حاصل ہوئی اور یہی صحیح ہے اس لئے کہ اب یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ مارکو پولو کے باپ اور چچا کے چین سے واپس چلے جانے کے بعد یہ محاصرہ ٹھہرا ہوا تھا خود مارکو پولو یہ محاصرہ ختم ہو جانے کے دو برس بعد چینی پہنچا اس قسم کے چند واقعات اختلافات کے سوا دیگر تفصیلات میں رشید الدین اور مارکو پولو کی تحریروں نے ایک دوسرے کی تصدیق ہو جاتی ہے اسی طرح چنگیز خان کی مغربی ایشیا پر فوج کشی کے واقعات کی تصدیق کے لئے ایک اور ایرانی مؤرخ جو وائینی کی تاریخ، جہاں گوشہ، موجود ہے جو چنگیز خاں کی مختصر تاریخ ہے۔

ڈال دینے اور اطاعت قبول کر لینے پر آمادہ کر یا۔

اس زمانے میں جاگیر دار چھوٹی موٹی فوج رکھا کرتے تھے۔ بعض وحشی منگول جاگیر دار اس فوج کے ذریعہ شہروں کے تاجروں کو دوران سفر لوٹ یا کمرٹے تھے جن کے سدباب کے لئے القازان نے جو اصلاحات جاری کیں وہ رشید الدین کے دماغ کی ہی پیداوار تھیں کہا جاتا ہے القازان نے ہی رشید الدین کو تاریخ مرتب کرنے کا حکم دیا تھا لیکن اس کے بیٹے القازان اولجیتو کے دور میں یہ کام مکمل ہوا۔

اولجیتو رشید الدین کی بڑی قدر کرتا تھا اور اس کی خدمات کے صلے میں گراں قدر انعام دیا کرتا تھا چنانچہ وہ سلطنت کے مختلف حصوں، حتیٰ کہ عراق، آذربائیجان اور اناطولیہ تک میں وسیع جائیدادوں کا مالک بن گیا۔ رشید الدین کی زندگی میں ہمارے چھ بیٹوں میں سے آٹھ کو گورنر مقرر کیا گیا اور پورا مغربی ایران، جارجیا، عراق اور موجودہ ترکمانستان کے بیٹوں کی عیال داری میں تھا۔

القازان اولجیتو نے سلطانیہ نامی تیار دار حکومت تعمیر کر لیا۔ تو رشید الدین نے اس کے مصافات میں ایک بہت بڑی تعمیر کرائی جس میں ایک خوبصورت مسجد، ایک وسیع اسلامی مدرسہ اور ایک شفا خانہ شامل تھا۔ اسی طرح تبریز کے مصافات میں بھی رہنمائی نامی بستی اس سے تعمیر کرائی تھی۔

رشید الدین نے جو کتابیں لکھیں، ان کی نقییں کرنے کے لئے خوشنویسوں، جلد بندی کے لئے جلد سازوں اور نقشے اور تصویریں بنانے کے لئے مصوروں کا باقاعدہ علم اس نے اکٹھا کر لیا تھا جن پر ساٹھ ہزار دینار (موجودہ حساب سے سات لاکھ روپے) سالانہ خرچ ہوتا تھا۔

وزیر اعظم صدر الدین شجائی نائب وزیر اعظم رشید الدین کی ترقی دیکھ کر کچھ امراء جلنے لگے تھے چنانچہ انہوں نے دولوں کے خلاف سازشوں کا چال بچھایا ۱۳۱۲ء میں ایک سازش کامیاب ہو

ہو گئی جس کے نتیجے میں بچارے صدر الدین کو اپنے عہدے اور جان، دولوں سے ہاتھ دھوئے پڑے۔ اس کے بعد رشید الدین کے خلاف ایک خوفناک سازش تیار کی گئی اور القازان اولجیتو کے سامنے غیرانی زبان میں لکھا ہوا ایک خط پیش کیا گیا۔ یہ خط منگول امیر کے یہودی ملازم کے نام لکھا تھا اور ہدایت کی گئی تھی کہ کسی طرح اولجیتو کو زہر دے دیا جائے۔ لیکن رشید الدین نے ثابت کر دیا کہ یہ خط جعلی ہے چنانچہ اولجیتو مطمئن ہو گیا۔

صدر الدین شجائی کے بعد تاج الدین علی شاہ کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ اس کا تعلق امراء کے دوسرے گروہ سے تھا چنانچہ رشید الدین کی اس سے کبھی نہیں ملتی تھی آخر القازان اولجیتو نے اپنی سلطنت کے دوسرے کمرے دیئے۔ وسطی اور جنوبی ایران، میسوپوٹامیہ اور ایشیا کوچک کا وزیر اعظم رشید الدین کو مقرر کیا گیا اور باقی حصوں کا وزیر اعظم تاج الدین علی شاہ قرار دیا گیا۔ لیکن تاج الدین اس انتظام سے بھی مطمئن نہ ہوا اور براہ رشید الدین کے خلاف سازشیں کرتا رہا۔

القازان اولجیتو کی زندگی میں تو اس کی کوئی چال کادر نہیں ہوئی لیکن ۱۳۱۴ء میں جب اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا القازان اولجیتو تخت پر بیٹھا تو تاج الدین کی سازش کامیاب ہو گئی اور رشید الدین کو برطرف کر دیا گیا۔

کچھ عرصے بعد رشید الدین کے حامیوں نے بادشاہ کو اس پر راضی کر لیا کہ رشید الدین کو دربار میں بلا لیا جائے۔ لیکن تاج الدین نے پھر سازش کی۔ اس مرتبہ الزام لگایا گیا کہ رشید الدین نے القازان اولجیتو کو زہر دیا تھا۔

واقعہ محض یہ تھا کہ اولجیتو کی بیماری کے دوران رشید الدین نے جو خود بھی ایک اچھا طبیب تھا، بادشاہ ایک مسہل دیا تھا لیکن تاج الدین نے جھوٹے گواہ پیش کر کے ابو سعید کو اس کا یقین دلایا۔ چنانچہ رشید الدین کو سخت ایذاؤں دے کر قتل کیا گیا۔ تاج الدین کے حکم سے اس کا سر کاٹ کر تبریز لے جایا گیا اور تین دن گلی کوچوں میں گشت کرایا گیا۔

کُرسی کی فریاد

(بلسلدہم شجرکاری)

ریٹ شفقت

کی نظر برائی پر بڑی جلدی جاتی ہے۔ تاریخ کے کچھ منچلے مجھے ہمیشہ کیلئے رسوا کر گئے اب تک مجھے طعنے سننے پڑ رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ کسی نے دماغ خراب کر دیا ہے کوئی کہتا ہے کہ کسی کا نشہ ہے کبھی کبھی جب میں اپنی زندگی پر غور کرتے لگتی ہوں تو پہروں کے لئے ہست دہود کے فلسفے میں ڈوب جاتی ہوں۔ بھلا غور تو کیجئے ابھی چند سال ہی گزرے میں ایک گھنے اور تناور درخت کا حصہ تھی یہ درخت وادی نیلم میں بل کھاتی پہاڑی ندی کے کنارے کھڑا تھا۔ اس درخت کی سبز شاخوں میں طیور خوش الحان بے سیرا لیتے تھے، صبح کو اُن کے رس گھولتے نئے اُج بھی میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ اس درخت کی چھایا دور تک پہنچتی تھی اور تھکے ہارے مسافر اس کے نیچے بیٹھ کر آرام کرتے تھے اور مناظر قدرت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس گھنے درخت کی سرسبز پتیاں سورج کی روشنی میں روزانہ بے اندازہ مقدار میں اکسین تقاضا میں چھوڑتی تھیں اور اُس پاس کے علاقے کی ہوا کو صاف اور صحت مند بناتی تھیں درخت کے سوکھے ٹڑے پتے زمین پر گرتے تھے تو ایک فرش سا بچھ جاتا تھا، نماز دھوپ بہت جلد انہیں خاک سے ہم رشتہ کر دیتی تھی اور یوں زمین نئی طاقت اور توانائی پیدا ہوتی تھی۔

اللہ تعالیٰ کتابے نیاز ہے کہ کبھی تو کسی کو اتنا پروان چڑھادیتا ہے کہ وہ شخصیت آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہے اور کبھی کسی کے وجود کو اتنا بے معنی اور مبہم کر دیتا ہے کہ اسے ہر چند کہ لوگ دیکھتے ہیں پر نہیں دیکھتے۔

میں ایک کرسی ہوں چوب خشک سے بنی ہوئی۔ کس منہ سے بڑی باتیں کروں مگر یہ بھی عجیب تماشا ہے کہ مجھ پر بیٹھ کر لوگ فلک افلاک سے بھی پرے کی باتیں کرتے لگتے ہیں۔ فرعون صاحب مجھ پر بیٹھے تو کیا گل نہیں کھلائے اور نمرود صاحب تے تو خدا کی پناہ میرے منہ میں خاک و ب کائنات ہونے کا دعویٰ فرما دیا۔ اور فرعون اور نمرود کی بات تو بہت پرانی ہوئی جمہ جمہ اٹھ دن بھی نہیں لگے مگر پھرے ہنر صاحب تے سارے یورپ میں کیا آدم نہیں جوت ڈالا تھا۔ اور میں کہ ایک کرسی ہوں چوب خشک سے بنی ہوئی ٹک ٹک یہ سب کچھ دیکھتی رہی اور اپنے رب سے التجا کرتی رہی کہ میرے مولا میرے وجود کو تحلیل کر دے اور مجھے زمیں کی خاک سے ہم آغوش کر دے کہ میں یہ مناظر پھر کبھی نہ دیکھ سکوں۔ یہ صبح ہے کہ مجھ پر ہمیشہ فرعون و نمرود ہی نہیں بیٹھے بڑے بڑے صاحبانِ خیر بھی متمکن ہوئے لیکن میں کیا کروں ہر کسی

پر وہ ضربیں لگائیں کہ میرا پیارا بوڑھا جسم کمال بے کسی سے زمین پر چیت ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک زندہ لاش زمین پر پڑی ہے پھر اُسے لئے ایک دوسری جماعت آئی اس نے ٹکڑے پارچے کئے اور ایک بھاری بھرکم ٹرک میں مجھے لاد کر جہلم دیا کے کنارے بیخ دیا۔ دوستو میرا سفر یہاں ختم نہیں ہوا۔ میرے جسم کے ٹکڑے پھر دریا میں بہائے گئے۔ اور میں موجوں کے دھکے سہتی کئی ہفتے بعد مشہور شہر جہلم پہنچی یہاں ایک چوب فروش کے آدمیوں نے مجھے دریا سے گھسیٹا گودام میں ڈھیر کیا۔ مہینوں دھوپ میں پڑی سوکھائی گئی پھر بھلی کے ارے پر میرے مزید ٹکڑے پارچے ہوئے۔ اور پھر میاں خیر دین ترکھان نے مجھے نصیبوں جلی کو کر سی بنا دیا۔ میں ایک مقامی عدالت میں قضا و قدر کا دھندہ دیکھتی رہی۔ پھر خدا بھلا کرے اُس گھن کا جو میرے ایک پیر سے ایسا چٹا کر مجھے پھر نیلام چڑھنا پڑا اور اب میں نفخو کے ہوٹل میں پڑی زندگی کے دن گزار رہی ہوں۔ میری چول چول ہل گئی ہے کچھ ہی دن میں میاں نصو مجھے کباڑی کی نظر کریں گے جہاں سے میں یقیناً چوہے کی نظر بھاجاؤں گی۔۔۔۔ میں سوچتی ہوں انسان اتنی ترقی کرنے کے باوجود کتنا جاہل ہے مجھ جیسی قیمتی شے کو کس طرح ضائع کر دیتا ہے۔ ارے بے عقل انسانوں کریاں تو دھات کی بھی بن سکتی ہیں۔ اور ان کا لوہا ہر حالت میں باقی رہ سکتا ہے مگر میں کے چوب خشک سے بنی ہوں دن گزرنے پر اپنا وجود بتدریج ختم کر دیتی ہوں اے عقل والو سوچو تھوڑی سی شان و شوکت کے لئے دن رات جیتے جاگتے پیڑ کاٹتے ہو۔ اور پھر ستم یہ ہے کہ جتنے پیڑ کاٹتے ہو اتنے لگاتے نہیں۔ دن رات ٹکڑے جنگلات والے پکارتے پھرتے ہیں درخت زمین کی دولت میں زیادہ درخت آگاؤ۔ درختوں کی حفاظت کرو۔ اے اس وطن کے خوش قسمت باسیو ذرا ان آوازوں پر کان تو دھرو۔

پیڑ کے تنے میں کوئی چھوٹا سا شگاف پیدا ہو جاتا تو لیس دار مادہ گوندھ کی صورت میں جم جاتا۔ اُس پاس کی بستیوں کے لوگ یہ گوندھ چن کر پتساریوں کی دوکانوں تک پہنچا دیتے۔ درخت کی سوکھی ٹہنیاں جب جھڑتیں تو گاؤں کی عورتیں انہیں بٹور کر اپنے چوہے روشن کرتیں۔ پھر کچھ دن بعد جب علاقے کی آبادی بڑھی تو ان عورتوں نے میرے سرسبز پیڑ پر نت نئی قیامتیں ڈھانا شروع کر دیں۔ وہ صبح صبح کھرپیاں اور درانٹیاں لے کر آجائیں اور اس شجر سایہ دار کی کھال کے ٹکڑے فوج فوج کر جھولیاں بھرتی شروع کر دیتیں۔ یہ ستم رسیدہ درخت خاموش فریادی بن کر اُہ و زادی کرتا۔ ایسے نیک بخت بیسیوں میری کھال کیوں تو پچے پھینکتی ہو۔ اگر تمہیں بالین کی ضرورت ہے تو سوکھے پتے اٹھا لو۔ سوکھی شاخیں اٹھا لو۔ ہائے میری جیبتی جاگتی کھال کیوں کھینچے پھینکتی ہو۔ میری کھال اتار گئی تو میری زندگی مرجھا جائے گی۔ میں سوکھ جاؤں گا۔ اگر تم کو اپنے چوہے جلانے ہیں تو ذرا کشادہ دل بنو۔ انسان کی عظیم دریافت مٹی کے تیل سے قائمہ اٹھاؤ اُہ تمہیں نہیں معلوم میرے وجود سے کتنی برکتیں ہیں، میں اندھیوں کو روکتا ہوں۔ میں زمین کی نمی برقرار رکھتا ہوں میں مٹی کی تہوں کو مضبوط اور مستحکم رکھتا ہوں، میں ہوا صاف کرتا ہوں، میں تمہیں بہت کچھ دیتا ہوں۔ مگر تو بے کیجئے کسی کے کان پر جو بن نہ رہیگی۔ اور تھوڑی سی مدت میں مجھے لٹھ منڈ کر کے رکھ دیا۔ میری کھال اتری تو میرا ہاتھ خراب ہو گیا، زمین سے غذا کھینچنا میرے بس میں نہ رہا۔ اور جب فوبت یہ آئی کہ سبز پتیاں بھی نکلنی بند ہو گئیں تو پھر حکمہ جنگلات کے علے نے مجھے بیکار تصور کر کے میرے وجود کے بوجھ سے دھرتی کو پاک کرنے کی ٹھانی۔

کچھ دن ہی گزرے ہوں گے کہ کچھ لوگ لمبی لمبی کلباڑیاں لئے میرا قصہ پاک کرنے اُن موجود ہوئے چشمِ زدن میں انہوں نے مجھ

نصیحت

ظہور محمد ملک

ظہور محمد ملک صاحب! ہماری بساط شاعری کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ بنیادی طور پر غزل گو ہونے کے باوصف خوبصورت نظمیں بھی ان کے کلام میں داخل مقدار میں دستیاب ہیں۔ غزل میں حسرت کا ساتھ کھر سیدھا انداز اور رومانوی ترنم ریزی ہے۔ مضامین جدید کے ساتھ تصوف کی دروں پر وہ کیفیات کارچاؤ ان کی شخصیت میں معصوم سچائی اور حقیقت پسندی کا رنگ بھرتا ہے۔ ظہور صاحب ۱۹ اگست ۱۹۳۲ء میں امرتسر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ ہائی سکول کڑہ خزانہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، آزادی کے بعد مستقل سکونت راولپنڈی میں اختیار کی۔ ۱۹۵۷ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے اردو لٹریچر میں ایم۔ اے کیا۔ عرصہ ۲۵ سال سے ریڈیو پاکستان سے فنلک ہیں اور اب سینٹرل ریڈیو سرکی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان کی چند غزلیں اور ایک نظم پیش خدمت ہے نقد و نظر کی میزان پر ان کے کلام کا معیار آنگن و پر کھناب قارئین کا کام ہے۔

اگلے وقت کے لوگوں نے یہ راز سُبھایا اے بیٹے سُن!
وقت کا دھن انمول ہے پیارے وقت نہ یونہی کھونا ہوگا
سائس کی ہے وہ تازک ڈوری پل پل جس کا تانا بانا!
بیش بہا ہیں گھسّر عمل کے ان کا بار پر مونا ہوگا
عالم سارا گھر ہے دکھوں کا جس میں کال رہا ہے وفا کا
گرم و سرد جہاں کے سہہ کر درد کو جی میں سمونا ہوگا
تیز چمکتی دھوپ ہر دن کی پا ہوں گہرے بادل چھائے
رُت ہو کوئی خون جگر سے بیج سخن کا بونا ہوگا
کام بہت ہے وقت ہے تھوڑا جیتے جی کچھ تم بھی کر لو
انہر خاک کی سیج پہ برسوں سکھ کی نیند بھی سونا ہوگا

غزل

ظہور احمد ملک

فصل گل آئے گی پھر چاک گریباں ہوگا
 دایہ دل اور بھی وحشت میں نمایاں ہوگا
 جو کسی طور مرے درد کا درماں ہوگا
 یہ کرشمہ ترا اے گردشپ دوراں ہوگا
 جوش گریہ سے کوئی حشر بداماں ہوگا
 تار بارش سے دل و دیدہ بیاباں ہوگا
 اشک کے سیل میں ڈوبے جو یہ ساری بستی
 اور بھادوں کی جھڑی سے نیا طوقاں ہوگا
 لے گا ہر دُوبنے والا بھی سہاے کیا کیا
 یہاں پھر کون رقیب سرو ساماں ہوگا
 عہد و پیمان و فاذ سر نواں ہوں گے
 مژدہ اے اہل جنوں درد سراواں ہوگا
 سرخی رنگِ حنا رخسار سے پھر جھلکے گی
 آبلہ پا کوئی جب جانِ بیاباں ہوگا

غزل

ظہور محمد ملک

دن بیتا ہے عصر کا عالم جوں توں کر کے شام کریں
چہین ملے تو دل زدگان بھی پل بھر کو آرام کریں

یار احباب الزام دھویں اور جی بھر کر بدنام کریں
پیار بھری آواز پہ اس کی کیا فکر انجام کریں

دیس بدیس میں ہم کس گلن مائے مائے پھرتے ہیں
نقش کف پاروشن ہوں تو سجدہ ہر ہر گام کریں

فترسی شے وہ جنس گراں ہے جس کا ملنا مشکل ہے
دین ہے اپنے داتا کی یہ اس بخشش کو عام کریں

گھٹے چاند کی چال ہمارا عہدِ جوانی ماند ہوا
پیری کے آغوش میں دل کے ارماں اب آرام کریں

عقل و دل کے لاکھ جتن بھی رازِ عشق چھپانے کے
محفلِ محفلِ شعر پڑھیں اور راز کو طشتِ ازیام کریں

غزل

ظہور مختار ملک

لذت ملی خلش میں تو گھر دل میں کر گئی
دُتیا یہ سمجھی سوزشِ زخمِ جگر گئی
رود کے آج آبروئے چشمِ تر گئی
دل کی وہ ساکھ ہائے پرانی کدھر گئی

جس سمت بھی یہ گردشِ شام و سحر گئی
بزمِ جہاں سے عزتِ اہلِ ہنر گئی
غم اس قدر اٹھائے کہ ہستی ٹکھر گئی
اب دل سے سخت گیرئی شام و سحر گئی

کیسے ملے گا منزلِ مقصود کا سراغ
اس نقشِ پا کے ساتھ ہی گردشِ سفر گئی
قحطِ الرجال وہ تھا نہ آیا کوئی نظر
شہرِ وفا میں میری نظر در بدر گئی

آجاؤ اب کہ ضبط کا یار نہیں رہا
دل پر میرے ہزار قیامت گذر گئی

غزل

ظہور محمد ملک

دل ہے سودائی تیرا جلوہ پیدا مانگے
 عقل کشکول لئے پھرتی ہے کیا کیا مانگے
 شوق نظارہ ادھر دیدہ بینا مانگے
 ہے جنوں وہ کہ سدا وسعت صحر مانگے
 حسن بے باکی جرات کا تقاضا مانگے
 موج طوفان جو اٹھے شورشِ دریا مانگے
 مانگنے والوں نے تو حور و جناں مانگے ہیں
 ہے مرا عشق کہ جو جلوہ پیدا مانگے
 رقص کرتے ہیں نگاہوں میں مری ویرانے
 اب جنوں برہنہ پا اور تن تنہا مانگے
 یوں تو ہر موڑ پہ دیکھے ہیں تیرے سودائی
 ترا شبیدا سر بازار تماشا مانگے
 دل وہ وحشی ہے کہ آداب جنوں میں اکثر
 چاہے تیری ہی رضا تیرا اشارہ مانگے
 دور پہ دور چلے سا قیام خانے میں
 رند مدِ شیوہ نئے ساغر و مینا مانگے
 نئے افلاک کو چھوتا ہے مرا فکر سخن
 اور مرا ذہن رسا اک نئی دنیا مانگے
 غیر ہم مانگتے رہتے ہیں ترے جلووں کی
 خلق کی آنکھ ترا حسن سراپا مانگے
 نقش اب دل پہ مرے اک ہی صورت ہے ظہور
 جذبہ شوق کوئی اور نہ اُن سا مانگے

چینی (خاندان)

محنت کی خوشبو

ترجمہ: پروین عارف

جیسی چمک نظر آتی تھی اس نے اپنے جسم کو ایک موٹی دبیز دھار
صدری سے ڈھانک رکھا تھا جس کے ٹہن کھلے ہوئے تھے اور اُس
کے پس منظر میں اس کی تانبے جیسی جسم کی جلد اس کے سخت جان ہونے
کی عکاسی کر رہی تھی۔ دوسرا شخص جس کا نام لسٹو فانگ تھا وہ
مذکورہ جمیعت کا ڈپٹی لیڈر تھا جو حال ہی میں اس عہدے پر منتخب
ہوا تھا۔ اس جوان سال لیڈر کا جسم مضبوط اور کڑی تھا۔ اُس کے
چوڑے چکلے بازوؤں سے اُس کے پیکر کی خوبصورت ساخت کا پتہ
چلتا تھا اور اُس کے چہرے پر جوانی کے اہلے ہوئے خون کی سرخ
تہ چڑھی ہوئی تھی۔ اُس وقت اس کی نظروں میں چین کا ایک کیفیت
آور رنگ جھلکیاں مار رہا تھا۔

دفعہ لسٹو نے پرانے سیکرٹری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا،
”بقید سیکرٹری صاحب غالباً اس وقت ہم اپنی منزل کے
کے اختتام پر ہیں۔ ہن نا! چچی نے لسٹو کے سوال کے جواب
میں کہا،
”ہن تو سہی مگر پہلے اگلے چوراہے پر ہماری گاڑی
مڑے جب سمجھو“
اور پھر یکا یک گاڑی بان کے سرخ چمڑے کے گتے ہوئے

اٹھ سال بہار کے موسم کا آغاز (چینی کاشتکاروں کی)
توقع سے کچھ قبل ہی شروع ہو گیا تھا حتیٰ کہ وسط سرما کو بھی دوہینے
بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ موسم میں غیر معمولی تمازت تغیر پذیر تھی
ہوا میں موسم کی سزائت کے سبب سے مٹی میں سوندا ہٹ اور ہلک
بس گئی تھی۔

ایک روز صبح کاذب کی ملکی روشنی میں ایک گھوڑا گاڑی جس
میں تازہ سبزیاں لدی ہوئی تھیں پکنگ شہر کے جنوب کی جانب
سے قومی شاہراہ چین سے گذرتی ہوئی دکھائی دی۔ گھوڑوں کے
ٹاپوں کی آواز نے اس وقت موسیقی کے سے سروں کا ترنم فضا میں
بکھر دیا تھا۔

اس گاڑی میں گاڑی بان کے پیچھے دو اور آدمی بھی سوار
تھے۔ اُن میں سے ایک کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ اُس کا
نام چی چنگ کوآن تھا جو مزارعوں کی جمیعت کی تنظیمی پارٹی کا قدیم
سیکرٹری تھا۔ اُس پارٹی کا تعلق زرد پھولوں والی پہاڑی کی ماہی
پشت منظم جماعت سے تھا۔ یہ پارٹی سیکرٹری اچھی ہڈی لکڑی اور
پُر وقار شخصیت کا مالک تھا۔ اُس کے چہرے کے چوڑے کشادہ اور
ابروؤں کے بال بڑے گھنے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں چیتکی آنکھوں

دوسرا شخص بھی اس کے ساتھ بول اٹھا۔

”ہائے اللہ! آٹے سال کی آمد کے ساتھ ساتھ
کیسی رنگ برنگی سبزیاں اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں۔
ایسی سبزیوں کی پیداوار میں کوئی ندرت تو بلا اثر
ہوگی ورنہ.....“

خریداروں کے تاثرات سے گاڑی بان خوشی سے پھولا نہیں
سمار رہا تھا۔ اُس سے خاموش نہ رہا گیا تو اپنی مسرت کے اظہار کیلئے
سرگوشی اختیار کر لی اور پارٹی سیکریٹری اور اسٹور وولوں کو مخاطب
کر کے بولا۔ ”آپ بھی سن رہے ہوں گے ہی ہی!!..... اس
موسم بہار میں ہماری فصل کی پہلی پیداوار کتنی ایک نمبر ہے
....“ چمکنے ڈرائیور کے اظہار خیال کا جواثر لیا وہ یہ تھا۔

”دبھئی اتنا بھی مت پھولو کہ آپے میں نہ رہ سکوں“ لٹو جو
ترکاریوں کی ٹوکریاں اُتارنے میں مدد دے رہا تھا اس نے بھی
چی کے موقف کو سراہتے ہوئے کہا۔ ”ایسی تعریفوں سے ہمیں اپنے
دماغوں کو عرش پر نہیں پہنچا دینا چاہیے گاڑی بان“ ہمارا کام تو یہ
ہے کہ ہم اپنے خریداروں کی گفتگو کو پوری توجہ سے سنیں تاکہ ہم
یہ ٹکوس کر سکیں کہ وہ واقعی ہمارے مال سے خوش اور مطمئن ہیں
بھی یا نہیں۔“

چی نے لٹاؤ کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے سر
کو ہلکی سی جنبش دی اور کہا۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو لٹو تاہم اگر تم لوں
متم بکم بنے رہے تو اس سے ہم کیا اخذ کریں گے سوچو تو ہمیں پورے
خور و خوض کے ساتھ اپنے دماغوں کی صلاحیت سے کام لینا چاہیے
تاکہ ہم معلوم کر سکیں کہ ہم اپنی ان کوتاہیوں کو جن کا اظہار خریدار
دوران گفتگو اکثر نہیں کرتے ہیں ہم خود بروقت ان کی اصلاح کر
لیں۔ ساتھ ہی ہمیں اس بات کا بھی کھوج لگانا چاہیے کہ کہیں
کسی عنوان ہماری کارکردگی میں کوئی سقم تو نہیں رہ گیا۔ میرا
مطلب ہے ایسا سقم جس کی تہ تک خریداروں کی نگاہیں بھی نہیں

چاہک کی چٹاخ کی آواز کانوں میں آئی مگر یہ علامت تھی اس اظہار
کی کہ گھوڑا گاڑی قلب شہر کے مقابل اس موڑ پر پہنچ چکی ہے جہاں
سے گھوم کر اُسے اُس چوراہے پر سے گزرنے کا اُپر ذکر کیا
گیا آخر کار وہ گاڑی خراماں خراماں اس معروف زرعی علاقے سے
گزرنے لگی اور پھر وہ متعلقہ بازار کے مقابل پہنچ کر رک گئی۔
وہاں اور کئی دوسری جمعیتوں کی گاڑیاں قطار بنائے کھڑی ہوئی
تھیں۔ یہاں کی سبز منڈی کے چھوٹے کارکن آنے والے ڈرائیوروں
اور سبزی پیدا کرنے والوں کی ٹوکریوں کے اتارنے میں ان کی
مدد کر رہے تھے لیکن جیسے ہی یہ زرہ پھولوں والی ماہی پشت
کی جمیعت کی گاڑی وہاں پہنچی وہ وہاں کے خریداروں کی توجہ
کا مرکز بن گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جو مال اس میں لدا ہوا تھا وہ واقعی
نہایت ہی جاذبِ نظر تھا مثال کے طور پر سُرُخ سُرُخ ٹماٹر ہری
ہری گھڑیاں، تازہ ہرا سبزا پالک جو تمام کا تمام ان کمیت کیا دیوں
سے بلو راست لایا گیا جہاں کی جاں بحق ہوا کا ایک مخصوص تاثر
ہوتا ہے۔ اس گاڑی میں تین قسم کے شلیم تھے۔ کچھ دودھ کی طرح
پکے اور سیند، کچھ سُرُخ گول مٹول بڑے ہی بھاری بھر کم اور کچھ
”حسن نا دیدہ“ کے نام سے موسوم تھے۔ منڈی میں موخر اللہ کر شلیم
کی شہرت اس کی خوبصورتی کے باعث تھی۔ ان شلیموں کے اندر
کا گودا جس کا رنگ ہلکا گلابی ہوتا ہے۔ گہرے سبز غلاف میں
ڈھٹکا ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاہکوں کے ٹھٹکے ٹھٹکے
گاڑی کے چاروں طرف منڈلانے لگے۔ یہ خریدار آغا موسم کی
ان نایاب سبزیوں پر ایک نگاہ ڈالنی چاہتے تھے جو عام طور پر
بازار میں دستیاب نہیں ہوتیں۔ حق تو یہ ہے کہ لوگ انہیں دیکھ
کر ہی ان کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے۔ ایک گاہک کو یہ
کہتے سنا گیا۔

”آپ ان سب کو دیکھ رہے ہیں یہ سبزیاں کتنی
فحش بخش اور کس قدر تازہ ہیں۔“

اسی جذبہ (خیر سگالی) کے ساتھ آئے ہیں۔“
اس اعلیٰ علم و عمل کی نے لٹو کو آنکھ مارتے ہوئے کہا: ”کیس
مت مانگئے۔ یہ تو میں بھی خوب سمجھتی ہوں آپ یہاں میری مدد
کرنے کیوں آئے گئے۔ آپ لوگوں کی دلچسپی بھی خریداروں سے
ہی وابستہ ہے۔“.....

”غلط! ... غلط! بالکل غلط! ابھی ہم ایک پختہ دکان
پر عمل کرنے والوں میں سے ہیں۔ کیا ہمارے شہری اور گاؤں
والے ایک ہی بڑے خاندان کے جدِ اجداد فرد نہیں ہیں۔ کہیے؟
پارٹی سیکرٹری اور نوجوان سنگ کی اس گرم بحث سے
لٹو خاصا محفوظ ہو رہا تھا۔ اس نے جب سبزی منڈی کے اندر وئی
حصے پر نظر دوڑائی تو اسے یہ محسوس ہوا کہ کچھ شیلیف کاؤنٹروں کے
پیچھے ابھی تک خالی ڈسٹنڈ پڑے ہیں۔ اس نے فوراً ہی صن نادیدہ
نامی شلموں کی ایک ٹوکری اٹھائی اور انہیں کسی ایک شیلیف میں
بلے پر دواہی سے انڈیل دیا۔

نوخیز شوخ و شنگ سنگ جو لٹو سے واقف نہیں تھی اس
کارگرداری کو دیکھ کر اپنے اوپر قابو پانے کے لئے سر کو جنبش دے
کر اپنے غصہ کو ضبط کر کے رہ گئی لیکن جب لٹو دوسری سفید
شلموں کی ٹوکری لوٹانے کے لئے پٹا اور ان شلموں کو بھی اس نے
اسی بے دردی سے شیلیف میں پھینکا تو لٹو کی جھلا اٹھی۔ اس سے
بغیر کہے نہ رہا گیا وہ چیخ کر بولی ہے ہے۔ سنبھال کے احتیاط
کے ساتھ گراؤ انہیں دیکھتے نہیں ہو یہ شلم ”حسن نادیدہ“
سے کہیں زیادہ نازک ہوتے ہیں اور آسانی سے خراب بھی ہو جاتے
ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مہنگے داموں بھی بکتے ہیں۔

لٹو کچھ لمحے کے لئے لٹو کی کے ڈانٹنے پر بدحواس سا ہو گیا
تھا۔ وہ خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ لٹو کی کی خفگی بے جا نہیں ہے
اُسے شلموں کو لا پر دواہی سے نہیں چھینکنا چاہیے تھا۔ نہایت
معذرت آمیز لہجے میں بولا۔

پہنچا کرتیں۔ ابھی ان دونوں کی گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک ٹوکر
لٹو کی جس کا نام سنگ تھا اور جو بزیوں کے کاؤنٹر پر کام کرتی تھی
یہ ایک پیچھے سے نمودار ہوئی۔ بڑی ہی ہشاش بشاش نظر آ رہی
تھی وہ۔ لمبا قد، چہرہ راجسم خوبصورت آنکھوں میں اظہار خیال
کی بے پناہ قدرت، دو لمبی لمبی چٹیاں جو گندھی ہوئی تھیں۔
ادھر سے ادھر اس کے جسم کی لچک کے ساتھ گھوم جاتی تھیں۔ اس
کی نظر بھی نو وارد گاڑی بانوں پر مرکوز تھی۔ یہ گاڑی بان صاحب
پارٹی سیکرٹری کے عقب میں جیسے کھڑے تھے۔ اس لٹو کی نے
اپنے کولہوں پر دونوں ہاتھوں کی توسیں بنا رکھی تھیں اس نے
بڑی توانا آواز میں کہا۔

”میں جب ایسے نازک اندام ہرے ہرے شعلہ بار
سبزیوں کے انبار دیکھتی ہوں تو معاً میرا ذہن زرد پھولوں والی
ماہی پشت جمیعت کی طرف پہنچ جاتا ہے۔“..... چلی آئے اس
تخیل کی پرواز پر گرفت کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو یہ ہے آپ کی ذات شریف“
سنگ نے ایک جھٹکے سے اپنی چوٹیوں کو پشت پر پھینکتے
ہوئے ان بزرگوار کے ہاتھوں کو بڑی گرم جوشی سے جھینپتے ہوئے
نہایت سرگرم لہجے میں کہا۔

”جناب عالی محرم سیکرٹری صاحب۔ ابھی واپس نہ
چلے سہائیے گا۔۔۔۔۔ مجھے اپنی الماری کے تختوں کو ٹھیک ٹھاک
کرنے میں آپ کی (مٹھوڑی سی) مدد لینا ہے۔۔۔۔۔ میری مدد
کریں گے نا!۔۔۔۔۔ (آپ تو جانتے ہی ہیں)۔ بلے اپنے خریداروں
کی خاطر کتنے پاؤں بیٹے پڑتے ہیں۔۔۔۔۔ ہاں نہیں تو!۔۔۔۔۔ ان کی
ضرورت کے مطابق ان کی خوشنودی کے خیل سے ADJUST
بھی تو کرنا پڑتا ہے؟

جی نے ہاں میں ہاں ملائی۔
”دیکھیں نہیں! ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ ہم بھی یہاں

کے ناولوں کی شکل میں چننا شروع کیا کہ سبز اور سرخ کے ساتھ جو تناسب قائم کیا جائے اس کا پس منظر سفید رنگ میں نمایاں ہو۔ چنانچہ یہ کام نہایت پھرتی، صفائی اور مہارت سے اس طرح انجام دیا کہ نوجوان سنگ خوشی سے مجموعہ اٹھی۔ وہ چچی کو چاقو دیتے ہوئے بولی،

”محترم پارٹی سیکرٹری صاحب کیوں نہ ہم کچھ شلیموں کو پھولوں کا لباس پہنا دیں۔ ہمارے خریداروں کے لئے اس صورت میں بڑی زیبائش پیدا ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے؟ آپ ایسا کریں گے؛ بغیر کچھ جواب دیئے چچی نے ایک ”حسن نادیدہ“ شلیم چپ چاپ اٹھایا اور بڑی مہارت سے پتروں کی تہ پر اس طرح جمائی کہ ”حسن نادیدہ“ خوبصورت نظر آنے لگا۔ اُس نے کچھ اسی انداز کی کاریگری دوسرے شلیموں کی ہیئت سنوارنے میں کی۔ حتیٰ کہ شلیموں میں رکھے ہوئے شلیم تمام کے تمام نظر نواز بن گئے خوشی سے تالی بجاتے ہوئے نو عمر سنگ نے کہا،

”محترم پارٹی سیکرٹری صاحب! آپ تو بڑے چھپے رستم نکلتے“

چچی نے اس کے رہمارک کو اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا،

سیر؛ خیر اخیر۔ اس وقت اس کی نگاہیں ناقذانہ طور پر شلیموں پر جمی ہوئی تھیں وہ کہنے لگا، ”بازار کی خرید و فروخت میں ابھی خاصی دیر ہے۔ اسی اثنا میں ہمیں خاما وقت مل رہا ہے کیوں نہ ہم آپس میں بات چیت سے اپنی پیداوار کے بارے میں کچھ اصلاحی پہلوؤں پر غور کر لیں۔ اتنا کہہ کر وہ نو عمر سنگ کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا تاکہ وہ دوسرے سبزی فروشوں سے بھی اُن کی تجاویز کے بارے میں آگاہی حاصل کر لے۔

اور پھر جیسے ہی منڈی لگی لوگوں کا جھگڑا بھی ساتھ ہی لگتا چلا گیا ایک ایک خریدار سنگ کے اسٹال کے قریب پہنچ کر اپنے قدم جمادیتا کیونکہ اس اسٹال پر شلیموں کو بڑی ویدہ ریزی

مہ فروخت کے سلسلے میں تعاون کرنے کا یہ میرا پہلا موقع ہے۔ اس کے اس جواب پر لڑکی بے ساختہ چیخ اٹھی۔۔۔۔۔ خیر!۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے!۔۔۔۔۔ خیر!۔۔۔۔۔

لیکن یہاں منڈی میں سبزیوں کو اتارنے اور چڑھانے اور اُن کا تحفظ کرنے میں آپ مجھے اتنے کورے بھی نہیں لگتے اور پھر بجلا آپ تو مختلف قسموں کی سبزیوں کے نرخ کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ کیا نہیں سمجھتے ہیں آپ“۔۔۔۔۔۔۔

کچھ غصہ سی شرمندگی اور خجالت محسوس کرتے ہوئے وہ نوجوان صرف اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ اتنا بوکھلایا ہوا تھا کہ اس کے سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا وہ اس لڑکی سے کیا کہے۔ یہ کیفیت اُس وقت تک اس کے حواس پر چھائی رہی جب تک چچی اس کی مدد کے لئے نہیں آیا۔

سٹور فلنگ میں یہ بات تھارے نوٹس میں لانا چاہتا ہوں کہ یہ نو عمر لڑکی سنگ بہت ہی بااخلاق اور بے تکلف ہے۔ اس کے ذہن پر صرف خریداروں کی خوشنودی مسلط رہتی ہے۔ پھر وہ سنگ کی جانب متوجہ ہوا اور اس سے کہا، ”سنگ اگرچہ میں تمہارے نقطہ نظر سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تمہیں اس طرح برا و راست لٹو کو نشانہ نہیں بنانا چاہیئے تھا۔ سنگ ہماری مقبول ترین پیداوار کی کوئی بھی سبزی ہمیں ہمیشہ اچھے دام نہیں دیتی۔ ہمیں گاہکوں کے بارے میں ابھی تک کون سا اندازہ ہے۔ کہ وہ کن شلیموں کی خریداری کے لئے اپنی زیادہ سے زیادہ رقم کا بہترین قعر صرف بھجیں گے“

نو عمر سنگ کی مسکراہٹ میں پشیمانی اور تردد کا ہلکا سا عنصر غالب تھا۔ اُس نے لٹو پر طائرانہ نظریں ڈالیں لٹو بے چارہ نے اسے دیکھ کر اپنا سر ہلا دیا مگر بولا کچھ نہیں۔ ادھر ہوا اور ادھر پارٹی سیکرٹری بے نفس نفیس قسم قسم کے شلیموں کو اُن کے مخصوص خانوں میں رکھتا ہوا دکھائی دیا۔ اُس نے ان شلیموں کو اقلیدس

دیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے ہوتی“

ابھی وہ گھوم کر ان شلجموں پر نظر ڈال ہی رہا تھا کہ اُسے ایک آہنی ہاتھ اپنے بازو پر محسوس ہوا۔ یہ جچی تھا۔ کہنے لگا۔
”بھلے مانس پہلے اپنے شیلٹ پر تو نگاہ ڈال لیا کرو۔ سٹوری سن کر بہت خفیف ہوا اور بچھے ہوئے لہجے میں بڑی بے دلی سے بولا۔
”محترمہ ”حسن نادیدہ“ تو خال خال ہی نظر آرہے تھے“ اس وقت تک سرخ گول مٹول شلجم تو سب کے سب فروخت ہو چکے تھے البتہ سفید براق جیسے شلجموں کا اب بھی ڈھیر لگا ہوا تھا۔ لٹونے اپنا سر کھاتے ہوئے اُس بڑی بی سے کہا محترمہ کیا دودھ یاد دلے پڑے ہیں۔“

اس ادھیڑ عمر والی خاتون نے لٹو کو ایک مشفقانہ ہنسم کے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا ”صاحبزادے! تم اس منڈی میں نئے نئے آئے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے میں اس منڈی کی پرانی خریدار ہوں۔ میں یہاں سے ہمیشہ ”حسن نادیدہ“ ہی خرید کرتی ہوں۔ یہ شلجم صرف کھلنے ہی میں مزے دار ہوتے ہیں بلکہ کھانسی اور زکام میں بھی یہ بڑے کام کی چیز ہیں“ اُس پر لٹو نے معذرت کے ساتھ ان بڑی بی سے کہا ”حسن نادیدہ“ میرے پاس سر درست اتنے نہیں ہیں“ جچی نے برسبیل تذکرہ ان محترمہ کی دلچسپی کے لئے کہا۔ ”محترمہ بات دراصل یہ ہے ہم نے گذشتہ موسم گرما میں ”حسن نادیدہ“ کی کاشت زیادہ مقدار میں نہیں کی اس لئے ہماری اور ہمارے خریداروں کی مانگ میں مطابقت نہیں پیدا ہوئی۔ اگر آپ کو ہمیں اپنے گھر کا پتہ دینے میں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم آپ کے لئے مزید ”حسن نادیدہ“ فراہم کرنے کا بندوبست کر دیں گے اور آپ کے گھر پہنچا دیں گے۔“

بڑی بی بولیں۔ ”میں میاں میں آپ کو اس قدر رحمت دینا گوارا نہیں کرتی۔ بہر حال آپ کا بہت بہت شکریہ“

کے ساتھ سما گیا تھا اور اُن کی زیبائش بڑی سادہ نظر تھی۔ جچی بڑی پھرتی کے ساتھ ہر سبزی کو بڑے سلیقے سے اٹھا کر اس کا وزن کرتا، موچ کی مناسبت سے گاہکوں سے باتیں بھی کرتا۔ خریداروں میں گھربلو بیبیاں اور مختلف طبعتوں کے لوگ شامل تھے لٹو فانگ بھی جچی کی معاونت کے خیال سے چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ اور پھر خود ہی اپنے دل میں فیصلہ کر کے کہ بس آج وہ شلجم ہی فروخت کرے گا۔ وہ پشت کی طرف کے کاؤنٹر پر پہنچا اور کاچی کنجروں کی طرح مخصوص بولیوں سے گاہکوں کو متوجہ کرنے لگا اس کی آوازوں کا شور کچھ اس طرح کا تھا۔

میرے شلجم کیسے رسیلے جیسے لال انار
اُن کی بھاجی کھائی نہ ہوگی

ان کو کھاؤ کھا کر اپنی جان بناؤ

صحت پکڑو ڈھیروں پلو خون برطحاؤ

کیسے سندر کیسے میٹھے کیسے گول مٹول ہیں بالو کیسے گول مٹول

بلکلے جیسے کچھ ہیں اُس میں ان کو سچا ہوان کو لے لیں ہیں نول

شلجم میرے من بھانا ان سے بھاگے جنگ کی پیاس

آؤ مسٹر آؤ بالو بھاجی اس کی سب کی آس

لٹو کی آواز سن کر خریدار اس کے کاؤنٹر پر جمع ہونا شروع

ہوئے۔ حسب منشا خریدار اپنی پسند کے مطابق شلجم خریدنے لگے

زیادہ لوگوں کے تو تینوں اقسام کے شلجم خرید لئے۔ اس وقت

لٹو فانگ بے حد مصروف نظر آرہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے

کے قطرے شلجم کے قطروں کی طرح جمع ہو گئے تھے۔ دوپہر کے

قریب ایک ادھیڑ عمر کی عورت خریداری کے لئے آئی۔ اُس کی

نگاہ ان شلجموں پر بڑی جنہیں جچی نے نئے قالب میں ڈھال دیا

تھا تو اس کی باچیں کھل گئیں۔ اس نے فوراً اپنی ٹوکری لٹو

کی طرف بڑھاتے ہوئے اس سے کہا۔ کامریڈ! پوری ڈلیا۔

”حسن نادیدہ“ کی میز پر جچی، سن لیا آپ نے لٹو نے جواب

جولائی، اگست ۱۹۷۶ء

وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا پیکٹ سے باہر نکالا اور جیسے کے شرکار سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”دچی ایسی سمت میں کھڑا تھا جہاں روشنی سب سے زیادہ تیز تھی“

”حضرات! آپ اپنی دانست میں ان تینوں شلجھوں میں سے کے ترجیح دیں گے۔ میری مراد کسی ایک کا مقابلہ زیادہ اچھا ہونے سے ہے۔“

حاضرین جلسہ کا ذہن اس پھیلی ہوئی جھنجھٹ کی طرف مائل نظر آیا لیکن حلی طور پر وہ یہ بتانے سے قاصر تھے کہ کون سا شلجھ سب سے اچھا ہے۔ تاہم ان میں سے ایک شخص نے جی سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔

”وجہ یہ بات کون نہیں جانتا ”حسن نادیدہ“ کچا کھانے کے لئے، گول گول سرخ پکانے کے لئے درست سمجھے جاتے ہیں؟“

”اور ان گورے محبوب کا سفید شلجھوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔“

جی نے برجستہ کہا۔ کسی دوسرے شخص کی آواز سنائی دی۔

اس نے کہا ”لیکن صاحب اس کی تو شہرت ہے ہی نہیں“

”تو پھر اس صورت میں“ جبکہ جی کی پیشانی سے سنجیدگی اور ذہانت کے آثار درخشاں تھے اپنے سوال کو دہراتے ہوئے کہا۔ ”....“

ہم نے گزشتہ موسم گرما میں ان سفید نام شلجھوں کی کثرت سے کاشت کیوں کی اور ”حسن نادیدہ“ کو ان کے مقابلے میں کیوں نظر انداز کر دیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور یہ سوال سل طلب بھی ہے۔“

یہاں سے بحث کا مٹخ گھاگھی میں تبدیل ہو گیا۔ لٹو فانگ کے اپنے پیٹ میں اگل دینے کو بہت سامود موجود تھا اور جسے وہ بھی ابھی منڈی سے اپنے ساتھ تجربے کے طور پر ساتھ لایا تھا۔ اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور پاؤں پٹختے ہوئے چلا کر بولا۔

”سامعین میں بتاتا ہوں، میں سنا تا ہوں۔ اس نکتہ کا تعلق ہمارے گزشتہ پیداواری منصوبہ سے ہے جہاں باہم مقابلے میں آنے

آنا کہ وہ منڈی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

جب لٹو فانگ نے نکلیں سے جی کا رد عمل معلوم کیا تھا سے پتہ چلا کہ وہ نیچے ہوئے سفید شلجھوں کے انہار پر اپنی نظریں گاڑے ہوئے ہے۔ اور پھر اس نے لٹو کو دیکھ کر اپنی جھنجھٹ جڑھا لیں۔

محبوب نے لٹو نے جی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ ضرورت سمجھیں تو میں اب بھی اس کا پچھا کر سکتا ہوں۔ میرا مطلب ہے اس کا پتہ حاصل کرنا مقصود ہو تو....“

جی نے نفی میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا ”نہیں نہیں لٹو!.....“ میں اس بات کے لئے فکر مند نہیں ہوں۔ دیکھو ایک گاگھ کو مطمئن کرنا مسئلہ نہیں ہوتا۔ مسائل تو ہمارے اپنے باغ کی سبزلیوں کی رسل و رسائل سے وابستہ ہیں جن کا براہِ راست منڈی سے تعلق ہے اور منڈی کو تم جانتے ہو ہزاروں خاندانوں کی ضرورت پوری کرنی ہوتی ہے۔“

”غیر! اب گھر چلنے کا وقت ہو چلا ہے۔“

جی نو عمر سنگ کو خدا حافظ کہنے کے لئے اس کی طرف بڑھا

گھر جانے سے پہلے اس نے تینوں قسم کے شلجھوں میں سے ایک ایک اٹھایا۔ لڑکی نے بڑی شوقی سے جی کو چیرتے ہوئے کہا۔

”یہ بھی کیا کم بات ہے آپ خالی ہاتھ گھر نہیں لوٹ رہے ہیں وہ یہ کہتی سار ہی تھی اور اپنی ساتھیوں کو آنکھ مارتی جاتی تھی۔“

جی نے اس پر کہا ”ایسی تو کوئی بات نہیں....“ میں جس مقصد سے یہاں آیا تھا وہ میں پورا کر چکا ہوں۔ اور پھر اس نے ان تینوں شلجھوں کو نمونے کے انداز سے اسے دکھایا۔ نو عمر سنگ نے تمباہلی مارنا کے انداز میں زیر لب کہا۔ ”میں کبھی نہیں اس سے آپ کا کیا مفہوم ہے۔“ مگر جی تو اس وقت تک کافی آگے بڑھ چکا تھا۔ اور اسی شام کو در دھولوں والی ماہی پشت جمیعت کا ایک اجلاس ان کی جماعت کے دفتر میں منعقد ہوا۔ جی نے ان تینوں شلجھوں کو جنہیں

رود گردانی کریں گے۔

اس وقت ہال کے اندر خاموشی مسلط تھی البتہ ہانپا کا کھوان آوازوں کے زور شور اور مباحثہ کے عوامل کی نشان دہی کر رہا تھا ایک مختصر وقفے کے بعد جی نے اراکین جمیعت کے متفقہ فیصلے پر مبنی قرارداد کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں عملی طور پر اقدام کرنے کے لئے آمادہ کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو میرے معزز ساتھیو ہمیں اب سوچنا یہ ہے کہ آئندہ سال کے لئے ہمارے منصوبے کی بنیاد کس پر رکھی جائے۔ اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پر شدید بے قراری اور رقت کی سی کیفیت عیاں تھی، اس پر مستزاد ہکلاہٹنے آمیزش کر کے الفاظ کو اور گنگناہٹ بنا دیا۔ اس کے مبہم الفاظ کچھ اس طرح ادا ہو رہے تھے۔

”اب ب..... اب کے بعد ہمیں ”حسن حسن نامادیدہ“ کی کاشت کرنی پڑی چاہیے۔ بس م م م م جے ات نا ہی کہنا ہے۔“

جی نے مزید کہنے کی گنجائش ہی نہیں رکھی چنانچہ میٹنگ کے ختم ہونے پر ہال قبضہ ہونے سے گونجنے لگا۔ جیسے ہی پارٹی سیکرٹری نے دروازہ کھولا تو تازہ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے انہیں خوش آمدید کہا۔ جی کو پتہ بھی نہیں چلا موسم بہار کی پہلی بارش کا کب آغاز ہوا۔

”بھئی ہارن رحمت نے بھی کیسے عین وقت پر دستک دی ہے۔“

رودانگی کے دوران کسی کے یہ الفاظ سنائی دے رہے تھے۔ پے در پے موسم بہار کی بارشوں نے زمین میں ڈالے ہوئے بیجوں کو فروغ دینے میں موثر کردار ادا کیا ہے۔

گرمیوں کے مصروف ایام آئے اور گزر بھی گئے پھر سنہری خزاں جب اپنے اختتام پر تھی اس وقت زرد پھولوں والا ماہ

والی چیزوں کی قدر و قیمت کے تعین میں بڑی مشکل پیش آتی ہے آپ کو یاد ہو گا موسم بہار میں کچھ خریدار شہر سے واپسی پر یہ کہتے ہوئے کہ سفید ذات والے شلیم ادبچے دامنوں پر اٹھے تھے اور ان کے ہتھلبے میں ”حسن نامادیدہ“ کی قیمت خاصی نیچے آگئی تھی۔ انہوں نے ہماری بے گلیڈ کے رہنما کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اس مرتبہ ہم سفید ذات کے شلیموں کو (IVORY WHITES) کثیر تعداد میں بولیں اور ”حسن نامادیدہ“ (HIDDEN BEAUTY) نسبتاً کم چنانچہ ہم نے ان کے مشورے پر عمل کیا۔ لیکن یہ بات اب روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ ہم ان کے پٹاؤ میں آگئے تھے۔ وہ جو عام قدیم مقولہ ہے ”اپنے فائدے کی پہلے سوچو“..... یہاں تک ہی کہنے پایا تھا کہ اس کی سانس بھول گئی اور وہ اس سے آگے نہ بول سکا۔ اس نے اپنے کسی ساتھی کی طرف دیکھا جو میز کے پاس بیٹھا ہوا تھا مگر وہ کچھ ایسا بے ڈھب گردن نیچے جھکائے بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے چہرے کے تاثرات کا کوئی اندازہ نہیں کر سکا۔ سٹوفاٹنگ کا نقطہ نظر بڑی حد تک برق آسا ثابت ہوا۔ اور کمیٹی ہال میں خاموشی اور گرمی کے انداز کار حمان پیدا ہوتا محسوس ہوا۔ اور پھر جی کا اشارہ ملتے ہی سٹو بیٹھ گیا۔ پارٹی سیکرٹری یعنی جی نے اب باری باری ہال کے سواروں طرف بیٹھے ہوئے افراد کی انفرادی خواہشات کا جائزہ لینے کی غرض سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور سامعین سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ معزز حضرات مجھے سٹوفاٹنگ کے اظہار خیال سے قطعی اتفاق ہے اس لئے کہ ”حسن نامادیدہ“ صرف ایک شلیم ہی کی قسم کو ہم لوگ کہتے ہیں لیکن اسی شلیم کو (اجتماعی طور پر) اب کاشتکاروں اور شہر کے کارندوں کے مزاجوں کی مساوی کڑی بن جانا چاہیے۔ ہمارا کام جو کہ اپنے باغات کی پیداوار کو منڈیوں تک پہنچانا ہے لہذا یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم شہریوں کو خاصی مقدار میں سبزیاں فراہم کرتے رہیں۔ اگر ہم نے کوئی کوتاہی کی تو ہم نادلہ اور کم متوسط درجے کے کاشتکار اپنے فرض سے

پشت جمیعت کے محلے کو حسن نادیدہ کی وافر پیداوار حاصل ہوئی۔ کوئی دیہات ایسا نہ تھا جہاں ان کاشتکاروں کی کامیابی پر لوگوں کے سر فر سے بلند نہ ہوں اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا اس لئے کاشتکاروں نے اپنے منصوبے میں رد و بدل کے بعد فوراً ہی کھیتوں میں پیداوار کی حقیقی قدر و قیمت کے تعین میں خاصا زور لگا دیا تھا۔ انہوں نے اس ضمن میں کافی مقدار میں پانی اور کھاد کا بھی اہتمام کیا تھا چنانچہ اس سال کی فصل کے ”حسن نادیدہ“ غیر معمولی طور پر نظر فریب تھے بڑے ہی فرہ اندام۔ مفرج قلب نہایت باریک جھلی والے اندر سے خاصی سرخی مائل جھلی سے مسور اور نہ جانے کیا کیا۔

ایک شام جبکہ سردی کی پہلی لہر اتنا زور باندھ رہی تھی۔ شلمبوں کا ذخیرہ کرنے کے بارے میں مذاکرات کے لئے ایک مجلس کا انعقاد عمل میں آیا مباحثے میں بحث طلب امور یہ تھے۔ دو ماہ کے اندر اندر حسن نادیدہ کو جو شہریوں کو بہت مرغوب ہیں کافی تعداد میں نہ صرف منڈی تک پہنچایا جائے بلکہ ہمارے تنظیمی عملے کے بکری کے کوٹے کو بازار کی مانگ سے زیادہ ملاحظت ہوئی چنانچہ مختلف نوعیت کے امور کے بارے میں تقسیم کار کے تعین کا مشعب مقرر کیا گیا اور اس ضمن میں اور بھی کئی فیصلے کئے گئے۔ پارٹی سیکرٹری کو براہ راست کھیتوں سے شلمبوں کو منڈی پہنچانے کا پورا اختیار سونپا گیا۔ اور سٹوفاگ کو نوجوان کاشتکاروں کی معیشت میں شلمبوں کو ذخیرہ کرنے کا نگران مقرر کیا گیا۔

دوسری صبح منہ اندھیرے جمیعت کا سارا عملہ بڑا ہی پرجوش اور ساق و چوبند دکھائی دیتا تھا کیوں نہیں! ان کی فصل کی پیداوار بھی تو خاصی وافر تعداد میں انہیں حاصل ہوئی تھی۔ سارا کا سارا عملہ اپنے فرائض کی تکمیل کے لئے تیار کھڑا تھا۔

اور ادھر بڑی جھیل کے نیم شفاف پانی کی مانند خزاں رسیدہ گہرے نیلے رنگ کا آسماں بادلوں سے بے نیاز نظر آ رہا تھا۔ پھل کی پتیاں جو کھر کی زد میں آکر جھڑ گئی تھیں ان کی رنگت گنار

نظر آتی تھی۔ پورا کا پورا محنت کشوں کا مختصر سا قافلہ کھیتوں کی جگہ نڈلیوں پر رواں دواں تھا۔ بہنگیوں میں لٹکی ہوئی ٹوکریاں ان کے شانوں پر اوپر نیچے چلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ بوائی کی بھٹی اوپر کی سمت پھیلی ہوئی مٹی میں غصب کی سونڈا ہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اس محنت کش کارواں کا سالار چچی سٹاگ کو اپنی بہنگی پر بہت بھاری بوجھ لادے ہوئے سب کے آگے آگے چل رہا تھا۔ جب وہ اپنے قدموں کو جنبش دیتا تھا تو اس کی بہنگی کافی وزنی ہونے کے باعث ہال کی مانند جھکی ہوئی دکھائی دیتی تھی وہ بڑی مستعدی مگر تیز گامی کے ساتھ آگے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس کے جوتوں کی ایڑیوں سے خاک کے گولے اس کی رفتار کی تیزی کی نشان دہی کر رہے تھے۔

کچھ ہی وقفے کے بعد سٹوفاگ پیلچہ ہاتھوں میں تھامے دوڑتا دوڑتا ادھر آ نکلا۔ شدید کھدائی کی مشقت کی وجہ سے اس کا چہرہ تھمارا تھا۔

اس نے آتے ہی چچی کو زور سے پکارا اور کہا۔ ”مجرم پارٹی سیکرٹری ہم سب تیار ہیں۔ یہ بتائیے ہمیں کل کتنے گڈھے کھودنا ہوں گے۔“

چچا نے اپنی بہنگیوں کو زمین پر ٹکاتے ہوئے جواب دیا۔ ”بھئی فصل کی مناسبت سے میں سمجھتا ہوں کم از کم دس گڈھے تو درکار ہوں گے۔ اس پر سٹو بولا۔ ”تب تو جناب ہمارا سارا عملہ ہی اسے مل کر انجام دے سکے گا۔ لیکن ہمارے دونوں گروپ اگر لگاتار کام میں پوری تن دہی کے ساتھ لگ جائیں تو ہم آج ہی کام کو بند کر سکیں گے۔“

اتنا کہہ کر وہ بھاگتا ہی چاہتا تھا کہ چچی نے چیخ کر کہا۔ اسے میاں جلد باز ایسی بھی کیا بھاگڑی ہے۔ شلمبوں کا ذخیرہ کرنے میں خاصی مہارت درکار ہوتی ہے۔ سوکھی ہوئی زمین جو گڈھوں کے جنوب کی جانب چھٹی ہوئی ہے۔ اسے تم کرنا ہے۔ سمجھ کر نہیں، تمہیں نرم مٹی

میں آنا چاہوں تو اس میں بھی کوئی پابندی ہے۔ اتنا کہہ کر اس نے اپنے سر کی چوٹیوں کو گھمایا اور بات کے سلسلے کو ہماری دیکھتے ہوئے کہا بمبئی فون پر تو آپ لوگوں سے ملاقات کرنا ناممکن ہے۔ میں نے کئی بار آپ کو فون بھی کیا مگر کسی نے جواب ہی نہیں دیا۔ لہذا مجھے خود ہی آنا پڑا۔ دیکھئے ٹیوٹو و شنگ شنگ ہم اس وقت سے لے کر ابھی تک فصل کٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس اتنے فالتوا دی کہاں ہیں جو صرف ٹیلی فون پر جواب دینے کے لئے تعینات رہیں؟ یہ جملہ مٹوٹے اپنے ملتے پر شکن ڈال کر بڑے سہجے میں ادا کیا جبکہ اس کا سارا زرد اس کے پیچھے پر تھا۔

سنگ سٹو سے مخاطب ہو کر بولی ”منڈی میں اختلاف یہ کیسی کی طرف سے کسی خاص ملک کرنے کے لئے آپ کے پارٹی سیکرٹری کی طبی ہوئی ہے؟ یہ سن کر سٹو نے ایک نوجوان شخص کی طرف جو اس کے عین مقابل کھڑا تھا مڑ کر دیکھا اور کہا ”آپ اسے پارٹی سیکرٹری کو تلاش کرنے کے لئے اپنے ساتھ لے جائیں سٹو جتنی جلد ہو سکے آپ کو واپس آنا ہو گا۔“ جون ہی وہ دونوں چلنے کے لئے آمادہ ہوئے سٹو کے لڑکی کو پکارتے ہوئے کہا ”سنگ“ تم دیکھ رہی ہو میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ کسی اور وقت واپسی پر مجھ سے آکر بات چیت کرنا، سمجھ گئی ”نومر سنگ نے جواب دیا،“ یہاں کس کے پاس گپ شپ کے لئے فاضل وقت ہے۔ اوں ہوں، ہاں سنئے البتہ منڈی میں ہم نے اپنے اوقات کار کی کچھ ایسی درجہ بندی کی ہے کہ پرسوں (اگر ہو سکا) ہم فصل کٹنے کے دوران تمہارا ہاتھ بٹا سکیں گے۔“ اور پھر وہ اپنے شانوں پر پڑی ہوئی چوٹیوں کو اچھالتی ہنسی، کو دتی رخصت ہو گئی۔

سٹو اور اس کے آدمی پھر دوبارہ گڑھوں میں اتر کر اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ وہ سب کے سب پسینے میں نہا رہے تھے لیکن اس عالم میں بھی انہوں نے پل بھر کے لئے بھی اپنے کام سے منہ نہیں موڑا۔ یہاں تک کہ تمام ”حسن نادیدہ“ مکمل طور پر

پہلے کسی جود سے اٹھا کر شلموں کی ہر تہ پر پھیلا نہ ہے۔ شلم گرم موسم میں تو ٹھہر نہیں سکتے۔ اسی لئے یہ بات بھی غور طلب ہے کہ شلم بھی طرح ڈھکے رہیں تاکہ وہ محفوظ رہ سکیں۔

سٹو نے دوڑتے ہوئے چلا کر کہا۔ ”آپ بالکل مطمئن رہیں ہمارے اس سال کے ”حسن نادیدہ“ گزشتہ کئی سالوں کے مقابلے میں کہیں بہتر رہیں گے۔ اور میں خود بھی ان پر زیادہ سے زیادہ توجہ دوں گا۔ سطح زمین پر کہیں دراڑیں باقی نہیں رہیں گی اور وہی انہیں قبل از وقت کریدنا سہلئے گا۔ جب بہار کے میلے میں ہمارے شلم غنڈی بھیجے جائیں گے تو اس بات کی میں آپ کو ضمانت دیتا ہوں کہ ہمارے شہر کے چھوٹے بڑے سب ہی انہیں حاصل کر کے خوش ہوں گے۔“ اتنا کہنے کے بعد وہ اپنے دوسرے ساتھیوں میں شامل ہو کر گڑھے کو دھکے کے لئے رخصت کے ساتھ چل پڑا۔

تیسرے پہر یکا یک موسم میں تبدیلی واقع ہوئی۔ بادلوں کے لمبے چوڑے خول کے غول باد بانی جہازوں کی مانند شمال کی سمت کھیتوں کے اوپر دھند کی شکل میں چھانے لگے۔ سٹو فنگ نے تشویش آمیز نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا اور زیر لب بڑ بڑایا۔ ”عجب آسمان پر سمورے ٹیالے رنگ کی تہ چڑھ کر انہیں پہلی سفیدی میں نمایاں کر رہی ہے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ یا تو ہوا کے تیز جھکڑ چلیں گے یا پھر بارش ہوگی۔“ ابھی مشکل ہی سے اپنے بڑے بوڑھوں کی سنی سنائی اس کہادت کو اپنی زبان پر لایا ہی تھا کہ ایک مانوس (مصنوعی) کرخت آواز پیچھے سے اس کے کانوں نے سنی۔ ”ساتھ! کیا آپ کی جمیعت کے پارٹی سیکرٹری یہاں ہمیں موجود ہیں؟“ سٹو فنگ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو عمر سبزی فروش سنگ کی آواز ہے۔ جو سائیکل گھماتی ہوئی کھیتوں کے ایک کنارے پر چلی آرہی ہے۔

آغا: یہ تم ہو! بتاؤ کیسے آنا ہوا۔ سٹو نے لڑکی سے دریافت کیا۔ لڑکی نے چٹان پٹان دو ٹوک جواب دیا۔ ”کیوں جناب اگر

اس بات سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس پر
بھاری ذمہ داری عائد تھی اس کا وزن بھی اس کے دماغ پر بڑھ
بنا ہوا تھا۔ وہ ان سے مخاطب ہو کر بولا:

عزیز ساتھیو! میں شہر سے ابھی واپس آ رہا ہوں جینڈیکو
اور اس پڑوس کی کمیٹیوں نے ہم سے ”حسن نادرہ“ کی ترسیل کی فو
فرمائش کی ہے۔ ہمیں اب اپنے بندے ٹکے خود پسندانہ اور فساد پر
کو ختم کرنا ہو گا۔ رجحانات کے بدلتے ہوئے اس دور میں ہمیں اپنے
منصوبوں کو نئے سانچوں میں ڈھاننا ہو گا۔

ان کارکنوں میں سے کسی ایک نے تشویش اور اضطراب کے با
جیلے انداز میں دریافت کیا:

”انہیں کتنی چھابڑیوں کی ضرورت ہے؟“ جی نے بر ملا جواب د
”اتنی جتنی ہمارے ذخیرے میں موجود ہیں۔“ کیا کہا آہ
نے: ”ایک اکثر قسم کے نوجوان نے جھٹاکر کہا۔“ ان کا بقیت اندیشہ
سے کون جا کر کہہ۔ انہوں نے ہمیں پہلے سے کیوں نہیں بتایا۔ ہم نے کچھ
ہی دیر پہلے تو اتنے ڈھیر سارے شہجوں کا ذخیرہ کیا تھا۔ کیا یہ ہمارا
آئنی زبردست کھدائی بغیر کسی مقصد کے رائگاں چلی جائے گی دھلا
ہی سوچئے)

لسٹو فانگ جو اس وقت آلتی پالتی مارے زمین پر بیٹھا ہوا
کچھ زیادہ ہی کبیدہ خاطر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نوجوان نے بیکنگ
کی منڈی میں عمدہ ترکاری کی معقول رسد کا جو بیڑا اٹھایا تھا اور
اُس کی تمام تر کاوش اس ضمن میں ہر فرد گذاشت سے نمبر اتھی ظاہر ہے
اس تبدیلی کار سے اُس کے ذہن پر پریشان کن خیالات کا ہجوم محض
ہئیت میں عود کر آیا۔ لسٹو کا تردد اپنی محنت کے رائیگاں جانے کے
سبب سے نہیں تھا بلکہ وہ کچھ اور ہی بات تھی جس سے وہ طول نظر
آ رہا تھا کچھ وقفے کی خاموشی کے بعد اس نے اپنے جسم کے پورے
تناؤ کے ساتھ اپنے پاؤں کو زمین پر ماما اور پارٹی سیکرٹری پر اپنے
احساس قلب کو پوری کیفیت سے روشناس کرانا چاہا۔ اس نے کہہ

محفوظ طریقے سے ڈھانک دیئے گئے جب کام ختم ہو گیا تو سٹو اتنی گڈے
کے اندر سے تھلا بازی کی شکل میں اچھل کر باہر نکل آیا۔ معاً اس کا سابل
شمال مغرب کی تیز دھند ہوا سے پڑا جو کھیتوں کو اپنی برقی رفتار سے
لرزہ برآمد کر رہی تھی۔ اپنے چہرے پر جے ہوئے پسینے کو پوچھتے ہوئے
لسٹو نے کارکنوں کو آواز دے کر اکٹھا کیا اور کہا:

ساتھیو! اب ہوا کے کتنے ہی زور دار جھکڑ چلیں ہم نے اپنے
شہجوں کو محفوظ کر دیا ہے۔ پھر وہ اپنے بلیچوں کو اکٹھا کر گھر جانے کی تیاری
میں مصروف نظر آنے لگے۔ اسی دوران ایک بچہ کافی سی آواز انہیں سنائی
دی۔ ”ادھر دیکھیے سامنے کون بڑھا چلا آ رہا ہے؟“ انہوں نے اپنی نظر
دوڑائی تو معلوم ہوا کہ یہ تو ان کا اپنا پارٹی لیڈر ہے جو دھول اور
خاک سے اٹی ہوئی سڑک پر تیز قدم بڑھائے ان کی سمت چلا آ رہا
ہے یہ (آنے والا شخص) جی جو عام طور پر مستعد اور کم سخن نظر آتا تھا
اس وقت اس کے چہرے سے تردد کے آثار نمایاں تھے۔ لسٹو بہت ہی
پر جوش انداز میں اس کے بغیر مقدم کے لئے آگے بڑھا اور اس سے کہا
”غیر تو ہے اگر آپ کو (خدا نخواستہ) شہجوں کے بارے میں ایسی ہی
تشویش ہے تو آپ اپنے طور پر اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔ انہیں اچھی طرح
اندر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ ان میں ڈھکے ہوئے گڑھوں کو آپ دیکھ
رہے ہیں نا۔“

جی گڑھوں کی طرف جانے لگا۔ اُس کی جھاڑ جھنکاڑ بھریں اس
وقت تل کھا رہی تھیں میرا خیال ہے تم لوگوں نے اپنا کام زیادہ جلد
میں تو نہیں کیا ہے۔“

یہ سوال کچھ ایسا غیر متوقع تھا کہ لسٹو کے تمام کے تمام ساتھیوں
نے اپنے بیلچے زمین پر رکھ دیئے اور پارٹی سیکرٹری کو اپنے گھر سے
میں لے لیا۔ ان لوگوں کی آنکھوں میں جھلکتے ہوئے (نیم لرزاں اخوت
کو پارٹی سیکرٹری نے تاڑ لیا۔ ویسے تو جی کو ان کی مرگم کار اندازی
کا اندازہ ہو چکا تھا اور اس نے محسوس بھی کر لیا تھا کہ ان سب نے
بہر صورت اپنا کام دن چھپنے سے پہلے ہی انجام دے دیا ہو گا اور جی

جولائی، اگست ۱۹۷۶ء

ہیں لیکن عوام کی خدمت کی بجائے اوری میں جذبات کو پیاؤں سے نہیں تپا جاتا۔ ہمیں اپنے حسی نادیدہ کے پورے ذخیرے کو فوراً منڈی پہنچا دینا چاہیے اور اُس کے ساتھ ساتھ ان نم گرم کیسا دیوں میں اُن سے بھی زیادہ تعداد میں حسی نادیدہ کی رقم ریزی بھی شروع کر دینی چاہیے اس صورت میں ہماری سبزیوں کی اقسام میں اور زیادہ اضافہ ہوگا۔ اگر ہم اس پر عمل پیرا ہو سکیں تو ہمیں نئی بنیادوں پر نیا توازن حاصل ہو سکے گا۔ اس موسم سرما میں اب ہم اتنے زیادہ شلیم نہیں بوئیں گے جتنے کہ ہم نے اب تک بوئے ہیں اور جن شلیموں کو اب تک فروخت کیا جا رہا ہے (گھراؤ مت ساقیو!) ہم اس موسم بہار کی خوشی میں پیکیگ کے شہریوں کو کثیر تعداد میں انواع و اقسام کی سبزیوں کے تحفے دیں گے؟

(پچ پوچھتے تو) جی کی واعظانہ تقریر نے ان محنت کشوں کے اجتماع میں ایک تحریک کو جنم دیا تھا چنانچہ جیسے ہی جی کی تقریر اختتام پہنچی وہ اولوالعزم نوجوان اپنی استینیں چڑھا کر نئی جہم کے لئے آمادہ پیکار ہو گئے بزرگ کاشتکاروں نے ان نوجوانوں کے عوامی جذبے کو بے حد سراہا۔ سٹوٹانگ اپنے مضبوط شانوں کو فضا میں ہر اکر زور سے دھاڑا: "ساقیو اگر اسے اب سب کا فیصلہ سمجھا جائے تو آج ہی رات گئے ہم حسی نادیدہ کو گاڑیوں میں لا کر شہر پہنچانے کی ہمت کرتے ہیں۔"

اودی مائل زعفرانی شام نے اپنی نقاب اڑھا کر کھیتوں کو روپوش کر دیا تھا۔ لمحہ گاؤں کے باشندے چھوٹے بڑے سب ہی حسی نادیدہ سے بھری ہوئی گاڑیوں کے کارواں کو جلوس کی شکل میں سڑک پر سے گزرتے ہوئے دیکھنے کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ رات گئے تک قومی شاہراہ چین پر یہ تنہا نا کا دواں دواں تھا۔ سڑک نہایت کشادہ اور حد نظر تک سیدھی دکھائی دے رہی تھی۔ دائیں بائیں کے کھیت فاصلے فاصلے تک پھیلے ہوئے تھے جنہیں شام کے گہرے سائے اپنا اثر جا کر تاریکی میں ڈبوئے جا رہے تھے سبزی سے لدی ہوئی گاڑیاں رات کی تاریکیوں کو کائناتی چھانٹتی گزرتی چلی جا رہی تھیں۔ ان کے عقب میں روشنیوں شہر کی قد تللیں ستاروں کے جھرمٹ معلوم ہو رہی تھیں جو ایک خواب اور منظر پیش کر رہی تھیں۔

(۲) تو آپ کو معلوم ہی ہے اہم ماہ بہ ماہ بلکہ روز بروز اپنی منصوبہ بندی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے رہے ہیں اور ہم نے اس پر سختی سے عمل کرنا ہو کر یہ بھی ثابت کیا کہ ہماری سبزیوں کی رصد کا مناسب طور پر توازن قائم رہے اب وہ لوگ ہم سے یہ فرمائش کر رہے ہیں ہم اپنے "حسی نادیدہ" کا سارا شاک اُن کے ہاتھوں فروخت کر دیں (آپ ہی خود کیجیے) جب اُنھیں موسم بہار اپنے ساتھ بہار کی خوشیاں لائے گا اُس وقت ہم صورت حال کی مطابقت کے ساتھ اپنی رصد کی کس طرح ضمانت دے سکیں گے؟ جی لستو کے تاثرات معلوم کر کے صرت مسکرا دیا پھر اس نے لستو سے کہا: "بھئی دیکھو ہم نے اپنے حسی نادیدہ پر آج کل بڑا نقاب ڈال رکھی ہے اُس سے اس بات کا کیا جواز پیدا ہوتا ہے اور کیا ضمانت ہے کہ وہ تمام ذخیرہ متوازن رصد کی ضمانت بن جائے گا؟ ان محنت کشوں میں سے کس ایک کی آواز اُٹنی؟ کیوں نہیں بن جائے گا صاحب؟" چنانچہ کہا "بھئی اس لئے کہ بعض سبزیوں کی مانگ میں ہر وقت توازن برقرار نہیں رہتا م دیکھ رہے ہو چین میں ذہنی انقلاب کس قدر تیزی سے قدم بڑھا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہمارے عوام کے معیار زندگی میں نمایاں تبدیلی ہو رہی ہے دوسرے الفاظ میں ہم لوگ جن کا شمار منڈی میں رصد پہنچانے والوں میں ہے اُن پر تو مسلسل زیادہ ہی مانگ کا دباؤ پڑے گا اس لئے منصوبے کی ہم فوری تبدیلی مستقبل کے لئے اچھا پیش خیمہ ہے کسی کی آواز اُٹنی؟ "اچھا پیش خیمہ" وہ کیسے؟ "چنانچہ جواب دیا۔ "اچھا پیش خیمہ اس لئے کہ حسی نادیدہ کی اچھی فصل تیار ہوتی ہے۔ اگر ہم انہیں فروخت کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں محض یہ سوچ کر کہ اُن کی مانگ فوری ہے تو ہم غلطی کے مرکب ہوں گے اور دیہی شلیم ہمارے لئے بحالت ذخیرہ نمودی قرضے کی شکل اختیار کر لیں گے خود ہی سوچو ہم اتنی بڑی ذمہ داری کے ساتھ اس قرضے سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ جی کی آنکھوں میں خود اعتمادی اور پیش بینی کا کون سا پیکر رہا تھا۔ اُس کا نقطہ نظر ہر قرضہ عہدہ اندیشی پر مبنی تھا (خیالات کی رو میں وہ کہے چلا جا رہا تھا)۔۔۔۔۔ اگر ہم ہماری سبزیوں کے کھیت صرت سیکنڈوں ایکڑ کے رقبے میں محدود

نا آسودہ تمناؤں کا سفر

فضل قدیر

گئیں۔ اور اکلوتا تو تالا لونڈا معراج چرخ کر باپ کے پیروں سے لپٹ جاتا۔

نثار حسین کو ایک دم بڑیک لگ جاتا اور ان کا تانا ہوا ہاتھ نیچے گر پڑتا۔ چند ساعتوں کے بعد پھر کسی شدید جذبے سے بے تاب ہو کر وہ دھڑا دھڑاپنا منہ پھینکا باہر نکل جاتا

اس کے باہر نکلنے کے معنی کئی دن تک گھر سے بیڑ حاضر ہی کے ہوتے۔ ایسے موقعوں پر وہ ہیرامن کے پندوپ سے نکل کر ریل بانار میں اپنے ایک بچپن کے دوست شیر محمد حجام کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ شیر محمد جو سماجی لحاظ سے اس سے بہت نیچے تھا اس کی بڑی آؤ بگٹ کرتا۔ اس کی آمد کو عزت افزائی سمجھ کر وہ اس کے آگے بچھ بچھ جاتا۔ گرم راتوں میں اسے دیر تک پٹنگھا جھنڈا رہتا۔ اس کی داستان غمنا بڑے مودب انداز میں ایک آدھ جگہ اسے ٹوک بھی دیتا۔ ”وہ اب دیکھنا نثار بھیاں شروع ہی سے آپ کو شوہر بننا نہیں آیا۔ آپ اگر پہلے ہی دن تیور دکھا دیتے تو آج دیکھنا نہ پڑتا۔“

نثار حسین ایک دم پھٹکارتا، ”اوہ ہو۔ تیور تیور کیا معنی کیا اب میں کنجڑے قصابیوں، تانی، تیلیوں کی طرح ڈنڈے کر کھڑا ہوجاتا۔“

والدہ ایک عجیب و غریب خاندان تھا۔ اس کا ہر سرد ایک دوسرے سے نبرد آزما تھا۔ وہ ایک دوسرے سے شرمندہ تھے وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے ان کی سب سے بڑی بد قسمتی یہ تھی کہ ان کی بڑیاں کسی بھی سماجی گروپ میں پیوست نہیں تھیں ان سب میں بعد المشرقین تھا وہ سب مشیت کے ہاتھوں مجبور تھے جس نے انہیں اس گھر میں ان کی مرضی دریافت کئے بغیر وحلیل دیا تھا۔

بیگم آصف اپنے شوہر سے تالاں تھی۔ وہ نہایت گھٹیا شخصیت اور لڑا کو تھا۔ بیگم آصف کا شوہر نثار حسین جو مقامی میونسپلٹی میں اکاؤنٹنٹ تھا اپنی بیوی سے متنفر تھا اس کا کہنا تھا کہ وہ بے حد اتڑی، چھوڑی اور پیچ ہے۔ بڑے آدمیوں کی نقالی کرتی ہے۔ جب کبھی وہ اپنی بچیوں کو کاونٹ میں داخل کرنے کے منصوبے پر بات چیت شروع کرتی تو حقیقت میں شوہر منہ پڑا کر اپنی مخصوص ہنسی جیسے ہونے کہتا۔ ”گھر میں نہیں دانے اماں چلیں بھانے“ اور سنگ کر اول فول کہنے لگتی جس میں اپنے شوہر کی کنوسی، ذالت اور گھٹیا پن کے طعنوں کے علاوہ اس کی جہانی حیثیت پر کھلی ہوئی چوٹیں ہوتیں۔

شوہر اونٹوں کی طرح بلبلا مٹھیاں جھینچ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ ایسے موقعوں پر دونوں بیٹیاں شوکت آرام اور راشدہ بلک بلک کر رونے

ایسے کیا واقعی لمحہ میں ملاوٹ کیا خدا کے لئے جلدی سے اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ فارم بھر دو۔ یہ سب خدا کے ہاں دیر ہے اندر میر نہیں۔ خدا نے میری جیسی اب ایک دن کیپٹن کی وردی تمہارے بدن پر ہوگی۔ مفت کے دو نو اور دلی ہوں گے۔ ہمارے بچے بھی کانٹ میں پڑھ سکیں گے۔ میں تو کہتی ہوں نیر آپا کے منہ پر اندر میاں نے لما نچہ مارا ہے بڑا غرور ہے انہیں اپنے میاں کی کپتانی پر۔۔۔۔۔ اب اللہ نے ہماری بھی سن لی ہے۔ اب دلدر دور ہوا چاہتے ہیں خدا کے لئے اپنا فلسفہ بگھارنے نہ بیٹھ جانا یہ از غیب سے سامان ہوا ہے تمہارے لئے۔۔۔۔۔ بھئی ایک بات میں بتائے دیتی ہوں۔ مجھ سے یہ کبوت کا پور کی گرمیاں اب نہیں گزاری جائیں چاہے تم کچھ کہو میں تو مسوری یا نیسی تال میں کوئی ہٹ کوئی جھوٹری لے کر اپنے بچوں کو وہاں لال کر یہ کبوت گرمیاں تیر کر لیا کروں گی۔ نثار حسین کی زبان لو کھڑا گئی۔ آر آر بھئی یہ یہ کیا گورکھ دہندہ بننے بیٹھ گئیں۔ اتنی اونچی اڑان ٹھیک نہیں میں بچارا ایک اکاؤنٹ ہوں مجھے کون کنگز کمیشن دے دیں گے یہ لال منہ کے بندر بہت ملا تو جو نیئر کمیشنڈ آفیسر کا رینک مل جائے گا یعنی صوبیدار۔

آصف نے زانو پر دو ہنٹر مارا۔ غضب خدا کا مجب نیلجا مردودا ہے۔ منہ لیڑھا کرتے ہوئے اس نے نقل کی۔ ”میں مہری کا ایک کیڑا ہوں مہری ہی میں پڑا رہوں گا۔ مجھے مہری بھا میں پڑا رہنے دو۔“ آصف سوچو تو ذرا بات تو منلو تم تو مجب جذباتی عورت ہو۔ بھلا حقائق سے کیوں کر آنکھیں چرائی جا سکتی ہیں۔ یہ تمہارے حسین خوابوں کے محل اگر آڈاڈا کر دھڑام سے گر پڑے تو۔۔۔۔۔ نثار حسین نے مضطرب انداز میں بیوی کو قائل کرنا چاہا۔ مگر جس قدر وہ اونچے بچے بھلاتے گئے۔ آصف کا پارہ غضب اتنا ہی اوپر چڑھا گیا۔

صاف بات یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ کم ہمت ہو جنگ سے ڈرتے ہو۔ اپنی تقدیر ہمت اور کوشش سے بدلنے کا حوصلہ نہیں اس انتزاعی کا یہی مطلب ہے۔ تمہیں کیا معلوم لوگ کن کن جتنوں سے

ایسے موقعوں پر شیر محمد حجام کچھ کھا پڑھا ہمارا جھکا کر دھاہت سے کہتا۔ نثار میاں کھڑے قصائی اور ناکی بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ ساما خضر پیسے کا ہوتا ہے۔

نثار حسین ایک دم گڑبڑا سا جاتا۔ ”ارماں شیر محمد تم واقعی غلام تھے میری مراد ناٹیوں سے نہیں کھڑے قصائیوں سے تھی وہ ادھ معاف کرنا تمہیں رنج پہنچا۔“

شیر محمد بڑے طنزیہ انداز میں اسے دیکھ کر مسکراتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ نثار میاں تم جو بڑے شریف ہو، نثار میاں تم جو بڑے خاندانی ہو۔ ذرا اپنی شرافت میں جھانکو تو تمہاری جو رو نے آج نہیں ہم جیسوں کے ہاں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور میں جو ایک حجام ہوں۔ عرف عام میں کیسی میری جو رو نے تو آج تک مجھ سے سر ڈھکے بغیر بات نہیں کی۔ لیکن شیر محمد کے منہ سے یہ تمام باتیں نکلتی نہیں تھیں وہ ایک خاموش سی مسکراہٹ سے سر جھکا لیتا۔

اس خاندان کی زندگی اسی طرح بسر ہوتی رہی۔ پھر کچھ دن بعد دوسری عالمی جنگ چھوڑ گئی۔ ہر طرف ایک افراتفری کا عالم تھا۔ دھڑا دھڑا فوجی بھرتیاں ہو رہی تھیں اور لگی محلوں کے ہوٹلوں پر جرمن کے تازہ حملے کی سنسنی خیز خبریں بات چیت کا موضوع بنی ہوئی تھیں۔

گرمیوں کے دن تھے نثار حسین اور بال بچے مختصر آنگن میں لیٹے ہوئے تھے۔ چاند ایک جلے دل عاشق کی طرح آہیں بھرتا معلوم ہو رہا تھا۔ بچے غافل سو رہے تھے مگر نثار حسین اور ان کی بیوی کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ نثار حسین نے پنکھا بھلتے ہوئے کہا۔ ”آجی میں لے کہا سنتی ہو۔“

آصف نے کروٹ ہڈی۔ ”ہوں۔ کیا بات ہے۔“

دفتر میں سرنگر آیا ہے کہ جو اہل کار فوجی خدمت کے لائق ہیں اور رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات۔ فوجی خدمت کے لئے پیش کریں گے ان کو ترقی دی جائے گی۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے اپنے دن بھی پھر جائیں۔ نثار حسین کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ آصف اچک کر پٹنگ پر بیٹھ گئی۔

بڑھاتے ہیں۔

نسیم آپا کے میاں کیپٹن الطاف نے 'یا نہیں کیا۔ ارے خدا بخشے' منجھلے چپا بتاتے تھے کہ فوجوں کی مید تک صاف کی ہے۔ انہوں نے بھرتی ہو کر ہانگ بنائے گئے تھے۔ پھر انڈیہ دن پھر سے ایک انگریز کرنل کا دل ایسا مٹھی میں کیا کہ اس نے انہیں جو ترقی پر ترقی دی ہے کہ اللہ اکبر..... اور آج بیگم صاحبہ بڑے مختے سے کہتی ہیں میرے انوکو گری کی تاب نہیں میری فیما انٹلی پاسر کے علاوہ کوئی بسکٹ منہ پر نہیں رکھ سکتی۔..... اللہ کی شان ہے صاحب۔

نثار حسین اتنا بولے کہ ان کا گلا خراشیدہ ہو گیا۔ آخر تھک کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنا شروع کیا۔ ابھی میری شہادت نکال میں کوئی اور مسز انجوز کر دی ہوئی یہ حرم کی ماری جو روجھ پر کیوں تازل کر دی اور اگر کرنا ہی تھا تو اس کے ایک چچی کی بیٹی کی شادی بڑاوی فوج کے ایک کپتان سے کیوں کروادی ایک تھکا ہوا گھوڑا ایک برقی دو موٹر کار کی سگت کس طرح کر سکتا ہے؟ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیوں کر اس تہی ہوئی تلوار سے بچیں۔ یہ تلوار جوان کی ایک نادان گفتگو نے آج کی شب ان کے سر پر تان دی تھی۔ پھر ان کا خیال نسیم کے شوہر کیپٹن الطاف کی ذات میں الجھ گیا۔ انہیں خیال آیا شادی کے کچھ ہی عرصے بعد ان کی بیوی نے کسی روم میں انہیں بتایا تھا کہ کیپٹن الطاف ان پر لٹو تھے..... اس وقت تو انہوں نے یہ ہی سوچا تھا کہ عورتیں اپنی مارکیٹ ویلیو بڑھانے کے لئے اکثر ایک خیالی عاشق تخلیق کر لیا کرتی ہیں مگر آج اس خیال کے منتشر ٹکڑے ایک میکانیکی عمل سے آؤ خود جڑتے جا رہے تھے۔ اور ڈوبے وقت کے لمحے نامعلوم کس کنوئیں سے دوبارہ طلوع ہو رہے تھے۔ آج انہیں سیمہ کی پہلی سالگرہ کا وہ موقع یاد آ رہا تھا جب کیپٹن الطاف کو دیکھ کر ان کی بیوی کی کنپٹیاں تپتا اٹھی تھیں اور شاید ایسے ہی موقعوں کے لئے کسی نے کہا تھا: 'تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں' مگر وہ خاموش پڑے کھولتے درمچ ہوتے وہ مارکس سے جا بچھے جس نے سرمایہ داری کو تمام برائیوں

کی جڑ قرار دیا تھا۔ آج نثار حسین بھی اس کے ہم خیال تھے اور سوچ رہے تھے یہ سب کچھ اس خاندان میں نسیم کے عام سطح سے بلند ہو جانے کی بدولت ہوا نہ وہ اتنی اونچی ہوئی اور نہ ان کی بیوی پر یہ آئے دن کے دورے پڑتے۔

سورج نکلا وہ اٹھے غسل کیا کپڑے بدلے اندھا سیدھا ناشتہ حلق کے اندر دھانسا مگر اب بیوی نے پھر ٹانگ لی۔ "اگر آج تم نے فارم نہ بھرا تو گھر میں نہیں گھسنے دوں گی۔" بڑی دیر جھائیں جھائیں ہوئی آخر جلد بھرا انہوں نے آخری فیصلہ کر لیا اور دفتر کو چل دیئے۔

دفتر جاتے ہی انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ فارم پُر کر دیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔

فارم پُر کرنے کے ٹھیک پندرہ دن بعد ان کی ٹما کڑی ہوئی اور انہیں منوٹریننگ کے لئے بھیج دیا گیا۔

کانپور اسٹیشن پر ان کی رخصت کا منظر قابل دید تھا۔ ان کے گلے میں پھولوں کے ہار پڑے تھے، چھوٹے چھوٹے بچے ہر اسان کھڑے تھے مگر بچوں کی ماں بار بار لمبی لمبی تقریریں کر رہی تھی۔ "بچو اب ہم لوگ بہت جلد بیگلے میں رہا کریں گے۔ گریبوں میں نیلی تال اور جھاڑوں میں کانپور ہم اب کمین ڈیل روٹی کا ناشتہ کیا کریں گے۔ تمہارے ابو بہت جلد فوج کے افسر بن جائیں گے بھر تم لوگ گھوڑوں پر سواری کرنا، اربلیوں کی گودوں میں کھیلنا"

اور نثار حسین تصویر یاس بنے ڈبلے کے دروازے سے گئے اپنی ادھ کچری فصل کو دیکھ رہے تھے۔ اس لمحے ان کا سر گھوم رہا تھا۔ کبھی انہیں خود پر ترس آ رہا تھا اور کبھی اس نیک بخت کی ناآسودہ تمنائوں اور اراموں پر..... وقفے وقفے سے وہ یہ سوچنے لگتے "کچھ اتنی بڑی خطا تو نہیں کی اس عورت نے.... آخر جلتی دھوپ سے چھاؤں کی طرف ہر کوئی بھاگتا ہے۔ پھر خواب تو ہر ایک ہی دیکھتا ہے۔ خواب اگر نہ رہیں تو بڑے زمین

ہلاتے آگے نکل گئے۔

مئو میں چھ ماہ کی ٹریننگ کا عرصہ جیسے جیسے گزرا اور پھر وہ صوبیدار میجر بنا کر فوراً برما بھیج دیئے گئے۔

قریبی رشتہ داروں نے سینہ تمام کر کہا ”ہائے کیا خبطی بن گیا ہے اس شخص نے چین سے اپنے بچوں میں بیٹھا بیٹیں کرنا تھا کہ خود ہی جا کر سولی کا پھندا گلے میں پہن لیا۔“

نثار حسین کی بوڑھی ماں جو بہو کی تیز مزاجی کے باعث اپنے پرانے مکان میں رہنی چھینیں، رو کر بولیں ”اللہ اسے اپنے بچوں کے ساتھ سلامتی کے دوبارہ ملائیو۔ اللہ تجھ میں بڑی قدرت ہے۔“

نثار حسین کے لام پر جانے کے ۳ ماہ کے اندر ہی آصف کی زندگی میں ایک عجب تغیر پیدا ہو گیا۔ اب میاں کی چوبیس گھنٹے کی نگرانی اور دانتا کل کل ختم ہو جانے کے بعد وہ ایک آزاد چڑیا کی طرح چہچہانے لگی تھی۔ ہیرامن کے پڑوسے میں اب اس کا گھر ایک چھوٹا موٹا کلب سا بن گیا تھا جہاں صبح شام بڑی پُر لطف، محفلیں جمتیں۔۔۔۔۔ رشتے تاتے کے نوجوان کنوارے لڑکے اس کے ارد گرد منڈلاتے۔ ”آصف آہا، آصف آہا“ کہتے ان کے منہ خشک ہوتے۔ اس گھر میں دو لڑکیاں جوانی کے زینے پر تھیں جنہیں کچھ مذاق تو نہیں تھا۔ آصف کے آنکھ کے اشارے پر یہ لڑکے چھوٹے چھوٹے کاموں کو دوڑ پڑتے۔ خالو سلطان کا لڑکا کمال خیر سے شاعر بھی تھا۔ روزانہ شام کو وہ سامعین کو اپنا تازہ کلام نہایت ترنم سے سنانا۔ ایسے موقعوں پر نیمبو کے شربت کا دور مرہ دے جاتا۔ راشن کے آس زمانے میں جب چینی آنکھ میں لگانے کو نہیں میسر آتی تھی آصف کے ہاں چینی کا کبھی توڑا نہیں پڑا۔ جب چہچہا ختم ہونے لگتی تو آصف کسی وائٹنر قسم کے بھائی جیتے کی طرح ”آج شربت کا دور نہیں چلے گا چینی ختم ہو گئی ہے۔“ یہ سنتے ہو جیسا مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے۔ ”اماں آصف آہا حد کرتی ہر

پہر زندگی ختم ہو جائے۔ ساری امیدیں ختم ہو جائیں۔ ساری کشمکش ساری لہر بہر ختم ہو جائے۔“

سر می سے تمنائے لال منہ کے انگریز فوجی افسر کھڑکھڑاتی در دیوں میں اپنے جوتے چمڑے پلٹ فارم پر بڑے پُر خشونت انداز سے اوپر پٹچے دوڑ رہے تھے۔ خولچے والے دیھے سروں میں آوازیں لگاتے ادھر ادھر نہیں رہے تھے۔ ایک ملائی کی برف کی ہتھ کاڑی کو دیکھ کر نثار حسین کے اکوتے لڑکے نے ٹھکانا شروع کر دیا۔

”اتو میں ڈنائی ٹی ڈنف مٹاؤں ڈا۔“ داتو میں ملائی کی برف کھاؤں گا۔

ماں نے بچے کو بری طرح ڈانٹ دیا۔ ”خبردار چپ کر ملائی کی برف سے گلا خراب ہو جائے گا۔“ مگر نثار حسین کے جذبات ایک دم اٹھ پڑے۔ انہوں نے جیب سے دس روپیہ کا نوٹ نکالا اور برف والے سے کہا سب بچوں کو برف کھلا دو جس قدر یہ کھائیں۔

بیوی نے انہیں گھورا۔۔۔۔۔ تو وہ ہونٹ پھڑپھڑا کر بندھے گلے سے بڑ پڑائے۔ ”معلوم اب ان کی فرمائشیں پوری کرنے کا موقع بھی ملے گا یا نہیں۔“ انہیں روزانہ دیکھ کر بچے آئس کریم کھانا بھول گئے اور سب باجماعت رونے لگے۔

پورے کنبے کو روزانہ دیکھ کر ایک انگریز فوجی افسران کی طرف بڑھا۔ اس نے بڑے پرتپاک انداز میں صورت حال دریافت کی۔ بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا نثار حسین کو قائل کیا۔ ”وَل آپ ایک دم کمزور کمزور۔ آدمی۔ ہیر میٹیز کی لینڈ فورس میں بھرتی ہونا آرزو ہے۔ آرزو۔ ہر کوئی جنگ میں مرتا نہیں آپ لوٹے گا اپنے بچہ لوگ میں۔“ نثار حسین آنسو پی کر خاموش ہو گئے۔

کئی گھنٹے کھڑے رہنے کے بعد گاڑی چلی تو پھر سارے بچے کورس میں رونے لگے۔ اور نثار حسین دروازے میں کھڑے ہاتھ

ہونے لگا تھا تو وہ ہانپتے پھنھناتے بہن کے گھر پہنچے۔
 ”ارے بمبئی سنتی ہو آصفہ.... میں یہ کہنے آیا ہوں کہ خدارا
 اپنے مرے ہاں باپ پر رحم کرو۔ جو کچھ اس گھر میں ہو رہا ہے وہ
 ان کی شرافت کو خاک میں ملا چکا۔ مگر اب اللہ اپنی جوان بچیوں
 کو مت ڈبو۔“

آصفہ نے لال پیٹے ہو کر بڑے بھائی کی وہ درگت بنائی کہ
 وہ روتے ہوئے اسٹے پاؤں گھر سے نکل گئے۔

اور پھر اس خاندان میں بڑے بڑے واقعات رونما ہوئے
 شوکت آراء کی کئی منگنیاں ٹوٹیں۔ راشدہ کے کئی رومان بھڑے
 اور آخر میں آصفہ کی پیٹ کی رسولی کا جب اپریشن ہوا تو ایک
 زلزلہ سا آگیا پورے محلے میں۔ اور ڈرافٹمین صاحب کی بیوی کو
 جب کوئی نہ ملا تو انہوں نے ایک دن آصفہ کے تونٹے لونڈے ہی
 کے چٹنگی لے لی۔ ”ارے منو تو وہ تمہاری ماں خیر سے بہا کے
 بیٹھ ہی گئیں نا“..... اور جب وہ کچھ نہ سمجھا تو انہوں نے مہترانی
 سے پوری وضاحت کر دی۔

ابھی زمانے میں جنگ ختم ہو گئی اور ایک دن نثار حسین فلیپ
 گولے کی طرح آٹپکے۔ محلے والوں نے بڑے ظرف کا ثبوت دیا
 کسی نے منہ تک نہ کھولا۔ مگر ڈرافٹمین صاحب کی بیوی جب
 زیادہ بلبلائی تو نثار حسین نے اس میں مفر سمجھا کہ محلے سے نقل مکانی
 کر کے کہیں اور اٹھ جائیں۔

ان کے محلے سے چلے جانے کے بعد میرے ذہن سے یہ
 خاندان معدوم ہو گیا۔ دن پردن گزرے سال پر سال پھر کٹی
 پتنگ کی طرح ڈوتا میں جب ۱۹۵۰ء میں کراچی پہنچا تو ایک دن
 مکان کی تلاش مجھے لالو کھیت لے گئی۔ خاک چھانتا جب ایک
 ڈبیا سگریٹ خریدنے ایک پرچون کی دکان پر پہنچا تو یہاں میں
 نے نثار حسین کو ترازو تھاڑے چینی تولتے دیکھا ”نثار بھائی“ میں
 چیخا..... اور نثار حسین ترازو چھوڑ کر سینے سے لپٹ گئے۔ بڑی

اپنا ہنسا دی ہو ارے صبح کہہ دیتیں تو چینی کے پہاڑ لگا دیتا۔ اچھا ٹھہرو
 دو چار سیر بھی پیدا کئے دیتا ہوں۔“ بچھو بھائی تھیلے کنگل جانے
 اور واقعی آدھ گھنٹے میں چار سیر چینی کنٹرول ریٹ پر لا کر ڈھیر
 کر دیتے۔ بچھو بھائی اور چینی لازم و ملزوم تھے۔ پورے ایک سال
 بعد یہ عقدہ پرچونے کی بیوی مٹھن مائی نے کھولا اس نے بتایا کہ
 بچھو میاں بلیک میں سمار روپیہ سیر چینی اس کی دکان سے دوسرے
 تیسرے دن خریدتے رہتے ہیں۔ واقعی وہ بلا کے بنڈل باز تھے
 چار روپیے سیر چینی لے کر آصفہ آپا کو سوار پیٹے سیر دیتے
 تھے۔ اور لطف یہ ہے کہ ہمیشہ بھی کہتے تھے کہ راشن کنٹرول ران
 کا بڑا دوست ہے انہیں کنٹرول ریٹ سے بھی سستی چینی دلاتا ہے
 ان کے اس اثر و رسوخ سے آصفہ بہت متاثر ہوتی تھی وہ بار بار
 اپنی بڑی بیٹی شوکت آراء سے کہتی۔ ”ایک تمہارے ابو ہیں گو بر
 کا چھوٹے ان کے لئے کوئی چیز ممکن ہی نہیں تھی۔ اور ایک ہمارے
 بچھو بھائی ہیں کہ گولہ کا پھول بھی کہو تولے آئیں۔“

یہ شخصیں بہت زمانے تک چلتی رہیں۔ پھر کچھ کم ظرف لوگوں
 نے انپ شاپ اڑانی شروع کر دی۔ پڑوس میں ڈرافٹمین صاحب
 کی بیگم نے کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا۔ بیٹوں کی کمائی کھا رہی ہے
 خدا نے بلی کے بھاگوں چھین کا توڑا ہے۔ نثار حسین کو لام پر لہردا
 کر اب کھیل ہو رہے ہیں کھیل۔ !!

اور جب نبو صاحب کے آوارہ پوت لکن نے شوکت کے
 نام رقعہ بھیجا۔ اور چھوٹے آکانے اس کی پٹائی کی تو بات جنگل کی
 آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور آصفہ کے بڑے بھائی تحمل حسین جو ریل بازار
 میں مولویانہ انداز سے زندگی گزار رہے تھے ضبط نہ کر سکے نثار حسین
 کے لام پر ہاتھ ہی آصفہ نے انہیں بڑی ذلیل نظروں سے دیکھنا
 ع کر دیا تھا وہ موقع بے موقع انہیں جلی کٹی سنا دیا کرتی تھی۔
 وہ عزیز اور انتہائی عینویر انسان تھے اس لئے انہوں نے
 کے گھر میں قدم رکھنا چھوڑ دیا۔ لیکن اب چونکہ ہائی سٹر اوپر

معلوم ہوا یہ آپ کے میاں ہیں۔ لالہ زار کا لونی میں کہیں رہتے ہیں پہلی بیوی مر چکی ہے۔ میں نے اپنے دل میں سوچا چلو اچھا ہوا ٹھکانے سے کہیں بیٹھ تو گئی۔

پانچ سچ سال ہی گزرے ہوں گے کہ ایک صبح اخبار نے یہ خبر سنائی کہ شوکت بیوہ ہو گئی ہے۔ دوڑا ہوا اس کے گھر پہنچا کہ نعل صاحب کو گمراہ تو پا دے دعائے مغفرت کی اور تسلی کے دو بول کہہ کر گھر آگیا۔

پھر بہت سی باتیں سننے میں آتی رہیں۔ کسی نے کہا پہلی بیوی کی اولاد نے گھر سے نکال دیا ہے۔ شادیاں کروانے کا کاروبار کر لیا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں سے آشنائی کر لی ہے۔ کوئی کہتا ساکھ شہر کو پسند آگئی ہے عرصہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

ایک دن سیٹلائٹ ٹاؤن کے کمرشل سنٹر میں پان سترہ تھے ہوئے شوکت سے ملاقات ہو گئی۔ تو وہ میری جان میں چمٹ گئی۔ اے واہ اٹکل آپ تو بلا کے سنگ دل ہیں آپ نے تو پلٹ کر خبر تک نہ لی۔ میں نے کہا ”بی بی مرے زندوں میں اب کچھ زیادہ فرق نہیں رہا ہے ہمیں مردوں سے زیادہ زندوں کا پر سادینا چاہیے کہ بے حیا ہیں جسے جلاتے ہیں۔“

وہ کھٹکلا کر ہنس پڑی۔ اس نے بتایا مرحوم کوئل کی پہلی بیوی کی اولاد نے ہر چیز پر قبضہ کر لیا ہے۔ سیٹلائٹ ٹاؤن میں ایک مختصر سا بنگلہ اس نے قبضہ لیا ہے اور یہاں وہ اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ رہتی ہے۔۔۔ اس کے گھر گیا کافی پی بچیوں کے نمر پر ماحفہ پھیرا اور چلا آیا۔ واقعی گھر بڑے سیتے سے چلا رہی تھی، صوفے، قابین، ریفریجریٹر۔۔۔ کچھ تھا۔

پھر کچھ کچھ وقفوں سے وہ شہر کے مختلف حصوں میں مگر ترقی رہی۔ ایک دن انڈیا ٹینٹل میں مل گئی اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا طرح دار شخص تھا۔ وہ نہایت نفیس سوٹ میں ملبوس تھا اس کی دہانے ہاتھ کی انگلی پر سونے کی ایک موٹی سی انگوٹھی تھی۔ اس کی

دیر تک بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے..... مجھے گھسیٹتے اپنے گھر لے گئے یہ گھر کیا تھا مرغیوں کا ڈروہ تھا ہر طرف عسرت کا راج تھا۔ چند جھلنگا سی چار پائیاں۔ ایک ٹوٹی ہوئی میز جس کے ایک یا۔ ٹے کے بجائے اینٹوں کا تختہ تھا اس گھر کی کل کائنات تھی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ تو سچلو خیر سے نیسی تال اور مسوری کے خواب تو اس میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو ہی گئے۔ میں ایک اُپھکی سی کرسی پر ٹکا ہی تھا کہ شوکت اپ بے پ کر فی اندر داخل ہوئی.... وہ بھر پور جواں ہو کر خاصی وچبیہ نظر آرہی تھی۔ انکل ساما یکم..... اس نے ٹھیکھ موڈرن لوکیوں کے انداز میں بانگ دی۔۔۔

”اے اتنی بڑی ہو تم“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تو وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ نثار حسین نے لقمہ دیتے ہوئے کہا ”گو لیما میں گرلز اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ابھی اسکول سے آ رہی ہے۔۔۔“ میں نے کہا ”ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ“ شوکت نے بڑے جے جمائے انداز میں پوچھا۔ ”اصل آپ کچھ ٹھنڈا لیں گے یا گرم۔“

میں ابھی بیوج ہی رہا تھا کہ یہ اصطلاح کس لغت سے آئی ہے کہ وہ لپ جمپ کرتی اندر گئی اور کچھ دیر بعد ایک ٹرالی حلیاتی ہوئی آگئی۔ ٹرالی پر چائے کا سامان قرینے سے رکھا تھا۔ ٹرالی کا خاصا بڑا حصہ سجاد سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے فوراً دیکھا تو معلوم ہوا ٹوٹی ماری بچہ گاڑی ہے جس پر ایک تینتہ ٹھونک لیا گیا ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا چور چوری سے جائے میرا پھیری سے نہیں جاسکتا۔ ابھی نا آسودہ تمنائوں کا سفر جاری ہے ادھر ادھر کی باتیں کر کے کھسک آیا..... پھر مدت بعد پشاور کو ہاٹ، کوئٹہ، چیچا وطنی خدا سہانے کہاں کہاں کی خاک اڑاتا پڑتا ہیں نمودار ہوا۔ تو ایک دن ایک گنجے سے کرل کے ساتھ۔ شوکت کو بڑے مٹے کی ساڑھی پہنے شاپنگ کرتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

لافانی سفر

احمد شمیم

لیکن میں ایک ہلکی سی پھیلاؤ لگا کر گاؤں کی سڑک سے کھیتوں کی گڈنڈیوں پر ہولیا۔ جب ربیع کی فصل والے کھیتوں کے درمیان سے ہو کر گزرا تو زمین اور ہوا میں ملی جلی سوندھی سوندھی خوشبوؤں نے سرگوشیاں کیں۔ اسے خاک وطن تم جہاں بھی جاؤ ہم سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو جاؤ۔ ہماری یاد تمہارے دل سے محو نہ ہو سکے گی۔ ایک نہ ایک دن ہماری یاد تمہارے دل میں آئے گی۔ اور تم میرے لئے بے قرار ہو اٹھو گے۔

میں ایک لمحے کے لئے اُس جگہ پر رُک گیا۔ جہاں پر سے دیہاتی نالہ ہلکے سُرور میں گنگنا تا ہوا ایک تیز بیل کھائے گاؤں کی سرحد سے دور ہوتا چلا سہاتا تھا۔ اور وہاں پر صرف شہر جانے والی سڑک ہی رہ سہاتی تھی وہیں پر سے اجنبیت کا ایک ہلکا سا احساس شروع ہو جاتا تھا۔

میں نے اس جگہ سے آخری بار اپنے گاؤں کو دیکھا گاؤں سے پرے اپنی زمینوں کو دیکھا جو ہم سے اجنبی بن کے ہمیشہ کے لئے پچھر ہی تھیں۔ اسے وطن الوداع۔ اسے سرزمین وطن الوداع اسے بلند قامت پہاڑ و الوداع۔ اسے رات کی تاریکی میں نغمہ سنائے والے آبشار و الوداع۔

”وہ موسم خزاں کی ایک منہموم، ادا ص اور پھیکی پھیکی سی دوپہر تھی۔ ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ درختوں کے پتے، سوکھے اور بے جان پتے ہوا کے تیز جھونکوں کے ساتھ ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔ لیکن کچھ پرانے سخت جان پتے اپنے دلوں میں مزید زندگی کی خواہش لئے ہوئے کچھ شاخوں سے اب تک چمٹے ہوئے تھے۔ اُس ضعیف ناتواں مریض کی طرح جو ایک طویل عمر گزارا لینے کے بعد بستر مرگ پر پڑا دم توڑ رہا ہو لیکن زندگی کی آخری سانس تک دنیا کے کچھ اور دکھ جھیل لینا چاہتا ہو۔“ اجنبی ایک لمحے کے لئے رُکا۔ ایک سرد آہ کھینچی اور پھر گویا ہوا۔

”آہ ساری زندگی میں جو تمنا میں پوری نہ ہو سکیں۔“

اُن کی تکمیل کی موموم سی امید زندگی کی آخری سانس

تک باقی رہتی ہے۔“

ایسی ہی ایک ادا ص دوپہر کو میں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور ایک انجانے اور طویل سفر پر تنہا چل پڑا۔ نہ کسی کو کچھ بتایا اور نہ کسی سے ملا، نہ ہی کوئی ساز و سامان اپنے ساتھ لیا۔ جس راستے سے دن میں بیسوں بار گزرا تھا، جب آخری بار گزرنے لگا تو زمین نے میرے پاؤں تھام لئے۔ اور جیتے ہوئے لمحوں کی یاد دلائی

لگا تلے جوتے تھے۔ اور جب تلے کی کھوپ ختم ہو سہاتی تو پاؤں کی بیٹھوں سے پانی بڑیس بھیجنے کا کاروبار شروع ہو سہاتا تھا۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ جب سے مجھے اس کسان کی حویلی میں ملازمت ملی تھی۔ انہی دنوں سے کسان کی حویلی میں ہن برنا شروع ہو گیا تھا۔ قصبے کی چوتھائی زمینیں اب اس کی ملکیت میں آچکی تھیں۔ اور قصبے سے باہر کئی گودام اور مکانات تعمیر ہو چکے تھے۔

میں اُن دنوں بے فکری سے کھانا کھاتا تھا اور ہر ہفتے کسان کا مال قصبے سے اسٹیشن کو لے سہاتا تھا۔ میں کھانا کھاتا ہوتا تھا اور کسان کی بیل گاڑی چلاتا تھا۔ بیل گاڑی کے سست رفتار پہیوں کی طرح میری زندگی بھی اپنے محور پر گردش کر رہی تھی۔ دیر سے دیر سے۔ رُک رُک کر، تھکے ہارے قدموں سے ایک ہی راستے پر۔ راستہ جو قصبے سے ریلوے اسٹیشن کو سہاتا تھا۔ اور پھر قصبے کو واپس لوٹ آتا تھا۔

اجنبی معاً خاموش ہو گیا۔

واقعات کے بھرے ہوئے تالوں بانوں کو نزدیک دے کر پھر اپنا سلسلہ کلام اس طرح شروع کیا۔ ”جب ہم قصبے سے سامان لے کے نکلتے تھے تو عموماً کیلا ہی ہوتے تھے۔ لیکن واپسی میں ہم ٹولیوں کی صورت میں آتے تھے۔ کسان کا مال ریلوے کے علیے کی تحویل میں دے کے ہم نیم شب تک پسینہ ٹرین کا انتظار کرتے۔

یہ ایک دیہی ریلوے اسٹیشن تھا۔ اور یہاں پر اترنے والے اکاؤنٹا ہی مسافر ہوتے تھے۔ جب ٹرین رکتی تو ریلوے کے کوئی آدمی گاڑیوں کی لالٹین لے کے ہر ڈبے کے قریب جاتا اور صدا لگاتا ”بھو اسٹیشن آگیا کوئی ہے جو یہاں پر اتارے گا۔“

ٹرین کے بیشتر ڈبوں میں مدہم روشنی کے جب ٹمٹماتے ہوتے تھے اور تھکے ہارے نیم خوابیدہ مسافروں کے آرام میں خلل انداز

ہاں تو اجنبی اجنبی تم نے کہاں کہاں کی سناک چھاتی اور اب اس جگہ پر تمہارا گزر کیسے ہوا۔ نوجوان جو اب تک ریتیلے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ اب شکستہ دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ چکا تھا۔ اس کا اشتیاق آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ جیسے اجنبی کی سرگوشٹ اپنے دامن میں عجیب و غریب واقعات کے خزانے سمیٹے ہوئے تھی۔

اجنبی نے ٹھٹھے ہوئے دریچے سے باہر کی جانب نگاہ کی اور وقت کے اس طویل فاصلے کو اپنی یادداشت کے آئینے کی مدد سے قریب تر لانے کی کوشش کرنے لگا۔

”اس وقت میں نو عمر تھا۔ اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا اب کہاں جاؤں۔ ہر جانب ایک نیا ماحول تھا۔ ہر شخص اجنبی تھا۔ اور میں ان غیر مانوس انسانوں کی ٹولیوں میں گھوم رہا تھا۔ ایک دن میں نے کسی شہر میں ایک کونا اپنے مستقل قیام کے لئے ڈھونڈ ہی نکالا۔ اور نئے ماحول میں پرانی باتوں کو بھولنے کی کوشش کرنے لگا۔“

پہلے پہل تو ماں باپ یاد آئے۔ پھر رشتہ داروں کے چہروں نے شکائتیں کیں۔ ندی اور تالوں نے اپنے مدہم رنگوں سے رات کی تاریکی میں آوازیں دیں۔ آخر میں دوستوں کے روٹھے ہوئے چہرے ہی یاد رہ گئے۔ اور پھر ایک دن سارے نقوش دھندلے پڑ گئے۔ ساری شبیں تاریکی کے پردوں میں گم ہو گئیں صرف یادیں ہی باقی رہ گئیں۔ دھندلی یادیں۔“

اجنبی دم لینے کے لئے ذرا اڑکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بول نہیں رہا ہو بلکہ الفاظ اس کے دل کی گہرائیوں سے پھوٹ کر نکل رہے ہوں اور ذہن پر نقش ہوتے جا رہے ہوں۔

”ایک دن قصبے کے ایک متمول کسان نے مجھے اپنی بیل گاڑی چلانے پر مامور کر لیا۔ یعنی جب فصل کا زمانہ ہوتا تو مجھے باغ بیل گاڑی میں ڈال کے ریلوے اسٹیشن تک لے سہاتا ہوتا تھا۔ اسٹیشن کی دوری شاید بیس میں رہی ہوگی۔ ہفتہ میں ایسے دو تین پیرے

ہونے سے گریز کرتے تھے۔

جب ریلوے کا آدمی گاڑی کے دو تین چکر لگایا۔ تو لائین گارڈ ہابو کے ہاتھ میں مٹھما کر۔ پلیٹ فارم کی کسی بچہ پر جا کے بیٹھ جاتا۔ گاڑی ایک ہلکی سی آواز میں سیٹی دیتی۔ اور آگے کے سفر کو روانہ ہو جاتی۔ اسٹیشن رات کی تاریک فضاء میں اپنا وجود مٹ کے ایک بار پھر اُدھن سے گلتا۔ اسٹیشن سے باہر ہمارے کمار بن سلاؤں کا انتظار کرتی ہوتی تھیں۔ اور ان کے قریب ہی میں بیل بٹانی کرتے ہوتے تھے۔

جب گاڑیاں ہر طرح سے لیس ہو جاتیں۔ جب میلوں کے بچے کچھ چارے گاڑی میں ڈال دیئے جاتے۔ اور جب لائین کی جٹیوں کو تیز کر دیا جاتا۔ تو سب سے آگے والی گاڑی بان بٹانہ بلند پکارتا۔ ”الٹرنام۔ گاڑی ہانکؤ۔“

بیل کساتے۔ پیٹے چمڑے پرتاتے اور ہمارا قافلہ اپنی منزل کی طرف پھل پڑتا۔ ایک سرے پر قصبہ تھا۔ اور دوسرے سرے پر اسٹیشن۔ اور پتے میں بیس میل کا فاصلہ حامل تھا۔ بیل ہمارے بوجھ ڈھونڈتے تھے اور ہم ایک لاسا صلی زندگی کا بوجھ ڈھونڈتے تھے۔ کسان میرا آقا تھا اور میں اس کا ملازم۔ کسان کے پاس بیل تھے۔ اور میں میلوں کو گاڑی میں جوتتا تھا۔ روز و شب کی محنت میری روزی مہیا کرتی تھی۔ اس سے آگے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

حب معمول ایک دن ہم نیم شب کی تاریکی میں اپنے قصبے کو واپس ہو رہے تھے۔ اسٹیشن سے ملحق دیہات جہاں پر ہم جوتا تھا وہاں پر قریباً پچاس گز کا ایک چوڑا نالہ تھا جو برسات کے دنوں میں تو جبل مثل جوتا تھا۔ اور سواریاں ناؤ کے ذریعے لاسرے کنارے تک لانی جاتی تھیں۔ لیکن دوسرے موسموں میں ہالہ خشک ہی رہتا تھا۔ اور سواریاں ہالاروک ٹوک آسانی سے اڑ جاتی تھیں۔ جہاں پر یہ نالہ ختم ہوتا تھا۔ وہاں پر چڑھائی تھی

اسی لئے بیل جہاں پر اپنی پورسی قوت صرف کر کے دوڑتے تھے اور مشکل تمام چڑھائی عبور کرتے تھے۔“

اجنبی کچھ ساعت کے لئے خاموش ہو گیا۔ جیسے اُسے اتنی باتیں بیان کرنے میں جوانی سے لے کر بڑھاپے کی چڑھائی عبور کرنی پڑی تھی۔ اور وہ ٹھک چکا تھا۔

اس کی نگاہوں کے سامنے۔ ماضی کے افق پر ایک سپاٹ عین سرخ مچھلی ہوئی تھی۔ اور بیل گاڑیوں کا قافلہ اپنے مدہم قدموں سے آگے کی طرف آہستہ آہستہ رنگ رہا تھا۔ چرچوں۔ چرچوں۔ سکوت۔ تاریکی۔ اور جھینکروں کی بے ہنگم آواز کافسوں۔

”میری آنکھیں جب کھلیں تو سب کاذب کا انجلا جاؤں طرف پھیل چکا تھا۔ اور آسمان کے روشن کناروں کے افق پر آبی پرندوں کے غول اپنے بازو پھیلاتے کسے کسے مدی کی سمت محور پرواز تھے۔“

بیل ایک جھٹکے سے رک گئے۔ اور ایک بھی سی مائنس کیلچ کے اپنی دل گر فٹنگ کا اعلان کر دیا۔ مجھے ایسا سوس ہوا جیسے میں خواب میں تھا۔ اور میرے گرد و پیش ہر گھبراہٹ کا عالم تھا۔ ملسماتی منظر پیش کر رہا تھا۔ بیل اسی دھن دھن سے مکان کے عقب میں آکر کھڑے ہو چکے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں کو مچھا پھر جو غور سے دیکھا تو دہائی منظر ایک بار پھر سامنے تھا۔ ایک نئی فضاء۔ نئی جگہ۔ یہاں دوسری جگہ تو نہیں پہنچ گئی تھی۔ کیا وہ میلوں کی نئی بن سداہائی جوڑی تو نہیں تھی۔ جو اپنے سابق آقا کے پاس ہمیں میسیوں کو س دور لے آئی تھی۔ کسی دور دراز کے کانوں میں۔ یا یہ سب کچھ میرا محض ایک خواب تھا۔

سامنے ایک دیہاتی میڈن موشیوں کے بو میں گھومتی نیم خوابیہ دھندلوں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ میں گاڑی سے

آئیں۔

لڑکی نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ اور مطمئن سی ہو گئی جیسے میں نے اپنی مد مقابل کی قوت کا اندازہ لگایا تھا۔ لیکن نہیں لڑنا نہیں ہے۔

اس کا مطلب۔

’اس کا مطلب یہ کہ ہم دونوں ایک ساتھ مل کر اس شرط کو پورا کریں گے۔ جس کا وعدہ میرے باپ نے اس شخص سے کیا تھا۔‘

کیا وعدہ تھا؟

’وہ وعدہ تھا کہ ہم سامنے والی پہاڑی پر بھنسنہ ایسی ہی ایک اور عمارت تعمیر کریں گے۔ اور اس کے حصار میں ایک اونچی سی دیوار کھڑی کی جائے گی۔ جس کی بلندی اتنی ہو کہ تیر ہواؤں کی زد سے عمارت بچی رہے۔ اور سورج کی تیز شعاعیں اس عمارت پر اپنا سایہ زیادہ دیر تک نہ ڈال سکیں۔‘

اس کا مطلب یہ ہوا کہ کئی برس تک کڑی محنت کرنی پڑے گی۔ تب کہیں جا۔ کہ یہ کام مکمل ہو سکے گا۔ پھر کہیں میری واپسی کا سوال پیدا ہوگا۔

’اس وقت تک زمیندار مجھے بھول چکا ہوگا۔ میں نے حالی بھری۔ بیلوں کو آزاد کیا اور منہ ماتھ دھولے پہاڑی چستے پر چلا گیا۔

دوسرے دن میں نے اپنے ہاتھوں میں معاری کے اوزار لئے اور لڑکی نے انہیں جمع کرنی شروع کیں میں نے گھرا تیار کیا اور اینٹ گارا جمایا۔ حتیٰ کہ سورج عزوب ہوئے تک میں فٹ چوڑی دیوار کھڑی ہو چکی تھی۔ اور ساتھ ہی میرے ہاتھ اور پاؤں کی قوت بھی جواب دے چکی تھی۔ جسم میں نفاہت اور آنکھوں میں خنودگی طاری تھی۔ میں وہیں صمن پر لیٹ گیا اور لڑکی نے خشک پتوں کی مدد سے آگ جلائی اور روٹی سینکنے لگی۔ جب روٹی تیار ہو گئی تو ہم دونوں نے وہیں پر بیٹھ

بیچے اترا اور سیدھا اس کے پاس پہنچا۔ لڑکی نے مجھے پیچھے سے اور پر تک ایک بار دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولی۔

’شائد پر ویسی ہو۔‘

میں اسٹیشن سے حافیت پور جا رہا تھا۔ اور اب اس جگہ کس طرح اور کیسے پہنچ گیا۔ تعجب ہے۔

میں نے ایک طائرانہ نگاہ ڈال کے اس لڑکی کی آنکھوں میں اپنی حائل حاصل تلاش کیا۔

’ایسے میں تم یہاں پر مل گئے۔ کتنا اچھا تھا پر ویسی۔ اب تم بھی میرے دکھ کے ساتھی ہو گئے۔‘ لڑکی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرزنے لگے۔

میں نے سوچا۔ میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا ہوں۔ جہاں کوئی شخص بھی مجھے نہیں پہچانتا۔ اب بھلا میں ایسے میں اس لڑکی کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ لڑکی نے شائد میری فکر کا اندازہ لگایا تھا۔

’جب زمین پر دو انسان آئے تو اتنی بڑی دنیا بس گئی اور تم میرا ساتھ دو تو کیا مجھے رہائی نصیب نہیں ہو سکتی؟‘

میں نے صیاد کی قوت کا اندازہ لگانے کے لئے سہاؤں طرف نظر دوڑائی۔

’وہ دور اس پہاڑی پر اس شخص کی عمارت کھڑی ہے۔‘ پہاڑی کی بلند چوٹی پر سورج کی کول کر نیں شاہ بلوط کے درختوں سے گزر کر گہرے رنگ کی عمارت پر دھیرے دھیرے نور چل رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی میں یوکلپٹس کے طویل قامت درخت خاموش لیکن عزور میں ڈوبے ہوئے اپنی عظمت کا اعلان کر رہے تھے ان سے ذرا نیچے ڈھلوانوں میں فالسے کے درختوں کی بے ترتیب قطار پھیلی ہوئی تھی۔ اور جہاں پر یہ سلسلہ ختم ہوتا تھا۔ وہاں پر ایک بڑا سا برگد کا پیڑ تھا۔ جس پر بے شمار پرندے چیخ چیخ کر ایک ہنگام سا بپا کئے ہوئے تھے۔

میری نگاہیں ان سب چیزوں کا تعاقب کر کے واپس لوٹ

بیٹے روٹی کھائی۔ دن بھر سخت محنت کرنے کی وجہ سے میری آنکھیں
بند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ لڑکی دھیسے
سروں میں کوئی نغمہ آلاپ رہی تھی۔ اور اس کی آواز پہاڑی نالے
کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ دور تک اڑتی چلی جا رہی تھی۔ گھاٹیوں
سے دور۔ میدانوں سے پرے، پہاڑوں پر، ہواؤں میں۔ دور
بہت دور۔ اس رات میں نے دیکھا کہ وہ جگہ ایک ریگ زار میں
تبدیل ہو چکی ہے۔ وہاں نہ کوئی آدمی ہے اور نہ کوئی آدم زاد۔
برسوں تاریکی ہے اور طوفانی ہواؤں کا سمندر ہر طرف مٹھائیں
مار رہا ہے۔ میں نے محسوس کیا جیسے کوئی انسانی پیکر۔ میرے
سامنے کھڑا مجھ سے سوال کر رہا ہے۔ میں نے کسی قدر توقف کے
بعد پوچھا۔

تو کون ہے جو رات کی اس تاریکی میں محو سفر ہے۔ کیا تو
ایک انسانی ہیولہ ہے۔ یا کوئی آسیب۔ اگر تو انسان ہے تو امیر
ہم سفر بن جا۔ اور اگر کوئی آسیب ہے تو جا۔ اپنی راہ لے۔
انسانی ہیولے نے تاسف بھری آواز میں کہا۔

’آہ تو ان راستوں کی ہزیمتوں سے آگاہ نہیں۔ ان راستوں
کی کوئی منزل نہیں۔ یہ بے ترتیب راستے ہر چار طرف پھیلے
ہوئے ہیں۔

آ میں تجھے اپنی ہستی کے رموز سے آگاہ کروں۔

میں اس انسان کی روح ہوں جس نے اپنے بدنما اور
بھیانک چہرے پر ایک سفید اور بے داغ قباہ اوڑھ رکھی ہے
میرا کوئی دین نہیں۔ کوئی دھرم نہیں۔ کوئی ایک نظریہ نہیں۔
میری زندگی کا کوئی ایک اچھوتا نصب العین نہیں۔ میں ہر قوم،
ہر ملک اور ہر تہذیب میں اپنے بدنما داغوں والے اس چہرے
پر ایک سفید نقاب ڈالے گشت کرتی پھرتی ہوں۔ واقعات اور
حالات کے تحت میں اپنا انسانیت کش ہتھیار استعمال کر کے ظلموں
کو زیر کرتی ہوں۔ اور ظالموں کی قوت کو فروغ دیتی ہوں کہیں

پر کالے اور گورے انسانوں کی تفریق کا حال پھیلا رکھا ہے کہیں پر
نسل اور زبان کا مسئلہ لاکھڑا کیا ہے۔ مجھے جہاں، کہیں، کسی بھی
جگہ ہمدردی، محبت اور اخوت کا سوتا نظر آیا ہے۔ میں ایک
ناقابل تسخیر چٹان بن کر اس ابلتے ہوئے چشمے کو ہمیشہ کے لئے
خشک کر دینے کے درپے ہو جاتی ہوں۔ مجھے جس جگہ بھی روشنی کی
ایک ہلکی سی شمع نظر آتی ہے میں نے اپنی گھناؤنی عنقریب اور
منافقت سے بھری غلیظ چادر ڈھانک کر اس روشنی کی کرن کو
ہمیشہ کے لئے تاریکی کے پردے میں پس پشت ڈال دیا ہے۔ لوگ
میری پوجا کرتے ہیں۔ میرے نعرے بلند کرتے ہیں۔ میں نے ان کے
ذہن کے ہر گوشے کو اس طرح تاریک کر دیا ہے۔ جس طرح کالی
اور مہیب رات دن کی روشنی کو نگل لیتی ہے۔ دن کے روشن
لمحات کو اپنی خاموش فغاں میں تھپک تھپک کر گہری نیند سلا دیتی
ہے۔ میں ہوں جموٹی اور ناپختہ تہذیب و تمدن کی علمبردار۔
انسان دشمنی کی ننگی تلوار۔

اے بے نام روح۔ اب تو بڑی دیر ہو چکی ہے مجرموں
اور نامراد نبیوں۔ یقین اور بے یقینی کی اس طویل مدت میں احساس
کی ایک خلیج ساحل ہے۔ جسے کس طرح اتنی جلدی پاٹ دیا جائے
آہ وہ کونسا راستہ ایسا ہے جو میری سوچ کے تانے بانے کو
تیری سوچ سے ملا دے۔ وہ کونسی ایسی کند ہے جو میر عقل
تیری عقل پر ڈال سکے۔ آہ اب خرد کہیں نظر نہیں آتی۔ اور ہر
طرف تاریکی ممتل سایہ کئے ہوئے ہے۔ اور میں ایک انسان۔ اس
بے برگ و گیاہ ویرانے میں حیران و پریشان۔ روح نے اپنی ننگی تلوار
کا دار مجھ پر کیا۔ اور میری آنکھیں ایک جھٹکے سے کھل گئیں۔
میرے سامنے نہ جموٹی روشنی اور نہ بیل گاڑی۔ اور نہ ہی
اس لڑکی کا کہیں دور دور تک کوئی پتہ تھا۔ پہاڑی سامنے تھی
اور عمارت اس حقیقت کا پتہ دے رہی تھی۔ میں نے دوسرے ہی
لمحے واپسی کی ٹھانی۔ اور سوچا کہ اپنے آقا کے پاس جاؤں۔ اور

اس طویل غیر حاضری کی معذرت چاہ لوں۔

کئی دنوں کی مسافت کے بعد جب میں بھوک سے بڑا حال ہو گیا۔ میرے جسم کی قوت جواب دے گئی۔ حلق میں کانٹے سے چھینے لگے۔ تو میں ایک پتھر سے درخت کی چھاؤں تلے لیٹ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی روح ایک بار پھر میرے سامنے نمودار ہوتی ہے۔ اور مجھے مخاطب کرتی ہے۔

’اے بدنصیب شخص تو جس سرزمین پر ہے وہاں انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔ اور مردہ تہذیب کو پھر سے جنم دیا جاتا ہے۔ اور تو جس منزل کی جانب گامزن ہے وہاں حیوان افضل اور انسان بے بسی و لاجارگی کی زندگی گزارتے ہیں۔ تو اکیلا ہے اور تیری اپنی سوچ تجھے بادِ سموم کے طوفانوں سے ٹکرا دے گی۔ تو روئے گا۔ کفِ افسوس ملے گا۔ لیکن اس وقت تیری کوئی نہ سنے گا۔

آ۔ اور میرے ساتھ پہل جو میں کہتا ہوں سن۔ اور جس طرح میں سوچتا ہوں اُسی طرح سوچ۔ ظالم قوی اور گنہگار بے بس۔ فرار کا ہر راستہ تیرے لئے اب مسدود ہو چکا ہے۔ ایک دھماکے کی آواز ہوئی۔ اور میری آنکھیں اچانک کھل گئیں۔

ہر طرف گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ بوڑھوں بچوں اور مردوں کی چیمیں ہر طرف سے بلند ہو رہی تھیں۔ لوگ بھاگ رہے تھے اور لوگ یزروں اور برہمیوں سے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ بندوقیں چل رہی تھیں اور مکانات کو نذرِ آتش کیا جا رہا تھا۔ قتل و غارت گرمی کا طوفان قریباً دو گھنٹوں تک اسی طرح جاری رہا۔

سورج جب غروب ہو چکا اور شام نے اپنی لمبی چادر جب چاروں سمت پھیلا دی۔ تو میں نے انسانی آبادی کی جانب ریگان شروع کیا۔ جب میں بستی میں پہنچا تو یلغار میں اپنا کام

ختم کر کے جا چکے تھے۔ اور زندگی کے آخری آثار بھی بستی سے قریباً مٹ چکے تھے۔

کسی کسی مکان میں آگ اب تک سرد نہیں پڑی تھی۔ ان مکانوں میں انسان جان کنی کی حالت میں زندگی اور موت کی کشمکش سے دو چار تھے۔ لیکن آہ! موت ان سے صرف چند قدم کے فاصلے پر آخری وار کرنے کھڑی تھی۔ میدانوں میں انسانی جسم خون میں لٹ پٹ جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔ کہیں کہیں تو بیبیوں، عورتوں، مردوں اور بچوں کے مردہ جسم ایک ہی جگہ ڈھیر کی شکل میں بکھرا تھے۔ جوان عورتیں اور جوان مرد بوڑھے باپ اور سن رسیدہ مائیں۔ پاؤں چلنے والے بچے اور شیرخوار بچے۔ گولیوں کا نشانہ اور تلواروں سے تہہ تیغ کئے ہوئے ان انسانی اجسام کو موت نے ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں اچانک آیا تھا۔

کسی کے ہاتھ میں صرف چاول کی ایک پوٹلی ہی تھی اور وہ بھاگتے ہوئے موت سے دو چار ہو گیا تھا۔ ایک کے ہاتھ میں فائل تھی جس میں چند تعلیمی اسناد اور کچھ کاغذات پڑے تھے۔ اس شخص کی گردن کچھ فاصلے پر کھڑی پڑی تھی۔ ایک ہاتھ دعا کی کوئی کتاب تھا جسے جسم سے دور جا پڑا تھا۔ خدا سے فریاد یا ظالم سے پناہ کی آخری التجا بھی خالی گئی تھی۔

میں نے جلد از جلد اس گاؤں کو چھوڑ دینے ہی میں اپنی خیر سمجھی اور کہیں دور کسی جنگلی مقام کی تلاش میں انسانی آبادی سے میلوں پہلے چل پڑا۔

رات میں نے ایک گمنام بھاڑی میں گزاری۔ اور آتے والے وقت کے بارے میں سوچنے لگا۔ ہر لمحہ جو گزرتا جاتا تھا صبح سے قریب اور میری موت کو قریب تر لاتا دکھائی دیتا تھا کوئی گناہ جگہ جہاں شیر اور بھیڑ پیسے بسیرا کرتے ہوں میری امید کی آخری کہن اور میری خوشیوں کا معراج بن چکا تھا۔ صبح ہونے

سے قبل آسمان کا ہر کوٹا بادلوں سے گھر گیا۔ اور بجلی کی کوندیں ہر جانب پلکنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔ بارش دن بھر اسی طرح سے ہوتی رہی۔ اور شاید کئی دنوں تک اسی طرح جاری رہی۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے انسانی آبادی کی سرحد کو جلد از جلد عبور کر لینا چاہیے۔ نہ جانے کب بلوائی اس جگہ پر بھی پہنچ جائیں۔ اور موت راستہ دیکھ لے۔

رات کی تاریکی میں میں اپنا سفر جاری رکھتا دن کا وقت بانس کے گھنے جنگلوں یا پٹ سن کے کینٹوں میں گزارتا۔ جنگلی بھلوں سے بھوک کی آگ بجھا لیتا۔ اور جو ہڑ کا پانی پی لیتا۔ کئی دنوں کی مسافت کے بعد مجھے دریا کے کنارے ایک گھنسا جنگل نظر آیا۔ اور میں بلا خوف و خطر جنگل میں اس طرح داخل ہو گیا جیسے وہ میری محفوظ ترین پناہ گاہ ہو۔ چند لمحوں بعد ہی میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ جنگل شیر، سیپے اور خونخوار جانوروں سے کسی طرح خالی نہیں تھوڑی سی دیر کی تلاش کے بعد میں نے ایک کہنہ درخت کا انتخاب کر لیا اور ایک مستحکم سی شاخ پر سہا کے بیٹھ رہا۔ اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ میرا قریب ترین پڑوسی ایک بندر دوسری شاخ پر بیٹھا میری طرف پُر تجسس نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی خیاؤں خیاؤں کی آوازیں حلق سے نکال رہا تھا نہ جانے کس گھڑی میری آنکھ جھپک گئی۔

ایک تپختی ہوئی آواز میرے کان سے نکلا اور میں بیدار ہو چکا تھا۔ بہت سے بندر ایک ساتھ ہی اچھل کود کے کس میں مصروف تھے۔ اور اپنی بٹیس دکھا کر مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رات کی دم توڑتی ہوئی سیاہی میں دن کا اچالا آہستہ آہستہ قدم رکھ رہا تھا۔ پرندوں نے اپنے گھونسلے چھوڑ دیئے تھے اور صبح کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ مجھے تب خیال آیا میں

نے انسانی آبادی چھوڑ دی تھی اور جنگل میں پناہ گزیں بننا میرے دل و دماغ سے خوف کا احساس آہستہ آہستہ رفع ہوتا جا رہا تھا۔ غذا اب میری اہم ترین ضرورت بن کر سامنے کھڑی تھی۔ رنگ برنگ کے جنگلی پھل صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اپنا روپ دکھا رہے تھے۔ جب میرے آس پاس کے سارے جانور شکار کی تلاش میں دور نکل گئے تو میں درخت سے نیچے اُترا کچھ جنگلی پھل توڑا اور ذائقہ معلوم کرنے لگا۔ کچھ میٹھے اور ترش کچھ کڑوے اور کپیلے تھے۔ پیٹ بھر پھل کھانے کے بعد میں پانی کی تلاش میں جنگل سے باہر نکلا۔ ایک جو ہڑ سے پانی پیا اور جنگل سے پرے دریا کی جانب چل دیا۔ دریا کے کنارے بیٹھ کر میں نے اپنی نئی زندگی کے آغاز کے متعلق سوچنا شروع کیا۔

مجھے اُس جنگل میں آئے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے اور اُس وقت میں اپنی شاخ پر بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے کالے بادلوں کی ایک فوج آسمان کے مشرقی کنارے سے نمودار ہوتی نظر آئی۔ کچھ ہی دیر میں بادلوں نے ساری کائنات کو ایک گھبر تارکی میں ڈبو دیا۔ بادل گرجے اور بجلیوں کی کوندیں ہر جانب تڑپنے لگیں۔ بارش کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ کئی دنوں تک بارش یکساں طور پر ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ندی اور نالے پُر آب ہو گئے۔ پانی کی سطح بلند ہوتی گئی حتیٰ کہ بارش کا پانی جنگل میں گھس آیا اور درختوں کی جڑیں زیرِ آب ہو گئیں۔ شام تک پانی درختوں کی جڑیں تک پہنچ گیا تھا۔ مجھے ایک بلند شاخ پر چڑھ جانا پڑا۔ کئی راتیں میں نے جاگ جاگ کر گزار دیں۔

ایک ہفتہ گزر جانے پر بارش تھی اور کم و بیش یہی عرصہ پانی گھٹنے میں لگا۔

پانی جب دریا کی سطح تک واپس نہ چکا تو میں جنگل سے

باہر نکلا۔ دریا میں اور زمین پر انسانی لاشیں اور سبائوں کے مردہ جسم ہر طرف بکھرے نظر آئے۔ کتے، بلی، لگائے بیل اور انسان ایک ہی جگہ ڈھیر پڑے تھے۔ سیلاب نے تباہی مچا دی تھی۔

میں نے سوچا مجھے انسانی آبادی کی طرف چلنا چاہیے۔ تب انسان پر مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ دوسروں کی دشمنی معمول جاتا ہے۔ میں نے بیسوں میل کا سفر ہر سمت میں کیا، لیکن مجھے اتنے بڑے خطے میں ایک ہی انسانی نفس نظر نہیں آیا۔ یہ تلاش کئی دنوں تک جاری رہی لیکن انسان شائد پیدا ہو چکے تھے۔ تم وہ پہلے شخص ہو جو مجھے اتنی بڑی آبادی میں زندہ حالت میں ملے ہو۔

نوجوان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ آہ! میں نے

اپنے ان ظالم ہاتھوں سے نجانے کتنے ہی بے قصوروں اور معصوم لوگوں کا قتل عام کیا ہے۔ اور اب مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ہے۔ میری اس بدکار شکل کو دیکھنے والے اس سرزمین پر اب تم ہی واحد شخص رہ گئے ہو۔ میں اپنے اس جسم پر اپنے بھاری بھرکم مرکوب اس طرح لئے چلتا ہوں، جیسے آب دریا میں کوئی دیو قامت سمندری جہاز۔

اجنبی اور نوجوان دونوں اپنی جگہ سے اٹھتے ہیں اور انسانی نفس کی تلاش میں چل پڑتے ہیں۔ ایک پورب کو سہاتا ہے۔ اور دوسرا کچھم کو۔ موت کی تاریکیوں کے درمیان زندگی کی کرن کا ایک بار بھر آغاز سفر ہوتا ہے۔



جہاں آراء بیگم

مستز سبیل

اور ”بادشاہ بیگم“ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ شاہجہان اور ممتاز محل کو اپنی اس بیٹی سے جلد سدا نیت تھی چنانچہ انہوں نے اس کی تعلیم و تربیت میں خصوصی دلچسپی لی۔ سنی انعام خانم، جو ملک الشعراء طالب آملیؒ کی بہن اور ربابندانیؒ ادب شاعری قرائت اور فن خطاطی کی ماہر سمجھی جاتی تھی، جہاں آراء بیگم کی معلمہ مقرر ہوئی۔ جہاں آراء کے جو کمالات بعد میں ظہور پذیر ہوئے ان کی اساسی وجہ سنی النساء خانم ہی کی ابتدائی تربیت تھی، جو رنگ لائی۔ ۱۶۲۸ء میں جب شاہجہان تخت نشین ہوا تو جہاں آراء صرف چودہ سال کی تھی لیکن غیر معمولی ذہانت اور اطوار حسنہ کے سبب اپنے تمام بہن بھائیوں میں نمایاں تھی ”بادشاہ نامہ“ میں عبدالحمید لاہوری تحریر کرتا ہے کہ اس موقع پر شہزادی لے شاہجہان کو قیمتی جواہرات پیش کئے جس کے جواب میں اس کا چھ لاکھ سلاخہ کا وظیفہ مقرر ہوا۔

محض ۱۷ برس کی عمر میں وہ لذتِ رغم سے آشنا ہوئی یعنی اس کی ماں ممتاز محل کا سانحہ ارتحال ہوا۔ بقول سرحدادو تاتہ مرکز جہاں آراء

خاندانِ مغلیہ کی وہ بیگمات جن کی قابلیت، ذہانت، ہذہ سخی اور حاضر جوابی میں کوئی ثانی نہ تھا ان میں جہاں آراء بیگم کا بھی شمار ہوتا ہے۔ وہ ایک نہایت سعادت مند بیٹی، نمکسار بہن اور بہترین تالیق تھی۔ وہ محض ایک ماہر لطیفہ ہی نہ تھی حافظ قرآن اور ادب شناس شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ قرائت اور خطاطی میں بھی مشاق تھی۔ اس کی زندگی انسانی ہمدردی، زہد و انقار، عزیز پروری اور ایثار و قربانی کا بہترین نمونہ تھی۔

جہاں آراء بیگم کا سلسلہ نسب نغیال کی طرف سے مرزا غیاث بیگ طہراتی الملقب بـ ”اعتماد الدولہ“ سے جاملتا ہے۔ اس کی ولادت ۱۰۲۴ھ مطابق ۱۶۱۴ء میں ہوئی۔ اس کی دل آویز صورت اور من موہنی صورت سے متاثر ہو کر جہانگیر نے اس کا نام ”جہاں آراء“ رکھا۔ اس کا اعزازی لقب ”فاطمۃ الزمان“ تھا جس کی وجہ سے

MACDONALD اور اس کے بعد VON KRAMER اس کا اصل نام فاطمہ تھا۔ عبدالحمید لاہوری اور محمد صالح کنبوہ، جو اس کے ہم عصر مورخین ہیں، اس کو ”بیگم صاحبہ“

تاریخ میں شہرت عام حاصل ہوئی بلکہ آفاقی سطح پر بقائے دوام ملی یعنی فرانسیسی شاعری میں بھی اس کے گیت گائے گئے۔ چنانچہ ایک فرانسیسی شاعر کی کائنات دلائل - (LE CONTE DELISLE) اس کے اس ایشار سے بے حد متاثر نظر آتا ہے جہاں آراء نے محض باپ کی خاطر دولت و عزت پر لات ماری جبکہ اسی کی مہین روشن آرا اورنگ زیب کے حلقہ اثر سے وابستہ ہو کر دولت مندی، پیش کشی اور آزادی کی پر بہار زندگی گزار رہی تھی۔

شہزادی جہاں آراء صلح کل و صلح جو ہی نہیں صلح و آشتی کی گویا دیوی تھی۔ شاہی محل کے دوران قیام میں اس کی زندگی کا مقصد اولین و آخرین تمام خاندان میں رابطہ قائم رکھنا تھا۔ جس وقت شاہجہاں کے بیٹوں میں تخت نشینی کے لئے تنازعہ شروع ہوا تو جہاں آراء نے داراشکوہ کی حمایت کی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ رسم و رواج اور قانون کے مطابق دارا ہی کو تخت کا اصل وارث سمجھتی تھی جیسا کہ اس کے اس مکتوب کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے جو اس نے اورنگ زیب کو معاہدہ پر آمادہ کرنے کے لئے تحریر کیا تھا۔

”تمہاری مسلح پیش قدمی خود تمہارے والد بزرگوار کے خلاف جنگ کرنے کے مترادف ہے، اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ یہ پیش قدمی دارا کے خلاف ہے تو بھی کچھ کم گناہ نہیں اس لئے کہ رسم و رواج اور شرع کے مطابق وہ بجائے باپ کے ہے۔“

اس کے برعکس یورپین مورخین کے خیال میں جہاں آراء نے

پر اس حادثہ کا بہت گہرا اثر ہوا اپنی ماں کی وفات کے بعد جہاں آراء ہی پر محل کے جملہ امور انتظامیہ کی ذمہ داریاں آپڑیں۔ شاہجہان نے وہ نام حقوق و اختیارات جو ممتاز محل کو حاصل تھے، جہاں آراء کو تفویض کر دیئے۔ جہاں آراء نے بھی خود کو دل و جان سے اپنے والد کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ پروفیسر محمد اسلم اپنے ایک گراں قدر مقالے میں رقمطراز ہیں کہ جہاں آراء نے اپنے بہن بھائیوں کو ماں کا پیار دیا اور ان کی تعلیم و تربیت کی طرف پوری توجہ دی۔

شاہجہان کو اپنی اس بیٹی پر نہایت درجہ اعتماد تھا۔ شہزادی کا امور سلطنت میں انہماک دیکھ کر بادشاہ یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ وہ انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے ہر طرح موزوں ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر بقول مصنف ”بادشاہ نامہ“ شاہجہاں کی خاص مہر بھی اس کے سپرد کر دی گئی۔ سرکاری کاغذات اور احکام جب اس کی نظر سے گزرتے تھے تو وہ سلطنت کے جملہ رموز اور ان کے نشیب و فراز سے واقف و آگاہ ہوتی تھیں جس سے اس کی سیاسی بصیرت اور معاملہ فہمی کی صلاحیتوں میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

جہاں آراء کو اپنے والد سے بے پناہ محبت تھی وہ شاہجہاں کی محافظ و نگہبان تھی اس ضمن میں وہ اس قدر محتاط تھی کہ دست و پاؤں پر کسی قسم کا ایسا لونی بھی کھانا نہ دیتا کہ وہ پیش منہیں یا جاسا نہ ہو۔ ان کے خیال میں تیار نہ کیا جاتا۔ باپ سے اس کی محبت کی اس سے بھی بڑی نشان ایک یہ بھی ہے کہ شاہجہان کی امور حکومت سے جبر یہ علیحدگی کے بعد بھی جہاں آراء بدستور معزول شہنشاہ اور بے کس باپ کی خدمت بجا لاتی رہی گویا اس نے اپنے غمزدہ باپ کی خاطر قید و بند کی سختی بھی قبول کر لی۔ اس جذبہ قربانی کے سبب نہ صرف یہ کہ جہاں آراء کو ہماری

۴۔ سر جادونا تھہ سرکار ”ہندوستانی اینٹی گنی“ دی ماڈرن ریویو ستمبر ۱۹۰۹ء

۵۔ ضیاء الدین احمد برنی۔ ”جہاں آراء بیگم“

۶۔ جہاں آراء بیگم بنت شاہجہاں از ضیاء الدین احمد برنی

ص ۳۰

۱۔ محمد اسلم، سیارہ ڈائجسٹ، اکتوبر ۱۹۷۲ء

۲۔ جہاں آراء بیگم بنت شاہجہان از ضیاء الدین احمد برنی ص ۲۲

۳۔ دقائق و روایات ڈاکٹر فریر، مزہم خلیفہ محمد حسین ص ۲۰

عین جوانی میں جہاں آراء نے ’مولس الارواح‘ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو سلسلہ چشتیہ کے بزرگوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں اس نے خواجہ معین الدین اجمیریؒ، خواجہ قلیب الدین بختیار کاکیؒ، صوفی حمید الدین ناگوریؒ، بابا فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کا ذکر بڑے عقیدت مندانہ انداز میں کیا ہے۔ شہزادی اپنی اس تصنیف کا مقصد ان الفاظ میں تحریر کرتی ہے:

”چونکہ یہ فقیر اپنے آپ کو حضرت پیر دستگیر کا حقیر ترین مرید تصور کرتی ہے۔۔۔۔۔ (اس لئے) حضرت پیر دستگیر کے رسالہ ”انیس الارواح“ کے نام پر اس عقیدت مند نے اس رسالہ کا نام ”مولس الارواح“ رکھا ہے اور امیدوار ہے کہ جو کوئی شخص چشتیوں کی عقیدت کی کشتی میں بیٹھے گا۔ حق سبحانہ و تعالیٰ اسے گناہوں کے سمندر کی متلاطم لہروں سے نجات دے کر ساحلِ مراد تک پہنچائے گا۔“

”مولس الارواح“ کے علاوہ جہاں آراء رسالہ صاحبیہ کی بھی مصنف ہے۔ جو اس کے پیر و مرشد کی ایک نامکمل سوانح عمری ہے پاکستان میں اس کتاب کا دوسرا قلمی نسخہ جناب پروفیسر محمد اسلم صدر شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی کی ملک ہے۔ مذکورہ بالا مخطوط کے باب میں گمان غالب یہ ہے کہ اسے شہزادی نے بہ نفس نفیس اپنے ہاتھ سے خود تحریر کیا ہے۔

جہاں آراء کی ایک اور اہم کتاب ”آیات بینات“ ہے جس میں قرآن پاک کی بعض آیات اور احادیث نبوی کا فارسی میں ترجمہ

داراشکوہ کی حمایت محض اس لئے کی تھی کہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ بادشاہ بن جائے پروہ جہاں آراء کو شادی کی اجازت دے دے گا۔ سرحد و تاجہ سرکار باوجود ہندو ہونے کے اس الزام کو جہاں آراء کے کردار پر ”پھینٹے ڈالنے کی سعی“ کہتے ہیں۔ دارا کی حمایت کا وہ یہ سبب بتاتے ہیں کہ دارا بلحاظ عمر اس سے قریب ترین تھا اس کے علاوہ ان کے خیالات، مقاصد، حتیٰ کہ تصوف کے روحانی مثافل یکساں تھے۔ اس کے باوجود جہاں آراء نے اور بھائیوں میں سے کسی کے حقوق کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ صرف سلطنتِ مغلیہ کو پُر جلال دیکھنے کی ممتی تھی۔ وہ خاندانِ جنگی کے نقصانات سے بخوبی واقف تھی۔ ساموگڑھ میں دارا کو شکستِ فاش ہوئی اور رنگِ زیب اگرہ تک آپہنچا۔ مراد بخش اس کے ساتھ تھلا چلا آ رہا تھا اس وقت جو قدم اٹھایا اگر وہ کامیاب رہتا تو تاریخ آج وہ نہ ہوتی کہ جو ہے۔ اس نے اپنے چاروں بھائیوں میں سلطنت کی پُر امن تقسیم کے اصول پر مصالحت کرانے کی کوشش کی لیکن اس کی مساعی جیدہ رائے گاہ میں۔ اس کا محبوب بھائی داراشکوہ مارا گیا اور اورنگ زیب بہتر اقتدار آگیا۔ شہزادی جہاں آراء اپنے باپ کے انتقال کے بعد ۱۵ سال تک زندہ رہی اور نگریب اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اس نے جہاں آراء کو کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ اب اس کا اقتدار ختم ہو چکا ہے بلکہ اُس نے جہاں آراء کو شاہی محل کی سب سے بڑی ملکہ کے درجہ پر بحال رکھا۔

شہزادی جہاں آراء کی سیرت کا نمایاں ترین پہلو اس کا زہد و تقویٰ ہے۔ بقول اس کے وہ خاندانِ تیموریہ کی پہلی خاتون ہے جس نے تصوف کو اپنا شیوہ بنایا۔ ابتداء میں وہ ملا شاہ کی مرید تھی لیکن پھر چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں سے اس کی عقیدت بڑھ گئی تھی۔

۱۔ جہاں آراء بیگم بنت شاہجہان، از منیاء الدین احمد برقی ص ۳۱

۲۔ چند و ستانی یعنی گئی، از سرحد و تاجہ سرکار۔

۳۔ جہاں آراء بیگم، منیاء الدین برقی ص ۵۳

۴۔ اورینٹل کالج میگزین ۱۹۳۷ء

۵۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، آرٹیکل جہاں آراء بیگم

۶۔ ”سیارہ ڈائجسٹ“ اکتوبر ۱۹۷۹ء

۷۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام آرٹیکل جہاں آراء۔

۸۔ ”سیارہ ڈائجسٹ“ ص ۱۳۳

کیا نیلے۔ اس کا مخطوط مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں موجود ہے۔
اس کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی میں نے جناب محمد اسلم کی تحویل میں دیکھی
ہے جو دیدہ زیب اور مجاز ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جہاں آرا نے ایک مثنوی بھی لکھی
تھی لیکن وہ آج تک دستیاب نہ ہو سکی۔ البتہ تونس الارواح میں
جہاں اس کے اشعار ملتے ہیں جو اس کے ذوق شری کی نہایت
مناسب عکاسی کرتے ہیں۔ نمونہ درج ذیل ہے۔

اے بہ وصفت بیان ما ہمہ پیچ

ہمہ آں تو آں ما ہمہ پیچ

ہر چند بیند خیال ما ہمہ نقص

ہر چہ گوید زباں ما ہمہ پیچ

اسی طرح اس کے چند اشعار جو خواجہ اجیری کی منقبت ہیں

ہیں، درج ذیل ہیں۔

اں شہنشاہ جہاں معرفت

ذات او بیرون ز ادراک وسعت

خرد ملک فنا بے سخت و تاج

از خود و از غیر خود بے احتیاج

اپنے والد کی وفات پر جہاں آرا کو بے حد صدمہ ہوا

جس کا اظہار اس نے اپنے تصنیف کردہ مرثیہ میں اس طرح کیا ہے۔

ملاحظہ ہو۔

اے آفتاب من کہ شدی غائب از نظر

آیا شب فراق ترا ہم بود سحر

جہاں آرا نہ صرف یہ کہ خود شاعر تھی بلکہ سخن فہمی میں ملکہ رکھتی تھی
ایک مرتبہ رات کے وقت وہ بادشاہ سے ملاقات کر کے واپس آ رہی
تھی کہ یکایک اس کے اچھل میں کسی موم بتی سے آگ لگ گئی اور آن
کی آن میں شہزادی کا سارا جسم شعلوں نے جھلس گیا شہزادی کی
صحبت بیابی پر ملک الشعراء حاجی محمد حسان قدسی نے ایک قصیدہ لکھا
جس کا ایک شعر ہے۔

تا سرزدہ از شمع چنیں بے ادبی

پردان ز عشق شمع را سوختہ است

چنانچہ جہاں آرا نے ملک الشعراء کو اپنی سرکار سے پانچ ہزار

روپے عطا کئے۔ یہ واقعہ بجائے خود اس کی فیاضی و سخن فہمی کی

واضح دلیل ہے۔

جہاں آرا کا جمالیاتی، فنی اور ادبی ذوق اس کی تعمیرات

میں بھی جھلکتا ہے اس کا آگرے کا محل طرح طرح کے طلائی نقش و

لکار کے علاوہ پاکیزہ اشعار سے مزین و منقش تھا اور ”پادشاہنامہ“

میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ شہزادی جہاں آرا بے انتہا دولت کی

مالک تھی اور اس نے اپنی دولت کو نلایہ عامہ کے کاموں میں

فیاضی سے صرف کیا۔ ”آگرہ کی جامع مسجد اس کی فیاضی کی زندہ یادگار

ہے جو کہ ۱۶۳۳ء میں چار لاکھ کے خرچ سے بنی ہوئی تھی۔

اس کی دوسری بڑی عمارت ”بیگم والاں ہے جو اس نے ۱۰۵۳ھ میں

غیر حج ہجرت عین آدین چشتی سے سعادت کے اظہار میں تعمیر کروایا اس کے

علاوہ بھی شہزادی نے بہت سی عمارتیں، باغات، حمام اور سرائیں

تعمیر کرائیں۔

۵۔ جہاں آرا بیگم ”ہندوستانی انشئی گنی“ سرحد و ناظمہ سرکار

۶۔ ارض تاج، از منشی واحد یار خاں ص ۱۱

۷۔ مقدمہ رقعات مانگیر ص ۸۳ سید نجیب اشرف

۸۔ جنرل آف دی پنجاب سٹاریکل سوسائٹی جلد ۲ نمبر ۲

۱۔ ”سیارہ ڈائجسٹ“ ص ۱۳۳

۲۔ جہاں آرا بنت شاہجہاں، منیاد الدین احمد برنی ص ۶۳

۳۔ ”جہاں آرا“ ص ۲۰ از طوب الرحمن کلیم

اور اپنے رشتہ داروں کے تنگ دائرے کے باہر یتیموں، بیواؤں اور عزیزوں کے لئے بھی شادی سہاوت کے حصول کا تنہا ذریعہ وہی تھی۔ یہ دنیا منی اور رحم دلی میں بے حد مشہور تھی۔ اس کی شرافت اس سے ظاہر ہے کہ اس نے بالآخر اس بیٹے کے لئے معافی نامہ لکھوایا جس نے اپنے باپ کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کیا تھا اور اس کی موت کے بعد بھی اس کی نیکی اور انکساری کی یاد اس عاجز شاعر کی صورت میں قائم رکھی گئی ہے جس نے آج تک کسی اور شہزادی یا شہزادے کی قبر کو مدین نہیں کیا ذیل کا شعر اس سے یادگار ہے اور اس کی آخری خواہش کا مرقع پیش کرتا ہے۔

بغیر سبزہ نبوشد کے مزار مرا
کہ قبر پوش حریم میں گیا ہواست

کتابیات

- ۱- ”جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں بادشاہ“ از منیاد الدین احمد برنی۔ لے
- ۲- انسائیکلو پیڈیا آن اسلام، آرٹیکل جہاں آرا
- ۳- سیاہ ڈائجسٹ اکتوبر ۱۹۷۷ء، مضمون جہاں آرا بیگم از پروفیسر محمد اسلم
- ۴- تاریخ اورنگ زیب، از پروفیسر جادو ناتھ سرکار
- ۵- ”ہندوستانی مٹی گئی“ ڈی ماڈرن ریویو ستمبر ۱۹۶۹ء از جادو ناتھ سرکار۔
- ۶- اورینٹل کالج میگزین، ۱۹۳۷ء
- ۷- ”جہاں آرا“، محبوب الرحمن کلیم
- ۸- مقدمات دفعات عالمگیر، سید نجیب اشرف
- ۹- وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر، ترجمہ خلیفہ محمد حسین
- ۱۰- ”ارض تاج“ فنی داسد یار خان۔

جناب پروفیسر محمد اسلم اپنے ایک مقالے میں فرماتے ہیں: ”جہاں آرا کو نوجوانی ہی کے عالم میں عبادت اور تصوف کا چرکا پڑ گیا تھا۔ اُس نے حضرت ملا شاہ بدخشی کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی اس نے اپنے مرشد و دادار (حضرت میاں میر) کی طرح شادی نہیں کی اور اپنی ساری عمر عبادت اور فقر میں گزار دی۔ اس کا یہ شعر اس کے حسب حال ہے:

اسے صدف تشنہ بھر دسو تے نیساں منگر
بہر یک قطرہ آب کہ شکم بشکافند

”مفتاح التاریخ“ میں طاس ولیم ہیل جہاں آرا کی سیرت پر یوں تبصرہ کرتے ہیں: ”جہاں آرا بیگم عورتوں کی تاریخی دنیا میں بلحاظ عصمت و حیا کے بے مثل شہزادی گزری ہے تمام کتب تاریخی میں ایک نامور بندہ بیچ، خوش اخلاق، فاضل اور خوبصورت بیگم مشہور ہے جہاں آرا کا نام ہمیشہ صفحات تاریخ کو آراستہ رکھے گا اور قیامت تک اطاعت والدین اور اداۓ فرض منصبی میں ضرب المثل رہے گی۔“

شاہجہاں کے عہد کا ایک سیاح ٹیورنیر (TAVERNIER)

رقطراز ہے۔ ”اس میں کچھ شک نہیں کہ جہاں آرا ایسی عورت ہے جس میں تمام اوصاف و خوبیاں پائی جاتی ہیں یہ وہ عورت ہے کہ اگر تمام دنیا کی سلطنت اس کے ہاتھ میں دے دی جائے تو وہ نہایت ممدگی کے ساتھ اس پر حکومت کر سکتی ہے۔“

”تاریخ اورنگ زیب“ میں سر جادو ناتھ سرکار، جو ایک ہندو مورخ ہیں جہاں آرا کی سیرت کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

”اپنی والدہ کی وفات کے بعد، جہاں آرا کی فہم و فراست نے شاہجہان کو خانگی المینوں میں پڑنے سے محفوظ رکھا اس کی شرافت قلبی اور نیک فہمی اس کی ذہنی قابلیتوں سے کہیں زیادہ اس کے رنج و غم میں تسلی و تشفی کا باعث رہی اور اُس نے اپنی نیک ولی کی بدولت شاہی گھر کے تمام تنازعات کا خاتمہ ہمیشہ خوش اسلوبی سے کیا

۱۰- ”مفتاح التاریخ“، طاس ولیم ہیل جادو منیاد الدین برنی۔

ہفت روزہ

پاک جمہوریت

لاہور

سالانہ چندہ: دس روپے قیمت فی پرچہ پچاس پیسے

بالتصویر دیدہ زیب آفٹ چھپائی



علمی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی مضامین کا مرقع

عربی اسباق

افسانے اور نظمیں ————— صفحہ طلباء اور طالبات

پتہ: پاک جمہوریت ۶ فین روڈ لاہور ————— ٹیلی فون نمبر ۳۲۳۲۷۷

ستمبر — اکتوبر — ۱۹۷۴ء
جلد ۲۹ — شماره ۵



اسے شمارے میں

۲	ناصر زیدی	ابتدائیہ
۳۰	عبرت صدیقی	بر فیض قائد اعظم
۴	حسین امام صاحب	بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح
۵	ادارہ	باتیں ان کی یاد میں
۷	غلام محمد قاصر	ماؤزے تنگ کو سلام
۱۰	قیصر سلیم	عزل
۱۱	قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو	ماؤزے تنگ کے دیس میں
۱۴	خورشید انصاری	تیسری دنیا — اتحاد کا تقاضا
۲۱	شیر افضل جعفری	عزل
۲۲	سلوک منیر	(برقاب)
۲۳	اشرف صہبوی	جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں
۳۶	بشری خاں	حق گوئی کا صلہ
۳۸	اشرف ایرایانی	پٹ فیڈر کے کسانوں کی قسمت جاگ انٹی
۴۳	رشیدہ سلیم سیمیں	وسیکشن ہال میں ایک تانز
۴۵	ڈاکٹر ناظر حسن زیدی	فادوق شاہ پوری
۵۰	فرخندہ لودھی	عزل
۵۹	اسلم جدون	اسرار و رموز
۷۱	جمیل الدین عالی	بونگا
۷۵	روشن نیکینوی	نیامہ ہاد
۷۶		تشیید الترغیب
		خوش آمدید

مدیر اعلیٰ: بیگم مسرت برکی

مدیر: فضل قدیر

نائب مدیر: سید علی محمد حسینی



چند سالانہ: ۹ روپے
نی پرچہ: ڈیڑھ روپیہ

ادارہ مطبوعات پاکستان — پوسٹ بکس نمبر ۲۵۵ — راولپنڈی

خورشید پرنٹرز، اسلام آباد

ابتداء

سنہ ۱۹۶۵ء کا سال ہے۔ اس صبح ہمارے عظیم رہبر اور بانی پاکستان حضرت قائد اعظم محمد علی جناح نے میں اس وقت اور دلع کہا جب ہمیں ان کی رہبری اور رہنمائی کی شدید ضرورت تھی۔ ان کے اٹھ جانے کے کچھ ہی عرصے بعد ان کے دست راست شہید ملت ہیقت علی خان بھی ہم سے جدا ہو گئے اور اس کے بعد بے چارگی کی اس سنسنائی ہوئی طویل رات نے ہمیں گھیر لیا جس کی سحر آخر عوامی حکومت کے برسرِ قیادت آنے کے بعد ہوئی۔ قائد اعظم کے اصولوں کا زبانی دم بھرنے والے تو بہت تھے مگر اس ادارہ کو نئے محبت کی راہ پر چلنے والے کتنی کسے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ قائد اعظم کے سیاسی افکار اور ان کی عظیم شخصیت کے انتہائی سناٹا بننا پہلوؤں پر پڑے پڑے اور ان کے مغز و کھن کے افکار سے بھی لاپرواہی برتی جاتی رہی۔ یہ شرف بھی خدا نے عوامی حکومت ہی کو بخشا کہ اس نے بانی پاکستان کے مغز کے کو جہاں شایان شان حیثیت دے کر اس کو مکمل کیا۔ ان کے افکار اور نظریات کو بھی دوبارہ زندہ کرنے کا سامان کیا۔ قائد اعظم مدی منانے میں جس طرح حکومت یحییٰ بھکر پور کو کشمکش کر رہی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ موجودہ حکومت قائد کے افکار کو زندہ سا وید بھکر کر یہ چاہتی ہے کہ موجودہ نسل اور آنے والی نسلیں اپنی تاریخ اور اپنے ماضی سے اپنا رشتہ مضبوط کر لیں کہ ماضی سے کٹ کر کوئی قوم عظمت حاصل نہیں کر سکتی۔ ”ماہ نو“ بھی قائد اعظم نمبر کی تیاریوں میں مصروف ہے اس سلسلے میں ہمیں اپنے بعض معاد میں سے یہ درخواست کرنا ہے کہ خدا را حمد کی کیجئے۔ یہ نمبر تکمیلی مراحل میں ہے اپنے وعدے پورے کیجئے اور ہمیں ہمیشہ کے لئے ممنون ہونے کا موقع دیجئے۔

ستمبر کے مہینے کی دوسری اہمیت اس عظیم مدافعتی جنگ کی ہے جو ۱۹۶۵ء میں وطن عزیز کو بیرونی جارحیت سے بچانے کے لئے لڑی گئی۔ خدا نے ہمیں اس جنگ میں سرخرو کیا۔ ہم پر امن زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور اپنی سماجی و اقتصادی ترقی کے ساتھ تیسری دنیا کی بھی بہتری کے خواہاں ہیں ہمارے ۱۰ سال رہبر اس سلسلے میں جو عظیم کردار ادا کر رہے ہیں تاریخ اسے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ اس شمارے میں تیسری دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے سلسلے میں قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کا مشہور عالم مقالہ ہمارے صفحات کی زینت ہے ہماری اپنے قارئین سے استدعا ہے کہ وہ اس مقالے کا غور سے مطالعہ فرمائیں اور خود کو ایک عظیم قائد کے جھنڈے سے عظیم کردار ادا کرنے کے لئے تیار کریں۔

پچھلے دنوں کا سب سے اندہ ناک واقعہ چین کے عظیم راہنما ماؤ زے تنگ کا بساط عالم سے اٹھ جانا تھا ہمیں امیر ہے اس شمارے کے دو مضامین جو اس عظیم انسان کی شخصیت اور اس کے بے مثال زرعی انقلاب سے متعلق ہیں مرغوب قارئین ہوں گے۔

اکتوبر کا آغاز نہایت مبارک اور پر مسعد ہے کہ اس کے پہلے ہفتے میں مملکت عربیہ سعودیہ کے فرماں رواں ذی وقار محمد شاہ خالد بن عبدالعزیز پاکستان کے پہلے سرکاری دورے پر تشریف لائے ہیں وہ اس موقع پر دنیا کی سب سے بڑی مسجد شاہ فیصل شہید کا اسلام آباد میں سنگ بنیاد رکھیں گے۔ شاہ خالد کے وجود میں ہمیں پھر ایک فیصل میسر آ گیا ہے اور اب اسلامیان عالم کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے کہ خالد اور ذوالفقار ان کے لئے مسدود ہیں

بہ فیض قائدِ عظیمؒ

نام سرزیدی

ہم وہ ہیں جن کی روایاتِ سلف کے آگے
 چڑھتے سورج تھے نگہوں
 قیصر و کسریٰ تھے زبوں
 گردشِ وقت سے اک ایسا زمانہ آیا
 ہم نگوں سار و زبوں حال و پرآگندہ ہوئے
 سال ہا سال کی اس صورتِ حالات کے بعد
 ایک انسان اُٹھا ایسا کہ جس نے بڑھ کر
 عزم و ہمت کا شجاعت کا چلن عام کیا
 اور برسوں کی غلامی کے شکنجوں میں کسے
 راہِ گم کردہ بھٹکتے ہوئے انسانوں کو
 لفظ ”آزادیِ جمہور“ سے آگاہ کیا
 اک نئے دورِ درخشندہ کا پیغام دیا
 قافلے بڑھتے رہے، بڑھتے رہے، بڑھتے رہے
 سورجِ آزادیٰ انساں کے یونہی چڑھتے رہے
 ہم کہ واقف تھے روایاتِ سلف سے اپنی
 ڈٹ گئے نظم و طن کی خاطر
 عزم و ہمت سے شجاعت سے نیا کام لیا
 اور قائدؒ کے اصولوں کا چلن عام کیا
 آج ہم پھر وہی مردانِ بھری ہیں کہ جو تھے

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح

عزت صدیقی

قائد اعظم رفیق ملک و ملت السلام
فطرتاً خود دار سر پر حسن آزادی کا تاج
دشمنوں کے دل ہلا ڈالے تیری للکار نے
نور کی چادر بھی سمٹے اندھیرے رات کے
آرزوؤں میں تلاطم لب پہ شور انقلاب
تا ابد قائم ہے گی یہ سنہری یادگار
ساحل مقصود پر تیرا سفینہ آگیا
روح پاکستان صرف اسلام ہی اسلام ہے
دامن ملت متاعِ آرزو سے بھر دیا
عین ممکن کر دکھایا غیر ممکن بات کو
ہیں ترے مدح سب اہل جہاں اہل وطن
جادو فکر و نظر میں پا گئے تجھ سے شکست
حق نے بخشنا ہوگا تجھ کو خلد میں عالی مقام
ملک پاکستان میں تنظیم ہو اسلام کی
قائد اعظم رفیق قوم مسلم السلام

ملک پاکستان کے اے بانی ذوالاحترام
عزم راسخ، جسم لاغر، حوصلہ آہن مزاج
زندگی ملت کو بخشی جذبہ بیدار نے
چاندنی چھلکی فضاؤں پر اجالے پھاگئے
روح میں ایماں کی گرمی رگوں میں اضطراب
تیری کوشش کا ہے پاکستان روشن شاہکار
وقت کے طوفان کے ہر دھاکے سے ٹکراتا ہوا
کاش ہم عامل ہوں اس پر جو تیرا پیغام ہے
ہم کو پاکستان کا تحفہ عطا تو نے کیا
فکر نے تیری بدل ڈالا رخ حالات کو
ماہر علم سیاست آشنائے فکر و فن
شہسواران سیاست کھا گئے تجھ سے شکست
قوم کی خدمت کے بدلے میں ملا اچھا مقام
پھر مسلمان کو ضرورت ہے ترے پیغام کی
ملک پاکستان کے اے بانی ذوالاحترام

بیاد قائد اعظم

باتیں اُن کی یاد رہیں گی

جناب حسین امام

لکھتے تھے۔ اُردو میں ان الفاظ کے معنی اکڑی گردن والے۔ اکڑوں میں اپنے کو ہم چناں دیگرے نیست، سمجھنے والے صاحب ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہتے کہ وہ سرد دماغ ہیں۔ جذبات سے عاری ہیں۔ ان سے کون سرگپائے۔

یہ سب الزام تراشیاں اس لئے تھیں کہ قائد اعظم بڑی خود دار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ وقار قائم رکھتے ہوئے اپنے سیاسی حریف سے ملاتی ہوتے تھے۔ وہ چالپوسی سے کام لینا نہیں چاہتے تھے۔ کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی۔ کبھی کسی کو ”بڑا بھائی“ کہہ کر اپنی عزت نفس کو ذلیل نہیں کیا۔ سیاسی نکات کو ٹھنڈے دماغ سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ ان کے متعلق ایک اور غلط فہمی اب تک لوگوں میں باقی ہے کہ قائد اعظم مخالفت برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ جھپوکی اصولی بحث و استدلال کی جگہ اپنا فیصلہ صادر کر دیا کرتے تھے۔ جہاں تک مجلس عاملہ کی نشست کا تعلق ہے میں آپ کو یہ بتا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ طریق کار یہ ہوتا تھا کہ زیر بحث مسئلہ پر قائد اعظم اپنے رفیقوں سے ان کی رائے معلوم کرتے تھے اور پھر ہر رائے کا احاطہ کرتے ہوئے آپ ماہر وکیل کی طرح جرح کرتے اور پھر اپنی رائے بتاتے کہ یہ بہتر فیصلہ ہو سکتا ہے اس کے بعد بھی کسی کو اختلاف ہوتا تو اس کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع دیتے تھے۔ اس طرح ایک متفق فیصلہ مجلس عاملہ کا سامنے آتا۔ ایک مرتبہ لیگ کے کھلے اجلاس میں ایک قرارداد

قائد اعظم محمد علی جناح کی رفاقت مجھے ۱۹۳۵ء سے نصیب تھی۔ وہ جب مرکزی اسمبلی کے رکن بنے تو پھر مجھ سے ان کے تعلقات استوار ہوئے۔ وہ ۱۹۳۵ء میں ممبر ہو کر آئے جبکہ میں ۱۹۳۱ء سے مرکزی ایوان بالا کا ممبر تھا۔

قائد اعظم کا قیام اسمبلی کی نشست کے دنوں میں دہلی میں رہا کرتا تھا اس طرح ملاقاتوں کا سلسلہ رہتا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں جب مسلم لیگ پارٹی دونوں ایوانوں میں بنی تو مجھے قائد ایوان بالا کی حیثیت سے اور بعد ازاں رکن مجلس عاملہ اور مرکزی پارلیمانی بورڈ کی حیثیت سے اور بھی زیادہ قرب نصیب ہوا اور قائد اعظم کی پہلو دار شخصیت سمجھنے کے بہتر مواقع ملے میں ان چند خوش نصیبوں میں اب تک بہ ندرت حیات ہوں جو ذاتی طور پر ان کے نزدیک ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔ میرے علاوہ جناب عبدالستار سیٹھ، ایم اے، مصنفہانی، ایم اے کھوڑو اور ایک دو باقی رہ گئے ہیں۔

”غیبت ہے کہ ہم صورت بھی دوچار بیٹھے ہیں۔“

تحریر پاکستان کے دوران جس کمیٹی کا ہم نے ثبوت دیا اس کی سب سے بڑی وجہ قائد اعظم کی قائدانہ صلاحیت اور ان کی بغیر بحث طلب شخصیت تھی، گو ہندو پریس نے جو ہندوستان کی سیاست پر چھایا ہوا تھا۔ قائد اعظم کے بارے میں طرح طرح کے افسانے تراشے مگر ہر بار منہ کی کھائی۔ کبھی ان کو اسٹیف نیکڈ (STIFF NECKED) اور کبھی اسٹینڈ آفس (STAND OFFISH)

کراچی سے بمبئی وکالت کرنے آئے تو تین سال بڑی عمر سے گزارے جب ایک انگریز دوست نے ان کو چند ماہ کے لئے عارضی پریڈنسی مجسٹریٹ کا عہدہ دلوا دیا تو انہوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا اور جب عارضی ملازمت ختم ہوئی تو اس انگریز نے دوسری بار ایک مستقل ملازمت ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہانہ کی پیشکش کی تو قائد نے شکریہ کے ساتھ رد کر دیا کہ چند برس میں اپنے پیشہ میں اس سے زائد کمائوں گا۔ اس واقعہ کو سن کر میرے عزیز (جن کا انتقال ہو گیا ہے) اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے ملازمت کا خیال ہی ترک کر دیا۔ اور اپنے پیشہ وکالت میں خاص کامیاب رہے!

قائد اعظم کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ کسی کا احسان اس وقت تک لینا نہیں چاہتے تھے جب تک وہ اس احسان کا بدلہ خود نہ کر سکیں۔ ایک دفعہ ہم لوگ بیٹھے تھے کہ کسی صاحب نے قائد اعظم سے ان کے پرانے مکان کا ذکر چھڑا۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیا وہ مکان کسی اور جگہ تھا تو قائد اعظم نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ جس طرف مکان کا رخ تھا وہ زمین سرکاری تھی اور پی ڈی بی کا دفتر تھا۔ دفتر والوں نے شرارت سے اس سامنے والی زمین پر ملازموں کیلئے پائینٹا بنوانے شروع کر دیئے تو بجائے اس کے کہ میں افسر بالا سے شکایت کروں اور کہوں کہ وہ اُن کا رخ بدل دیں۔ میں نے اپنے مکان کا رخ ہی بدل دیا اور اسی وقت تصدیق کر لیا کہ کسی اور جگہ بنواؤں گا۔ چنانچہ لندن سے واپسی کے بعد نیا مکان مالا بارہل پر بنوایا جہاں اس وقت ہم سب بیٹھے ہیں! ہندو پاکستان کی سیاسی شخصیتوں میں قائد اعظم کی شخصیت یکتا ہے۔ رد گارہ ہے کہ ان پر کبھی کسی نے کسی قسم کی خرد برد کی الزام تراشی نہیں کی۔ وہ چھوٹے سے چھوٹی رقم کی بھی رسید بھیجتے تھے۔ قائد اعظم کو آج ہم میں جمہانی طور پر نہیں ہیں مگر ان کی روح آج بھی بھڑکن ہے۔

پر حسرت موہانی نے مخالفت میں تقریر شروع کی تو سارا مجمع ان کی مخالفت کے خلاف کھڑا ہو گیا اور ان سے بیٹھنے کے لئے کہنے لگا۔ اس موقع پر قائد اعظم جو جلسہ کی صدارت کر رہے تھے کھڑے ہو گئے اور مجمع کو خاموش رہنے کی تلقین کی اور کہا کہ مولانا کو مخالفت کا حق ہے اور آپ کو ان کی تقریر سننے پر پڑے گی۔ ایسے جمہوریت پسند کو کانگریسی اخبار اور کانگریسی نظریہ رکھنے والوں کے پروپیگنڈہ نے کیسا مسخ کیا کہ آج پاکستان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو قائد اعظم کو ”آمر“ کہتے ہیں۔

”نا ملے سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہئے“

قائد اعظم طلباء کو بہت عزیز رکھتے تھے کہ ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ جب بھی طالب علم ان کے پاس آتے تو قائد اعظم ایک شفیق باپ کی طرح کھلے دل سے ان سے ملتے۔ ان کے ہر سوال کا شافی جواب دیتے۔ اس دور کے طالب علم لیڈر گواہ ہیں کہ قائد اعظم نے کبھی ان سے فاصلہ سے ملاقات نہیں کی، کبھی ان کو چھوٹا نہیں سمجھا۔ نہیں یقین تھا کہ یہ کچا سونا جب تپے گا کھرا سونا بن کر سامنے آئے گا۔ چنانچہ جب کل ہند و پاک الیکشن میں وقت پڑا تو نوجوان مسلم لیگ کا ہر دل درست ثابت ہوئے مسلم لیگ کی کامیابی کا بڑا حصہ ان نوجوانوں کی دن رات کی کوشش پر منحصر تھا بڑا قائد وہ ہے جو تخریب کی جگہ جانوں کو تخلیق کا سبق دے۔ پاکستان کی تخلیق کا ان جوانوں کے سرسہرا ہے! قائد اعظم خود بھی خود ارستے اور دوسروں میں بھی خوداری دیکھنا چاہتے تھے میرے ایک عزیز جن کے مرحوم والد مجلس عاملہ کے رکن رہ چکے تھے اور جن سے قائد اعظم کے بڑے گہرے تعلقات تھے، میرے ہمراہ قائد اعظم سے ملنے گئے۔ وہ ایک ملازمت کے لئے ایک سفارشی خط قائد اعظم سے لینا چاہتے تھے۔ ان کے اس سوال پر قائد اعظم نے اپنا ایک واقعہ سنایا کہ جب وہ پہلے پہلے



ماؤزے تنگ کو سلام

ادارہ

ماؤزے تنگ انقلاب کی پیداوار بلکہ انقلاب کی روح
اس کا نعرہ اور اس کے محرک تھے وہ ایک نئے تابناک
دور کے مہمار تھے جس نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔
ان کے افکار رہتی دنیا تک لوگوں اور قوموں کو رہنمائی
فراہم کرتے رہیں گے۔

آگے چل کر وزیر اعظم تے فرمایا،

”آج دنیا ماؤزے تنگ کی موت پر نوحہ کننا ہے
لیکن کل جب سورج طلوع ہوگا تو لوگ اس کی تقریر کے
گیت گائیں گے۔ ہم پاکستانی ماؤزے تنگ کو
سلام کرتے ہیں۔“

صدر مملکت جناب فضل الہی چودھری نے وزیر اعظم چین کے نام اپنے

تقریبی پیغام میں فرمایا،

”ہم نے چیزیں ماؤ کی وفات کی خبر انتہائی دکھ سے
سنی۔ وہ چینی انقلاب کے مانی تھے جس نے دنیا کے چوتھائی
عوام کی زندگیوں تبدیل کر دیں۔ بلاشبہ وہ بہت بڑے
راہنما تھے جنہوں نے ایک مدبر اور سیاسی مفکر کی حیثیت
سے انسانی تاریخ کے صفحات پر ائمہ نقوش چھوڑے ہیں۔

چین کے عظیم راہنما اور ۸۰ کروڑ چینی عوام کے نجات دہندہ
ماؤزے تنگ پچھلے دنوں انتقال کر گئے۔ وہ بلاشبہ ایشیاء کے
عظیم ترین فرزند تھے، انہوں نے گراں خواب چینوں کو نکر و عمل کی
وہ حرارت بخشی جس نے انہیں خود آگہی اور یقین عطا کرنے کے
ساتھ ظلم و استعمار سے نجات حاصل کرنے کا جو یا بنا دیا۔ ایک
مختصر مدت میں انہوں نے قومی تعمیر کے لئے وہ کچھ کر دکھایا جو صدیوں
کے مسلسل عمل سے بھی تکمیل کو نہیں پہنچتا۔

وزیر اعظم بھٹو نے جو سیلابِ سرمتاڑہ اپنے عوام کی
دلجوئی اور خدمت کے لئے دریائے سندھ کے دائیں کنارے کا دورہ
کر رہے تھے۔ اس افسوسناک خبر کو سن کر فرمایا:

”ماؤزے تنگ جیسے لوگ ایک صدی بلکہ ایک

ہزار سال میں پیدا ہوتے ہیں۔ لوگ دنیا کی قیادت پر
چھا جاتے ہیں اور تاریخ ساز ہوتے ہیں اس میں کوئی
شک نہیں کہ چین میں ماؤزے تنگ عظیم لوگوں میں سب
سے عظیم تھے، انہوں نے انتہائی مختصر عمر میں تاریخ کو مسخر
کر لیا۔ ان کے افکار اور ان کی شخصیت نے لاکھوں
انسانوں کے دلوں پر گہرے نقوش ثبت کئے ہیں۔

اس اسکول نے چین میں انقلابی ذہن تیار کرنے میں بڑی مدد دی۔ ۱۹۱۸ء میں ماؤ پینگ کی ایک لائبریری میں اسٹنٹ ہو گئے یہاں انہیں نوجوان انقلابیوں کی صحبتیں میسر آئیں۔ ماؤ پینگ ہیں ایک سال کے لگ بھگ رہے پھر شننگائی چلے گئے جہاں مختصر قیام کے بعد وہ چانگ شا چلے گئے۔ چانگ شا میں انہوں نے ایک اخبار کی ادارت سنبھال لی اور نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم کی۔ حکام نے ایک ماہ کے بعد ہی اس اخبار کو بند کر دیا۔ انہوں نے دوسرا اخبار نکالا مگر جلد ہی یہ بھی بند کر دیا گیا۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں ماؤ بڑے واضح انداز میں میدان سیاست میں اتر آئے اور انہوں نے پہلی بار طلباء کی ایک ہڑتال کی قیادت کی جسے کے گورنر نے ماؤ کو صوبہ بدر کر دیا۔ اور مجبوراً اب انہیں پھر شننگائی کا رخ کرنا پڑا۔ یہاں ان کی ملاقاتیں مارکسزم کے حامیوں سے ہوئیں اور ان ہی کی تلقین سے انہوں نے مارکس کے افکار کا مطالعہ شروع کیا۔

۱۹۲۰ء میں ماؤ ایک بار پھر چانگ شا پہنچے جہاں انہیں ایک پرائمری اسکول کا میڈ ماسٹر مقرر کر دیا گیا۔

۱۹۲۰ء میں چین میں کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ماؤ نے جو مارکسزم کے مطالعے کیونسلوں کے حامی بن گئے تھے چانگ شا میں کمیونسٹ پارٹی کا ایک سیل اور یوتھ لیگ قائم کر دی۔ کمیونسٹوں کی پہلی کانگریس کا اجلاس شننگائی میں جولائی ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ ماؤ نے اس اجلاس میں سیکرٹری کے فرائض ادا کئے۔ اس کے بعد انہیں ہونان میں پارٹی کا سیکرٹری مقرر کر دیا گیا۔

جون ۱۹۲۲ء میں ماؤ نے کیٹن میں تیسری کمیونسٹ کانگریس میں شرکت کی اس کانگریس میں ماؤ کو پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کا رکن مقرر کر لیا گیا۔ ۱۹۲۳ء کے اواخر تک ماؤ شننگائی میں رہے۔

مئی ۱۹۲۵ء میں ان کے خیالات میں ایک عظیم انقلاب آیا۔

ان کی موت نہ صرف چینی عوام کے لئے بلکہ پوری دنیا کے لئے ایک عظیم نقصان ہے۔ پاکستان کے عوام انہیں ہمیشہ ایک محکم اور قابل اعتماد دوست کی حیثیت سے یاد رکھیں گے۔

ماؤزے تک ۲۶ دسمبر ۱۸۹۳ء کو چین کے صوبہ میانگ تان سین کے ایک گاؤں سواشن میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک عزیزب کسان تھے۔ ماؤ نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری اسکول میں حاصل کی پرائمری اسکول میں پانچ سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے کھیتوں میں کام کرنے لگے۔ ابتدا ہی سے انہیں تعلیم سے عشق تھا اسی لئے انہوں نے محنت و مصنت کے ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی اور نجی طور پر کتابیں پڑھتے اور اپنی فراست اور دانائی میں اضافہ کرتے رہے۔ پھر تین سال گھر پر رہنے کے بعد وہ گھر کے تنگ، ماحول اور باپ کی سخت گیری کے باعث گھر سے بھاگ گئے اور کام کاج کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اسکول میں تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔

۱۹۱۱ء میں ماؤزے تنگ، چانگ شا چلے گئے جہاں تقریباً دس سال وہ مقیم رہے۔ انہوں نے مانچو خاندان کی حکومت کے زوال کو اپنے نظروں سے دیکھا اور حب الوطنی کے جذبے کے تحت انقلابی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شریک ہو گئے ۱۹۱۲ء میں وہ اس فوج سے علیحدہ ہو گئے اور واپس اپنے اسکول پہنچ گئے۔ اس تاریخی شہر میں انہوں نے علم کے موتی جہاں میسر آئے اپنے دامن میں خوب خوب سمیٹے۔ ۱۹۱۳ء میں وہ نارمل اسکول میں داخل ہوئے اور یہاں انہوں نے معلمی کی تربیت حاصل کرنا شروع کی۔ مگر بعض وجوہ کی بناء پر اس تعلیم کو انہوں نے ہونان کے نارمل اسکول میں مکمل کیا۔

۱۸ - ۱۹۱۷ء میں ماؤ اور ان کے چند ساتھیوں نے ایک اسکول کی بنیاد رکھی جہاں نوجوانوں کو سیاسی تعلیم دی جاتی تھی۔

اور اس کے نتیجے میں ۱۹۲۷ء میں کمیونسٹوں نے ٹانگنگ میں مسلح بغاوت کر دی۔

دسمبر ۱۹۳۱ء میں جزل چینگ کاٹی شیک نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ کمیونسٹ باغیوں کو کچل دیں۔ مگر ماؤ نے چینگ کی ہنہم کو تاکام بنا دیا۔

ماؤ نے اب پہاڑی علاقوں میں اپنی گوریلا فوج کی تنظیم شروع کی۔ نومبر ۱۹۳۱ء میں عوامی جمہوریہ چین کا اعلان کمیونسٹوں کی جانب سے کیا گیا اور ماؤ اس کے چیئرمین مقرر کئے گئے۔

کومنتانگ نے اب ماؤ کے ساتھیوں پر ہر طرف سے یورش کر دی حالات اتنے نازک ہو گئے کہ ماؤ کو آخر وسط ۱۹۳۴ء میں چھ ہزار میل لمبا اپنا وہ عظیم مارچ کرنا پڑا جسے تاریخ میں لانگ مارچ کہا جاتا ہے۔ یہ مارچ ایک سال جاری رہا اور اس میں بے پناہ جانی نقصان ہوا۔ اس لانگ مارچ کے بعد ماؤ نے نیچے کچے سپاہیوں کو دوبارہ ایک زبردست گوریلا جنگ کے لئے منظم کیا۔ انہوں نے تمام علاقے کے کسانوں کو منظم کر کے ان کے دستے ترتیب دیئے اور اس طرح دس ہزار سے زیادہ فوج اکٹھی کر لی۔

۱۹۳۰ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ لائی لائی سان مقرر ہوئے۔ ماؤ ان کے خیالات سے ہم آہنگ نہ تھے۔ تاہم طویل بحث و مباحثہ کے بعد انہوں نے لائی لائی سان کے منصوبوں پر طوعاً و کرہاً عائد کر ہی دیا۔ اور جون ۱۹۳۰ء میں اپنے فوجی دستوں کی تنظیم نو کے بعد انہوں نے ہونان کے دارالحکومت چانگ شا پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۳۵ء میں ماؤ کومنتانگ سے مل کر سیاپانی حملہ آوروں کو پسپا کرنے میں مشغول ہو گئے۔ کچھ عرصے کے بعد دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ ۱۹۴۵ء میں جب جاپانیوں کا زور ٹوٹ گیا تو کومنتانگ اور کمیونسٹوں نے شمالی چین پر اپنا اپنا قبضہ مستحکم کرنا شروع کر دیا اور یوں ایک مرتبہ پھر کومنتانگ

انہوں نے سوچا محنت کشوں اور مزدوروں کے علاوہ کسانوں کی قوت کو منظم کرنا پارٹی کا اولین مقصد ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے بڑے خلوص اور لگن سے کسانوں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ ان کی کوششوں اور سرگرمیوں سے حکومت وقت سخت چوکنہ ہو گئی اور ۱۹۲۵ء میں انہیں ایک مرتبہ پھر صوبے سے نکال دیا گیا۔

جنوری ۱۹۲۶ء میں ماؤ کو چین کی تحریک آزادی کومنتانگ کے پراپیگنڈے کے شعبے کا سربراہ منتخب کر دیا گیا اور فروری میں انہیں کسان کمیٹی کا رکن چنا گیا۔ کومنتانگ اور کمیونسٹ اب تک ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے مگر اب ان میں اختلافات نمایاں ہونے لگے تھے اور جب ۱۹۲۶ء میں کومنتانگ کے سربراہ چینگ کاٹی شیک نے محنت کشوں کے خلاف بعض سخت اقدامات کئے تو ماؤ کو مشکوک سمجھے ہوئے انہوں نے انہیں شعبدہ فروش و شامت کے عہدے سے ہٹا دیا۔

مستقل مزاج ماؤ اس سلوک سے شکست قبول کرنے والے نہیں تھے انہوں نے کسانوں کی تربیت کے اسکول میں اپنے خیالات کی زبردست تبلیغ کی۔ یہ ادارہ کمیونسٹوں کا اڈہ بن گیا۔ کچھ عرصے کے بعد ماؤ کینٹن چلے گئے۔ اب وہ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کسان کمیٹی کے صدر تھے۔ اس حیثیت میں انہوں نے بڑے دور سے کئے اور زبردست تقاریر سے کسانوں کو منظم کیا۔

۱۹۲۷ء میں کچھ عرصے تک انہوں نے کسانوں کی حالت زار کا جائزہ لیا اور اپنی مشہور عالم رپورٹ لکھی۔ اس رپورٹ میں انہوں نے آخر میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ ایک دن غریب کسان بڑے زمینداروں کے استحصال کا خاتمہ کر دیں گے۔

۱۹۲۷ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی کی پانچویں کانگریس ہوئی ماؤ نے اس کانگریس میں جب کسانوں کی طرف توجہ نہ پائی تو وہ اس کے جلسوں میں شریک نہ ہوئے۔

کمیونسٹوں اور کومنتانگ کے مابین اشتراک ختم ہونے لگا۔

غزلے

غلام محمد قاسم

یوں تو صدائے زخم بہت دور تک گئی
اک چارہ گر کے سامنے جا کر بھٹک گئی

خوشبو، گرفتِ عکس میں لایا اور اس کے بعد
میں دیکھتا رہا تری تصویر تھک گئی

گل کو برہنہ دیکھ کے جھونکا نسیم کا
جگنو بھبھ رہا تھا کہ تتلی چمک کھئی

میں نے پڑھا تھا چاند کو انجیل کی طرح
اور چاندنی صلیب پہ اگر ٹٹک گئی

روتی رہی پیٹ کے ہر اک سنگ میل سے
مجبور ہو کے شہر کے اندر بڑک گئی

اب تلخ ذائقوں کے تعاقب میں ہے زباں
مدت ہوئی شراب سے مستی پھلک گئی

قاتل کو آج صاحبِ اعجاز مان کر
دیوارِ عدل اپنی جگہ سے سرک گئی



اور کمیونسٹوں میں تعادد شروع ہو گیا۔ سرخ فوج منجور یا پر قابض ہو گئی اور اب چین میں زبردست خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اور بالآخر کمیونسٹوں نے میدان مار لیا اور ۱۹۴۹ء تک چیانگ کائی شیک کی فوجوں کا صفایا ہو گیا اور انہوں نے اپنے حامیوں کے ساتھ جزیروں میں پنا لے لی اور ماؤ نے عوامی جمہوریہ چین کے قیام کا اعلان کر دیا۔ جس کے صدر وہ خود تھے۔ اور وزیرِ اعظم چوان لائی۔

ماؤ نے اس آزادی کے لئے ذاتی حیثیت سے بڑی عظیم قربانیاں دیں ان کے دو بھائی انقلابی جدوجہد میں کام آئے ان کی بہن اور ان کی بیوی کو پھانسی دے دی گئی اور ان کا بیٹا کوریا کی جنگ میں مارا گیا۔

ماؤ کے لائے ہوئے انقلاب کا سب سے بڑا پہلو وہ معاشرتی انقلاب ہے جس نے ایک نئے مثالی بین الاقوامی اخلاق اور حکمت عملی کو جنم دیا۔ انہوں نے اپنے حامیوں اور ہموطنوں کو صاف لفظوں میں ہدایت کی کہ وہ سیدھا راستہ اختیار کریں اور کسی قسم کی جھوٹا راستہ یا بالادستی قائم کرنے کا خیال تک دل میں نہ لائیں۔ اپنی تمام تر طاقت ملکی پیداوار بڑھانے اور محنت کش طبقے کی جمہوریت قائم کرنے پر صرف کریں۔ موجودہ چین کا معاشرہ اور اقتصادی نظام ماؤ کے انکار کی زندہ تصویر ہے :

ماوڑے تنگ کے دیس میں

قیصر سلیم

جن گھرانوں میں زیادہ کام کرنے والے ہیں وہ نسبتاً خوشحال ہیں۔ چانچر ۶٪، گھرانوں کے پاس ریڈیو ۲۰٪، گھرانوں کے پاس سلائی مشینیں اور ۸۰٪ کے پاس سائیکلیں ہیں۔ جو کارکن سب سے زیادہ اگائیاں حاصل کرتا ہے اسے ڈائریکٹر کی سفارش پر ایک بڑی تقریب میں LABOUR HERO کا اعزاز عطا کیا جاتا ہے۔

اس موقع پر ہم نے یہ سوال اٹھایا کہ ایسے گھرانے بھی ہو سکتے ہیں جن میں کوئی کام کرنے والا نہ ہو، صرف بوڑھے رہ گئے ہوں، ان کی گزراوقات کے لئے آپ کے پاس کیا انتظام ہے؟ جواب ملا کہ ایسے افراد کے لئے کیوں کی جانب سے پانچ ضمانتیں جتیا کی جاتی ہیں جن میں کھانا، کپڑا، رہائش، طبی امداد اور سردی سے بچاؤ کے لئے کوئلہ اور لکڑی وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے بعد ڈائریکٹر نے بتایا کہ چینی میں دس دن وہ بذات خود کھیتوں میں جا کر کام کرتے ہیں اور یہ نظم و نسق کے لئے بیس دن کافی ہیں لوگوں کے ذاتی مکان ہیں جن میں وہ اپنے ذاتی اشیاء کے لئے مویشی رکھ سکتے ہیں، مرغیاں پال سکتے ہیں اور سبزیاں اگا سکتے ہیں اس کیوں میں تو بے اقسام کی سبزیاں پیدا کی جاتی ہیں برفباری کے زمانے میں بھی سبزیاں اگائی جاتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے اٹھ سو HOT HOUSES تعمیر کئے گئے ہیں۔

مجھے ۱۹۶۶ء کے اوائل میں دو ماہ کے لئے چین جانے کا اتفاق ہوا یہاں پر میں صرف انہی تفصیلات کو درج کر رہا ہوں جو زمین اور زراعت سے متعلق ہیں۔ پکنگ کے فوج میں ہم پیپلز کمیون PEOPLES COMMUNE دیکھنے گئے۔ کیوں کے ڈائریکٹر نے بڑا پر تپاک خیر مقدم کیا ان کے دفتر کی عمارت ویسی ہی تھی جیسی کہ عام طور پر دیہاتوں میں ہوتی ہے۔ ہال میں کرسیوں پر بٹھانے کے بعد ہمیں چین کی مخصوص چائے سے نوازا گیا۔ اس کے بعد ڈائریکٹر نے اپنے کمیون کی تفصیلات بتائیں جو یہ ہیں:-

کمیون کا رقبہ ۵۷۵۰ ایکڑ ہے۔ ۵٪ زمین نجی پلاٹوں کے لئے مختص ہے۔ پانچ پیداواری بریگیڈ ہیں کل آبادی بیالیس ہزار ہے جن میں کام کرنے والے (ABLE BODIED) انیس ہزار ہیں، تو بڑاڑ سے اوپر مکانات ہیں۔ سالانہ پیداوار ۱۳۵ ملین کیلوگرام (تقریباً ۳۰۰،۰۰۰،۷۵۰ من) ہے سات درکشاپ ہیں ۳۱ ٹریکٹر ۵۴ ٹرک اور ۲۵۲ بجلی کے پمپ ہیں۔ ابتداء میں حکومت نے تین لاکھ یوآن (چھ لاکھ روپے) خرچ کئے ہیں۔ کل پیداوار کا ۷۰ فیصد بطور ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ بقیہ میں سے کمیون کے جملہ اخراجات منہا کر کے کام کی اکائیوں (WORK POINTS) پر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

کیون کے تمام علاقے پر نظر ڈالنے سے ایسا معلوم ہوا کہ زمین کا کوئی حصہ کاشت نہیں چھوڑا گیا ہے۔ حتیٰ کہ سڑک کے کناروں تک کھیتی کی جا رہی ہے بعد میں جب وہاں موسم بہار شروع ہوا تو ہم نے گندم کے پودے ہر طرف ابھرتے دیکھے۔ یہاں تک کہ پہاڑوں پر بھی گندم کے پودوں کی پہلیاں نظر آئیں۔

ایک روز قومی زراعتی نمائش کا مرکز (NATIONAL AGRICULTURAL EXHIBITION CENTRE) دیکھنے گئے یہ مرکز دس بڑے ہال پر مشتمل ہے اور یہ بھی آزادی کی دسویں سالگرہ کے موقع پر یعنی ۱۹۵۹ء میں کل دس مہینوں میں تعمیر ہوا ہے بے شمار اشیاء دیکھنے کے بعد ہمیں TAIZAI BRIGADE کا کارنامہ دکھایا گیا۔ دیوار پر ایک بڑے نقشے میں اس علاقے کی تصویر تھی۔ پہاڑوں پر کھیتیاں بنانے کا سب سے پہلا تجربہ یہیں کیا گیا۔ پارٹی کے سیکرٹری کی تصویر بھی بچے نمایاں طور پر دکھائی گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ ان ہی کی رہنمائی میں یہ کام انجام کو پہنچا ہے۔

دوسری جانب سیم وختور دور کرنے کی ترکیبیں تصویروں اور نقشوں کے ذریعے واضح کی گئی تھیں یہ چونکہ ہمارے لئے بھی ایک مسئلہ ہے۔ اسیلے ہم نے اس میں خاص دلچسپی لی۔ ڈیٹا سٹریٹر، جو ایک خاتون تھی، نے بتایا کہ پورے سیم زدہ علاقہ میں مشرق تا مغرب ڈیڑھ میٹر گہرا اور شمال تا جنوب ڈھائی میٹر گہرا نالہ کھود دیا جاتا ہے تاکہ تمام علاقے کی نمی ان نالوں کے ذریعہ بہہ نکلے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ گواہ کے بیج بودیتے ہیں اور جب یہ پودے بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کو سیم زدہ علاقے میں جوت دیتے ہیں۔

قدرتی کھاد کا بھی عجیب انتظام کیا گیا ہے۔ پانچ قسم کی فصلیں اس طرح الگ الگ قطار میں بوئی جاتی ہیں کہ ایک فصل تیار ہو تو اس کی پھلیاں کاٹ کر پودوں کو کھیت میں جوت دیتے ہیں جو دوسرے پودوں کے لئے کھاد کا کام دیتے ہیں۔ اسی طرح دوسری فصلیں بھی یکے بعد دیگرے کھاد کا کام دیتی ہیں۔

ان معلومات کے بعد ہم کیون کی سیر کو نکلے۔ سب سے پہلے ہم نے ایک HOT HOUSE دیکھا جو اندازہ ہے کہ پچاس گز لمبا اور بیس گز چوڑا ہوگا دیواریں پکی تھیں اور صرف ایک دروازہ تھا۔ چھت شیشوں کی بنی ہوئی اور ڈھلوان تھی۔ ڈھلوان کاٹی تھی تاکہ ہوت پگھل کر آسانی سے نیچے جلی جائے اور دھوپ اور روشنی اندر آتی رہے۔ نگہاں ایک بڑے میاں تھے۔ اندرونی حصہ گرم رکھنے کے لئے ایک کونے میں چوہا تھا جہاں سے تمام حصے میں گرمی پہنچانے کے لئے کپریلوں کے پائپ کا انتظام تھا۔ درجہ حرارت کو خاص حد تک رکھنے کے لئے ہاتھ دو ہاتھ فاصلے پر بندھے ہوئے بانس کی تھپیوں میں تھرماسٹک بھی لگے ہوئے تھے۔ ایک اور خاص بات یہ بھی دیکھی کہ کھیرے وغیرہ کے ابتدائی پھلوں کے ساتھ، دھاگے سے بندھی ہوئی مٹی کی گولیاں بھی تھیں۔ دریافت کرتے پر معلوم ہوا کہ اس طرح پھل نیدھا سڈول اور دبلا ہوتا ہے غرضیکہ شدید برفباری میں بھی انہوں نے ٹماٹر، مرچیں، کھیرے، گلگڑیاں، ساگ اور سلاد وغیرہ اگانے کا انتظام کر رکھا تھا جن کی مانگ شہروں میں ہمیشہ رہتی ہے۔

یہاں سے ہم، ان کے ذاتی مکانات دیکھنے گئے پہلا مکان کافی بڑا تھا۔ تیرہ کوٹھریاں تھیں، کپاؤنڈ بھی بڑا تھا جہاں ایک پینڈیپ تھا اور سبزی کے پلاٹ بنے ہوئے تھے۔ ایک بڑے میاں بھی تھے اور بچکانہ پاؤں والی بڑی بی بھی تھیں۔ دونوں نے بٹھے خلوص اور تپاک کا اظہار کیا، پھر ایک خاتون آئیں اور انہوں نے تفصیلات بتائیں۔ جوان لڑکیاں دور دور سے دیکھتی رہیں۔ سب کی سب سمارٹ اور صحت مند نظر آئیں۔ ان کے پاؤں قد کے مطابق نارمل تھے خاتون نے بتایا کہ ان کے یہاں ۱۴ افراد ہیں جن میں پانچ کام کرنے والے اور بقیہ بچے اور بوڑھے ہیں۔ دوسرے مکان میں گئے تو بتایا گیا کہ اس مکان میں انیس افراد ہیں۔ پانچ تو کیون میں کام کرتے ہیں، ایک ٹیچر ہیں اور دو شہروں میں ہیں۔ تیسرے مکان میں صرف دو کاتے والے بقیہ نو افراد بوڑھے اور بچے تھے۔

لئے بھی اس کی تصدیق کر دی ہے لیکن ڈاکٹر کٹر اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ ان بزرگوں کی خدمت میں بھی جاتا ہے جس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے کہ جو ضعیف العمری کے سبب کام کرنے کے قابل نہیں رہتے اور جو لاولد ہوتے ہیں اور جن کو کیوں کی طرف سے پانچ ضمانتیں دی جاتی ہیں اور جہاں انہیں سکونت دی جاتی ہے اس کا نام "HOUSE OF RESPECT FOR OLD MEN" ہوتا ہے۔ ان بزرگوں میں ایسے حضرات بھی ہوتے ہیں جنہیں بیٹریں چرانے کا پچاس سالہ تجربہ ہو گیا ہے یہ حضرات باہر نکل کر آسمان کو دیکھتے ہیں، ہواؤں کے رخ پر نظر رکھتے ہیں اور زمین سے پتھر اٹھا کر اُس کے نیچے کی نمی کا اندازہ لگاتے ہیں اس طرح اگر انہوں نے بھی تصدیق کر دی کہ کل بارش ہوگی تو ڈاکٹر کو ملنے پیداواری بریگیڈوں کو ہدایت دیتا ہے کہ فلاں مقام پر جو کئی سو لیکڑ زمین تیار ہے اُن کے آج اس میں شکر قندی بادی جائے۔ اس قدر احتیاط اور اعتماد کے بعد دوسرے دن بارش یقیناً ہو جاتی ہے اور شکر قندی کے پودے لہلہا اُٹھتے ہیں۔

جب کھڑ پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو کیوں ولے پودوں کی حفاظت کے لئے ہزاروں من سوکھی گھاس اور پیال جلا دیتے ہیں۔ تاکہ پودوں کو نقصان نہ پہنچے۔ ہدایت ملے ہی سیل گاڑیوں کا قافلہ چل پڑتا ہے۔ لیکن اس اعلان کے لئے مقامی ماہر موسمیات کو اپنے آلات کے ذریعے سو فیصد درستگی کا یقین کر لینا پڑتا ہے تاکہ غلط پیش گوئی کے سبب کیوں کو نقصان نہ اٹھانا پڑے۔

یہاں ایک چھل بھی دیکھی ہے BABY FISH کہتے ہیں یہ پانی کے علاوہ خشکی میں بھی رہ سکتی ہے اور جب بولتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچہ زور رہا ہے۔

شہرت یافتہ لٹن (PEKING DUCK) بھی دیکھی جو دو جینے میں FORCED FEEDING کے ذریعے سات کلو گرام وزنی ہو جاتی ہے۔

کیوں نظام کا مظاہرہ صوبہ ہوتی میں بھی دیکھنے میں آیا جہاں کئی کیوں مل کر دریا کا رخ تبدیل کرنے میں مصروف تھے۔ یہ کارروائی بھی سیم و قشور کا خاتمہ کرنے کے لئے کی جا رہی تھی۔

یہ تو تھا آنکھوں دیکھا حال۔ اب سسلسلے کی ایک فلم کا بھی ذکر سنئے پکنگ سے دیوار چینی جاتے ہوئے ایک ذخیرہ آب MING RESERVOIR تعمیر کیا گیا ہے اس فلم میں چیئر مین ماؤنٹے تنگ، وزیر اعظم چو این لائی اور مارشل چو تہہ کو کام کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ حضرات بہنگی کو کندھے پر رکھے ہوئے مٹی ڈھوتے دکھائے گئے ہیں۔

کیوں نظام کی افادیت کا اندازہ چند چینی کتب کے مطالعے سے بھی ہوا۔ موسمی پیشین گوئیاں جہاں ریڈیو سے نشر کی جاتی ہیں وہاں کیوں کے اندر بھی موسمیات کا ایک شعبہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کٹر، ریڈیو رپورٹ کے بعد اپنے ماہر موسمیات سے بھی معلومات حاصل کرتا ہے۔ اب ذہنی کر لیجئے کہ ریڈیو نے ایک بڑے علاقے کے لئے اُنندہ چوبیس گھنٹوں میں بارش کی پیش گوئی کی ہے۔ اس کے بعد متعلقہ کیوں کے ماہر موسمیات

تیسری دنیا۔ اتحاد کا تقاضا

قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو

شروع کرنا باقی ہے جو کسی قطعی نتیجہ تک پہنچ سکے۔ اسے گڈ مڈ اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہے۔ چونکہ یہ مضابطہ ساز یوں کے گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ گئی ہے اس لئے اب اسے یہ خطرہ لاحق ہے کہ لفاغلی میں کہیں اس کا گلا گھونٹ نہ دیا جائے۔ اس سے بھی بدتر بات یہ ہے کہ اسے طاقت کی سیاست کی بساط میں ایک مہرہ، عسکری چال کا ایک اڈہ یا ایسے اختیارات کرنے کے لئے ایک آڑ بنایا جاسکتا ہے جو بذات خود ذلیل نہ ہوں لیکن جو تاریخی مسئلہ کی مرکزیت کو مسخ کرتے ہیں۔

اس مکالمہ کو گڈ مڈ کرنے کے کیا اسباب ہیں؟ انہیں منظر عام پر لانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس حیرت انگیز کام کی خوبی سے انکار کیا جائے جو ۷۷ ممالک کے گروپ کے زیر اہتمام کیا گیا ہے جس کی عکاسی منشور الجیٹرز، اعلان یما (پیرو)، ایکشن پروگرام، اعلان ڈاکار (سیسے گول) کے فیصلوں اور اعلان منیلا میں کی گئی ہے۔ نہ ہی یہ ان قراردادوں کی قدر و قیمت کو کم کرتا ہے جو غیر جانبدار ملکوں نے قاہرہ، جارج ٹاؤن، الجیٹرز، ایما اور سب سے حال میں کولمبو میں، اقتصادی مسائل پر منظور کی ہیں۔ نہ ہی یہ ایک نئے اقتصادی نظام پر اس قسم کے مباحثے میں کوئی عدم دلچسپی ظاہر

آج بین الاقوامی سطح پر انسانی امور میں اصل مسئلہ غریبوں اور امیروں کے درمیان تقسیم کا ہے۔ ایک طرف تو لکڑیاں کاٹنے والے اور مشکوں کے ذریعہ پانی پہنچانے والے ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنہیں اس سیارے کے وسائل پر مکمل قدرت حاصل ہے اس تقسیم کی حقیقت کو جسے بعض اوقات شمال اور جنوب کی یا ہم صفت آرائی کہا جاتا ہے، پچھلے تین سال کی تبدیلیوں نے مزید اجاگر کر دیا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ اس تقسیم کو ایسی خلیج تصور کر لیا جائے۔ جسے پائنا نہ جاسکے۔ یہ ایک انوکھی صورت حال ہے جس کے ہم شاہد ہیں اور یہ اس کے سوا اور کسی بات کا تقاضا نہیں کرتی کہ قوموں کے ان دو طبقوں کے درمیان ایک تعمیری گفت و شنید ہو۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ بین الاقوامی مفاہیم میں مساوات کے مصنفانہ اقتصادی نظاموں کو حقیقت کا جامہ پہنایا جائے۔ اور ان طبقاتی جھگڑوں کو طے کیا جائے جن میں شمال یا جنوب، مشرق یا مغرب کی بہت سی قوموں کی بنیادیں اس وقت اپنے نجی دائروں میں الجھی ہوئی ہیں۔

باصطاف اس امر کے کہ اس کی مخالفت میں ظاہر طور پر خاما زو رہے۔ اس بات چیت کو اس انداز اور اس قسم کے پلیٹ فارم سے

کرتا ہے۔ جس کا آغاز اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے چیلے خصوصی اجلاس میں کیا گیا تھا اور جس نے ساتویں خصوصی اجلاس میں کچھ ترقی کی تاہم یہ بات واضح ہے کہ اس ساری کوشش نے سوچ کا صرف بنیادی ڈھانچہ تعبیر کیا ہے۔ تاکہ بین الاقوامی اقتصادی تعلقات کو انصاف کی وہ نئی سمت دی جائے جو تنہا انسانیت کو درپیش موجودہ چیلنج کا مناسب طریقہ پر جواب دے سکتی ہے۔

انصاف کی یہ سمت اب تک حقیقت کا روپ کیوں نہیں دھار سکی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تیسری دنیا کی جانب سے اس کے لئے اب تک کوئی منظم تحریک نہیں چلائی گئی۔ اقوام متحدہ کے زیر اہتمام بین الاقوامی پلیٹ فارموں پر ترقی پذیر ممالک آپس میں یک جہتی کے جو مظاہرے کرتے ہیں وہ بلاشبہ اخلاص پر مبنی ہیں اور ان کو بخوبی محسوس کیا گیا ہے۔ تاہم ہم اپنے آپ کو اس عقیدے پر مائل نہیں کر سکتے کہ تیسری دنیا کی تمام توجہات اس مل مسئلہ پر مرکوز ہیں جن سے یہ آج دوچار ہے۔ تیسری دنیا کی نفاذ انگیز حالت تو اس حقیقت سے ہی عیاں ہے کہ ترقی پذیر ملکوں کے سارے موجودہ گروپوں کی بنیاد اپنے ارکان کے علاقائی اور سیاسی تعلق پر ہے اور چونکہ وہ سب اپنی ذات کے اندر اس حد تک محدود ہیں اسی لئے وہ اس مسئلہ پر پوری توجہ نہیں دے سکتے جو سارے علاقوں پر محیط ہے اور سیاسی یا نظریاتی اختلافات سے بالاتر ہے۔ اسلامی کانفرنس، عرب لیگ، افریقی اتحاد کی تنظیم اور لاطینی امریکی ممالک کی اقتصادی تنظیمیں اپنے محدود منشوروں کی وجہ سے ایک خاص براعظم علاقے یا عقیدے کے ملکوں تک محدود ہیں۔ لہذا وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتی ہیں کہ وہ ترقی پذیر ملکوں کے اقتصادی مفادات کا بحیثیت جمعی ادراک کرتی ہیں۔

اور نہ ہی ایسا دعویٰ غیر جانب دار ممالک کا گروپ کرتا ہے اگرچہ اس گروپ نے اب اپنے آپ کو بڑھا کر ۸۰ سے زائد ارکان کا گروپ بنا لیا ہے۔ تاہم بہت سے ترقی پذیر ممالک

اس حلقے سے اب تک باہر ہیں۔ اس گروپ کے آغاز کے وقت تشکیل کا جو اصول بڑی طاقتوں سے تعلقات سے منسلک کیا گیا تھا۔ اس کا کوئی نامیاتی تعلق آج تیسری دنیا کے بنیادی مقاصد اور جدوجہد سے نہیں ہو سکتا۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ بیشتر غیر جانب دار ممالک کے رجحان کے برخلاف پچھلے برسوں میں بے انصافی کے ساتھ اس اصول کا اطلاق کیا گیا ہے۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ترقی پذیر ملکوں کے ایک گروپ اور دوسرے گروپ کے درمیان تقسیم سے صرف تیسری دنیا کی اجتماعی قوت گھٹ سکتی ہے۔ دونوں گروپ ایسے ممالک پر مشتمل ہیں جو شہنشاہیت یا نو استعماری غلبے کی سختیاں برداشت کر چکے ہیں اور جو بین الاقوامی اقتصادی نا انصافیوں کو ختم کرنے کی جدوجہد میں برابر کے شریک ہیں۔ میں خوش ہوں کہ اس حقیقت کا درجہ دست لریٹے پر اظہار حالیہ کولمبو کانفرنس میں کیا گیا ہے۔ میری قلم دوست وزیر اعظم سری لنکا نے غیر جانب دار ممالک کی اکثریت کے احساسات کی مستند طور پر ترجمانی کی۔ جب انہوں نے یہ کہا کہ غیر جانب داری کی تحریک کوئی ”مخالفت“ الگ کلب نہیں ہے۔ اور یہ کہ اگر کوئی خلوت پسندی ہے تو وہ ان ملکوں کی ہے جو کم مراعات یافتہ یا تہی دست ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا ”یہ صرف غیر جانبدار قومیں ہی نہیں ہیں جنہوں نے تبدیلی کے امکان کو محسوس کیا ہے بلکہ ساری تیسری دنیا اس وقت اپنی سیاسی اور اقتصادی قوت کو منظم کرنے میں مصروف عمل ہے تاکہ انحصار اور استحصال کے پرانے طریقوں کو تبدیل کیا جائے“ ساری عروم قوموں کی جانب سے مشترکہ کارروائی کے لئے ایک وسیع تر بنیاد قائم کرنے کی ضرورت کا اس سے بہتر اقرار نہیں ہو سکتا۔

۲

ایک خاص مدت تک ترقی پذیر ملکوں کے اتحاد کی ضرورت دنیا میں اقتصادی قوت اور اثر و رسوخ کے تیز رفتار

بڑھ گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں آج وہ اپنے اس اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے نقطہ آغاز سے بھی پیچھے ہیں۔ اس نقطہ کا ذکر کیا گیا جائے بس لے افریقہ کے کچھ حصوں میں حالیہ برسوں میں المٹاک طور پر بہت سی جانیں لی ہیں۔ ان کی خستہ حالی کی چند علامتوں میں۔ ایک تو بھوک ہے جن کا سایہ دوسرے ملکوں پر منڈلا رہا ہے اور وہ ادائیگیوں کے توازن میں سلسلہ خسارے میں اور تجارت کی یہ سے بدتر ہونے والی شرائط ہیں۔ جب ان میں سے کوئی گروپ ان بے انصافیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو مالدار ملکوں کی زبردست اقتصادی طاقت اپنا روپ دکھاتی ہے اور تجارت اور سرمایہ کے اداروں پر اپنی احیاء سے داریوں کے سہارے یہ مالک اندرونی اور بیرونی رد و بدل کے اثرات کو غریب ترقیوں کی جانب دھکیل دیتے ہیں۔ جب تیل کی قیمت بڑھی تو ترقی یافتہ ملکوں نے بحیثیت جمعی کوئی خاص قربانی نہیں دی۔ انہوں نے کیا یہ کہ اپنی صنعتی پیداوار کی قیمتیں بڑھادیں اور اس طرح تیل کے نام نہاد بحران کے بوجھ کو تیسری دنیا کی طرف واپس کر دیں۔ جب تیسری دنیا کی طرف سے برآمد کردہ بنیادی پیداواروں کی بات آتی ہے تو ترقی یافتہ ممالک ہی پر قیمتوں کا تعین کرتے ہیں کیونکہ اصل منڈیاں انہی کے قبضے میں ہیں اور پیداواری کوٹوں پر اختلاف رائے اور دوسرے اسباب ترقی پذیر ملکوں کو اپنا اثر ڈالنے سے روکتے ہیں۔ اس عمل کو اس وقت تک روکا نہیں جاسکتا جب تک کہ سارے ترقی پذیر ممالک اپنے مقاصد کو مربوط کر سکیں اور متحد ہو کر کام نہ کریں۔ گزشتہ پندرہ سال میں تیل کو چھوڑ کر تیسری دنیا کی برآمدات کا بیشتر حصہ بنتا ہے۔ بنیادی اخیار کی قیمتوں میں حقیقی معنوں میں کافی حد تک کمی ہوئی ہے۔ اس پر مستزاد ان برآمدات کی قیمتوں میں شدید سالانہ اتار چڑھاؤ ہے جس کا زیادہ تر دارم دار مالدار ملکوں میں ہونے والی اقتصادی سہ گریوں پر ہے۔ جب کچھ ترقی پذیر ممالک مصنوعات بنانے کی صلاحیت پیدا

اجتماع کے ظہور سے ماند پڑ گئی تھی۔ تیل پیدا کرنے والے ملکوں نے جب اپنے اس حق کا اظہار کیا کہ وہ اپنے بنیادی اور روز بروز کم ہونے والے وسائل پر کنٹرول کریں گے اور اس کی قیمت متعین کریں گے تو دکھی انسانیت نے اسے ایک صدیوں پرانی غلطی کی ڈرامائی طریقہ سے اصلاح تصور کیا۔ اس سے یہ اُمید بھی پیدا ہوئی کہ وہ اس پرانے نظام کی جگہ جس میں ملکوں کے ایک گروپ کے بنیادی وسائل امیر تر ملکوں کی ترقی اور آسائشوں کے لئے کنٹرول میں رکھے جاتے ہیں انہیں کوڑیوں کے مول خرید لیا جاتا ہے اور بڑی بے دردی سے خرچ کیا جاتا تھا۔ ایک نیا نظام آگے گامیں میں یہ وسائل اپنے جائز مالکوں کے فائدے کے لئے کام میں لائے جائیں گے۔ لیکن یہ ایک مسئلہ حقیقت ہے کہ یہ تمام اُمیدیں خاک میں مل گئی ہیں۔ لیکن صرف ایک شے یعنی تیل کی قیمت سے متعلق جو تبدیلی ہوئی اس نے خود یہ ثابت کر دیا کہ مقصد کے اتحاد سے اور تیل پیدا کرنے والے ملکوں کی منظم سیاسی و اقتصادی قوتِ ارادی سے کیا نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ جب قومیں تاریخ کے موڑوں پر اپنے مشترکہ فائدے کے لئے متحد ہو جائیں تو دیرینہ ادارے ٹوٹ کر گر جاتے ہیں اور روایتی اقتصادی طریقے دم توڑ دیتے ہیں۔

ان تمام باتوں کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ جب قومیں پارہ پارہ ہو جاتی ہیں۔ جب وہ مقصد کا اتحاد پیدا نہیں کر سکتیں تو وہ نہ صرف موجودہ بے انصافیوں کا برابر شکار رہتی ہیں بلکہ عالمی اقتصادی قوتوں کے عمل سے ان میں مزید اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ تیسری دنیا کے نوآبادی ملکوں کے لئے بین الاقوامی اقتصادی ماحول تو اس وقت بھی ساہمراہ نہ تھا۔ جب انہیں خود مختار ملکوں کی حیثیت حاصل ہوئی لیکن ان کی سیاسی آزادی کے عشروں کے دوران ان کے اور مالدار ملکوں کے درمیان اقتصادی ناہمواری حد سے زیادہ

ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۶ء

نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس بات کی فوری ضرورت ہے کہ غریب تر ممالک کو سانحہ کی صورت میں بیمہ ہتیا کیا جائے۔ کم مراعات والے ممالک کے مستقبل کو بڑھتی ہوئی عدم مساوات پر انحصار کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کوئی ایک راہ نکالنا لازمی ہے تاکہ تیسری دنیا کے لئے تجارت کی شرائط بہتر ہوں، مالدار ملکوں میں کوٹے کی نالائقیوں اور تجارتی پابندیوں کو دور کی جائیں اور بیرونی قرضہ کا منطوق کرنے والا بوجھ کم کیا جائے جو غریب اور امیر ملکوں کے درمیان زیادہ تفریق مساوی تجارت اور تبادلے کا نتیجہ ہے۔

۳

ہم تیسری دنیا کے ممالک کو صدیوں کے عرصے کو فتنوں میں مبتلا ہے۔ ہمارے سامنے اُن ملکوں جیسے پُر سکون حالات موجود نہیں جنہوں نے بہت عرصہ پہلے انتہائی سازگار اور پُر امن فضا میں اپنی میشتوں کو تعمیر کیا۔ ان ملکوں کے ہاں کوئی ایسے ادارے بھی نہیں تھے جنہیں گزرا فروزی ہوتا بلکہ یہ ایسے ادارے تھے جو بتدریج اصلاح اور سماجی تبدیلی کی مسلسل کارکردگی سے مطمئن ہو گئے۔ ہم ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس میں مواقع پیدا ہوں جس میں اپنے عوام کی غیر مراعات یافتہ اکثریت باعزت، باوقار اور پُر امید زندگی بسر کر سکے۔ ہم اپنے عوام کو بہتر معیار زندگی فراہم کرنے کے لئے خندہ پیشانی سے خون پسینہ لیک کر رہے ہیں۔ ہم فوری آرام و آسائش سے محرومی کو قبول کرتے ہیں لیکن اپنی قربانی کی قدر و قیمت کو ان اداروں اور رسومات کی ہیمنٹ نہیں چڑھا سکتے جو اپنے وجود کے اعتبار سے ہی ہمارے خلاف برسرِ کار ہیں۔ ہمارے عوام کی محنت کی قدر و قیمت اس ناہمواری کے باعث مسلسل کم ہو رہی ہے جو ہمارے اور امیر ملکوں کے اقتصادی تعلقات میں پائی جاتی ہے۔ ہم بمشکل وقت گزار رہے ہیں۔ اگرچہ ہمارے لئے اپنے معاشرے میں انقلابی تبدیلیاں لانا ناگزیر ہے۔ لیکن ان کے لانے کے لئے حکمت عملی کی گنجائش بہت کم ہے۔ ۱۹۷۰ء سے شروع ہونے والے عشرے کے وسطی برسوں میں ترقی یافتہ ممالک میں جو بحران پیدا ہوا

کر لیتے ہیں اور مصنوعات فروخت کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو ان کی مصنوعات کو امتیازی کوٹے کے ذریعہ ایسروں کی منڈیوں سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ یہ سارے عوامل متعدد نتائج برآمد کرتے ہیں۔ ابتدائی اشیاء کی قیمتوں کے بارے میں غیر لچکی کیفیت غریب تر ملکوں کی اقتصادی منصوبہ بندی کو جوڑنے کا کیل بنادیتی ہے۔ مصنوعات سے متعلق ان کی یہ پوزیشن، ان کے خود کفالت حاصل کرنے کے مقصد کو ناکام بنا دیتی ہے۔ امیر تر ملکوں سے انہیں درآمدات کے لئے زیادہ سے زیادہ رقم ادا کرنے کی ضرورت ان میں سے بہتوں کو قرض کے دلدل میں مزید پھنسا دیتی ہے۔ یہ ایسی صورت حال ہے جو ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان اشیاء، مصنوعات، ٹیکنالوجی اور مالیات کے اقتصادی تبادلے میں بے رحمی سے اپنے آپ کو دہراتی ہے اس کا مجموعی نتیجہ ترقی پذیر ممالک کا تقریباً مکمل انحصار ہے۔

ان ساری باتوں کے پیش نظر، یہ نظریہ روز افزوں طریقے پر پھیلا یا جا رہا ہے۔ کہ غریبوں کی ترقی کا دارومدار امیروں کی مسلسل تیز ترقی پر ہونا چاہیے۔ کیونکہ صرف اسی صورت میں غریبوں کے مال کی نمایاں بھی بڑھ سکتی ہیں اور ان کی اشیاء کی قیمتیں بھی برقرار رہ سکتی ہیں۔ یہ ایک تباہ کن نظریہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غریبوں اور امیروں کے درمیان خلا کو برابر بڑھتے رہنا چاہیے۔ گویا امیروں کو اس کڑے زمین کی دولت کا زبردست حصہ اپنے تصرف میں لاتے رہنا چاہیے۔

دوسرے لفظوں میں اگر امیر ممالک بعض مل کی ضرورت سے زیادہ بہتات کی وجہ سے اپنی ترقی کی رفتار میں قدرے کمی کر دیں تو غریب ممالک کے لئے کوئی امید نہیں۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ ہم اس نظریہ کی مذمت کرنے میں حق بجانب ہی ہوں۔ یہ موجودہ بین الاقوامی اقتصادی نظام کی مخصوص داخلی خصوصیت کو بیان کرتا ہے۔ یہ اس ناقابل انکار حقیقت کی عکاسی بھی کرتا ہے کہ ہماری تجارت کی شرائط ہماری منڈیاں اور ہمارے وسائل کے بہاؤ کا بہت زیادہ دھماکہ امیر تر ملکوں میں اختیار کی جانے والی اقتصادی اور سیاسی پالیسیوں پر ہے۔ اس نظام کے بنیادی سہاروں کو مدتوں رات میں تو تبدیل

برائے نام ہے۔

موجودہ بین الاقوامی اداروں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اس عدم توازن کو درست کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بالکل غیر حقیقت پسندانہ بات ہے۔

وہ لوگ جو ان اداروں میں غیر ملکی امداد اور مالی امور سے تعلق رکھتے ہیں وہ اس رجعت پسندانہ رویہ کا شکار ہو گئے ہیں جو امیر اور طاقتور ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ ان میں چوٹی کے جو مالک ہیں ان کی مجموعی قومی پیداوار میں بیرونی امداد کا تناسب مسلسل کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ بین الاقوامی ادارہ ترقی اور اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام جیسی تنظیمیں رقوم کی قلت کا شکار ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں کی برآمدات کے کوڑ پر پابندیاں ختم کرنے کے لئے وہ مذاکرات بھی ناکام ہو گئے ہیں جو سالہا سال سے منعقد ہو رہے تھے۔ ترقی پذیر ملکوں کے خام مال کی برآمدات کی قیمتوں کو مستحکم اور بہتر بنانے کے سوال پر بعض الفاظ کی جنگ ہو رہی ہے۔ چنانچہ قرار دادوں کی شکل میں علاج کے بجائے غصے سُن کرنے کی دوائیں دی جا رہی ہیں۔ جیسا کہ پیش گوئی کی گئی تھی، پیرس کانفرنس بھی افسوس ناک تھکاوٹ کا شکار ہے۔ جس سطح پر یہ ادارے کام کر رہے ہیں۔ ان کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ موجودہ چیلنج کا جواب دے سکیں۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں گفتگو مٹوس مذاکرات کا مقام حاصل نہیں کر سکتی۔

۵

ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ تیسری دنیا کے مالک کے درمیان بین الاقوامی اقتصادی نظام سے متعلق تمام مومنوعات پر کوئی مشترکہ مفاد نہیں پایا جاتا۔ ان ملکوں میں بھی آپس کا اختلاف بیان کیا جاتا ہے۔ ایک طرف وہ ملک ہیں جن کا تعلق صرف اور صرف اشتہار سے ہے اور دوسری طرف وہ ملک ہیں جو نیم صنعتی مالک کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرضوں میں کسی رعایت کا معاملہ ان ملکوں کے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ جنہیں سرمائے کی منڈی تک براہ راست رسائی حاصل ہے

تھا اس کا بدترین اثر ہم پر پڑا اور ہماری ترقی کی رفتار برسوں پیچھے چلی گئی۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کئی ممالک میں فی کس آمدنی کم ہو گئی ہے۔ اگرچہ ان ملکوں میں سے بعض ملک پاکستان کی طرح اپنی ترقیاتی کوششوں کو برقرار رکھنے بلکہ انہیں تیز تر کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ تاہم اس کے نتیجے میں ان پر قرضوں کا بوجھ بہت بڑھ گیا۔ چنانچہ ہمیں ایسی ترقی حاصل کرنی ہے۔ جس سے پیداواری عمل خود بخود جاری رہے۔ لہذا ہم سب کو چاہیے کہ خارجی اقتصادی ماحول کا جائزہ لیں اور ہماری اجتماعی کمزوری سے خارجی اقتصادی ماحول کا جو تعلق ہے اس کا بھی جائزہ لیں تاکہ عالمی معیشت ہمارے لئے سمندری قہیڑوں کا کردار ادا نہ کرے کہ قہر اسے سفر طے کرنے کے بعد یہ قہیڑے ہمیں دھکیل کر وہیں واپس چھوڑ دیں۔ جہاں سے ہم نے اپنی منزل کی جانب سفر کا آغاز کیا تھا۔

۴

اگرچہ بے شمار بین الاقوامی اجتماعات میں ان بنیادی حقیقتوں کا اظہار کیا گیا ہے لیکن سقم ظریفی یہ ہے کہ ان کے جواب میں باہمی انحصار کا احساس جسے قدرتی طور پر پیدا ہونا چاہیئے تھا نہ صرف یہ کہ وہ نہیں ہوا بلکہ اس کا اُلٹا رد عمل ہوا۔ اس بات کا اندازہ امیر ملکوں کے بڑھتے ہوئے احساس خود پسندی سے لگایا جاسکتا ہے لہذا قوموں کی عزیت کو ان مورد وثقی نقائص کا نتیجہ بتایا جاتا ہے جو ان قوموں میں پائے جاتے ہیں اور اب تو ہمیں بار بار یہ دلیل می سننی پڑتی ہے کہ کم ترقی یافتہ ممالک اپنی ذلوں حالی کے خود ہی ذمہ دار ہیں۔ امیر ممالک اپنے گروپوں اور انجمنوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنا رہے ہیں اور اب وہ تمام تر قوتہ اپنے مفادات کو مستحکم کرنے پر مرکوز کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ ممالک بین الاقوامی مالی اصلاحات اور تجارت و وسائل کی منتقلی کے سلسلہ میں زیادہ تر آپس میں ہی معاملات طے کر لیتے ہیں اور اس ضمن میں ترقی پذیر ملکوں کا اثر محض

اس سیاسی عزم کا اظہار ہماری اجتماعی قیادت کی اعلیٰ ترین سطح کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ تیسری دنیا کے پاس ۷۷ ملکوں کے گروپ کا پلیٹ فارم موجود ہے جس سے وہ اپنی مشترکہ کوششوں میں رابطہ پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ گروپ تجارت و ترقی کے ادارہ کے سیاق و سباق میں قائم کیا گیا تھا لہذا بعض اوقات گروپ کے مستقبل کے امکانات خود اس کے ابتدائی محرکات کے سبب محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ گروپ کی سخت اور تشکیل کچھ اس قدر بوجھل اور بے ڈھب سی ہے کہ گروپ ان محلات کا کوئی موزوں حل پیش نہیں کر سکتا جو تبدیلی لانے کے لئے ناگزیر ہو۔ ایک ایسی فطیم جس کا دائرہ محدود ہو اور جو ترقی پذیر ملکوں کی سیاسی اُنگٹ اور اقتدار اعلیٰ کی ترغیبی نہیں کر سکتی، اس فطیم کو ان ملکوں کی حکمت عملی کی رہنمائی کا اہم کام نہیں سونپا جاسکتا۔

تیسری دنیا میں اپنی خوابیدہ اور دبی ہوئی قوت کے بارے میں احساس روز بروز بڑھتا جا رہا ہے یہ شعور اور آگاہی اتنی واضح ہے کہ ہمارے دور کا انتہائی اہم مسئلہ نسل انسانی کی اکثریت کے لئے مواقع پیدا کرنا ہے۔ اس مسئلہ پر نام نہاد جانب دار اور نام نہاد خیر جانبدار ملکوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف ترقی یافتہ اور کم ترقی یافتہ ممالک کے درمیان ہے۔ اس فرق کی نشاندہی کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عالمی سطح پر طبقاتی جنگ کو کوئی دعوت دی جائے اس مطلب کا مقصد اقتصادی قوت کو از سر نو تقسیم کرنا ہے۔ کیونکہ صرف اسی طریقے پر ہی کشیدگی کا لائق ہی سلسلہ اور نئے دن کے انقلابات کو روکا جاسکتا ہے۔ اس دعوت کا مقصد عالمی بلواری کی بقا کی وکالت کرنا ہے۔

ہم اس خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہیں کہ نیا اور منفصلہ اقتصادی نظام کسی ایک اجلاس یا کانفرنس کے نتیجہ میں وجود میں آسکتا ہے۔ تیسری دنیا کو اقتصادی آزادی کے لئے وادی پر خار سے گزرنا پڑے گا۔ لیکن اس راہ کو آسان بنایا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ تیسری دنیا کی قیادت جس کی پشت پر انسانی راستے نامہ کی بے پناہ قوت موجود ہو، متحد، منظم اور باعزم ہو۔

اور وہ صرف "قرضوں کے حصول کے لئے اپنی ساکھ" برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے تمام ترقی پذیر ملکوں کا مشترکہ مفاد ایک ہے۔ یعنی یہ کہ انہیں عالمی اقتصادی نظام میں برابری کا مقام ملنا چاہیئے۔ اس نکتہ پر ان کے درمیان جو اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ وہ تمام فرومی اختلافات سے بالاتر ہے۔ ایک ایک مسئلہ پر مکمل یکجہت کا ہونا اتحاد کے لئے کوئی ایسا ضروری نہیں اختلاف کا مطلب مخالفت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یورپی مشترکہ منڈی کا اقتصادی اتحاد دیکھئے۔ جس کی پشت پر کئی اداروں کا ایک جال بچھا ہے اور جو مشترکہ سیاسی مقاصد کو فروغ دے رہے ہیں۔ یہ اتحاد جبر ملکوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات سے کہیں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اتحاد کو باہمی رواداری سے پروان چڑھایا جاتا ہے۔ یہ اس احساس سے پیدا ہوتا ہے کہ عدم اتحاد کی صورت میں ہر ایک کے مفاد کو لازمی طور پر نقصان پہنچے گا۔

ہم تیسری دنیا کے مالک بھی اپنے مشترکہ مصائب پر متحد اور استحصال کے خلاف مشترکہ جدوجہد کی ضرورت پر متفق ہیں۔ اپنے اندرونی سیاسی نظاموں یا خارجی نقطہ ہائے نظر سے قطع نظر ہمارے پاس ایک مشترکہ اختیار ہے وہ یہ کہ ہم دنیا کی اکثریت کو اس اقتصادی نظام سے نجات دلائیں جس نے ان لوگوں کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ ہمیں خود اپنی شخصیت کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ لہذا اس شخصیت کو اس زہنی پر اگندگی کا شکار نہ ہونے دیا جائے۔ جو طویل المیاد مقاصد کو طویل المیاد مفادات سے ہم آہنگ کرنے میں ناکامی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ اگر ہم اپنی اقتصادی اور سماجی ترقی کے لئے باہمی تعاون کی حدود اور دائرہ کار کا جائزہ نہیں لے سکتے تو اس کے نتیجے میں ہماری شخصیت پر کوئی حرف نہیں آنا چاہیئے اس شخصیت کو اس سیاسی عزم کے فقدان کے باعث کمزور نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم ایک ایسے نظام کو تبدیل کرتے کے لئے مشترکہ قوت کو بھرپور طور پر بروئے کار نہیں لاسکتے جس کا بنیادی ڈھانچہ ترقی پذیر ملکوں کے خلاف تعصیب دہنی ہے۔

میں ایک اہم قدم ہوگی۔

یہ ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی قوموں کی سیاسی آزادی کے حصول کے بعد اگلے مرحلے میں داخل ہونے کی راہ دکھائے گی۔ یہ مرحلہ وہ ہوگا جب دنیا کی قوموں کے لئے مساوی مواقع فراہم کرنے کا ذریعہ بڑی بڑی غیر ملکی امدادی قوم کی صورت میں خیرات یا مخصوص تجارتی رعایتوں وغیرہ کے ذریعہ جزوی اصلاحات پر نہیں ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بظہر کے ہوئے جذبات اور تباہ کن محاذ آرائی کا خطرہ نہ صرف ٹل جائے گا۔ بلکہ عالمی سطح پر شراکت کا امکان پیدا ہوگا۔ آخری تجربہ میں ترقی پذیر ملکوں میں ہونے والی اقتصادی سرگرمیوں میں تیزی، ترقی یافتہ ملکوں کی فلاح و بہبود کے لئے بھی لازمی ہے۔ غریب ملکوں کی سربراہی کا فرانس ان کے اس عزم کا مظاہرہ کرے گی کہ وہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ معیشتوں میں اس مقصد کے حصول تک صرف ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے نہیں رہیں گے۔

صورت حال کا جائزہ لے کر مستقبل کے لئے ایک حکمت عملی اختیار کر کے اور موزوں اداراتی انتظامات کے ذریعہ تیسری دنیا کی سربراہ کا فرانس ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں تیسری دنیا کے ممالک کی کامیابیوں کو مربوط اور ان کی پوزیشن کو بحال کر سکتی ہے اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان تعاون کا کم سے کم منفعت پر دو گرام مرتب کر کے اس چیلنج کو کرا سکتی ہے۔ اس طرح یہ علاقائی یا بین علاقائی ترقی پذیر ملکوں کے مختلف گروپوں میں شروع کی ہوئی کوششوں کو مربوط اور ہم آہنگ کرے گی اور تیسری دنیا اس قابل ہو سکے گی کہ مضبوط تر ہو اور عالمی اقتصادی برادری میں اپنا جائز مقام حاصل کرے۔

تیسری دنیا کے پیغام کو گزرتے ہوئے دور کی نفاذی کا جامہ نہیں پہنانا چاہیئے اور نہ اسے کسی ملک یا ممالک کے گروپ کے سیاسی مفادات کے مطابق تراشنا چاہیئے۔ اگر ممتول اور مقتدر ممالک اپنی دولت اور ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر اپنا غلبہ برقرار رکھنے کے لئے متحد ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ نازک لمحات میں وہ ہمیشہ کرتے رہے ہیں تو

اس مقصد کے لئے میں نے ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ترقی پذیر ملکوں کی سربراہ کا فرانس بلانے کی اپیل جاری کی ہے۔ تاکہ تیسری دنیا کی قوموں کی پوری قوت کو یکجا کر کے انہیں بین الاقوامی اقتصادی متصل سے نجات اور ظلم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے مشترکہ جدوجہد کو آگے بڑھایا جائے۔

اس اپیل کا براہ راست تعلق تیسری دنیا کے اتحاد کے تقاضے کو بڑھتے ہوئے احساس و اعتراف سے ہے۔ گزشتہ ماہ کولمبوس میں منعقد ہونے والے ملکوں کی سربراہ کا فرانس منعقد ہوئی جس میں ہمارے دور کے اس اہم مسئلہ پر توجہ دی گئی۔ آئندہ ہفتے میکسیکو میں ترقی پذیر ملکوں کے نمائندوں کا مذاقہ سطح پر اجلاس منعقد ہو رہا ہے۔ جس میں ان ملکوں کے درمیان اقتصادی تعاون کو فروغ دینے کے ذرائع اور وسائل پر غور کیا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میکسیکو کا فرانس بھی اس منزل کا دوسرا سنگ میل ثابت ہوگی۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس بھی اس ماہ کے آخر تک منعقد ہو رہا ہے۔ لہذا پاکستان کے لئے مناسب وقت آگیا ہے کہ وہ تیسری دنیا کی اس سربراہ کا فرانس کے انعقاد کے لئے اپنی اپیل کے پس منظر میں کارفرما بنیادی ملحوظات کی وضاحت کرے جو بنی نوع انسان کی غیر مراعات یافتہ اکثریت کے اتحاد کو یقیناً مستحکم بنائے گی۔

پاکستان اس کا فرانس کے انعقاد اور اس کی کارروائیوں کو شرم آور بنانے کے لئے تمام ترقی پذیر ملکوں کے تعاون کا طلب گار ہے۔ ۲۰ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر رہا ہے کہ نوآباد ممالک کا اجلاس بینڈونگ (انڈونیشیا) میں ہوا اور وہاں وہ سیاسی اصول اور مقاصد مرتب کئے گئے جو بین الاقوامی معاملات میں ان کی رہنمائی کریں گے۔ عالمی سیاسی صورت حال کے خراب ہونے سے متعلق جو خدشات پائے جاتے تھے انہیں بینڈونگ کا فرانس نے غلط ثابت کر دیا۔ بلاشبہ اس کے اعلانات پر امن بین الاقوامی تعلقات کا ایک بنیادی متن فراہم کرتے ہیں۔ اسی طرح تیسری دنیا کی سربراہی کا فرانس ارتقائی عمل

غزل

_____ خورشید انصاری

جیسے بگڑے ہوئے کچھ نقش ہوں تحریر نہ ہو
ایسا الجھ ہوا کوئی خط تقدیر نہ ہو
اشکارا کبھی حالِ دل دلیکیر نہ ہو
یہ وہ اجمال ہے جس کی کوئی تفسیر نہ ہو
ساری دنیا کو جو سرِ رشتہ آزادی ہے
وہ مرے پاؤں کی اتری ہوئی زنجیر نہ ہو
اپنی امیدوں کا انجام طلب کرتے ہیں
خواب کیوں دیکھیں اگر حسرت تعبیر نہ ہو
شوق ایسا کہ جو دل میں ہے وہ سب کچھ لکھوں
دل کا وہ حال کہ چپا ہوں بھی تو تحریر نہ ہو
اُن کی محفل میں بھی وہاں و تابلِ تعزیر نہ ہو
اتفاقِ مری تقدیر جو تم بن جاؤ
پھر زمانے میں مجھے شکوہ تقدیر نہ ہو
میری دیوانگی شوق کو رسوا نہ کرو
کم سے کم جسمِ محبت کی تو تشہیر نہ ہو
روح کا حسن نمایاں نہیں ہوتا ہرگز
یہ وہ جلوہ ہے جو منت کش تصویر نہ ہو
چاہتا ہوں کہ زمانے میں محبت کے سوا
کوئی خفیہ نہ ہو تلوار نہ ہو تیر نہ ہو
دن ڈھلا جاتا ہے خورشید نکلے گھر سے
میکدے جانے میں بے وجہ کی تاخیر نہ ہو

اگر غریب قومیں اپنی ہی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور غریب
اور غریب کے درمیان خلیج پیدا کرنے میں اپنی نسبتاً محدود طاقت کو ضائع
کرتی رہیں تو یہ انسانیت کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ تیسری دنیا کے افلاس
عوام اپنی اجتماعی مرضی کے لئے ایک نئے عور کی تمنا کر رہے ہیں۔ وہ غیر لائی
سلوک کے خلاف انسان کی آخری فتح کے لئے جہاد کرنے کی غرض سے طاقت
کے ایک نئے قلعہ کی تلاش کر رہے ہیں۔ یہ وقت کی ضرورت اور
غریبوں کی ترجیح ہے۔ جو کافر نس میرے تصور میں ہے اس میں شرکت
کے لئے ایک اور صرف ایک فولادی کسوٹی ہوگی یعنی تیسری دنیا کی غیر
ترقی یافتہ اور مظلوم برادری، ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی قومیں
خواہ وہ جانب دار یا غیر جانب دار ہوں۔ اشتراکی یا غیر اشتراکی ہوں
سفید، زرد یا سیاہ یا بھورے رنگ والی ہوں وہ اس مشن میں شریک
ہوں گی اور بنی نوع انسان کے لئے ایک قانون کے تحت ایک دنیا
کے مقصد کے حصول کی لقیب بن جائیں گی۔



برقاب

شیر افضل جعفری

شیر افضل جعفری صاحب نے حالیہ سیلاب سے متاثر ہو کر ذیل کے اشعار اپنے مخصوص رنگ میں کہے ہیں۔

پنٹھال میں ہی سیر مائی جل رہی ہے	قضا موجوں کے پنکھے جھل رہی ہے
اگن چپکی میں راوی کی روان	نشیلے جھونپڑوں کو دل رہی ہے
اُبلتے سندھ کی گہرائیوں میں	سنا ہے گرم دلدل پل رہی ہے
چڑھا کچھ اس طرح جہلم کا سوج	زراعت کی جوانی ڈھل رہی ہے
جھلس کر وہ گیا سرسبز بیلا	ترائی بے طرح جل تھل رہی ہے
کڑا ہی لے کے مٹیالے بھنور کی	اجل پانی میں انساں تل رہی ہے
دھواں اُٹھنے لگا آب و ہوا سے	گھٹا تیزاب پی کے جھل رہی ہے
تعجب ہے کہ پروا کے برن میں	خنک دھپک کی آندھی چل رہی ہے
ادھر سلگا کیا "شیراب" دُلھا	کنارے پہ دلہن بے کھل رہی ہے

ترموں سے گزرنے کو ہے "برقاب"

مرے سر سے قیامت ٹل رہی ہے

جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں

(انتظار حسین کے افسانوی ادب کا ایک جائزہ)

مراج منیر

ہاں کہانی نے جنم ہی رات کو لیا۔ انجمنہاری کی گھریا سے لے کر الف لیلہ کے دیبے تک اور اس کے بعد بھی انتظار حسین کے لئے رات ایک پورا طریقہ حیات ہے جس کی بنا خارج کی دہشت کے عالم میں تخیل کی بنیاد پر زندہ رہنے کی کوشش پر ہے۔ سوہر وہ جگہ جہاں خارج کا خوف مسلط ہے، بے تحاشی کے گہرا احساس ہے اور ہوش کے عالم میں نامعلوم کی دہشت اعصاب میں تباہی پیدا کرتی ہے۔ رات ہے۔ رات جس کے اپنے بھید ہیں، جس کی دہشت میں ایک جمال ہے تخیل کو زندہ کرنے والی صورتحال ہے جہاں محض تخیل کے زور پر ہی آدمی ایک پراسرار کائنات میں کہیں سے بھی نکل کر آنے والی چیزوں کے خوف میں اپنے اعصاب کے توازن کو قائم اور اپنی حیات کو زندہ رکھ سکتا ہے۔ اگرچہ لارنس نے اصول تو یہ مرتب کیا ہے کہ کہانی کا اعتبار کردہ کہانی کہنے والے کی ذہن، لیکن اگر خود اپنے موضوعات کے بارے میں انتظار حسین کی رائے دیکھ لی جائے تو کیا ہر جگہ

”لاریب دقت سب کچھ بکیر دے گا۔“ تاریخ۔ شیفین نے کہا ایک ڈاؤنٹا خواب ہے۔ میں جاگ اٹھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک تیز گونجوا سیٹی۔ گول! ”جیمز جوائس“

”نانی جان اللہ کو پیاری ہوئیں تو ہمارے گھر سے کہانیوں کا دفتر مٹ گیا۔ میں سمجھا کہ دن نکل آیا۔“

انتظار حسین نے جب کہانی کہنی شروع کی تو دن نکل آیا خدا شعور کے ایک منظر سے دوسرے تک کا، زندگی کو دیکھنے کے ایک دوپٹے سے دوسرے روپے تک کا، اودام و تصورات، بھیدا اور اسرار سے سائنسی حقیقت پرستی اور عقلیت پسندی کا سفر مکمل ہو چکا تھا۔ ان دو منظر کے درمیان زندگی کو دیکھنے کے دو متخالف زاویہ ہائے نظر کے درمیان پس و پیش کی ایک ہراساں کر دینے والی کیفیت کے بیچ اردو افسانے نے جنم لیا کہ اگر ڈراما تصنیف کے درمیان سناٹے پیدا ہوتا ہے تو کہانی پس و پیش، پریشانی اور گہراہٹ بعض اوقات دہشت کے اس لمحے میں بنی جاتی ہے، جب حقیقت اشیاء بے نام، بے پہچان ہو رہی ہوں کہ خواب اور بیداری کا لمحہ یہی ہے اور میں سے دراصل فرد کے لئے زندگی اور موت کے درمیان کش مکش کی ایک علامت پیدا ہوتی ہے اور اسی لئے ہمارے ہاں زندہ کو موت کی بہن کہتے ہیں۔

رات انتظار حسین کے ہاں ایک بہت اہم موٹیو ہے اور ان کے

(۱) جیمز جوائس۔ بولیس۔ ۱۹ انجمنہاری کی گھریا

”پیلے سے واپسی میں راہ سے بھٹک جانے والا بچہ، وہ اکیلا کبوتر جو اپنی چڑیا سے بہت دور کسی اونچے کوٹھے پر بیٹھا رہ جائے اور اسے رات اُسے، اندھیرے بھتے ہوئے آسمان پر وہ ڈنگ لگتی ہوئی اکیلی چٹنگ جسے کھینچتے ہوئے ہر بار چٹنگ بازو محسوس کرے کہ اب درخت میں اُلجھ

ہوتا ہے۔ یعنی جذبے کی بڑی مقدار اس پر مرکوز کرتا ہے اور آسما لیکہ وہ اسے حقیقت سے واضح طور پر الگ رکھتا ہے۔

فرائیڈ کی نظر مجھ سے نہیں سنسلیتی لیکن لاشتم پشتم میں نے اس کا ترجمہ کر مارا ہے۔ نیز تو خواب کی یہ تخلیقی دنیا ایک طرح کی جذباتی INVESTMENT کا تقاضا کرتی ہے اور اسی مضمون میں فرائیڈ نے اگے چل کر اس جذباتی ارتکا کا منبع ”خواہش“ کو بتایا ہے۔ کہانی کے سلسلے میں اور ٹیگلیسٹ تو اس قدر آگے چلے گئے ہیں کہ ان کا کہنا ہے کہ کہانی کی دنیا خواب کی ہی دنیا ہوتی ہے، جہاں حقیقت سے اس کا مس جو وہاں یہ گم ہو جاتی ہے۔ لیکن انتظار حسین کے سلسلے میں کہانی کی دنیا کا اس طرح تعین کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی ممکن یہاں تو خواب غنودگی اور سیداری کے لمحے کی ایک واردات ہے جس میں خواب حقیقت میں اس طرح ڈھلتا ہے کہ بشارت بن کر کوئی پھول یا کوئی اور شے چھوڑ جاتا ہے، یا پھر موجودہ حقیقت خواب کا روپ اس طرح دھارتی ہے کہ ”چاند گہن“ کی ابتدا میں بوجی کے تجربے کی شکل بن جاتی ہے یا پھر

”دن چھپ چلا تھا اور اندھیرے میں گم ہوتے ہوئے ہرے پتوں پر سفید سفید دھواں سا منڈلا رہا تھا۔ بھدانیلا آسمان، چپ چاپ اپنے پیڑ، سوتے ہوئے کعبیت، سب کے سب گھلے سارے تھے، سفید دھواں سا بننے جا رہے تھے۔ اور وہ سفید سفید دھواں خود شام کی گہری ہوتی ہوتی کالوس میں گھل رہا تھا، گم ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہ اچٹ کر سامنے والے پیپل پر جا پڑی۔“

بہر حال تو انتظار حسین کے ہاں خواب ذات کے ظہور کا لمحہ ہے اور انسان کے باطن کے اور اس کے باہر موجود کائنات کے

مرئی کا وہ بچہ جو شام پڑے آنگن میں کیلا رہ جائے اور مارے آنگن کا بدحواسی میں چکر لگاتے گرد رہے میں داخل نہ ہو سکے۔ یہ تصویریں مجھے رہ رہ کر ستاتی ہیں۔۔۔۔۔

بنیادی طور پر یہ چار تصویریں ہیں اور دو تین چیزیں ان میں شریک ہیں۔

(۱) منزل پر پہنچنے کا احساس۔

(۲) اکیلے رہ جانے کے عالم میں ایک خوف اور بدحواسی۔

(۳) شام کی آمد۔

(۴) ایک ہمہ گیر بے تحفظی۔

اور ان چار تصویروں میں آدمی موت ایک ہے۔ گم ہونے والا بچہ دیگر دو تصویریں جانوروں کی ہیں، ایک چٹنگ کی۔ خیر اس سے مقصود ایک مختصر سے بیان کے ذریعے انتظار حسین کے کینوس کا ایک غیر معتبر اور نامکمل سہمی، ایسا تعین کرنا ہے جس میں ذرات کے بنیادی حوالے طے ہو سکیں ذکر شکار گوسکول کے نقادوں کی طرح ایک شیشی شمار یہ فراہم کرنا۔

بہر حال تو ذکر رات اور اس کے اسرار کا تقاضا اور جو چیز ان خطا کے اپنے بیان کے مطابق اسے ستاتی ہے وہ تصویریں ہیں جن سب کا پس منظر شام کی آمد ہے اور شام کی یہ آمد منزل بلکہ زیادہ صبح طور پر گھر پہنچنے کے احساس سے مشروط ہے۔ اور رات کی آمد کے ساتھ ہی گھر تک پہنچنے کا یہ احساس ایک خواب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک تکلیف دہ نیم غنودگی کے عالم میں دیکھا ہلنے والا خواب، یا بشارت کی حیثیت میں نظر آنے والا ہر دو حیثیتوں میں خواب باطن کا ظہور ہے اور جاگتے آنکھوں اگر یہی خواب دیکھا ہلنے تو کہانی ہے۔

”تخلیقی فن کار وہی کچھ کرتا ہے جو بچہ کھیلتے ہوئے کرتا ہے۔ وہ فینٹسی کی ایک دنیا تخلیق کرتا ہے اور اس کے بارے میں بڑا سنجیدہ

بلکہ پچ پو پچھے تو خواب خود بھی شعور کے ایک علاقے سے دوسرے کی طرف ہجرت کا نام ہے۔ اور اس عمل کی معنویت اس میں ہے کہ یہ محض فرد کا پردیس کو سفر نہیں ہے کہ سفر کی یہ کہانیاں اُردو میں بھری پڑی ہیں مگر انتظار حسین کو کچھ زیادہ INSPIRE نہیں کرتیں بلکہ ہجرت تو ایک زمین سے دوسری کی طرف سفر نہیں بلکہ رشتوں کے جو انسانوں کے درمیان ہوں ان علاقوں کے جو ان سے ظاہر ہوں اور ان ترجیحات اور معنویتوں کے پورے نظام سے جو اس سر زمین پر ایک تاریخ نے قائم کی ہوں، سفر ہے۔ گویا اس طرح یہ تجربہ ایک REBIRTH کا تجربہ ہے۔ لیکن انتظار حسین کے سلسلے میں ایک بات ہمیں بہر حال ذہن میں رکھنی پڑے گی کہ ان کے ہاں ہجرت محض اکیلا واقعہ نہیں بلکہ اس کی حیثیت ایک ایسے تجربے کی ہے جو زاویہ نگاہ فراہم کرتا ہے واقعات کے ایک ایسے سلسلے کو دیکھنے کا جو واقعہ کر بلا سے کن ستاد تک اور کن ستاد سے سن اکہتر تک قائم ہے اور ہر واقعہ فی الاصل ایک پوری قوم کے سفر کے معنی یا اس کی بے معنویت کا تعین کرتا ہے اور کچھ یہی حوالہ ایک سطح پر انسانوں کے لئے بھی ہے۔

”کتنا اچھا ہوتا کہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہوتے اور انسانی رشتے جوں کے توں رہتے اور مجھے افسانہ لکھنے کی مصیبت نہ اسٹانی پڑتی۔ مگر افسوس ہے کہ انسانی رشتے ہر آن بدلتے ہیں اور بگڑتے ہیں۔ لوگ مر جاتے ہیں یا سفر پر نکل جاتے ہیں، یا روٹھ جاتے ہیں۔ پھر میں انہیں یاد کرتا ہوں اور انہیں خوابوں میں دیکھتا ہوں اور افسانے لکھتا ہوں؟“

(۲)

ڈرامے کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ارتکاز ہے کسی

درمیان رابطے کا ایک ذریعہ، اور یہ ذریعہ دراصل گھر ڈھونڈنے، یا اپنی ذات کا تعین کرنے کی خواہش پر اپنی اساس رکھتا ہے۔ اس طرح انتظار حسین کی کہانیوں کی ایک رو میں خواب کا موثیت اہم ترین یوں ٹھہرتا ہے کہ یہ دراصل بطون ذات اور سٹارجی کائنات کے درمیان رابطے کو ایک بنیادی خواہش کے حوالے سے بیان کرتا ہے اور اسی کے ذریعے کہانیوں میں باطنی دنیا کا اسرار، تخیل کی بھرپور زندگی اور فرد کی حقیقت بار پاتی ہے اور یہیں سے انتظار حسین کے ہاں تقدیر کا تصور بھی ظہور کرتا ہے کہ ہم اسی طرح دوسروں کے خواب نہیں دیکھ سکتے جس طرح دوسروں کی تقدیر میں شریک نہیں ہو سکتے اور دوسروں کے خواب میں شریک ہونے کا پس ایک ذریعہ ہے۔ کہانی۔

”آخر تو میں جانوں سوتا ہی نہیں ہے۔ آدمی رات تک خواب بیان کرتا ہے، آدمی رات کے بعد خواب دیکھنے شروع کرتا ہے؟“

اور یہی صورت حال کہانی کہنے والے کی ہے۔ اسی کہانی میں دوسری جگہ آتا ہے۔

”سید نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھولیں، رُنی کی طرف دیکھتے ہوئے پراسرار لہجے میں بولا، میرا دل دھڑک رہا ہے، کوئی خواب دیکھے گا آج؟“

یہ نامعلوم کے سامنے کھڑے ہونے کی دہشت ہے اور اس کے پس منظر میں ہجرت کا حوالہ موجود ہے کہ یہ بھی معلوم کے ایک منظر سے ایک ایسے علاقے کی طرف سفر کا استعارہ ہے جہاں ہر شے بطون اسرار میں ہے۔

اک مسافت پاؤں شل کرتی ہوئی سی خواب میں
اک سفر گہرا مسلسل، دروئی بہت اب میں

کے گم ہونے سے شروع ہوتی ہے، با سوں، اشیائے ضرورت مکان کے نقشے کے حوالے سے تغیر پذیر رشتے سامنے آتے ہیں یا اس طرح کے بہت سارے افسانوں کے حوالے دیئے جاسکتے ہیں۔

انتظار حسین کے ہاں اشیاء اور مقامات، واقعات پر سب ایک بہت پیچیدہ نظام میں گنڈھے ہوئے ہیں اور ان کا مطالعہ وسیع تر حوالوں کا مقصد ہے۔

وقت کی بہت ساری تعریفوں میں سے ایک تعریف یہ بھی ہے کہ وقت واقعات کے درمیان فاصلے کو کہتے ہیں اور اسی طرح ایک بیان: ”وقت حرکت کی مقدار کا نام ہے۔“

ان دونوں صورتوں میں وقت جب تک ایک انسانی حوالے سے بلکہ زیادہ درست طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ انسانی رشتوں کے حوالے سے سامنے نہ آئے اس وقت تک مجرد محض ہے اور زمان کے بغیر زمین بھی ناقابل شناخت ہے۔

”شہر شاہ نے زمین کی ٹان میں خوب کھینچیں اور بے فرسنگ فاصلوں کو خوب جکڑا، مگر وقت کے دریا پر بندھ نہ باندھا، وقت بغیر کڑا، رخص مٹی کا ڈھیلا ہے۔“

اور انتظار حسین کے بیشتر کردار وقت کی اسی حرکت کے تابع بلکہ اس کے جبر میں ہیں جو وہ واقعہ در واقعہ ظاہر کرتا ہے۔ اس طرح وقت کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو وہ سبب وقت واقعے میں اپنا ظہور کرے۔ دوسرے وہ سبب اشیاء سے ظاہر ہو اور وقت کی پہلی حرکت دوسری کو مٹا کر دیتی ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں کہانیوں میں ہم وقت کے، یا تاریخ کے ادل الذکر تجربے تک موخر الذکر تبدیلی کی وسالت سے پہنچتے ہیں۔ یہ وقت کا بالمشق اور روحانی تجربہ ہے۔ مارتھ نے وقت

دور کے اعمال اور تضادات کا اور رزمیے کے بارے میں یہ خیال رہا ہے کہ اس میں کسی دور یا ادوار کی اشیاء مجتمع ہوتی ہیں۔ رزمیے کی کم از کم ایک خصوصیت تو انتظار حسین کے ہاں یہ دکھائی دیتی ہے کہ ان کی تحریروں میں جس قدر اشیاء کا ذکر ہے شاید اردو کے کسی ناول نگار کے ہاں بھی اتنی اشیاء دکھائی نہیں دیتیں اور پھر یہاں ایک اور بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ مثلاً داستانوں میں بھی اشیاء کی فہرست پر فہرست مرتب ہوتی چلی جاتی ہے۔ مگر وہاں ان کی حیثیت منظر نامے کی ترتیب میں ضمنی اور فروغی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ داستان اگرچہ ایک ماضی کا بیان ہے لیکن جس زمانے میں لے بیان کیا جا رہا تھا ابھی وہ ماضی مکمل طور پر ماضی نہ ہوا تھا لہذا انسانی بیان سے متعلق اور اشیاء اس بیان کا ایک حصہ ہوتے تھے۔ لیکن انتظار کے ہاں اکثر کہانیوں میں، فضا بندی، بلکہ کہانی کو آگے بڑھانے کے عمل میں اشیاء اور مقامات کا ایک بہت حرکتی رول ہے اور معمولی سے معمولی شے کا تذکرہ ایک پوری تہذیبی روایت کی علامت ہے بلکہ یوں کہیں تو درست ہوگا کہ انتظار حسین کے ہاں بین الافرا دی تعلقات کی جس بُنت سے معاشرے کا منظر نامہ مرتب ہوتا ہے اس میں یہ تعلقات اشیاء اور مقامات کے ذریعے ہی قائم ہوتے ہیں، مثلاً ”گلی کو چے“ میں قیوما کی دکان جب ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہے اور تحویل صورت کرتی ہے تو وہ پوری معنویت جو اسے حاصل تھی یوں گم ہو جاتی ہے کہ اس دکان کا ارد گرد کی دکانوں سے اور آنے والوں سے ایک خاص رابطہ استوار تھا جبکہ ہجرت کے بعد اس کی شکل کے تبدیل ہونے میں ان بین الافرا دی تعلقات کی نوعیت کے بدل جانے کی معنویت ہے۔ اسی طرح کنکری کے بہت سارے افسانے مثلاً ”دیولا“، ”پٹ پٹنا وغیرہ ایک رشتے کا سوال بنتے ہیں۔ بلکہ اس مجموعے میں ”محل والے“ کی کہانی فوج صاحب کی تصویر

در اصل دقت اور اس سے منسلک منظر نامے کی قوت کے اور ایک کی علامت ہے۔ اس سارے سائز سے معلوم ہوا کہ انتظار حسین کے ہاں اصل کہانی افراد کی نہیں بلکہ ایک لمحہ زمان میں ایک مخصوص لینڈ سکیپ کی ہے جس کے قائم رہنے اور مٹ جانے پر افراد کے رشتوں کے قیام اور ان کے تغیر اور نتیجہً افراد کی زندگی کی معنویت یا بے معنی پن کا دار و مدار ہے اور وہ لمحہ زمان جس میں کسی لینڈ سکیپ کو دریافت کیا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے لئے واقعہ در واقعہ پھیلتے جاتے ایک وسیع تر متن کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی لئے انتظار حسین کے ہاں دورانیہ الگ الگ لمحات کی جو ایک تجربے کی سطح پر ایک دوسرے سے منسلک ہیں، اکثر کا نام ہے اور اس کی ایک اہم مثال ”زردنا“ ہے جہاں چھوٹی چھوٹی حکایتوں سے جو دقت کے بزیروں کی نمائندہ ہیں، پوری کہانی بنی گئی ہے۔ چنانچہ اسی لئے انتظار حسین کے ہاں صورت حال کا بننا یا بگڑنا یا پوری تاریخ کے بننے یا بگڑنے سے عبارت ہے کہ دراصل تاریخ اپنا ظہور اشیاء میں ہی کرتی ہے اور اسی لئے ایک جگہ غالباً کسی کالم میں انہوں نے لکھا بھی تھا کہ جب کوئی تہذیب اجڑتی ہے تو سب سے پہلے اس کا دسترخوان الٹا ہے یہاں دسترخوان تو محض نمائندگی کرتا ہے۔ اشیاء کی ایک پوری دائرہ کی کا جو آدمیوں کے گرد ان کے تہذیبی شعور کے اظہار کے طور پر قائم ہوتی ہے۔ اب رہ گیا مسئلہ اس تصور زمان کا جس میں دقت واقعات کے درمیان فاصلے سے عبارت ہے تو اس سلسلے میں بھی کربلا کے واقعے سے لے کر ستوا ڈھاکہ تک ایک زنجیر ہے جس میں ہر واقعے کی معنویت دوسرے سے جڑی ہوئی ہے اور یہاں بھی ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ انتظار حسین کے لئے وہی واقعات اہم ٹھہرتے ہیں جو افراد پر چھا جاتے ہیں بلکہ اس سلسلے میں ان کا ہی ایک بیان جس سے ان کا تصور تاریخ بھی واضح ہوتا ہے یہ ہے۔

”میرے ساتھ بڑی مشکل یہ ہے کہ میں تادمیخ کو
افسانہ بنا کر پڑھتا ہوں۔ یہ روش ثقہ لوگوں کو تو کیوں

پسند آنے لگی۔ لیکن ثقافت شاید افسانے کے ساتھ ساتھ تاریخ کے لئے بھی ایسی سازگار نہیں ہے۔ بہانہ اور تاریخ آپس میں غیر متعلق تو نہیں ہیں۔ افسانہ تو شاید تاریخ سے الگ رہ کر چار دن سانس بھی لے جائے مگر تاریخ تو افسانے سے رشتہ توڑ کر تجارت دم نہیں چل سکتی۔ وہ تاریخ کیا ہوئی جس پر تخیل نے تہیں نہیں چڑھاؤں اور وہ کہاں کی تاریخی شخصیتیں ہوئیں جن کے گرد افسانے نہیں بنے گئے اور جن کے قد و قامت ہیں قدرے اضافہ نہیں کیا گیا۔ وہ تاریخ تو نہ ہوئی واقعاتہ اشخاص کا تذکرہ ہوا اور ایسی تاریخ رکھنے والی قوم کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ تخلیقی صلاحیت سے عاری ہے۔ تاریخ اصل میں تخلیقی عمل ہے۔ وہ کتابوں سے زیادہ سپنوں میں رقم ہوتی ہے اور اجتماعی تخیل سے مس ہو کر زندہ حیثیت اختیار کرتی ہے۔.....

..... یہاں کہانی کرداروں پر چھا گئی ہے۔ یہ معرکہ اتنے بڑے پیمانے پر گرم ہوا ہے کہ کسی ایک شخصیت کے لئے ابھر کر واقعہ پر چھا جانے یا واقعہ کا مرکز بن جانے کی گنجائش نہیں رہی۔“

اس ضمن میں انتظار حسین نے ٹیمپو سلطان اسراج الدولہ اور سید احمد بریلوی وغیرہ کا حوالہ بھی دیا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ وہ سارے واقعات جہاں انفراد صورت حال پر چھا گئے ہیں انتظار حسین کی کہانیاں کے لئے کوئی مواد فراہم نہیں کر سکے حتیٰ کہ کربلا کا واقعہ بھی جہاں جہاں ظاہر ہوا ہے۔ مثلاً ”شہادت“ میں وہاں بھی کردار ایک منمنی شے ہے اور تاریخ کے وسیع پس منظر میں بٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے اور وہ پس منظر جس میں یہ شہادت طلب کی جاتی ہے اہم ہے۔

کی حیثیت بھی کچھ یہی ہے کہ اس کے ساتھ ہی پہلی بار تاریخ مٹتا
کا تجربہ بنی اور جس طرح یہ شعور ایک تجربے کو اس کے مماثل دوسرے
تجربے کے ساتھ لڑی میں پروتا چلا جاتا ہے اسی طرح ہجرت اور
پھر سقوط ڈھاکہ اس سے منسلک ہوتے چلے گئے ہیں۔ جنگ آزادی
کے آس پاس جاگیر کے پروانوں کا ملن اور گم ہو جانا، خاندانی تذکروں
کا کھو جانا، ہجرت کے عمل مثالوں اور تصویروں کا رہ جانا، اور
کی لانا غیر منسلک کا ساتھ سے نکل جانا۔ ایک آہستہ آہستہ
مٹتے ہوئے تاریخی شعور پر دلالت کرتا ہے اور اس تاریخی شعور
کے مٹنے کے ساتھ ساتھ ایک حافظہ اور اس سے منسلک شیاؤ
کا نظام بھی مٹا چلا جاتا ہے اور جب یہ سب کچھ مٹنے لگے تو یہ اصل
میں اعتبار کے کھو جانے کی علامت ہے۔

یہ تو ہم کا کا رخسانہ ہے

یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

جب اعتبار کی قوت ختم ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی
ساتھ معنی کا ایک نظام بھی مٹتا ہے۔

”جسے حق کہتے ہیں وہ بھی بالکل ہے۔“

یہ دراصل ایک تصویروں کا زوال اور تصور کائنات کے زوال
کا عمل ہے۔ آج سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل انتظار حسین نے رمان
اور مرثیوں کا تقابل کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

”رمان اور مہا بھارت میں کائنات پھیلتی جاتی

ہے اور آدمی سکڑتا جاتا ہے۔ مرثیوں میں آدمی پھیلتا

۲۔ چاند گہن، جل گر جے۔

۳۔ ہندوستان سے ایک خط۔

۴۔ محل والے۔

۵۔ ہندوستان سے ایک خط۔

۶۔ شہر افسوس۔

ن صورت حال کا سڑکچر کی سطح پر بہترین اظہار جو دراصل انتظار حسین
لی افسانہ نگاری یا صورت حال سے فرد کے ربط کا بوجھ ہے آخری
دنی کا سڑکچر یہاں ایسا سٹ کے کردار پر پورا ماحول غالب آنا چلا
جاتا ہے اور ایک طویل کرب سے گزرنے کے بعد اسے اپنے عمل
کے خیمہ زد کے طور پر ہی سہی لیکن صورت حال کے جبر میں آنا پڑتا
ہے۔ لہذا مسلمانوں کی تاریخ میں سے اب ان واقعات کی ایک
جمالی فہرست مرتب کر لی جائے جو انتظار حسین کو ستاتی ہے۔

(۱) واقعہ کر بلا۔

(۲) جنگ آزادی۔

(۳) ہجرت۔

(۴) سقوط ڈھاکہ۔

کہیں کہیں ایران سے ہندوستان کو ہجرت کر کے آنے
والوں کے تذکرے بھی ملتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ضمنی صورتحال ہے
بہ سارے واقعات انتظار کی کہانیوں کی ایک قسم پر محیط ہیں اور
ن سب میں ایک بات مشترک ہے کہ یہ سب اجتماعی وارداتیں
ہیں۔ جن کرداروں کا تذکرہ پہلے انتظار حسین نے کیا تھا ان کی بلند
بنیثیت سے انکار ممکن نہیں لیکن یہ اس سطح پر اجتماعی وارداتیں
نہیں بن سکیں جیسی وہ کہ جو انتظار حسین کے تاریخی شعور کو مواد
نزاہم کرتی ہیں۔

یورپ کی صورت حال پر گفتگو کرتے ہوئے رومانی ادب
کے سلسلے میں ایک بیان ہمیں یہ ملتا ہے کہ انقلابِ فرانس میں پہلی بار
تاریخ عام آدمی کا تجربہ بنی اور اس کے بعد کے ادب میں نثری
کہانی کو تو چھوڑ بیٹے شاعری میں اتنی کہانیاں لکھی گئیں کہ یہ شبہ
پیدا ہوا کہ کہیں شاعری ناول کی جگہ نہ لے لے۔ بلکہ ایک صاحب
نے تو یہ بھی کہا کہ اگر لائسنس اور درجینا دولت وغیرہ ورڈز
درتھ کے ہم عصر ہوتے تو طویل منظوم کہانیاں لکھتے۔ چنانچہ جنگ آزادی

ہے اور اس کے سامنے کائنات چھوٹی ہوتی چلی جاتی ہے۔“

چنانچہ جنگ آزادی کے بعد کی ساری صورت حال انتظار حسین کے لئے آدمی کے جھوٹے ہوتے جانے اور سکڑتے جانے کی صورت حال ہے۔ لہذا اسی لئے انتظار حسین جب بھی رزمیہ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو صورت حال کا جبر یا تو اس رزمیہ کو نامکمل چھوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے یا پھر ایسے ہیر و جن میں رزمیہ کو سہارنے کی قوت ہوتی ہے جو ہوں کی طرح مار دیے جاتے ہیں یا خود ہی آگے بڑھ کر موت کو قبول کر لیتے ہیں۔ ”بن لکھی رزمیہ“ میں پچھو اکا کر دار یا سپانڈ گھن میں کالے خان کا کر دار اودیہ رزمیہ کا ہی طرز احساس ہے جو انتظار حسین کو بار بار داستان کے اسلوب اور داستان کی فضا کی طرف لے جاتا ہے لیکن پوری صورت حال پر ہیر و ایک بار غلبہ پانے کی کوشش کرتا ہے پھر گم ہو جاتا ہے یا بے فائدہ مارا جاتا ہے۔ مثلاً اجل گرجے میں محمد خان کا یہ بیان

”میں نے یہ اضافہ جگر باش سنا تو آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مگر محمد خان آج تنہا تھا۔ کیا کر سکتا تھا۔۔۔“

اس طرح کے واقعات کے بعد کی صورت حال کا سب سے اچھا بیان یقیناً ”آخری خندق“ کا اختتام ہے۔ کسی اجتماعی واردات کا ادب یا پوری زندگی پر کیا اثر ہو سکتا ہے اس کے لئے خود انتظار حسین کے بیانات دیکھئے۔

”نہ ماں زمین سے رشتہ پیدا کہہ کے بدلتا ہے زمین بہت پرانی ہے مگر انسانی وارداتوں کے اثر میں آکر بار بار وہ قالب بدلتا ہے اور نئی حقیقت

بن جاتی ہے۔ اور اٹھارہ برس سے ہمارے لئے یہ مسئلہ سلا آ رہا تھا کہ اس نئے حقیقت کو جسے پاکستان کہتے ہیں کیسے درک کریں۔ کیسے اسے اپنے شعور کے دائرے میں لائیں۔ شاید واردات بڑی تھی ہم چھوٹے تھے، ہم اس میں کھوسے گئے تھے۔ پاکستان کی صورت میں زمین سے جو ہماری نئی رشتہ داری قائم ہوئی تھی وہ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور آخر آدمی مٹی کا بنا ہوا ہے۔ مٹی سے اپنا رشتہ اس کی سمجھ میں نہ آئے تو اسے خود اپنی ذات سمجھ سے ماہر نظر آتی ہے؟“

اسی مضمون میں آگے چلی کردات کے انکشاف کا عمل بیان ہوا ہے۔

”ہم مقام حیرت میں ہیں اور تو جہیں اور تفسیریں کر کے اس حیرت پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اپنے خواب مانتے ہیں اپنے اپنے مشاہدے بیان کرتے ہیں۔ کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے۔ کسی نے حضرت علیؓ کو سفید گھوڑے پر سوار سر پر حمام باندھے، ہاتھ میں تلوار لئے میدان جنگ کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ کسی نے کسی سفید پوش بزرگ کو ہم کے گولے پکٹتے اور راوی میں عزق کرتے دیکھا ہے۔ ہمارے اندر سوئے ہوئے منظر جاگ رہے ہیں۔ یہ ہماری ذات کے ظہور کا وقت ہے۔“

اور جب آدمی کسی روحانی واردات کا اسیر ہو تو اسے

۳۔ ادب جنگ کے بعد۔

۴۔ فنون فریدی راجہ سلتہ۔

۱۔ محرم ۱۴۱۷ھ میں طلی دیژن پر بھادیاقر خدی کے ساتھ ایک مکالمہ۔

۲۔ بن گرجے۔

ذات کے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ چنانچہ اسی لئے روسانی وارداتوں کے حوالے سے انتظار حسین نے خواب کے عالم میں ذات کے ظہور کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

اصل میں کائنات کو دیکھنے کے بنیادی طور پر دو رویے ہیں ایک وہ جو کائنات کو بحیثیت فطرت دیکھتا ہے اور دوسرا وہ جو کائنات کو بحیثیت تاریخ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اول الذکر اصل میں اساطیری شعور ہے اور دوسرا تاریخی۔ ان دونوں کی متوازن تالیف میں تخلیقی عمل اپنا ظہور کرتا ہے۔ زمین و زمان کا وہ رشتہ جس کا انتظار حسین بار بار تذکرہ کرتے ہیں دراصل انہیں دونوں رویوں کی آمیخت سے وجود میں آتا ہے اور اس تناظر عالم کے سلسلے میں کہانی کہنے والا یا فلسفہ لکھنے والا دونوں بجاور ہیں کہ اجتماعی شعور کی گرفت میں ہوتے ہیں۔

”مفکر ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس کا کام

اپنے دیگران اور اپنی سمجھ کے مطابق وقت کو علامت میں ڈھانا ہے..... اس کے لئے صداقت بالآخر

وہ منظر کائنات ہے جو اس کے جنم کے ساتھ ہی

پیدا ہوا۔ یہ منظر وہ ایسا وہ نہیں کرتا بلکہ اپنے اندر

دریافت کرتا ہے۔ یہ پھر وہ خود ہی ہے، الفاظ میں

خود اپنے وجود کا اظہار کہ صداقت اور اس کی

زندگی دونوں ایک ہیں۔“

اسی لئے انتظار حسین کی حیثیت زمین و زمان کے رشتے

کے حوالے سے، انسانی واردات کے پس منظر میں ایک خاص طرز اس کا

کے تصور زمان کو علامت میں ڈھالنے والے کی بنتی ہے۔ تصور زمان

جو کسی بھی تہذیب کا بنیادی استعارہ ہے؛

(۳)

لیکن یہ ساری گفت گویاں زیادہ تر انتظار حسین کی ایسی تحریروں کے حوالے

سے رہی جو ان کا ایک عجیب اور مخصوص اسلوب اظہار و فکر بھی جاتی ہیں۔ انتظار حسین کی ایک اہمیت ہمارے لئے یہ بھی ہے کہ اسالیب کا اتنا وسیع دائرہ شاید ان سے پہلے کسی اور افسانہ نگار میں دکھائی نہیں دیتا۔ جل گرے کا خالص داستانی انداز بیان۔ ”زرد کتا“ کے ملفوظاتی طریقہ اظہار ”آخری آدمی“ کے اہائی کتابوں والے اسلوب کچھوے میں جاتکوں کے حوالے سے ایک مخصوص تجرباتی اور لفظیاتی فنان سب کے ساتھ ساتھ ایک اور بہت اہم انداز وہ بھی ہے جو گلی کوچے کی اکثر کہانیوں میں لکھری میں اور آج تک ”نیند“ اور ”بادل“ جیسی کہانیوں میں دکھائی دیتا ہے۔ ایک حیثیت میں انتظار حسین کے ہاں یہ کہانیاں ان کہانیوں کی جن کے حوالے سے آج زیادہ تر انتظار حسین کا تذکرہ ہوتا ہے، متخالف رہیں، اگر ان کہانیوں میں اجتماعی تجربات زیر نظر ہیں تو ان میں فرد کا ایسا تجسربہ سامنے آتا ہے جہاں وہ اجتماع سے کٹا ہوا ہے اور اپنی چھوٹی سی واردات میں گم ہے اور اسی واردات سے پوری کہانی کی فنانمشی ہے۔ اس بات کا تذکرہ انتظار حسین نے ”انجمنہا رسی کی گھریا“ میں بھی کیا ہے

”اجتماعی شعور بیشک بڑی نشے سی مگر انسان کا بنیادی

احساس، اپنی تنہائی کا احساس تو اس کی تہہ میں جوں کا توں

موجود ہے کسی بھی لمحہ وہ اجتماعی شعور کے غلات کو چیر کر

سطح پر آ سکتا ہے....“

یہ تنہائی کا احساس ”لکھری“ میں بہت واضح ہے۔ لیکن اس احساس

کے ساتھ اس دور کی کہانیوں میں ایک بات اور ہے یعنی نا اُسودگی کا احساس

بچوں کے حوالے سے کچھ کہانیوں میں یہ جنس کے جذبے کا ظہور پھر اس ضمن

تجربے میں گم ہو کر وہ جانے کی صورت دکھائی دیتی ہے۔^۲

جنس کے بارے میں انتظار حسین کے ہاں دو ہی صورتیں دکھائی

دیتی ہیں۔ اگر ایسی کہانیوں میں جو اجتماع سے منسلک ہیں عورت کا

ذکر آتا ہے تو ساری امیجری اور حسن کا سارا بیان داستانوں، اہائی

ہو وہاں زبان ساتھ نہیں دیتی۔ چنانچہ اسی لئے مسئلہ کہانیوں کے سڑکچر میں بھی ظاہر ہوا ہے کہ جہاں تجربہ اجتماعی ہے وہاں زبان کی پریمیں بھی بہت ہیں اور جیسے جیسے تجربہ انفرادی ہوتا چلا جاتا ہے دیئے ویسے زبان اولہجہ جو انتظار کی بہت سی کہانیوں میں بذاتہ ایک کردار ہے اس کا رول کم سے کم ہوتا جاتا ہے اور اس کی سطح عام طور پر مستعمل زبان سے قریب ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ زبان، اسماء و افعال کے استعمال کے انداز میں تسہیلی اور اس کے ساتھ بدلتے ہوئے اشیاء کے منظر نامے کے ایک مطالعے سے ہم انتظار حسین کے ہاں ہمہ وقت تغیر پذیر انسانی رشتوں کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ دیئے کسی بھی لکھنے والے کے ہاں طرز احساس کی تہہ داری اور دوسروں سے اس کے رشتے کا اندازہ لگانے کے لئے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے کہ بقول پینگلر

”وہ ہمیت جس میں ایک آدمی کا جاگتا

ہوا شعور دوسرے کے شعور سے رابطہ استوار کرتا

ہے، میں اسے لسان کا نام دیتا ہوں“

چنانچہ انتظار حسین کے ہاں انسانی رشتوں کا ہر قصور زبان کی ایک مخصوص سطح سے مشروط ہے اور زبان کی وہ مخصوص فضا اشیاء کے ایک منظر باقی نظام کا عکس کہ بقول میگل

”گفتگو کی کائنات، کائنات کی گفتگو ہے۔“

چنانچہ اس طرح انتظار حسین کے ہاں موضوع سے اس کے اظہار تک ایک ہائڈرا کی منہتی ہے جو ایک طرز احساس میں رچی ہوئی ہے۔

(۵)

گم ہوتی ہوئی دستاویزیں، گھروں میں سونے والوں کے بستر کے گرد چکراتے ہوئے آؤ۔ راستہ کاٹ جانے والی بلایاں اور بیل کٹھ

کتاؤں سے ماخوذ ہے۔ لیکن جہاں بچپن اور جوانی کی سرحد پر جنس کے تجربے کا تعلق ہے یا ذہنی عمر میں ناسودگی کا اظہار ہے وہاں تجربہ اپنی تمام جہتوں میں مکمل ہے۔ پٹ بیچنا، ساتواں در، دیونا، کیلا وغیرہ اس کی اہم مثالیں ہیں اور ان سب میں ایک طرح کی لاماحلیت ہے جس نے ایک پختہ تر شکل انتظار حسین کی تازہ کہانی ”بادل“ میں اختیار کی ہے۔ ذہنی عمر میں جنس کے تجربے اور ناسودگی کی کیفیت ”عقیدہ خالہ“ اور ٹھنڈی آگ میں نظر آتی ہے اور وہ جسے جنسی حقیقت نگاری کہتے ہیں اور ہمارے ہاں جس سے مراد مبتذل بیان لیتے ہیں اپنی بہت فنکارانہ صورت میں ان کہانیاں میں دکھائی دیتی ہے۔ اور اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ پورا وجود اس تجربے کی گرفت میں ہوتا ہے۔ اسی طرح کی کہانیوں میں ایک ہم بات یہ دکھائی دیتی ہے کہ تجربے کے بیان میں زبان ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ ”دبولا“ میں یہی صورت حال پیش آتی ہے اور ایک وسیع تر پس منظر میں پچھلے برسوں میں لکھی جانے والی کہانی ”نیند“ اسی احساس کی توسیع ہے۔ لفظ کا ساتھ چھوڑ جانا؛

(۴)

لسانی رابطے کے بارے میں سارنر کا ایک بہت اہم بیان ملتا ہے جو اس کیفیت کو سمجھنے میں مدد ثابت ہو سکتا ہے

”لسان وجود..... پر الگ سے نافذ

کیا گیا کوئی منظر نہیں ہے۔ فی الاصل یہی وجود.....

ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں ایک موضوعیت

اپنا تجربہ دوسروں کے لئے ایک معروض کی حیثیت سے

کرتی ہے۔“

چنانچہ ہر وہ صورت حال جہاں فرد اپنے تجربے میں گم خود ہی موضوع اور خود ہی معروض ہو، دوسروں سے اس کا رشتہ منقطع ہو جاتا

ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۶ء

ذریعے عام آدمی کا کائنات سے بڑا یا بھلا ایک رابطہ استوار رہتا ہے
بہر حال تو ہم حوام کی METAPHYSICS بھی سہل METAPHYSICS
بھی اور اسی ادارے کے حوالے سے انسانوں کے درمیان رشتوں کی
معنویت، انسان اور کائنات کے درمیان رشتے کی حیثیت کا تعین ہوتا
ہے۔ چنانچہ صحیح معنوں میں انتظار حسین کے تجربے کا بنیادی سڑک پر یہی
ادہام کا نظام ہے جو کہانیوں میں ڈھلتا ہے اور کہانیاں ڈھالتا ہے
یہ کائنات ہی الگ ہے۔

وقت کے باطنی تصور کے بارے میں ابھی ایک بات سامنے
آئی تھی کہ وقت جب باطنی تجربے کی حیثیت میں ہوتا ہے تو مستقبل
بھی ماضی کی حیثیت میں دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کی سند ہمیں نظارین
کی افانوی تحریروں کے علاوہ دیگر تحریروں سے بھی ملتی ہے جہاں
ہر بڑے واقعے اور ہر بڑی واردات سے پہلے پکارتے ہوئے،
خبردار کرتے ہوئے، بشارتیں دیتے ہوئے نامعلوم لوگ دکھائی دیتے
ہیں، اور ان تذکروں سے تاریخ بھی حالی نہیں ہے۔ غیر فی الحال
تو یہ ایک ایسا ملتا ہوا ادارہ ہے جو تجربوں کی تخلیقی سطح پر تحولی صورت
کر دیتا تھا۔ اور اس کی حیثیت بھی ایک اجتماعی خواب کی تھی۔
انتظار حسین کے ماں یہ ایک ایسا نظام ہے جس کے ذریعے
ہر واردات کے تاثر میں اضافہ ہو سکتا ہے اور ہر شخصی تجربہ
ایک کائناتی تجربے میں داخل جاتا ہے۔ اس متوازی غیر محسوس
کائنات سے کسی خاص لمحے پر علامتیں نکل کر آتی ہیں اور پھر
اس میں ردپوش ہو جاتی ہیں۔ دراصل انہیں کے ذریعے ہماری
فات اپنا ظہور کرتی ہے اور اپنی ذات سے باہر ان شہادتوں پر
ایمان رکھتی ہے جو اس کے ارادوں میں موثر ہیں اور اسے معلوم
کے خوف سے محفوظ رکھتے ہیں اور یہ چیز ایک ایسے ہی معاشرے
میں جنم لے سکتی ہے جہاں انسان خستہ بنا نہ سچا ہوتا ہو۔

انتظار حسین کا پورا رویہ اس کا متقاضی ہے اور پردہ
غیب سے ظہور میں آنے والے اور پھر اس میں ردپوش ہو جانے والے

دکھائی نہ دینے والے لوگوں کی صدائیں، بشارتیں، بدعائیں، محرم میں
سرخ ہوجانے والی تسبیح کے دلنے اور پٹنے، زمین کے نیچے مبلے ہوئے
خزانوں کی پاگل کر دینے والی پکار..... بھید اور اسرار سے لبریز
یہ فضا ہماری زندگیوں کے بیچ سے گم ہو گئی ہے، بڑی بوڑھیوں کے
دم سے جو کچھ باقی ہے وہ بھی آہستہ آہستہ مٹتی جاتی ہے کہ ادہام
سائنسی دنیا میں پینے کی سکت نہیں رکھتے۔ انتظار حسین
کی کہانی کے منظر نامے کو مرتب کرنے والے تصورات اور اشیاء میں
یہ بڑی اہم چیزیں ہیں۔

انسان اور کائنات کے رابطے کے سلسلے میں دو متضاد
نکتہ ہائے نظر ہمیشہ سے موجود رہے ہیں ایک وہ جو انسان کو کائنات
کا غیر سمجھتا ہے، کائنات کو ایک غیر اہم، بے جان، بولان گاہ مانتا ہے
اور دوسرا وہ جو انسان اور کائنات کو باہم ربط میں دیکھتا ہے اور
اس کا ہر کائناتی مظہر انسانی صورت حال سے منسلک ہے۔ دوسرا
رویہ ایک اسطیری ذہن کا رویہ ہے جو اپنے سے خارج میں ایک
فعل اور مؤثر کائنات کا شعور رکھتا ہے۔ ادہام اسی دوسرے رویے
کی پسندوار ہیں۔ ہمارے ماں پہلے بھی دہم اور ٹھکوں کے خلاف
کوئی متشدد رویہ موجود نہیں ہے بلکہ بعض مونیانے تو کہا ہے کہ
دہم سلطان العارفین ہے کہ غیر موجود کو موجود کرتا ہے۔ یہ ایک تخلیقی
عمل ہے، اور انتظار حسین خلقت کے جس حلقے پر بڑا زور دیتے ہیں
اس کا سب سے اہم ادارہ تو ہم ہے کہ جس کے ذریعے ایک پوری
مابعد الطبیعیات وجود میں آتی ہے جو خلقت کا خواب بھی ہے، اس
کا عقیدہ بھی اداس کی کہانی بھی۔ تاریخ کے ایک فلسفی نے بڑی
شکایت کی تھی کہ تاریخ شہروں کی مکھی گئی سب شہروں میں بھی محض
میاہست اور معیشت کی ابداد شاہوں کی۔ چنانچہ جس طرح کھسے جانے
والے ادب کے متوازی ایک بولا اور گایا جانے والا ادب موجود ہوتا
ہے اسی طرح ادہام کا یہ نظام تاریخ کے متوازی خلقت کی تاریخ ہوتی
ہے جو بے نام و نشان صرف حلقوں میں سڑکرتی رہتی ہے اور اسی کے

یہ کردار ان کی چاہے کتنی ہی نفسیاتی تعبیریں اور توہمیں کیوں نہ کر دی جائیں بہر حال ایک قوم کی باطنی قوت کی علامت تھے اور ساتھ ہی ساتھ کائنات میں انسان کے بے یار و مددگار ہونے یا ایک معلم میں بھٹکتے رہنے کے تصور کی نفی کرتے تھے، بوجی کا گرہن کے وقت نمازیں پڑھا، منخوس پرندوں سے خوفزدہ رہنا، فتنیں اور مرادیں مانگنا، دن میں کہانیاں کہنے سے مسافروں کا راستہ بھول جانا یہ سب علامتیں تھیں فطرت اور انسانی زندگی کے درمیان ایک تعلق کی جو آہستہ آہستہ گم ہوتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی فطرت اور انسان کی معاشرت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس ایک ادارے کا مٹا چلا جانا دراصل ایک ایسے شعور کے گم ہونے کے صورت حال ہے جس کے بعد زندگی کی ایک جہت مٹ جائے گی اور یہ معاشرت تکمیل کو پہنچنے لگی کہ خلق کے مافوق کا غیر معتبر ہو جانا ہماری زندگی سے عینیت کے اٹھ جانے کی گھڑی ہے۔ اسی لئے شاہ ولی اللہ نے کہا تھا کہ جو باتیں خلق کی زمان پر جاری ہوں ان کی تکذیب نہ کرو کہ وہ حظیرۃ القدس کے فیصلے ہوتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آدمی انہیں کے آئینے میں اپنی صورت حال کا مشاہدہ کرتا ہے۔

(۴)

انتظار حسین کے ہاں اگر ہم گلی کو چپے سے شہر افسوس تک کا سارا سلسلہ نظریں رکھیں اور ان میں اسلوب کی تبدیلیوں پر نگاہ ڈالیں تو یہ اندازہ ہو گا کہ انتظار حسین کے ہاں اردو کہانی کا تقریباً ہر قابل ذکر اسلوب موجود ہے اور اس طرح انتظار حسین کے ادبی کیریئر میں اردو کہانی کی تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہے مغرب کے افسانہ نگاروں اور دنیا کی روایتوں کے حوالے سے میں نے دائرۃ الغماض پر تہا ہے اس لئے کہ ان اثرات اور ان رابطوں کا جائزہ بین الاقوامی صورت حال کے ایک جائزے کا متقاضی تھا جس کا حق بہر حال اس مضمون میں ادا نہیں کیا جاسکتا۔ ویترن کے اعتبار سے انتظار حسین کے ہاں ایک

انتظار حسین نے خسرو پر اپنے ایک مضمون میں اس بات کا لگ کر کیا تھا کہ لوگوں نے خسرو کو ٹکڑوں میں بانٹ کر دیکھنا شروع کر دیا ہے اور یہ صورت تقریباً ہر قابل ذکر لکھنے والے کے ساتھ پیش آئی ہے۔ ہماری تنقید نے انتظار حسین کی تحریروں کے محض ایک حصے کو متعلق اور اہم سمجھا اور اس طرح انتظار کے صرف دو موٹیف ہمارے سامنے آئے یعنی ہجرت اور خواب درآں حالیکہ انسانوں میں ہی اردو کہانی کی کم و بیش ہر دو غالب سے خود انتظار تک دکھائی دیتی ہے اور بات عدہ ایک فکری نظام میں گندھی ہوئی ہے۔ دوسری طرف انتظار حسین نے افسانہ نگاری کے عمل پر بہت سے اہم مضامین لکھے ہیں اور اس کے علاوہ دیگر تہذیبی اور تاریخی مسائل پر ان کا قلم رواں ہے۔

اگر ان سب کو ایک ساتھ رکھ کر اور ایک دوسرے کی صداقت پر ان کی گواہی طلب کر کے تنقید کے میدان میں انتظار حسین کے ورژن کو مربوط انداز میں دیکھنے کی کوشش کی جائے تو اس سے

تاریخ اور تہذیب کے بارے میں ایک پورا رویہ سامنے آنے لگا، اور اس حیثیت میں انتظار حسین کی ہمہ جہتی سے ان کی فکری جہت اور ادبی روایت دریافت کی جا سکے گی۔

انتظار حسین کے ہاں تاریخ کا ایک مٹا دینے اور برباد کر دینے والا تصور نظر آتا ہے اور اسی بنیاد پر قنوطیت کا الزام ایک عرصے تک یہاں کی فضا میں گونجتا رہا ہے۔ مجھے پھر پلنگر کا ایک بیان دہرانا پڑے گا۔

”بیشک، ”قنوطیت“ کا شور فوراً ان لوگوں نے مچایا تھا جو ہمیشہ دیر دوز میں رہتے ہیں اور صرف ان خیالات کا استقبال کرتے ہیں جو آنے والے کل کے لئے راستے کی تلاش میں مدد دیں۔ لیکن میں نے ان لوگوں کے لئے نہیں لکھا جو یہ سمجھتے ہیں کہ عمل کے سرچشموں کی تلاش اور عمل ایک ہی چیز ہیں۔ وہ جو تعریفیں گھومتے ہیں اور تقدیروں سے غافل ہیں۔ کائنات کے فہم سے میری مراد خود کائنات بن سانا ہے۔ اصلی چیز زندہ رہنے کی تلخ حقیقت ہے ذکر تصور حماہات۔“

یہ تحریر اس نے اپنے فلسفے کے بارے میں لکھی تھی مگر کسی حد تک قنوطیت کے تصور سے جو ہمارے ہاں انتظار حسین کے حوالے سے بار بار دہرایا جا رہا ہے، متعلق ہے۔

بہر حال ہمارے لئے انتظار حسین کی تحریریں اپنی تاریخی HISTORICITY کو مرحلہ در مرحلہ اپنی ذات کے ظہور کو دریافت کرنے کا ایک طریقہ کار ہے اور اس کائنات سے رشتہ جوڑنے کی ایک پرہیزگار کوشش ہے یہ کوشش جو تقدیر کے خلاف جنگ ہے جو شاید فنا اور ظہور کے درمیان کہیں ہے اور جسے انتظار حسین جڑوں کی تلاش کا نام دیتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ تلاش کا یہ عمل بھی گم ہو جائے اور برصغیر کی پوری اسلامی روایت ایک تہی نظام سے گھٹکھن زندگی گزار دینے کی مادی روایت میں گھلتا ڈھل جائے۔ پہلے کہ شہر افسوس میں یہ شعور ہی حاصل کر لیں کہ۔

بلے یا شہر دل کا دیران ہو رہا ہے

دکھلائی دے جہاں تک میدان ہو رہا ہے

اپنے لئے قویہ یاد وہ تہذیبی روایت ہے جو شجرہ نسب کے ساتھ گم ہو گئی ہے



حق گوئی کا صلہ

♦ ♦ ♦ ♦ ♦

اشرف مہجوی

پہلے چلا۔

اسحق۔ (اشتقاق بھرے لہجے میں) اباجان! پھر اسی وقت کیوں نہ چلیں۔

ابراہیم۔ بیٹا! اگر تمہاری یہی خوشی ہے تو آؤ ابھی چلیں۔

عزیز دونوں باپ بیٹے اسماعیل بن جامع کے مکان پر پہنچے۔ ابن جامع نے نہایت خندہ پیشانی سے دونوں باپ بیٹے کا استقبال کیا۔ عزت کے ساتھ بٹھایا۔ رسمی مزاج پرہی کے بعد ابراہیم موصلی نے ابن جامع سے درخواست کی کہ ازراہ کرم آپ اس وقت ہم باپ بیٹے کو اپنی موسیقی سے نواز دیں۔ ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ آپ سوائے امیر المومنین کے اور کسی کو اپنی موسیقی سے شاد کام نہیں فرماتے اس لئے میں آپ سے خصوصی درخواست کرتا ہوں کہ ہمیں اپنے دروازے سے محروم نہ بھیجے گا۔

اسماعیل بن جامع نے کہا کہ مجھے زیادہ شرمندہ نہ کیجئے! میں آپ کے ارشاد کی سرورچشم تعمیل کروں گا۔ مگر پہلے آپ میری خوشی پوری کر دیں۔ وہ یہ کہ اول کچھ تناول فرمائیں۔ پھر المینان سے دعوتِ رقصی کا سامان پیش کروں گا۔ چنانچہ فوراً دسترخوان بچھایا گیا۔ اللہ و اقسام کے کھانے چنے گئے۔ دونوں نے خوب سیر مو کر کھانا کھایا اور کھانے سے فارغ ہو کر گانا سننے بیٹھے۔

دولتِ عباسیہ کے بعض نامور علماء مجیب اوصاف کے مالک تھے جہاں وہ علوم و فنون کے قدرواں، سرب و طب کے شوقین، جہاں داری و جہاں بانی میں شہرہ آفاق تھے وہاں گانے بھانے کی محفلوں اور عیش و عشرت کی مجلسوں کے بھی دلدادہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے دورِ حکومت میں موسیقاروں، مغنیوں اور شاعروں کی بڑی کثرت تھی۔ وہ جو کہتے ہیں جیسا راجا ویسی پر جا۔ سربراہِ حکومت کی رنگین محفلوں کا سال دیکھ کر انہوں نے بھی اپنی محفلوں کو رنگین بنا لیا تھا۔ ان میں سے چند موسیقاروں نے اپنے فن میں وہ کمال پیدا کیا تھا کہ دورِ دور مشہور ہو گئے تھے۔

ان مشاہیر موسیقاروں میں ایک تو ابراہیم موصلی تھے اور دوسرے اسماعیل بن جامع۔ ان دونوں موسیقاروں کے سامنے بڑے بڑے موسیقار گان پکڑتے تھے۔ ایک روز ابراہیم موصلی کے فرزند اسحق نے اپنے والد ماجد سے کہا کہ اباجان وہ بڑھامرہائے گا اور مجھے اس کا گانا سننا نصیب نہ ہو گا۔ اور میرا حال یہ ہے کہ اس کا گانا سننے کے لئے میری بے تابی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

ابراہیم موصلی۔ بیٹا! کون ہے وہ بڑھا؟

اسحق۔ اباجان! وہی اسماعیل بن جامع۔

ابراہیم۔ بیٹا! یہ کونسی مشکل بات ہے۔ کسی روز میرے ساتھ

چکا تھا۔

جب مزدوریات سے فارغ ہو کر اسحق باہر جانے لگا تو باپ نے اسے آواز دے کر کہا ”میاں! ذرا میری بات سنئے جانا۔“ اسحق کے دل میں تو چور تھا۔ وہ ایک مجرم کی طرح ڈرتا جھپکتا باپ کے سامنے گیا کہ دیکھئے والد ماجد اب میرے ساتھ کس سختی سے پیش آتے ہیں۔ مگر جب والد صاحب کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ان کے پاس دیناروں کی ایک ڈھیری پڑی ہے اور باپ کے چہرے پر غصے کے آثار کی جگہ بشارت ہے۔

اسحق نے باپ کے سامنے پہنچ کر ادب سے سلام کیا اور ادب سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابراہیم بولا۔ ”دیکھو میاں اسحق! سردی کا موسم آ رہا ہے۔ تمہیں گرم کپڑے بنانے کے لئے رقم کی ضرورت ہوگی۔ یوں بھی جاڑے میں کھانے پینے کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ اس لئے یہ دینا لے جاؤ اور اپنے کام میں لے آنا اور کہتا مٹا سکتے ہو کہ اس بار میں نے تمہیں اتنے دینا کیوں دیئے ہیں۔“

اسحق (نہایت ادب کیساتھ) اگر میرا عہدہ غلط نہیں ہے تو میں جانتا ہوں ابراہیم۔ اچھا بتاؤ۔

اسحق۔ آبا جان! کل جس بچکانہ جرات کے ساتھ میں نے آپ کے حضور اپنے دل کی بات پہنچا کر دی تھی میری اس بچائی سے خوش ہو کر آپ نے مجھے اس حلیے سے نوازا ہے۔ اب میں اپنی اس لفظانہ جرات پر آپ سے دست بستہ صاف مانگتا ہوں۔ یقین فرمائیے ساری بات میں اپنی اس جسارت پر پشیمان رہا ہوں کہ مجھ سے یہ نازیبا حرکت کیوں سرزد ہوئی جو سراسر ادب کے خلاف تھی۔

ابراہیم۔ میاں تمہارا انداز درست ہے۔ میں نے تمہیں یہ دینا پہنچا بولنے پر دیئے ہیں۔ جاؤ اور ہمیشہ ہر حالت میں پہنچا بولو۔ اور پہنچا بولنے میں کسی شخصیت سے بھی مرعوب نہ ہونا۔ تمہارا حق گوئی پر میں ناراض نہیں ہوں بلکہ خوش ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ہمیشہ پہنچا بولنے کی توفیق عطا فرمائے اور تم سے خوش رہے۔

ابن جامع نے نہایت خوش الحانی کے ساتھ وجد آفریں اشعار شائع شروع کئے پھر کچھ ایسا سماں بندھا کہ ابن جامع خود بھی لطف اندوز ہو کر جھومنے لگا اور ادھر باپ بیٹے پر سکے سکا سا عالم ملاری ہو گیا۔ دو دیوار جھومتے نظر آ رہے تھے۔

جب ابن جامع کا جوش کم ہوا اور اس کی حالت اعتدال پر آئی تو باپ بیٹے بھی اپنے ہوش میں آئے دونوں نے ابن جامع کی بے حد تعریف کی اور اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ان کی درخواست کو قبولیت کا شرف بخشا اور دعوت روحانی کا بھرپور سامان ہتیا کیا۔

گمانسنے کے بعد دونوں باپ بیٹا ابن جامع کے گھر سے رخصت ہوئے تو راستے میں ابراہیم موصیٰ لے بیٹے سے پوچھا کہ وہ ابن جامع کو تم نے اپنے فن میں کیسا پایا

اسحق اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں کچھ عرض کروں۔ ابراہیم اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو آدای کے ساتھ کہو۔

اسحق۔ آبا جان! آج سے پہلے میں آپ کو اس فن میں نہ صرف کامل بلکہ یگانہ روزگار سمجھا کرتا تھا اور اپنے دل میں خیال کرتا تھا کہ میرے والد ماجد سے بڑھ کر اور کوئی مغنی نہیں ہے۔ لیکن جب سے ابن جامع کا گانا سنا ہے قلب کی کیفیت کچھ اور ہے۔

ابراہیم۔ کیا کیفیت ہے صاف صاف بیان کرو۔ اسحق۔ کیفیت یہ ہے کہ ابن جامع کا گانا سننے کے بعد اب میں آپ کی بجائے ابن جامع کو اس فن کا امام سمجھتا ہوں۔

ابراہیم بیٹے کی یہ بات سن کر حاشا ہو گئے اور اس عمر سے پھر باپ داد بیٹے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ بات ہو چکی تھی دونوں گھر پہنچ کر اپنے اپنے بستر پر لیٹ کر سو رہے۔ اسحق صبح سوکر اٹھا تو دل میں یہ خیال آکر اسے حد درجہ پشیمانی ہوئی کہ اس نے اپنے والد ماجد کے سامنے کیوں اس تجارت اور صاف گوئی سے کام لیا جس سے والد ماجد کے جذبات کو مزور ٹھیس پہنچی ہوگی کہ بیٹے نے میرے باپ ہونے کا خیال دیکھ کر اب جبر کان سے صل

پٹ فیڈر کے کسانوں کی قسمت جاگ اٹھی

”میں ضروری سمجھتا ہوں کہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کو خبردار کر دوں اس طبقے کی خوشحالی کی قیمت عوام نے ادا کی ہے اس کا سہرا جس نظام کے سر ہے، وہ انتہائی ظالمانہ اور شراپہ جیز ہے۔ اور اس نے اپنے پروردہ عوام کو اس حد تک خود غرض بنادیا ہے کہ انہیں دلیل سے قائل نہیں کیا جاسکتا۔ اپنی مقصد براری کے لئے عوام کا استحصال کرنے کی نونے بڑا ان کے خون میں درج گئی ہے۔ کیا آپ نے محسوس کیا کہ کروڑوں عوام کا استحصال کیا گیا ہے، اور اب ان کے لئے دن میں ایک وقت کی نامحاصل کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ مگر حجاز اور سرمایہ دار عقلمند ہیں تو وہ نئے حالات کے مطابق خود کو ڈھال میں لگے گا، وہ ایسا نہیں کرتے تو پھر خدا ان کے حال پر رحم کرے ہم ان کی کوئی مدد نہ کریں گے۔“

جن کو ایک ظالمانہ اور شراپہ جیز نظام کی بنیاد پر ایک وقت کی پیٹ بھروٹی بھی نصیب نہیں ہے۔

بائی پاکستان کی اس تقریر کی بنیادی اہمیت ہے کہ اس کے ذریعہ اس امر کی بھرپور نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ پاکستان کو اسلام کے نام پر محض اس لئے قائم نہیں کرتا چاہتے تھے کہ لوگ یہاں صرف اسلامی شعائر کے مطابق آزادانہ زندگی گزار سکیں، بلکہ پاکستان کا اولین مقصد ان کے نزدیک ایک ایسا عادلانہ اسلامی معاشرہ بھی قائم کرنا تھا۔ جس میں کسی کو کسی کا استحصال کرنے کی سہاڑت نہ ہو۔ معاشی و اقتصادی عدل قائم کیا جائے اور ماضی

قائد اعظم محمد علی جناح نے یہ الفاظ ۲۳ مارچ ۱۹۴۳ء کو دہلی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمائے تھے۔ اس تقریر میں قائد اعظم نے پاکستان کے قیام سے چار سال پہلے ماہ پیشتر دو اہم نکات پوری طرح واضح کر دیئے تھے۔ اول یہ کہ زمیندار بھائیگروار اور سرمایہ دار طبقہ ایک ایسا استحصالی طبقہ ہے جس نے ملک کے کروڑوں عوام کا استحصال کر کے، ان کے حقوق پر خاصہ قبضہ کر کے اور انہیں زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم کر کے اپنی خوشحالی کے محل تعمیر کئے ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ پاکستان کے قیام کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ان کروڑوں عوام کی حالت تبدیل کی جائے

کی بنا پر ملک میں سنگین معاشی اور اقتصادی ناہمواری پیدا ہوئی اور نتیجتاً ملک شدید سیاسی، اقتصادی اور ذہنی بحران سے دوچار ہوا۔

اسی عالم میں ملک کی پہلی منتخب جمہوری حکومت برسرِ اقتدار آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی ملک میں ایسے اقدامات کا سلسلہ شروع ہوا جو قیام پاکستان کے بنیادی مقاصد اور قائد اعظم کی دلی خواہشات کے عین مطابق تھے۔ وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ”اسلام خطرہ میں ہے“ کہ پرانے فرسودہ گمراہ کن اور استعمالی نعرے کو مسترد کر کے ٹھوس حقیقت عوام کے سامنے رکھی کہ اسلام کو آج کوئی خطرہ ہے نہ پہلے کبھی تھا، اس لئے اسلام کو بچانے کا کوئی مسئلہ نہیں، اسلام کی حفاظت اور دفاع پاکستان کے عین عوام کا قومی، اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے البتہ اصل مسئلہ استحصال اور استعمالی نظام کے کرداروں استحصال زدہ عوام کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کے لئے سماجی اور اقتصادی اصلاحات نافذ کرنے کا ہے۔ یہ بات بنیادی صداقت کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن قومی قیادت کی جانب سے پہلی بار اس کا اظہار خیال ہوا تھا، عوام نے اس کا پُر جوش خیز مقوم کیا اور عوامی حکومت سے بھرپور تعاون کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ عوامی دور حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی پاکستان کی تعمیر نو اور عوامی زندگی میں استحصال کے خاتمے کا سلسلہ شروع ہوا۔

اس جدوجہد کے پہلے ہی مرحلے میں اس استعمالی طبقے پر ضرب لگائی گئی جس کی نشاندہی قائد اعظم نے ۱۹۴۳ء میں کی تھی زرعی اصلاحات کے نفاذ کے ذریعہ اراضی کی صد ملکیت مقرر کر دی گئی اور فاضل اراضی زمینداروں اور جاگیرداروں سے سرکاری تحویل میں لے کر بے زمین کسانوں میں بلا معاوضہ تقسیم کر دی گئی۔ اس کے بعد زندگی کے ہر شعبے میں اصلاحات نافذ کی گئیں تاہم بنیادی توجہ کسانوں، کاشتکاروں اور چھوٹے زمینداروں پر مشتمل دیہی آبادی کی فلاح و بہبود پر مرکوز کی گئی جو دراصل اس

میں نا انصافی، ظلم اور استحصال کے شکار ہونے والے کرداروں عوام کو استحصال سے نجات دلانی چاہئے اور ان کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی لائی جائے۔

قائد اعظم نے اس مسئلے کا ہر پہلو سے جائزہ لیا تھا، اور اس مسئلے میں واضح فیصلوں کا اعلان کر دیا تھا۔ ۳ جولائی ۱۹۴۳ء کو کوئٹہ میں تقریر کرتے ہوئے قائد اعظم نے بلوچستان کے بدنام زمانہ سرداری نظام کو جاگیردارانہ اور استعمالی نظام کی بدترین صورت قرار دیا اور سرداروں کو خبردار کیا کہ وہ پھانی روش ترک کر کے نئے حالات اور تقاضوں کو محسوس کریں، اور اپنے عوام کا استحصال کرنے کے بجائے ان کی خدمت کے لئے کڑیتہ ہوں۔ انہیں آنے والی تبدیلیوں کے مطابق قوم و ملک کی خدمت کے لئے اپنا کردار مثبت طور پر ادا کرنا ہوگا۔ پھر ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو الیوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندے سے انٹرویو کے دوران قائد اعظم نے اعلان کیا کہ،

”پاکستان بننے پر موجودہ دور میں ضروری اور

بنیادی نوعیت کی صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لینا ہوگا

اور یہی عمل عوامی ضروریات کے تحت بعض دوسرے

شعبوں میں بھی کرنا ہوگا“

یہ پس منظر واضح کرنا اس لئے ضروری تھا کہ اس سے پاکستان کی معاشی و اقتصادی پالیسی کے وہ خدوخال واضح ہو جائیں جو قائد اعظم کو ناچسپاہتے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد قائد اعظم کو قدرت نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنے نظریات، اطلاعات اور وعدوں کو عملی صورت دے کر نافذ کرتے۔ اس کے بعد سے پوسے میں پچیس سال تک اس ملک پر وہی استعمالی طبقہ قابض رہا جس کی گرفت کو توڑنا قائد اعظم کے نزدیک پاکستان کے قیام کا اولین مقصد تھا۔ استعمالی طبقہ استحصال کو کیسے ختم کر سکتا تھا۔ یہ لوگ دوسروں کے حقوق اور کرداروں استحصال زدہ عوام کے دکھ درد کو کیسے محسوس کر سکتے تھے چنانچہ اس طبقے کی خود مرضی، حرص و ہوس اور صریح نا انصافیوں

یہ علاقہ بلوچستان کا مایہ ناز زرعی علاقہ ہے اور پٹ فیڈر نہر سے تیراب ہوتا ہے۔ اس علاقے میں لاکھوں ایکڑ اراضی پر پھیلے ہوئے سہرے بھرے کھیت اور یہاں کی زرخیز زمینوں کی سوتا لگنے کی صلاحیت ہمیشہ مفاد پرست اور استحصالی قوتوں کی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بنی رہی ہے۔ یہاں کے کاشتکاروں کے حقوق و مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی ضرورت کبھی کسی نے محسوس نہ کی۔ بلوچستان میں تو یہ کھادت عام رہی ہے کہ وہاں سرداروں کا قلع میں اور ضلع کچی اور پٹ فیڈر کے میدان ان کی فرکار گاہیں ہیں۔

۱۹۷۲ء کا وہ تاریک دور یہاں کے لوگوں کو ہمیشہ یاد ہے گا جبکہ پٹ فیڈر کے بچے، پڑھن، سادہ دل اور محنت کش کسانوں پر مسلح حملے کئے گئے، ان کے گھر لوٹے گئے، ان کے مولیٰ اور ٹریڈر چھینے گئے۔ ان کی فصلوں اور جھوپڑوں کو آگ لگائی گئی، ان کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا اور ان کے آدمی اغوا کئے گئے۔ اور یہ سب کچھ ایک ایسی صوبائی حکومت کے دور میں دیدہ و دانستہ اور صوبائی حکومت کی مکمل پشت پناہی کے ساتھ ہوا، جو بلوچستان کے عوام کے حقوق کی بحالی اور ان کے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کے ازالے کے نام پر اقتدار میں آئی تھی۔

مفاد پرست عناصر کی ریشہ دوانیوں، سابق سرداروں کے استحصالی حربوں، سابق حکومتوں کی بے تدبیری اور بلوچستان میں کالعدم ٹیپ کی سابق صوبائی حکومت کے بے رحمانہ رویے نے کاشتکاروں کے حقوق کی بحالی اور اراضی پر ان کے مالکانہ حقوق تسلیم کرنے کے سیدھے سادے مسئلے کو اس قدر الجھا دیا کہ اس کا حل اگر ناممکن نہیں تو شدید طور پر مشکل مزور دکھائی دینے لگا تھا۔ لیکن مسائل کو حل کرنے کی یہ غرضانہ اور غمخسانہ خواہش اور اس خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا عظیم جذبہ موجود ہو تو کوئی مسئلہ لایحل نہیں رہتا۔

۲۵ جولائی کا دن پٹ فیڈر کے علاقے میں نا انصافی، محرومی اور مایوسی کا آخری دن تھا۔ وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے

ملک کی ۸۰ فیصد آبادی اور ہماری معیشت کی اصل معمار ہے۔ زرعی اصلاحات کے بعد کسانوں کو بے شمار سہولتیں فراہم کی گئیں تاکہ وہ پیداوار میں اضافہ کر سکیں انہیں آبپاشی کے وسائل کی کمیائی کھاد کی سہولتیں اور ایک تہائی قیمت پر زرعی مشین خریدنے کی مرمت دی گئیں اور ان کی ضرورتوں کی کفالت کیلئے وسیع پیمانے پر قرضے دیئے گئے جو بعض حالات میں معات بھی کئے جاتے رہے ان میں بلوچستان کے کاشتکاروں کے ذمہ صوبائی حکومت کے ۲۶ لاکھ روپے کے وہ قرضے بھی شامل ہیں جو وزیراعظم بھٹو نے گذشتہ مارچ میں اپنے دورہ بلوچستان کے دوران معاف کر دیئے تھے۔

جہاں تک بلوچستان کے عوام کا تعلق ہے، ان کا تجربہ یہ ہے کہ وزیراعظم جب بھی اس خطہ وطن کے دورے پر تشریف لاتے ہیں اہل بلوچستان کے لئے نئی خوشخبریاں لے کر آتے ہیں۔ چنانچہ اس مرتبہ وزیراعظم نے اپنا دورہ صوبے کے ساحلی علاقوں سے شروع کیا، اور اس کے دوسرے مرحلے میں جوں ہی ضلع لسبیلہ میں اٹکل کے مقام پر پہنچے، عوام نے پہلی خوشخبری سنی، وزیراعظم نے ضلع لسبیلہ کی سرکاری اراضی کے موردی مزارعین کو اس اراضی کے مالکانہ حقوق دینے کا اعلان کیا اور کہا کہ یہ لوگ کئی صدیوں اور کئی نسلوں سے اس اراضی پر کاشت کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے مالکانہ حقوق تسلیم نہیں کئے گئے اب عوامی حکومت ۳۰ سال کی نا انصافیوں کے ازالے کا تہیہ کر چکی ہے چنانچہ ان موردی مزارعین کو ضلع لسبیلہ کی سرکاری اراضی کے مالکانہ حقوق دیئے جا رہے ہیں۔

وزیراعظم کے حالیہ دورے کا اہم ترین اعلان ۲۵ جولائی کو بلوچستان کے ضلع نصیر آباد میں ٹیپل ڈیرہ کے مقام پر کیا گیا اور بلاشبہ یہ اعلان اپنے تاریخی پس منظر اور اثرات و نتائج کی بنا پر ایک اہم تاریخی اعلان ہے۔

ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۹ء

کا نقصان خود برداشت کرے گی۔“
پٹ فیڈر کے علاقے کی ۵ لاکھ ایکڑ اراضی کے مالکانہ حقوق کانوں کو منتقل کرنے کے لئے کانوں کو تین گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا گروپ ان کانوں کا ہے جن کے پاس پہلے سے اراضی موجود ان میں ایسے بھی ہیں جن کے پاس ۱۴ ایکڑ یا اس سے کم رقبے کے زرعی یونٹ ہیں، اور ایسے بھی جن کے پاس ۳۲ ایکڑ تک اراضی موجود ہے۔ ان سب کو یکساں طور پر سولہ ایکڑ اراضی کے مالکانہ حقوق دینے گئے ہیں۔ اس گروپ کے ۲۰ کاشتکاروں کو زمین کی ملکیت کی منتقلی کا کام ۱۵ اگست تک مکمل کر دیا جائے گا۔

دوسرے گروپ میں وہ کاشتکار ہیں جو ان اراضی پر کاشت تو کر رہے ہیں لیکن ان کے پاس کوئی زمین نہیں ہے۔ تیسرا گروپ اراضی کے ان قابضین کا ہے جن کے پاس اراضی کی ملکیت اور قبضے سے متعلق بعض پرانی سندیں موجود ہیں۔ ان تمام کاشتکاروں کو سولہ ایکڑ اراضی منتقل کی جائے گی اور یہ کام وزیر اعظم کی ہدایت کے مطابق ۱۵ اگست تک پورا کر لیا جائے گا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، وزیر اعظم بھٹو کے اس تاریخی فیصلے سے پہلے مرحلے میں ۱۵ ہزار کاشتکار خاندان مستفید ہوں گے لیکن جیسا کہ اعلان کیا گیا ہے کہ ۵ لاکھ ایکڑ اراضی ۱۴ ایکڑ فی خاندان کے حساب سے تقسیم کرنے پر تقریباً ۳۲ ہزار کاشتکار خاندان فائدہ اٹھائیں گے۔

وزیر اعظم بھٹو کا یہ فیصلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک بے حد اہم تاریخی فیصلہ ہے اور اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے بے مثال قومی افادیت کا حامل فیصلہ ہے۔ پٹ فیڈر کے کان عرصہ دراز سے غیر یقینی حالات اور غیر محفوظ مستقبل کے اندیشہ کے دوچار تھے اور جیسا کہ وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں بتایا سابق حکومتوں کا اندازہ فکر یہ تھا کہ،

”ان کانوں کے حقوق و مفادات کی فکر کسی

اس روز ایک عظیم الشان جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے پٹ فیڈر کی ۵ لاکھ ایکڑ اراضی کے مالکانہ حقوق کسی معاوضے اور قیمت کے بغیر کاشتکاروں کو منتقل کرنے کا تاریخی اعلان کر کے یہاں کے کاشتکاروں کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل کر دیا اور انہیں مایوسی کے گہرے سمندروں سے نکال کر مسرت و اطمینان کے آسمانوں پر پہنچا دیا۔ اس علاقے میں وزیر اعظم کے تاریخی اعلان سے تقریباً ۳۲ ہزار خاندانوں کو فائدہ پہنچا۔ تاہم پہلے مرحلے میں ۱۵ ہزار خاندان اس سے مستفید ہوں گے۔ ان میں وہ خاندان بھی شامل ہیں جو پہلے سے زمینوں پر قابض ہیں اور وہ کاشتکار بھی فائدہ اٹھائیں گے جن کے پاس اس وقت کوئی زمین نہیں۔

وزیر اعظم نے اس تاریخی اعلان میں حکومت کے مصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ:

”پٹ فیڈر کے مسئلے کا حتمی، متصفیٰ اور مؤثر حل تلاش کرنے کے لئے حکومت نے اعلیٰ اختیارات کی دو کمیٹیاں قائم کی تھیں جنہوں نے مسئلے کا ہر پہلو سے جائزہ لینے کے بعد اپنی سفارشات پیش کر دی ہیں۔ ان سفارشات کی روشنی میں پٹ فیڈر نہوسے سیراب ہونے والی ساڑھے پانچ لاکھ ایکڑ اراضی میں سے ۲۵ ہزار ایکڑ ان شہداء کے خاندانوں کے لئے وقف کر دی گئی ہے جنہوں نے مادر وطن کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ ۵ لاکھ ایکڑ اراضی ۱۴ ایکڑ فی خاندان کے حساب سے کسی قسم کے معاوضہ یا قیمت کے بغیر اس علاقے کے کانوں کو مالکانہ حقوق کے ساتھ منتقل کی جا رہی ہے حکومت اس اراضی کی کوئی قیمت وصول نہیں کر رہی کیونکہ میں کسی کاشتکار کو مقررہ دیگیا نہیں چاہتا چنانچہ اس اراضی کی بلا قیمت تقسیم سے حکومت ۵ کروڑ پہلے

سہولتیں اور زرعی قرضوں کی فراہمی کی صورت میں مزید مراعات فراہم کر دی گئی ہیں۔

ان تحفظات اور سہولتوں کی بنا پر پٹ فیڈر کے علاقہ میں بسنے والے کاشتکار اب خوب دلچسپی کے ساتھ اپنی زمینوں پر محنت کریں گے، ان کی زرخیزی اور شاندار پیداواری صلاحیت سے بھرپور فائدہ اٹھائیں گے اور زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی جدوجہد کریں گے۔ یہ جدوجہد نہ صرف ان کی اپنی خوشحالی اور ترقی کا ذریعہ ثابت ہوگی بلکہ اس کے ذریعہ ملک کو غذائی طور پر خود کفالت کی منزل تک پہنچانے میں بھی زبردست مدد ملے گی۔ اور اس طرح یہ فیصلہ پوری قوم کے لئے مفید ثابت ہوگا اور اعظم بھٹو کے اس حقیقت پسندانہ، منصفانہ اور انتہائی جرات مندانہ فیصلے پر پوری قوم کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ خصوصاً ضلع نصیر آباد کے خوش قسمت کسانوں کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے جذبہ تشکر کے عملی اظہار کے لئے اس علاقے کی زمینوں سے بھرپور پیداوار حاصل کر کے انہیں پوری قوم کے لئے سرمایہ غز بنا دیں :

کو نہ سستی، سوچا جاتا تھا تو ان زادیوں سے کہ یہ ارا منی بڑے افسروں اور ان کی بیگمات کو دے دی جائے تاکہ وہ اس پر سرمایہ کاری کر سکیں، مٹی کی کاشت کے ذریعہ پیداوار بڑھا سکیں، ان کسانوں کے پاس کیا رکھا ہے، یہ تو نہ سرمایہ لگا سکتے ہیں، نہ ٹریڈ خرید سکتے ہیں اور نہ ہی پیداوار بڑھا سکتے ہیں۔

کسانوں کو اس غیر یقینی صورت حال سے نہات مل گئی ہے اب وہ ان زمینوں کے مالک خود ہیں، اور ان کے بعد ان کی اولادیں اس زمین کی مالک ہوں گی۔ اب انہیں نہ کسی بڑے زمیندار اور جاگیردار کے استعمالی حربوں کا خوف ہے، نہ کسی سردار کے مسلح حملے کا اندیشہ اور نہ کسی بڑے افسر کو زمین کی ملکیت منتقل ہونے کا خطرہ انہیں کھل ڈھنی سکون اور تحفظ فراہم کر دیا گیا ہے۔ آبپاشی کے لئے انہیں پٹ فیڈر نہر کے ذریعہ ان کے اصل حصے سے بھی درآمد پانی فراہم کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ کیمیائی کھاد، مسمدہ بیج اور ٹریکٹروں سمیت ہر قسم کی زرعی مشینری حاصل کرنے کی وافر



ڈسکشن ہال میں ایک تاثر

بشریٰ خاثر

آنر بٹری خاثر میڈیکل کالج کے طالبہ ہیں اور ساتھ ہی ایک شاعرہ بھی۔ ان کے سینے میں ایک پُرسوز دل ہے، یہ نظم ڈسکشن ہال میں ایک مردہ جسم کے تجزیاتی، بوجھی سے پیدا ہونے والے ان کے تاثر کے مترادف تصور ہے۔ جیسے یقین ہے۔ آنر بٹری ان لطیف و عظیم جذبات کو عین معنوں میں ایک مستند ڈاکٹر کے برعکس کار لائیں گے اور جسے جسم لے نہیںے چاہ سارے بیمار اور بے کس کے علمی تربیت کا موقع فراہم کیا، اس کے سیکھو دو ہزاروں ہونے ہیں بجائے توت کے درد مند خدمت کر کے وہ مجھ نذرانہ پیش کرے گے:

سلگ اٹھتا ہوگا، دھک اٹھتا ہوگا
یہ خاموش سینہ کہ جس کی تہوں میں
وہ قبریں بھی ہوں گی
جہاں دفن ہیں
کتنی معصوم سی خواہشوں کی وہ کلیاں
جنہیں اپنے کھنکھنے سے پہلے ہی
مجنور یوں کی صلیبوں پر قربان ہونا پڑا
اور یہیں دفن ہوگا وہ دل بھی کہ جس میں
کبھی دھڑکنوں کے ترنم پہ نغموں کی جھنکار ہوگی
کبھی بستیوں کے اجڑنے کا غم
اور کبھی پیار لٹنے کا ماتم بھی ہوگا
مرے سامنے ہے تمہارا بدن
اور میں سوچتی ہوں
کہ بے جان و بے بس یہ مردہ بدن
کبھی ماں کی ممتا بھری گود میں

میرے ہاتھوں میں نشتر ہے اور سامنے میز پر ہے تمہارا بدن
جس کی ہڈیوں پر چمڑے کا ہے سخت سا پیرہن
جس کے چہرے کا ہر نقش ہے دراصل
ایک ویران اجڑا ہوا سا کھنڈر
میرے سامنے میز پر ہے تمہارا بدن
اور میں سوچتی ہوں
کہ تم آخری وقت کیا کہہ رہے تھے
کہ اب تک تمہارے لبوں کے درپے کھلے ہیں
تمہیں کون سی شے کے چھننے کا ڈر تھا
کہ اب بھی
اسی طرح سے ہاتھ بندھیں تمہارے
مرے سامنے ہے تمہارا بدن
اور میں سوچتی ہوں
کہ پتھر کی طرح یہ خاموش سینہ
کبھی زندہ جذبوں کی حدت سے تپ کر

کسی ماہِ رُخ کی محبت کی شمعیں
چراغاں کیے رہتی ہوں گی سدا
وہ آنکھیں کہ بھرا آتی ہوں گی جو غم سے
وہ آنکھیں کہ جو مسکراتی بھی ہوں گی
مرے سامنے ہے تمہارا بدن
اور میں سوچتی ہوں
کہ شاید کبھی
کسی موڑ پر یا کسی راہ پر
ہم اور تم
ایک لمحے کو مل کر جدا ہو گئے ہوں
مگر آج اُس ایک لمحے کی پہچان کا
کوئی غنجہ نہیں
اس شناسائی کی کوئی خوشبو نہیں
اور ابھی چند لمحوں میں نشتر سے میں
تمہارا بدن ریزہ ریزہ کروں گی
اگر تم کو تکلیف ہو تو خدا را
قسم ہے اُس ایک لمحے کی تم کو
مجھے معاف کرنا مجھے بخش دینا

اک حسین پھول کی طرح مہر کا تو ہوگا
اور اس کی ہنسی
پاک و معصوم و دلکش رو پہلی ہنسی
کسی گھر کے آئین میں سورج کی طرح چمکتی تو ہوگی
مرے سامنے میز پر ہے تمہارا بدن
اور میں سوچتی ہوں
تمہارے لئے بھی کبھی تو کسی کی
لگا ہوں میں چاہت چمک اٹھتی ہوگی
کسی نے تمہارے دکھوں کی تپش میں
کئی راتیں جل جل کے کاٹی بھی ہوں گی
مگر آج یہ کیا عجیب بے کسی ہے
کہ اتنی مہبت ساری آنکھیں ہیں لیکن
کسی میں تمہارے لئے کوئی آنسو نہیں
کوئی غم کوئی چاہت نہیں
مرے سامنے ہے تمہارا بدن
اور میں سوچتی ہوں
کہ ویران چہرے کے اجڑے گواہوں میں
کبھی زندہ آنکھیں بھی ہوں گی کہ جن میں

فاروق شاہ پوری

اثرن ابرائیانی

شاگرد تھا اس کے دیوان کا دیباچہ منشی شوکت علی کا تحریر کردہ ہے
سید ذاکر علیہ ذکر شاہ پوری کا اردو دیوان ”نغمہ بہار“ کے نام
سے ۱۸۸۶ء میں بہار ہند پریس انگریز سے شائع ہوا آپ حاتم علی
مہر اکبر آبادی کے شاگرد تھے مومن علی صاحب امرہوی آپ کے دوست
تھے ذاکر شاہ پوری کا انتقال ۱۳۱۵ ہجری میں انگریزوں میں ہوا احاطہ
منوہرہاں میں مدفون ہیں۔

حاجی سید سجاد حسین سجاد شاہ پوری کا نعت دیوان (قلمی) انجمن ترقی
اردو حیدر آباد (دکن) طبع کرانے کے لئے علی شہر حاجتی ۱۹۴۶ء میں لے
گئے تھے۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد دکن کے فسادات میں وہ قلمی
دیوان تلف ہو گیا لیکن اس سے قبل انتخاب کلام سجاد اکبر ک پرپیس
الہ آباد سے ۱۹۲۴ء میں شائع ہو چکا تھا ایک زمانہ میں سجاد حسین
صاحب نے رسالہ اکبر انقلاب زمانہ اخبار ترجمان اودھ و بنگالہ پور
چون نکال کر اردو کی بڑی خدمت کی وہ اپنی بہت سی صفات خصوصاً

سے جو ۱۹۳۳ء میں روزانہ اخبار ”انقلاب زمانہ“ کلکتہ سے شائع کیا جس
کے ایڈیٹر محمد امین کیتی ولد مولانا محمد فاروق چڑیا کوئی تھے ۱۴ دسمبر ۱۹۳۳ء ہفت روزہ
اخبار ”بنچہ پور“ اودھ پرنس کے طرز پر شائع کیا اس کے ایڈیٹر اصغر وارثی تھے۔
رسالہ اکبر آباد سے اعظم کریم کی زیر امداد شائع ہوا

”شاہ پور“ ضلع فتح پور ہمسوہ (یو۔ پی) کہنے کو ایک چھوٹی سی آبادی
ہے لیکن قدرت نے یہاں شخصیتیں عظیم پیدا کیں۔ اسے آباد کرنے
کا شرف اورچ شریف کے ایک بزرگ محمد معروف شاہ کو حاصل
ہے جن سے عقیدت رکھنے کے سبب اکبر اعظم نے ۹ صفر ۹۸۲ ہجری
کو ایک فرمان کی نڈ سے طویل و عریض اراضی بہ مدد معاش آپ کی
تذکرہ جس کو آباد کر کے آپ نے اس بستی کا نام ”شاہ پور“ رکھا۔
اس بستی میں جہاں دوسرے علوم و فنون کے ماہرین پیدا ہوئے
وہاں شعروادب کا صحیح ذوق رکھنے والوں نے بھی جنم لیا ان میں
مولوی محمد شجاع مصنف ”منہاج الرشاد“ میر مظفر علی۔ مولوی دائم علی، سہلو
شاہ پوری۔ اصغر وارثی، محمد اعظم۔ ذاکر شاہ پوری، فاروق شاہ پوری
اور منشی شوکت علی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

منشی شوکت علی اردو اور فارسی ادبیات کے ماہر تھے ریاست
جھجھر میں قیام کی وجہ سے غالب اور عارف دوستانہ تعلقات رکھتے تھے
انکے تذکرہ ہیڈ رلی فرانسیسی نثر اور اردو اور فارسی زبان میں ان کا
لے بحوالہ تاریخ شاہ پور مصنف اصغر وارثی

لے منقرہ شجرہ سادات شاہ پور مرتب حاجی سید سجاد حسین سجاد شاہ پوری
مولانا عبد الماجد دریا آبادی از مقالات ماجد صفحہ ۱۰

بدرجہ اتم موجود ہیں۔ آپ محمد عظیم صاحب کے بڑے صاحبزادے ہیں جن کا ذکر آدپر ہو چکا ہے آپ کی ولادت ۱۸۸۳ء میں ہوئی ابھی آپ کا عالم طفلی ہی تھا کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا آپ کی کفالت اور تعلیم میں آپ کے حقیقی نانا کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالقادر کیل سرکار حیدر آباد (دکن) کو بڑا دخل ہے مروجہ اصول کے تحت آپ کی تعلیم کا آغاز مکتب سے ہوا کلام پاک ختم کرنے کے بعد ایدو اور فارسی آپ نے مولوی امیر احمد صاحب جو ایرایان کے باشندے تھے سے حاصل کی اس کے بعد اسلامیہ مدرسہ رفیع پور میں داخل ہو گئے کچھ عرصہ وہاں تعلیم حاصل کی اس کے بعد عبدالقادر صاحب کے پاس حیدر آباد چلے گئے اور حیدر آباد گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہو کر میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔

شعر و سخن سے چونکہ فطری لگاؤ تھا تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ ذوق و شوق پروان چڑھتا رہا مضامین کی ابتدا پیسہ اجار سے ہوئی اور کچھ عرصہ ایڈیٹوریل اشاف سے منسلک رہے اس کے بعد پولیس میں ملازمت کر لی اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے ۱۹۴۴ء میں پنتھن نے کر سبکدوش ہوئے "خان صاحب" کا خطاب حاصل کیا تاریخ اقوام جرائم پیشہ کا انگریزی سے ہندی میں ترجمہ کرنے پر برٹش گورنمنٹ سے نقد اقام حاصل کیا۔

آپ نے اپنا تخلص اس رکھا تھا لیکن پھر فاروق کھنے لگے کسی کے شاگرد نہیں ہونے لیکن علم عروض اور قواعد شعر و سخن سے پوری آگاہی تھی مضامین نظم و نثر قلم برداشتہ لکھتے تھے ایک مدت تک رسالہ زمانہ، العصر، الناظر، ادیب، مخزن، تمدن، اکسین، نقاد، نگار، پنجاب ریو وغیرہ میں کثرت سے مضامین نظم و نثر شائع ہو کر شائقین علم و ادب سے توجہ عقیدت وصول کیے ہیں، طاہری شہرت اور نام و نمود سے سروکار نہ تھا ہی وجہ سے کی کتابی شکل میں آپ کا کوئی مجموعہ منظر عام پر نہ آ سکا ویسے آپ کے تمام مضامین نظم و نثر آپ کے بڑے صاحبزادے اختر تابان کے پاس محفوظ ہیں۔

قیامتی طبع، مہمان نوازی، حاجت روائی اور رفاہ عامہ کے کاموں میں دلچسپی لینے کے سبب غفلت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اعظم شاہپوری کا اردو دیوان اُن کے ایک خاص عزیز محمد یونس نے یادگار اعظم کے نام سے سہیل پریس حیدر آباد دکن سے ۱۳۰۹ھ میں ان کے انتقال کے بعد شائع کرایا ان کے انتقال کو ایک حیرت انگیز واقعہ کی حیثیت حاصل ہے جو یادگار اعظم کے حوالے سے مختصر یہاں درج کیا جاتا ہے۔

"یہ ایک عجیب واقعہ گذرا ۲۹ رمضان المبارک ۱۳۰۷ھ کو روزہ افطار کے بعد محمد اعظم غازی مغرب ادا کرنے مسجد میں گئے اسی وقت کچھ ترشح ہونے لگا جس وقت امام مسجد نے نیت غازی باندھ لی تو دفعتاً گند مسجد پر پھیل گئی اور اس کو توڑ کر جماعت پر آئی ساری جماعت حالت غازی میں فرش مسجد پر گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی کچھ وقت گزرتے پر رفتہ رفتہ لوگوں کو ہوش آتا گیا لیکن مرحوم اُسی طرح غازی پڑھتے ہوئے جنت کو سدھارے بجل گرنے سے مسجد کی عمارت کو کوئی نقصان سوائے اس کے نہیں پہنچا۔ کی شمال گنبد کے کلس کی نوک دو چار پنج ٹوٹ گئی اور معبر کے سلسلے چھ سات پنج کا گڑھا پڑ گیا لیکن انتہائی تعجب کی بات یہ ہے کہ جامع غازی محفل اپنی جگہ بالکل درست رہی۔"

سید محمد فاروق شاہپوری کا قلم نظم ہو یا نثر دونوں میں خوب چلتا ہے دنیا میں شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی ایسے لوگ کم ملتے ہیں جن میں یہ دونوں خوبیاں بیک وقت موجود ہوں اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی اچھا شاعر ہے تو نثر اُکمل نہیں یا نثر اچھا ہے تو شاعر نہ ہونے کے برابر لیکن سید محمد فاروق شاہپوری میں یہ دونوں اوصاف

اس واقعہ کی تفصیل یادگار اعظم میں صفحہ اول پر درج ہے۔

فاروق شاہپوری کا انتقال ۱۹۶۰ء میں ہوا ہے اگر آپ ایک طرف کامیاب نقاد تھے تو دوسری طرف ایک بہترین شاعر اس سے ذرا ہٹ کر دیکھئے تو مخلص انسان جو اپنی با اصول زندگی، نفاست پرندگی علمی و ادبی مسئلے، اعلیٰ اخلاق، نیک نفسی، زہد و تقویٰ، محبت و مروت اور ساتھ ہی ساتھ انتہائی صاف گوئی کیلئے مشہور تھے۔

آپ کے دوستوں میں نیاز فتح پوری، ڈاکٹر عبدالکادری، نوبت رائے نظر، عارف ہسوی، سمر ہنگامی وغیرہ قابل ذکر ہیں یہ تھے وہ محقق حالات فاروق شاہ پوری سے متعلق جو پیش کئے گئے جن سے موصوف کی تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی زندگی کا پتہ چلتا ہے علم و ادب سے فطری مناسبت نظر آتی ہے اور ان کے شخصیت کے رنگارنگ پہلوؤں کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے اس مضمون میں ہم ان کی شاعری کے بارے میں عرض کرنا چاہتے ہیں اس باب میں انہوں نے اپنی ذہانت اور فنکاری کا ثبوت پیش کیا ہے اس سے کسی ذی علم کو انکار ممکن نہیں۔

اشعار میں موصوف کی زبان سادہ اور بامحاورہ ہے شیرازی گفتار، ندرت بیانی، تشبیہات اور استعاروں کا برعمل استعمال فاروق شاہپوری کے فن اور ان کی بالغ النظری کی عکاسی کرتے ہیں۔ دوست ہی دوست کے اقتاد طبع سے واقف ہوتا ہے خود از شخص کسی غیر کے سلئے ہاتھ نہیں پھیلاتا کیونکہ یہ بات شان خود داری کے خلاف ہے دوستوں کا کرم دشمنوں کے ستم سے زیادہ گراں ہوتا ہے اس نزاکت کو کس خوبی سے اس شعر میں ڈھالا گیا ہے ملاحظہ ہو۔

دوست کے اگے بڑھاؤں کس طرح دست طلب

مانگنے کی ایسے دلیوں سے نہیں عادت مجھے

محبوب کی گل کا تجرہ یہ فاروق صاحب کس حسین پیرائے میں کیا ہے صبا کی پریشانی سے جو جس اس شعر میں پیدا ہو گیا ہے یہ ان کے قادر الکلامی کی دلیل ہے اور صفت حسن تعلیل ہے۔

ترمے کو پچے سے جو آیا وہ پریشاں آیا
خاک اڑاتی ہوئی آئی جو صبا بھی آئی
محبوب کی ضد کو ادا سمجھ لیجئے عاشق کے لئے محبوب کی ادا
ہی سب کچھ ہے حسن اپنی فطرت سے مجبور ہے تو عشق اپنی عادت
سے یہ شعر نفسیاتی تجزیے کے مترادف ہے۔

کیا قیامت ہے کہ جب آپ بگڑ جاتے ہیں
وہی کرتے ہیں کہ جس بات پہ اڑ جاتے ہیں
محبت کی منزل سے گزرنا صرف دیوانوں ہی کا کام ہے اس
راہ میں اہل فرد تو کیا خضر بھی کام نہیں آتے اس شعر میں اسی طرف اشارہ ہے
خضر جس کا راستہ بتلا سکیں

وادی الفت کی وہ منزل نہیں
کس کا احسان لینا ایک عزت مند انسان کے لئے کسی طرح
مناسب نہیں دوسروں کے اگے وہی ہاتھ پھیلاتے ہیں جنہیں خدا
پر بھروسہ نہیں ہوتا یعنی جو طرفت خالی ہوتا ہے وہی صدا دیتا ہے۔
قید و بند کی زندگی کو آزادی سے بہتر تصور کرتے ہیں ذیل کے اشعار
میں ان باتوں کا عکس ملاحظہ ہو۔

درد خود احسان پیہم کس لئے ہوں اور کا

ہے تہی ظرفوں سے پتھ پوچھو تو بیزاری مجھے

بار منت لے کے آزادی جو قید غم سے ہو

اس سے تو بہتر ہے سو درجہ گرفتاری مجھے

خاک کی صورت نہیں آتی ہے سراٹھاندگی

رکعتی ہے دوش صبا پر طرز خود داری مجھے

اس شعر میں لطف زبان کے ساتھ ساتھ شباب اپنے پیرائے

استیعاب ملاحظہ ہو۔

یہ دیدہ دلیری رقیبوں کے ساتھ

شباب آتے ہی تم کو کیا ہو گیا

اُردو شاعری تصوف کے آب و ہوا میں پروان پر طس ہے اس

لئے تصوف کا رنگ اشعار میں اُجانا لازمی بات ہے کیا لطیف شعر فرمایا ہے حوالہ قلم کرتا ہوں۔

اللہ اللہ کیا فروغ جلوۂ جہان ہے
سامنے جس کے چراغِ طہاک پر دانہ ہے

رندوں کی غفلت و احترام کے اشعار غالب۔ جگر۔ ریاض
خیر گبادی وغیرہ کی یہاں پائے جاتے ہیں فاروق صاحبِ شعر پر
بھی نظر ڈالتے چلے۔

ہوں وہ مست اگر دُخ کروں میکے کا
تو ساقی مجھے بڑھ کے لے دس قدم سے

چند اشعار اور دیکھیں ان میں تدرت کلام کیساتھ ساتھ آپ
لفظ زبان بھی پائیں گے۔

کیا شکر بھی تو گلا ہو گیب
بھلائی بھی کرتا بُرا ہو گیا

یہ آزاد کیا ہو گا قیدِ الم سے
ہے انساں کے پیکر کی تعمیرِ غم سے

روئے والے روئیں کیا مرگ تمنا کے لئے
شام سے پہلے چراغِ اُردو ٹھنڈے ہوئے

اللہ یہ دستِ درازی تری جنوں
دامن جو کل نہیں تھا تو اُج اُسیتیں نہیں

وطن سے دور غریب الوطنی میں یادِ وطن سو ہاں روح ہوتی

ہے جس کا احساس فاروق صاحب کو بھی ہے وہ فرماتے ہیں۔

وہ جلسے یاد آتے ہیں وہ باتیں یاد آتی ہیں

وطن والوں کو ہم فاروق جسدِ یاد کہتے ہیں

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اہل وطن ہی کو یہ یقین
ابتدائی دور میں نہ ہوتا رہا ہو گا کہ یہ کلام خود انہیں کے کاوشِ قلم
کا نتیجہ ہیں۔ جیسا کہ ان کی ایک غزل کے مقطع سے ظاہر ہوتا ہے۔

جانے کہ نہ جانے کوئی مانے کہ نہ مانے

شاعر تو ہیں فاروق ہم اللہ کے در سے

ذاکراور اعظم کے بعد شاہ پوری میں شیخ شاعری کو آپ نے گردش

میں رکھا اور بڑے عزم و حوصلے سے جو کہا تھا کہ دکھایا

اب کہاں سودائے الفت و حشمت و دیوانگی

وہ زمانہ اب کہاں وہ تم نہیں وہ ہم نہیں

اب ہماری ذات مشہور ہو گا "مشاہد پور"

مگر کیا فاروق اگر ذاکر نہیں اعظم نہیں

مختصر یہ کہ فاروق شاہ پوری ایک جامع الصفات ادیب شاعر

ہیں انہوں نے ایک دو سال نہیں ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں

گزاری ہے، عوام نہ سہی خواص ضرور ان کے نام اور کام سے واقف

ہیں ان کے تحقیقی مقالات، علمی مضامین اور تنقیدی شہرِ پادے انیسویں

صدی عیسوی کے نصفِ اول کے ادبی رسائل میں بکھرے پڑے

ہیں نظمیں اور غزلیں مستزاد ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی

شخص ان بکھرے ہوئے جواہرِ پادوں کی طرف توجہ کرے اور انہیں ایک

لڑی میں پرو کر ایسی مالا بنادے جو فاروق شاہ پوری اور اردو ادب

دونوں کے لئے یادگار ہو جائے پ

غزل

رشید سلیم سمیں

شام تنہا ہے تو شب اور بھی دیراں ہوگی
 صبح ہوگی تو بہت بے سرو ساماں ہوگی
 ابریر سا ہے جو سیلاب کی صورت اب کے
 مدّتوں اب نہ کبھی خواہش باراں ہوگی
 اور ہر شے کی طرح جنس وفا بھی ہے گراں
 جانے کس شہر کے بازار میں ارزاں ہوگی
 چاند آئین کی منڈیروں پر تو اُترا ہوگا
 چاندنی صحن کی دیواروں پر لرزاں ہوگی
 لحظہ لحظہ کوئی آہٹ ہے اُترتی دل میں
 خواہش قرب ملاقات کی خواہاں ہوگی
 شام سے پھیل گئے درد کے گہرے سائے
 آج کی شب میرے گھر کی شب زنداں ہوگی
 آپ مائل بہ کرم ہوں نہ خدا سا ہم پر
 اپنی بے مائگی کچھ اور نسیاں ہوگی
 اب تو الزام ہی ٹھہرا ہے مقدر اپنا
 زندگی کیوں نہ میرے حال پر گریاں ہوگی!
 پھر وہی عرض تمنا، وہی بے تابئی شوق
 آمدِ فصل گل و موج بہاراں ہوگی!!

اسرار و رموز

ڈاکٹر ناظر حسن زبیدی

کو اسلامی خلافت کی تباہی سمجھا اور اس کی بحالی کے لئے پورے ملک میں تحریک خلافت چلائی گئی جس کے دوح رواں مولانا شوکت علی اور محمد علی تھے۔ غرض پورا عالم اسلام مایوسی اور ناکامی کا شکار ہو گیا۔ اس وقت قدرتا ہر مسلمان کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش کوئی مرد مجاہد میدان میں آئے اور ترکیہ، ایران، عرب اور ہندوستان کو برطانیہ کے فولا دی پنجے سے نجات دلوائے۔

اسی جذبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے علامہ نے انہی دنوں جمال الدین افغانی کی تحریک اتحاد عالم اسلام پر ۱۹۱۵ء میں مثنوی اسرار خودی اور ۱۹۱۸ء میں رموز بے خودی لکھی۔ اپنا پیغام کھڑے ملکوں تک پہنچانے کے لئے انہوں نے یہ مثنوی فارسی زبان میں لکھی کیونکہ فارسی زبان ایران کے علاوہ ترکیہ، عراق اور ہندوستان میں بھی سمجھی جاتی تھی۔ اس کا آغاز مولانا جلال الدین رومی کے ان دلولہ انگریز شعرا سے کیا جن کا مضمون یہ ہے کہ کل شیخ اسلام دن دہاڑے چراغ ہاتھ میں لئے گھوم رہا تھا۔ میں نے پوچھا حضرت آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟ بولا کہ میں سیوانوں اور سوجاؤں کے ساتھ رہتے رہتے بزار ہو گیا ہوں۔ اب مجھے کسی انسان کی تلاش ہے۔

تاریخ عالم میں بیسویں صدی وہ زمانہ ہے جب یورپ کی تمام قومیں خود نمائی، تسخیر اور غلبے کی خواہش میں گرفتار ہو کر مشرقی ممالک کو اپنی جولان گاہ بنائے ہوئے تھیں۔ برصغیر ہندوستان میں انگریزی اقتدار انتہا کو پہنچ چکا تھا اور ان کی ترقی دیکھ دیکھ کر یورپ کی دوسری قوموں کو رشک و حسد ہوتا تھا کہ ہم بھی تجارتی اور سیاسی میدان میں انگریزوں کے برابر آجائیں۔ رشک اور ہمسری کے اس جذبہ کی وجہ سے پہلی جنگ عظیم برپا ہوئی جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔ اس جنگ میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی اور ان کے مخالفوں کو جن میں جرمنوں کے علاوہ ترک قوم بھی شامل تھی شکست ہوئی۔ ترکیہ کی عظیم حکومت کے جو اسلامی خلافت کی یادگار اور مرکز تھی، ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، ایران کی سلطنت کمزور ہوتے ہوئے جہاں بلب ہو گئی۔ مصر پہلے ہی برطانیہ کے زیر اقتدار تھا غرض پوری اسلامی دنیا پر انفرنگی، مروتی اور تباہی چھا گئی۔

ہندوستان نے اس جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا لیکن برطانوی سرکام نے آزادی دینے کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہ ہوا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکی سلطان کے شکست کھانے

مرسلے متعین کئے ہیں۔ انہوں نے ان کا نام اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الہی رکھا ہے۔ اطاعت سے مراد یہ ہے کہ انسان کے لئے اس کے روحانی پیشواؤں یعنی پیغمبروں نے جو آئین مرتب کیا ہے اور جسے عام اصطلاح میں مذہب کہتے ہیں وہ اس کی پابندی بخشتی ہے کرے۔ ضبط نفس سے یہ مراد ہے کہ وہ تمام بری باتیں جو ہر مذہب میں ناجائز سمجھی جاتی ہیں۔ ان سے اجتناب کرے اور نیابت الہی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی روحانی قوتوں کو ترقی دے کہ وہ صفات پیدا کرے جو خدا کی ذات میں ہیں یعنی اس میں قہر و غضب، رحم و کرم، لطف و عنایت، رزاقی، جہاں بانی اور تغیر فطرت کے اوصاف پیدا ہو جائیں۔

وہ تمام عادتیں اور رجحان جو صدیوں کی غلامی کی وجہ سے مسلمان ملکوں میں پیدا ہو گئے ہیں ان کی اصلاح ہو جائے۔ غلط تصورات اور صبر و قناعت کے غلط مفہوم نے مسلمانوں کو بے عمل کر دیا ہے۔ انہیں دوبارہ ذوق عمل سے آشنا کیا جائے۔ یہ صفات پیدا کرنے کیلئے علامہ نے توحید کو پہلا اصول قرار دیا ہے کیونکہ اگر انسان خدائے واحد کی معرفت حاصل کرے تو اسے ہر طرح کے خوف سے نجات مل جاتی ہے۔ پھر وہ بادشاہوں کے سامنے بھی گون نہیں جھکاتا۔ علامہ کے اشعار اس سلسلے میں یہ ہیں:

تا معصائے لالہ داری بدست
ہر طلسم خوف را خواہی شکست

ہر کہ حق باشد چو جان اندر تنش
خیم نگرود پیشش باطل گردنش

خوف را در سینه ادراہ نیست
خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست

اطاعت اور توحید کے سلسلے میں علامہ مغفور نے یہ نکتے بھی سمجھائے ہیں کہ جو شخص دل سے لا الہ الا اللہ کا قائل ہوتا ہے

میرے رفیق کسست قدم ہیں۔ میری آرزو ہے کہ کوئی دستم یا شیر خدا جیسا کوئی جو اس مرد مجھے مل جائے۔ میں نے کہا تلاش میں نے بہت کی لیکن شیر خدا علی سے ترقی اور رستم دستان جیسے آدمی کہیں نظر نہیں آتے۔ شیخ نے کہا جو چیز ہمیں ملتی نہ ملے میرے دل میں آرزو ہی ایسی چیز کی ہے جو میرے آسکے۔ مثنوی اصرار و رموز کے سرورق پر لکھے ہوئے اشعار یہ ہیں:

دی شیخ با چراغ ہے گشت گرد شہر
کز دام و دود مولم و لالہ آرزوست
زین ہر جان کسست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نہ شود جستنہ ایم ما
گفت آن کہ یافت می نہ شود آتم آرزوست

ان اشعار کے پڑھنے میں بلکہ پوری مثنوی اصرار و رموز کے پس منظر میں یہی جذبہ اور خواہش جلوہ گر کی رہی ہے کہ کوئی مرد مجاہد میدان میں آئے اور شرقی اقوام بالخصوص مسلمانوں کو برطانوی اقتدار سے نجات دلوائے۔ اور جب تک کوئی ایسا مرد کامل نمودار نہیں ہوتا، ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی حالت کو بہتر کرے، اپنی اخلاقی اور روحانی قوتوں کو ترقی دے اور چونکہ انسان کو خدا کا خلیفہ یا نائب کہا جاتا ہے لہذا وہ اپنے اندر ایسی صفات پیدا کرے جو اسے غلامی سے نکال کر کے آزاد، غیرت مند اور باعزت مسلمان بنادیں۔ انہی صفات کے مجموعے کو علامہ اقبال نے لفظ ”خودی“ سے تعبیر کیا ہے یعنی مسلمان اپنا درجہ پہچانے کہ وہ خدا کا نائب ہے اور اپنے اندر خدائے پاک کی صفات پیدا کرے جن میں قہاری و بخاری و قدوسی و جبروت جیسے عناصر شامل ہیں تاکہ اسے غیروں کی غلامی سے نجات مل جائے۔

انسان کی خودی کو بیدار کرنے کے لئے اور اسے خود شنائی کے ادبچے زینے تک پہنچانے کے واسطے علامہ نے خودی کے تین

اسے نہ فرزند و زن کی محبت باقی رہتی ہے نہ اہل و عیال کا فکر ہوتا ہے بلکہ وہ ہر وقت اپنے رب کی اطاعت کرتا ہے۔ جب حکم ملتا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح وطن کو چھوڑ کر مکے کے بے آب و گیاہ میدان میں رہنے لگتا ہے اور اپنے اکلوتے بیٹے کے حلق پر پھیری پھرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ حضرت علیؓ کی طرح وہ کائنات پر حکومت کرتا ہے، آفتاب اس کے اشارے سے پلٹ آتا ہے اور رزم حق و باطل میں وہ تنہا پورے لشکر کے سامنے آتا ہے یعنی علامہ کے الفاظ میں اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

ہر کہ در اقلیم لا آباد شد

فارغ از بند زن و اولاد شد

می کند از ما سوا قطع نظر

می نهد سا طور بر حلق پیر

گردش ایام را بر ہم زند

چرخ نیلی فام را بر ہم زند

اپنی ان قوتوں کے باوجود یہ شخص، نماز، روزے، حج، زکوٰۃ اور جہاد کا پابند ہوتا ہے کیونکہ نماز سے اس کا دل ظاہر ہوتا ہے۔ روزے سے نفس امارہ کی سرکشی ختم ہو جاتی ہے۔ حج سے وہ ایک مرکز پر جمع ہونا سیکھتا ہے۔ زکوٰۃ سے یہ فائدہ ہے کہ انسان کے دل سے دولت کی ہوس نکل جاتی ہے اور غریبوں کو سہارا ملتا ہے اور تمام انسانوں میں مساوات کا رنگ آتا ہے۔ جہاد کے معنی یہ ہیں کہ جب باطل کی گٹھائیں سپاروں طرف سے امنڈ کر آجائیں تو ایک غیرت مند انسان کی طرح مسلمان کا فرض ہے کہ وہ باطل کے خلاف سینہ سپر ہو جائے اور اپنی جان عزیز عدا کی راہ میں قربان کر دے۔ مثنوی اسرار و رموز کے اشعار آپ حضرات کی مزید رہبری کریں گے

لا الہ الا اللہ صمد گو ہر نماز

قلب مسلم را حج اصغر نماز

مومنان را فطرت افزا است حج

بہرت آموز و وطن سواست حج

جب دولت را فنا سازد زکوٰۃ

ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

دل ز سحتی تنفقوا محکم کند

زر فزاید الفت زر کم کند

دولت اور وطن دو ایسی چیزیں ہیں کہ انسان ان کے سبب میں چنسن کر رہ سکتا ہے۔ لیکن مسلمان ان پھندوں میں گرفتار نہیں ہوتا۔

ما کہ از قید وطن بیگانه ایم

چوں نگاہ نور دو چشم و یکیم

مست چشم ساقی بطح سیم

در جہاں مثل مے و مینا سیم

امتیازات نسب را پاک سوخت

آتش او این خس و خاشاک سوخت

جب انسان ان مرحلوں سے گزر سکتا ہے تو اس میں نیت الہی کا یا خلیفہ رحمان بننے کا جو ہر پیرا ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس کی تمام خواہش اور سارے افعال خدا کی رضا مندی کے لئے ہوتے ہیں اس لئے خدا بھی اس سے راضی ہوتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جب اس کے تمام افعال کو خدائے پاک اپنا فعل قرار دیتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں خدا خود بندے سے پوچھتا ہے کہ تیری رضا کیا ہے۔ یہی وہ درجہ ہے جب انسان کے نالوں کا جواب افلاک سے آتا ہے۔ حجاب اٹھتے ہیں، خطاب ہوتا ہے اور انسان اپنے رب کی بارگاہ میں باریاب ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ خودی جس کی تعلیم علامہ اقبال نے اسرار رموز کے علاوہ پیام شرق، زبور مجسم، بال جبریل اور ضرب کلیم میں بھی دی ہے ان خیالات پر مبنی ہے جو انہوں نے قیام یورپ کے دوران میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یورپ کے مفکروں سے

ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۶ء

نئے عالموں اور نئی دنیاؤں کی تلاش بلکہ نئی کائنات کی تحقیق کا منصوبہ بناتا ہے۔

بساطے کا اندر و طرح دو عالمی توازن کردن
بدست آورده ام اندازہ دہکار نمی باید

ان پر سب سے زیادہ اثر مولانا جلال الدین رومی کا ہے جن کی تعلیم کو وہ تمام مسائل کا حل قرار دیتے ہیں۔ اکثر اشعار میں وہ رومی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور ہر مغرب زدہ مسلمان سے کہتے ہیں کہ اگر تم تہذیب مغرب کے حال سے نکلنا چاہتے ہو تو رومی کا مطالعہ کرو۔ یہ اشعار ان کی عقیدت کو ظاہر کرتے ہیں۔

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا
قری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فوں
ایک جگہ بڑی حسرت سے کہتے ہیں کہ،
نہ اٹھا پھر کوئی رومی غم کے لالہ نزاروں سے
دہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

رومی کی مثنوی معنوی ان کی نگاہ میں مثنوی اور رومی کی عزیز ہیں۔ دیوان شمس تبریز کے نام سے مشہور ہیں ان کے مطالعے میں ہمیں بہت سے اشعار کی گنجائش نہیں۔ یہاں رومی کا ایک شعر جو ان کو تسخیر کائنات کی دعوت دیتا ہے اور جس سے تعمیر خودی کا سبق ملتا ہے درج کرتا مناسب ہے اس شعر میں رومی نے اپنے سے کہا ہے کہ اے پتے تو شاخ کے اندر بند تھا تو نے اپنی ذوق نمود اور کوشش پیہم سے شاخ کو توڑا اور کوئل بن کر باہر نکل آیا مجھے بھی یہی ترکیب بتا دے تاکہ میں اس جسم خاکی کے زندان سے نکل کر اور خواہشات نفسانی کے جنگل سے چھوٹ کر اپنی شخصیت کا صحیح سبلوہ دکھا دوں۔ شعر یہ ہے۔

اے برگ قوت یافتی تا شاخ را بشکافتی
چوں رستی از زندان بگو تا من دریں جس آن کنم
قرآن پاک کی تعلیم سے انہوں نے معراج کا سبق سیکھا تھا

حاصل کئے۔ خلیفہ عبدالجلیل نے اپنی تصنیف فکر اقبال میں لکھا ہے کہ اس فریضہ میں نٹنے کا اثر بہت نمایاں ہے۔ مجھے بڑے ادیب کے ساتھ اس بات سے اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ اقبال ایک صوفی اور عابد و زاہد آدمی کے بیٹے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر میں اسلامی تصوف اور فقر کے اصول سنے تھے۔ اپنے زمانے کے دستور کے مطابق انہوں نے قرآن پڑھا تھا اور اپنے استاد میر حسن سیالکوٹی کی تعلیم کی بدولت وہ عربی پر خاصہ عبور رکھتے تھے اور فارسی میں کامل تھے۔ انہوں نے کلام اللہ کی ان تمام تعلیمات سے سبق لیا تھا جو انسان کو ثراقت، خود شناسی، اخلاق حمیدہ اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کا درس دیتی ہیں۔ کلام اللہ میں سبجا لاف تعداد، لاتخلفوا اور لا یخلف الیعاد وغیرہ کی تعلیم ملتی ہے، جو انسان کو مومن، کامل اور مرد کامل بناتی ہے۔ علاوہ ازیں خود شناسی، خود گردی اور تسخیر فطرت کے متعلق انہوں نے عربی، رومی اور سنائی کے کلام سے بھی اثر لیا تھا وہ عربی کو اتنا بڑا صاحب فکر و تخیل سمجھتے تھے کہ جس کے خیالات پر حیرت خاں سینا و فارابی تصدیق ہوتا تھا۔

رومی وہ مرشد کامل ہے جس نے اقبال کو مطالعہ نفس و ذات سے آشنا کیا۔ سنائی نے اس کے واسطے اپنی کلیات کا بحر بیکراں دیا۔ جس کے ادب میں انہوں نے خوب خواصی کی اور ہزاروں لولؤ لالہ حاصل کئے۔ یہاں برسیل تذکرہ ان شعراء کے کچھ اشعار پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے ان کے بلند افکار، رفعت تخیل اور گیرائی ذہن کا اندازہ ہو گا۔ عربی کا وہ شعر ہم سب کو یاد ہے جس میں وہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر سننے والے ذوق فہم نہ رکھتے ہوں تو اپنی رائے اور زیادہ تند و تیز کر دیں۔ یہ شعر جسے بانگ درا میں تفصیل کیا ہے اور جو انسان کو سخت کوشش کی تعلیم دیتا ہے یہ ہے۔

تو ارا تلخ قومی زن چو ذوق نغمہ کم یابی
سدری را تیز قومی خواں چو محل را گراں بینی
لیکن عربی کے بعض روح پرور اشعار اور بھی ہیں جن میں وہ

اور شعر نے ایران کے اثر سے خودی کے نکتے ذہن نشین کئے تھے۔ ان کے اردو کلام سے یہ اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کے مروج نفس، اس کے امکانات اور اس کے رتبہ عظیم سے کس قدر آگاہ تھے۔ اشعار ملاحظہ کیجئے

دے دلوں شوقی جسے لذت پر داز

کر سکتا ہے وہ ذرہ مر دہر کو تاراج

ناوک ہے مسلمان دہت اس کا ہے ثریا

ہے ستر سرا پر دہ جہاں نکتہ معراج

سبق بلا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے

کہ عالم بشریت کی زمین ہے گردوں

ہا وید تائے میں انہوں نے افلاک پر اپنی روحانی سیر اور مختلف زمانوں کی جلیل القدر مستیوں سے اپنی ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ ایسے بلند نظر شاعر کے متعلق ہمارا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ نیشے سے متاثر تھا۔ ان پر اسلامی تعلیم کا رنگ اتنا چڑھ چکا تھا کہ انہیں نیشے سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بلکہ انہوں نے ایک شعر میں بیان کیا ہے کہ اگر نیشے میرے زمانے میں زندہ ہوتا تو میں اسے اللہ کی معرفت کا سبق خوب پڑھاتا اور مقام کبریا سے آگاہ کرتا

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زلزلے میں

تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

علامہ اقبال کو عرفانِ نفس اور خود شناسی کا وہ مقام حاصل

ہو چکا تھا جب انسان اپنے آپ کو خدا لڑے قادر کا نمائندہ بلکہ رفیق

سمجھتا ہے۔ ان کا یہ مصرع بہت مشہور ہے

خدا ہم در تلاش آدمی ہست

ایک اردو شعر میں ان کا یہ ناز بندگی امتہا کو پہنچ گیا ہے

جس میں وہ بندگی کو خدائی سے بھی بہتر سمجھتے ہیں

مقام بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی

مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

ایک فارسی شعر میں اس سے بھی زیادہ پر لطف بات کہی ہے یعنی خدا نے پاک نے انسان کو کہیں کھو دیا ہے۔ اب اسے گم کرنے کے بعد وہ اسے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح انسان آرزو کے دام میں گرفتار ہے خدا کی ذات بھی آرزو و مسندی سے خالی نہیں ہے

ما از خدائے گم شدہ ایم ادب جستجو مست

چوں ما نیا ساز مند و گرفتار آرزو مست

یہی انسانیت کی وہ معراج ہے جس طرف اقبال ہر انسان کو لے جانا چاہتا ہے۔ اس نخیل کو نیشے کے مردہ کامل یا فوق البشر سے کوئی واسطہ نہیں۔ ذاقبال کو یہ ضرورت تھی کہ وہ مردہ کامل کا تصور کر لے یا نمونہ پیش کرنے کے لئے نیشے کی گدائی کرتا۔ علامہ کی نگاہ میں حضور سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ کی ذات تھی جنہوں نے ساری دنیا کو کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس کا سبق دیا۔ ان کی ذات میں حضرت محمد مصطفیٰ کا سنا ندان یعنی وہ اہلبیت تھے جن کی زندگی تقویٰ و طہارت، شرافت و شجاعت اور حکمت و سخاوت کا بہترین پیکر تھی۔ ہر صاحب بصیرت کی طرح علامہ کی نگاہ میں اہلبیت اطہار کی سیرت عالیہ تھی بالخصوص مولا علی مرتضیٰ جن کے نام نامی کو علامہ اقبال محزون اسرار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اسرار خودی میں حضرت علی مرتضیٰ کی صفات کو انہوں نے بڑے والہانہ انداز میں پیش کیا ہے

از رسالت در جہاں تکوین ما

از رسالت دین ما آئین ما

طرح عشق انداز اندر جان خویش

تازہ کن با مصطفیٰ پیمان خویش

کی ذاتِ عشق کی معراج ہے۔ یہ عشق مختلف شکلوں میں جلوہ گری کرتا ہے۔ کبھی آتشِ فروغ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کود پڑتا ہے جبکہ عقلِ تماشائے لبِ بام میں محو رہتی ہے۔ کبھی فرعون جیسے سرکش و قہار بادشاہوں کے دربار میں کلمہ حق کہہ گزرتا ہے، کبھی سرمایہٴ محراب و منبر بن سہاتا ہے، کبھی خیر شکنی کرتا ہے، عزمِ جہل کہیں حق و باطل کی پیکار ہوتی ہے عشق وہاں بے تیغ و براتی آتا ہے۔ علامہ کی نگاہ میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی نسل میں عشق و شہادت کا سبذہ ادل سے آخر تک قائم رہا ہے۔ داستانِ حرمِ غریبہ سادہ و رنگین ہے جو ابراہیم و اسماعیل سے شروع ہوتی ہے اور امام حسینؑ کی ذات پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس ذاتِ گرامی سے اقبال کو جو والہانہ لگاؤ ہے اس کا اندازہ رموزِ بے خودی کے ان اشعار سے کیجئے جن میں انہوں نے اہلبیت سے عشق اور ان کی پیروی کو دین و ایمان کی شرط قرار دیا ہے۔

آں امام عاشقان پور بتول

مرو آزادے زبستان رسول

اللہ اللہ بے بسم اللہ پدر

معنی ذبحِ عظیم آمد پسر

مرکز و عشق بغیر از خون او

شوخی این مصرع از مضمون او

برزمن کر بلا بارید و رفت

لالہ حا در خاک ماکارید و رفت

نقش اللہ بر صحرانوش

سطر معنای نجات سانش

رمز قرآن از حسینؑ موعظ

ز آتش او شعلہ اندوختیم

تار ما از زخم آتش لرزل ہنوز

تازہ از تکبیر او ایمل ہنوز

حریت زاد از ضمیر پاک او

این سہ نوشیں چکید از تاک او

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد

بر رسول ما رسالت ختم کرد

کل مومن اخو، اندر دلش

حریت سرمایہٴ آب و گلش

در جہاں وابستہٴ دینش حیات

نیست ممکن جز بہ آئینش حیات

مسلم اول شہ مرداں علی

عشق را سرمایہٴ ایماں علی

از ولایت دودمانش زندہ ام

ہجگو گوہر در جہاں تابندہ ام

از رخ او فال پیغمبر گرفت

ملت حق از شکوہش فرگرفت

قوت دین میں فرمودہ اش

کائنات اٹیں پذیر از دودہ اش

مرسل حق کرد نامش بو تراب

حق ید اللہ خواند در ام کتاب

زیر پاش اینجا شکوہ خبر است

دست او آنجا تقسیم کوثر است

ذات او دروازہٴ شہسور علوم

زیر فرمانش حجاز و چین و روم

علامہ کی نگاہ میں مرد کامل کا ایک اور نمونہ امام حسین علیہ السلام

کی ذات ہے جنہوں نے ایمان اور اصول کو قائم رکھنے کے لئے اپنے خاندان اور دوستوں کو قربان کر دیا۔ علامہ کی نگاہ میں امام علیہ السلام

اس کی مشیتِ خاکِ ثریا اور کہکشاں سے بلند ہے۔ اگرچہ افلاطون اور ارسطو کی سی تصانیف اس نے نہیں لکھیں لیکن ارسطو اور افلاطون نے اسی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے شایا سے مشیتِ خاکِ اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ ممکنوں
مکالماتِ فلاطون نہ لکھ سکی بسکین
اسی کے شعلے سے ٹوٹا سحرِ افلاطون

ان تمام باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے علامہ نے عورت کے منصب کو منصبِ نبوت سے تشبیہ دی ہے انہوں نے رسولِ کریم کی ایک حدیث کا بھی حوالہ دیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ غرض عورت کے احترام کے تمام حق وادائے کئے ہیں۔ اشعار یہ ہیں

نیک اگر بینی امومتِ رحمت است
زانکہ اور با باموتِ نسبت است

شفقت اور شفقتِ پیغمبرِ راست
سیرتِ اقوامِ را صورتِ نگر است
گفت آں مقصودِ حرفِ کن نکاں
زیرِ پائے امہاتِ آمدِ جنناں

عورت میں شفقت ہو تو زرد رُو کمزور ماں اُن تہذیب یافتہ
فرمنِ فراموش لڑکیوں سے بہتر ہے جو خانہ داری اور تربیتِ اولاد
کی ذمہ داری یا تخلیقِ اولاد کے فریضے کو وبال سمجھتی ہیں۔

عورتوں کیلئے علامہ نے بہترین نمونہ حضرت فاطمہ زہرا کو قرار
دیا ہے اور وضاحت کی ہے کہ جنابِ مریم کو تو ایک ہی شرف
حاصل ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ تھیں۔ جناب
فاطمہ سلام اللہ علیہا کو تین شرف حاصل ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ رسولِ پاک

اے صبا اے بیک دور افتاد گاہ

اشکِ ماہِ رخسارِ پاک اور ساں

غرض علامہ اقبال نے خودی، ایمان اور قلندر کی کانسیمہ ہی نہیں
بتایا بلکہ ان مقدس ہستیوں سے روشناس بھی کرا دیا ہے جو فقرِ غیور اور
ایمان کا نمونہ تھے۔ وہ اپنی کثرتِ تصانیف میں ان حضرات کے نام بڑے
ادب سے لیتا ہے۔ یہاں ایک دو نام آپ کے سامنے پیش کر دیتا
مناسب ہوگا۔

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دل مرتضیٰ سونہ صدیق دے

دل بیدار فاروقی دل بیدارِ لاری
مس آدم کے حق میں کیلے طہ کی بیلاری

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا زورِ حیدر، فقرِ بوفہ، صدقِ سلمانی

اب تک ان اشخاص کا ذکر ہوا جنہیں اقبال مومن کامل، مرد
کامل، مرد حق یا قلندر کہہ کر پکارتا ہے۔ اسرار و رموز کے آخر میں
علامہ نے مسلمان عورت کا مرتبہ بھی متعین کیا ہے اور بتایا ہے کہ
یہ مخلوق جسے ہم صفتِ مذکر کہتے ہیں اپنی نزاکت اور لطافت
کے باوجود دنیا کی بہت بڑی خدمت کرتی ہے۔ نبی، ولی، پیر،
پیغمبر، عالم، فاضل، فلسفی سب اسی کی آغوش میں پل کر جوان ہوتے
ہیں۔ علامہ نے براہِ راست قرآن اور حدیثِ رسولؐ سے زندگی
کے آداب سکھے ہیں۔ اس لئے ان کی نگاہ میں عورت کا درجہ نہایت
محترم اور قابلِ عزت ہے۔ یعنی وہ ماں کی صورت میں، بہن کے روپ
میں، بیٹی کی شکل میں یا بیوی کے پیکر میں غرض بہر صورت انسان
کی ہمدم ہے۔ اگرچہ اس میں مردانہ صلاحیت نہیں لیکن سیدہ کرار
اور حسین شہید جیسے بہادر اسی کی آغوش میں پلتے ہیں۔ شرافت میں

بے عمل پیدا ہو جائے، وہ دانش و حکمت جو اسے منفرد حیات سے دور کر دے، کسی طرح قابل تسلیم نہیں۔ اس مسئلے کو علامہ نے بہت ہی سادہ الفاظ میں پیش کیا ہے اور تخلیق مقاصد، جفاکشی اور سخت کوشی کو انسان کا نصب العین ٹھہرایا ہے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است

اصل او در آرزو پوشیدہ است

ماز تخلیق مقاصد زندہ ایم

از سشار آرزو تا بندہ ایم

سخت کوشی کا یہی فلسفہ انہوں نے بعد میں بال بھریل میں بھی پیش کیا ہے۔ ضربِ کلیم تو تمام تر اسی تسلیم سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض معترضوں نے ان پر فاسٹ ہونے کا الزام بھی لگا دیا۔ لیکن علامہ نہ جا رہے ہیں نہ ظالم۔ وہ انسان کو صلاحیت، سخت کوشی اور جفاکشی کی تعلیم دیتے ہیں کہ مرد کے لئے یہی چیز باعثِ فخر ہے۔ وہ فارسی کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان کا حوالہ دیتے ہوئے یہ اشعار پیش کرتے ہیں۔

ہے یاد مجھے نکتہ سلمان خوش آہنگ

دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لئے تنگ

چیتے کا جگر سپاہیئے شاہین کا تجس

جی سکتے ہیں بے روشنی دانش و فرنگ

بچہ شاہین سے کہتا تھا عتاب سالخور

اے نرے شہر پہ آساں رفتِ ہر رخ بریں

ہے شاب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگلیں

حضرت احمد مختار کی بیٹی ہیں۔ دوسرا شرف یہ کہ وہ حضرت علی مرتضیٰ کی شریکِ زندگی ہیں اور تیسری بزرگی یہ کہ وہ امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام جیسے شہزادوں کی والدہ محترمہ ہیں۔ ذیل کے اشعار میں علامہ نے یہ تمام فضائل بیان کئے ہیں۔

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز

از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز

نور چشمِ رحمتہ القاسمیں

آں امام اولین و آخرین

بانوئے آں تاجدارِ ہل اقی

مرتضیٰ مشکل کشا شیرِ خدا

مادر آں مرکزِ پرکارِ عشق

مادر آں کارواںِ سالارِ عشق

اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی میں خودی اور عشق کے علاوہ علامہ نے ذوقِ عمل کا درس بھی دیا ہے۔ وہ فلسفہ جو انسان کو کابل اور تن آسانی کا سبق دے یا جو اسے ذوقِ عمل سے عاری کر دے علامہ کے نزدیک مردود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے افلاطون کی بعض تعلیمات کو رہبانیت اور ترکِ دنیا سے تعبیر کیا ہے اور اسے ”راہبِ دیرینہ افلاطون حکیم، گوسفند از گوسفندانِ قدیم“ کہا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے حافظِ شیرازی کے کلام پر بھی اعتراضات کئے تھے کہ اس کی غزلوں میں رندی، سرمستی اور بیخودی کے ایسے معنائیں ہیں جو انسان کو آرام طلبی اور عیش پرستی پر مائل کر کے سخت کوشی سے دور کر دیتے ہیں لیکن حافظ کا نام شرواح سے لے کر آج تک اتنا مقبول رہا ہے کہ لوگوں کو علامہ کی یہ تنقید ناگوار گزری اور ہنگامے سے بچنے کے لئے انہوں نے ان اشعار کو اپنی مثنوی کے دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دیا تاہم اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کے اکثر اشعار سے یہ مضمون نکلتا ہے کہ وہ علم و دانش اور فلسفہ جو ذوقِ عمل سے انسان کو دور کر دے ہرگز قابلِ قبول نہیں۔ وہ علم جس سے انسان میں

دفتر ہے، عشق کا صحیفہ ہے اور انسانیت کا آئین ہے۔ علامہ نے اس مثنوی کو نہایت کرب کے عالم میں راتوں کو جاگ جاگ کر لکھا ہے۔ ان کا خون جسگر اس میں صرف ہوا اور یہ مثنوی شائع ہوتے ہی آج سے پچپن سال پہلے مشرق و مغرب میں مشہور ہوئی۔ ایمان میں اسے بڑے احترام سے پڑھا گیا۔ ترکیہ میں جہاں فارسی زبان بخوبی رائج تھی لوگوں نے اسے حرزِ جان بنایا۔ انگلستان میں ڈاکٹر نکلسن نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا جس سے امریکہ اور یورپ کے ممالک اس مردِ قلندر کے افکار سے بلکہ قرآن و حدیث کی تعلیم سے آشنا ہوئے آج یہ کتاب فارسی اور اردو کی اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں شامل ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ طلباء کے علاوہ یہ ہر مسلمان کے لئے دستورِ عمل کی حیثیت رکھتی ہے اور اگر میں اس کی صحیح تعریف کرنے کے لئے نظیری نیشاپوری کی ایک بیت پیش کر دوں تو وہ اس مضمون کے خاتمے کے لئے موزوں ہوگی، ۷

آغشتہ ایم ہر سرخالے بہ خونِ دل
قانونِ باغبانی صحرا نوشتہ ایم

چو کبوتر پر چھپنے میں مزہ ہے اے پیر
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

ان تعلیمات کے علاوہ اسرار و رموز میں بعض اور مفادِ عالیہ اور اخلاق کا بھی بیان ہے مثلاً توحید و عبادت کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا واقعہ لکھا ہے جس نے جنگی میں شیر کی دھاڑ سننے کے باوجود نماز ساری رکھی اور سلام پھیرنے کے بعد تلوار سے شیر کو ہلاک کر دیا اسی طرح سلطان مراد کا سال لکھا ہے جس نے ایک عمارت کو ناپسند کئے ہوئے معمار کا ہاتھ کٹوا دیا تھا۔ معمار نے قاضی کی کچہری میں فریاد کی اور قاضی نے بادشاہ کو بلا کر فرد جرم سنائی اور یہ فیصلہ کیا کہ اس ظلم کی پاداش میں بادشاہ سلطان مراد کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ ان تمام مثالوں سے اسلامی مساوات، عظمتِ انسان اور احترامِ آدمیت کا سبق علامہ نے ہمیں دیا ہے اور سمجھایا ہے کہ

باخبر شواہز مقامِ آدمی

اس گفتگو سے میری مراد یہ ہے کہ مثنوی اسرار و رموز کو محض وعظ و پند سمجھ لینا درست نہیں۔ یہ مثنوی ایمان کا



بونگا

فرخندہ لودھی

“WHAT DO YOU WANT CHILD?”

رشید وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ علما کو اپنی شرارت پر آپ ہی ہنسی آگئی۔

“NAUGHTY BOY?”

وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہی۔

سٹوڈنٹس یونین کے دفتر میں شیطان ٹولہ کسی آئندہ تقریب کے سلسلے میں جھگڑ رہا تھا۔ برآمدہ اُن کی آوازوں اور قہقہوں سے آباد تھا۔ رشید کسی بہانے پھر ادھر اُٹکلا۔ سیز میوں کے بل پر کھڑے کسی مابعلم نے غورہ لگایا۔
”بونگا اسی اونٹے“

رشید نے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا سارے چہرے اجنبی تھے۔ وہ جینٹلمن مٹانے کے لئے یونین کے دفتر میں گھستا چلا گیا۔ یہاں بھی کوئی اُس کا شناسا نہ تھا۔ وہ پرانے یار دوستوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اُس کی ماں اگر اُسے اپنا حاصل حیات تصور نہ کرتی تو ممکن ہے وہ بھی اس قدر بڑے شہر کی اتنی پرانے درس گاہ میں قدم نہ رکھ سکتا۔ قدرت نے اُسے حافظہ اچھا دیا تھا۔ نصیبی کتابیں صغیر و کبیر ذہن میں محفوظ ہو جاتیں۔ ہر امتحان میں کوئی نہ کوئی پوزیشن حاصل کر لیتا

کارہ میں اُسے ہونے ابھی اُسے چند ہفتے ہوئے تھے کہ اس کی مڈ بیٹر علما سے ہوئی۔ یونہی چلتے چلتے وہ انگریزی ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا نکلا۔ بونگا بلیا کی بیل کی اوٹ میں کھڑی علما شاید کسی کا انتظار کر رہی تھی ستمبر کی ڈھلتی دو پہر میں کوئی حُسن نہ تھا کسی قسم کی دلکشی نہ تھی۔ کہیں پھول نہ کھلے تھے تاہم جھک میں بسی ہوا اُس کے قریب سے گزری یا وہ خوشبو کے پاس سے گذرا۔ بہر کیف برآمدے میں خوشبو ڈول رہی تھی۔ وہ اس کا پتہ لگانے بڑھتا چلا گیا۔ تعاقب میں چکر لگاتا ’یو، شیب بروئڈ‘ کو عبور کر گیا۔ واپس آیا۔ علما وہیں کھڑی تھی۔ خوشبو اُس کے بدن سے پھوٹ رہی تھی۔ اب کے ذرا رک کر اُس نے علما کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ فیروزی رنگ کی لان کا ڈھیلا ڈھالا کرتا پسینے کے باعث علما کے کاندھوں سے چپکا ہوا تھا۔ گلابی ربن سے بندھے بندھے کے سے بال گودی گردن پر ہوئے ہوئے لڑ رہے تھے۔ علما اسے سراپا حسن اور خوشبو نظر آئی۔

انسان جہاں بھی ہو جیسے حالات میں بھی ہوا اپنے لئے دلکشی کے سامان پیدا کر لیتا ہے زندگی یہی ہے کہ دل کھینچتا رہے۔ جب وہ کششِ دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتی یا علما کے پاس سے گذرا تو علما نے اُسے روک لیا اور انگریزی میں پوچھا۔

”میں کہہ رہی ہوں۔ میرا رشید کالج میں پڑھے گا۔“

”اے۔ ٹڈی کو بھی میلے کا چاؤ چڑھا۔“

فیضان کی ساس نے شوہر کو متوجہ کرتے ہوئے کہا اور وہ کھٹے گڑ گولتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ فیضان جب بھی تھی تب تھی اب وہ بہو ہے اور وہ بھی بیوہ۔ اسے عقل سے کام لینا چاہیے۔ فیضان کا باپ اس وقت سر جھکائے چارپائی کے باں پر بے مقصد انگلیاں پھیر رہا تھا اور خاموش تھا چند ثانیے اس طرح گزرے تو فیضان کی ماں افسردہ لمبے میں بولی۔

”فیضان! دیجیے۔ تیرا کون ختم زندہ ہے جو تو ناز کرے گی اور لڑکے کو کرائے گی۔ تیرے باپ اور تایا جو فیصلہ کریں تیرے فائدہ ہی کا ہوگا۔ برے وقت میں سب پرانے میری بچی۔“

”اچھا اچھا۔ تو تم سب پرانے ہو؟ یہ مجھے آج پتہ چلا کاش۔ کاش۔“ فیضان نے دو تین دو ہنٹر اپنے سر پر مارے منہ پر تلنے مارتی دیوانہ وار رشید کی طرف بڑھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔

جیل پتھر چلی۔ ابھی چلی۔ یہ ہمارے کچھ نہیں ہوتے۔ ارے میں کم سن کی لالچ سنبھالے رہی جو میرے اپنے نہ تھے۔“

رشید ماں کو بین کرتے دیکھ کر دھاڑیں مارنے لگا۔ پندہ سولہ برس کا لڑکا جس کی ابھی چند دن پہلے آواز ٹوٹی تھی ”بھائی بھائی“ رورہا تھا۔ پاس پڑوس کی عورتیں مرد بچے دوڑے آئے۔ عورتوں نے فیضان کو گھیر لیا۔ ”پاگل ہو گئی ہے۔ ساری عمر کی رکھی رکھائی یوں غارت کر رہی ہو۔ ہائے تو تو گائے تھی۔“ تجھے کیا ہوا؟

”میں گائے ہوں نہ بکری۔ ایک تو جوان بیٹے کی ماں ہوں اور

میرا اس کے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔“

فیضان نے اپنے گرد جمع عورتوں کو دھتکار دیا۔

”جاؤ۔ اپنے اپنے گھروں کو۔ تماشا دیکھنے آئی ہو چڑھو! مارا

عمر تماشا دیکھتی رہیں ہو۔ جی نہیں بھرا۔“

فیضان نے رشید کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ماں بیٹا سست

تھا۔ شہر میں وہ کر تعلیم حاصل کرنے کا شوق اُس سے زیادہ اُس کی ماں کو تھا۔

جب رشید کے دادا نے کہا کہ بیٹا پتھر پڑھے تو اُس نے کوئی احتجاج نہ کیا بلکہ کہا ٹھیک ہے۔ ”نانا اُسے سکول ماسٹر بنانا چاہتے تھے اُسے نانا کی ہاں میں ہاں ملا دی اور کہا یہ بھی ٹھیک ہے۔“ دونوں بزرگوار اصل میں اسے جلد اہل کادر بنانا چاہتے تھے۔ اس کی ماں فیضان کو سسر کی بات پسند تھی نہ باپ کی۔ ان بزرگوں کو قائل کرنے کے لئے فیضان نے جو طریقہ اختیار کیا وہ عام طور پر اثر انگیز ہی ہوتا ہے۔ بزرگ جوانوں کے اُن جذباتی مظاہروں میں خام دلچسپی رکھتے ہیں جن میں ان کی تسکین ہو۔

فیضان اپنا شباب ان بزرگوں کی انا کی بھینٹ چڑھا چکی تھی۔ بچے کے مستقبل کے فیصلے کی گھڑی آئی تو وہ چپ نہ رہ سکی۔ اُسے ماضی یاد آیا۔ کیسے کیسے ارمالوں کا گلا گھونٹ کر اُس نے بزرگوں کی ابرو کا پالمن کیا۔ رشید نہ ہوتا اور وہ اُس کی ذات کی وساطت سے ایک اچھے زمانے کا خواب نہ دیکھتی تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ ایک طرح سے باپ دادا اور سسر کی عزت اُس کے ہاتھ میں تھی اوداب وقت اُگیا تھا کہ وہ اُسے ہتھیار کے طور پر استعمال کرے۔

چنانچہ جس روز رشید کے نانا اور دادا جو آپس میں گے بھاٹی بھی تھے رشید کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک دوسرے سے بحث رہے تھے تو فیضان نے صحن میں کھڑے ہو کر عمل الاعلان کہا: ”بہت ہو چکا۔ رشید میری ساری عمر کی گائی ہے۔ اس کی زندگی بنانے یا بگاڑنے کا حق میں بھی رکھتی ہوں۔“

”کیا۔؟“ دونوں بوڑھوں کی لال داڑھیاں کانپ کر رہ گئیں رشید کو ماں کی جرات پر سخت حیرت ہوئی اور وہ چادر کاٹنے والی مشین چلاتے چلاتے ڈگ گیا۔ نانی اور دادی جو آپس میں دیورانی اور جھٹانی تھیں۔ پھٹکار ڈالتے ہوئے بولیں۔

”فیضان۔ مدت ماری گئی ہے۔ کیا کہہ رہی ہو۔ کس سے کہہ ہو۔ کس سے کہہ رہی ہو؟“

قدموں سے احاطے کے دروازے کی سمت چل دیئے۔ رشید مجبور پٹھوے کی مانند اپنے پالنے والوں کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔

نائی جو اسے مسری اور کھن چٹایا کرتی تھی اور دادی پراٹھوں کی چوڑی میں مغز بادام ڈال کر کھلاتے ہوئے ”صدقے جاداں میرے موٹے جان محمدی نشانی“ کہتی تھی۔ اُس کا دادا نانا اور رشتے کی چچیاں تائیاں اور عمنائیاں یہ سب اُسے میلہ دیکھتے اُسے ہوئے لوگ نظر آتے تھے اور رشید کی آنکھوں میں دنیا گھوم رہی تھی۔

ماں کے زبان کھولنے نے اُسے گھر کا نقشہ ہی بدل دیا۔ رشید کو ماں پر ترس بھی آ رہا تھا اور عقہہ بھی۔ ماں کی بلند آواز نے اُسے گھر کے دروازے پر درازیں سی ڈال دی تھیں جو تین فیضال کی کو موڈ والاظم ٹھہرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”بیٹا دس جماعت کیا پڑھ گیا فیضال بی ایم اُ ہو گئی۔ دیکھو کیے سر اٹھا کے چل رہی ہے“

ماں بیٹے نے لمبا چوڑا صحن عبور کر لیا تھا کہ رشید کی دادی باز کی طرح جھپٹ کر رشید کو بازو سے کھینچتے ہوئے چینی۔

”یہ نہیں جائے گا۔ تو بے شک جا۔ ہم بھی دیکھیں کس کو تاک رکھا ہے“

پھر وہ مردوں کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

”جان محمد کے ابا! کیا پٹ بٹ تنک رہے ہو اور غنودے غیز جاتی کیا تجھے نظر نہیں آتی؟“

فیضال کا باپ کسی سوچ میں گم تھا۔ چونک کر اٹھا اور رشید کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔

”سجالی امنہ سنبھال کر بات کر۔ فیضال کے منہ پر کالک نہ مل۔ اُس نے اپنی جوانی اس گھر کی عزت پر قربان کر دی اور آج تو اسے راہ دکھاتے چلے ہے“

”رشید میرے بچے کا خون ہے اس پر میرا حق ہے“ ماس چلائی۔

”حق ہے تو لے پکو۔“ فیضال کے باپ غور نے رشید کو دوشے

دھکیل دیا۔ وہ چارے والی مشین پر گرتے گرتے سنبھلا۔ اُس وقت اُسے خیال آیا کہ ماں اُسے پیار سے کھلونا کہتی تھی تو سچ ہی کہتی تھی ماں یوڑھے ہاتھوں میں وہ کھلونا ہی ہے۔ اُس میں جان نہیں۔ یہی چابی دیتے ہیں تو اس کے کل پرزے چلتے ہیں۔

آج یہ پہلا موقع تھا کہ فیضال کی ماں اور ساس روایتی دیو رانیاں اور جٹھائیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ نہ فیضال کی ماں اپنی جٹھانی کے ساتھ ہمیشہ دبی ہوئی، کم امیز اور صلح کل سی بنی رہی۔ اُس نے جتنی ہمر کی جٹھ اور جٹھانی کے سلئے سلئے بسر کی۔ اُس کی اپنی کوئی حیثیت نہ تھی۔ بیٹی بیاہی اُسے پتہ ہی نہیں چلا۔ سب ہم کام کیونکر انجام کو پہنچے پھر فیضال کامیاں مرا تو جٹھ جٹھانی نے فیضال اور بچے کو ایسے پروں کے نیچے سمیٹ لیا جیسے وہ صرف انہی کی ذمہ داری تھے۔ فیضال کا باپ اور تایا کھیتوں میں کام کرتے اور عورتیں گھر داری کر سیں۔ زندگی ایک پنج پر چل رہی تھی۔ بیاہ اد بیوگی جیسے حادثات سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ سب کام اسی احاطے کے اندر انہی چھتوں کے نیچے بخیر و خوں ہو گئے۔

مگر آج جب نانائے ولے کو کھینچ کر چارے کی مشین پر دے مارا تو اہل خانہ کے اندر نہ جانے کیا کیا ٹوٹ گیا۔ رشید کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی مگر نانی مغلوموں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور فیضال دروازے کا پٹ تھلے گھر اور اُس کے مکینوں کیوں تک ہی تھی جیسے پہانے کی کوشش کر رہی ہو۔ دادا نہ معلوم کس خیال کے تحت اچانک اُسے اور فیضال کو بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے آہستہ سے بولے

”فیضال ادھیئے۔ غصہ تھوک دے۔ تو مالک ہے جو کہے گی ہوگا۔ روکا کا کالج میں پڑھے گا۔“

جان محمد کے ابا! روکا کا کالج میں نہیں پڑھے گا۔ سمجھے۔ دس جاتوں نے بہو کا دماغ خراب کر دیا۔ بی اُ پڑھ گیا تو ماں بیٹا آسمان توڑ دیں گے۔ تم گھر کے بڑے ہو عقل سے کام لو۔ یہ رشید کی دادی تھی جو شوہر کو نرم پڑتے ہوئے دیکھ کر اسے ولے وقت سے آگاہ کر رہی تھی۔ فیضال کی

ماں بیٹی کو کچل کر چل پانی تک لاتے ہوئے میاں۔

”بھابی! دھن جگرا میرا میں نے ساری عمر تیرے ساتھ سی نہیں کی لیکن اب نہیں چلے گی۔“

رشید کو کالج میں پڑھانے کی خواہش نے گھر کے اندر دو مختلف ارا کو جنم دیا۔ ان ارا کی روشنی میں ہر شخص نے اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ ورنہ اس گھر میں چھ لوگوں کی بجائے ایک شخصیت رہتی تھی اور یہ شخصیت نسل در نسل منتقل ہوتی چل آ رہی تھی جس کو عام طور سے کسی گھرانے کی روایت کہا جاتا ہے۔ لوگ روایت سے اپنا دامن اتانکس کے باندھتے ہیں کہ صدیوں گرفت عادت اور عادت ایک قدر بن جاتی ہے۔

فیضان نے اس قدر کو کیونکر منفی قرار دیا۔ اُس کی انگلیوں کی قسبات کا نتیجہ تھا یا بیٹے کے تعلیم یافتہ ہونے نے اُس میں عجیب حرارت پیدا کر دی جس پر سب حیران تھے۔ اور رات ہونے تک دو بھائی ایک دوسرے سے الگ سوچکے تھے دو گھرانے وجود میں آچکے تھے۔ فیضان کا میکہ اور فیضان کی سسرال۔ آج گھر میں چوہا جلا نہ دیتی پکی۔ دونوں خاندان ایک دوسرے کا پیٹھ طعن و تشنیع سے بھرتے رہے۔ بیچ بیچ کر اپنی قربانیوں اور دوسرے کی زیادتیوں کا پرچار کرتے ہوئے گھرانے کی ساکھ اور اُبرو کے پرچے اڑاتے رہے۔ فیضان کی ماں نے صاف کہہ دیا۔

”فیضان کے آبا۔ اب جو فیضان کہے گی وہی ہوگا۔“

اُس وقت گھر میں دو عورتیں دو مرد، ایک لڑکا ایک طرف تھے۔ بوڑھے جوان اور تو خیر تینوں زمانے ایک بات کہیں تو وہ حقیقت بن جاتی ہے۔ رشید کی دادی ایک روایت تھی رد کردی گئی۔

اگلے ہفتے داخلے کے سلسلے میں دادا ابا خود رشید کے ہیڈ ماسٹر کے پاس گئے اور اس طرح وہ ہیڈ ماسٹر کے وسیلے سے کالجیٹ بن گیا۔

یہاں اُس کا حلقہ یارداں چند ہی ہفتوں میں وسیع ہو گیا کیونکہ ہنسل

کی خوراک سے اکتائے ہوئے نوجوانوں کے لئے اُس کے پاس کافی ساٹا ہوتا تھا۔ طرح طرح کی پجیریاں، مکھن، انگوری گیہوں کے فروٹس، قسم قسم کے حلوسے پینڈیوں کے کنسٹر تو کبھی خالی نہ ہوتے تھے۔ گھر والے باقاعدگی سے بھجواتے رہتے دنیا میں کھانے والے یاروں کی کمی نہیں ہوتی کام کرنے والے کم ہوتے ہیں۔

وہ اپنے نانا دادا کا اکلوتا نانا سا اور پوتا تھا۔ دونوں طرف سے جہربانیوں کی زنجیروں نے اُسے جکڑ رکھا تھا لیکن لاہور آکر اُسے یوں لگا جیسے یہ زنجیریں دہڑکی تھیں۔ وہ انہیں جتنا چاہے کھینچ سکتا ہے۔ شہر کی رونق اور بھیر بھاڑ میں گم ہونے کے لئے رشید بے تاب تھا۔ وہ اب تک پیار کی جانے والی ہستی تھا مگر انسان تھا خدا تو نہیں کہ فقط چاہے جانے کا اتفاق کرے۔ چاہت کے درد سے اُشنا ہونا ہی زندگی کی مٹھاس ہے۔ رشید کے لئے کالج کا زمانہ مطلق العنان کا دور تھا جو چاہے کرے۔ وہ شروع شروع میں ایک دو بار گاؤں گیا تو شہر گاؤں کے واضح فرق نے اُسے خاصا بد مزہ کیا۔ یاروں کی مٹھلیں یاد آتی تھیں ہر دھڑکی کو عاشق کی نظر سے دیکھنے میں کتنا لطف تھا۔ گاؤں میں عورت کو ماں بہن سمجھنے کی وہی صدیوں پرانی ریت، وہی پرانے رستے وہی پرانے لوگ مگر شہر کا لطف ہی اور تھا۔ اُس کے اپنے کالج میں ہی سیکڑوں رنگ سیکڑوں نائیٹ تھے۔ یہاں نیلی آنکھوں والی سلی تھی، بلونڈ طہا ہرہ تھی، سائونی رقیہ کے سراپا کے ساتھ پورا کالج سانس لے رہا تھا۔ اور ان سب سے زیادہ محبوب ہستی علامہ کی تھی جس کے پاس سے گزر جانا ہی نئی دنیا سے آگاہ ہونا تھا۔

جب سے لوگن ہیلیا کی اوٹ میں کھڑی علامہ نے اُسے مسکرا کر پاس بلایا تھا۔ وہ اُس کے ذہن سے محو ہونے کا نام نہ لیتی تھی صبح شام رات دن، سفر میں حضر میں، اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک تصویر پھرتی رہتی جس کے پس منظر میں ہندی اور توت کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ لال اینٹوں کے ستون سے لپٹی ہوئی سبز بیل میں گلابی پھولوں کے گچے۔ بے شمار گچے جن میں پتوں کا سبزہ محض زمین سے

مطلوبہ رقم وہ بھی فراہم نہ کر پائے۔ ماں کا دل بیٹے کی خوشی سے زندہ تھا۔ بیٹا جا کر ماں کے پاس رو یا اور اُس نے چپکے سے اپنی شادی کے وقت کا طلافی کڑا بیٹے کے حوالے کیا۔

”توجا۔ ضرورت پوری کر۔ پوچھیں گے تو دیکھا جائے گا؛ رشید سوچ رہا تھا۔ پوچھے گا کون؟ آخر ان تمام چیزوں کا مالک میں ہوں۔ یہ بوٹے ایک ایک کس کے لاجائیں گے۔ رہ جائے گی اماں تو وہ میرے دم سے زندہ ہے۔“

لاہور واپس آتے ہی اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ پرلے فیشن کا کڑا ادا کرنے پر فروخت کیا۔ پھر بھی اُس کے ہاتھ میں معقول رقم تھی اُسے رات بھر تیند نہیں آئی۔ دن بھر چین نہیں کیا۔ جیب میں رقم ڈالے وہ موقع کی تلاش میں تھا۔ علما آج کل سنجیدگی سے پڑھائی کی طرف متوجہ تھے کبھی کبھی لائبریری میں نظر آتی یا پھر سیدینار روم میں کتابیں سامنے اور سر پر ہاتھ دھڑکے کسی سوچ میں گم۔ اچانک دھڑا دھڑا لڑکھائی لینے شروع کر دیتی۔ کتنے اس کے غم میں ٹپکتے تھے اُسے کیا؟ لڑکیاں کالج میں عام طور سے شغف کرتے یا بڑبڑھونٹنے کی غرض سے داخل ہوتی ہیں۔ سب اپنے حساب سے کام میں مصروف تھیں۔

سیدینار روم میں علما کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے صفحات سیاہ کر رہی تھی۔ رشید پہنچ گیا۔

”باجی! آپ میرے ساتھ چلیں گی۔“

”کہاں۔؟“ علما نے کام میں مہمک رہتے ہوئے پوچھا

”اتار کلی۔“

”کیا لینا ہے؟“ علما نے کتاب سے نگاہیں نہ اٹھائیں۔

”تھو۔“

کس کے لئے؟

علما کی توجہ کتاب سے ہٹ گئی۔ رشید نے بچوں کی طرح جھینپ کر کہا۔

بیوٹنگ کا بھرم تھا۔ ورنہ بوگس بیلیا کے گلابی اور سنہری شعلوں نے کالج کی بلڈنگ کو اپنی پلیٹ میں لے رکھا تھا اور یہ شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ان شعلوں میں چھپیں ایک چنگاری تھی علما جس نے رشید کے بھس بھرے دل میں سلگن پیدا کر دی۔ چڑھتی عمر میں لڑکوں کا خون خون نہیں ہوتا خالص پٹرول ہوتا ہے۔ دھوپ سے آگ پلٹنے کو تیار۔ اگر علما سوہویں کی طاہرہ تھی اور وہ صرف گیا رہو میں پڑھتا تھا تو کیا؟ عشق اور مشک موقع محل کب دیکھتے ہیں بس چل نکلتے ہیں۔

علما برآمدے کے ستونوں کا سہارا لئے حسب معمول کسی گتھی کو سلجھانے میں غرق تھی۔ اُس کے گرد لوٹنے پلٹنے ہمیشہ کی طرح منڈا رہے تھے۔ رشید اُس کے قریب جا کر ایک دم ڈک گیا گویا کسی نے بریک لگا دیا ہو۔ علما اُس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

”ہیلو۔“

”ہیلو۔“

علما عام لڑکیوں کی طرح چھوٹی موٹی نہیں تھی۔ لٹک لٹک کر کم دکھاتی تھی۔ اعتماد سے بات کرتی اور لڑکوں کے لئے اس کا یہی رویہ دلکش کا باعث تھا۔ علما کے لئے رشید کالوں میں لو کہنا کوئی نئی بات نہ تھی اور نہ ہی اُسے خیال آیا کہ اُس میں کوئی پیغام چھپا ہے۔ رشید نے ہمت کر کے انگیریزی میں کہا۔

”میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔“

ادہ۔ یقیناً۔

اس کے بعد وہ بلا جھجک علما کے پاس جا کر کھڑا ہوتا۔ وہ اس سے اُس کی عمر اور سمجھ بوجھ کے مطابق باتیں کرتی اور اپنے خاص انداز میں نصیحتیں کرتی رہتی۔ اُن کی گفتگو کا موضوع محبت کبھی نہ ہوا۔ تاہم رشید روز بروز علما کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا گیا۔

بڑے دنوں کی چھٹییاں ہونے والی تھیں۔ رشید علما کو کتنے سال کا ایسا تھم دینا چاہتا تھا جو وہ اپنے سے جدا نہ کر سکے۔ دادا دادا سے بچے منگوائے۔ انہوں نے معذرتی ظاہر کی تو نانا نانی کو آدھایا۔

”آپ کے لئے۔“

”میرے لئے؟“ علانے کاغذ اور قلم ایک طرف رکھ دیا اور بظاہر چوہکتے ہوئے بولی۔

”تو تم میرے لئے تحفہ خریدو گے؟“

اُس کا ہر کچھ یوں تھا۔ جیسے تتلا کر کہہ رہی ہو۔

”مٹے میاں کتے پیسے ہیں تمہارے پاس؟ چلو میری طرف سے

ثانی کھالوان کی؟ اور جب رشید نے سو سو روپے کے پندرہ نوٹ

اُس کے سامنے رکھ دیئے تو وہ کبھی رشید اور کبھی نوٹوں کو دیکھ رہی تھی

پھر اُس نے اپنے حواس مجتمع کر کے پوچھا۔

”کہاں سے لئے؟“

”اماں سے۔“

چوری تو نہیں کئے؟“

”ہرگز نہیں۔ میں آپ کے لئے تحفہ خریدنا چاہتا ہوں اور چوری

کروں؟ نا۔“

”شاباش۔“ علانے اُس کی پیٹھ تھپکی۔

”اچھا چلو سیڈو انہیں۔ چوری نہیں کئے تو چوری ہو جائیں گے؟“

”آپ رکھ لیجئے۔ اور۔“

”کیوں میں کیوں رکھوں؟“

”آپ ہی کے ہیں۔“

ایسے نہیں کہتے۔“

کیسے کہتے ہیں؟ میں تو آپ کا احترام کرتا ہوں، عزت کرتا ہوں اور۔ اور۔

مجھے۔ وہ ہکھلانے لگا تھا۔ علانے ہنستے ہوئے فقرہ مکمل کر دیا۔

”مجھے آپ سے محبت ہے۔“

رشید کی آنکھیں چمک اٹھیں اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا

چہرہ چھپا لیا۔ علانے دیکھا کہ رشید کا وجود دھیرے دھیرے کانپ رہا

ہے اور وہ انتہائی بے بس ہے۔

چند لمحوں اس خاموشی میں گزر گئے۔ رشید روتا رہا۔ علانے سوچتی رہی

کر کیا کیسے۔ پھر اُس نے رشید کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے

نیم دائیگی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں وہی اذلی گواہی تھی۔

میں نے تیرے لئے جہنم لیا ہے۔ دیکھ میں تیرے لئے دنیا میں بھیجا گیا

ہوں۔ علانے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کے ہاتھوں سے رشید کے

ہاتھ یوں چھوٹ گئے۔ جیسے نیند کے ماتے ہاتھوں سے کھوتا۔ اُس

وقت وہ دونوں بچوں کی مانند تھے۔ بے خیال، حیران سے۔

کافی دیر کے بعد علانے سوال کیا۔

”رشید مجھ سے بیاہ کر دو گے؟“

رشید کو اس سوال کی توقع نہ تھی وہ UP SET ہو گیا۔ یہ تو اُس

نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ کبھی نہیں۔ اور یہ بات فی الحال سوچنے کی تھی بھی

نہیں۔ تاہم سوال بے حد اہینگ تھا۔ اُس کے رومان زدہ ذہن نے

فوراً ہامی بھری۔

”آپ مجھے EMBARESS کئے دے رہی ہیں۔ دیکھئے۔

اس سوال کا جواب۔“ اُسے پھر کچھ نہیں سوچہ رہا تھا۔ علانے خود جواب

بنایا۔

اس کا جواب تم اماں سے پوچھ کر دو گے۔ ہیں نا۔“

”ہوں۔ مگر آپ میرے ساتھ چلیں نا! تحفہ خریدنا ہے۔“

مگر مجھے آپ سے کچھ نہیں لینا ہے۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ آپ نے اپنی اماں سے پوچھا نہیں۔“

علانے میز پر بکھرے ہوئے کرنسی نوٹ سمیٹ کر اُس کی جیب

میں بھر دیئے اور کتابیں اکٹھی کر کے جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔

”میں تو چائے پیوں گی۔ بڑی سردی لگ رہی ہے۔ چلتے ہو؟“

اور وہ اُس کے پیچھے پیچھے سر جھکائے سینینا روم سے باہر نکل آیا۔

دونوں چپ چاپ سیڑھیاں اترے۔ رشید کا دل بھاری تھا

اور منہ سے ٹھنڈی آہیں نکل رہی تھیں۔ ریڈنگ روم میں اُس کے ہم جاوے

ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۶ء

”کچھ نہیں۔“

علما کی سہیلیا یوں ہنسیں جیسے انہیں رشید کے بارے میں پورا علم ہو۔ ٹاٹے قد کی زرد رُو انیسہ آگے بڑھی۔

”سننا ہے آپ بڑے اداس ہیں آج کل؟“

”قطعاً نہیں۔“

”تو پھر علما آپ کے لئے پریشان کیوں ہے؟“

”نہیں تو۔“

وہ لو لکھڑا گیا اور کتابیں اُس کے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے پچیس۔ علما مسکرا دی تھی رشید کو اس وقت علما کی مسکراہٹ زہر لگی اور اندازہ ہوا کہ وہ جان بوجھ کر لڑکیوں کو تیار کر کے لائی ہے تاکہ اس کا مذاق اڑایا جائے۔

دو دن اور گزر گئے۔ وہ علما کو تحفہ دینے میں کامیاب نہ ہو سکا علما ہر بار ”CRAZY BOY“ کہہ کر ٹال دیتی تھی۔ باقاعدہ جھڑکنی بھی نہ تھی اور رشید کو اُس کا یہ رویہ قتل کے دے رہا تھا۔ ان دو دلوں میں اُس کی جان پہچان انیسہ سے ہو گئی۔ انیسہ خود ہی اُس کے پاس آکر رک جاتی۔ بہت سی باتیں پوچھتی اور بہت کچھ بتاتی اور رشید کو ایسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی کی پناہ میں چلتا جا رہا ہے۔ اُس کی آواز اور وجہ کو سہارا سا مل گیا ہے۔

انیسہ میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ لباس اور طور اطوار سے بھی معمولی گھرانے کی لگتی تھی مگر لڑکوں کے ساتھ بے تکلف ملتی۔ ہر کلاس کا لڑکا اُس سے مخاطب ہو سکتا تھا وہ ہر ایک سے یہی کہتی۔

”مجھے بھائی بنانے کا بے حد شوق ہے۔“

”کیا آپ کا اپنا بھائی کوئی نہیں؟“

کیوں نہیں۔ چار ہیں۔ مگر بھائی تو جتنے ہوں کم ہوتے ہیں ایسے بھائی بہن کا رشتہ دنیا کا مقدس ترین رشتہ ہے۔ میں نارشید!

رشید کی کوئی حقیقی بہن نہ تھی۔ اس لئے بہنا ہے کا اُسے علی تجر بہ نہ تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ نانی اور دادی گاؤں کی ہر لڑکی کو اُس کی بہن

پرٹھنے کے بجائے شور مچا رہے تھے۔ کاؤنٹر پر بیٹھا کلرک انہیں بار بار منع کرتا تھا۔ علما نے لائبریری کی کتابیں واپس کیں اور اٹے قدموں واپس آگئی رشید لڑکوں کے جھنڈ میں سر دے کر کھڑا تھا۔ لڑکے کسی TRIP پر جانے کا پلان بنا رہے تھے۔ رشید کو ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی پھر وہ علما کے ساتھ ساتھ چلتا لیڈر روم تک چلا گیا۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ چلیں گی نا؟“

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

وہ بوکھلا کر رہ گیا۔

”پہلے آپ۔“

”نہیں۔ پہلے آپ۔“

وہ بے ساختہ جھپٹنے لگے۔ تھوڑی دیر پہلے کی یوسٹ ایک تپتے سے کافور ہو گئی۔

کالج OVER ہو گیا۔ علما گھر چلی گئی۔ فرد فرد کر کے رونق ختم ہوئی صرف میوزک روم سے طبلے اور ستار کی آواز آرہی تھی۔ مالی گھاس کاٹنے والی مشین سے سکوت ٹوڑنے کا اہتمام کر رہا تھا۔ رشید ہوشل جاتے کے بجائے لان میں پڑے۔ پنج پر لیٹ کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ اُسے بھوک تھی نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاہتا تھا۔

وہ اب تک با اعتماد دوست بھی بنا نہیں سکا تھا اور پھر کالج میں داخل ہوتے ہی مخالف جنس کی کشش نے اُسے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنی جنس کی طرف توجہ دے۔

اگلے روز علما سے پھر مایوس ہوا۔ آج تو اس نے انتہا کر دی۔

گھپ اندھیرے کا ریڈور میں سے گزر کر وہ کسی پروفیسر کے کمرے میں جا رہی تھی اُس کے ساتھ اُس کی ہم جماعت لڑکیاں تیز تیز باتیں کرتی چلی آرہی تھیں۔ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے رشید کو دیکھ کر علما لگ گئی اور اندھیرے سے روشنی میں کھینچ لائی۔

”کیا بات ہے؟“

وہ نانی دادی کو رائے زنی کرتے چھوڑ کر ڈھارے میں گیا۔
 ملائی سے پیالہ بھرا اور مزے سے کھانے لگا۔
 ”اچھا تو اب اُس کی شادی ہونے والی ہے“ اور جب ملائے سیمینہ
 روم میں اس سے پوچھا کہ مجھ سے شادی کر دے تو وہ الجھ کر رہ گیا۔ دنیا
 نے اُسے ایک دم شادی کے قابل قرار کیوں دے دیا۔ کیا مصیبت ہے؟
 اور اب انیسہ کہہ رہی تھی۔

”مجھے تو بھائی بنانے کا شوق ہے۔“

ایک دن وہ انیسہ کے ساتھ باتیں کرتا انا رگلی تک پہنچ گیا۔
 اچانک ہی وہ ایک جنرل اسٹور پر کھڑے تھے۔ انیسہ زنانہ جرسیاں نکلا
 کر دیکھنے لگی۔

”کتنی پیاری ہے۔ ہے نارشید!“

اور رشید اپنے ساتھ نوجوان لڑکی کے وجود کے احساس سے
 پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ انیسہ اتنی جلدی اُس کے ساتھ اُنے پر رماند
 ہو جانے لگی۔ اُسے عجیب سا لگ رہا تھا اور اب وہ جرسی کو کاؤنٹر
 پر پھیلانے نرم لمبے میں اُس کی رائے معلوم کر رہی تھی جیسے بیوریاں
 شوہروں سے پوچھتی ہیں۔ لگاوٹ اور انجان پن سے اُنکھوں میں
 جھانکتے ہوئے۔

رشید نے بغیر کچھ کہے سر کی ہلکی جنبش سے رائے ظاہر کی۔ اُس
 لمحے اُسے عجیب طرح کی خوشی اور اُسودگی حاصل ہوئی اور یقین سا ہو
 چلا کہ وہ واقعی شادی شدہ ہونے کے قابل ہو گیا ہے اور جب
 وہ پے منٹ کر کے دکان سے باہر نکلے تو انیسہ نے پوچھا۔

رشید! تمہیں سچ بچ پسند ہے نا؟

رشید کو یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ایسے موقع پر کیا جواب
 دیتے ہیں۔

رات کو اس نے چلا کو ٹرپ ٹرپ کر یاد کیا۔ ظالم۔ ظالم۔
 صبح اُس کے روم میٹ نے اُسے بتایا کہ تم لحاف میں مٹے بیٹے
 ظالم۔ ظالم کی رٹ لگا رہے تھے۔ اپنا سائیکو انیلیسیز کراؤ۔

بتاتی تھیں، اور وہ انہیں اسی نگاہ سے دیکھتا بھی تھا۔

اب کے عید پر وہ گھر گیا تو ماں نے کسی لڑکی کا ذکر کرتے ہوئے
 کہا۔ ”میں اُس سے تمہاری سنگتی کرنے والی ہوں۔“
 تو اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کل تک وہ اس لڑکی
 کو بہن سمجھتا تھا۔

”وہ تو میری بہن ہے ماں!“

اُس نے بغیر سوچے ماں سے کہا تھا اور ماں نے اُسے پیار سے
 ڈانٹا۔

”بھی۔ میں جو کہتی ہوں اُس سے تمہاری شادی ہوگی۔“

اور پھر وہ نانی کے پاس گیا۔ دادی سے پوچھا۔ انہوں نے
 چرخوں کی ہتھکیوں کو مسلسل گھماتے نکلوں پر تانت ڈالتے ہوئے جواب دیا
 ”ہاں فیضان ٹھیک کہتی ہے۔ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔
 سوچ کے بدلو اور تمہاری سنگتی تو طے ہے۔ بڑے دنوں کی چھٹیوں
 میں اڈ گئے تاتب۔“

”کیکن۔“

وہ ہکھلانے لگا۔

”ارے جا۔ تیری کون سنتا ہے۔ تیرے نام پر بیٹیاں تانتا کرتی

ہے۔ ہے نا

”بہن۔ برکتے! تو بہ میری تو بہ لڑکیاں بھی کیا ہوتی ہیں۔“

رشید کی نانی منہ پر دوپٹہ رکھ کر ہنسی۔ وہ خود شرماسی تھی
 اور دادی نکلے پر تانت پر تانت ڈالنے میں مصروف تھی۔ رشید احتجاج
 کے طور پر جمیا یا۔

”مگر چنو تو ماسی پھجیاں کی لڑکی ہے اور میری بہن ہے۔“

”چل۔ یک نہ۔ کاڑھنی میں دودھ پڑا ہے۔ موٹی موٹی ملائی

اچکی ہوگی۔ کھائے شکر ڈال کر۔“

”ملائی تو خود میٹھی ہوتی ہے شکر کی کیا ضرورت۔“

”جا تجھے کھانے سے کام یا جیتیں کرنے سے۔“

”کیا۔؟ انیسہ نے حیرت پر نالو پاتے ہوئے پوچھا
”مجھے ساتھ نہیں لے چلو گے؟“

”نہ۔“

رشید ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے ایسے بولا جیسے ایک بچہ دوسرے
بچے کو ڈراتے۔

کیوں؟۔ میں تمہاری بہن نہیں۔؟ اور گاؤں کے لوگ تو بہنوں
کو قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہیں نا؟
”وہ تو ہے۔“

”پھر۔؟“

”مگر میں تمہیں ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔“

”بھئی۔ یہاں سے اکٹھے چلیں گے۔ اگے چل کر بطحہ علیحدہ
گھر بنیں گے۔“

”ٹھیک۔“

میں نے تمہارے بارے میں گھر والوں کو نہیں بتایا۔“

”ہٹو۔ ہم نہیں بولتے۔“

انیسہ روٹھتے ہوئے بولی۔

کتے بزدل ہو۔ مجھے تمہاری یہ بزدلی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔
میں جاؤں گی اور اماں کو بتاؤں گی اتنا ڈر پوک تھا تو گود سے الگ کیوں
کیا؟
رشید منہیں کرنے لگا۔

پلیز انیسہ۔ اللہ کے واسطے یہ غضب نہ کرنا۔ اور تم جو بھی
کہو کروں گا۔ گاؤں مدت جانا۔
”دیکھا۔ دیکھا۔ کیسے کانپ رہے ہو جیسے میں تمہاری ماں سے
ملنے کے لئے مری جا رہی ہوں۔ او تمہ۔“
اور وہ ناراضی دکھا کر جانے لگی۔

علا جہاں تھی وہیں تھی۔ انیسہ روز بروز اُس کے قریب آرہی
تھی ماں کا کڑا بیچ کر جتنی رقم حاصل کی تھی خرچ ہو گئی۔ وہ پھینٹوں میں
گھرنے جا سکا۔ انیسہ لائبریری سے کتابیں نکلوانے آتی تو وہ کسی خاموش
گوشے میں جا بیٹھتے۔ انیسہ تقریباً ہر روز آجاتی۔ اب وہ اپنے کسی کلاس
فیلو سے نصابی بحث لے بیٹھتی تو رشید کا جی جلنے لگتا۔ وہ ہمیشہ سے
ایسی تھی مگر رشید کو اس کا بے تکلف ہونا اب زیادہ کھلنے لگا تھا۔ رشید
کی تیوری پر بل پڑے ہوئے دیکھ کر جب وہ ہلکورا سا کھا کر کہتی۔

”I KNOW YOU ARE JEALOUS“

تو وہ حسب معمول شرما کر رہ جاتا۔

پھر علا اور انیسہ دونوں امتحانات کی تیاریوں میں مصروف ہو
گئیں وہ سالانہ امتحان سے فارغ ہو کر بھی گھر نہیں گیا۔ اس دوران اُسے
علا سے خاص رغبت نہ رہی۔ علا نے کب اُسے CRAZY BOY
کہنا چھوڑا اُسے یاد نہیں اور کب اُس نے علا کی راہوں میں کھڑے ہونا
”نرک کیا پتہ نہیں چلا اگرچہ انیسہ کالج میں کم دکھائی دیتی تھی۔ رشید
پر رومانوی اداسی کے دورے پہلے سے کم پڑتے تھے۔“

نیا سیشن شروع ہو چکا تھا پھر بھی کالج میں ہما ہی نہیں تھی
گرمیاں دھوم دھام سے آرہی تھیں۔ بارش کے چھینٹے، ہوا کے
جھکڑ۔ بڑا بور موسم تھا۔ کالج کی تین کلاسیں جاچکی تھیں نئی کھیپ
اُسنے میں کافی دن باقی تھے۔ یادوں میں بیٹھ کر گفتگو کرتے کا ڈھب
اُسے اب تک نہ آیا تھا۔ کتابوں سے شفقت پیدا ہو ایسی کوشش
ہی نہ کی۔

بہت دن بعد گھر سے خط آیا تمہاری منگنی کی رسم ادا ہو گئی،
مبارک ہو۔ وہ انیسہ سے اپنی منگنی کے واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا تھا۔
”انیسہ! مجھے گھر والوں نے بلایا ہے۔“
”کس لئے؟“
”میری منگنی کی بات ہے۔“

پاتھ منہ دھونے کے بعد انیسہ مزے سے میٹھی چھا چھتی ،
لکھن روٹی کھاتی لہو لہو اپنے گرد جمع ہوتی عورتوں بچوں کو دیکھ رہی تھی
اور زیادہ پریشان نہ تھی۔ یہ سب رشید کی رشتہ دار ، ہمسائیاں اور جاننے
والیاں تھیں۔ دادی نے فیضال کو اشارہ کیا اور وہ انیسہ کو لے کر کمرے
میں چلی گئی۔

موسم گرما کے آغاز کی سہ پہر خاص طویل تھی۔ فیضال سے آرام
کرنے کی تاکید کم کے جانے لگی تو انیسہ نے پوچھا۔

”اپا۔ رشید کب آئے گا؟“

”نہیں پتہ ہوگا۔“

انیسہ کو فیضال کے لمبے سے اندازہ ہوا کہ فیضال نے اُسے پسند
نہیں کیا اس کے باوجود جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی وہیں اُس کی
اُڈ بھگت اور دیکھ بھال میں لگی ہوئی تھی۔

”آپ میرے پاس بیٹھیں۔ مجھے تنہائی سے خوف آتا ہے۔“

فیضال دل میں ہنسی اور روایتی طریقے سے کہا۔

”ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔“

جب ہی تو میں ابھی گئی۔“

سفر کی تکان اور مرغن کھانے کے بعد پرسکون کمرے اور فیضال
کی مدھم مدھم باتوں نے انیسہ پر غنودگی طاری کر دی۔ فیضال کے
ذہن میں اوہام کا ڈیرا تھا۔ انیسہ کی آنکھ لگی تو وہ سوچنے لگی۔ یہ کیوں
آئی ہے؟ یہ کون ہے؟ رشید آجائے فوراً آجائے۔ اچانک انیسہ کی ہنسی

نے اُس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔

مجھے معلوم ہے آپ مجھے پسند نہیں کر رہیں اور آپ کو یہ اندازہ بھی
ہو گیا ہو گا کہ میں کیوں آئی۔“

پھر وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”رشید اور میں اکٹھے آتے مگر وہ آپ سے ڈرتا ہے۔ میں آپ

کے پوتے کی انیسہ پھر رونے لگی۔

انیسہ پتیر۔ وہ راستے میں کھڑا ہو گیا۔ انیسہ ایک خاص ادا کے ساتھ
بدن چھلکتی رک گئی۔ پھر رشید کی طرف گھومتے ہوئے پوچھا۔
”رشید۔ میں جان گئی۔ تمہارے دل میں میرے لئے کتنی جگہ
ہے۔“

رشید کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ اس لمحے اپنے جذبات کا
جائزہ لے رہا تھا۔ دل کو ٹٹول رہا تھا۔ انیسہ کا مسکن دل کے کس
کونے میں تھا۔ انیسہ کی طرف تکتے تکتے اُس نے انیسہ کی نگاہوں کی گڑی
کو سرے پاؤں تک گزرتے محسوس کیا اور پھر مسکرا کر آنکھیں جھکا لیں۔
”اچھا۔ جیسے تم کہو۔ مگر گھر والوں کو جواب تم دینا۔ ہاں۔“
”ارے۔ وہ تم مجھ پر چھوڑو۔ میں یوں کروں گی۔“

انیسہ نے چٹکی بجائی

”تم مجھے سمجھے نہیں۔“

سوچی سمجھی سکیم کے مطابق انہوں نے سفر کا آغاز کیا۔

پنجاب کے گاؤں کے باس جہان کے معاملے میں بے حد تعجب
ہوتے ہیں کون ہے؟ کس کا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے!
کب تک رہے گا؟ گاؤں کی حدود میں داخل ہوتے ہی پہلا استقبال گتے کرتے
ہیں۔ کوئی اجنبی مقامی شخص کی مدد کے بغیر گاؤں میں قدم نہیں رکھ سکتا۔
اسیشن سے اتر کر رشید نے انیسہ کو گھر جانے والی پگڈنڈی پر ڈال

دیا۔ کھیت کھیت، روش روش چلتی انیسہ خاصی محاط تھی۔ آبادی کے
قریب پہنچی، کتے بھونکے۔ انیسہ نے انہیں پیار سے پکارا اور سنبھل
سنبھل کر چلنے لگی۔ اسی دوران گاؤں کے بچے رضا کارانہ اُس کی مدد کو پہنچے
اور یوں وہ رشید کی حریم میں پہنچا دی گئی۔

جب اُس نے بتایا کہ وہ شہر سے آئی ہے اور رشید سے ملنا چاہتی
ہے تو تجربہ کار عورتوں کا ماتھا ٹھنکا۔ رشید کی دادی اور نانی نے ایک دوسرے
پر آنکھوں میں آنکھوں میں سوال و جواب کی بوچھاڑ کر دی۔

فیضان خاموش رہی۔ اُس کے ہاتھ تیزی سے ردی گڑھے
تھے۔

”اب سمجھانا سسر کو۔“

ایسے موقع پر جتنے کہاں معات کرنے والی تھی۔ دو برس ادھر
اُس نے یہی انجام سوچ کر تو کہا تھا کہ رشید شہر نہیں جائے گا۔ اب صرف
وہ بھی تھی اور بات سب جھوٹے۔

”فیضان دھیئے۔“

فیضان کی ماں برکتے عمر بعد فقط اتنا ہی کہنے کی جسارت کرتی رہی
تھی۔ ان دو لفظوں میں فیضان کے لئے بے پیاری، محبت، غم سب
کچھ چھپا ہوتا تھا اُس نے ماتھے پر لئے ہونے کو قدرے پیچھے سر کیا۔

”تایا تمہاری بات ہوئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں میرے بیٹے نے
جو کچھ کیا سوچ سمجھ کر ہی کیا ہو گا۔“

ہاں پڑھا لکھا ہے۔ ہم سے زیادہ دماغ رکھتا ہے۔ فیضان
کی ماں نے بیٹی کی بات پر ہیند ماری کی۔
دماغ رکھتا ہے۔ پھٹے منہ۔
جیتنے دیورانی کا فقرہ چیا کر بولی۔

”میں بیٹیوں کی ماں کو کیا جواب دوں گی۔ گاؤں والے تھڑی تھڑی
کہیں گے۔ فیضان جس طرح تو سینوں پر مونگ دل رہی ہے بہتر تھا ختم
کو لیتی۔ رنڈاپے کا بدلہ پھر پھر کہ ہم سے زلیتی۔“

”بہن جتنے امنہ سنبھال کے بات کر۔ میری فیضان نے جس
طرح عزت رکھی کوئی رکھ کر تو دکھائے۔“
برکتے ہائے، ہائے میری کو مل بیٹی، کہہ کر فیضان سے لپٹ گئی

جتنے ہنڈیا کے کنارے پر ڈوٹی بجاتے ہوئے چلی۔

”میری تو نہ کسی نے کہیں نہ ہے نہ سے گا۔ میں بڑی ہوں میں
نام کی۔ کان کھول کر سنو آج کے بعد اس گھر میں رہوں گی یا۔“

”کیا کیا؟“

لفظ فیضان کے حلق میں پھنس گئے۔

”آپ کا لڑکا ڈرپوک اور بزدل ہے۔ وہ آپ لوگوں کا سامنا
کرنے سے گھبراتا ہے۔ مگر میری زندگی تو خراب ہوئی۔ میں کہاں جاؤں؟
رشید کو لانے کے لئے آدمی دوڑایا گیا۔ وہ آیا تو سویرے کافی نیچے
جا چکا تھا رشید کی آمد سے گھر کے در و دیوار پر جو غیر معمولی رونق دوڑ
جایا کرتی تھی آج سرے سے مفقود تھی۔ نانا اور دادا اکیلتوں میں کام
ختم کئے اچکے تھے اور چوہے کے پاس بھی ہوئی چار پائیوں پر بیٹھے
چب چاپ حنفی رہے تھے۔ فیضان صرب معمول تو ہے پر روٹیاں
ڈال رہی تھی۔ دوسری طرف رشید یا ہوں کا تکیہ بنائے نیم دراز تھا۔

نانا نے جتنے کی نے بھائی کو پکڑتے ہوئے پوچھا۔

”سنا ہے شہر سے جہان آئے ہیں۔ کیوں کو بیٹے؟“

رشید نے کروٹ بدلی۔ فیضان نے اُسے آنکھ کے اشارے
کھسک جانے کے لئے کہا تو وہ سلسلہ کلام شروع ہونے سے پہلے
مولیشیوں کے پاس جا کر انہیں چارہ کھلانے لگا۔
دادی نے رکابیوں میں سالن نکالتے ہوئے فیضان کی ماں کو

حکم دیا۔

”کمرے میں دبا رکھ آؤ۔“

”رکھ دیا۔“

فیضان کی ماں! میں نے سنا ہے شہر سے جہان آئے ہیں۔
”کیوں جان محمد کی ماں؟“ بڑے بھائی نے اپنی بیوی سے پوچھا

رشید کی دادی جتنے تھے وہ بڑے ہیں تھی۔

تم بولو۔ اب کیوں سانپ سونگھ گیا۔

”بہو سے پوچھو۔“

”کیوں دھیئے! تو ہی کچھ بول؟“

طو پر بھاگتا ہوا صدر دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ فیضان نے ہڑھ کر ایسہ گویا زو کے گھرے میں لے لیا اور ساس کی طرف منہ کر کے بولی۔

”تائی۔ تو کیوں جائے۔ گھر والے گھر میں رہیں۔ قاتل تو ہم ہیں۔ چل، چل دھنئے۔“

ایسے لمحوں میں وہ یہ کہی نہیں سوچتی تھی کہ جائے گی کہاں؟ ”رنشید! لے چل پتر۔ جہاں سینگ سمائیں۔ اب ہم دو نہیں تین ہیں۔ تین نہیں چار ہیں۔“

تایا نے حالات کو زیادہ بگڑتے ہوئے پایا تو دروازے کی کنڈی چڑکھا کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

”تم سب جیتے۔ جانے دے فیضان۔ کچھ تو عقل کرو، کیوں مٹی اڑا رہی ہو جہاں سے سیدہ سرور پر۔ جو تو کہے گی وہی ہوگا۔“ اور رنشید کا سریوں گھوم رہا تھا جیسے وہ چرخ پر سوار ہو چکا۔

وہ روٹیوں سے بھری چنگیر کو دونوں بھائیوں کے درمیان پٹختے ہوئے اٹھی۔

”جس گھر میں چلتی پرتی عورتیں ہیں اس گھر میں میرا کیا کام؟ میں کوئی گری پڑی نہیں مچکے چل جاؤں گی۔“

جتنے نے آخری پتر پھینکا اور چادر کو جسم کے گرد لپیٹا جیسے وہ سفر پر جاتے لے لئے تیار ہو

”جتنے۔ کوئی عقل کرو۔“

”بھابی یہ نہیں ہونے کا۔“

فیضان اور بکتے خاموش تھیں۔ اسی لمحے کو ٹھہری سے ایسہ نکل۔ شام کے پھیکے اندھیرے میں بغیر کچھ کہے صدر دروازے کی طرف چلتے نکل۔ رنشید جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا۔ وہ ان اُن مل بے جوڑ واقعات سے خاصا پریشان تھا۔ ایسہ نے اس پر جتنے ملے کئے تھے اچانک کئے تھے۔ اور اب نامعلوم کیا کرنے کا ارادہ لئے وہ کمرے سے نکل کر باہر جا رہی تھی۔ وہ بالکل اضطرابی

قائد اعظم نمبر

”ماہ ذو“ کا قائد اعظم نمبر تکمیلی مراحل میں ہے۔

دیدہ زیب سرورق، نادر تصاویر، بصیرت افروز مضامین،

دلورہ خیز نظمیں! پیشکے بک کر لیں!!

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ مادل چیمبرز۔ راولپنڈی

نیاسر باد

اسلم جسدون

یہ جا رہے ہو۔ تم اُنے تھے شیریں سے شادی کا دن مقرر کرانے اور پالا پر لگیا اس شرط سے۔ اس زمانے میں بھی اس علاقے کے لوگ کسی خسرو پر ویز سے کیا کم ہیں؟

حسن نے سامنے دیکھا۔ بنجر و سنگلاخ ہمیب پہاڑوں کا ایک نیم دائرہ پورے ماحول کو گھیرے ہوئے تھا لیکن جہاں وہ بیٹھا تھا وہ ٹکڑا سرسبز تھا۔ قدرت کی فیاضی سے ایک چشمے کا پانی اس طرف کے پہاڑ کے اس ٹکڑے کو سیراب کر رہا تھا۔ ورنہ یہ جگہ بھی سہلے ولے پہاڑ کی طرح ہوتی کیونکہ کچھ فلاٹنگ ادھر اور ادھر سامنے والے پہاڑ کی اسی طرح کی چٹانیں اور ریت کے وہ ملعوبے تھے جو ہزار ہا برس قبل کسی ارضی عمل سے گندھ کر ٹھوس چٹانوں کی صورت اختیار کر گئے تھے ایک طوفانی ندی دونوں پہاڑوں کے درمیان بہہ رہی تھی جو دریا سے کم نہ تھی۔ حسن کو اس ندی سے اتنا ہی پیار تھا۔ جتنا اس ندی کو ان میدانوں سے جن کی جانب وہ رواں دواں رہتی ہے۔

وہ چٹان پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی ٹھوڑی دونوں ہاتھوں سے تھام لی اور سوچ میں گم ہو گیا۔

”شیریں کے باپ نے کتنی کڑی شرط لگائی ہے۔۔۔۔۔ وہ لوگ تربور (رشتہ دار) ہیں تو اس کے ہیں میرے تو نہیں۔ لیکن ماں شیریں سے شادی کے بعد ان کے تربور میرے بھی تربور بن جائیں گے مجھے اپنے رشتہ داروں کا ساتھ دینا ہوگا۔ پر مجھے کیا پڑی ہے کہ ان کے معاملوں میں ٹانگ اڑاؤں؟ ایک بار شیریں کو اپنا لوں تو پھر کون کسی کا۔۔۔۔۔ اب تو شیریں کا حاصل کرنا جوئے شیر لانے والا معاملہ ہو گیا ہے۔ یاد حسن یہ جوئے شیر تو شیریں کے لئے لانا ہی ہوگی کیونکہ تم شیریں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نہ جانے یہ شیریں کہاں سے آگئی۔ اچھی بھلی زندگی گزر رہی تھی۔ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اڑان تھی۔ اب شیریں کے تنے سے بندھ جاؤں گا۔ شیریں پر سب ہی قربان ہیں شیریں شیریں تم کہاں ہو؟ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”حسن یاز دیوانے کیوں

ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۶ء

تم جو چاہو کر سکتے ہو۔ سڑک وہاں سے نہ سہی یہاں سے گزر سکتی ہے۔“ نہیں۔ شیریں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ میرے بس میں نہیں۔ میرے اختیار میں نہیں۔ تم اپنی ماں کو سمجھاؤ کہ وہ تمہارے باپ کو سمجھائے کہ یہ شرط نہ لگائے۔“ میں نہیں سمجھاؤں گی۔“ کیوں؟“ حسن نے پوچھا۔ سڑک کا یہاں سے گزرنا اب تو ضروری ہے۔ وہ ہے ناگل میری چچا زاد بہن۔ وہی ہمارے قریب۔ وہ لوگوں میں کہتی پھرتی ہے کہ حسن شیریں سے پیار نہیں کرتا ہے۔ وہاں سے خوار کرے گا۔ اگر حسن کو شیریں سے واقعی پیار ہے تو پھر حسن سڑک کو ان کے گھر کے سامنے کی بجائے شیریں کے گھر کے سامنے لے جائے۔ حسن تم مجھ سے بچا پیار کرتے ہو نا؟ اگر تم کو سچا پیار ہے تو سڑک کو یہاں لا دو نا۔“ شیریں۔ تم نہیں جانتیں کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ مگر سڑک کو یہاں لانا ممکن نہیں۔“ حسن نے شیریں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر سڑک یہاں نہیں آسکتی تو پھر ہماری شادی بھی نہیں ہوگی۔“ شیریں نے کہا۔ ”تم کیا کہہ رہی ہو شیریں؟“ حسن نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”میں جانتی ہوں کہ حسن میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں مرجاؤں گی زہر کھالوں گی۔ اُس ندی میں کود جاؤں گی۔ لیکن سڑک کے بغیر۔“

حسن سوچنے لگا۔ باپ ترپوروں کی وجہ سے سڑک یہاں لانا چاہتا ہے اور میں میری سچی محبت کا ثبوت مانگنے کے لئے سڑک یہاں لانا چاہتی ہے۔ اُسے زندگی میں کئی شیریںوں سے سابقہ پڑا تھا۔ اُس نے ہر شیریں کو رام کر لیا تھا۔ لیکن اس کو ہتانی شیریں نے اُسے واقعی فریاد بنانے پر کمزور باندھ رکھی تھی۔ حسن سوچنے لگا شیریں بڑی گھمنڈی اور ہٹیل ہے۔ شیریں میرے ساتھ بھاگ کر نہیں جائے گی ہیں اس کو اغوا بھی نہیں کر سکتا۔ اور اس کے بغیر۔ لیکن کیسے؟“

”توفیق“

”سر فرمائیے“

”چھ ماہ گزر گئے۔ کتنا تھک گیا ہوں۔ اب پہلی بار سکون ملا

ایک بار تو وہ اس ندی کی نذر ہو چلا تھا۔ لیکن پیاری ندی نے اُسے بچا لیا تھا اسی لئے تو وہ اسے اچھی لگتی تھی۔ بالکل شیریں کی طرح۔ وہ اب تک یہ عقدہ حل نہ کر سکا کہ اس دن ندی نے خود اسے بچا لیا تھا، یا شیریں نے کیونکہ جب اُس کی جیب ندی میں گری تھی تو وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا، جیب کہیں جا پڑی اور وہ کہیں اُسے جب ہوش آیا تو وہ ندی کے کنارے تھا اور اُس کا سر شیریں کی گود میں تھا۔ شاید قدرت نے شیریں اور اُسے ملانے کے لئے ندی کو وسیلہ بنایا تھا۔ وہیں سے تو حسن دیوانہ ہوا تھا۔ شیریں کا اور پرستار ندی کا، یہ سب

کیونکہ ہوا وہ تو غریب ندی مشہور تھی جو ہر سال کئی انسانی جانوں کی بھینٹ لیتی تھی اور جیب سے اس کے کنارے کنارے سڑک بننا شروع ہوتی تھی جسے وہ خاص طور پر ناراض نظر آتی تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے حسن کو یوں

پامال کیا جائے۔ اسی لئے تو سڑک بنانے والے کچھ لوگوں کو ہنس نہ لگایا نا کی طرح ڈس لیا تھا۔ البتہ اُسے گاؤں والوں سے اُس تھا کیونکہ انہوں نے کبھی اُنکے کاروبار حیات میں دخل اندازی نہیں کی تھی۔ ندی اور سڑک۔ دونوں اس کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ دونوں ہی سے اسے لگاؤ تھا۔ وہ پھر بڑ بڑانے لگا۔ ”یہ میں وہاں سے یہاں کیسے لا سکتا ہوں ڈیڑھ دو میل کی بندی۔ کچے پہاڑ، جیب چٹانیں اور خطرناک موڑ بیٹھانی نالے بھلا یہاں تک سڑک کیسے آسکتی ہے؟“

اُس کی نگاہ اُنھی اور شیریں پر ٹپک گئی۔ جو گھڑا اٹھانے کچھ فاصلے پر گھر کی طرف رواں تھی۔ اس نے اشارہ کیا شیریں نے گھڑا اٹھا اور لمبائی ہوئی اُگئی۔ شیریں نے حسن کو خلاف معمول پریشان دیکھا اور بولی۔ ”کیا بات ہے حسن؟“ حسن خاموش رہا تو شیریں نے پھر پوچھا۔ اس پر حسن نے جواب دیا۔ ”گویا تم کو معلوم ہی نہیں۔“ شیریں نے ہلکا سا ہتھکڑ لگاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا وہ سڑک والی بات۔“ ”ہاں۔“ حسن نے کہا۔ ”تو اس میں کیا مشکل ہے۔ سڑک کو وہاں سے اٹھا کر یہاں لے آؤ۔ تم ہی کہتے تھے کہ تم اس سڑک کے سب سے بڑے افسر ہو۔“

کام کرتے تھے اور میں ان ٹاسک ماسٹروں کی طرح جو ہاتھوں میں کوڑا لئے گھومتا تھا۔

”ایسا نہ کہیے سر۔ کچھ بھی ہو آپ نے ڈیوٹی دی ہے۔ نقشہ منظور ہونے کے بعد آپ کی ذمہ داری ختم۔ اب آپ کو تعمیر کی نگرانی کرنا تھی سو آپ نے دل جان سے کی۔“

”لیکن دس میل کے لئے جو بیس انسانی جانیں ضائع ہوئیں ہیں“
”یہ تو ہوتا ہی ہے سر۔ شاید ایسا نہ ہوتا لیکن حکم تھا کہ سرنگ جلد سے جلد مکمل ہو کیونکہ اس کی سیاسی۔ اقتصادی اور اسٹریٹجک اہمیت ہے۔“

”چھوٹی توفیق جو کچھ ہوا سو ہوا۔ رات بہت ہو گئی ہے سو جائیے۔ اور ہاں یہ لو۔ ۵ ہزار۔“

اگلے دن لشکارے مادی ہوئی چیپ شیریں کے گھر کے سلیٹے کھڑی تھی مسٹر فرہاد نے شیریں کو جیت لیا تھا۔ رسم و رواج کے مطابق شیریں کی حسن سے شادی ہوئی اور حسن اُسے لے کر شہر چلا گیا۔

چھ ماہ اور گزر گئے۔ دس میل کی سرنگ اب پندرہ میل ہو چکی تھی۔ شیریں کبھی کبھاد اپنے گاؤں آتی۔ اُس کی قسمت پر بھی رشک کھتے کہ کہتے۔ بڑے افسر اور کتنے حسین انسان سے اس کی شادی ہوئی ہے وہ زیور سے لے کر آتی تھی۔ طرح طرح کے پکڑے۔ ہر باد نئی کار میں آتی تھی۔ اب اس کے گھر والے بھی نہال ہو گئے تھے۔ یہ شیریں کے خاوند کا فیض تھا۔ حسن نے شیریں کو اُہستہ اُہستہ ماڈرن سوسائٹی کے لئے تیار کر لیا تھا۔ وہ اب کچھ کچھ انگریزی بھی بولنے لگی تھی۔ بیگماتی انگریزی۔۔۔۔۔

گل کے گھر والے شیریں کے خاندان سے اور بھی چلنے لگے۔ گل کے والد تو خیر کیا کہتے لیکن گل کی امی ایک ایسی عورت تھی جس کے پاس میں گاؤں میں مشہور تھا کہ وہ آسمان خود ہی چیرتی ہے اور خود ہی تھکن لگاتی ہے۔ آسمان کو پھاڑتی اور خود ہی پیوند لگا آتی ہے لباس

”سر۔ آپ نے بھی توجہ کر دی۔ چھ ماہ مسلسل دن رات کام کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کو ثبوت پوست کے نہیں فلا د کے انسان ہیں۔ سر سچ بات یہ ہے کہ کیمپ میں لوگ اکثر حیران ہوتے تھے آپ جیسے کھنڈر سے آدمی کو کیا ہو گیا ہے اس خلوص۔ محنت اور توجہ کو دیکھ کر۔ پھر خود ہی لوگ کہتے تھے کہ آپ دیا نت دار ہیں۔ مقررہ مدت میں کام کو مکمل کرنا چاہتے ہیں۔“

حسن نے قہقہہ لگایا۔ اچھا یہ بات تھی۔ چلئے ان کو اصل بات کا علم نہیں۔ لیکن توفیق۔ داد تو آپ کو ملنا چاہتے۔

”جی سر۔ داد تو مجھے ملنا چاہیے لیکن سر معاف کیجئے گا۔ ترقی آپ

کو ملی اور ساتھ ہی ایک لاکھ بھی۔“

”میری ترقی تمہاری ترقی ہے توفیق اور یہ ایک لاکھ ان کی مجھے ضرورت نہیں۔ ویسے بھی ترقی کی ضرورت نہ تھی۔“
”جی کیا فرمایا؟“

توفیق۔ ”میں کہہ رہا تھا کہ داد تمہیں ملنا چاہیے۔ تمہارے دماغ نے کیسا عمدہ منصوبہ سوچا۔ چلئے دس، بارہ ہزار خرچ ہو گئے، تو کیا۔ سرنگ کی الائنمنٹ بدل دی گئی۔ ہماری مرضی کے مطابق نقشہ۔ منظور ہوا اور سرنگ شیریں کے گھر کے سلیٹے سے گزرا کر نیچے پھر مذی کے کنارے چلی گئی۔ میں سوچتا ہوں توفیق؟“
کیا سوچتے ہیں آپ؟

”یہ کس لئے دس میل سرنگ اور طویل کی گئی۔ یہ ڈیڑھ میل کی بلندی پر چلی گئی۔ کتنے خطرناک موڑ ہیں۔ شیطانی ٹالے ہیں۔ ان پر جان لیوا پل ہیں اور سب سے بڑھ کر ہزاروں فرہاد دن رات چٹانوں کو کاٹتے رہے۔ وہ میری شیریں کے لئے جوئے شیر لانے میں مصروف رہے اور میں مسٹر فرہاد بنا چٹانوں پر بیٹھان کو دیکھتا رہتا۔ عجیب اکثر وہ سین یاد آتے ہیں جس میں فرعونوں کے مقبرے کے لئے ہزاروں سال

جہنچے ہوئے بزرگوں کے مزاروں سے گذرتی ہے۔ جس کے حوالہ کا نشان تو مٹ گیا ہے لیکن کرامات زندہ ہیں۔ وہ اپنی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتے اسی لئے تنبیہ کے لئے اُنے دن کسی نہ کسی گاڑی کو بڑھکا دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں کوئی تیس انسان قہراً جل بن چکے ہیں۔ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ بستی والوں نے بزرگوں کی حرمت بچانے کے لئے ہنگامے کئے۔ توفیق کے ذریعے مشہور ہو گیا کہ اُنٹھویں میل پر ایک چیخ مٹائی دیتی ہے اور اس کے بعد ڈرائیور گاڑی پر کنٹرول نہیں کر سکتا۔ ہر نئے حادثے سے اتفاق سے بچنے والے اس کی تصدیق کرتے۔ اب ڈرائیوروں نے اس مرکز پر جانے سے انکار کر دیا، جو جاتے وہ دُعا میں لگتے جاتے۔ منت مان کر جاتے زندہ رہ جاتے تو منت اتا دتے۔ مرحلت، تو ہنگامہ ہوتا۔

توفیق اور حسن کی کارستانی سے مرکز کی الائنمنٹ پھر تبدیل ہو گئی۔ وہی پرانی مرکز آگے بلا حملنے کی اجازت مل گئی۔ دو ماہ بعد مرکز گل کے گھر کے سامنے گذری۔ حسن وہی جیب لے کر آیا جس پر وہ شیریں کو لے گیا تھا۔ اب کی اس جیب میں گل دہن بنی بیٹھی تھی۔ گل کی ماں نے اپنی بیٹی کو آخری الفاظ کہے۔

”بیٹی کچھ بھی ہو خاندان کی ناک اونچی رہی۔ تم شیریں پر سوکھن بن کر جا رہی ہو۔ شیریں تم پر سوکھن بن کر نہیں آ رہی۔“

تے ایسا حال پھیلا یا کہ حسن اس میں بڑی طرح گرفتار ہو گیا۔ جب شکوہ پھنس گیا تو اس نے گل کے خاندان سے گل سے شادی کے متعلق بات کی تو انہوں نے صاف کہا کہ شیریں پہلے ہی حسن کے گھر موجود ہے۔ اب وہ گل کو سوکھن کے طور پر نہیں سمجھا سکتے حسن نے ایک دم سے فیصلہ دیا کہ وہ گل کے لئے شیریں کو طلاق دینے کو تیار ہے گل کی ماں کے لئے بظاہر یہ خوشی کی بات تھی لیکن وہ اس سے بھی زیادہ شیریں کے خاندان والوں سے بدلہ لینا چاہتی تھی اس لئے اس نے کہا کہ شیریں کال سری ہے، (جوان ہے) اس لئے ہم نہیں چاہتے کہ اسے طلاق دی جائے۔ حسن نے کہا کہ پھر وہ گل کی شادی کر دیں وہ گل کو شیریں سے بہتر طور پر رکھے گا۔ اب گل کے خاندان والوں کو یقین ہو گیا کہ حسن ان کے ہاتھ لگ چکا ہے اس لئے انہوں نے وہی شرط لگائی جو شیریں کے گھر والوں نے لگائی تھی۔ گل کی امی نے کہا کہ شادی ہو سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ پرانی مرکز آگے بڑھے اور ان کے گھر کے سامنے سے گذرے۔

حسن اب بہت ہی پریشان تھا۔ یہ مسئلہ پہلے کی طرح اس کے قابو میں آنے والا نہیں تھا اس پر پھر توفیق حسن کے ریسکیو (RESCUE) کو کیا۔ نئی مرکز اپنا تذکرہ وصول کر رہی تھی چھ ماہ میں کنٹرول کمپنیاں اور گاڑیاں ڈیڑھ میل کی بلندی سے ندی میں رٹھک چکی تھیں۔ ان حادثات نے ہیجان خیزی کا روپ دھار دیا۔ توفیق نے چال چل۔ راتوں رات مشہور ہو گیا کہ نئی مرکز ایسے





نَشِيدُ التَّرْحِيبِ

بِجَلَالَةِ الْمَلِكِ خَالِدِ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ الْمَعْظَمِ

— جمیل الدین عاکی —

یا ناصر اسلامیات	یا خادم خیر الزمان
یا ناصر الاسلام والمسلمین	یا خادم خیر المرسلین
اهلاً وسهلاً مرحباً اهلاً وسهلاً مرحباً	
اے حامی ایمان تو	جس ملک کا جہان ہے
یا حامی الایمان ائت	ضیف للبلد اشدی
اس ملک کی بنیاد میں	ایمان ہی ایمان ہے
أُتِيسَ عَلَى أَسَاسِ الْإِسْلَامِ	فَلَيْسَ فِي بَيْتَانِهِ إِلَّا الْإِيمَانُ

اهلاً وسهلاً مرحباً اهلاً وسهلاً مرحباً

یہ دوستی !

نعیم الصداقة

یہ مسم دلی !

والأخوة فيما بيننا

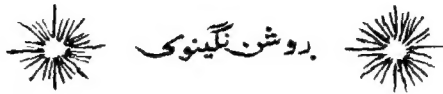
اهلاً وسهلاً مرحباً اهلاً وسهلاً مرحباً

تو جس کا ہے وہ سرزمین	أُمْنَانِي عَالَمِ كِي أَمِين
أَتَتْ تَبَتُّنِي إِلَى الْأَرْضِ الْقَبِي	بِحِي أَمِينَةٍ لِأَمْنَاءِ الْعَالَمِ
عَالِي مَكَانٍ، عَالِي مَكِينٍ	اے دوست الے دوست آفرین
يَا عَالِي الْمَكَانِ يَا ذُو الْمَعَالِي	يَا أَبَا الصَّدِّيقِ الْوَفِيِّ يَا مَنْشَى الصَّفْحِ

(بہ شکرید روزنامہ مشرق)



خوش آمدید



سرزمین پاک! تو قسمت پر اپنی ناز کر
گلستانِ حکمت و دانش کی تابندہ بہار
وہ صداقت کا علمبردارِ اخوت کا این
وہ وحدتِ ملی کا خواہاں، وہ محبت کا نقیب
وہ شہنشاہِ عرب جو خادمِ حرمین ہے
شاہِ فیصل کی طرح اس کی بھی ہے یہ آرزو
جب کسی مومن کو دکھ پہنچے تڑپ جالتا ہے وہ
وہ مسلمانانِ فلپائن کے غم سے باخبر!!
مضطرب ہے قلب اس کا خونچکاں لبنان پر
تیسری دنیا کے منصوبے کی وہ روجِ رواں
وہ فراغین جہاں سے برسرِ پیکار ہے
میں فرومایہ، تہی داماں سہی، اس پر تار
قلعہٴ اسلام سے یک گونہ رغبت ہے اسے

جلوہ گر ہے ملتِ اسلامیہ کا راہبر
سیرت و گفتار کا غازی، وفا کا شاہکار
وہ مروت کا مبلغِ پیسرو دینِ میں
وہ رفیقِ اہل ایمان، ہر مسلمان کے قریب
خدمتِ اسلام و ملت اس کا نصب العین ہے
مسجدِ اقصیٰ کو واپس لے کر ہو وہ سرخرو
مونس و غمخوار بن کے سامنے آتا ہے وہ
قضیہٴ کشمیر و قبرص پہ بھی ہے اُس کی نظر
جینا دو بھر ہے جہاں اس وقت ہر انسان پر
اس کے دم سے متحد ہیں ایشیا کے حکمران!
قابلِ تعریف اس کا موسوی کردار ہے
میں تو ہوں کیا چیز، میری شامی اُس پر تار
یعنی پاکستان سے بے حد محبت ہے اسے

ذی وقار و محترم، صاحبِ نظر، عالمِ پناہ!
اہلِ پاکستان کے ہیں دیدہ و دل فرسش راہ!

بد شکریہ روزنامہ مشرق

Accession Number

124869

Date 31.8.75



بند خوش دل خاں (بلوچستان) کا ایک روج پر اُرد منظر



حضدار (بلوچستان) کی پرائمری سکول کی دو طالبات

